قصصِ قرآنی اور انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات
اور اُنکی دعوتِ حق کی مُستند ترین تاریخ

قصص القرآن

جلد اوّل و دوم

تالیف
مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ
رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

دارالاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

قصص القرآن

اوّل ودوم

قصصِ قرآنی اور انبیاء علیہم السّلام کے سوانح حیات اور اُنکی دعوتِ حق کی مُستند ترین تاریخ جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے واقعات تک نہایت مُفصّل اور مُحقِقانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں!

تالیف

مولانا محمد حِفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

دَارُالاِشَاعَت

اُردو بازار، ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

نام کتاب	قصص القرآن
مصنف	مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی
کمپیوٹرائزڈ، ایڈیشن	۲۰۰۲
ناشر	دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، فون ۲۲۱۳ ۷۶۸
	E MAIL: ishaat@digicom.net.pk
باہتمام	خلیل اشرف عثمانی
کمپوزنگ	منظور احمد

ملنے کے پتے

- دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، فون ۲۲۱۳ ۷۶۸
- ادارۃ المعارف دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴
- مکتبہ دارالعلوم، ڈاکخانہ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴
- بیت القرآن، اردو بازار، کراچی
- ادارۂ اسلامیات، ۱۹۰انار کلی، لاہور
- ادارۂ اسلامیات، موھن چوک اردو بازار کراچی

عرض ناشر

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی محبوب ہستیوں کو بار بار عجیب انداز میں یاد فرمایا۔ ان ہستیوں کے تذکرے کو پسند فرمایا اور فرمایا کہ فلاں پیغمبر کو انکے تذکروں کے ساتھ یاد کیا کرو۔ فلاں رسول کو ان جانفشانیوں کے ساتھ یاد کرو۔ بلاشبہ ان شخصیات کے طفیل انسانیت اشرف المخلوقات قرار پائی۔

اللہ جل جلالہٗ نے اپنی عظیم کتاب میں ان کے واقعات کو مزیّن فرمایا ان واقعات پر مشتمل متعدد کتب وجود میں آئیں لیکن جو اعزاز اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی معرکۃ الاراء تصنیف "قصص القرآن چار جلد کامل" کو عطا فرمایا وہ کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں۔ حضرت مصنفؒ نے قرآن پاک میں موجود تمام واقعات کو اس طرح ذکر فرمایا جس میں ترجمہ، تشریح، تاریخ، جغرافیہ، مستشرقین کے اعتراضات کے شافی جواب پر سیر حاصل تحقیق اور انکے عالمانہ نچوڑ سے قاری کی مکمل تشفی ہو جاتی ہے۔

دارالاشاعت کراچی نے سب سے پہلے پاکستان میں اسے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا تھا۔ اور اب تک بحمد اللہ شائع کر رہا ہے۔ اب یہ جدید ایڈیشن کمپیوٹر کتابت سے آراستہ کر کے امپورٹڈ اعلیٰ کاغذ اور مقدس مقامات کی نادر رنگین تصاویر بھی شامل کر کے مزید بہت بہتر معیار کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائیں۔ آمین

خلیل اشرف عثمانی

نوٹ:۔ اس ایڈیشن کے علاوہ اسکا ایک ایڈیشن پاکستانی کاغذ پر حسب سابق دستیاب ہے۔ ناشر

فہرست مضامین حصہ اول و دوم

حصہ دوم

پیش لفظ

طبع اول

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ الّذی ھدانا بالکتاب المبین و انزل علینا القراٰن بلسانٍ عربّی مبین و قص فیہ احسن القصص موعظۃ وّ ذکرٰی للمؤمنین و الصّلوٰۃ و السّلام علی النّبی الصادق الامین محمّد رسول اللّٰہ و خاتم النبیین و علیٰ اٰلہٖ و اصحابہ الذین ھم ھداۃٌ للمتّقین

امابعد...... قرآنِ عزیز میں حق تعالیٰ نے دنیاءِ انسانی کی ہدایت کیلئے جو مختلف معجزانہ اسلوب بیان اختیار فرمائے ہیں، اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ گزشتہ قوموں کے واقعات و قصص کے ذریعہ اُن کے نیک و بد اعمال اور ان اعمال کے ثمرات و نتائج کو یاد دلائے اور عبرت و بصیرت کا سامان مہیا کرے، اسی لئے وہ تاریخی اسلوبِ بیان کے درپے نہیں ہوتا، بلکہ ابلاغ حق اور دعوت الی اللہ کے اہم مقصد کے پیشِ نظر صرف انہی وقائع کو سامنے لاتا ہے جو اس غرض و غایت کو پورا کرتے ہوں اور اسی لئے قرآنِ عزیز میں ان کی تکرار پائی جاتی ہے تاکہ سامعین کے دل میں وہ گھر کر سکیں اور فطری اور طبعی رجحانات کو ان حقائق کی جانب متوجہ کیا جا سکے، اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ ایک بات کو مختلف پیرایہ بیان اور مناسب حال اسلوبِ نگارش سے بار بار دُہرایا جائے اور خوابیدہ قوائے فکریہ کو پے بہ پے بیدار کیا جائے۔

قرآنِ مجید کے قصص و واقعات کا سلسلہ بیشتر گزشتہ اقوام اور ان کی جانب بھیجے ہوئے پیغمبروں سے وابستہ ہے اور جستہ جستہ بعض اور واقعات بھی اس ضمن میں آگئے ہیں، اور یہ تمام تر حق و باطل کے مجادلوں، اولیاء اللہ و اولیاء شیطان کے معرکوں کا ایک عبرت آموز اور بصیرت خیز بے مثل ذخیرہ ہے۔

لیکن دوسروں کا کیا ذکر ہم مسلمانوں میں بھی بہت کم ہیں جو خدائے تعالیٰ کے اس مکمل ترین اور آخری قانون (قرآن عزیز) سے استفادہ کرتے اور اپنے مردہ دلوں میں ایمان و یقین کی زندگی پیدا کرتے ہوں اس لئے کہ یہ خدا کا قانون ہے اور ہم اس کے امتثال پر مامور ہیں، اور معانی و مطالب پر غور کرتے ہوں یہ سمجھ، کر کہ یہ رہتی دنیا تک حیات ابدی و سرمدی اور دارین کی فلاح و سعادت کا مکمل دستور ہے۔

نزول قرآن کے وقت پیغمبر خدا ﷺ نے مشرکوں کی معاندانہ روش سے تنگ آکر یہ شکایت کی تھی:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝ (فرقان ع ۳)

رسولؐ نے کہا: اے میرے پروردگار! بے شبہ میری قوم نے قرآن کو مہجور (جھک جھک) بنالیا ہے۔
لیکن اس چودھویں صدی میں اگر ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں تو دعوائے اسلام اور قرآن کو خدا کا کلام یقین کرنے کے باوجود کتنے ہیں جو اس کلام الٰہی کو اپنی زندگی کے لئے بہترین نظام عمل بناتے اور اس نظر سے اس کی تلاوت کرتے ہوں۔

اپنی اور اپنی قوم کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے جی چاہا کہ اس سرمایہ عبرت وبصیرت کو اردو میں منتقل کیا جائے تاکہ نقل سے محفوظ ہونے کے بعد خود بخود اصل کی جانب رغبت پیدا ہو اور اس طرح سعادت دارین کا سراغ ملے۔

اپنی سادہ طرز نگارش کے باوجود اس مجموعے میں چند خصوصیات کا خاص طور پر لحاظ کیا گیا ہو:

۱ کتاب میں تمام واقعات کی اساس وبنیاد قرآن عزیز کو بنایا گیا ہے اور احادیث صحیحہ اور واقعات تاریخی سے ان کی توضیح وتشریح کی گئی ہے۔
۲ تاریخ اور کتب عہد قدیم کے درمیان اور قرآن عزیز کے "یقین محکم" کے درمیان اگر کہیں تعارض آپڑا ہے تو اس کو روشن دلائل وبراہین کے ذریعہ یا تطبیق دی گئی ہے اور یا پھر صداقت قرآن کو وضاحت سے ثابت کیا گیا ہے۔
۳ اسرائیلی خرافات اور معاندین کے اعتراضات کی خرافت کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کیا گیا ہے۔
۴ خاص خاص مقامات پر تفسیری، حدیثی اور تاریخی اشکالات پر بحث وتمحیص کے بعد سلف صالحین کے مسلک کے مطابق ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔
۵ ہر پیغمبر کے حالات قرآن عزیز کی کن کن سورتوں میں بیان ہوئے ہیں ان کو نقشہ کی شکل میں ایک جگہ دکھایا گیا ہے۔
۶ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ "نتائج وعبر" یا "عبر وبصائر" کے عنوان سے اصل مقصد اور حقیقی غرض وغایت یعنی عبرت وبصیرت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔

خادم ملت
محمد حفظ الرحمن سیوہاروی
مرقومہ ۲۲ رجب المرجب ۶۰ ۱۳ھ

دیباچہ طبع ثانی

قصص القرآن حصہ اول ودوم عرصہ ہوا کہ ختم ہو گئے تھے مگر کاغذ کی قلت، کنٹرول کی پابندیوں اور طباعت کی گوناگوں مشکلات نے موقع نہ دیا کہ دوسرا ایڈیشن جلد طبع ہو سکتا، تاہم سعی بلیغ کے بعد طبع دوم کی نوبت آہی گئی اور اب اصحاب کے ہاتھوں میں حصہ اول کا دوسرا ایڈیشن پہنچ رہا ہے۔ فالحمد للہ علےٰ ذٰلک۔

ارادہ تھا کہ اس مرتبہ نظر ثانی کر کے کتاب کو نئے اسلوب پر ترتیب دیا جائے، لیکن حصہ اول کی کتابت اس وقت ہوئی جبکہ میں مراد آباد اور بریلی کی جیلوں میں اسارت سے لطف اندوز ہو رہا تھا اس لئے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ پھر بھی یہ ترمیم ضروری خیال کی گئی کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا پورا واقعہ پہلے ہی حصہ میں آجائے اور پہلے ایڈیشن کی طرح نصف دوسرے حصہ کے لئے باقی نہ رہے، چنانچہ اس ایڈیشن میں حضرتِ موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے مکمل حالات وواقعات یکجا ہو گئے ہیں۔

دیباچہ طبع ثالث

دلی مرحوم کے "مرحوم" ہونے کے بعد کسے گمان تھا کہ قرول باغ میں برباد شدہ ادارہ "ندوۃ المصنفین" دوبارہ زندگی کے سانس لے سکے گا، لیکن مشیتِ ایزدی نے اُس کو روحِ تازہ بخشی اور سابق کی طرح علمی و دینی خدمت کیلئے اُس کو ایک مرتبہ پھر شاہراہِ افادیت پر گامزن کیا۔ تاہم ناساز گار حالات اور نامساعد ساعات نے مسلمانانِ ہند کی جن نت نئی خدمات سے دوچار کیا، اُن کی وجہ سے وہ منصوبہ آج بھی پورا نہ ہو سکا کہ قصص القرآن جلد اول کو نئے اسلوب پر ترتیب دیا جائے۔ حق تعالیٰ نے توفیق بخشی تو بعد کے ایڈیشن میں اس عزم کو پورا کیا جا سکے گا۔

محمد حفظ الرحمٰن

۱۵ شعبان ۱۳۶۹ھ

حضرت آدم علیہ السلام

۱	انسانِ اوّل	۲	قرآنِ عزیز میں ذکرِ آدم علیہ السلام
۳	پیدائش آدم علیہ السلام	۴	مسئلہ سجودِ ملائکہ
۵	انکارِ ابلیس	۶	رب العلمین سے ابلیس کا مکالمہ
۷	ملعونیتِ ابلیس اور تاقیام قیامت زندگی کی مہلت	۸	خلافتِ آدم علیہ السلام
۹	خلافتِ آدم علیہ السلام پر فرشتوں کا اظہارِ تعجب	۱۰	بارگاہِ ربوبیت سے حضرت آدم علیہ السلام کو تعلیم اور فرشتوں کو تنبیہ
۱۱	حوّا علیہا السلام کی پیدائش اور آدم علیہ السلام وحوا علیہا السلام کی جنت میں رہائش	۱۲	آدم علیہ السلام وحوا علیہا السلام ، وسوسۂ ابلیس اور شجر ممنوعہ کا واقعہ
۱۳	عتابِ الٰہی اور آدم علیہ السلام وحوا علیہا السلام کا جنت سے زمین کی جانب اخراج	۱۴	قصۂ آدم علیہ السلام سے متعلق بعض اہم مسائل

انسانِ اوّل

حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق قرآنِ عزیز نے جو حقائق بیان کیے ہیں اُن کے تفصیلی تذکرہ سے پہلے یہ واضح ہو جانا ضروری ہے کہ انسان کے عالمِ وجود میں آنے کا مسئلہ آج علمی نقطۂ نگاہ سے بحث کا ایک نیا دروازہ کھولتا ہے یعنی ارتقاء (Evolution) کا یہ دعویٰ ہے کہ موجودہ انسان اپنی ابتدائی تخلیق و تکوین ہی سے انسان پیدا نہیں ہوا بلکہ کائناتِ ہست و بود میں اس نے بہت سے مدارج طے کر کے موجودہ انسانی شکل حاصل کی ہے، اسلئے کہ مبدءِ حیات نے جمادات و نباتات کی مختلف شکلیں اختیار کر کے ہزاروں، لاکھوں برس بعد درجہ بدرجہ ترقی کرتے کرتے اوّل لبونہ (پانی کی جونک) کا لباس پہنا اور پھر ایسی ہی طویل مدت کے بعد حیوانات کے مختلف چھوٹے بڑے طبقات سے گزر کر موجودہ انسان کی شکل میں وجود پذیر ہوا۔

اور مذہب یہ کہتا ہے کہ خالقِ کائنات نے انسانِ اوّل کو آدم علیہ السلام کی شکل میں ہی پیدا کیا اور پھر اُس کی طرح ایک ہم جنس مخلوق حوا علیہا السلام کو وجود دے کر کائناتِ ارض پر نسلِ انسان کا سلسلہ قائم کیا، اور یہی وہ انسان

ہے جس کو خالقِ کائنات نے عام مخلوق پر برتری اور بزرگی عطا فرمائی اور امانت الٰہی کا بارِ گراں اس کے سپرد فرمایا اور کل کائنات کو اس کے ہاتھ میں مسخر کر کے خلافت و نیابتِ الٰہی کا شرف اُس ہی کو بخشا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيٓ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ

بلاشبہ ہم نے انسانوں کو بہترین اندازہ سے بنایا۔ (والتین)

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ

بے شبہ ہم نے نسلِ آدم کو تمام کائنات پر بزرگی اور برتری بخشی۔ (بنی اسرائیل)

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً

میں زمین پر (آدم ﷺ کو) اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ (بقرہ)

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ

ہم نے بارِ امانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو انہوں نے (کل کائنات) امانتِ الٰہی کے بار کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اُس بارِ گراں کو اٹھالیا۔ (احزاب ع۹)

اب غور طلب بات یہ ہے کہ نظریہ ارتقاء (EVOLUTON) اور مذہب کے درمیان اس خاص مسئلہ میں علمی تضاد ہے یا تطبیق کی گنجائش نکل سکتی ہے خصوصاً جبکہ علم اور تجربہ نے یہ حقیقت واشگاف کر دی ہے کہ دینی اور مذہبی حقائق اور علم کے درمیان کسی بھی موقف پر تضاد نہیں ہے اور اگر ظاہر سطح میں کہیں ایسا نظر بھی آتا ہے تو وہ علم کے بعض حقائق مستور ہونے کی وجہ سے نظر آتا ہے کیونکہ بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ جب بھی علم کے مستور حقائق سے پردہ اٹھا تو اُسی وقت تضاد بھی جاتا رہا اور وہی حقیقت نکھر کر سامنے آگئی جس کا اظہار وحی الٰہی کے ذریعہ ہو چکا تھا۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجئے کہ علم اور مذہب کے درمیان اگر کسی وقت بھی تضاد نظر آیا تو نتیجہ میں علم کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑی اور وحی الٰہی کا فیصلہ اپنی جگہ اٹل رہا۔

اس بنا پر اس جگہ بھی قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں حقیقت حال کیا ہے اور کس طرح ہے؟

جواب یہ ہے کہ اس موقف پر بھی علم (ارتقاء) اور مذہب کے درمیان تضاد نہیں ہے البتہ یہ مسئلہ چونکہ دقیق نکتہ سنجیوں کا حامل ہے اس لئے یہ مقام اُس کے تفصیلی مباحث کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اسی کتاب کے کسی دوسرے مقام پر زیر بحث آسکے گا۔

تاہم اس جگہ یہ حقیقت ضرور پیش نظر رہنی چاہئے کہ انسانِ اوّل (جو کہ موجودہ نسل انسان کا باوا آدم ﷺ ہے) خواہ ارتقائی (Evolution) نظریہ کے مطابق درجہ بہ درجہ انسانی شکل تک پہنچا ہو یا ابتداءِ تخلیق ہی

کے وقت سے انسانی صورت میں وجود پذیر ہوا ہو علم اور مذہب دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ موجودہ انسان ہی اس کائنات کی سب سے بہترین مخلوق ہے اور عقل ودانش کا یہ پیکر ہی اپنے اعمال وکردار کیلئے جوابدہ ہے اور دستور وقانون کا مکلف!

یا اس طرح تعبیر کر لیجئے کہ انسانی کردار اور اس کے علمی وعملی نیز اخلاقی عوامل ومحرکات کے پیش نظر اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ اسکی تخلیق وتکوین اور عالم وجود میں آنے کی تفصیلات کیا ہیں بلکہ اہمیت کا موقف یہ ہے کہ اس عالم کون ومکان میں اس کا وجود یونہی بے معنی اور بے مقصد وجود میں آیا ہے یا اُس کی ہستی اپنے اندر عظیم مقصد لے کر وجود پذیر ہوئی ہے؟ کیا اُس کے افعال واقوال اور کردار وگفتار کے اثرات لا یعنی ہیں؟ کیا اُس کی مادی وروحانی قدریں سب کی سب مہمل اور بے نتیجہ ہیں یا بیش بہا ثمرات کی حامل اور پُر از حکمت ہیں؟ اور کیا اُسکی زندگی اپنے اندر کوئی روشن وتابناک حقیقت رکھتی ہے یا تیرہ وتاریک مستقبل کا پتہ دیتی ہے اور اُس کا ماضی اور حال اپنے مستقبل سے بے بہرہ ہے؟

پس اگر ان حقائق کا جواب نفی میں نہیں بلکہ اثبات میں ہے تو پھر قدرتی طور پر یہ تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ اس کی کیفیت پیدائش پر بحث کی بجائے اس کے وجود کے مقصد پر پوری نگاہ رکھی جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ اس اشرف المخلوقات ہستی کا وجود بلاشبہ مقصدِ عظیم کا پتہ دیتا ہے اور اس لئے اُس کی اخلاقی قدروں کا ضرور کوئی مثل اعلیٰ اور اُس کی تخلیق کی کوئی غایت ہے۔

قرآن عزیز نے اسی لئے حضرت انسان سے متعلق مثبت اور منفی ہر دو پہلو کو واضح کر کے انسانی، ہستی کی عظمت کا اعلان کیا ہے اور بتایا ہے کہ خالق کائنات کی قدرت تخلیق وتکوین میں انسان کی تخلیق "حسن تقویم" کا درجہ رکھتی ہے اور اسی وجہ سے وہ تمام کائنات کا مقابلہ میں "تکریم وتعظیم" کا مستحق ہے اور اپنے حسن تقویم اور لائق تکریم ہونے کی بنا پر بلاشبہ وہی امانت الٰہی کا علمبردار ہو کر "خلیفۃ اللہ" کے منصب پر فائز ہونے کا حق رکھتا ہے اور جب یہ سب کچھ اُس میں ودیعت ہے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اُس کی ہستی کو یونہی بے مقصد اور بے نتیجہ چھوڑ دیا جاتا ہے:۔

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى ۝

کیا لوگوں (انسانوں) نے یہ گمان کر لیا ہے کہ وہ بے مقصد چھوڑ دیئے جائیں گے۔

اور ضروری ہے کہ عقل وشعور کے اس پیکر کو تمام کائنات سے ممتاز بنا کر نیک وبد کی تمیز عطا کی جائے ار بُرائی سے پرہیز اور بھلائی کے اختیار کا مکلف بنایا جائے۔

خَلَقَهُ ثُمَّ هَدٰى ۝

(اللہ تعالیٰ نے) انسان کو پیدا کیا اور پھر (نیک وبد کی) راہ دکھلائی۔

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝

پھر ہم نے انسان کو دونوں راستے (نیک وبد کے) دکھلائے۔

غرض قرآن عزیز کی تذکیر و دعوت، اور امر و نواہی، اور رشد و ہدایت کا مخاطب اور مبدء و معاد کا محور و مرکز صرف یہی ہستی ہے جس کو "انسان" کہتے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے انسانِ اول کی تخلیقی کوائف و تفصیلات کو نظرانداز کر کے اس کے "مبدء و معاد" کے مسائل ہی کو اہمیت دی ہے۔

ذکرِ آدم علیہ السلام سے متعلق آیاتِ قرآنی

قرآن عزیز میں حضرت آدم علیہ السلام کا نام پچپن مرتبہ پچیس آیات میں آیا ہے جو ذیل کی جدول سے ظاہر ہوتا ہے:۔

نمبر سورۃ	سورۃ	آیات	شمار
۲	البقرہ	۳۷،۳۵،۳۴،۳۳،۳۱	۵
۳	ال عمران	۵۹،۳۳	۲
۵	المائدہ	۲۷	۱
۷	الاعراف	۱۷۲،۳۵،۳۱،۲۷،۲۶،۱۹،۱۱	۷
۱۷	الاسراء	۷۰،۶۱	۲
۱۸	الکہف	۵۰	۱
۱۹	مریم	۵۸	۱
۲۰	طٰہٰ	۱۲۱،۱۲۰،۱۱۷،۱۱۶،۱۱۵	۵
۳۶	یٰس	۶۰	۱

قرآنِ عزیز میں انبیاء علیہم السلام کے تذکروں میں سب سے پہلا تذکرہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کا ہے اور حسب ذیل سورتوں میں بیان کیا گیا ہے:۔

سورۂ بقرہ، اعراف، اسراء، کہف اور طٰہٰ میں نام اور صفات دونوں کے ساتھ اور سورۂ حجر و صٓ میں فقط ذکر صفات کے ساتھ اور آلِ عمران، مائدہ، مریم اور یٰسین میں صرف ضمنی طور پر نام لیا گیا ہے۔

یہ واقعہ اوپر کی تمام سورتوں اور آیتوں میں اگرچہ اسلوب بیان، طرزِ ادا اور لطیف تعبیر کے اعتبار سے مختلف نظر آتا ہے، لیکن مقصد اور واقعہ کے اعتبار سے ایک ہی حقیقت ہے جو مختلف تعبیرات میں موعظت و عبرت کے پیشِ نظر حسب موقعہ بیان کی گئی ہے۔

قرآن عزیز ان تاریخی واقعات کو محض اس لئے نہیں بیان کرتا کہ وہ واقعات ہیں جن کا ایک تاریخ میں درج ہونا ضروری ہے بلکہ اُس کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ وہ ان واقعات سے پیدا شدہ نتائج کو انسانی رشد و ہدایت کے لئے موعظت و عبرت بنائے اور انسانی عقل و جذبات سے اپیل کرے کہ وہ نوامیس و قوانینِ فطرت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ان تاریخی نتائج سے سبق حاصل کریں اور ایمان لائیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور اس کا یدِ قدرت ہی اس تمام ہست و بود پر کار فرما ہے، اور اُسی مذہب کے احکام کی پیروی میں فلاح و نجات

اور ہر قسم کی ترقی کا راز مضمر ہے جس کا نام مذہبِ فطرت یا اسلام ہے۔

قرآن عزیز کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ کو مختلف سورتوں میں اُن سورتوں کے مضامین کے مناسب نئے اور اچھوتے انداز میں بیان کرنے کے باوجود واقعہ کی اصل حقیقت اور اُس کی متانت و سنجیدگی میں ادنیٰ سا فرق بھی نہیں آنے دیتا، کہیں واقعہ کی تفصیل ہے، کہیں اجمال، کسی مقام پر اُس کا ایک پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے تو دوسرے مقام پر اُس کو سب سے زیادہ نمایاں حقیقت دی گئی ہے، ایک جگہ اُسی واقعہ سے مسرّت و انبساط اور لذت و سرور پیدا کرنے والے نتائج نکالے گئے ہیں تو دوسری جگہ واقعہ میں معمولی سا تغیر کئے بغیر خوف و دہشت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے، بلکہ بعض مرتبہ ایک ہی مقام پر لذت و الم دونوں کا مظاہرہ نظر آتا ہے، مگر موعظت و عبرت کے اس تمام ذخیرہ میں ناممکن ہے کہ نفسِ واقعہ کی حقیقت اور متانت میں معمولی سا بھی تغیر پیدا ہو جائے۔

بلاشبہ یہ کلام الٰہی کے ہی شایانِ شان ہے اور اعجازِ قرآن کے عنوان سے معنون اور متضاد صفات کے حامل "حضرت انسان" کی فصاحت و بلاغت کے مدارج علیا کی دسترس سے باہر!

أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ ط وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ○

کیا وہ قرآن کے متعلق غور فکر سے کام نہیں لیتے؟ اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کا کلام ہوتا تو بلاشبہ وہ اس میں (قسم قسم کے) تضاد و اختلاف کو پاتے۔ (نساء)

پیدائشِ آدم، فرشتوں کو سجدہ کا حکم، شیطان کا انکار

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ آدم کو مٹی سے پیدا کیا، اور اُن کا خمیر تیار ہونے سے قبل ہی اس نے فرشتوں کو یہ اطلاع دی کہ عنقریب وہ مٹی سے ایک مخلوق پیدا کرنے والا ہے جو بشر کہلائے گی، اور زمین میں ہماری خلافت کا شرف حاصل کرے گی۔

آدم علیہ السلام کا خمیر مٹی سے گوندھا گیا اور ایسی مٹّی سے گوندھا گیا جو نت نئی تبدیلی قبول کر لینے والی تھی، جب یہ مٹی پختہ ٹھکری کی طرح آواز دینے اور کھنکھنانے لگی تو اللہ تعالیٰ نے اس جسدِ خاکی میں رُوح پھونکی اور وہ یک بیک گوشت پوست، ہڈی، پٹھے کا زندہ انسان بن گیا اور ارادہ، شعور، حس، عقل اور وجدانی جذبات و کیفیات کا حامل نظر آنے لگا۔

تب فرشتوں کو حکم ہوا کہ تم اس کے سامنے سر بسجود ہو جاؤ، فوراً تمام فرشتوں نے تعمیل ارشاد کی مگر ابلیس (شیطان) نے غرور تمکنت کے ساتھ صاف انکار کر دیا۔

قرآنِ عزیز کی ان آیات میں واقعہ کے اسی حصہ کو بیان کیا گیا ہے:

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَآئِكَةِ اسْجُدُوْا لِآدَمَ فَسَجَدُوْٓا إِلَّآ إِبْلِيْسَ أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ ○ وَقُلْنَا يَآآدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ

شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○

اور پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ آدم کے آگے سر بسجود ہو جاؤ، وہ جھک گئے، مگر ابلیس کی گردن نہیں جھکی، اسنے نہ مانا، اور گھمنڈ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ کافروں میں سے تھا پھر (ایسا ہوا کہ) ہم نے آدم سے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو جس طرح چاہو، کھاؤ پیو، امن چین کی زندگی بسر کرو، مگر دیکھو وہ جو ایک درخت ہے، تو کبھی اُس کے پاس نہ پھٹکنا، اگر تم اس کے قریب گئے، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ) حد سے تجاوز کر بیٹھو گے، اور اُن لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو زیادتی کرنے والے ہیں۔ (بقرہ آیہ ۳۴-۳۵)

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ○

اور (دیکھو یہ ہماری ہی کارفرمائی ہے کہ) ہم نے تمہیں پیدا کیا (یعنی تمہارا وجود پیدا کیا) پھر تمہاری (یعنی نوع انسان کی) شکل و صورت بنا دی، پھر (وہ وقت آیا کہ) فرشتوں کو حکم دیا "آدمؑ کے آگے جھک جاؤ" اس پر سب جھک گئے، مگر ابلیس کہ جھکنے والوں میں نہ تھا۔ (اعراف۔ آیۃ ۱۱)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ○ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ○ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ○ اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ○

اور بلاشبہ یہ واقع ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اُٹھے ہوئے گارے سے بنایا، جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے اور ہم "جن" کو اس سے پہلے جلتی ہوئی ہوا کی گرمی سے پیدا کر چکے تھے، اور (اے پیغمبر! جب ایسا ہوا تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا "میں خمیر اُٹھے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگا ہے، ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں (یعنی نوعِ انسانی پیدا کرنے والا ہوں) تو جب ایسا ہو کہ میں اُسے درست کر دوں (یعنی وہ وجود تکمیل کو پہنچ جائے) اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو چاہئے کہ تم سب اس کے آگے سر بسجود ہو جاؤ" چنانچہ جتنے فرشتے تھے سب اس کے آگے سر بسجود ہو گئے، مگر ایک ابلیس، اُس نے انکار کیا کہ سجدہ کرنے والوں میں سے ہو۔ (حجر آیۃ: ۲۶-۲۹)

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ○

اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا" آدم کے آگے جھک جاؤ" اور سب جھک گئے تھے مگر ابلیس نہیں جھکا تھا۔ وہ جن میں سے تھا، پس اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہو گیا پھر کیا تم مجھے چھوڑ کر (کہ تمہارا پروردگار ہوں) اسے اور اسکی نسل کو کارساز بناتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ (دیکھو) ظلم کرنے والوں کیلئے کیا ہی بری تبدیلی ہوئی! (کہف آیۃ ۵۰)

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِينٍ ○ فَإِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سَاجِدِيْنَ ○ فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُوْنَ ○ إِلَّا إِبْلِيسَ ط اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ ○

اور وہ وقت یاد کرو جب تیرے پرودگانے فرشتوں سے کہا میں مٹی سے بشر کو پیدا کرنے والا ہوں، بس جب میں اس کو بنا سنوار لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو سب فرشتے اس کیلئے سر بسجود ہو جاؤ پس سب ہی نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ مانا، گھمنڈ کیا اور وہ (علم الٰہی میں پہلے ہی) کافروں میں سے تھا۔

سجدہ سے انکار کرنے پر ابلیس کا مناظرہ

اللہ تعالیٰ اگرچہ عالم الغیب اور دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے اور ماضی، حال اور استقبال سے سب اس کیلئے یکساں ہیں مگر اس نے امتحان و آزمائش کیلئے ابلیس (شیطان) سے سوال کیا:

مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ

کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جب کہ میں نے حکم دیا تھا؟

ابلیس نے جواب دیا:

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ○

اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اسے مٹی سے۔

شیطان کا مقصد یہ تھا کہ میں آدمؑ سے افضل ہوں، اس لئے کہ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا ہے اور آگ بلندی و رفعت چاہتی ہے اور آدم مخلوقِ خاکی، بھلا خاک کو آگ سے کیا نسبت؟ اے خدا! پھر یہ تیرا حکم کہ ناری، خاکی کو سجدہ کرے کیا انصاف پر مبنی ہے؟

میں ہر حالت میں آدم سے بہتر ہوں، لہذا وہ مجھے سجدہ کرے نہ کہ میں اس کے سامنے سر بسجود ہوں، مگر بد بخت شیطان اپنے غرور و تکبر میں یہ بھول گیا کہ جب تو اور آدم دونوں خدا کی مخلوق ہو، تو مخلوق کی حقیقت خالق سے بہتر خود وہ مخلوق بھی نہیں جان سکتی، وہ اپنی تمکنت اور گھمنڈ میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ مرتبہ کی بلندی و پستی اس مادہ کی بنا پر نہیں ہے جس سے کسی مخلوق کا خمیر تیار کیا گیا ہے بلکہ اس کی ان صفات پر ہے جو خالق کائنات نے اسکے اندر ودیعت کی ہیں۔

بہر حال شیطان کا جواب چونکہ غرور و تکبر کی جہالت پر مبنی تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس پر واضح کر دیا کہ

جہالت سے پیدا شدہ کبر و نخوت نے تجھ کو اس قدر اندھا کر دیا ہے کہ تو اپنے خالق کے حقوق اور احترام خالقیت سے بھی منکر ہو گیا، اسلئے مجھ کو ظالم قرار دیا اور یہ نہ سمجھا کہ تیری جہالت نے تجھ کو حقیقت کے سمجھنے سے درماندہ و عاجز بنا دیا ہے پس تو اب اس سرکشی کی وجہ سے ابدی ہلاکت کا مستحق ہے اور یہی تیرے عمل کی قدرتی پاداش ہے۔

ابلیس کی طلب مہلت

ابلیس نے جب دیکھا کہ خالق کائنات کے حکم کی خلاف ورزی، تکبر و رعونت اور خدائے تعالیٰ پر ظلم کے الزام نے ہمیشہ کیلئے مجھ کو رب العلمین کی آغوش رحمت سے مردود اور جنت سے محروم کر دیا، تو توبہ اور ندامت کی جگہ اللہ تعالیٰ سے یہ استدعاء کی کہ تا قیام قیامت مجھ کو مہلت عطا کر اور اس طویل مدت کیلئے میری زندگی کی رسی کو دراز کر دے۔

حکمت الٰہی کا تقاضا بھی یہی تھا، لہٰذا اس کی درخواست منظور کر لی گئی، یہ سن کر اب اس نے پھر ایک مرتبہ اپنی شیطنت کا مظاہرہ کیا، کہنے لگا! جب تو نے مجھ کو راندۂ درگاہ کر ہی دیا تو جس آدم کی بدولت مجھے یہ رسوائی نصیب ہوئی میں بھی آدم کی اولاد کی راہ ماروں گا اور ان کے پس و پیش، ارد گرد اور چہار جانب سے ہو کر ان کو گمراہ کروں گا، اور ان کی اکثریت کو تیرا ناسپاس اور ناشکر گذار بنا چھوڑوں گا، البتہ تیرے "مخلص بندے" میرے اغوا کے تیرے گھائل نہ ہو سکیں گے اور ہر طرح سے محفوظ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم کو اس کی کیا پرواہ، ہماری فطرت کا قانون "مکافاتِ عمل و پاداشِ عمل" اٹل قانون ہے، پس جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا، جو بنی آدم مجھ سے روگردانی کر کے تیری پیروی کرے گا وہ تیرے ساتھ ہی عذاب الٰہی (جہنم) کا سزاوار ہو گا، جا.... اپنی ذلت و رسوائی اور شومئ قسمت کے ساتھ یہاں سے دور ہو اور اپنی اور اپنے پیروؤں کی ابدی لعنت (جہنم) کا منتظر رہو۔

قرآن مجید حسب ذیل آیات ان ہی تفصیلات پر روشنی ڈالتی ہیں:۔

مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ط قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝ قَالَ أَنْظِرْنِيْٓ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ قَالَ فَبِمَآ أَغْوَيْتَنِيْ لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ط وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ط لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِيْنَ ۝ (الاعراف ۷، آیت ۱۲۔۱۸)

کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟ کہا "اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اسے مٹی سے"۔ فرمایا "جنت سے نکل جا۔ تیری یہ ہستی نہیں کہ یہاں رہ کر سرکشی کرے۔ یہاں سے نکل دور ہو یقینا تو ان میں سے ہوا جو ذلیل وخوار ہیں۔" ابلیس نے کہا "مجھے اس وقت تک کیلئے مہلت دے جب لوگ (مرنے کے بعد) اٹھائے جائیں گے۔" "تجھے مہلت ہے" اس پر ابلیس نے کہا چونکہ تو نے مجھ پر راہ بند کردی، تو اب میں بھی ایسا ضرور کروں گا۔ تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کیلئے بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں، پھر سامنے سے پیچھے سے، داہنے سے، بائیں سے (غرضکہ ہر طرف سے) ان پر آؤں اور تو ان میں سے اکثروں کو شکر گذار نہ پائے گا، خدا نے فرمایا "یہاں سے نکل جا، ذلیل اور ٹھکرایا ہوا، بنی آدم میں سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا تو (وہ) تیرا ساتھی ہوگا۔ اور میں البتہ ایسا کروں گا کہ (پاداشِ عمل میں تم سب سے جہنم بھر دوں!

قَالَ يَآإِبْلِيسُ مَا لَكَ أَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السَّاجِدِيْنَ ○ قَالَ لَمْ أَكُنْ لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ ○ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيْمٌ ○ وَّإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَى يَوْمِ الدِّيْنِ ○ قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِيٓ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ○ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ○ إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ○ قَالَ رَبِّ بِمَآ أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ ○ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ○ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ○ إِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِيْنَ ○ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِيْنَ ○ (الحجر ۱۵، آیت ۳۲-۴۳)

اللہ نے فرمایا: "اے ابلیس! تجھے کیا ہوا کہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟" کہا مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسے بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا ہے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے" حکم ہوا "اگر ایسا ہے تو یہاں سے نکل جا، کہ تو راندہ ہوا اور جزا کے دن تک تجھ پر لعنت ہوئی" اس نے کہا: "خدایا! مجھے اس دن تک مہلت دے جب انسان (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے"۔ فرمایا: "اس مقررہ وقت کے دن تک تجھے مہلت دی گئی۔" اس نے کہا: "خدایا! چونکہ تو نے مجھ پر (نجات وسعادت) کی راہ بند کردی، تو اب میں ضرور ایسا کروں گا کہ زمین میں ان کیلئے جھوٹی خوشنمائیاں بنا دوں اور (راہِ حق سے) گمراہ کردوں، ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہوں گے (میں جانتا ہوں) میرے بہکانے میں آنے والے نہیں۔" فرمایا: "بس یہی سیدھی راہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والی ہے، جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں چلے گا۔ صرف انہی پر چلے گا جو (بندگی کی) راہ سے بھٹک گئے اور ان سب کیلئے جہنم کے عذاب کا وعدہ ہے (جو کبھی ٹلنے والا نہیں)۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَآئِكَةِ اسْجُدُوْا لِآدَمَ فَسَجَدُوٓا إِلَّآ إِبْلِيْسَ ط قَالَ أَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ○ قَالَ أَرَأَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِي إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيْلًا ○ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ

جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۝ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ط وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُوْرًا ۝ إِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ ط وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝

(اسراء ۶۱-۶۵)

اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا: "آدم کے آگے جھک جاؤ" اس پر سب جھک گئے مگر ایک ابلیس نہ جھکا اس نے کہا: "کیا میں ایسی ہستی کے آگے جھکوں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟" نیز اس نے کہا "کیا تیرا یہی فیصلہ ہوا کہ تو نے اس (حقیر) ہستی کو مجھ پر بڑائی دی؟" اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے دے تو میں ضرور اس کی نسل کی بیخ بنیاد اکھاڑ کے رہوں، تھوڑے آدمی اس ہلاکت سے بچیں، اور کوئی نہ بچے"۔ اللہ نے فرمایا: "جا اپنی راہ لے، جو کوئی بھی ان میں سے تیرے پیچھے چلے گا، تو اس کیلئے اور تیرے لئے جہنم کی سزا ہوگی پوری پوری سزا ان میں سے جس کسی کو تو اپنی صدائیں سنا کر بہکا سکتا ہے۔ بہکانے کی کوشش کر لے، اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں سے حملہ کر، ان کے مال اور اولاد میں شریک ہو جا، اُن سے (طرح طرح کی باتوں کے) وعدے کر، اور شیطان کے وعدے تو اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ سر تا سر دھوکا" جو میرے (سچے) بندے ہیں ان پر تو قابو پانے والا نہیں، تیرا پروردگار کارسازی کیلئے بس کرتا ہے۔ (اسراء ۶۵)

قَالَ يَآإِبْلِيْسُ مَامَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ط أَاسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ۝ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ط خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝ وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِيْ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ إِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُوْلُ ۝ لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِيْنَ ۝ (ص ۳۸، آیت ۷۵-۸۵)

فرمایا اے ابلیس! کس چیز نے روک دیا تجھ کو کہ سجدہ کرے اُسکو جس کو میں نے بنایا اپنے (قدرت کے) ہاتھوں سے، یہ تو نے غرور کیا یا تو بڑا تھا درجہ میں، بولا میں بہتر ہوں اس سے مجھ کو بنایا آگ سے اور اُسکو بنایا مٹی سے، فرمایا تو تو نکل یہاں سے کہ تو مردود ہوا۔ اور تجھ پر میری پھٹکار ہے اُس جزا کے دن تک، بولا، اے رب! مجھ کو ڈھیل دے جس دن تک مُردے جی اُٹھیں۔ فرمایا تو تجھ کو ڈھیل ہے۔ اُسی وقت کے دن تک جو معلوم ہے۔ بولا تو قسم ہے تیری عزت کی میں گمراہ کروں گا اُن سب کو، مگر جو بندے ہیں تیرے اُن میں چنے ہوئے، فرمایا، تو ٹھیک بات یہ ہے اور میں ٹھیک ہی کہتا ہوں۔ مجھ کو بھرنا ہے دوزخ تجھ سے اور جو اُن میں تیری راہ چلیں اُن سب سے۔ (ص ۸۵)

خلافت آدم

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں کو اطلاع دی کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں، جو اختیار وارادہ کا مالک ہوگا، اور میری زمین پر جس قسم کا تصور کرنا چاہے گا کر سکے گا، اور اپنی ضروریات کیلئے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکے گا، گویا وہ میری قدرت اور میرے تصرف واختیار کا "مظہر" ہوگا۔

فرشتوں نے یہ سُنا تو حیرت میں رہ گئے، اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا اگر اس ہستی کی پیدائش کی حکمت یہ ہے کہ وہ دن رات تیری تسبیح و تہلیل میں مصروف رہے اور تیری تقدیس و بزرگی کے گُن گائے، تو اس کے لئے ہم حاضر ہیں، جو ہر لحہ تیری حمد و ثنا کرتے اور بے چون و چرا تیرا حکم بجالاتے ہیں، ہم کو تو اس "خاکی" سے فتنہ وفساد کی بو آتی ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ تری زمین میں خرابی اور خونریزی بپا کر دے؟ بارِ الٰہا! تیرا یہ فیصلہ آخر کس حکمت پر مبنی ہے؟

بارگاہِ الٰہی سے اوّل اُن کو یہ ادب سکھایا گیا کہ مخلوق کو خالق کے معاملات میں جلد بازی سے کام نہ لینا چاہئے، اور اس کی جانب سے حقیقت حال کے اظہار سے قبل ہی شک و شبہ کو سامنے نہ لانا چاہئے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اُس میں اپنی برتری اور بڑائی کا پہلو نکلتا ہو، خالقِ کائنات اُن حقائق کو جانتا ہے جس سے تم بے بہرہ ہو، اور اُس کے علم میں وہ سب کچھ ہے جو تم نہیں جانتے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً ط قَالُوْٓا أَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّيْٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

اور جب ایسا ہوا تھا کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا۔ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، فرشتوں نے کہا: کیا ایسی ہستی کو خلیفہ بنایا جارہا ہے جو زمین میں خرابی پھیلائے گی اور خونریزی کرے گی، حالانکہ ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہوئے تیری پاکی و قدوسی کا اقرار کرتے ہیں (کہ تیری مشیت برائی سے پاک اور تیرا کام نقصان سے منزہ ہے!) اللہ نے کہا، میری نظر جس حقیقت پر ہے، تمہیں اُسکی خبر نہیں۔ (البقرۃ:۳۰)

تعلیم آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا اقرارِ عجز

یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ اس مقام پر فرشتوں کا سوال اس لئے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مناظرہ یا اس کے فیصلہ کے متعلق موشگافی کریں بلکہ وہ آدم کی تخلیق کا سبب معلوم کرنا چاہتے تھے اور یہ کہ اس کے خلیفہ بنانے میں کیا حکمت ہے ان کی خواہش تھی کہ اس حکمت کا راز اُن پر بھی کھل جائے، اس لئے ان کے طرزِ ادا اور تعبیر مقصد میں کوتاہی پر تنبیہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ اُن کے اس سوال کا جواب جو بظاہر حضرت آدمؑ کی تحقیر پر مبنی ہے۔ عمل و فعل کے ذریعہ اس طرح دیا جائے کہ ان کو خود بخود آدم کی برتری اور حکمتِ عملی الٰہی کی بلندی ورفعت کا نہ صرف اعتراف کرنا پڑے بلکہ اپنی درماندگی اور عجز کا بھی بدیہی طور پر مشاہدہ ہو جائے، لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی سب سے عظیم المرتب صفت "علم" سے نوازا اور اُن کو علم اشیاء عطا فرمایا۔ اور

پھر فرشتوں کے سامنے پیش کر کے ارشاد فرمایا کہ تم ان اشیاء کے متعلق کیا علم رکھتے ہو؟ وہ لاعلم تھے کیا جواب دیتے۔ مگر چونکہ بارگاہ صمدیت سے قرب رکھتے تھے سمجھ گئے کہ ہمارا امتحان مقصود نہیں ہے کیونکہ اس سے قبل ہم کو ان کا علم ہی کب دیا گیا ہے کہ آزمائش کی جاتی بلکہ یہ تنبیہ مقصود ہے کہ "خلافت الٰہیہ" کا مدار کثرت تسبیح و تحلیل اور تقدیس و تمجید پر نہیں بلکہ صفت "علم" پر ہے، اس لئے کہ ارادہ واختیار، قدرت تصرف اور قدرت اختیار یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ حکومت ارضی صفت "علم" کے بغیر ناممکن ہے، پس جبکہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت علم کا مظہر اتم بنایا ہے تو بلا شبہ وہی خلافت ارضی کا مستحق ہے نہ کہ ہم، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ملائکۃ اللہ چونکہ اپنی خدمات مفوضہ کے علاوہ ہر قسم کی دنیوی خواہشوں اور ضرورتوں سے بے نیاز ہیں، اسلئے وہ اُن کے علم سے بھی ناآشنا تھے اور آدم کو چونکہ ان سب سے واسطہ پڑنا تھا اسلئے ان کا علم اس کیلئے ایک فطری امر تھا جو رب العلمین کی ربوبیت کاملہ کی بخشش و عطا سے عطا ہوا اور اُس کو وہ سب کچھ بتا دیا گیا جو اس کیلئے ضروری تھا۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝ قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ۝

(پھر جب ایسا ہوا کہ مشیت الٰہی نے جو کچھ چاہا تھا، ظہور میں آ گیا) اور آدم نے (یہاں تک معنوی ترقی کی کہ) تعلیم الٰہی سے تمام چیزوں کے نام معلوم کر لئے، تو فرشتوں کے سامنے وہ (تمام حقائق) پیش کر دیئے اور فرمایا، اگر تم (اپنے شبہ میں) درستی پر ہو تو بتلاؤ، ان (حقائق) کے نام کیا ہیں؟ فرشتوں نے عرض کیا۔ خدایا ساری پاکیاں اور بڑائیاں تیرے ہی لئے ہیں ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں سکھلا دیا ہے، علم تیرا علم ہے اور حکمت تیری حکمت! جب فرشتوں نے اس طرح اپنے عجز کا اعتراف کر لیا تو حکم الٰہی ہوا "اے آدم تم (اب) فرشتوں کو اُن (حقائق) کے نام بتلا دو..... جب آدم نے بتلا دیئے تو اللہ نے فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان و زمین کے تمام غیب مجھ پر روشن ہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ بھی مجھ سے مخفی نہیں! (سورۂ بقرہ: ۳۱-۳۳)

حضرت آدم علیہ السلام کے اس شرف علم کے متعلق مفسرین کے دو رائے ہیں ایک یہ کائنات کی وہ تمام اشیاء جو ماضی سے مستقبل تک وجود میں آنے والی تھیں اُن سب کے نام اور ان کی حقیقت کا علم حضرت آدم علیہ السلام کو دے دیا گیا، دوسری رائے یہ ہے کہ اُس وقت جس قدر اشیاء بھی عالم کائنات میں موجود تھیں اور حضرت آدم کے سامنے ان کا مظاہرہ کیا گیا تھا اُن سب کا علم عطا کیا گیا، اور الاسماء کلھا (تمام چیزوں کے نام) کا اطلاق جس طرح کائنات کی ماضی و مستقبل کی تمام اشیاء پر ہوتا ہے اسی طرح اُس وقت کی تمام موجودہ

اشیاء پر بھی بغیر کسی تاویل کے ہو سکتا ہے، اور یہ کہ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ سے اکثر موجود و محسوس یعنی حاضر ہی کی جانب اشارہ مقصود ہوا کرتا ہے۔ اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اشیاء کی تمام جزئیات و تفصیلات کا علم بخشا گیا تھا بلکہ اشیاء کی بنیاد و نہاد اور اصول واساس کا علم عطا کیا گیا تب بھی الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا کے منافی نہیں ہے۔

بہر حال حضرت آدم علیہ السلام کو صفت "علم" سے اس طرح نوازا گیا کہ فرشتوں کیلئے بھی ان کی برتری اور استحقاق خلافت کے اقرار کے علاوہ چارۂ کار نہ رہا، اور یہ ماننا پڑا کہ اگر ہم زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ بنائے جاتے تو کائنات کے تمام بھیدوں سے ناآشنا رہتے اور قدرت نے جو خواص اور علوم ودیعت کئے ہیں اُن سے یکسر ناواقف ہوتے اس لئے کہ نہ ہم خورد و نوش کے محتاج ہیں کہ زمین میں ودیعت شدہ رزق اور خزانوں کی جستجو کرتے نہ ہمیں غرق کا اندیشہ کہ کشتیوں اور جہازوں کی ایجاد کرتے، نہ مرض کا خوف کہ قسم قسم کے معالجات اشیاء کے خواص، کیمیائی مرکبات، فوائد طبیعات و فلکیات، طبی ایجادات علوم نفسیات و وجدانیات اور اسی طرح کے بیش بہا اور بیشمار علوم و فنون کے اسرار اور اُن کی حکمتوں سے واقف ہو سکتے، بلاشبہ یہ صرف حضرت انسان ہی کے لئے موزون تھا کہ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ بنے اور ان تمام حقائق و معارف اور علوم و فنون سے واقف ہو کر نیابت الٰہی کا صحیح حق ادا کرے۔

حضرتِ آدم کا قیام جنت اور حواء کی زوجیت

حضرت آدم علیہ السلام ایک عرصہ تک تنہا زندگی بسر کرتے رہے مگر اپنی زندگی اور راحت و سکون میں ایک وحشت اور خلاء محسوس کرتے تھے اور اُن کی طبیعت اور فطرت کسی مونس و ہمدم کی جویا نظر آتی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حواء علیہا السلام کو پیدا کیا اور حضرت آدم علیہ السلام اپنا ہمدم و رفیق پا کر بیحد مسرور ہوئے اور اطمینان قلب محسوس کیا۔ حضرت آدم و حواء کو اجازت تھی وہ جنت میں رہیں سہیں اور اُس کی ہر چیز سے فائدہ اٹھائیں، مگر ایک درخت کو معیّن کر کے بتایا گیا کہ اس کو نہ کھائیں بلکہ اُس کے پاس تک نہ جائیں۔

آدم کا خلد سے نکلنا

اب ابلیس کو ایک موقعہ ہاتھ آیا اور اُس نے حضرت آدم و حوا کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ شجر شجر خلد" ہے، اس کا پھل کھانا جنت میں سرمدی آرام و سکونت اور قربِ الٰہی کا ضامن ہے اور قسمیں کھا کر اُن کو باور کرایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، دشمن نہیں ہوں یہ سُن کر حضرت آدم علیہ السلام کے انسانی اور بشری خواص میں سب سے پہلے نسیان (بھول چوک) نے ظہور کیا اور وہ یہ فراموش کر بیٹھے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم، حکم امتناعی تھا نہ کہ مربیانہ مشورہ، اور آخر کار جنت کے دائمی قیام اور قربتِ الٰہی کے عزم میں لغزش پیدا کر دی اور انھوں نے اُس درخت کا پھل کھا لیا، اُس کا کھانا تھا کہ بشری لوازم ابھرنے لگے، دیکھا تو ننگے ہیں اور لباس محروم، جلد جلد (آدم و حوّا) دونوں پتوں سے ستر ڈھانکنے لگے گویا انسانی تمدن کا یہ آغاز تھا، کہ اُس نے تن ڈھانکنے کیلئے سب سے پہلے پتوں کو استعمال کیا۔

ادھر یہ ہو رہا تھا کہ خدائے تعالیٰ کا عتاب نازل ہوا اور آدم سے باز پُرس ہوئی کہ ممانعت کے باوجود یہ عدول

حُکمی کیسی؟ آدم آخر آدم تھے، مقبولِ بارگاہِ الٰہی تھے، اسلئے شیطان کی طرح مناظرہ نہیں کیا اور اپنی غلطی کو تاویلات کے پردے میں چھپانے کی سعیِ نامشکور سے باز رہے ندامت و شرمساری کے ساتھ اقرار کیا کہ غلطی ضرور ہوئی لیکن اس کا سبب تمرد و سرکشی نہیں ہے بلکہ بربنائے بشریت بھول چوک اس کا باعث ہے، تاہم غلطی ہے، اس لئے توبہ واستغفار کرتے ہوئے عفوو درگزر کا خواست گار ہوں۔

حضرت حق نے اُن کے اس عذر کو قبول فرمالیا اور معاف کر دیا، مگر وقت آ گیا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام خدا کی زمین پر "حق خلافت" ادا کریں، اس لئے بہ تقاضائے حکمت ساتھ ہی یہ فیصلہ سُنایا کہ تم کو اور تمہاری اولاد کو ایک معیّن وقت تک زمین پر قیام کرنا ہو گا، اور تمہارا دشمن ابلیس بھی اپنے تمام سامانِ عداوت کے ساتھ وہاں موجود رہے گا اور تم کو اس طرح ملکوتی اور طاغوتی و متضاد طاقتوں کے درمیان زندگی بسر کرنی ہو گی اس کے باوجود اگر تم اور تمہاری اولاد مخلص بندے اور سچّے نائب ثابت ہوئے تو تمہارا اصل وطن "جنت" ہمیشہ کے لئے تمہاری ملکیت میں دے دیا جائے گا، لہٰذا تم اور حواء دونوں یہاں سے جاؤ اور میری زمین پر جا کر بسو اور اپنی مقررہ زندگی تک حق عبودیت ادا کرتے رہو۔

اور اس طرح انسانوں کے باپ اور خدائے تعالیٰ کے خلیفہ آدم نے اپنی رفیقۂ حیات حواء کے ساتھ خدا کی زمین پر قدم رکھا۔

وَقُلْنَا يَاآدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِيْنَ ۝ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَّلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَى حِيْنٍ ۝ فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

پھر (ایسا ہوا کہ) ہم نے آدم علیہ السلام سے کہا، اے آدم! تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو، جس طرح چاہو کھاؤ پیو، امن چین کی زندگی بسر کرو، مگر دیکھو، وہ جو ایک درخت ہے، تو کبھی اُس کے پاس نہ پھٹکنا، اگر تم اس کے پاس گئے تو (نتیجہ یہ نکلے گا کہ) حد سے تجاوز کر بیٹھو گے اور اُن لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو زیادتی کرنے والے ہیں پھر ایسا ہوا کہ شیطان کی وسوسہ اندازی نے اُن دونوں کے قدم ڈگمگا دیئے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جیسی کچھ (راحت و سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے اس سے نکلنا پڑا، خدا کا حکم ہوا کہ یہاں سے نکل جاؤ تم میں سے ہر وجود دوسرے کا دشمن ہے، اب تمہیں (جنت کی جگہ) زمین میں رہنا ہے، اور ایک خاص وقت تک کیلئے (جو علمِ الٰہی میں مقرر ہو چکا ہے) اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ آدم نے اپنے پروردگار کے القاء سے چند کلمات معلوم کر لئے (جن کیلئے اس کے حضور قبولیت تھی) پس اللہ نے اس کی توبہ قبول کر لی اور بلا شبہ وہی ہے جو رحمت سے درگزر کرنے والا ہے۔ اور اس کے درگزر کی کوئی انتہا نہیں (آدم کی توبہ قبول ہو گئی

لیکن جس زندگی سے وہ نکل چکا تھا وہ دوبارہ نہیں مل سکتی تھی، پس ہمارا حکم ہوا، اب تم سب یہاں سے نکل جاؤ (اور جس نئی زندگی کا دروازہ تم پر کھولا جارہا ہے اسے اختیار کرلو، لیکن (یادرکھو) جب کبھی ایسا ہوگا کہ ہماری جانب سے تم پر راہِ (حق) کھولی جائے گی، تو تمہارے لئے دو ہی راہیں ہوں گی، جو کوئی ہدایت کی پیروی کرے گا اس کے لئے (کامیابی وسعادت ہوگی) کسی طرح کا کھٹکا نہیں، کسی طرح کی غمگینی نہیں۔ (بقرۃ: ۳۵-۳۸)

وَ يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُوْرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ○ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ○ فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ط وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ○

اے آدم! تو اور تیری بیوی، دونوں جنت میں رہو سہو اور جس جگہ سے جو چیز پسند آئے شوق سے کھاؤ، مگر دیکھو (وہ جو ایک درخت ہے، تو اس درخت کے قریب بھی نہ جانا، اگر گئے تو یادرکھو، تم زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ اُن کے ستر جو اُن سے چُھپے تھے ان پر کھول دے، اُس نے کہا تمہارے پروردگار نے اس درخت سے جو تمہیں روکا ہے، تو صرف اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو، تم فرشتے بن جاؤ، یا دائمی زندگی تمہیں حاصل ہو جائے، اس نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ میں تم دونوں کو خیر خواہی سے نیک بات سمجھانے والا ہوں۔ غرضکہ (شیطان اس طرح کی باتیں سُنا سُنا کر بالآخر) انہیں فریب میں لے آیا۔ پھر جو ہی ایسا ہوا کہ انھوں نے درخت کا پھل چکھا۔ اُن کے ستر اُن پر کھل گئے، اور جب اُنہیں اپنی برہنگی دیکھ کر شرم محسوس ہوئی تو باغ کے پتے اوپر تلے رکھ کر اپنے جسم پر چپکانے لگے، اُس وقت اُن کے پروردگار نے پکارا: "کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روک دیا تھا، اور کیا میں نے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟ انھوں نے عرض کیا "پروردگار! ہم نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا، اگر تو نے ہمارا قصور نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا، تو ہمارے لئے بربادی کے سوا کچھ نہیں! فرمایا" یہاں سے نکل جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمہارے لئے زمین میں ٹھکانا ہے اور یہ کہ ایک خاص وقت تک وہاں سروسامانِ زندگی سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ اور فرمایا! تم اسی میں جیو گے اسی میں مرو گے پھر اسی سے

(مرنے کے بعد) نکالے جاؤ گے۔" (اعراف ۱۹-۲۵)

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ إِلَىٰٓ آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُۥ عَزْمًا ۝ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوٓا إِلَّآ إِبْلِيسَ أَبَىٰ ۝ فَقُلْنَا يَآآدَمُ إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ ۝ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ۝ فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَآآدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ ۝ فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَعَصَىٰٓ آدَمُ رَبَّهُۥ فَغَوَىٰ ۝ ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُۥ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ ۝ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ۝

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے آدم کو پہلے سے جتا کر عہد لے لیا تھا پھر وہ بھول گیا، اور ہم نے (نافرمانی کا) قصد اس میں نہیں پایا تھا اور پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا "آدم کے آگے جھک جاؤ" سب جھک گئے تھے مگر ابلیس نہیں جھکا، اس نے انکار کیا اس پر ہم نے کہا اے آدم (دیکھ لے) یہ (ابلیس) تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے ایسا نہ ہو یہ تمہیں جنت سے نکال کے رہے اور تم محنت میں پڑ جاؤ۔ تمہارے لئے اب ایسی زندگی ہے کہ نہ تو اس میں بھوکے رہتے ہو نہ برہنہ، نہ تمہارے لئے پیاس کی جلن ہے نہ سورج کی تپش (اگر اس سے نکلے تو سر تا سر محنت میں مبتلا ہو جاؤ گے) لیکن پھر شیطان نے آدم کو وسوسہ میں ڈالا اس نے کہا "اے آدم"! میں تجھے ہمیشگی کے درخت کا نشان دے دوں؟ اور ایسی بادشاہی جو کبھی زائل نہ ہو؟" چنانچہ دونوں نے (یعنی آدم اور اس کی بیوی نے) اس درخت کا پھل کھالیا، اور دونوں کے ستر اُن پر کھل گئے تب اُن کی حالت ایسی ہو گئی کہ باغ کے پتے توڑنے لگے اور ان سے اپنا جسم ڈھانکنے لگے غرضکہ آدم اپنے پروردگار کے کہنے پر نہ چلا پس وہ (جنت کی زندگی سے) بے راہ ہو گیا۔ (لیکن) پھر اُس کے پروردگار نے اُسے برگزیدہ کیا۔ اس پر (اپنی رحمتوں سے) لوٹ آیا۔ اس پر (زندگی و عمل کی) راہ کھول دی، چنانچہ اللہ نے حکم دیا تھا "تم دونوں اکٹھے یہاں سے نکل چلو تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہوا (اب تم پر ایک دوسری زندگی کی راہ کھلے گی) پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس (یعنی تمہاری نسل کے پاس) کوئی پیام ہدایت آیا تو (اس بارے میں میرا قانون یاد رکھو) جو کوئی میری ہدایت پر چلے گا، وہ نہ تو راہ سے بے راہ ہو گا نہ دکھ میں پڑے گا۔ (سورۃ طٰہٰ: ۱۱۵-۱۲۳)

واقعہ سے متعلق چند اہم مسائل

واقعہ کی اس تفصیل کے بعد چند ایسے اہم مسائل پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے جو واقعہ کی تفصیلات میں بڑی حد تک معین و مددگار ثابت ہوں۔

تخلیق آدم علیہ السلام

۱ یہ مسئلہ بھی لائقِ فکر و نظر ہے کہ انسانِ اوّل حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کب ہوئی، کیا کائناتِ ارض و سماوی کے ساتھ ساتھ یا غیر معیّن مدّت کے بعد اُس کی ہستی عالمِ وجود میں آئی؟

علماءِ یہود و نصاریٰ اور بعض علماءِ اسلام کا قول ہے کہ حق تعالیٰ نے تخلیق و تکوینِ کائنات کے بارہ جو "ستۃ ایّام" (چھ دن) کی تعبیر اختیار فرمائی ہے اُن ہی ایّام میں سے ایک دن حضرت آدم علیہ السلام نے بھی لباسِ وجود پہنا اور وہ جمعہ کا دن ہے۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ

کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار خدا ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر چھا گیا۔ (سورۂ اعراف)

لیکن یہ مسلک درست نہیں ہے نہ علمی و تاریخی اعتبار سے اور دینی و مذہبی روایات کے لحاظ سے، یہود و نصاریٰ کے متعلق تو معلوم نہیں کہ انھوں نے کس بنیاد پر یہ کہا، اور اس کے لئے اُن کے پاس کیا دلیل ہے مگر علاّمہ سبکیؒ سے ضرور یہ تعجب ہے کہ انھوں نے اس بے دلیل بات کو کس طرح قبول فرمایا اور یہ مسلک کیوں اختیار کیا۔

کافی غور و فکر کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ سبکیؒ کو یہ مغالطہ غالباً صحیح مسلم کی اس حدیث سے ہوا ہے جو فضائلِ جمعہ میں مذکور ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش جمعہ کے دن ہوئی ہے۔

اس روایت میں صرف اسی قدر مذکور ہے مگر سبکیؒ نے اپنی جانب سے یہ اضافہ کر لیا کہ یہ جمعہ "ستۃ ایام" میں شامل جمعہ کا دن ہے اور یہی مغالطہ ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے متعدد جگہ خلقِ کائنات کا ذکر کیا ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی خلقِ آدم علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا...... حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ارض و سماوات سے زیادہ حضرت آدم کا ذکر ضروری تھا جو قرآن ہی کی زبان میں اشرف المخلوقات، اور خَلِيْفَةُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قدر اہم شخصیت کو "ستۃ ایّام" ہی میں سے کسی دن (یوم) وجود بخشا جائے اور اُس کا ذکر تک نہ کیا جائے کیونکہ ان آیات میں صرف دو ہی باتیں ذکر کی گئی ہیں ایک ارض و سماوات کی پیدائش کا معاملہ اور دوسرا "استواء علی العرش" کا، مگر حضرت آدم کی ولادت سے متعلق صراحت تو کجا اشارہ تک موجود نہیں ہے پھر مستزاد یہ کہ قرآنِ عزیز نے جس جس موقعہ پر حضرت آدم کا ذکر کسی بھی نہج سے کیا ہے ان میں سے کسی ایک مقام پر بھی یومِ پیدائش کا ذکر نہیں ہے تب بات واضح ہے کہ اصل حقیقت یہی ہے کہ خلقِ سماوات وارض سے ہزاروں، لاکھوں بلکہ غیر معین مدّت کے بعد (جس کا عِلم صرف عالم الغیب والشہادہ ہی کو ہے) حضرت آدم علیہ السلام کو

کسی جمعہ میں خلعتِ وجود عطا کیا گیا اور "ستۃ ایام" کے جمعہ کے دن کسی کی بھی تخلیق و تکوین نہیں ہوئی بلکہ استواءً علی العرش[1] کا مظاہرہ ہوا اور اس لئے جمعہ کا دن جشن یا تعطیل کا دن قرار پایا۔

۲ آدم و حوا عربی نام ہیں یا عجمی؟ اور یہ نام کسی مناسبت سے رکھے گئے ہیں یا صرف نام ہی کی حیثیت میں ہیں؟

پہلے سوال کے متعلق مشہور محدّث حافظ ابن حجرؒ مکی کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ "سریانی" نام ہے اور بائبل میں الف کے مد اور دال کے طول کے ساتھ پڑھا جاتا ہے یعنی آدم، اور علامہ جوہریؒ اور جوالیقیؒ یہ کہتے ہیں کہ یہ عربی نام ہیں، اور دوسرے سوال کے متعلق ثعلبی کا قول ہے کہ عبرانی زبان میں آدام مٹی کو کہتے ہیں، چونکہ اُن کی تخلیق مٹی سے ہوئی، اس لئے آدم یا آدام نام رکھا گیا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ اُدمۃ سے ماخوذ ہے اس لئے کہ وہ ادیم الارض" یعنی صفحہ زمین سے پیدا کئے گئے ہیں، اور بعض علماء کہتے ہیں کہ اُدمت بمعنی خلطت سے ماخوذ ہے اور چونکہ اُن کا خمیر پانی اور مٹی کو ملا کر اور خلط ملط کر کے بنایا گیا ہے اس لئے اس مناسبت سے ان کو آدم کہا گیا ہے۔ اسی طرح حواء اسلئے نام پڑا کہ وہ ہر "انسانِ حیّ" (زندہ انسان) کی ماں ہیں اور مبالغہ کا صیغہ بنا کر اُنکا نام رکھدیا گیا۔[2]

بہر حال نام اور معنی میں مناسبت کا یہ سوال نکتہ اور لطیفہ کی حیثیت رکھتا ہے، اسلئے بیان کردہ تمام وجود بیک وقت بھی صحیح ہو سکتی ہیں اور کسی ایک وجہ کو دوسری پر ترجیح بھی دی جا سکتی ہے، کیونکہ یہ باب بہت وسیع ہے۔

۳ اللہ تعالیٰ نے سجدہ کا جو حکم دیا تھا وہ فرشتوں کو دیا تھا اور ابلیس فرشتوں کی جنس میں داخل نہیں تو پھر اُس پر عتابِ الٰہی کیوں ہوا اور وہ نافرمانی کا مرتکب کس لئے قرار دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ ابلیس ملائکہ کی جنس نہ تھا۔ قرآن عزیز میں تصریح ہے۔

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهٖ

وہ "جن" سے تھا پس اُس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی

مگر جب اللہ تعالیٰ نے سجدہ کا حکم فرمایا تو اُس وقت وہ اس مجلس میں موجود تھا اور غیر معلوم مدّت تک فرشتوں کے ساتھ تسبیح و تہلیل میں مشغول رہنے کی وجہ سے وہ بھی اس حکم کا مخاطب تھا اور وہ بھی خود کو مخاطب سمجھتا تھا اسی لئے جب خدائے تعالیٰ نے اس سے دریافت کیا تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا۔ تو اُس نے یہ جواب نہیں دیا کہ میں فرشتہ نہیں ہوں اس لئے اس حکم کا مخاطب ہی نہ تھا کہ سجدہ کرتا، بلکہ ازراہِ غرور کہا تو یہ کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں اس لئے سجدہ سے باز رہا۔

یہی جواب صحیح اور درست ہے۔ ورنہ تو ایک ضعیف اور کمزور رائے یہ بھی ہے کہ ملائکۃ اللہ میں سے ایک قسم کو "جن" بھی کہا جاتا ہے اور یہ اُنہیں میں سے ایک تھا۔ مگر اس رائے کی تائید نہ قرآن عزیز سے ملتی ہے اور نہ صحیح احادیث سے!

1: استواء علی العرش اور ستۃ ایام کی تعبیر کیلئے قصص القرآن کی دوسری جلد ملاحظہ فرمائیں۔

2: فتح الباری ج ۶، کتاب حدیث الانبیاء، چونکہ یہ تمام اقوال تخمینی ہیں اس لئے سب کو نقل کر دیا گیا اور کسی ایک قول کو ترجیح دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

۴ ابلیس جب جنت سے مردود ہو کر نکال دیا گیا تو پھر وہ حضرت آدم و حواء علیہما السلام کو کس طرح بہکا سکا؟
علماءِ اسلام سے اس کے دو جواب منقول ہیں اور دونوں کسی تاویل کے بغیر چسپاں ہیں:

۱) اگرچہ ابلیس جنت سے نکال دیا گیا، لیکن پھر بھی اس کا ایک گنہگار اور نابکار مخلوق کی حیثیت میں جنت کے اندر داخل ہونا اس کے مردود ہونے کے منافی نہیں ہے۔

اس لئے اُس نے اسی حیثیت سے اندر جا کر حضرت آدم علیہ السلام و حواء علیہا السلام سے یہ گفتگو کی اور ان کو لغزش میں ڈال دیا آیت اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا اُسی کی تائید کرتی ہے کہ عاصی کی حیثیت سے ابھی تک اس کا داخلہ ممنوع نہیں تھا۔

۲) جس طرح ایک آواز ٹیلیفون اور ریڈیو کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ دُور جا سکتی ہے یا جس طرح لاسلکی (وائرلیس) میں صرف شعاعوں اور آواز کی لہروں کے ذریعہ سے ایک پیغام ہزاروں میل پہنچایا جا سکتا ہے اسی طرح یہ بھی کیوں ممکن نہیں کہ قربت یا بالمشافہہ مخاطبت کے بغیر ہی شیطان کا وسوسہ نفسِ انسانی تک پہنچ جائے اور اس پر اثر انداز ہو تب واقعہ کی صورت یہ ہوئی کہ شیطان نے جنت سے باہر ہی رہ کر حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء علیہا السلام کے قلوب میں یہ وسوسہ ڈالا اور اُن کو بہکانے کی کوشش کی، آیت فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

۵ حواء علیہا السلام کی پیدائش کس طرح ہوئی؟ قرآنِ عزیز میں اس کے متعلق صرف اسی قدر مذکور ہے:
"وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا" "اور اس (نفس) سے اس جوڑے کو پیدا کیا"

یہ نظم قرآنی حواء علیہا السلام کی پیدائش کی حقیقت کی تفصیل نہیں بتاتی، اس لئے دونوں احتمال ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حواء علیہا السلام حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئی ہوں جیسا کہ مشہور ہے اور بائبل میں بھی اسی طرح مذکور ہے، دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو اس طرح پیدا کیا کہ مرد کے ساتھ اسی کی جنس سے ایک دوسری مخلوق بھی بنائی جس کو عورت کہا جاتا ہے اور جو مرد کی رفیقۂ حیات بنتی ہے۔

آیت کی تفسیر میں محققین کی رائے اس دوسری تفسیر کی جانب مائل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآنِ عزیز صرف حضرت حواء علیہا السلام کی تخلیق کا ذکر نہیں کر رہا ہے بلکہ "عورت کی تخلیق کے متعلق" اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ بھی مرد ہی کی جنس سے ہے اور اسی طرح مخلوق ہوئی ہے، البتہ بخاری و مسلم کی روایتوں میں یہ ضرور آتا ہے کہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔

الفاظ یہ ہیں:

"استوصوا بالنسآء فان المرأۃ خلقت من ضلع" (الحدیث)
"عورت کے ساتھ نرمی اور خیر خواہی سے پیش آؤ اس لئے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے"

اس کا مطلب ابن اسحٰق نے تو یہ بیان کیا ہے کہ حواء علیہا السلام آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں، مگر ابن اسحٰق سے زیادہ محقق اور نقاد علامہ قرطبیؒ نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ دراصل عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ عورت کی خلقت کی ابتداء پسلی سے کی گئی ہے اس کا حال پسلی ہی کی

طرح ہے، اگر اس کی کجی کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی تو جس طرح پسلی کے ترچھے پن کے باوجود اس سے کام لیا جاتا ہے اور اس کے خم کو دُور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اسی طرح عورتوں کے ساتھ نرمی اور رفق کا معاملہ کرنا چاہئے۔ ورنہ سختی کے برتاؤ سے خوشگواری کی جگہ تعلق کی شکست وریخت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ (فتح الباری، ج۶، ص ۲۸۳)

۲ حضرت آدم علیہ السلام جس جنت میں مقیم تھے اور جہاں سے انھیں زمین پر اُترنے کا حکم دیا گیا وہ جنت کون سی جنت ہے "جنت الماویٰ" ہے جو بعد قیامت اہلِ ایمان کا مستقر ہے یا "جنتِ ارضی" جو اسی سرزمین میں کسی بلند پُر فضا مقام پر آدم کی حکومت کے لئے بنائی گئی تھی، جمہور علماءِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ یہ "جنت الماویٰ" ہے جس کا وعدہ آخرت میں مسلمانوں کے لئے کیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ آیات واحادیث کا ظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً

۱ قُلْنَا يَآ اٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ "ہم نے کہا اے آدم علیہ السلام تم اور تمہاری بیوی (حواء علیہا السلام) جنت میں رہو"

اس جگہ جنت کو عربی قاعدہ سے "الجنۃ" الف لام کے ساتھ ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اُسی مشہور جنت کا ذکر ہے جس کو جگہ جگہ قرآنِ عزیز میں قیامِ قیامت کے بعد مومنوں کا وطن بتایا گیا ہے ورنہ اگر کسی نئے مقام کا تذکرہ ہوتا تو پہلے اس کی حقیقت کا اظہار ہوتا پھر اس کو جانی پہچانی چیز کی طرح اِن الفاظ کے ساتھ ذکر کیا جاتا۔

۲ اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا "تم وہاں سے ایک ساتھ اترو"

ہبوط: (اُترنا) بلندی سے پستی کی طرف ہوتا ہے، اس لئے یہ جنت ارضی نہیں ہو سکتی بلکہ "جنۃ ماویٰ" ہی ہو سکتی ہے۔

۳ مسلم میں ایک طویل حدیث ہے۔ جس میں یہ جملہ موجود ہے۔

يجمع الله الناس فيقوم المؤمنون حين تزدلف لهم الجنة فيأتون ادم فيقولون يا باان استفتح لنا الجنة فيقول: وهل اخرجكم من الجنة الآ خطيئة ابيكم ـ (الحديث)

اللہ تعالیٰ لوگوں کو جمع کرے گا، پس اہلِ ایمان کھڑے ہوں گے جب جنت ان کے قریب ہو گی۔ پھر وہ آدم کے پاس آئیں گے اور کہیں گے، اے ہمارے باپ ہمارے لئے اس جنت کو کھولئے! اس پر حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے کیا تم کو جنت سے تمہارا باپ کی خطاکاری ہی نے نہیں نکالا تھا۔

اس کے برعکس علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ "جنت" دنیا، ہی کے مقامات میں سے کسی مقام پر تھی "جنۃ الماویٰ" نہ تھی، اور اپنے قول کی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام و حوا علیہا السلام کو وہاں کھانے پینے کے مکلّف بنایا اور ایک درخت کے نہ کھانے کی تکلیف دی، پھر وہاں آدم علیہ السلام خوابِ راحت میں بھی رہتے تھے اور وہاں ابلیس بھی آتا جاتا رہتا تھا، اور اُس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکا بھی دیا۔ اور پھر آدم علیہ السلام و حواء علیہا السلام اور ابلیس وہاں سے نکالے بھی گئے، تو یہ تمام وہ امور ہیں جو دنیا کے

ساتھ مخصوص ہیں اور "جنۃ الماویٰ" میں اُن کا وجود نہیں ہے، نہ وہ عالمِ تکلیف ہے اور نہ اُس میں داخلہ کے بعد اخراج ہے، یہ قول بھی بڑے بڑے علماءِ اسلام کی طرف منسوب ہے، اور اُن دورایوں کے علاوہ اس سلسلہ میں دو رائیں اور بھی ہیں اور اس طرح اس مسئلہ میں چار اقوال ہو جاتے ہیں۔

۱) یہ جنۃ الماویٰ ہے
۲) یہ جنت ارضی ہے۔
۳) یہ جنت الماویٰ اور جنۃ الارضی کے علاوہ ایک اور جنت ہے جو صرف اسی غرض سے تیار کی گئی تھی۔
۴) اس معاملہ میں توقف اور سکوت کرنا چاہیئے، اور اسے خدا کے حوالہ کر دینا چاہیئے یہ بحث بہت طویل ہے اور حافظ عمادالدین بن کثیر نے اپنی تاریخ البدایة والنهاية میں اس کو بڑے شرح وبسط سے بیان کیا ہے اور تمام اقوال کے مفصل دلائل اور نظائر کو بھی نقل کیا ہے۔[1] تفصیل دیکھنے کیلئے اس کی مراجعت کرنی چاہیئے۔

بہر حال حقیقتِ حال کا عالم تو خدا ہی ہے لیکن تمام دلائل وبراہین کے دیکھنے کے بعد ہماری رائے تو یہی ہے کہ یہ معاملہ بلاشبہ "جنۃ الماویٰ" ہی میں پیش آیا ہے اور کھانے، سونے اور شیطان کے وسوسہ ڈالنے کے لئے تمام معاملات "جنۃ الماویٰ" میں اس وقت پیش آئے ہیں جبکہ انسان ابھی تک عالمِ تکلیف میں نہیں آیا تھا۔ پس یہ جو کچھ ہوا مشیت الٰہی کی حکمتِ بالغہ کے زیرِ اثر اس لئے ہوا کہ یہ تمام تکوینی امور انسان کے زمین پر آباد ہونے اور "خلافتِ الٰہیہ" کے حقدار بننے کے لئے ضروری تھے۔ پس اگر یہی راجح قول ہے کہ اس جگہ جنت سے مراد "جنۃ الماویٰ"، ہی ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حواء علیہا السلام زمین کے کس حصہ پر اتارے گئے تو بعض ضعیف روایتوں میں ہی کہ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان کی سرزمین پر اور حضرت حواء علیہا السلام جدہ کی سرزمین پر اتارے گئے اور پھر چل کر دونوں عرفات (حجاز) کے میدان میں ایک دوسرے سے جا ملے اسی لئے اس میدانِ حج کا نام عرفات ہوا کیوں کہ دونوں نے اسی مقام پر ایک دوسرے کو پہچانا۔

لیکن قرآنِ عزیز نے اس حصہ کو نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ اس کا اظہار رشد وہدایت سے غیر متعلق تھا البتہ قلبی رجحان اور نفسیاتی برہان اس جانب توجہ دلاتے ہیں کہ آدم وحواء علیہا السلام ایک ہی جگہ اُتارے گئے ہوں گے تاکہ حق تعالیٰ حکمتِ بالغہ کے زیرِ اثر جلد ہی نسلِ انسانی کی افزائش اپنا کام کر سکے اور اس عالمِ خاکی کے وارث وکمین خدا کی زمین کو آباد کر کے انسانیت کے سب سے بڑے شرف "خلافتِ ارضی" کا پورا پورا حق ادا کر سکے۔

ظریفانہ نکتہ

جو علماء اس کے قائل ہیں کہ یہ "جنۃ الماویٰ" ہے ان پر دوسرے علماء کا یہ اعتراض ہے کہ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے (اور یہ ظاہر ہے کہ اسی کا دوسرا نام جنۃ الخلد ہے) تو حضرتِ آدم علیہ السلام سے ابلیس کا یہ کہنا کہ میں تمہیں شجرِ خلد کا پتہ بتاؤں کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

لیکن اوّل الذکر علماء ان حضرات سے جو جنتِ ارضی کے قائل ہیں پلٹ کر یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر یہ جنتِ

۱: البدایۃ والنہایۃ، جلد۱، ص۷۵ تا ۸۱۔

ارضی تھی تو اس دار فانی میں ابلیس حضرت آدم علیہ السلام سے ایسی بحث ہی کیسے کر سکتا تھا کہ دنیا اور اُس کی تمام اشیاء تو فانی ہیں مگر اس میں ایک شجر خلد بھی ہے۔ دارِ فانی میں خلود کہاں اس کو تو معمولی عقل کا انسان بھی تسلیم نہیں کر سکتا چہ جائیکہ حضرت آدم علیہ السلام ۔

جنت ارضی علماءِ طبقات الارض کی نظر میں

جو علماء اس جنت کو ''جنتِ ارضی'' بتاتے ہیں اُن میں سے علماء طبقات الارض کا یہ دعویٰ ہے کہ رُبع مسکون میں سے جس خطہ پر جنت قائم تھی وہ آج کائناتِ ارضی پر موجود نہیں ہے۔ یہ حصہ ''قارہ مُو'' کے نام سے اس دنیا میں آباد تھا مگر مختلف حوادث اور پیہم زلزلوں کے باعث بحرِ ہند میں ہزاروں سال ہوئے کہ غرق ہو گیا، اور یہ کہ جب یہ حادثہ پیش آیا تھا تو اس خطّہ پر بسنے والی انسانی آبادی تقریباً ساٹھ ملین (چھ کروڑ) کی تعداد میں ہلاک ہو گئی۔

اور بائبل کے سفر تکوین اصحاح میں اس کا مقامِ وقوع وہ بتایا گیا ہے جہاں سے دجلہ اور فرات نکلتے ہیں۔

۷ کیا حضرت آدم علیہ السلام نبی اور رسول ہیں؟

شریعتِ اسلامی میں ''نبی'' اس ہستی کو کہتے ہیں جس کو حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے چن لیا ہو اور وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوتی ہو اور ''رسول'' اس نبی کو کہا جاتا ہے جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے نئی شریعت اور نئی کتاب بھیجی گئی ہو۔

چونکہ حضرت آدم علیہ السلام دنیائے انسانی کے باپ ہیں تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ جس طرح اپنی نسل کی دنیوی سعادت و فلاح کیلئے رہنما اور ہادی تھے اسی طرح اُخروی سعادت و فلاح کیلئے پیغامبر تھے یا نہیں؟

اسکا جواب ایک ہی ہو سکتا ہے کہ وہ بلاشبہ خدا کے سچّے پیغمبر اور نبی برحق تھے اور اس مسئلہ میں اُمت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں اور اسی لئے کبھی یہ مسئلہ موضوعِ بحث نہیں بنا مگر اس مسئلہ میں اس وقت سے اہمیت پیدا ہوئی جبکہ مصر کے قریہ مشہور کے ایک شخص نے حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا اور اپنے دعوے کی دلیل میں پیش کیا کہ قرآنِ عزیز میں کسی مقام پر بھی حضرت آدم علیہ السلام کو دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح ''نبی'' نہیں کہا گیا[1]۔

اس شخص کا یہ کہنا کہ قرآنِ عزیز نے حضرتِ آدم علیہ السلام کو کسی جگہ لفظ ''نبی'' سے مخاطب نہیں کیا، لفظی اعتبار سے اگرچہ صحیح ہے لیکن حقیقتِ نبوت کے اعتبار سے بالکل غلط ہے اس لئے کہ نبوت کے جو معنی اسلامی اصطلاح میں بیان کئے گئے ہیں بغیر کسی تاویل کے اس کا اطلاق حضرتِ آدم علیہ السلام پر نظم قرآنی میں بہت سے مقامات میں موجود ہے، جگہ جگہ یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی واسطہ کے حضرت آدم علیہ السلام سے ہمکلام

---

[1] حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے ''میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! مجھے بتائیے کیا آدم علیہ السلام نبی تھے؟۔ مجھے حضور ﷺ نے فرمایا، ہاں وہ نبی تھے اور رسول بھی، انہیں اللہ رب العٰلمین سے شرف تخاطب و تکلم حاصل ہوا''۔

روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی ذر قال قلت یا رسول اللہ (ﷺ) ارایت آدم انبیا کان قال نعم نبیا رسولا یکلم اللہ قبیلا۔ (تفسیر ابن کثیر، ج ا، ص ۴ ۳ قدیم)

ہو تا رہا ہے اور اس تمام مخاطبت اور بات چیت میں امر و نہی اور حلال و حرام کے احکام دیتا رہا ہے اور ان احکام کے لئے آدم علیہ السلام کے پاس کسی کو نبی و رسول بنا کر نہیں بھیجا بلکہ براہِ راست انہی سے خطاب فرمایا گیا، پس جبکہ نبوت کی حقیقت بھی یہی ہے تو حضرتِ آدم علیہ السلام کی نبوّت کا انکار قطعاً باطل اور بے معنی ہے، نیز ان کے رسول ہونے نہ ہونے کی بحث بھی کچھ زیادہ اہم نہیں ہے اسلئے کہ جب وہ پہلے انسان ہیں تو انسانی آبادی کیلئے خدا کی وحی کے ذریعہ جو پیغامات بھی انھوں نے سُنائے وہی ان کی شریعت سمجھی جائے گی اور اسلئے وہ رسول بھی ہیں، بہر حال ان کی نبوت پر یقین رکھنے اور قلب میں اطمینان پیدا کرنے کیلئے نظم قرآنی کی وہ تمام آیات کافی و شافی دلیل ہیں جو حضرتِ آدم علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان براہِ راست گفتگو اور مکالمت و مخاطبت کی شکل میں نظر آتی ہیں۔

۸ حضرتِ آدم علیہ السلام جبکہ نبی ہیں تو اُن سے خدا کے حکم کی خلاف ورزی کے کیا معنی، نبی تو معصوم ہوتا ہے اور "عصمت" نافرمانی اور گناہ کے متضاد ہے؟

حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت پر بحث کرنے سے قبل مختصر الفاظ میں "عصمت" کے معنی اور اس کا مفہوم معلوم ہو جانا ضروری ہے تاکہ آئندہ بھی ایسے مقامات میں تَخلّلک اور ریب و شک کی گنجائش باقی نہ رہے۔

عصمتِ نبی کے معنی

خالقِ کائنات نے انسان کی تخلیق متضاد قوتوں کے ساتھ فرمائی ہے، یعنی اس کو نیک و بد دونوں قسم کی قوتیں عطا کی گئی ہیں، وہ گناہ بھی کر سکتا ہے اور نیکی بھی، وہ ارادۂ بد کا بھی حامل ہے اور ارادۂ خیر کا بھی، اور یہی اسکے انسانی شرف کا طغرائے امتیاز ہے۔

ان متضاد قوتوں کے حامل "انسان" میں سے حضرتِ حق، انسانی رشد و ہدایت، اور اصول الی اللہ کیلئے کبھی کبھی کسی شخص کو چن لیتے اور اسکو اپنا رسول، نبی اور پیغمبر بنا لیتے ہیں اور اس سلسلہ کی آخری کڑی ذاتِ اقدس ﷺ ہیں۔

اور جب یہ ہستی "نبوت" کے لئے چُن لی جاتی ہے تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ عمل و ارادہ کی زندگی میں ہر قسم کے گناہ سے پاک اور ہمہ قسم کی نافرمانیوں سے منزّہ ہو، تاکہ پیغامِ الٰہی کے منصب میں خدا کی صحیح نیابت ادا کر سکے۔ اور:۔ "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کا مصداق نہ ثابت ہو، اس طرح وہ ایک انسان اور بشر بھی ہے کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے اور اہل و عیال کی زندگی سے بھی وابستہ ہے اور وہ ہر قسم کے عملی اور ارادی گناہوں سے پاک بھی ہے کیوں کہ وہ ہر قسم کی نیکی کے لئے ہادی و مرشد اور خدا کا نائب ہے، اور اگرچہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح متضاد قوتوں کا حامل ضرور ہے لیکن عمل اور ارادہ میں اُس سے ہر قسم کی بدی کے ظہور کو ناممکن اور محال کر دیا گیا ہے تاکہ اس کا ہر ایک ارادہ، ہر ایک عمل اور ہر ایک قول غرض ہر ایک حرکت و سکون، کائنات کے لئے اسوہ اور نمونہ بن سکے، البتہ بشریت و انسانیت سے متصف ہونے کی بنا پر سہو، نسیان، اور لغزش کا امکان باقی رہتا اور کبھی کبھی عملی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے مگر فوراً ہی اُس پر متنبہ کر دیا جاتا ہے اور وہ اس

سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔

سہو اور نسیان تو اپنے مفہوم میں ظاہر ہیں مگر زلّۃ (لغزش) کیا ہے؟

تو اس کا اطلاق ایسی حقیقت پر ہوتا ہے کہ جہاں نہ عمل اور کردار میں تمرد اور سرکشی کا دخل ہو اور نہ قصد و ارادہ کے ساتھ حکم کی خلاف ورزی کا اور ساتھ ہی وہ عمل اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے قبیح، بد اور شر بھی نہ ہو بلکہ ان تمام امور کے پیش نظر وہ اپنی ذات میں اگرچہ اباحت اور جواز کا درجہ رکھتا ہو مگر کرنے والے کی ہستی کے شایانِ شان نہ ہو بلکہ اُس کے عظیم رتبہ کے سامنے سُبک اور ہلکا نظر آتا ہو، بااین ہمہ اس لئے عمل میں آگیا کہ عمل کرنے والے کی نگاہ میں اس کا اس طرح کرنا خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ تھا لیکن نبی پر چونکہ خدائے تعالیٰ کی مستقل حفاظت و نگرانی رہتی ہے اس لئے فوراً ہی اسکو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ عمل تمہاری جلالتِ قدر اور عظمتِ مرتبہ کے شایانِ شان نہیں ہے اور قطعی غیر مناسب ہے، اسی فرقِ مراتب کو عربی کی اس مثل میں ظاہر کیا گیا ہے۔

حسناتُ الا برار سیّاٰتُ المقربین

"نکوکار انسانوں کی عام خوبیاں مقربینِ بارگاہِ الٰہی کے حق میں بُرائیاں، ہوتی ہیں"

مگر اس لئے کہ ایک مقرب بارگاہِ الٰہی کو خدا کی مرضی کے سمجھنے میں بھی یہ لغزش کیوں پیش آئی سنۃ اللہ یہ ہے کہ وہ انبیاء و مرسلین (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی اس قسم کی لغزشوں پر جب ان کو متنبہ کرتا ہے تو اول نہایت سخت اور مجرمانہ عمل کی حیثیت میں اُس لغزش کا ذکر کرتا ہے مگر پھر کسی دوسرے مقام پر اُس معاملہ کی اصل حقیقت کو ظاہر کر کے "نبی و رسول" کے عمل کو لغزش ہی کی حد میں لے آتا، اور اُن کی جانب سے خود ہی معذرت کر دیتا ہے تاکہ کسی ملحد اور زندیق کو کسی بھی نبی و رسول کی جانب گناہ کے الزام لگانے کی بے جا جرأت نہ ہو سکے۔

اسی مجموعہ حقیقت کا نام "عصمت انبیاء" ہے اور یہی اسلامی عقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ ہے، یہ مسئلہ اگرچہ بحث و کاوش کے اعتبار سے بہت اہم اور معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، مگر دلائل و براہین اور بحث و نظر کے بعد مسئلہ کی حقیقت اور اس کا خلاصہ یہی ہے جو یہاں سپردِ قلم کیا گیا اور اس مقام پر اسی قدر کافی و شافی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب حضرتِ آدم علیہ السلام کے واقعہ پر غور کیجئے اور نظر ڈالئے کہ قرآنِ عزیز "سورۂ بقرہ" میں جب یہ واقعہ بیان کیا گیا تو صاف طور پر یہ واضح کر دیا گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی یہ غلطی نہ گناہ تھی اور نہ نافرمانی بلکہ معمولی قسم کی لغزش تھی۔

"فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ"

"شیطان نے ان دونوں سے لغزش کرادی"

اور اس کے بعد سورۂ "اعراف" اور "طٰہٰ" میں دو جگہ اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے "وسوسہ" سے تعبیر کیا۔

"فَوَسْوَسَ اِلَیْهِ الشَّیْطٰنُ"

"شیطان نے اُن کو پھسلا دیا"

اور "طٰہٰ" میں تیسری جگہ اس لغزش اور وسوسہ کا خود ہی سبب بیان کر کے حضرتِ آدم کو ہر قسم کے ارادی اور عملی گناہ سے پاک ظاہر کیا اور اُن کی عصمت کے مسئلہ کو زیادہ سے زیادہ محکم اور مضبوط بنا دیا۔

"وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا"

"اور بلا شبہ ہم نے آدم سے ایک اقرار لیا تھا پس وہ اس کو بھول گیا اور ہم نے اس کو پختہ ارادہ کا نہیں پایا (ہم نے اس کو اقرار کے پورا نہ کرنے میں اس کے ارادہ اور قصد کا دخل نہیں پایا)"

یہ آیات صاف طور پر واضح کرتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں کیا جس حد تک معاملہ پیش آیا اس میں بھی اُن کے قصد وارادہ سے خلاف ورزی کا مطلق کوئی دخل نہیں ہے بلکہ وہ ایک وسوسہ تھا جو لغزش کی شکل میں ان سے صادر ہو گیا اور وہ بھی نسیان اور بھول چوک کے ساتھ۔

ان تمام تصریحات کے بعد اب سورۂ طٰہٰ کی مسطورۂ ذیل آیت کا مقصد خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔

"وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى"

"اور آدم نے اپنے پروردگار کا حکم پورا نہ کیا اور وہ بہک گیا"

ہم نے اس جگہ عصیان اور غوایت کے وہ معنی نہیں لئے جو عام بول چال میں بولے جاتے ہیں یعنی "گناہ" اور "گمراہی" اور ایسا تاویل بعید یا دور از کار توجیہ کے لئے نہیں کیا گیا بلکہ لغت اور علم معانی کے عام اصول کے زیرِ نظر ہی کیا گیا ہے اس لئے کہ لغتِ عربی کی مشہور کتاب "لسان العرب" اور "اقرب الموارد" وغیرہ میں ہے "المعصیة، مصدر وقد تطلق علی الزلّة مجازاً" (معصیة مصدر ہے اور کبھی مجاز کے طور پر لغزش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) اسی طرح "غویٰ" کے معنی یہاں ضلّ یا خاب کے ہیں، پس اگر یہاں ضلّ مراد ہیں تو اس کا اُردو ترجمہ "بہک گیا" کیا جائے گا اور خاب مراد ہیں تو نقصان میں پڑ گیا فصیح تر ترجمہ ہے۔

بہر حال واقعہ سے متعلق ان تمام آیات کو اور ان آیات کو جو حضرت آدم علیہ السلام کی جلالتِ قدر، صفوت و برگزیدگی، اور خلعتِ خلافت سے سرفرازی کو ظاہر کرتی ہیں، جدا جدا کر کے نہ دیکھا جائے "جیسا کہ معترضین کا عام قاعدہ ہے اور جو اکثر قرآن فہمی میں گمراہی کا سبب بنتا ہے" اور سب کو یکجا جمع کر کے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت کا مسئلہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے اور اس میں قطعی کسی شائبہ، ریب وشک کی گنجائش نہیں ہے۔

اور بالفرض اگر عصیٰ اور غویٰ کو عام معنی میں لیا جائے تب بھی وہ اصول پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جو مسئلہ عصمت" کی حقیقت کے سلسلہ میں ابھی بیان ہو چکا ہے کہ جب نصوصِ قرآن حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت، صفوت، اور خلافت جیسے عظیم الشان مراتب کا اظہار کرتی ہیں تو اس آیت میں ان کی اس لغزش کو ان سخت الفاظ کے ساتھ اس لئے یاد کیا گیا کہ آدم علیہ السلام جیسے مقرب بارگاہِ الٰہی کے لئے کہ جس کو خود اللہ تعالیٰ کی براہِ راست ہمکلامی کا شرف حاصل ہے، یہ لغزش اور نسیان بھی اس کے مرتبہ سے نازل اور غیر موزوں ہے لہٰذا

زیادہ سے زیادہ قابلِ گرفت ہے اگر چہ ابرار و نیکو کار انسانوں کے حق میں اس قسم کی غلطی ایک معمولی بات ہی کیوں نہ ہو۔

۱۰ حضرتِ آدم علیہ السلام دنیاءِ انسانی میں پہلے انسان اور کائناتِ بشری کے پہلے ابوالبشر ہیں یا اس سے بھی پہلے اس قسم کی دنیاءِ انسانی کا وجود اس کائنات میں رہا ہے اور اس کیلئے بھی اسی طرح ایک آدم ابوالبشر کی ہستی رہی ہے؟

اس مسئلہ کے متعلق اگر چہ بعض علماءِ طبقات الارض نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ انسانی دنیا سے قبل بھی ربع مسکون پر عالم انسانی کا وجود رہا ہے اور آج سے تیس ہزار سال قبل کی اس جنس بشری کا نام تیاندرتال تھا اور اس کا موجودہ نسل انسانی سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا بلکہ وہ مستقل نسل تھی جو ہلاک ہو گئی اور اس کے بعد موجودہ نسلِ انسانی نے جنم لیا مگر ان کی یہ تحقیق تخمینی اور قیاسی ہے جو انسانی ڈھانچوں اور ان کی ہڈیوں کی تحقیق (ریسرچ) پر مبنی ہے اور کسی یقین اور علمِ حقیقی پر مبنی نہیں ہے اور قرآنِ عزیز نے ہم کو اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی، نہ کسی موقع پر اس کے بارہ میں کوئی اشارہ کیا اور نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسئلہ میں کوئی تصریح موجود ہے۔ لہٰذا ہمارے یقین اور اعتقاد کے لئے اسی قدر کافی ہے جو ہم کو قرآن کے یقینی علم اور وحی الٰہی کی صاف اور صریح اطلاع سے حاصل ہوا۔

دراصل اس قسم کے مباحثِ علمیہ کیلئے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو مسائل علمِ یقین اور مشاہدہ کی حد تک پہنچ چکے ہیں اور قرآنی علوم اور وحیِ الٰہی ان حقائق کا انکار نہیں کرتے کیونکہ قرآن عزیز مشاہدہ اور بداہت کا کبھی بھی انکار نہیں کرتا" تو ان کو بلا شبہ تسلیم کیا جائے اس لئے کہ ایسے حقائق کا انکار بیجا تعصب اور تنگ نظری کے سوا اور کچھ نہیں، اور جو مسائل ابھی تک یقین اور جزم کی اُس حد تک نہیں پہنچے جن کو مشاہدہ اور بداہت کہا جا سکے جیسا کہ مسئلہ "زیرِ بحث" تو اُن کے متعلق قرآن عزیز کے مطالب میں تاویلات نہیں کرنی چاہئیں اور خواہ مخواہ ان کو جدید تحقیقات کے سانچہ میں ڈھالنے کی سعی ہر گز جائز نہیں، بلکہ وقت کا انتظار کرنا چاہئے کہ وہ مسائل اپنی حقیقت کو اس طرح آشکارا کر دیں کہ ان کے انکار سے مشاہدہ اور بداہت کا انکار لازم آ جائے۔ اسلئے کہ یہ حقیقت ہے کہ مباحثِ علمیہ کو تو بارہا اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا ہے، مگر علوم قرآنی کو کبھی ایک مرتبہ بھی اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور جب کبھی مسائلِ علمیہ بحث و نظر کے بعد یقینیات اور مشاہدات کی حد تک پہنچے ہیں وہ ایک نقطہ بھی اُس سے آگے نہیں گئے جس کو قرآن نے پہلے سے واضح کر دیا ہے۔

البتہ اگر کسی مفسر نے ایک آیت کی ایسی تفسیر کر دی ہے جو اس مسئلہ کی اصل حقیقت کے خلاف پڑتی ہے تو بلا شبہ اسکے بیان کردہ معانی کو نظر انداز کر دینا اور آیتِ قرآن کو اصل حقیقت کے مطابق ظاہر کرنا قرآنِ عزیز کا اپنا مطالبہ ہے جو تعقل، تفکر اور تدبر کی بار بار دعوت سے ظاہر ہوتا ہے، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، اَفَلَا تَتَدَبَّرُوْنَ، اَفَلَا یَتَفَکَّرُوْنَ۔

لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ یہ بحث صرف ان ہی مسائل سے متعلق ہے۔ جو تاریخی، جغرافی اور طبعی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں اور قرآنِ عزیز نے اس حد تک ان کی طرف توجہ کی ہے جس سے

اس کے مقصد ارشاد و ہدایت کو مدد مل سکے، باقی وہ تمام مسائل جن کا تعلق ایک مسلمان کے ''مسلم'' ہونے اور عقائد و اعمال کے اعتبار سے اُس کے ''مومن'' کہلانے سے ہے۔ سوان کو قرآنِ عزیز نے جس یقین اور علم حقیقی (وحی الٰہی) کے ذریعہ بیان کر دیا ہے ان میں مطلق کسی قسم کے تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں ہے، اور نہ وہ کسی تحقیق اور ریسرچ کے محتاج، مثلاً خدا کی ہستی، آخرت کے وجود، ملائکۃ اللہ، تقدیر اور انبیاء و رسل سے متعلق ایمان و اعتقاد یا نماز و روزہ کی اصل حقیقت، حج و زکوٰۃ کے معنی و مفہوم وغیرہ یہ تمام مسائل ایک مسلمان کیلئے مطلق کسی جدید تحقیق کے محتاج نہیں ہیں بلکہ اُنکے حقائق کے متعلق نصوص نے ہم کو دوسروں سے قطعی بے نیاز کر دیا ہے اور اس کا دیا ہوا علم، علم یقین (وحی الٰہی) پر مبنی ہے جو اپنی ابدیت کے ساتھ اٹل اور غیر متبدل ہے۔

۱۱ توراۃ و انجیل (بائبل) میں اس قصہ سے متعلق جو واقعات مذکور ہیں مثلاً سانپ اور طاؤس کا قصہ یا اسی قسم کی اور باتیں جو قرآنِ عزیز اور صحیح روایاتِ حدیثی میں نہیں پائی جاتیں ان کے متعلق کیا حکم ہے؟

یہ سب اسرائیلیات کہلاتی ہیں اور بے اصل ہیں، ان کی پشت پر نہ علم یقین اور علم صحیح (وحی الٰہی) کی سند ہے اور نہ عقل و تاریخ کی شہادت، اس لئے من گھڑت اور بے سر و پا باتیں ہیں، بعض مفسرین بھی ایسی روایات کے نقل میں سہل انکاری برتتے ہیں، جس سے بہت بڑا نقصان یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام نہیں بلکہ خواص بھی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان روایات کو اسلامی روایات میں دخل ہے اور یہ بھی صحیح روایات کی طرح صحیح اور قابلِ قبول ہیں، اس لئے از بس ضروری ہے کہ تردید کے ارادہ سے علاوہ تفسیرِ قرآن میں ہرگز ان کو جگہ نہ دی جائے اور نہ صرف کتب تفسیر و حدیث بلکہ کتب سیرت کو بھی ان سے پاک رکھا جائے۔

۱۲ حضرتِ آدم علیہ السلام کے واقعہ میں مَلَك (فرشتہ) اور ''جن'' کا ذکر بھی آیا ہے، یہ دونوں خدائے تعالیٰ کی مستقل مخلوق ہیں یا صرف دو قوتوں کا نام ہے جو قوتِ ملکوتی اور قوتِ شیطانی سے موسوم ہیں؟

فرشتہ

قرآنِ عزیز اور احادیث رسول ﷺ نے جو کچھ ہم کو بتایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم ''فرشتہ'' کی نہ حقیقت تخلیقی سے واقف کئے گئے ہیں اور نہ وہ ہم کو نظر آتے ہیں، البتہ ہمارے لئے یہ یقین و اعتقاد ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ہم ان کے وجود کو تسلیم کریں اور ان کو مستقل مخلوق یقین کریں، اس لئے کہ قرآن عزیز اور احادیث صحیح نے ان میں سے بعض کے ناموں کی تصریح تک کی ہے اور جنس ملائکہ کی جن صفات کا تذکرہ فرمایا ہے وہ ان کے ایک مستقل مخلوق ہونے کی صراحت کرتی ہیں، ذیل کی آیات ان ہی حقائق کو واضح کرتی ہیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ
تو کہہ دے، جو کوئی دشمن ہو جبریل کا سو اس نے تو اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكَالَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِيْنَ ۝
جو کوئی دشمن ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ أَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ
وہ اتارتا ہے فرشتوں کو بھید دے کر اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے۔

الْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا أُولِيْٓ أَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝
سب خوبی اللہ کو ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین، جس نے ٹھیرایا فرشتوں کو پیغام لانے والا جن کے پر ہیں دو دو اور تین تین اور چار چار، بڑھا دیتا ہے وہ پیدائش میں جو چاہے بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ إِلَيْهِ
پیش ہوں گے فرشتے اور روحیں اس کے آگے۔

وَالْمَلَكُ عَلٰٓى أَرْجَائِهَا ط وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ ۝
اور فرشتے ہوں گے (قیامت کے دن) اس (آسمان) کے کناروں پر اور اٹھائیں گے عرش تیرے رب کا اپنے اوپر اس دن آٹھ (فرشتے) (الحاقہ)

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً ط قَالُوْٓا أَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا
اور جب کہا تیرے پروردگار نے فرشتوں سے میں بنانے والا ہوں زمین میں خلیفہ تو انھوں نے کہا کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس زمین میں فساد پھیلائے گا۔ (البقرۃ)

ان آیات کو غور سے پڑھنے کے بعد خود انصاف کیجئے کہ جن ملحدوں نے فرشتوں کے مستقل مخلوق ہونے سے انکار کیا ہے ان کی باطل تاویلات اور قرآنِ عزیز میں معنوی تحریفات کس حد تک قابلِ قبول بلکہ لائق ذکر ہیں۔

قرآنِ عزیز میں مَلَک اور ملائکہ کا ذکر ۸۶ آیات میں ۸۸ مرتبہ آیا ہے جو ذیل کی جدول سے ظاہر ہے:۔

نمبر سورۃ	سورۃ	تعدادِ آیات
۲	البقرہ	،۱۶۱،۱۰۲،۹۸،۳۴،۳۱،۳۰ ۲۸۵،۲۴۸،۲۱۰،۱۷۷
۳	ال عمران	۱۸، ۳۹، ۴۲، ۴۵، ۸۰، ۱۲۵،۱۲۴،۸۷
۴	النساء	۱۷۲،۱۶۶،۱۳۶،۹۷
۶	الانعام	۸،۶،۵۰،۹۳،۱۱۱،۱۹۸
۷	الاعراف	۲۰،۱۱
۸	الانفال	۵۰،۱۲،۹
۱۱	ہود	۳۱،۱۲
۱۲	یوسف	۳۱
۱۳	الرعد	۲۳،۱۳
۱۵	الحجر	۳۰،۲۸،۸،۷
۱۶	النحل	،۴۹،۳۳،۳۲،۲۸،۲
۱۷	الاسراء	۹۵،۹۲،۶۱،۴۰
۱۸	الکہف	۵۰
۲۰	طٰہٰ	۱۱۶
۲۱	الانبیاء	۱،۳
۲۲	الحج	۷۵
۲۳	المومنون	۲۴
۲۵	الفرقان	۲۵،۲۲،۲۱
۳۲	السجدہ	۱۱
۳۳	الاحزاب	۵۶،۴،۳
۳۴	سباء	۴۰
۳۵	فاطر	۱
۳۷	الصافات	۱۴۹
۳۸	صٓ	۷۳،۷۱
۳۹	الزمر	۷۵
۴۱	فصلت	۱۴
۴۲	الشوریٰ	۵
۴۰	الزخرف	۶۰،۵۳،۱۹
۴۷	محمدؐ	۲۷
۵۳	النجم	۲۷،۲۶
۶۶	التحریم	۶۴
۶۹	الحاقہ	۱۷
۷۰	المعراج	۴
۷۴	المدثر	۳۱
۷۸	النباء	۳۸
۷۹	الفجر	۲۲
۸۷	القدر	۴

نیز احادیثِ صحیحہ اور قدیم آسمانی کتابوں توراۃ، زبور، انجیل وغیرہ میں بھی فرشتوں کا تذکرہ موجود ہے اور ان کو مستقل مخلوق ہی بتایا گیا ہے، خصوصاً بخاری اور مسلم کی روایات میں بکثرت اس کی شہادتیں موجود ہیں۔

جن

اسی طرح "جن" بھی خدائے تعالیٰ کی مستقل مخلوق ہے جس کی حقیقتِ تخلیق سے ہم پوری طرح آگاہ نہیں ہیں اور نہ عام انسانی آبادی کی طرح وہ ہم کو نظر آتے ہیں لیکن قرآنِ عزیز نے جو تصریحات اس مخلوق کے متعلق کی ہیں وہ ہمارے لئے ضروری قرار دیتی ہیں کہ ہم یہ اعتقاد اور یقین رکھیں کہ وہ بھی انسان کی طرح مستقل مخلوق ہیں اور اسی کی طرح شریعت کے مکلّف بھی، ان میں توالد و تناسل کا بھی سلسلہ ہے اور اُن میں نیک و بد بھی ہیں۔

قرآنِ عزیز کی یہ آیات ان ہی حقائق کو واضح اور ظاہر کرتی ہیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝

اور نہیں پیدا کیا ہم نے جن اور انسان کو مگر تا کہ وہ عبادت گذار ہوں۔ (الذاریات)

قُلْ أُوْحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝ يَهْدِيْٓ إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ أَحَدًا ۝

اور اے پیغمبر سب لوگوں کو جتادو کہ میرے پاس خدا کی طرف سے اس بات کی وحی آئی ہے کہ جنات میں سے چند شخصوں نے مجھے قرآن پڑھتے سنا اور اُس نے پیچھے اپنے لوگوں سے جا کر کہا کہ ہم نے عجیب طرح کا قرآن سنا جو نیک راہ دکھاتا ہے سو ہم اُس پر ایمان لے آئے اور ہم تو کسی کو اپنے پروردگار کا شریک ٹھہرائیں گے نہیں۔ (جن)

وَأَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقَاسِطُوْنَ ۝

اور بلا شبہ کچھ ہم میں سے فرماں بردار ہیں اور کچھ بے انصاف۔

إِنَّهٗ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ

بیشک وہ (شیطان) اور اس کی ذریات تم کو اُدھر سے دیکھتے رہتے ہیں جدھر سے تم اُن کو نہیں دیکھتے۔

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهٖ

اور تھا (ابلیس) جنات میں سے پس نافرمانی کی اس نے اپنے رب کی۔

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان بھی "جن" ہی کی نسل میں سے ہے اور ابلیس (شیطان) نے خدائے تعالیٰ کے سامنے خود یہ اقرار کیا کہ اس کی تخلیق نار (آگ) سے ہوئی ہے،

مسطورۂ بالا آیات کے علاوہ لفظ جن، جان اور جنۃ بتیس مرتبہ قرآنِ حکیم کی اکتیس آیات میں مذکور ہوئے ہیں، جو ذیل کی جدول سے ظاہر ہیں۔

نمبر سورۃ	سورۃ	تعدادِ آیات
۶	الانعام	۱۰۰، ۱۱۲، ۱۲۸، ۱۳۰
۷	الاعراف	۳۸، ۱۹۷
۱۱	ھود	۱۱۹
۱۵	الحجر	۲۷
۱۷	الاسراء	۸۸
۱۸	الکہف	۵۰
۲۷	النمل	۱۷، ۳۹
۳۲	السجدہ	۱۳
۳۴	السباء	۱۲، ۱۴، ۴۱
۳۷	الصافات	۱۵۸
۴۱	فصلت	۲۵، ۲۶
۴۶	الاحقاف	۱۸، ۲۹
۵۱	الذاریات	۵۶
۵۵	الرحمن	۱۵، ۲۳، ۳۹، ۵۶، ۷۴
۷۲	الجن	۱، ۵، ۶
۱۱۴	الناس	۶

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآنِ عزیز اور نبی معصوم ﷺ نے ہم کو یہ اطلاع دی ہے کہ "ملائکہ" اور "جن" اگرچہ ہماری ان نگاہوں سے پوشیدہ ہیں لیکن بلاشبہ وہ مستقل مخلوق ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ مشاہدہ میں تو غلطی کا امکان بھی ہے اور بارہا ہوتا رہتا ہے لیکن "وحی الٰہی" اور "نبی معصوم" کی اطلاع میں غلطی کی مطلق گنجائش نہیں لہٰذا ہمارا ایمان ہے کہ وہ خدا کی مستقل مخلوق ہیں، اس کے علاوہ عقلی اعتبار سے بھی ان کا مستقل مخلوق ہونا ناممکن نہیں ہے بلکہ امکانِ عقلی کے دائرہ میں ہے۔

پس جو چیز عقل کے نزدیک ناممکن نہ ہو اور نقل یعنی "وحی الٰہی" اس کا یقین دلاتی ہو تو اس کا انکار "علم" اور "حقیقت" کا انکار ہے، اور تنگ نظری اور ہٹ دھرمی کی زندہ مثال، رہا یہ امر کہ وہ ہمارے مشاہدات و محسوسات سے باہر ہیں اور ہم ان کو نہیں دیکھتے تو یہ بھی انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی اس لئے کہ آج کی دوربینوں اور سائنس کے آلات سے پہلے ہزاروں برس تک ہم کو وہ بہت سی اشیاء محسوس نہیں ہوتی تھیں اور نہ آنکھیں اُن کو دیکھ سکتی تھیں جن کا وجود اُس وقت بھی موجود تھا مگر آج وہ نظر بھی آتی ہیں اور محسوس بھی ہوتی ہیں تو کیا ہزاروں سال پہلے جن لوگوں نے اُن کے وجود کا انکار کیا وہ حقیقی علم پر مبنی تھا یا کوتاہیِ علم اور ذرائع معلومات و تحقیقات سے ناواقفیت کا نتیجہ، اسی طرح ہم آج بھی بجلی، مقناطیس اور روشنی کی صحیح حقیقت سے ناآشنا ہیں اور انکو صرف ان کے اثار و علامات ہی سے پہچانتے ہیں۔

اسی طرح مادّیین اور ملاحدہ کا انکار کسی علم اور یقین پر مبنی نہیں ہے بلکہ محسوسات و مشاہدات میں نہ آنے کی بنا پر "عدمِ علم" کی وجہ سے ہے جو کسی طرح عدمِ وجود کی دلیل نہیں بن سکتا، نیز علم دو ہی طرح حاصل ہو سکتا ہے، ایک علوم و فنون کے ذریعہ جو کسب و اکتساب کا محتاج ہے اور دوسرے موہبت اور عطیۂ الٰہی کی راہ سے اور اس کا سب سے بلند درجہ وحیِ الٰہی ہے، پس اگر کوئی شے علوم و فنون کی راہ سے ہم نہ معلوم کر سکیں مگر عقل اُس کے وجود کو ناممکن نہ سمجھتی ہو اور "وحیِ الٰہی" اس کے وجود کا اعلان کرتی ہے تو ہر ذی ہوش اور ذی عقل کا فرض ہے کہ وہ علوم و فنون کی درماندگی کے اعتراف کے ساتھ اس کو تسلیم کرے، البتہ اگر اُس کو اس اطلاع کے وحی الٰہی ہونے ہی میں انکار ہو یا وہ سر تا سر وحی الٰہی کا ہی منکر ہو تو اب اُس کے لئے اس اطلاع پر ایمان لانے سے قبل ان دلائل کا مطالعہ ضروری ہے جو اس سلسلہ میں قرآنِ عزیز نے بیان کئے ہیں، اور جن میں بتایا گیا ہے کہ وہ

بلاشبہ "کلام اللہ" اور "وحی الٰہی" ہے۔

قصۂ آدم علیہ السلام میں چند اہم عبرتیں

یوں تو حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں بے شمار پند و نصائح، اور مسائل، کا ذخیرہ موجود ہے اور اُن کا احاطہ اس مقام پر ناممکن تاہم چند اہم عبرتوں کی جانب اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے بھید بے شمار اور ان گنت ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی ہستی بھی خواہ وہ کتنی ہی مقربین بارگاہِ الٰہی میں سے کیوں نہ ہو، ان تمام بھیدوں پر واقف ہو جائے اسی لئے ملائکۃ اللہ انتہائی مقرب ہونے کے باوجود خلافتِ آدم علیہ السلام کی حکمت سے آشنا نہ ہو سکے اور جب تک معاملہ کی پوری حقیقت سامنے نہ آگئی وہ حیرت ہی میں غرق رہے۔

۲ اللہ تعالیٰ کی عنایت و توجہ اگر کسی حقیر شے کی جانب بھی ہو جائے تو وہ بڑے سے بڑے مرتبہ اور جلیل القدر منصب پر فائز ہو سکتی اور خلعتِ شرف و مجد سے نوازی جا سکتی ہے۔

ایک مشتِ خاک کو دیکھئے اور پھر "خلیفۃ اللہ" کے منصب پر نظر ڈالئے اور پھر اس کے منصب نبوت و رسالت کو ملاحظہ فرمایئے، مگر اس کی توجہ کا فیضان بخت و اتفاق کی بدولت یا خالی از حکمت نہیں ہوتا بلکہ اُس شے کی استعداد کے مناسب بے نظیر حکمتوں اور مصلحتوں کے نظام سے منظم ہوتا ہے۔

۳ انسان کو اگرچہ ہمہ قسم کا شرف عطا ہوا اور ہر طرح کی جلالت و بزرگی نصیب ہوئی، تاہم اس کی خلقی اور طبعی کمزوری اپنی جگہ اسی طرح قائم رہی اور بشریت و انسانیت کا وہ نقص پھر بھی باقی رہا یہی وہ چیز تھی جس نے حضرتِ آدم علیہ السلام پر بایں جلالت قدر و منصب عظیم نسیان طاری کر دیا اور وہ ابلیس کے وسوسہ سے متاثر ہو گئے۔

۴ خطاکار ہونے کے باوجود اگر انسان کا دل ندامت و توبہ کی طرف مائل ہو تو اُس کے لئے بابِ رحمت بند نہیں ہے اور اُس درگاہ تک رسائی میں ناامیدی کی تاریک گھاٹی میں پڑتی، البتہ خلوص اور صداقت شرط ہے اور جس طرح حضرتِ آدم علیہ السلام کے نسیان و لغزش کا عفو اسی دامن سے وابستہ ہے، اسی طرح ان کی تمام نسل کیلئے بھی عفو و رحمتِ عالم کا دامن وسیع ہے۔

قُلْ يَاعِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلَىٰٓ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا إِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝

کہہ دے، اے میرے وہ بندوں جو اپنے نفسوں کے بارہ میں حد سے گذر گئے ہو (گناہ کر کے نفسوں پر ظلم کیا ہے) تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ تعالیٰ سب گناہوں کو بخش دینے والا رحم کرنے والا ہے۔

۵ بارگاہِ الٰہی میں گستاخی یا بغاوت بڑی سے بڑی نیکی اور بھلائی کو بھی تباہ کر دیتی، اور ابدی ذلت و خسران کا باعث بن جاتی ہے، ابلیس کا واقعہ عبرت ناک واقعہ ہے اور اس کی ہزاروں سال کی عبادت گذاری کا جو حشر بارگاہِ الٰہی میں گستاخی اور بغاوت کی وجہ سے ہوا وہ بلاشبہ سرمایۂ صد ہزار عبرت ہے۔

فَاعْتَبِرُوْا يَاأُولِي الْأَبْصَارِ ○
پس عبرت حاصل کرو اے چشم عبرت رکھنے والو

قابیل و ہابیل

ان دونوں کا واقعہ بھی چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کا ایک حصہ ہے، اس لئے یہاں قابلِ ذکر ہے۔

قرآن عزیز نے حضرتِ آدم علیہ السلام کے ان دونوں صاحبزادوں کا نام ذکر نہیں کیا صرف ابنی ادم (آدم کے دو بیٹے) کہہ کر مجمل چھوڑ دیا ہے، البتہ توراۃ میں ان کے یہی نام بیان کئے گئے ہیں جو عنوان میں درج ہیں، ان کے واقعہ کے متعلق حافظ حدیث عماد الدین ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں سدّی سے سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ سے منقول ہے، اس کا مضمون یہ ہے،

دنیائے انسانی میں اضافہ کے لئے حضرتِ آدم علیہ السلام کا یہ دستور تھا کہ حوّاء علیہا السلام سے توام (جوڑیا) پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا عقد دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والے توام بچوں کے ساتھ کر دیا کرتے تھے، اسی دستور کے مطابق قابیل اور ہابیل کی شادی کا معاملہ پیش تھا، قابیل عمر میں بڑا تھا اور اس کی ہمشیرہ ہابیل کی ہمشیرہ سے زیادہ حسین و خوبرد تھی، اسلئے قابیل کو یہ انتہائی ناگوار تھا کہ دستور کے مطابق ہابیل کی ہمشیرہ سے اس کی شادی ہو اور ہابیل کی اسکی ہمشیرہ سے، معاملہ کو ختم کرنے کے لئے حضرتِ آدم علیہ السلام نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں اپنی اپنی قربانی حق تعالیٰ کی جناب میں پیش کریں جس کی قربانی منظور ہو جائے وہی اپنے ارادہ کے پورا کر لینے کا مستحق ہے۔

جیسا کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں قربانی (نذر) کی قبولیت کا یہ الہامی دستور تھا کہ نذر و قربانی کی چیز کسی بلند جگہ پر رکھ دی جاتی اور آسمان سے آگ نمودار ہو کر اس کو جلا دیتی تھی، اس قانون کے مطابق ہابیل نے اپنے ریوڑ میں سے ایک بہترین دنبہ خدا کی نذر کیا اور قابیل نے اپنی کھیتی کے غلہ میں سے ردی قسم کا غلہ قربانی کے لئے پیش کیا، دونوں کی حسنِ نیت اور نیتِ بد کا اندازہ اسی عمل سے ہو گیا، لہٰذا حسبِ دستور آگ نے آکر ہابیل کی نذر کو جلا دیا اور اس طرح قبولیت کا شرف اُس کے حصہ میں آیا۔

قابیل اپنی اس توہین کو کسی طرح برداشت نہ کر سکا اور اس نے غیض و غضب میں آکر ہابیل سے کہا کہ میں تجھ کو قتل کیئے بغیر نہ چھوڑوں گا تاکہ تو اپنی مراد کو نہ پہنچ سکے۔ ہابیل نے جواب دیا: میں تو کسی طرح تجھ پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا، باقی تیری جو مرضی آئے وہ کر، رہا قربانی کا معاملہ سو خدا کے یہاں تو نیک نیت ہی کی نذر قبول ہو سکتی ہے وہاں بد نیت کی نہ دھمکی کام آسکتی ہے اور نہ بے وجہ کا غم و غصہ، قابیل پر اس نصیحت کا اُلٹا اثر پڑا اور اس نے غصہ سے مشتعل ہو کر اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ا، ص ۹۳)

مگر قرآنِ عزیز میں شادی کا قصہ مذکور نہیں ہے، صرف قربانی (نذر) کا ذکر ہے، اور اس روایت سے زائد ہابیل کی نعش کے دفن کے متعلق یہ اضافہ ہے۔

قتل کے بعد قابیل حیران تھا کہ اس لغش کا کیا کرے، ابھی تک نسل آدم علیہ السلام موت سے دوچار نہیں ہوئی تھی اور اسی لئے حضرتِ آدم علیہ السلام نے مردے کے بارہ میں کوئی حکم الٰہی نہیں سنایا تھا، یکایک اس نے دیکھا کہ ایک کوّے نے زمین کرید کرید کر گڑھا کھودا، قابیل کو تنبہ ہوا کہ مجھے بھی اپنے بھائی کے لئے اسی طرح گڑھا کھودنا چاہئے اور بعض روایات میں ہے کہ کوّے نے دُوسرے مُردے کوّے کو اس گڑھے میں چھپادیا۔

قابیل نے یہ دیکھا تو اپنی ناکارہ زندگی پر بے حد افسوس کیا اور کہنے لگا کہ میں اس حیوان سے بھی گیا گذرا ہوں کہ اپنے اس جرم کو چھپانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا، ندامت سے سر جھکالیا اور پھر اسی طرح اپنے بھائی کی لغش کو سپردِ خاک کردیا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ۝ لَئِنْ بَسَطْتَ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسِطٍ يَدِيَ إِلَيْكَ لِأَقْتُلَكَ إِنِّي أَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ تَبُوءَ بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ فَتَكُونَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ وَذٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ۝ فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ فَقَتَلَهُ فَأَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُوَارِي سَوْأَةَ أَخِيهِ قَالَ يَا وَيْلَتَىٰ أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَأُوَارِيَ سَوْأَةَ أَخِي فَأَصْبَحَ مِنَ النَّادِمِينَ ۝ مِنْ أَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا ط

اور سنا اُن کو حال واقعی آدم کے دو بیٹوں کا جب نذر کی دونوں نے کچھ نذر اور مقبول ہوئی ایک کی اور نہ مقبول ہوئی دوسرے کی، کہا: میں تجھ کو مار ڈالوں گا، وہ بولا اللہ قبول کرتا ہے پرہیزگاروں سے، اگر تو ہاتھ چلادے گا، مجھ پر مارنے کو میں نہ ہاتھ چلاؤں گا تجھ پر مارنے کو، میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو پروردگار ہے سب جہان کا، میں چاہتا ہوں کہ (اس اقدام پر) تو میرا گناہ بھی حاصل کرلے، اور اپنا گناہ بھی، پھر ہو جائے تو دوزخ والوں میں سے اور یہی سزا ہے ظالموں کی، پس اسکو راضی کیا اُسکے نفس نے خون پر اپنے بھائی کے، پھر اسکو مار ڈالا۔ سو ہو گیا نقصان اُٹھانے والوں میں، پھر بھیجا اللہ نے ایک کوا جو کرید تا تھا زمین کو تاکہ اسکو دکھلادے کسطرح چھپاتا ہے لاش اپنے بھائی کی، بولا ہائے افسوس مجھ کو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس کوّے جیسا ہی ہو تاکہ چھپالیتا لاش اپنے بھائی کی، پھر لگا پچھتانے۔ اسی سبب سے لکھا ہم نے، بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغرض فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اُن سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو۔ (سورہ مائدہ رکوع ۵)

امام احمدؒ نے اپنی مُسند میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت کی ہے:۔

قال رسول اللہ ﷺ لا تقتل نفس ظلما الا کان علی ابن آدم الاول کفل دمها لانه کان اول من سن القتل ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا میں جب بھی کوئی ظلم سے قتل ہوتا ہے تو اُس کا گناہ حضرت آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے (قابیل) کی گردن پر ضرور ہوتا ہے اس لئے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ظالمانہ قتل کی ابتدا کی اور یہ ناپاک سنت جاری کی۔

دمشق کے شمال میں جبل قاسیون پر ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے جو مقتلِ ہابیل کے نام سے مشہور ہے، اور اس کے متعلق ابن عساکرؒ نے احمد بن کثیر کے تذکرہ میں انکا ایک خواب نقل کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا اور آپ ﷺ کے ساتھ ہابیل بھی تھے، ہابیل نے بقسم کہا کہ میرا مقتل یہی ہے اور آپ ﷺ نے ان کے قول کی تصدیق فرمائی بہر حال یہ خواب ہی کی باتیں ہیں اور خواب کے سچے ہونے کے باوجود بھی اُس سے کوئی شرعی یا تاریخی حکم ثابت نہیں ہو سکتا۔

مقامِ عبرت

سورۂ مائدہ کی بیان کردہ آخری آیت اور مسطورۂ بالا حدیث ہم پر یہ حقیقت آشکارا کرتی ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں ہرگز کسی گناہ کی ایجاد نہ کرنی چاہئے تاکہ وہ کل کو بدکاروں اور ظالموں کے لئے ایک نئے حربہ کا کام نہ دے، ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات میں جو شخص بھی آئندہ اس "بدعت" کا اقدام کرے گا تو بانی بدعت بھی برابر اس گناہ کا حصہ دار بنتا رہے گا اور موجد ہونے کی وجہ سے ابدی ذلت و خسراں کا مستحق ٹھہرے گا، گناہ بہر حال گناہ ہے لیکن گناہ کی ایجاد موجد کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کا وبال سر سے باندھ دیتی ہے۔ (نعوذ وباللہ من ذلک)

۲ ہابیل خدائے تعالیٰ کا مقبول بندہ تھا اور قابیل بارگاہِ الٰہی کا راندہ ہوا، اسلئے ضرورت تھی کہ ہابیل کے پاک جسم کی توہین نہ ہو، اور نسل آدم علیہ السلام کی کرامت و بزرگی قائم رکھنے کیلئے بعد مُردن "تدفین" کی سنت قائم ہو جائے اور تقاضائے انصاف تھا کہ قابیل کی اس کمینہ حرکت پر اس کو دنیا میں بھی ذلیل کیا جائے، اور اس قابل بنا دیا جائے کہ خود اس کو اپنی بے مائگی عقل و دانش اور کمینگی کا احساس ہو جائے اسلئے نہ اسکو الہام بخشا گیا اور نہ اس کمینہ حرکت کو چھپانے کے لئے عقل کی روشنی عطا کی گئی بلکہ ایک ایسے حیوان کو اسکا رہنما بنایا گیا جو عیاری و مکاری میں طاق اور دنائت طبع میں ضرب المثل ہے، اور آخر کار قابیل کو یہ کہتے ہی بنا۔

"یٰوَیْلَتٰیٓ اَعَجَزْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ"

"ہائے افسوس! کیا میں ایسا گیا گذرا ہو گیا کہ اس کوے جیسا بھی نہ بن سکا"

نوٹ..... اربابِ سیر و تاریخ کی عام روش یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر کرتے ہیں، اور حضرتِ نوح علیہ السلام کا اس کے بعد مگر ہم نے ان اختلافات کے پیشِ نظر جو حضرت ادریس

علیہ السلام سے متعلق عنقریب ذکر ہونے والے ہیں عام روش کے خلاف اُن کا تذکرہ نوح علیہ السلام کے تذکرہ کے بعد کیا ہے، تاہم جن اربابِ ذوق کو یہ گراں گذرے وہ حضرتِ آدم علیہ السلام کے تذکرہ کے بعد ادریس علیہ السلام کے تذکرہ کا مطالعہ کریں اور پھر حضرتِ نوح علیہ السلام کا۔

حضرت نوح علیہ السلام

- حضرت نوح پہلے رسول ہیں
- نسب نامہ
- قرآن عزیز میں حضرت نوح کا تذکرہ
- قوم نوح
- دعوت و تبلیغ اور قوم کی نافرمانی
- بناء سفینہ
- پسر نوح
- کوہ جودی
- طوفان نوح عام تھا یا خاص
- پسر نوح کی نسبی بحث
- ایک اخلاقی مسئلہ
- چند ضمنی مسائل

حضرتِ نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد یہ پہلے نبی ہیں جن کو "رسالت[1]" سے نوازا گیا۔ صحیح مسلم بابِ شفاعت میں حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت ہے، اس میں یہ تصریح ہے۔

یا نوح انت اول الرسل الی الارض

"اے نوح تو زمین پر سب سے پہلا رسول بنایا گیا"

ا: جس انسان پر خدا کی وحی نازل ہوتی ہے وہ نبی ہے اور جس کو جدید شریعت بھی عطا کی گئی ہو وہ رسول ہے۔

نسب نامہ

علم الانساب کے ماہرین نے حضرتِ نوح علیہ السلام کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:

نوح بن لامک بن متوشالح بن اخنوخ یا خنوح بن یارُد بن مہلئیل بن قینان بن انوش بن شیث علیہ السلام بن آدم علیہ السلام۔

اگرچہ مورخین اور تورات (سفر تکوین) نے اسی کو صحیح مانا ہے لیکن ہم کو اس کی صحت میں شک اور تردّد ہے، بلکہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ حضرتِ آدم علیہ السلام اور حضرتِ نوح علیہ السلام کے درمیان ان بیان کردہ سلسلوں سے زیادہ سلسلے ہیں، تورات میں خلقِ آدم علیہ السلام اور ولادتِ حضرت نوح علیہ السلام نیز وفاتِ آدم علیہ السلام اور ولادتِ نوح علیہ السلام کی درمیانی مدت کا جو تذکرہ ہے ہم اس کو بھی نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں، البتہ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ تورات کے عبرانی، سامی اور یونانی زبان کے نسخوں میں بہت زیادہ اختلاف ہے اور اس بحث پر علامہ شیخ رحمۃ اللہ ہندی (کیرانہ ضلع مظفر نگر) کی مشہور کتاب "اظہارِ حق" قابل مطالعہ ہے، بہر حال تورات سے منقول نقشہ حسب ذیل ہے۔

جس انسان پر اللہ تعالیٰ کی وحی نازل ہوتی ہے وہ "نبی" ہے اور جس کو جدید شریعت عطا کی گئی ہو وہ "رسول" ہے۔

نقشہ -۱

سال	عمر بوقتِ ولادتِ پسر	
۱۳۰	آدم علیہ السلام	بوقتِ ولادت شیث علیہ السلام
۱۵۰	شیث علیہ السلام	بوقتِ ولادت انوش علیہ السلام
۹۰	انوش علیہ السلام	بوقتِ ولادت قینان علیہ السلام
۷۰	قینان علیہ السلام	بوقتِ ولادت مہلئیل علیہ السلام
۶۵	مہلئیل علیہ السلام	بوقتِ ولادت یارُد علیہ السلام
۱۶۲	یارُد علیہ السلام	بوقتِ ولادت اُخنوخ علیہ السلام
۶۵	اُخنوخ علیہ السلام	بوقتِ ولادت متوشالح علیہ السلام
۱۸۷	متوشالح علیہ السلام	بوقتِ ولادت لامک علیہ السلام
۱۸۲	لامک علیہ السلام	بوقتِ ولادت نوح علیہ السلام

نقشہ -۲

مدت درمیان خلقِ آدم علیہ السلام وولادتِ نوح علیہ السلام	۱۰۵۶
عمر آدم علیہ السلام	۹۳۰
مدت درمیان وفاتِ آدم علیہ السلام وولادت نوح علیہ السلام	۱۰۲۶

آپ اگر ان دونوں نقشوں کے درمیان حسابی مطابقت کرنا چاہیں تو کامیاب نہ ہو سکیں گے اس لئے کہ سطور بالا سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ یہ سب تخمین و ظن پر مبنی ہے اور اسی وجہ سے اس مسئلہ میں توراۃ کے مختلف نسخوں میں بھی کافی اختلاف و انتشار پایا جاتا ہے۔

قرآن عزیز میں حضرتِ نوح علیہ السلام کا تذکرہ

قرآنِ عزیز کے معجز نما نظم کلام کی یہ سنت ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں سے جب کسی واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اپنے مقصد "وعظ و تذکیر" کے پیش نظر واقعہ کی اُن ہی جزئیات کو نقل کرتا ہے جو مقصد کے لئے ضروری ہیں اور اجمال و تفصیل اور تکرارِ واقعہ میں بھی صرف ایک ہی مقصد اس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ یہی "موعظت و عبرت" کا مقصد ہے، چنانچہ اسی اسلوبِ بیان کے مطابق قرآنِ عزیز نے حضرتِ نوح علیہ السلام کے واقعہ کا اجمالی و تفصیلی ذکر تینتالیس جگہ کیا ہے، جس ثبوت مسطورۂ ذیل جدول سے ہوتا ہے:

سورۃ	آیۃ	سورۃ	آیۃ	سورۃ	آیۃ
ال عمران	۳۳	التوبہ	۷۰	الاسراء	۳،۱۷
النساء	۱۶۳	یونس	۷۱	مریم	۵۸
انعام	۸۴	ہود	۲۵،۳۲،۳۶،۴۲، ۴۵،۴۶،۴۸،۹۸	الانبیاء	۷۶

اعراف	۵۹،۶۹	ابراھیم	۹	الحج	۴۲
المومنون	۲۳	ص	۱۲	القمر	۹
الفرقان	۳۷	غافر	۵،۳۱	الحدید	۲۶
الشعراء	۱۰۵،۱۰۶،۱۱۶	الشوریٰ	۱۳	التحریم	۱۰
العنکبوت	۱۴	ق	۱۲	نوح	۱،۲۱،۲۶
الاحزاب	۷۰	الذاریات	۴۶		
الصافات	۷۵،۷۹	النجم	۵۲		

لیکن اس واقعہ کی اہم تفصیلات صرف سورۂ اعراف، ہود، مومنون، شعراء، قمر، اور سورۂ نوح ہی میں بیان ہوئی ہیں، ان سے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے متعلق جس قسم کی تاریخ بنتی ہے وہی ہمارا موضوعِ بیان ہے۔

قومِ نوح علیہ السلام

حضرتِ نوح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے تمام قوم خدا کی توحید اور صحیح مذہبی روشنی سے یکسر نا آشنا ہو چکی تھی اور حقیقی خدا کی جگہ خود ساختہ بتوں نے لے لی تھی، غیر اللہ کی پرستش اور اصنام پرستی ان کا شعار تھا۔

دعوت و تبلیغ اور قوم کی نافرمانی

آخر سنت اللہ کے مطابق ان کے رشد و ہدایت کیلئے بھی ان ہی میں سے ایک ہادی اور خدا کے سچے رسول نوح علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا۔

حضرتِ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو راہِ حق کی طرف پکارا اور سچے مذہب کی دعوت دی، لیکن قوم نے نہ مانا اور نفرت و حقارت کے ساتھ انکار پر اصرار کیا، امراء و رؤساءِ قوم نے اُنکی تکذیب و تحقیر کا کوئی پہلو نہ چھوڑا اور اُن کے پیروؤں نے ان ہی کی تقلید و پیروی کے ثبوت میں ہر قسم کی تذلیل و توہین کے طریقوں کو حضرتِ نوح علیہ السلام پر آزمایا، انھوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ جس کو نہ ہم پر دولت و ثروت میں برتری حاصل ہے اور نہ وہ انسانیت کے رتبہ سے بلند "فرشتہ ہیکل" ہے، اُس کو کیا حق ہے کہ وہ ہمارا پیشوا بنے، اور ہم اُس کے احکام کی تعمیل کریں؟

وہ غریب اور کمزور افرادِ قوم کو جب حضرتِ نوح علیہ السلام کا تابع اور پیرو دیکھتے تو مغرورانہ انداز میں حقارت سے کہتے "ہم ان کی طرح نہیں ہیں کہ تیرے تابع فرمان بن جائیں اور تجھ کو اپنا مقتدا مان لیں" وہ سمجھتے تھے کہ یہ کمزور اور پست لوگ نوح علیہ السلام کے اندھے مقلد ہیں، نہ یہ ذی رائے ہیں کہ ہماری طرح اپنی جانچی پرکھی رائے سے کام لیتے اور نہ ذی شعور ہیں کہ حقیقتِ حال کو سمجھ لیتے، اور اگر وہ حضرتِ نوح علیہ السلام کی بات کی طرف کبھی توجہ دیتے تو اُن سے اصرار کرتے کہ پہلے ان پست اور غریب افرادِ قوم کو اپنے پاس سے نکال دے تب ہم تیری بات سنیں گے کیوں کہ ہم کو ان سے گھن آتی ہے اور ہم اور یہ ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے۔

حضرت نوح علیہ السلام اس کا ایک ہی جواب دیتے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا کیونکہ یہ اللہ کے مخلص بندے ہیں۔ اگر میں ان کے ساتھ ایسا معاملہ کروں جس کے تم خواہش مند ہو تو خدا کے عذاب سے میرے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ میں اس کے دردناک عذاب سے ڈرتا ہوں، اُس کے یہاں اخلاص کی قدر ہے، امیر و غریب کا وہاں کوئی سوال نہیں ہے نیز ارشاد فرماتے کہ میں تمہارے پاس اللہ کی ہدایت کا پیغام لے کر آیا ہوں، نہ میں نے غیب دانی کا دعویٰ کیا ہے اور نہ فرشتہ ہونے کا، خدا کا برگزیدہ پیغمبر اور رسول ہوں اور دعوت و ارشاد میرا مقصد و نصب العین ہے، اس کو سرمایہ دار نہ بلندی، غیب دانی یا فرشتہ، ہیکل ہونے سے کیا واسطہ؟ یہ کمزور و نادار افرادِ قوم جو خدا پر سچے دل سے ایمان لائے ہیں تمہاری نگاہ میں اس لئے حقیر و ذلیل ہیں کہ وہ تمہاری طرح صاحبِ دولت و مال نہیں ہیں اور اسی لئے تمہارے خیال میں یہ نہ خیر حاصل کر سکتے ہیں اور نہ سعادت کیونکہ یہ دونوں چیزیں دولت و حشمت کے ساتھ ہیں نہ کہ نکبت و افلاس کے ساتھ۔

سو واضح رہے کہ خدا کی سعادت و خیر کا قانون ظاہری دولت و حشمت کے تابع نہیں ہے اور نہ اس کے یہاں سعادت و ہدایت کا حصول و ادراک سرمایہ کی رونق کے زیر اثر ہے بلکہ اس کے برعکس طمانیتِ نفس، رضاءِ الٰہی، غناءِ قلب اور اخلاصِ نیت و عمل پر موقوف ہے۔

حضرتِ نوح علیہ السلام نے یہ بھی بارہا تنبیہ کی کہ مجھ کو اپنی اس ابلاغِ دعوت و ارسالِ ہدایت میں نہ تمہارے مال کی خواہش ہے نہ جاہ و منصب کی۔ میں اجرت کا طلب گار نہیں ہوں، اس خدمت کا حقیقی اجر و ثواب تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، اور وہی بہترین قدردان ہے غرض سورۂ ہود حق و تبلیغ کے ان تمام مکالموں، مناظروں اور پیغاماتِ حق کے ان ہی ارشاداتِ عالیہ کا ایک غیر فانی ذخیرہ ہے۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِيْنَ ○ قَالَ يَاقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَآتَانِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ ○ وَيَاقَوْمِ لَآ أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ أَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنَّهُمْ مُلَاقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ○ وَيَاقَوْمِ مَنْ يَنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ إِنْ طَرَدْتُّهُمْ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ وَلَآ أَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ أَقُوْلُ إِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ أَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ أَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ إِنِّيْٓ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِيْنَ ○

اس پر قوم کے اُن سرداروں نے جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہا "ہم تو تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں ان میں بھی اُن لوگوں

کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں ذلیل و حقیر ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہوئے ہیں ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو" نوح علیہ السلام نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! تم نے اس بات پر بھی غور کیا اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں، اور اس نے اپنے حضور سے ایک رحمت بھی مجھے بخشدی ہو (یعنی راہِ حق دکھادی ہو) مگر وہ تمہیں دکھائی نہ دے (تو میں اسکے سوا کیا کر سکتا ہوں جو کر رہا ہوں؟) کیا ہم جبراً تمہیں راہ دکھادیں، حالانکہ تم اس سے بیزار ہو، لوگو! یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں تو اس پر مال و دولت کا تم سے طالب نہیں، میری خدمت کی مزدوری جو کچھ ہے، صرف اللہ پر ہے، اور یہ بھی سمجھ لو کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں (وہ تمہاری نظروں میں کتنے ہی ذلیل ہوں مگر) میں ایسا کرنیوالا نہیں کہ اپنے پاس سے انہیں ہنکادوں انہیں بھی اپنے پروردگار سے (ایک دن) ملنا ہے (اور وہ ہم سب کے اعمال کا حساب لینے والا ہے) لیکن (میں تمہیں سمجھاؤں تو کس طرح سمجھاؤں) میں دیکھتا ہوں کہ تم ایک جماعت ہو (حقیقت سے) جاہل اے میری قوم کے لوگو! مجھے بتاؤ، اگر میں ان لوگوں کو اپنے پاس سے نکال باہر کروں (اور اللہ کی طرف سے مواخذہ ہو جس کے نزدیک معیارِ قبولیت ایمان و عمل ہے، نہ تمہاری گھڑی ہوئی شرافت ورذالت) تو اللہ کے مقابلہ میں کون ہے جو میری مدد کریگا؟ (افسوس تم پر!) کیا تم غور نہیں کرتے؟ اور دیکھو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں، نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں، میں یہ نہیں کہتا کہ جن لوگوں کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو، اللہ انہیں بھلائی نہیں دے گا (جیسا کہ تمہارا عتقاد ہے) اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں ہے اگر میں تمہاری خواہش کے مطابق ایسا کہوں، تو جو نبی ایسی بات کہی، میں ظالموں میں سے ہو گیا!" (ھود "رکوع ۳")

بہر حال حضرت نوح علیہ السلام نے انتہائی کوشش کی کہ بد بخت قوم سمجھ جائے اور اللہ کی رحمت کی آغوش میں آجائے مگر قوم نے نہ مانا اور جس قدر اس جانب سے تبلیغ حق میں جدو جہد ہوئی اسی قدر قوم کی جانب سے بغض و عناد میں سرگرمی کا اظہار ہوا، اور ایذاء رسانی اور تکلیف دہی کے تمام وسائل کا استعمال کیا گیا اور اُن کے بڑوں نے عوام سے صاف صاف کہہ دیا کہ تم کسی طرح وَد، سواع، یغوث، یعوق، اور نسر جیسے بتوں کی پرستش کو نہ چھوڑو۔

یہی وہ مباحث ہیں جن کو سورۂ نوح میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور جو بلاشبہ ہدایت و ضلالت کے مہم و مسائل کو آشکار کرتے ہیں۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَى قَوْمِهِ أَنْ أَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ قَالَ يَاقَوْمِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ ○ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ ○ يَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○ قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ○ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا ○ وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ

وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ○ ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ○ ثُمَّ إِنِّيٓ أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ○ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ○

ہم نے بھیجا نوح ﷺ کو اُس کی قوم کی طرف کو ڈرا اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ پہنچے اُن پر عذاب دردناک، بولا اے قوم میری میں تم کو ڈر سناتا ہوں کھول کر کہ بندگی کرو اللہ کی اور اس سے ڈرو اور میرا کہا مانو تاکہ بخشے وہ تم کو جو کچھ گناہ تمہارے اور ڈھیل دے تم کو ایک مقررہ وعدہ تک، وہ جو وعدہ کیا ہے اللہ نے، جب آپہونچے گا اسکو ڈھیل نہ ہوگی۔

اگر تم کو سمجھ ہے، بولا اے رب میں بلاتا رہا اپنی قوم کو رات اور دن، پھر میرے بلانے سے اور زیادہ بھاگنے لگے، اور میں نے جب کبھی ان کو بلایا تاکہ تو ان کو بخشے، ڈالنے لگے انگلیاں اپنے کانوں میں اور لپیٹنے لگے اپنے اوپر کپڑے، اور ضد کی اور غرور کیا بڑا غرور، پھر میں نے اُن کو بلایا برملا، پھر میں نے ان کو کھول کر کہا اور چھپ کر کہا چپکے سے تو میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے رب سے، بیشک وہ ہے بخشنے والا۔ (نوح،ع:۱)

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ○

اور انھوں نے (اپنے عوام سے) کہا ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑو اور ود، سواع، یغوث یعوق اور نسر کو نہ چھوڑو۔ (نوح رکوع ۲)

اور آخر میں زچ ہوکر کہنے لگے "اے نوح ﷺ! اب ہم سے جنگ وجدل نہ کر اور ہمارے اس انکار پر اپنے اللہ کا عذاب لا سکتا ہے لے آ۔"

قَالُوا يَانُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ○

وہ کہنے لگے "نوح! تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑا کیا" اب اس کو ختم کر" اور جو تو نے ہم سے (عذاب الہیٰ کا) وعدہ کیا ہے وہ لے آ۔

حضرت نوح ﷺ نے یہ سُن کر اُن کو جواب دیا کہ عذاب الہیٰ میرے قبضہ میں نہیں ہے وہ تو اس کے قبضہ میں ہے جس نے مجھ کو رسول بنا کر بھیجا ہے، وہ چاہے گا تو یہ سب کچھ بھی ہو جائے گا۔

قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ○

نوح نے کہا ضرور اگر اللہ چاہے گا تو اس عذاب کو بھی لے آئیگا اور تم اُس کو تھکا دینے والے نہیں ہو۔

بہر حال جب قوم کی ہدایت سے حضرت نوح ﷺ بالکل مایوس ہو گئے اور اس کی باطل کوشی اور عناد اور ہٹ دھرمی اُن پر واضح ہو گئی اور قرآنی تصریح کے مطابق ساڑھے نو سو سال کی پیہم دعوت و تبلیغ کا اُن پر کوئی اثر نہ

دیکھا تو سخت ملول اور پریشان خاطر ہوئے تب اللہ تعالیٰ نے ان کی تسلی کے لئے فرمایا:۔

وَأُوْحِيَ إِلَىٰ نُوْحٍ أَنَّهٗ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ○

اور نوح پر وحی کی گئی کہ جو ایمان لے آئے وہ لے آئے اب ان میں سے کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے پس ان کی حرکات پر غم نہ کر۔

جب حضرت نوح علیہ السلام کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے ابلاغ حق میں کوتاہی نہیں ہے بلکہ خود نہ ماننے والوں کی استعداد کا قصور ہے، اور ان کو اپنی سرکشی کا نتیجہ، تب ان کے اعمال اور کمینہ حرکات سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں یہ دعا فرمائی:

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا ○ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْآ إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ○

اے پروردگار تو کافروں میں سے کسی کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑ، اگر تو ان کو یونہی چھوڑ دے گا تو یہ تیرے بندوں کو بھی گمراہ کرینگے اور اُن کی نسل بھی انہی کی طرح نافرمان پیدا ہو گی۔

بناءِ سفینہ

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ نوح علیہ السلام کی دعاء قبول فرمائی، اور اپنے قانونِ جزاءِ اعمال کے مطابق سرکشوں کی سرکشی اور متمردوں کے تمرد کے سزا کا اعلان کر دیا، اور حفظ ماتقدم کے لئے پہلے حضرتِ نوح علیہ السلام کو ہدایت فرمائی کہ وہ ایک کشتی تیار کریں، تاکہ اسبابِ ظاہری کے اعتبار سے وہ اور مومنین قانتین اس عذاب سے محفوظ رہیں۔ جو اللہ کے نافرمانوں پر نازل ہونے والا ہے۔ حضرتِ نوح علیہ السلام نے جب حکم رب میں کشتی بنائی شروع کی تو کفار نے ہنسی اُڑانا اور مذاق بنانا شروع کر دیا۔ اور جب کبھی اُن کا اُدھر سے گذر ہوتا تو کہتے کہ خوب! جب ہم غرق ہونے لگیں گے تب تو اور تیرے پیرو اس کشتی میں محفوظ رہ کر نجات پا جائیں گے، کیسا احمقانہ خیال ہے'' حضرتِ نوح علیہ السلام بھی اُنکو انجام کار سے غفلت اور خدا کی نافرمانی پر جرأت دیکھ کر اُن ہی کے طرز پر جواب دیتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْآ إِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ○

اے نوح تو ہماری حفاظت میں ہماری وحی کے مطابق سفینہ تیار کئے جا اور اب مجھ سے انکے متعلق کچھ نہ کہو۔ یہ بلاشبہ غرق ہونے والے ہیں۔ (ھود رکوع ۴)

آخر سفینۂ نوح علیہ السلام بن کر تیار ہو گیا۔ اب خدا کے وعدۂ عذاب کا وقت قریب آیا اور حضرتِ نوح

علیہ السلام نے اُس پہلی علامت کو دیکھا جس کا ذکر اُن سے کیا گیا تھا، یعنی زمین کی تہہ میں سے پانی کا چشمہ اُبلنا شروع ہو گیا۔ تب وحی الٰہی نے ان کو حکم سنایا کہ کشتی میں اپنے خاندان کو بیٹھنے کا حکم دو اور تمام جانداروں میں سے ہر ایک کا ایک جوڑا بھی کشتی میں پناہ گیر ہو، اور وہ مختصر جماعت (تقریباً چالیس نفر) بھی جو تجھ پر ایمان لاچکی ہے کشتی میں سوار ہو جائے۔

جب وحی الٰہی کی تعمیل پوری ہو گئی تو اب آسمان کو حکم ہوا کہ پانی برسانا شروع ہو، اور زمین کے چشموں کو امر کیا گیا کہ وہ پوری طرح اُبل پڑیں۔

خدا کے حکم سے جب یہ سب کچھ ہو تا رہا تو کشتی بھی اُسکی حفاظت میں پانی پر ایک مدت تک محفوظ تیرتی رہی تا آنکہ تمام منکرین و معاندین غرق آب ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کے قانون "جزاءِ اعمال" کے مطابق اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے۔

پسرِ نوح علیہ السلام

اس مقام پر ایک مسئلہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ حضرتِ نوح علیہ السلام نے طوفانی عذاب کے وقت خدائے تعالیٰ سے اپنے بیٹے کی نجات کے متعلق سفارش کی اور خدائے تعالیٰ نے ان کو اس سفارش سے روک دیا، اس مسئلہ کی اہمیت قرآنِ عزیز کی حسب ذیل آیات سے پیدا ہوتی ہے۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِيْ مِنْ أَهْلِيْ وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنْتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِيْنَ ۝ قَالَ يَانُوْحُ إِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْأَلْنِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ط إِنِّيْ أَعِظُكَ أَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَالَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْ أَكُنْ مِّنَ الْخَاسِرِيْنَ ۝ قِيْلَ يَانُوْحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰى أُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا اے پروردگار میرا بیٹا میرے اہل ہی میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو بہترین حاکموں میں سے ہے، اللہ تعالیٰ نے کہا اے نوح! یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے، یہ بد کردار ہے، پس تجھ کو ایسا سوال نہ کرنا چاہیئے جس کے بارہ میں تجھ کو علم نہ ہو، میں بلا شبہ تجھ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تو نادانوں میں سے نہ بن، نوح نے کہا "اے رب میں بلاتردد" اس بارہ میں کہ جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو تجھ سے سوال کروں، تیری پناہ چاہتا ہوں اور اگر تو نے معاف نہ کیا اور رحم نہ کیا تو میں نقصان اُٹھانے والوں میں ہوں گا۔ نوح سے کہہ دیا گیا "اے نوح! ہماری جانب سے تو اور تیرے ہمراہی ہماری سلامتی اور برکتوں کے ساتھ زمین پر اُترو۔" (ہود رکوع ۴)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام سے اللہ کا وعدہ تھا کہ وہ ان کے اہل کو نجات دے

گا، اسلئے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے (کنعان) کے لئے دعا مانگی جس پر رب العالمین کی جانب سے عتاب ہوا کہ تم کو جس شئے کا علم نہ ہو اس کے متعلق اس طرز سے سوال کرنے کا حق نہیں ہے اس پر حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور خدائے تعالیٰ سے مغفرت و رحمت طلب کی اور اس کی جانب سے بھی خواہش کے مطابق جواب ملا۔

تو اب غور طلب بات یہ ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام کا سوال کس وعدہ پر مبنی تھا۔ اور آیا وہ وعدہ پورا ہوا یا نہیں اور حضرت نوح علیہ السلام کو اس وعدہ کے سمجھنے میں کس قسم کی غلط فہمی ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی تنبیہ پر انھوں نے کس طرح اصل حقیقت کو سمجھ لیا؟

اس سوال کے جواب میں حسب ذیل آیت قابلِ توجہ ہے۔

حَتّٰٓى إِذَا جَآءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ أَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ وَمَا آمَنَ مَعَهٗٓ إِلَّا قَلِيْلٌ ○

تا آنکہ جب ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا اور تنور سے پانی اُبل پڑا تو ہم نے (نوح سے) کہا کہ "ہر جاندار میں سے ایک ایک جوڑا کشتی میں اٹھالو اور اُس کے علاوہ جس پر خدا کا فرمان ناطق ہو چکا ہے "اپنے اہل کو بھی اور جو تجھ پر ایمان لائے ہیں ان کو بھی اور وہ بہت تھوڑے ہیں۔ (ہود رکوع ۴)

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ تم اپنی اس کشتی میں جو اہلِ نجات کے لئے تیار کی گئی ہے اپنے اہل کو بٹھالو لیکن تمہارا پورا کنبہ نجات یافتہ نہیں ہے بلکہ بعض ایسے بھی ہیں جن پر خدا کے عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ ۔

چونکہ حضرتِ نوح علیہ السلام اپنی بیوی کے سابقہ کافرانہ عقائد و اعمال کی بنا پر اس بات سے مایوس ہو چکے تھے وہ خدائے برحق پر ایمان لائے اور توحید کی آواز پر لبیک کہے!

اس لئے اس استثناء کا مصداق صرف اُسی کو سمجھے اور بیٹے کی محبت میں یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ نو عمر ہے شاید کشتی میں مومنین کی صحبت سے فائدہ اٹھا کر ایمان لے آئے اور کافروں کی مجالس کے اثرات کو محو کر دے، خدائے تعالیٰ کے ارشاد وَاَهْلَكَ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے درگاہِ الٰہی میں کنعان کی نجات کی دُعا کی، مگر اللہ تعالیٰ کو اپنے جلیل القدر پیغمبر کا یہ "قیاس" پسند نہ آیا اور اُن کو تنبیہ کی کہ جو ہستی خدا کی "وحی" سے ہر وقت مستفیض ہوتی رہتی ہو اس کو جذبہ محبت پدری میں اس قدر سرشار نہ ہو جانا چاہیے کہ "وحی الٰہی" کا انتظار کئے بغیر خود ہی قیاس آرائی کر کے انجام تک کا فیصلہ کر بیٹھے؟ حالانکہ وعدۂ نجات صرف مومنین کیلئے مخصوص ہے اور کنعان کافروں کے ساتھ کافر ہی رہے گا، بلاشبہ تمہارا اس قسم کا سوال منصبِ رسالت و نبوت کے شایانِ شان نہیں ہے۔

گویا حضرتِ نوح علیہ السلام سے خدائے تعالیٰ کا یہ خطاب دراصل عتاب نہیں تھا بلکہ مشاہدۂ حقیقت کے لئے ایک پکار تھی جس کو انھوں نے سُنا اور اپنی بشریت و عبدیت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ مغفرت کے طالب ہوئے اور خدا کی سلامتی اور برکت حاصل کر کے شادکام و بامُراد بنے، پس یہ سوال نہ معصیت کا سوال تھا اور نہ

عصمتِ انبیاء کے منافی،اسلئے خطاب الٰہی نے اس کو "نادانی" سے تعبیر کیانہ کہ گناہ اور نافرمانی سے۔

بہر حال حضرتِ نوح علیہ السلام کے سامنے یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ وعدۂ نجات کا منشاء نسل و خاندان نہیں ہے "بلکہ "ایمان باللہ" ہے،اس لئے انھوں نے اپنا رُخ بدل کر کنعان کو مخاطب کیا اور اپنا منصب دعوت ادا کرتے ہوئے چاہا کہ وہ بھی "مومن" بن کر نجاتِ الٰہی" سے بہرہ ور ہو، مگر اس بدبخت نے جواب دیا۔

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَاۗءِ

کہا: میں بہت جلد کسی پہاڑ کی پناہ لیتا ہوں کہ وہ مجھ کو غرقابی سے بچالے گا۔ (ھود، رکوع ۴)

حضرتِ نوح علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا:

قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ○

آج کوئی خدا کے حکم سے بچانے والا نہیں ہے صرف وہی بچے گا جس پر خدا کا رحم ہو جائے،اس درمیان میں ان دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی اور وہ غرق ہونیوالوں میں سے ایک ہو گیا۔

کوہِ جودی

غرض جب حکم الٰہی سے عذاب ختم ہوا تو سفینہ نوح "جودی" پر جا کر ٹھہر گیا۔

وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○

اور حکم پورا ہوا اور کشتی جودی پر جا ٹھہری اور اعلان کر دیا گیا کہ قوم ظالمین کے لئے بلاکت ہے۔

توراۃ میں جودی کو اراراط کے پہاڑوں میں سے بتایا گیا ہے،اراراط درحقیقت جزیرہ کا نام ہے یعنی اس علاقہ کا نام جو فرات و دجلہ کے درمیان دیارِ بکر سے بغداد تک مسلسل چلا گیا ہے۔

پانی آہستہ آہستہ خشک ہونا شروع ہو گیا اور ساکنانِ کشتی نے دوسری بار امن و سلامتی کے ساتھ خدا کی سرزمین پر قدم رکھا،اسی بنا پر حضرتِ نوح علیہ السلام کا لقب "ابو البشرِ ثانی" یا "آدم ثانی" (یعنی انسانوں کا دوسرا باپ) مشہور ہوا،اور غالباً اسی اعتبار سے حدیث میں ان کو "اوّل الرسل" کہا گیا۔

اگرچہ یہاں پہنچ کر واقعہ کی تفصیلات ختم ہو جاتی ہیں تاہم اس اہم واقعہ میں جو علمی اور تاریخی سوالات پیدا ہوتے ہیں یا پیدا کئے گئے ہیں وہ بھی قابلِ ذکر و مذاکرہ ہیں جو ترتیب وار درج ذیل ہیں:۔

۱: طوفانِ نوح عام تھا یا خاص

کیا طوفانِ نوح تمام کرۂ ارضی پر آیا تھا یا کسی خاص خطہ پر؟

اس کے متعلق علماءِ قدیم و جدید میں ہمیشہ سے دو رائے رہی ہیں،علمائے اسلام میں سے ایک جماعت،علماءِ یہود و نصاریٰ،اور بعض ماہرین علومِ فلکیات،طبقات الارض،اور تاریخ طبیعات کی یہ رائے ہے کہ یہ طوفان تمام

کرۂ ارضی پر نہیں آیا تھا بلکہ صرف اُسی خطّہ میں محدود تھا جہاں حضرتِ نوح علیہ السلام کی قوم آباد تھی اور یہ علاقہ مساحت کے اعتبار سے ایک لاکھ چالیس ہزار کیلو میٹر مربع ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک طوفانِ نوح کے خاص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ طوفان عام تھا تو اس کے اثار کرۂ ارضی کے مختلف گوشوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر ملنے چاہئیں تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں، نیز اس زمانہ میں انسانی آبادی بہت ہی محدود تھی اور وہی خطّہ تھا جہاں حضرتِ نوح علیہ السلام اور اُن کی قوم آباد تھی، ابھی حضرتِ آدم علیہ السلام کی اولاد کا سلسلہ اس سے زیادہ وسیع نہ ہوا تھا جو کہ اس علاقہ میں آباد تھا، لہٰذا وہی مستحقِ عذاب تھے اور ان ہی پر طوفان کا یہ عذاب بھیجا گیا، باقی کرۂ زمین کو اس سے کوئی علاقہ نہ تھا۔

اور بعض علماء اسلام اور ماہرین طبقات الارض اور علماءِ طبیعات کے نزدیک یہ طوفان تمام کرۂ ارضی پر حاوی تھا اور ایک یہ ہی نہیں بلکہ ان کے خیال میں اس زمین پر متعدد ایسے طوفان آئے ہیں، ان ہی میں سے ایک یہ بھی تھا اور وہ پہلی رائے کے تسلیم کرنیوالوں کو ''آثار'' سے متعلق سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ''جزیرہ'' یا عراقِ عرب کی اس سرزمین کے علاوہ بلند پہاڑوں پر بھی ایسے حیوانات کے ڈھانچے اور ہڈیاں بکثرت پائی گئی ہیں جن کے متعلق ماہرینِ علم طبقات الارض کی یہ رائے ہے کہ یہ حیوانات مائی ہی ہیں اور صرف پانی ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں، پانی سے باہر ایک لمحہ بھی ان کی زندگی دشوار ہے، اس لئے کرۂ ارض کے مختلف پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر ان کا ثبوت اس کی دلیل ہے کہ کسی زمانہ میں پانی کا ایک ہیبت ناک طوفان آیا جس نے پہاڑوں کی اُن چوٹیوں کو بھی اپنی غرقابی سے نہ چھوڑا۔

ان ہر دو خیالات و آراء کی اُن تمام تفصیلات کے بعد جن کا مختصر خاکہ مضمون زیرِ بحث میں درج ہے اہل تحقیق کی یہ رائے ہے کہ صحیح مسلک یہی ہے کہ طوفان خاص تھا عام نہ تھا۔ اور یہ مسئلہ بھی محلِ نظر ہے کہ تمام کائناتِ انسانی صرف حضرتِ نوح علیہ السلام کی نسل سے ہے، اور آیت اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ بھی کچھ اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

البتہ قرآنِ عزیز نے ''سنت اللہ'' کے مطابق صرف ان ہی تفصیلات پر توجہ کی ہے جو موعظت و عبرت کیلئے ضروری تھے اور باقی مباحث سے قطعاً کوئی تعرض نہیں کیا اور ان کو انسانی علوم کی ترقی کے حوالہ کر دیا، وہ تو صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ تاریخ کا یہ واقعہ اہل عقل و شعور کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ آج سے ہزاروں سال قبل ایک قوم نے خدا کی نافرمانی پر اصرار کیا اور اس کے بھیجے ہوئے ہادی حضرتِ نوح علیہ السلام کے رشد و ہدایت کے پیغام کو جھٹلایا، ٹھکرایا، اور قبول کرنے سے انکار کر دیا تو خدائے تعالیٰ نے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا اور ایسے سرکشوں اور متمردوں کو طوفانِ بادوباراں میں غرق کر کے تباہ و برباد کر دیا، اور اسی حالت میں حضرتِ نوح علیہ السلام اور مختصر سی ایمان دار جماعت کو محفوظ رکھ کر نجات دی: اِنَّ فِيْ ذَالِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۔

پسرِ نوح علیہ السلام کی نسبی بحث

بعض علماء نے حضرتِ نوح علیہ السلام کے اس بیٹے کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ حقیقی بیٹا نہ تھا اور پھر اس بارہ میں

دو جداجداد عوے کئے ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ "ربیب" تھا، یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کے پہلے شوہر کا لڑکا تھا جو حضرت نوح علیہ السلام سے نکاح کے بعد ان کی آغوش میں پلا بڑھا، اور دوسری جماعت حضرت نوح علیہ السلام کی اس کافرہ بیوی پر خیانت عصمت کاالزام لگاتی ہے۔

ان علماء کو ان غیر مستند اور دور از صواب تاویلوں کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ ان کے خیال میں پیغمبر کا بیٹا کافر ہو، یہ بہت مستبعد اور عجیب معلوم ہوتا ہے۔؟

مگر تعجب ہے کہ وہ اس نص قرآنی کو کیوں فراموش کر جاتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ "آذر" بت تراش و بت پرست کافر تھے، پس اگر ایک جلیل القدر پیغمبر کے باپ کے کفر سے رسولِ خدا کی جلالت و عظمت اور منصب رسالت و نبوت میں مطلق فرق نہیں آتا تو پھر عظیم المرتبت رسول و نبی کے بیٹے کے کفر سے اس پیغمبر کی عظمت و جلالت قدر میں کیا نقص آسکتا ہے بلکہ ایک حقیقت بیں نگاہ اور حقیقت شناس کے نزدیک تو یہ رب العلمین اور خالق کائنات کی قدرتِ کاملہ کا مظہر اتم ہے کہ وہ بنجر زمین میں گلاب اگا دیتا، اور گلاب کے مہکتے ہوئے پھولوں کے ساتھ خار پیدا کردیتا ہے فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۔

پس جبکہ قرآنِ عزیز نے یہ تصریح کی ہے کہ کنعان حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا تو بلا وجہ ان رکیک اور بے سند تاویلات کی کیا حاجت؟

ایک اخلاقی مسئلہ

اس مقام پر اگر چہ علامہ عبدالوہاب نجّار نے قرآنِ عزیز کی تصریح ہی کو تسلیم کیا ہے، تاہم ان کے نزدیک حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی بصراحت قرآن اگر کافر ہو سکتی ہے تو اس پر خیانتِ عصمت کاالزام عائد کرنا بھی کوئی ناواجب بات نہیں ہے۔

مگر مجھ کو ان جیسے تمام مقامات میں ان بزرگوں سے ہمیشہ اختلاف رہتا ہے اور میں ورطہ حیرت و تعجب میں پڑ جاتا ہوں کہ ان علماء کے پیش نظر "نبی ورسول" کے معاملہ میں ان تمام نزاکتوں کا لحاظ کیوں نہیں، جو اخلاق، معاشرت، اور تہذیب و تمدن کی زندگی سے وابستہ ہیں۔

مثلاً اسی مقام کو لیجئے کہ صاحب قصص الانبیاء اور بعض دوسرے علماء کہتے ہیں کہ حضرتِ نوح علیہ السلام کی بیوی جب کافر ہو سکتی ہے تو خائن عصمت کیوں نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ دوسرا عمل پہلے سے کم درجہ رکھتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس کو تسلیم کر لینے کے باوجود کہ کفر زنا سے بہت زیادہ بُرا اور قبیح عمل ہے، مجھے اس سے سخت اختلاف ہے کہ کسی پیغمبر و نبی کی بیوی ان کے حبالۂ عقد میں رہتے ہوئے خائنِ عصمت ہو اور نبی و رسول اس کی اس حرکت سے غافل رہے، اس لئے کہ اگر کسی نیک اور صالح انسان کی بیوی شوہر سے چھپ کر اس قسم کی بد عملی میں مبتلا ہو جائے تو یہ ممکن ہے کیونکہ وہ ناواقف رہ سکتا ہے اور جب تک اس کے علم میں یہ بد عملی نہ آئے اس کی ثقاہت و تقویٰ پر کوئی حرف نہیں آتا مگر ایک نبی ورسول کا معاملہ اس سے جدا ہے، اس کے پاس صبح و شام خدائے برتر کی وحی آتی ہے اور وہ خدائے برتر کی ہمکلامی سے مشرف ہوتا ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کے گھر میں ایک فاحشہ و زانیہ اس کی رفیق حیات بھی رہے اور خدا کی وحی اس سے قطعاً خاموش ہو۔

خدا کے برگزیدہ پیغمبر جب اصلاح و ہدایت کیلئے بھیجے جاتے ہیں تو ظاہری و باطنی ہر قسم کے عیوب سے معصوم اور پاک رکھے جاتے ہیں تاکہ کوئی ایک شخص بھی اُن کے حسب ونسب اور اخلاق و معاشرت پر نکتہ چینی نہ کرسکے، لہٰذا یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وحی الٰہی اور ربِ اکبر کی ہم کلامی کے مدعی کے گھر میں بداخلاقی کا جریمہ مستقل ہو رہا ہو اور اس کو بے خبر اور غافل چھوڑ دیا جائے۔

ہمارے سامنے حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ دلیلِ راہ ہے، اُن ہوئی کو ہوئی کرنے والوں اور بے پر کی اُڑانے والوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ نبی اکرم ﷺ کے سمعِ مبارک نے بھی سُنا۔ چند روز بدبخت و خوش بخت بننے والوں کے لئے آزمائش کے بھی ملے۔ مگر آخر کار وحی الٰہی نے معاملہ کو اس طرح صاف کر دیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر رہ گیا۔

یہ ہو سکتا ہے کہ (العیاذ باللہ) پیغمبر اور نبی کی بیوی سے زنا سرزد ہو جائے کیونکہ وہ نبی کی طرح معصوم نہیں ہے لیکن یہ محال اور ناممکن ہے کہ اس ارتکاب کے بعد وہ نبی کی بیوی رہے اور وحی الٰہی نبی اور پیغمبر کو اس کی بداخلاقی سے غافل رکھے۔

کفر، بلاشبہ سب سے بڑا جریمہ اور گناہ ہے لیکن وہ معاشرتی اور اخلاقی بول چال میں بداخلاقی اور فحش نہیں ہے بلکہ ایک عقیدہ ہے جو عقیدۂ بد کہلانے کا مستحق ہے، اسلئے بعض اسلامی مصالح کی بنا پر نبی اکرم ﷺ سے قبل کی شریعتوں اور خود نبی اکرم ﷺ کی مکی زندگی میں کافر سے مناکحت کو ممنوع قرار نہیں دیا گیا البتہ مدنی زندگی کے دور میں قرآنِ عزیز کی نص نے مشرک و مسلم کے درمیان رشتہ مناکحت کو ہمیشہ کے لئے ممنوع قرار دیدیا، لیکن زنا کسی حال اور کسی وقت میں بھی جائز نہیں رکھا گیا۔

پس اس معاملہ میں کفر و زنا کے تقابل کا سوال صحیح نہیں ہو سکتا بلکہ معاشرتی بدکرداری و نیک کرداری کی بقاء و قیام کا سوال پیدا ہوتا ہے لہٰذا میرے نزدیک حضرتِ نوح علیہ السلام کی زندگی پاک کے ساتھ زانیہ رفیقہ کا تعلق ناممکن تھا۔ اگر امراۃ نوح ایک مرتبہ بھی ایسا اقدام کرتی تو وحی الٰہی فوراً نبی کو مطلع کر کے تفریق کرا دیتی، یا کم از کم ''توبۃً نصوحاً'' پر جا کر معاملہ ٹھہرتا۔ میں اس سے آگے بڑھ کر یہ جرأت کرتا ہوں کہ اگر خدانہ کردہ کسی روایت میں بھی اس قسم کے معاملات کا اشارہ پایا جاتا تو بھی ہمارا فرض تھا کہ اُس کی صحیح توجیہ تلاش کر کے اصل حقیقت کو سامنے لاتے، چہ جائیکہ نہ قرآنِ عزیز اس کے متعلق کچھ کہتا ہے اور نہ صحیح و ضعیف روایات میں سے کوئی روایتِ حدیث و سیرت اس کا ذکر کرتی ہے تو پھر خواہ مخواہ اس قسم کی دُور از کار تاویلات سے عوام و متوسطین اور موافقین و مخالفین کے دل و دماغ پر غلط نقوش نقش کرنے سے بجز مضرت و نقصان کے اور کیا حاصل ہے۔

بہر حال صحیح یہی ہے کہ کنعان حضرتِ نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا مگر اس پر حضرتِ نوح علیہ السلام کی ہدایت و رشد کی جگہ اپنی کافر والدہ کی آغوشِ تربیت اور خاندان و قوم کے ماحول نے بُرا اثر ڈالا، اور وہ نبی کا بیٹا ہونے کے باوجود کافر ہی رہا۔

پسر نوح با بداں بہ نشست خاندانِ نبوتش گم شد

نبی و پیغمبر کا کام فقط رشد و ہدایت کا پیغام پہنچانا ہے۔ اولاد، بیوی، خاندان، قبیلہ اور قوم پر اُس کو زبردستی عائد کرنا اور اُن کے قلوب کو پلٹ دینا نہیں ہے۔

لَسۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ (غاشیۃ)

توان (کافروں پر) مسلط نہیں کیا گیا۔

وما اَنۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِجَبَّارٍ (ق)

اور تو اُن کو (قبولِ حق کے لئے) مجبور نہیں کر سکتا۔

اربابِ تاریخ نے حضرتِ نوح علیہ السلام کے اس بیٹے کا نام کنعان بتایا ہے، یہ تورات کی روایت کے مطابق ہے، قرآنِ عزیز اس کے نام کی صراحت سے ساکت ہے جو نفسِ واقعہ کے لئے غیر ضروری تھا۔

چند ضمنی مسائل

۱ طوفانِ نوح علیہ السلام خاص حصۂ زمین میں سے وابستہ رہا ہو یا تمام کرۂ زمین سے، مذاہب علم کی تاریخ اور علم آثارِ ارض سے یہ قطعی ثابت ہو چکا ہے کہ یہ واقعہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے، اور اسکی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ تورات کے علاوہ قدیم ہندو مذہب کی کتابوں میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے اور اگرچہ قرآنِ عزیز کے بیان کئے ہوئے سادہ اور صاف واقعات کے مقابلہ میں ان میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم نفسِ واقعہ کے اظہار میں یہ سب متفق نظر آتی ہیں۔

مولانا سیّد ابو نصر احمد حسین بھوپالی نے اپنی کتاب "تاریخ الادب[1] الہندی" میں تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو نقل کیا ہے، جس کا عنوان ہے "برہماناداوبانیشاء" اس میں حضرتِ نوح علیہ السلام کو مانو کہا گیا ہے، جس کے معنی "خدا کا بیٹا" یا "نسلِ انسانی کا جدِ اعلیٰ" بتائے جاتے ہیں۔

۲ قرآنِ عزیز نے صراحت کی ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال تبلیغ و دعوت کا فرض انجام دیا۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِهٖ فَلَبِثَ فِیۡهِمۡ اَلۡفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا (عنکبوت ع ۲)

اور بلاشبہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی جانب رسول بنا کر بھیجا، پس وہ رہا ان میں پچاس کم ایک ہزار سال۔

یہ عمر، موجود عمرِ طبعی کے اعتبار سے بعید از عقل معلوم ہوتی ہے لیکن محال اور ناممکن نہیں ہے۔ اسلیئے کہ کائنات کی ابتداء میں ہموم و افکار اور امراض کی یہ فراوانی نہیں تھی جو چند ہزار برسوں میں انسانی تمدن کے مصنوعی سامانوں نے پیدا کر دی ہے اور تاریخ قدیم بھی یہ اقرار کرتی ہے کہ چند ہزار سال قبل کی عمرِ طبعی کا تناسب موجودہ تناسب سے بہت زیادہ تھا۔ نیز حضرت نوح علیہ السلام کی عمرِ طبعی کا معاملہ اسی قسم کی مستثنیات میں سے ہے۔ جو

---

[1] صفحہ ۳۴۔۳۵

انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں موہبتِ الٰہی اور آیۃ اللہ کی فہرست میں شمار ہوتی ہیں اور جن کی حکمت و غایت کا معاملہ خود خدائے تعالیٰ کے سپرد ہے۔

قرآن عزیز نے کسی نبی اور پیغمبر کی دعوت و تبلیغ کی مدت کا صراحت کے ساتھ اس طرح تذکرہ نہیں فرمایا جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں مذکور ہے، لہٰذا آج تقریباً سات ہزار سال قبل کی طویل عمر کے تاریخی شواہد کے اعتبار سے اگر اس کو صحیح تسلیم کیا جائے تو اس کی پوری گنجائش ہے اور اگر تاریخ کی ان شہادتوں کو غیر وقیع مان کر انکار کر دیا جائے تب بھی اس واقعہ کو مخصوص حالات کے زیر اثر ایک عطیۂ الٰہی سمجھنا چاہئے جو ایک رسول اور پیغمبر کی دعوت و تبلیغ کی حکمتوں سے وابستہ ہے، حق اور صحیح مسلک یہی ہے اور اس مدت کو گھٹانے کیلئے دور از کار تاویلات کی قطعاً ضرورت نہیں۔ مشہور شاعر ابو العلاء معری اپنے چند اشعار میں یہ بیان کرتا ہے کہ قدیم زمانہ میں یہ دستور تھا کہ لوگ سنہ، عام (سال) بول کر شہر (مہینہ) مراد لیا کرتے تھے، اس قول کے پیشِ نظر بعض مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغی خدمات کی عمر اسی سال ہوتی ہے اور ان کی کل عمر ڈیڑھ سو سال سے آگے نہیں بڑھتی۔

لیکن یہ صحیح نہیں ہے اسلئے کہ اگر ابو العلاء کا یہ قول تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ عرب کے کسی غیر معروف حساب کا تذکرہ سمجھا جائے گا۔ کیونکہ قرآنِ عزیز کے نزول کے وقت عرب کے کسی قبیلہ کے متعلق یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ "سنہ" یا "عام" بول کر "شہر" (مہینہ) مراد لیا کرتے تھے۔ لہٰذا قرآن عزیز کی بیان کردہ تعبیر پر اس قول کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

نیز سب سے زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے جس انداز میں اس مدت کا ذکر کیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کی غیر معمولی تبلیغی مدت کے اظہار کو خاص اہمیت دیتا رہتا ہے، ورنہ قرآنِ عزیز کی عام سنت یہ ہے کہ وہ سخت اہم ضرورت کے بغیر واقعات و حالات کی اس قسم کی جزئیات سے بہت ہی کم تعرض کرتا ہے۔

۳ بعض مفسرین نے اسرائیلیات (تورات و یہود کی راویات) سے یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طوفانِ نوحؑ سے چالیس سال قبل قوم کی عورتوں کو بانجھ کر دیا تھا کہ جدید نسل عالم وجود میں نہ آئے۔ مگر یہ روایت "غپ شپ" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور غالباً اسے اس لیئے گھڑا گیا ہے کہ یہ اعتراض پیدا نہ ہو کہ طوفانِ نوحؑ کی صورت میں بچوں نے کیا قصور کیا تھا کہ وہ بھی لقمۂ اجل ہو گئے۔

ان احتیاط پسند حضرات کو شاید یہ بات فراموش ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کا قانون جس کا نام "سنۃ اللہ" ہے، اس بارہ میں کیا ہے؟ ورنہ ان کو ایسی لا یعنی روایت کے بیان کی ضرورت پیش نہ آتی جو اکثر یہود کے غلط افکار و عقائد کی مخلوق ہوتی ہیں۔

کائناتِ ہست و بود میں "عادۃ اللہ" یہ جاری ہے کہ امراض، وبا، طوفان اور زلزلے جیسے امور جب بھی کسی سبب سے نمودار ہوتے ہیں۔ "خواہ وہ عذاب کیلئے ہوں یا عام حالاتِ زندگی کے اعتبار سے کسی خارجی سبب کے ذریعہ ظاہر ہوئے ہوں"۔ تو جس مقام پر وہ نازل ہوتے ہیں، وہاں کی آبادی میں نیک و بد، ولی و شیطان، زاہد و عابد،

اور فاسق و فاجر کے مابین کوئی تمیز نہیں کرتے بلکہ اسبابِ عادیہ کے زیرِ اثر مسببات کو وجود میں لانے کیلئے منجانب اللہ مامور ہیں، اور دنیوی زندگی کے اعتبار سے ان کی لپیٹ میں ہر وہ انسان آجاتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے ان اسباب کا مسبب بن گیا ہے۔

البتہ عالم آخرت کے اعتبار سے یہ امتیاز نمایاں رہتا ہے کہ فاسق و فاجر اور خدا کے دشمن کے لئے یہ اسباب عذاب الٰہی بن جاتے ہیں اور مطیع و فرماں بردار اور نیک کردار انسان کے لئے موجب سعادت اور درجاتِ عالیہ کا مستوجب ہوتے ہیں۔

کیا ہماری نگاہیں روزمرہ یہ مشاہدہ نہیں کرتیں کہ جب زلزلہ آتا ہے تو نیک و بد دونوں پر یکساں اثر کرتا ہے، وبا پھیلتی ہے تو نیک کردار و بد کردار دونوں ہی اس کی زد میں آجاتے ہیں اور دونوں کے رشتۂ حیات کیلئے وہ یکساں مہلک ثابت ہوتی ہے۔

البتہ یہ بات فراموش نہ کرنی چاہئے کہ جب کبھی اس قسم کا عذاب نبی اور پیغمبر کی پیہم نافرمانی کی وجہ سے کسی قوم پر نازل ہوتا ہے تو پیغمبر کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع دے دی جاتی ہے اور یہ حکم ہو جاتا ہے کہ وہ مع اپنے پیرؤوں کے جو اسلام کے دامن سے وابستہ ہوگئے ہیں عذاب کی اس بستی سے باہر چلا جائے، اور با نگ دُہل یہ کہہ کر جائے کہ یا قوم اس کے لائے ہوئے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے ورنہ خدا کے عذاب کو قبول کرے، اور اس طرح مومنین اُس عذاب کی زد سے محفوظ رہتے ہیں۔

بہر حال مفسرین نے جس احتیاط کی خاطر اسرائیلیات کے اس ذخیرہ سے مدد لینی چاہی ہے وہ قطعاً بے ضرورت ہے۔

پس طوفانِ نوح میں قوم نوحؑ کے مرد و عورت بوڑھے جوان، بچے اور بچیاں سب ہی طوفان کی ہلاکت خیزی کا شکار ہوئے اور دنیاء کفر کا وہ حصہ سب ہی برباد کر دیا گیا، اب یہ معاملہ اللہ کے سپرد ہے کہ جن عاقل و بالغ انسانوں نے نافرمانی کی تھی اُن کے حق میں یہ دائمی اور سرمدی عذاب بنے اور جو معصوم اور غیر عاقل تھے وہ آخرت کے عذاب سے مامون و محفوظ قرار پائیں۔

سفینۂ نوحؑ طوفان کے بعد کس مقام پر ٹھہرا؟ توراۃ نے اس کا نام اراراط بتایا ہے، حضرت نوحؑ کی دعوت و تبلیغ اُس سرزمین سے وابستہ تھی جو دجلہ اور فرات کے درمیان واقع ہے اور یہ دونوں دریا آرمینیا کے پہاڑوں سے نکلے ہیں، اور جدا جدا بہہ کر عراق کے حصہ زیریں میں آکر مل گئے ہیں، پھر خلیج فارس میں سمندر میں جا گرے ہیں، آرمینیا کے یہ پہاڑ اراراط کے علاقہ میں واقع ہیں، اسی لئے توراۃ میں ان کو اراراط کا پہاڑ کہا ہے، مگر قرآنِ عزیز نے اس پورے علاقہ کی بجائے صرف اس خاص مقام کا تذکرہ کیا ہے جہاں کشتی جا کر ٹھہری تھی، یعنی جودی کا، توراۃ کے شارحین کا یہ خیال ہے کہ جودی اُس سلسلۂ کوہ کا نام ہے جو اراراط اور جارجیا کے پہاڑی سلسلہ کو باہم ملاتا ہے، اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سکندرِ اعظم کے زمانے کی یونانی تحریرات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں، اور اس تاریخی واقعہ کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آٹھویں صدی مسیحی تک اس جگہ ایک معبد اور ہیکل موجود تھا جو "کشتی کا معبد" کہا جاتا تھا۔

۵ ایک مفسر نے حضرتِ نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان کے نجات نہ پانے کے متعلق لطیف اشارہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر اور مستجاب الدعوات تھے، انھوں نے دعاء اور بد دعاء دونوں حالتوں میں خود اپنے بیٹے کو فراموش کر دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ کافر بیٹے کی سرکشی، پاداشِ عمل کی صورت میں نمودار ہوئی اور وہ بھی ہالکین کے ساتھ غرقِ دریا ہو کر رہ گیا۔

حضرتِ نوح علیہ السلام نے جبکہ وہ قوم کو راہِ راست پر لانے سے عاجز آ گئے تھے سب سے پہلے یہ دعاء کی:۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝

اے پروردگار! تو اس زمین پر کسی بسنے والے کافر کو زندہ نہ چھوڑ اس لئے کہ اگر تو ان کو زندہ چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کرتے رہیں گے اور ان کی اولاد کا سلسلہ بھی گمراہی اور کفر ہی پر قائم رہے گا۔ (نوح رکوع ۲)

اور یہ قطعاً فراموش کر دیا کہ اس موقع پر کنعان کو مستثنیٰ کر کے اس کے لئے قبولِ ہدایت کی دعاء مانگنا چاہئے، یا شاید اُس وقت تک ان کو بیٹے کے کفر کا علم ہی نہ تھا۔

دوسری مرتبہ جنابِ باری میں یہ دعاء کی:۔

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ لِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ

اے پروردگار مجھ کو اور میرے ماں باپ کو بخش دے اور اُس شخص کو بھی بخشش سے نواز جو مومن ہو کر میرے گھر میں داخل ہوا اور مومنین و مومنات کو بھی بخش دے۔

اس موقعہ پر انھوں نے کنعان کا استثناء نہیں کیا اور یا اسکے مومن ہو کر گھر میں داخل ہونے کی دعاء نہیں فرمائی۔

تیسری مرتبہ پھر یہ دعاء کی۔

وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِيْنَ إِلَّا تَبَارًا ۝

اور ظالموں کیلئے ہلاکت کے سوا کچھ اضافہ نہ کر۔

کنعان ظالم تھا اسلئے کہ کافر تھا، موقعہ تھا کہ استثناء کر کے اُس کے لئے ظالم نہ رہنے کی دعاء بھی فرما لیتے اور اگر معلوم نہ تھا تو یہ بدقسمت بیٹے کی بدقسمتی پر ازلی مہر تھی جو ثبت ہو کر رہی۔

پس جب وقتِ قبولیتِ دعا آ پہنچا اور کنعان کی سرکشی بدستور رہی تو اب محبتِ پدری کا جوش خدا کے عادلانہ فیصلہ کے سامنے نہ ٹھہر سکا، اور اس کی نجات کی دعاء پر اپنی نادانی کے اعتراف کے ساتھ عذر خواہی کرنی پڑی، اور بایں ہمہ جلالتِ قدر خدا کے سامنے اپنی بندگی کے اظہار ہی کو بہتر سمجھ کر عبدِ کامل ہونے کا ثبوت پیش فرمایا، اور درگاہِ الٰہی سے شرفِ مغفرت اور قربتِ الٰہی کو حاصل کیا۔

اہم نتائج

۱ ہر ایک انسان اپنے کردار و عمل کا خود ہی جواب دہ ہے، اسلئے باپ کی بزرگی بیٹے کی نافرمانی کا مداوا اور علاج نہیں بن سکتی اور نہ بیٹے کی سعادت باپ کی سرکشی کا بدل ہو سکتی ہے، حضرتِ نوح علیہ السلام کی نبوت و پیغمبری کنعان کے کفر کی پاداش کے آڑے نہ آسکی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ جلالتِ قدر شرکِ آزر کیلئے نجات کا باعث نہ ہو سکی۔

كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ

ہر شخص اپنے اپنے ڈھنگ پر کام کرتا ہے۔

۲ بری صحبت زہر ہلاہل سے بھی زیادہ قاتل ہے اور اس کا ثمر و نتیجہ ذلت و خسران اور تباہی کے علاوہ کچھ نہیں ہے، انسان کے لئے جس طرح نیکی ضروری شے ہے اس سے زیادہ وہ صحبتِ نیکاں ضروری ہے، اور جس طرح بدی سے بچنا اس کی زندگی کا نمایاں امتیاز ہے اُس سے کہیں زیادہ بُروں کی صحبت سے خود کو بچانا ضروری ہے۔

پسر نوح بابداں بہ نشست خاندانِ نبوتش گم شد
سگِ اصحابِ کہف روزے چند پئے نیکاں گرفت مردم شد
صحبت صالح ترا صالح کند صحبت طالح ترا طالح کند

۳ خدائے تعالیٰ پر صحیح اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ ظاہری اسباب کا استعمال توکّل کے منافی نہیں ہے بلکہ توکّل علی اللہ کے لئے صحیح طریق کار ہے، تب ہی تو طوفانِ نوح سے بچنے کے لئے کشتی نوح ضروری ٹھہری۔

۴ انبیاء علیہم السلام سے "پیغمبر خدا اور معصوم ہونے کے باوجود" بہ تقاضائے بشریت لغزش ہو سکتی ہے مگر وہ اُس پر قائم نہیں رہتے بلکہ منجانب اللہ ان کو تنبیہ کر دی جاتی ہے اور اس سے ہٹا لیا جاتا ہے، حضرتِ آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات اس کے لئے شاہدِ عدل ہیں، نیز وہ عالم الغیب بھی نہیں ہوتے جیسا کہ اسی واقعہ میں ولا تسئلن ما لیس لک بہ علم سے واضح ہے۔

۵ اگرچہ پاداشِ عمل کا خدائی قانون کائنات کے ہر گوشہ میں اپنا کام کر رہا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جرم اور ہر طاعت کی سزا یا جزاء اسی عالم میں مل جائے۔

کیونکہ یہ کائنات، عمل کی کشت زار ہے اور پاداشِ کردار کے لئے معاد اور عالم آخرت کو مخصوص کیا گیا ہے تاہم ظلم اور غروران دو بد عملیوں کی سزا کسی نہ کسی نہج سے یہاں دنیا میں بھی ضرور ملتی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ ظالم اور متکبر اپنی موت سے قبل ہی اپنے ظلم و کبر کی کچھ نہ کچھ سزا ضرور پاتا، اور ذلت و نامرادی کا منہ دیکھتا ہے، چنانچہ خدا کے سچے پیغمبروں سے اُلجھنے والی قوموں اور تاریخ کی ظالم و مغرور ہستیوں کی عبرتناک ہلاکت و بربادی کی داستانیں اس دعوے کی بہترین دلیل ہیں۔

حضرتِ ادریس علیہ السلام

- قرآنِ عزیز میں ذکر مبارک
- نام و نسبت
- اختلافِ روایات
- نبوت
- تبلیغ و تعلیم
- فلاسفہ کے بے سند باتیں
- محاکمہ

حضرتِ ادریس علیہ السلام کا ذکر قرآن میں

قرآنِ عزیز میں حضرتِ ادریس علیہ السلام کا ذکر صرف دو جگہ آیا ہے، سورۂ مریم میں اور سورۂ انبیاء میں۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ○ وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا ○

اور یاد کر قرآن میں ادریس کو، بلاشبہ وہ تھے سچے نبی اور بلند کیا ہم نے ان کا مقام۔ (سورۂ مریم رکوع ۴)

وَإِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ ○

اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذالکفل ان میں سے ہر ایک تھا صبر کرنے والا۔ (انبیاء رکوع ۶)

نام و نسب اور زمانہ

حضرتِ ادریس علیہ السلام کے نام، نسب اور زمانہ کے متعلق مورخین کو سخت اختلاف ہے اور تمام اختلافی وجوہ کو سامنے رکھنے کے بعد بھی کوئی فیصلہ کُن یا کم از کم راجح رائے نہیں قائم کی جاسکتی، وجہ یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے تو اپنے مقصدِ رشد و ہدایت کے پیشِ نظر تاریخی بحث سے جدا ہو کر صرف ان کی نبوّت، رفعتِ مرتبت اور ان کی صفاتِ عالیہ کا ذکر کیا ہے اور اسی طرح حدیثی روایات بھی اِس سے آگے نہیں جاتیں، اسلئے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی ہے وہ اسرائیلی روایات ہیں اور وہ بھی تضاد و اختلاف سے معمور، ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کے جدِ امجد ہیں، اور اُن کا نام اخنوخ ہے اور ادریس لقب ہے یا عربی زبان میں ادریس عبرانی یا سریانی میں اُن کا نام اخنوخ ہے اور اُن کا نسب نامہ یہ ہے۔

خنوخ یا اخنوخ (ادریس) بن یارد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام ابن اسحٰق کا رجحان اسی جانب ہے اور دوسری جماعت کا خیال ہے کہ وہ انبیاءِ بنی اسرائیل میں سے ہیں اور الیاس ادریس ایک ہی ہستی کے نام اور لقب ہیں اور ان دونوں روایات کے پیشِ نظر بعض علماء نے یہ تطبیق دینے کی سعی کی ہے کہ جدِ نوح علیہ السلام کا نام اخنوخ ہے اور ادریس لقب اور بنی اسرائیل کے پیغمبر کا نام ادریس ہے اور الیاس

لقب، مگر یہ رائے بے سند اور بے دلیل ہے، بلکہ قرآنِ عزیز کا الیاس اور ادر ادریس کو جدا جدا بیان کرنا شاید اس کو متحمل نہ ہو سکے۔[1]

صحیح ابن حبان میں روایت ہے کہ حضرتِ ادریس علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنھوں نے قلم کو استعمال کیا، ایک حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے کسی نے رمل کے خطوط کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ علم ایک نبی کو دیا گیا تھا، پس اگر کسی شخص کے نقوش اس کے مطابق آجاتے ہیں تو نشانہ صحیح بیٹھ جاتا ہے ورنہ نہیں۔

حافظ عماد الدین ابنِ کثیر ان روایات کے ساتھ یہ بھی نقل فرماتے ہیں کہ بہت سے علماءِ تفسیر و احکام کا یہ خیال ہے کہ حضرتِ ادریس علیہ السلام ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے رمل کے کلمات ادا کئے[2] اور وہ ان کو "ہرمس الہرامسہ"[3] کا لقب دیتے ہیں اور ان کی جانب بہت سی غلط باتیں اسی طرح منسوب کرتے ہیں جس طرح اُن کے علاوہ بہت سے انبیاء، علماء، حکماء اور اولیاء اللہ کے متعلق منسوب کی گئی ہیں۔

معراج کی صحیحین[4] والی حدیث میں صرف اسی قدر ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرتِ ادریس علیہ السلام سے چوتھے آسمان پر ملاقات کی۔

مگر مشہور مفسر ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں ہلال بن یساف کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرتِ عبد اللہ بن عباسؓ نے کعبِ احبار سے دریافت کیا کہ حضرتِ ادریس سے متعلق اس آیت ورفعنٰہ مکانا علیاً کا کیا مطلب ہے؟ تو کعبؒ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ ادریس علیہ السلام پر ایک مرتبہ یہ وحی نازل فرمائی۔ اے ادریس! تمام اہلِ دنیا جس قدر روزانہ نیک عمل کریں گے اُن سب کے برابر میں تجھ کو ہر دن اجر عطا کروں گا۔ حضرتِ ادریس علیہ السلام نے یہ سنا تو ان کو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے اعمال میں روزافزوں اضافہ ہو، اور اس لئے عمر کا حصہ طویل ہو جائے تو اچھا ہے، انھوں نے وحیِ الٰہی اور اپنے اس خیال کو ایک رفیق فرشتہ پر ظاہر کر کے کہا کہ اس معاملہ میں فرشتۂ موت سے گفتگو کرو تاکہ مجھ کو نیک اعمال کے اضافہ کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے، اس فرشتہ نے جب یہ سنا تو حضرتِ ادریس علیہ السلام کو اپنے بازوؤں پر بٹھا کر لے اُڑا، جب یہ چوتھے آسمان سے گذر رہے تھے تو فرشتۂ موت زمین کے لئے اتر رہا تھا، وہیں دونوں کی ملاقات ہو گئی، دوست فرشتہ نے فرشتۂ موت سے حضرتِ ادریس کے معاملہ کے متعلق گفتگو کی، فرشتۂ موت نے دریافت کیا۔ ادریس ہیں کہاں؟ اُس نے کہا میری پشت پر سوار ہیں، فرشتۂ موت کہنے لگا درگاہِ الٰہی سے یہ حکم ہوا ہے کہ ادریس علیہ السلام کی روح چوتھے آسمان پر قبض کروں، اس لئے میں سخت حیرت و تعجب میں تھا

1: ان اختلافات کے مطالعہ کے بعد غالباً آپ اُس نوٹ سے اتفاق فرمائیں گے جو صفحہ ۵۸ پر درج ہے، حضرت ادریسؑ سے متعلق مزید اختلافی بحث کیلئے فتح الباری جلد ۶ ص ۲۸۸ اور البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ص ۳۶-۳۷ قابلِ مطالعہ ہیں۔

2: البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر جلد اول ص ۹۹۔

3: ہرمس علم نجوم کے ماہر عالم کو کہتے ہیں، اس لئے ہرمس الہرامسہ کے معنی یہ ہیں کہ ماہرینِ علم نجوم کا استاذِ اول، ہرمیس یونان کا ایک مشہور منجم گذرا ہے۔

4: صحیح بخاری باب الاسراء، مسلم جلد ا باب الاسراء۔

کہ یہ کیسے ممکن ہے جبکہ ادریس علیہ السلام زمین میں ہیں، اُسی وقت فرشتہ موت نے حضرت ادریس علیہ السلام کی روح قبض کرلی۔"

یہ واقعہ نقل کرکے کعب احبار نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا کی یہی تفسیر ہے، ابنِ جریرؒ کی طرح ابن ابی حاتمؒ نے اپنی تفسیر میں اسی قسم کی روایت نقل کی ہے۔

ان ہر دو نقول کو روایت کرنے کے بعد حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ سب اسرائیلی خرافات ہیں اور ان میں روایتی اعتبار سے بھی "نکارت" یعنی نا قابلِ اعتبار اچنبھا ہے، اس لئے صحیح تفسیر وہی ہے جو آیت کے ترجمہ میں بیان کی گئی۔

امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ الیاس نبی کا نام ہی ادریس علیہ السلام ہے اور اُن کے اس قول کی وجہ حضرت انسؓ کی وہ روایت ہے جو زہری نے معراج کے سلسلہ میں بیان کی ہے اس میں نبی اکرم ﷺ اور انبیاء علیہم السلام کی آسمان پر ملاقات کا جو ذکر ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جب آپ کی ملاقات حضرت ادریس علیہ السلام سے ہوئی تو انھوں نے فرمایا "مرحبا بالاخ الصّالح" (برادرِ نیک تمہارا آنا مبارک) پس اگر حضرت ادریس، اخنوخ ہوتے تو حضرتِ آدمؑ و حضرت ابراہیم کی طرح "بالابن الصالح" کہتے یعنی نیک بھائی کی جگہ "نیک بیٹے" کے ساتھ خطاب کرتے۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ دلیل کمزور ہے اس لئے کہ اوّل تو یہ امکان ہے کہ اس طویل حدیث میں راوی الفاظ کی پوری حفاظت نہ کرسکا ہو، دوم ہو سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی جلالتِ قدر اور رفعتِ مرتبت کے پیش نظر انہوں نے پدری انتساب کو نمایانہ کیا ہو اور ازراہِ تواضع برادرانہ حیثیت کو ہی ظاہر کرنا مناسب سمجھا ہو۔

رہا حضرتِ آدم علیہ السلام و حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا معاملہ سو ایک ابوالبشر ہیں اور دوسرے محمد ﷺ کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر اور رفیع الشان پیغمبر جن کے متعلق قرآنِ عزیز نے کہا ہے فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا[1] لہٰذا ان کا "ابن" کے ساتھ خطاب کرنا ہر طرح موزوں اور برمحل ہے۔

ابن کثیر نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ حضرت ادریس علیہ السلام نوح علیہ السلام سے قبل کے نبی نہیں ہیں بلکہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک نبی ہیں، اور الیاس علیہ السلام ہی ادریس علیہ السلام ہیں۔

تورات میں ان مقدس نبی کے متعلق صرف اسی قدر لکھا ہے:

"اور حنوک (اخنوخ) پینسٹھ برس کا ہوا کہ اُس سے متوشلح پیدا ہوا اور متوشلح کی پیدائش کے بعد حنوک تین سو برس خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا، اور اس سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں اور حنوک کی ساری عمر تین سو پینسٹھ برس کی ہوئیں اور حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا، اور غائب ہو گیا، اس لئے کہ خدا نے اُسے لے لیا۔ (باب پیدائش آیت ۲۱۔ ۲۴)

[1] آل عمران

حضرت ادریس علیہ السلام حکماء اور فلاسفہ کی نظر میں

علامہ جمال الدین قفطی نے تاریخ الحکماء[1] میں حضرت ادریس علیہ السلام کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے، حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق علماء تفسیر اور ارباب تاریخ وقصص نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ بہت مشہور ہے، اس لئے اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں، البتہ حکماء اور فلاسفہ نے خصوصیت کے ساتھ اُن کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ پیش کیا جاتا ہے۔

حضرتِ ادریس علیہ السلام کا مولد ومنشاء (جائے ولادت وپرورش) کہاں ہے، اور انھوں نے نبوت سے پہلے کس سے علم حاصل کیا؟ حکماء اور فلاسفہ کے اقوال ان مسائل میں مختلف ہیں۔

ایک فرقہ کی رائے ہے کہ ان کا نام ہرمس الہرامسہ ہے اور مصر کے قریہ منف میں پیدا ہوئے، یونانی ہرمس کو ارمیس کہتے ہیں، ارمیس کے معنی عطارد[2] ہیں۔

اور دوسری جماعت کا خیال ہے کہ ان کا نام یونانی میں طرمیس، عبرانی میں خنوخ اور عربی میں اخنوخ ہے، اور قرآنِ عزیز میں ان کو اللہ تعالیٰ نے ادریس کہا ہے یہی جماعت کہتی ہے کہ انکے استاذ کا نام غوثاذیمون یا اغوثاذیمون (مصری) ہے، وہ غوثاذیمون کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاتے کہ وہ یونان یا مصر کے انبیاء میں سے ایک نبی، اور یہ جماعت انکو ادرین دوم اور حضرتِ ادریس علیہ السلام کو اورین سوم کا لقب دیتی ہے، اور غوثاذیمون کے معنی "سعد اور بہت نیک بخت" ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہرمس نے مصر سے نکل کر اقطاعِ عالم کی سیر کی اور تمام دنیا کو چھان ڈالا اور جب مصر واپس ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بیاسی سال کی عمر میں اپنی جانب اٹھالیا۔

ایک تیسری جماعت یہ کہتی ہے کہ ادریس بابل میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی، اور اوائلِ عمل میں انھوں نے حضرت شیث بن آدم علیہ السلام سے علم حاصل کیا، علمِ کلام کے مشہور عالم علامہ شہرستانی کہتے ہیں کہ اغثاذیمون حضرت شیث علیہ السلام ہی کا نام ہے۔

بہرحال جب حضرت ادریس علیہ السلام سنِ شعور کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو نبوت سے سرفراز فرمایا، تب انہوں نے شریر اور مفسدوں کو راہِ ہدایت کی تبلیغ شروع کی مگر مفسدوں نے انکی ایک نہ سنی اور حضرتِ آدم وشیث کی شریعت کے مخالف ہی رہے، البتہ ایک چھوٹی سی جماعت ضرور مشرف بااسلام ہو گئی۔

حضرتِ ادریس علیہ السلام نے جب یہ رنگ دیکھا تو وہاں سے ہجرت کا ارادہ کیا اور اپنے پیرووں کو بھی ہجرت کی تلقین فرمائی، پیروانِ ادریس علیہ السلام نے جب یہ سنا تو ان کو ترکِ وطن بہت شاق گذرا اور کہنے لگے کہ بابل[3] جیسا وطن ہم کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے۔

۱: اس تاریخ کا پورا نام "المنتخبات الملتقطات من کتاب اخبار العلماء باخبار الحکما" ہے اور علامہ جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف قفطی کی تصنیف ہے اور مختصر زوزنی کے نام سے مشہور ہے۔

۲: ارمیس یا ہرمیس یونان کا ایک مشہور منجم اور ماہر فلکیات حکیم تھا اسی لئے اس کو ارمیس (عطارد) کہتے تھے، یونانی غلطی سے ادریس اور ارمیس کو ایک ہی شخص تسلیم کرتے ہیں حالانکہ یہ ایسی فاش غلطی ہے جس کیلئے کوئی دلیل نہیں ہے۔

۳: بابل کے معنی نہر کے ہیں اور چونکہ بابل دجلہ وفرات کی نہروں سے سرسبز وشاداب تھا اس لئے اس نام سے موسوم ہوا، یہ عراق کا مشہور شہر تھا جو فنا ہو گیا۔

حضرتِ ادریس علیہ السلام نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم یہ تکلیف اللہ کی راہ میں اٹھاتے ہو تو اس کی رحمت وسیع ہے وہ اس کا نعم البدل ضرور عطا کرے گی، پس ہمت نہ ہارو اور خدا کے حکم کے سامنے سر نیاز جھکادو۔

مسلمانوں کی رضا مندی کے بعد حضرت ادریس علیہ السلام اور ان کی جماعت مصر کی جانب ہجرت کر گئی۔ جماعت نے جب نیل کی روانی اور اس کی سر زمین کی شادابی دیکھی تو بہت خوش ہوئی، اور حضرتِ ادریس علیہ السلام نے یہ دیکھ کر اپنی جماعت سے فرمایا، بابلیون[1] (تمہارے بابل کی طرح شاداب مقام) اور ایک بہترین جگہ منتخب کر کے نیل کے کنارے بس گئے حضرت ادریس کے اس جملہ "بابلیون" نے ایسی شہرت پائی کہ عرب کے علاوہ قدیم اقوام اس سر زمین کو بابلیون ہی کہنے لگیں، البتہ عرب نے اس کا نام مصر بتایا اور اس کی وجہ تسمیہ یہ سنائی کہ طوفانِ نوح علیہ السلام کے بعد یہ مصر بن حام کی نسل کا مسکن و موطن بنا ہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام اور اُن کی پیرو جماعت نے جب مصر میں سکونت اختیار کر لی تو یہاں بھی انھوں نے پیغامِ الٰہی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا شروع کر دیا کہا جاتا ہے کہ اُن کے زمانہ میں بہتر زبانیں بولی جاتی تھی، اور خدائے تعالٰی کی عطاء و بخشش سے یہ وقت کی تمام زبانوں کے زباں داں تھے، اور ہر ایک جماعت کو اُسی کی زبان میں تبلیغ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت ادریس علیہ السلام نے دینِ الٰہی کے پیغام کے علاوہ سیاستِ مُدن، شہری زندگی اور بود و ماند کے متمدن طریقوں کی بھی تعلیم و تلقین کی اور اس کے لئے انھوں نے ہر ایک فرقہ و جماعت سے طلباء جمع کئے اور ان کو مدنی سیاست اور اُس کے اصول و قواعد سکھائے جب یہ طلبہ کامل و ماہر بن کر اپنے قبائل کی طرف لوٹے تو انھوں نے شہر اور بستیاں آباد کیں جن کو مدنی اصول پر بسایا، ان شہروں کی تعداد کم و بیش دو صد کے قریب تھی، جن میں سب سے چھوٹا شہر[2] رہا تھا، حضرتِ ادریس علیہ السلام نے ان طلبہ کو دوسرے علوم کی بھی تعلیم دی جس میں علمِ حکمت اور علمِ نجوم جیسے علوم بھی شامل ہیں۔

حضرت ادریس علیہ السلام پہلی ہستی ہیں جنھوں نے علمِ حکمت و نجوم کی ابتدا کی، اس لئے کہ اللہ تعالٰی نے ان کو افلاک اور اُن کی ترکیب، کواکب اور اُن کے اجتماع و افتراق کے نقاط اور اُن کے باہم کشش کے رموز و اسرار کی تعلیم دی اور اُن کو علم عدد و حساب کا عالم بنایا، اور اگر اس پیغمبر خدا کے ذریعہ ان علوم کا انکشاف نہ ہوتا تو انسانی طبائع کی وہاں تک رسائی مشکل تھی، انہوں نے مختلف گروہوں اور امتوں کیلئے ان کے مناسبِ حال قوانین قواعد مقرر فرمائے اور اقطاعِ عالم کو چار حصّوں میں منقسم کر کے ہر ربع کیلئے ایک حاکم مقرر کیا جو اس حصہ زمین کی سیاست و ملوکیت کا ذمہ دار قرار پایا، اور ان چاروں کیلئے ضروری قرار دیا کہ تمام قوانین سے مقدم شریعت کا وہ قانون رہے گا جس کی تعلیم وحی الٰہی کے ذریعے میں نے تم کو دی ہے، اس سلسلہ کے سب سے پہلے چار بادشاہوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱: بابلیون کے معنی میں مختلف اقوال ہیں، مثلاً تمہاری طرح کی نہر، مبارک نہر، مگر سب سے بہتر قول یہ ہے کہ "یون" سریانی میں تفصیل کی علامت ہے اور معنی ہیں "بڑی نہر"۔

۲: شہر صفحۂ عالم سے مٹ گیا مگر اس کے کھنڈرات باقی ہیں۔

۱) ایلاوس (بمعنی رحیم) ۲) زوس
۳) اسقلیبوس ۴) زوس امون یا ایلاوس امون یا بیسلوس

حضرت ادریس علیہ السلام کی تعلیم کا خلاصہ

خدا کی ہستی اور اسکی توحید پر ایمان لانا، صرف خالق کائنات کی پرستش کرنا، آخرت کے عذاب سے رستگاری کیلئے اعمالِ صالح کو ڈھال بنانا، دنیا سے بے التفاتی اور تمام امور میں عدل وانصاف کو پیش نظر رکھنا، اور مقررہ طریقہ پر عباداتِ الٰہی ادا کرنا، اور ایام بیض[1] کے روزے رکھنا، دشمنانِ اسلام سے جہاد کرنا، زکوۃ ادا کرنا، طہارت ونظافت سے رہنا، خصوصیت کیساتھ جنائت، کتے اور سور سے اجتناب کرنا، ہر نشہ آور شے سے پرہیز کرنا انکی تعلیم کا لُبِ لباب ہے۔

انہوں نے اپنے پیرودں کیلئے بحکم الٰہی سال میں چند دن عید کے مقرر فرمائے اور چند مخصوص اوقات میں نذر اور قربانی دینا فرض قرار دیا، ان میں بعض رویتِ ہلال پر ادا کی جاتی تھیں اور بعض اس وقت جبکہ سورج کسی برج میں داخل ہونے لگا ہو، اور بعض جگہ سیارے اپنے بیوت و برجِ شرف میں داخل ہوں اور بعض سیارے بعض سیاروں کے مقابل آ جائیں۔

نذرِ الٰہی کے طریقے

اللہ تعالیٰ کے سامنے نذر و قربانی پیش کرنے کے لئے اُن کے یہاں تین چیزیں اہمیت رکھتی تھیں، خوشبوؤں کی دھونی، جانوروں کی قربانی اور شراب[2] اوران کے علاوہ وہ میووں پھلوں اور پھولوں وغیرہ میں سے موسم کی پہلی چیز کی نذر ضرور تھی، اور میووں پھلوں اور پھولوں وغیرہ میں سے موسم کی پہلی چیز کی نذر ضروری تھی، اور میووں میں سے سیب کو، اناج میں سے گیہوں کو، اور پھولوں میں سے گلاب کو ترجیح حاصل تھی۔

بعد میں آنے والے نبیوں کے متعلق بشارت

حضرت ادریس علیہ السلام نے اپنی امت کو یہ بھی بتایا کہ میری طرح اس عالم کی دینی ودُنیوی اصلاح کے لئے بہت سے انبیاء علیہم السلام تشریف لائیں گے اور اُن کی نمایاں خصوصیات یہ ہوں گی۔

۱ وہ ہر ایک بُری بات سے بَری اور پاک ہوں گے۔

۲ قابلِ ستائش اور فضائل میں کامل ہونگے، زمین و آسمان کے احوال سے اور ان امور سے کہ جن میں کائنات کیلئے شفا ہے یا مرض، وحی الٰہی کے ذریعہ اس طرح واقف ہوں گے کہ کوئی سائل تشنہ کام نہ رہے گا، وہ مستجاب الدعوات ہوں گے اور ان کے مذہب کی دعوت کا خلاصہ اصلاحِ کائنات ہوگا۔

۱: ہر ماہ قمری کی ۱۴، ۱۵، ۱۶ تاریخ۔

۲: حکماء کا یہ تضادِ بیان حیرت میں ڈالتا ہے کہ ایک جانب تو وہ شریعتِ ادریسی میں شراب کو حرام بتاتے ہیں اور دوسری جانب خدا کی جانب میں شراب کی قربانی و نذر کو مقبول کہتے ہیں۔ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۔

حضرت ادریس علیہ السلام کی خلافت ارضی

جب حضرت ادریس علیہ السلام خدا کی زمین کے مالک بنادیئے گئے تو انہوں نے علم و عمل کے اعتبار سے اللہ کی مخلوق کو تین طبقات میں تقسیم کردیا۔

کاہن، بادشاہ اور رعیت اور حسب ترتیب اُن کے مراتب مقرر فرمائے، کاہن سب سے پہلا اور بلند درجہ قرار پایا اسلئے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے سامنے اپنے نفس کے علاوہ بادشاہ اور رعیت کے معاملات میں بھی جوابدہ ہے اور بادشاہ کا دوسرا درجہ رکھ گیا، اسلئے کہ وہ اپنے نفس اور امورِ مملکت کے متعلق جوابدہ ہے اور رعیت صرف اپنے نفس ہی کیلئے جوابدہ ہے، اسلئے وہ تیسرے طبقہ میں شامل ہے، لیکن یہ طبقات فرائض کے اعتبار سے تھے نہ کہ نسل و خاندان کے امتیازات کے لحاظ سے، بہر حال حضرت ادریس علیہ السلام "رفع الی اللہ" تک انہی قوانین شریعت و سیاست کی تبلیغ فرماتے رہے۔

مذکورۂ بالا چار بادشاہوں میں سے اسقلیبوس بہت پختہ عزم وارادہ کا بادشاہ تھا، اُس نے حضرت ادریس علیہ السلام کے کلمات کی حفاظت اور قوانینِ شریعت کی نگہداشت خوب کی اور حضرت ادریس علیہ السلام کے اٹھالئے جانے پر بیحد حزن وملال کا اظہار کیا اور ہیکلوں میں اُن کی اور ان کے رفع کی حالت کی تصاویر بنوائیں۔

اسقلیبوس اس خطہ پر حکومت کرتا تھا جو طوفانِ نوح علیہ السلام کے بعد خطۂ یونان کہلایا۔ یونانیوں نے طوفان کی تباہ کاریوں سے بچے ہوئے ٹوٹے پھوٹے ہیکلوں میں جب حضرت ادریس علیہ السلام کے مجسمہ اور ان کے رفع کی تصویر کو دیکھا اور ساتھ ہی اسقلیبوس کی عظمت اور ہیکلوں میں حکمت و فلسفہ کی تدوین کا شہرہ سنا تو ان کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ اسقلیبوس ہی وہ ہستی ہے جس کا رفع ہوا، حالانکہ یہ صریح غلطی ہے جو محض اٹکل و تخمین سے انھوں نے اختیار کی۔

حضرت ادریس علیہ السلام کا حُلیہ

حضرت ادریس علیہ السلام کا حلیہ یہ ہے، گندم گوں رنگ، پورا قد و قامت، سر پر بال کم، خوبصورت و خوبرو، گھنی ڈاڑھی، رنگ و روپ اور چہرہ کے خطوط میں ملاحت مضبوط بازو، چوڑے مُنڈھے، مضبوط ہڈی، دبلے پتلے، سرمگیں چمک دار آنکھیں، گفتگو باوقار، خاموشی پسند سنجیدہ اور متین، چلتے ہوئے نیچی نظر، انتہائی فکر و خوض کے عادی، غصہ کے وقت سخت غضبناک باتیں کرنے میں شہادت کی انگلی سے بار بار اشارہ کے عادی، حضرت ادریس علیہ السلام نے بیاسی سال کی عمر پائی۔

ان کی انگوٹھی پر یہ عبارت گندہ تھی۔

الصبر مع الایمان باللّٰہ یورث الظفر — اللہ پر ایمان کے ساتھ ساتھ صبر، فتحمندی کا باعث ہے۔

اور کمر سے باندھنے والے پٹکہ پر یہ تحریر تھا۔

الاعیاد فی حفظ الفروض و الشریعۃ من تمام الدین و تمام الدین کمال المروۃ۔

حقیقی عیدیں اللہ کے فرائض کی حفاظت میں پوشیدہ ہیں اور دین کمال شریعت سے وابستہ ہے اور مروّت میں

کمال دین کی تکمیل ہے۔

اور نمازِ جنازہ کے وقت جو پٹکہ باندھتے اس پر حسب ذیل جملے ثبت ہوتے:۔

"السعید من نظر لنفسه و شفاعته عند ربه اعماله الصالحة"

"سعادت مند وہ ہے جو اپنے نفس کی نگرانی کرے اور پروردگار کے سامنے انسان کے شفیع اس کے اپنے نیک اعمال ہیں"۔

حضرت ادریس علیہ السلام کے بہت سے پند و نصائح اور آداب و اخلاق کے جملے مشہور ہیں جو مختلف زبانوں میں ضرب المثل اور رموز و اسرار کی طرح مستعمل ہیں، ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:۔

۱ خدا کی بیکراں نعمتوں کا شکر یہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔

۲ جو علم میں کمال اور عمل صالح کا خواہش مند ہو اس کو جہالت کے اسباب اور بد کرداری کے قریب بھی نہ جانا چاہئے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہر فن مولا کاریگر اگر سینے کا ارادہ کرتا ہے تو سوئی ہاتھ میں لیتا ہے نہ کہ برما، پس ہر وقت یہ پیشِ نظر رہے۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دو   این خیال است و محال است وجنوں

۳ دنیا کی بھلائی "حسرت" ہے اور برائی "ندامت"

۴ خدا کی یاد، اور عملِ صالح کے لئے خلوصِ نیت شرط ہے۔

۵ نہ جھوٹی قسمیں کھاؤ، نہ اللہ تعالیٰ کے نام کو قسم کے لئے تختۂ مشق بناؤ اور نہ جھوٹوں کو قسمیں کھانے پر آمادہ کرو، کیوں کہ ایسا کرنے سے تم بھی شریکِ گناہ ہو جاؤ گے۔

۶ ذلیل پیشوں کو اختیار نہ کرو (جیسے سینگی لگانا، جانوروں کے جفتی کرانے پر اجرت لینا وغیرہ)

۷ اپنے بادشاہوں کی (جو کہ پیغمبر کی جانب سے احکامِ شریعت کے نفاذ کیلئے مقرر کئے جاتے ہیں) اطاعت کرو اور اپنے بڑوں کے سامنے پست رہو' اور ہر وقت حمدِ الٰہی میں اپنی زبان کو تر رکھو۔

۸ حکمت روح کی زندگی ہے۔

۹ دوسروں کی خوش عیشی پر حسد نہ کرو اس لئے کہ انکی یہ مسرور زندگی چند روزہ ہے۔

۱۰ جو ضروریاتِ زندگی سے زیادہ طالب ہوا وہ کبھی قانع نہ رہا۔ (تاریخ الحکماء ج۱)

تاریخ الحکماء کے ص ۳۴۸ پر ہرمس ثالث کے تذکرہ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ علماء کی ایک جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ طوفانِ نوح سے قبل دنیا میں جس قدر علوم شائع ہوئے اُن سب کے معلّم اوّل یہی ہرمس اوّل ہیں جو مصر کے حصہ اعلیٰ کے باشندہ تھے اور عبرانی حضرات اُن کو خنوخ نبی مانتے ہیں اور جو اپنے نسب میں حضرتِ آدم علیہ السلام کے پروتے ہیں۔ یعنی خنوخ (ادریس) یارد بن مہلائیل بن قینان، بن انوش، بن شیث، بن آدم علیہ السلام۔

ان کا یہ دعویٰ ہے کہ فلسفہ کی کتابوں میں جن علمی جواہر اور حرکاتِ نجوم کا تذکرہ آتا ہے سب سے پہلے ان کا ذکر ان ہی کی زبان سے ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے ہیکلوں کی تعمیر، علمِ طب کی ایجاد، ارضی

وسماوی اشیاء کے متعلق موزوں قصائد کے ذریعہ اظہارِ خیال بھی ان ہی کی اوّلیات میں سے ہیں، اور اُنہوں نے ہی سب سے پہلے طوفان کی اطلاع دے کر بندگانِ خدا کو ڈرایا اور بتایا کہ اُن کو دکھایا گیا ہے کہ ایک آسمانی آفت ہے جو زمین کو پانی اور آگ میں لپیٹ رہی ہے، انہیں یہ دیکھ کر علوم کی بربادی اور ضعت و حرفت کی تباہی کا خوف ہوا اور اس لئے نہوں نے مصر میں اہرام اور برابی[1] بنائے اور ان میں تمام صنائع اور تو ایجاد آلات کی تصاویر بنوائیں اور تمام علوم کے حقائق واوصاف کو منقش کیا تاکہ یہ علوم وصناعات تاابد باقی رہیں اور فنا کا ہاتھ ان کو گزند نہ پہنچا سکے۔ (تاریخ الحکماء جلد ۱)

محاکمہ

فلاسفہ اور حکمت و فلسفہ کی قدیم کتابوں کی (بعض باتوں سے قطع نظر) اُن یاوہ گویوں اور بے سروپا باتوں کا یہ خلاصہ ہے جو حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق افسانوی حیثیت میں گھڑا گیا ہے کہ جس کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نقل اس کی تائید میں ہے بلکہ تحقیق اور صحیح علم تاریخ کے حقائق ان میں سے اکثر باتوں کی خرافات کو آج اس طرح ظاہر کر رہے ہیں کہ جس کا انکار حقیقت کے انکار کے مرادف ہے مثلاً اہرام و برابی کی تاریخ آج جدید اکتشافات کی بدولت ہمارے سامنے بے نقاب ہے اور اہرام اور ان مقابر کی کھدائی نے علوم و نقوش، اور صنائع کی تصویر کے بنانے والوں اور ان کے مختلف زمانوں میں مختلف مدارج کے ترقی دینے والوں کے نام ان کے اجسام اور ان کے زروجواہر کے خزانوں اور مختلف زمانوں کی تحریروں، اور رسم الخط کی ترکیبوں کو سامنے لا کر روزِ روشن کی طرح آشکار کر دیا ہے، کہاں وہ حقیقتیں اور کہاں یہ دور از کار باتیں، آج مینا، خوفو، منقرع اور طوطامن خامن وغیرہ بادشاہوں کے حالات سے کون آشنا نہیں ہے۔

تاہم ان بے سروپا باتوں کو بھی نقل کر دینا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ یہ آگاہی رہے کہ ان پیغمبروں کے متعلق حکماء کی کتابوں میں بھی کس قسم کی دُور از کار باتیں درج ہیں۔

اس سلسلہ میں بس اُسی قدر سچ اور حق ہے جسکو ہم قرآنِ عزیز اور احادیثِ صحیحہ سے نقل کر آئے ہیں یا توقف کے درجہ میں وہ چند جملے جو تورات سے نقل کئے گئے ہیں، یا وہ اقوال جو پیغمبرانہ تعلیمات کے شایانِ شان ہیں۔

۱: برابی ایسے ہیکل جو چلہ کشی کیلئے چہار جانب سے بند ہوں۔

حضرتِ ہُود علیہ السلام

- قرآنِ عزیز میں ہود علیہ السلام کا ذکر
- ہود علیہ السلام کا نسب
- عاد کی بستیاں اور اُن کا طریقِ عبادت
- عاد کی ہلاکت
- ہود اور قومِ ہود کے واقعات سے حصولِ عبرت

قرآنِ عزیز میں ہود کا ذکر

قرآنِ عزیز میں ہود علیہ السلام کا سات جگہ ذکر آیا ہے جو ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

نمبر شمار	سورہ	آیات
۱	اعراف	۶۵
۲	ھود	۵۰،۵۳،۵۸،۶۰،۸۹
۳	شعراء	۱۲۴

قرآنِ عزیز میں عاد کا ذکر

اور عاد کا ذکر نو سورتوں میں ہوا ہے، یعنی اعراف، ھود، مومنون، شعراء، فُصِّلت، احقاف، الذاریات، القمر اور الحاقّہ میں ہیں۔

قوم عاد

اس سے قبل کہ ہم عاد کے متعلق تفصیلی بحث کریں یہ بتادینا ضروری ہے کہ قرآنِ عزیز کے علاوہ کوئی تاریخ کی کتاب یا توراۃ عاد کے متعلق روشنی نہیں ڈالتی، اس لئے اِس قوم کے حالات کا نقشہ یا قرآنِ عزیز کے ذریعہ بن سکتا ہے اور یا پھر اُن اثریات کے ذریعہ جو محققینِ علم الآثار نے اس راہ میں حاصل کی ہیں۔

پہلا ذریعہ چونکہ قطعی اور یقینی ہے اس لئے اُس کے بیان کردہ حقائق کو بھی بلاشبہ قطعیت حاصل ہے اور دوسرا ذریعہ تخمینی اور قیاسی، اس لئے اس کے بیان کردہ واقعات کی حیثیت ظن و تخمین سے آگے نہیں جاتی۔

عاد، عرب کے قدیم قبیلہ یا امم سامیہ کے صاحبِ قوت و اقتدار افرادِ جماعت کا نام ہے، تاریخ قدیم کے بعض یورپی مصنّفین عاد کو ایک فرضی کہانی (میتھالوجی) یقین کرتے ہیں، مگر اُن کا یہ یقین بالکل غلط اور سراسر وہم ہے، اسلئے کہ جدید تحقیقات کا یہ مسلم فیصلہ ہے کہ عرب کے قدیم باشندے کثرتِ افراد و قبائل کے اعتبار سے ایک باعظمت و سطوت جماعت کی حیثیت میں تھے جو عرب سے نکل کر شام، مصر اور بابل کی طرف بڑھے اور وہاں زبردست حکومتوں کی بنیادیں قائم کیں، اب فرق صرف اسقدر رہے کہ عرب ان باشندوں کو امم بائدہ (ہلاک ہوجانیوالی قومیں) یا عرب عاربہ (خالص عرب) اور ان کی مختلف جماعتوں کے افراد کو عاد، ثمود، طسم،

اور جدلیس کہتے ہیں ۔ اور مستشرقینِ یورپ (امم سامیہ) نام رکھتے ہیں، پس اصطلاحات و تعبیرات کے فرق سے حقیقت وواقعہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہو جاتی، اسلئے قرآنِ عزیز نے ان کو عاد اولیٰ کہا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ عرب کی قدیم قوم بنو سام اور عادِ اولیٰ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

اہل جغرافیہ کا قول ہے ساف کہ لفظِ عرب دراصل عربہ تھا جس کے معنی صحرا اور بادیہ کے ہیں، خود عربی زبان میں اعراب اہل بادیہ کو کہتے ہیں اور عراب کے معنی بدویت کے آتے ہیں۔

اور بعض اہلِ تحقیق کی رائے یہ ہے کہ عرب اصل میں غرب (غین معجمہ کے ساتھ) تھا اور چونکہ اسکا جائے وقوع فرات کے غرب میں ہے اسلئے وہ آرامی قومیں (امم سامیہ) جو کہ فراتِ غربی پر آباد تھیں، اول غرب اور پھر غین کے نقطہ کے سقوط کے بعد عرب کہلائیں، ان میں سے عرب کی وجہ تسمیہ جو بھی صحیح ہو یہ حقیقت ہے کہ یہ مقام قدیم امم سامیہ یا بدوی جماعتوں یا عاد کا مسکن تھا۔ اسلئے عاد بغیر کسی اختلاف کے عرب نژاد تھے، اور لفظ عاد عربی ہے نہ کہ عجمی جسکے معنی عبرانی میں "بلند و مشہور" کے ہیں، قرآنِ عزیز میں عاد کے ساتھ ارم کا لفظ لگا ہوا ہے اور ارم (سام) کے معنی بھی "بلند و مشہور" ہی کے ہیں، انہی عاد کو توراۃ کی غلط پیروی میں کہیں کہیں عمالقہ بھی کہا گیا ہے۔

عاد کا زمانہ

عاد کا زمانہ تقریباً دو ہزار قبل حضرتِ مسیح علیہ السلام مانا جاتا ہے، اور قرآنِ عزیز میں عاد کو من بعد قوم نوح کہہ کر قوم نوح کے خلفاء میں سے شمار کیا ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شام کی دوبارہ آبادی کے بعد امم سامیہ کی ترقی عاد ہی سے شروع ہوتی ہے۔

عاد کا مسکن

عاد کا مرکزی مقام ارضِ احقاف ہے۔ یہ حضر موت شمال[1] میں اس طرح واقع ہے کہ اس کے شرق میں عمان ہے اور شمال میں ربع الخالی، مگر آج یہاں ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہیں[2] ہے، اور بعض مورخین کہتے ہیں کہ اُن کی آبادی عرب کے سبب سے بہترین حصہ حضر موت اور یمن میں خلیج فارس کے سواحل سے حدودِ عراق تک وسیع تھی یمن ان کا دارالحکومت تھا۔

عاد کا مذہب

عاد بُت پرست تھے اور اپنے پیشرو قومِ نوح علیہ السلام کی طرح صنم پرستی اور صنم تراشی میں ماہر تھے، تاریخ قدیم کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ اُن کے معبودانِ باطل بھی قومِ نوح علیہ السلام کی طرح وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق، اور نسر

۱۔ معجم البلدان ص ۱۲۹۔ جلد ۲۔

۲۔ عبد الوہاب نجار کہتے ہیں کہ مجھ سے سید عبداللہ بن احمد بن عمر بن یحییٰ علوی نے (جو حضر موت کے باشندہ ہیں) بیان کیا کہ وہ ایک جماعت کے ساتھ ان ہلاک شدہ قوموں کے قدیم مساکن کے کھوج میں حضر موت کے شمالی میدان میں مقیم تھے، طویل جدوجہد کے بعد ہم نے مرمر کے بعض ظروف کو ریت کے ٹیلوں کی کھدائی میں حاصل کیا جن پر خط مسماری میں تحریر تھا، مگر افسوس کہ مالیہ کی کمی نے اس عظیم الشان مہم کو پورا نہ ہونے دیا۔

ہی تھے، اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک اثر منقول ہے، اس میں ہے کہ ان کے ایک صنم کا نام صمود اور ایک کا نام ہتار تھا۔[۱]

حضرت ہود علیہ السلام

عاد اپنی اپنی مملکت کی سطوت و جبروت، جسمانی قوت و صولت کے غرور میں ایسے چمکے کہ انھوں نے خدائے واحد کو بالکل بھلا دیا اور اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو اپنا معبود مان کر ہر قسم کے شیطانی اعمال بےخوف و خطر کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے انہی میں ایک پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا، حضرت ہود علیہ السلام عاد کی سب سے زیادہ معزز شاخ خلود کے ایک فرد تھے، سرخ و سپید رنگ اور وجیہ تھے، اُن کی داڑھی بڑی تھی۔ (عینی جلد ۷ کتاب الانبیاء)

تبلیغ اسلام

انھوں نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف دعوت دی اور لوگوں پر ظلم و جور کرنے سے منع فرمایا مگر عاد نے ایک نہ مانی اور ان کو سختی کے ساتھ جھٹلایا اور غرور و تکبر کے ساتھ کہنے لگے مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً آج دنیا میں ہم سے زیادہ شوکت و جبروت کا کون مالک ہے؟ مگر حضرت ہود علیہ السلام مسلسل اسلام کی تبلیغ میں لگے رہے، وہ اپنی قوم کو عذاب الٰہی سے ڈراتے اور غرور سرکشی کے نتائج بتا کر قوم نوح کے واقعات یاد دلاتے اور ارشاد فرماتے:

اے قوم! اپنی جسمانی طاقت اور حکومت کے جبروت پر گھمنڈ نہ کر بلکہ خدا کا شکر ادا کر کہ اس نے تجھ کو یہ دولت بخشی، قوم نوح کی تباہی کے بعد تجھ کو زمین کا مالک بنایا، خوش عیشی، فارغ البالی اور خوشحالی عطا کی لہٰذا اسکی نعمتوں کو نہ بھول اور خود ساختہ بتوں کی پرستش سے باز آجا نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ دکھ دے سکتے ہیں، موت و زیست، نفع و ضرر سب ایک اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، اے افرادِ قوم! مانا کہ تم عرصہ تک سرکشی اور اسکی نافرمانی میں مبتلا رہے ہو مگر آج بھی اگر توبہ کر لو، اور باز آجاؤ تو اس کی رحمت وسیع ہے اور دروازۂ توبہ بند نہیں ہوا، اس سے مغفرت چاہو وہ بخش دے گا، اس کی طرف رجوع ہو جاؤ وہ معاف کر دے گا، تقویٰ و طہارت کی زندگی اختیار کر لو، وہ تم کو دن دوگنی، رات چوگنی ترقی عطا کرے گا، بیش از بیش عزت دیگا، اور مال و عزت میں سرفرازی بخشے گا۔ حضرت ہود علیہ السلام اپنی تبلیغ اور پیغام حق کے ساتھ ساتھ بار بار یہ بھی دہراتے کہ میں تم سے کسی اجر و عوض کا خواہاں نہیں، میرا اجر تو خدا ہی کے پاس ہے اور یہ نبی کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے، ان کو کوئی یہ تہمت نہیں لگا سکتا کہ وہ مال کی طلب میں ایسا کرتے ہیں، یا عزت و جاہ اور ریاست کے طالب ہیں، وہ نہ قوم سے اپنی ریاست و عزت کے طالب ہوتے ہیں، اور نہ مال و منال کے، ان کے سامنے تو صرف ایک ہی نقطہ ہوتا ہے اور وہ ادائے فرض اور اپنے مالک حقیقی کے احکام کی پیغامبری ہے۔

---

[۱] صدا بھی ان کا مشہور بت تھا، البدایہ والنہایہ جلد ا

عاد میں ایمان دار تو چند ہی تھے باقی تمام سرکش اور متمرد انسانوں کا گروہ تھا، انکو حضرت ہود علیہ السلام کی یہ نصائح سخت شاق گذرتی تھیں، اور وہ یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے خیالات، ان کے عقائد و اعمال، غرض ان کے کسی ارادہ میں بھی کوئی شخص حائل ہو اُنکے لئے ناصح مشفق بنے، اس لئے انھوں نے یہ روش اختیار کی کہ حضرتِ ہود علیہ السلام کا مذاق اُڑایا، اُن کو بے وقوف گردانا اور ان کی معصومانہ حقانیتوں اور صداقتوں کی تمام یقینی دلائل و براہین کو جھٹلانا شروع کردیا اور حضرت ہود علیہ السلام سے کہنے لگے۔

يَاهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ○

اے ہود! تو ہمارے پاس ایک دلیل بھی نہیں لایا، اور تیرے کہنے سے ہم اپنے خداؤں کو چھوڑنیوالے نہیں، اور نہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے ہیں۔ (ہود، رکوع ۵)

ہم اس ڈھونگ میں آنے والے نہیں کہ تجھ کو خدا کا رسول مان لیں اور اپنے خداؤں کی عبادت چھوڑ کر یہ یقین کرلیں کہ وہ خدائے اکبر کے سامنے ہمارے شفارشی نہیں ہوں گے۔

حضرت ہود علیہ السلام نے ان سے کہا کہ نہ میں بے وقوف ہوں اور نہ پاگل، بلاشبہ خدا کا رسول" اور پیغمبر ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے بیوقوف کو منتخب نہیں کیا کرتا کہ اس کا نقصان اس کے نفع سے بڑھ جائے اور ہدایت کی جگہ گمراہی آجائے، وہ اس عظیم الشان خدمت کے لئے اپنے بندوں میں ایسے شخص کو چنتا ہے جو ہر طرح اس کا اہل ہو، اور اس خدمتِ حق کو بخوبی انجام دے سکے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ

اور اللہ خوب جاننے والا ہے کہ اپنے منصب رسالت کو کس جگہ رکھے۔

مگر قوم کی سرکشی اور مخالفت بڑھتی ہی رہی اور ان پر آفتاب سے زیادہ روشن دلائل و نصائح کا مطلق اثر نہ ہوا، اور وہ حضرت ہود علیہ السلام کی تکذیب و تذلیل کے اور زیادہ درپے ہوگئے اور (العیاذ باللہ) مجنوں اور خبطی کہہ کر اور زیادہ مذاق اڑانے لگے، اور کہنے لگے اے ہود علیہ السلام! جب سے تو نے ہمارے معبودوں کو بُرا کہنا اور ہم کو اُن کی عبادت سے باز رہنے کے لئے تلقین کرنا شروع کیا ہے ہم دیکھتے ہیں اس وقت سے تیرا حال خراب ہو گیا ہے اور ہمارے خداؤں کی بدعا سے تو پاگل و مجنون ہو گیا ہے تو اب ہم اس کے علاوہ تجھ کو اور کیا سمجھیں؟

ان کو اپنی اس گستاخانہ جرأت و تہمت سے یہ خیال ہو چلا تھا کہ اب کوئی شخص حضرت ہود علیہ السلام کی طرف دھیان نہ دے گا، اور ان کی باتوں کو توجہ سے نہ سُنے گا۔

حضرت ہود علیہ السلام نے یہ سب کچھ نہایت ضبط و صبر سے سُنا اور پھر اُن سے یوں مخاطب ہوئے:

"میں خدا کو اور تم سب کو گواہ بنا کر سب سے پہلے یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں اس اعتقاد سے قطعاً بری ہوں ان بتوں میں یہ قدرت ہے کہ مجھ کو یا کسی کو کسی قسم کی بھی کوئی برائی پہنچا سکتے ہیں اس کے بعد تم کو اور تمہارے اِن معبودانِ باطل کو تحدی (چیلنج) کرتا ہوں کہ اگر ان میں ایسی قدرت ہے تو وہ مجھ کو

نقصان پہنچانے میں جلدی سے اقدام کریں، میں اپنے اللہ کے فضل و کرم سے صاحب عقل و خرد ہوں، فراست و کیاست کا مالک ہوں اور حکمت و دانائی کا حامل۔ میں تو صرف اپنے اس خدا ہی پر بھروسہ کرتا اور اسی پر وثوق رکھتا ہوں جس کے قبضہ و قدرت میں کائنات کے تمام جانداروں کی پیشانیاں ہیں اور جو حیات و ممات کا مالک ہے، وہ ضرور میری مدد کرے گا اور ہر نقصان پہنچانے والے کے نقصان سے محفوظ رکھے گا۔"

آخر حضرت ہود علیہ السلام اُن کی مسلسل بغاوت و سرکشی کے خلاف یہ اعلان کر دیا کہ اگر عاد کا رویہ یہی رہا اور حق سے اعراض و روگردانی کی روش میں انھوں نے کوئی تبدیلی نہ کی، اور میری پند و نصائح کو گوش دل سے نہ سُنا تو میں اگرچہ اپنی مفوضہ خدمت کے لئے ہر وقت چست کمر اور باہم ہوں مگر ان کے لئے ہلاکت یقینی ہے، اللہ تعالیٰ عنقریب اُن کو ہلاک کر دے گا، اور ایک دوسری قوم کو زمین کا مالک بنا کر ان کی جگہ قائم کر دے گا، اور بلاشبہ وہ اللہ تعالیٰ کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، وہ تو ہر شے پر قادر و مسلط اور ہر شے کا حافظ و نگہبان ہے، اور تمام کائنات اس کے ید قدرت میں مسخر ہے۔

اے قوم! اب بھی سمجھ اور عقل و ہوش سے کام لے، قومِ نوح کے حالات سے عبرت حاصل کر اور خدا کے پیغام کے سامنے سرِ نیاز جھکا دے، ورنہ قضاء و قدر کا ہاتھ ظاہر ہو چکا ہے اور بہت قریب ہے وہ زمانہ کہ تیرا یہ سارا غرور و گھمنڈ خاک میں مل جائے گا، اور اس وقت ندامت سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

حضرتِ ہود علیہ السلام نے بار بار ان کو یہ بھی باور کرایا کہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں دوست ہوں تم سے زر و سیم اور ریاست کا طالب نہیں ہوں بلکہ تمہاری فلاح و نجاح چاہتا ہوں، میں اللہ تعالیٰ کے پیغام کے بارہ میں خائن نہیں بلکہ امین ہوں، وہی کہتا ہوں جو مجھ سے کہا جاتا ہے۔ جو کچھ کہتا ہوں قوم کی سعادت اور حسنِ حال و مآل کے لئے کہتا ہوں، بلکہ دائمی و سرمدی نجات کے لئے کہتا ہوں۔

تم کو اپنی ہی قوم کے ایک انسان پر خدا کے پیغام نازل ہونے سے اچنبھا نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ قدیم سے خدا کی سنتِ جاریہ ہے کہ انسانوں کی ہدایت و سعادت کے لئے اُن ہی میں سے ایک شخص کو چُن لیتا اور اپنا رسول بنا کر اس کو خطاب کرتا ہے اور اپنی اضیات و ناضیات سے اس کو معرفت اپنے بندوں کو مطلع کرتا رہا ہے، اور فطرت کا تقاضا بھی تو یہی ہے کہ کسی قوم کے رشد و ہدایت کے لئے ایسے شخص کا ہی انتخاب کیا جائے جو بول چال میں ان ہی کی طرح ہو، اُن کے اخلاق و عادات کا واقف و دانا ہو، ان کے خصوصی امتیازات سے آشنا، اور اُن ہی کے ساتھ زندگی گزار تا رہا ہو کہ اُسی سے قوم مانوس ہو سکتی ہے اور وہی ان کا صحیح ہادی مشفق بن سکتا ہے۔

عاد نے جب یہ سنا تو وہ عجیب حیرت میں پڑ گئے 'ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک خدا کی پرستش کے کیا معنیٰ؟ وہ غم و غصہ میں آ گئے کہ کس طرح ہم باپ دادا کی ریت "اصنام پرستی" کو چھوڑ دیں؟ یہ تو ہماری اور ہمارے باپ دادا کی سخت توہین ہے، ان کا غیظ و غضب بھڑک اٹھا کہ ان کو کافر اور مشرک کیوں کہا جاتا ہے جبکہ وہ بُتوں کو خدا کے سامنے اپنا شفیع مانتے ہیں؟ اُن کے نزدیک ہود علیہ السلام کی بات مان لینے میں ان کے معبودوں اور بزرگوں کی توہین و تحقیر تھی جن کو وہ خدائے اکبر کی بارگاہ میں اپنا وسیلہ اور شفیع مانتے تھے اور اُسی کے لئے ان تصویروں اور مجسموں کو

پوچتے تھے کہ وہ خوش ہو کر ہماری سفارش کرینگے اور عذاب الٰہی سے نجات دلائیں گے۔

آخر وہ شعلہ کی طرح بھڑک اُٹھے اور حضرت ہود علیہ السلام سے بگڑ کر کہنے لگے "تو نے ہم کو اپنے خدا کے عذاب کی دھمکی دی اور ہم کو اس سے یہ کہہ کر ڈرایا"۔

إِنِّيْٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○

میں تمہارے اوپر بڑے دن کے عذاب آنے سے ڈرتا ہوں (کہ کہیں تم اُس کے مستحق نہ ٹھہر جاؤ)۔ (الشعراء)

تو اے ہود علیہ السلام! اب ہم سے تیری روز روز کی نصیحتیں نہیں سنی جاتیں، ہم ایسے ناصح مشفق سے باز آئے، اگر تو واقعی اپنے قول میں سچا ہے تو وہ عذاب جلد لے آ ہمارا تیرا قصہ پاک ہو۔

فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○

پس لا تو ہمارے پاس اس شے کو جس کا تو ہم سے وعدہ کرتا ہے اگر تو واقعی سچوں میں سے ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام نے جواب دیا کہ اگر میری مخلصانہ اور صادقانہ نصائح کا یہی جواب ہے تو بسم اللہ اور تم کو عذاب کا اگر اتنا ہی شوق ہے تو وہ بھی کچھ دُور نہیں۔

قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ

بلاشبہ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر عذاب و غضب آ پہنچا۔

تم کو شرم نہیں آتی کہ تم چند خود ساختہ بتوں کو ان کے نام گھڑ کر پکارتے ہو اور تم تمہارے آباو اجداد اُن کو خدا کی دی ہوئی دلیل کے بغیر من گھڑت طریقہ پر ان کو اپنا شفیع اور سفارشی بناتے ہو اور میری روشن دلائل سے انحراف اور سرکشی کر کے عذاب کے طالب ہوتے ہو، اگر ایسا ہی شوق ہے تو اب تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں کہ وقت قریب آ پہنچا۔

أَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ أَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَا أَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ فَانْتَظِرُوْٓا إِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ○

کیا تم مجھ سے ان من گھڑت ناموں (بتوں) کے بارہ میں جھگڑتے ہو جس کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے گھڑ لیا ہے کہ جس کے متعلق تمہارے پاس خدا کی کوئی حجت نہیں آئی پس اب تم (عذابِ الٰہی کا) انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ (الاعراف رکوع ۹)

الحاصل قوم ہود (عاد) کی انتہائی شرارت و بغاوت اور اپنے پیغمبر کی تعلیم سے بے پناہ بغض و عناد کی پاداشِ عمل اور قانونِ جزاء کا وقت آ پہنچا اور غیرتِ حق حرکت میں آئی اور عذابِ الٰہی نے سب سے پہلے خشک سالی کی شکل اختیار کی، عاد سخت گھبرائے پریشان، ہوئے اور عاجز و درماندہ نظر آنے لگے تو حضرت ہود علیہ السلام کو جوشِ ہمدردی نے اُکسایا اور مایوسی کے بعد پھر ایک مرتبہ اُن کو سمجھایا کہ راہِ حق اختیار کر لو، میری نصائح پر ایمان لے آؤ کہ یہی نجات کی راہ ہے، دنیا میں بھی آخرت میں بھی ورنہ پچتاؤ گے، لیکن بد بخت و بد نصیب قوم پر کوئی اثر نہ ہوا،

بلکہ بغض و عناد اور دوبالا ہو گیا۔ تب ہولناک عذاب نے اُن کو آگھیرا، آٹھ دن اور سات راتیں پیہم تیز و تند ہوا کے طوفان اُٹھے اور اُن کو اور اُن کی آبادی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا، تنومند اور قوی ہیکل انسان جو اپنی جسمانی قوتوں کے گھمنڈ میں سرمست سرکشی تھے اس طرح بے حس و حرکت پڑے نظر آتے تھے جس طرح آندھی سے تناور درخت بے جان ہو کر گر جاتا ہے، غرض انکو صفحۂ ہستی سے مٹادیا گیا تاکہ آنے والی نسلوں کے لئے عبرت بنیں اور دنیاو آخرت کی لعنت اور عذاب اُن پر مسلط کر دیا گیا کہ وہ اس کے مستحق[1] تھے اور حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے مخلص پیروان اسلام خدا کی رحمت و نعمت میں عذابِ الٰہی سے محفوظ رہے اور سرکش قوم کی سرکشی و بغاوت سے مامون ہو گئے۔

یہ ہے عادِ اولیٰ کی وہ داستانِ عبرت جو اپنے اندر چشمِ عبرت بین کیلئے بیشمار پند و نصائح رکھتی اور خدائے برتر کے احکام کی تعمیل اور تقویٰ و طہارت کی زندگی کی جانب دعوت دیتی ہے، شرارت، سرکشی اور خدا کے احکام سے بغاوت، کے انجامِ بد سے آگاہ کرتی اور وقتی خوش عیشی پر گھمنڈ کر کے نتیجہ کی بدبختی پر مذاق اُڑانے سے ڈراتی اور باز رکھتی ہے۔

غرض حضرتِ ہود علیہ السلام کے اِس واقعہ کا تفصیلی ذکر قرآنِ عزیز نے جس عبرت آموز طریقہ پر کیا ہے اس کو پڑھئے اور موعظت و عبرت، اور گرانمایہ پند و نصائح کا سامان فراہم کیجئے کہ دنیاو آخرت کی سعادت و فلاح کا یہی بہترین ذخیرہ ہے۔

وَ إِلٰى عَادٍ أَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يَاقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ أَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ إِنَّا لَنَرَاكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ ○ قَالَ يَاقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّيْ وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِيْنٌ ○ أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَاذْكُرُوْآ إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً فَاذْكُرُوْآ آلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ قَالُوْآ أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَآؤُنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ ○ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ أَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْ أَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَا أَنْتُمْ وَآبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ فَانْتَظِرُوْآ إِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ○ فَأَنْجَيْنَاهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ

[1] ان ہلاک شدگان کی تعداد مفسرین نے تین سے چار ہزار تک بتائی ہے جیسا کہ روح المعانی وغیرہ میں مذکور ہے۔ لیکن قرآن عزیز نے جس طرح ان کی شوکت و حکومت کا تذکرہ کیا ہے اور بنو سام کی قدیم تاریخ سے پتہ جیسا پتہ چلتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ تعداد بہت زیادہ ہونی چاہئے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيَاتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○

(الاعراف ۷، آیت ۶۵ ـ ۷۲)

اور اسی طرح ہم نے قوم عاد میں اس کے بھائی بندوں میں سے ہود کو بھیجا، اس نے کہا "اے قوم اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا معبود نہیں، کیا تم (انکار و بد عملی کے نتائج سے) نہیں ڈرتے؟ اس پر قوم کے سر برآوردہ لوگوں نے جنھوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا تھا، کہا "ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم حماقت میں پڑ گئے ہو اور ہمارا خیال یہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے والوں میں سے ہو، ہود نے کہا بھائیو! میں احمق نہیں ہوں میں تو اس کی طرف سے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے فرستادہ ہوں میں اُس کا پیام تمہیں پہنچاتا ہوں اور یقین کرو کہ تمہیں دیانتداری کے ساتھ نصیحت کرنے والا ہوں کیا تمہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ ایک ایسے آدمی کے ذریعہ تمہارے پروردگار کی نصیحت تم تک پہنچی جو خود تم ہی میں سے ہے خدا کا یہ احسان یاد کرو کہ قوم نوح کے بعد تمہیں اس کا جانشین اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت و توانائی بخشی، پس چاہیے کہ اللہ کی نعمتوں کی یاد سے غافل نہ ہو تا کہ ہر طرح کا کامیاب ہو، انھوں نے کہا "کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے کہ ہم صرف ایک ہی خدا کے پجاری ہو جائیں اور اُن معبودوں کو چھوڑ دیں جنھیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں؟ اگر تم سچے ہو تو وہ بات لا دکھاؤ جس کا ہمیں خوف دلا رہے ہو، ہود نے کہا "یقین کرو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب واقع ہو گیا ہے (کہ عقلیں ماری گئی ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے کو تباہی کے حوالے کر رہے ہو) کیا ہے جس کی بناء پر تم مجھ سے جھگڑ رہے ہو؟ محض چند نام جو تم نے اور تمہارے بزرگوں نے اپنے جی سے گھڑ لئے ہیں اور جن کے لئے خدا نے کوئی سند نہیں اتاری، اچھا (آنے والے وقت کا) انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کروں گا پھر ایسا ہوا کہ ہم نے ہود کو اور اس کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے بچا لیا اور جنھوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائی تھیں ان کی بیخ و بنیاد تک اکھاڑ دی حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان لانے والے نہ تھے۔ (الاعراف)

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يَاقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ○ يَاقَوْمِ لَآ اَسْاَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ وَيَاقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ○ قَالُوْا يَاهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ○ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ○ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ

قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْئًا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝ وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝ وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝ (ھود ۱۱، آیت ۵۰۔۶۰)

اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف اُس کے بھائی بندوں میں سے ہود کو بھیجا ہود نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں یقین کرو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ (حقیقت کے خلاف) افترا پردازیاں کر رہے ہو "اے میری قوم کے لوگو! میں اس بات کے لئے تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا، میرا بدلہ تو اسی پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ پھر کیا تم (اتنی صاف بات بھی) نہیں سمجھتے؟ اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے پروردگار سے (اپنے قصوروں کی) مغفرت مانگو اور (آئندہ کے لئے) اُسکی جناب میں توبہ کرو، وہ تم پر برستے ہوئے بادل بھیجتا ہے (جس سے تمہارے کھیت اور باغ شاداب ہو جاتے ہیں) اور تمہاری قوتوں پر نئی نئی قوتیں بڑھاتا ہے (کہ روز بروز گھٹنے کی جگہ بڑھتے جاتے ہو) اور (دیکھو) جرم کرتے ہوئے اُس سے مُنہ نہ موڑو (ان لوگوں نے) کہا "اے ہود تو ہمارے پاس کوئی دلیل لے کر تو آیا نہیں (جسے ہم دلیل سمجھیں) اور ہم ایسا کرنے والے نہیں کہ تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں، ہم تجھ پر ایمان لانے والے نہیں، ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں، وہ تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی معبود کی تجھ پر مار پڑ گئی ہے (اسی لئے اس طرح کی باتیں کرنے لگا ہے) ہود نے کہا "میں اللہ کو گواہ ٹھراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ جن ہستیوں کو تم نے اس کا شریک بنا رکھا ہے، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں تم سب مل کر میرے خلاف جو کچھ تدبیریں کر سکتے ہو ضرور کرو، اور مجھے (ذرا بھی مہلت نہ دو، پھر دیکھ لو، نتیجہ کیا نکلتا ہے؟) میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی، کوئی چلنے والا وجود نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ نے اسے اس کی پیشانی کے بالوں سے پکڑ رکھا ہے (یعنی کوئی حرکت کرنے والی ہستی نہیں کہ اس کے قبضہ سے باہر ہو) میرا پروردگار (حق و عدل کی سیدھی راہ پر ہے) یعنی اس کی راہ ظلم کی راہ نہیں ہو سکتی، پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لئے میں بھیجا گیا تھا وہ میں نے پہنچادی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے اور مجھے تو نظر آرہا ہے کہ) کہ میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دے دیگا، اور تم اُس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے، یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگران حال ہے۔

اور (دیکھو) جب ہماری ٹھہرائی ہوئی بات کا وقت آ پہنچا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود کو بچالیا جو اُس کے ساتھ (سچائی پر) ایمان لائے تھے، اور ایسے عذاب سے بچایا کہ بڑا ہی سخت عذاب تھا، یہ ہے سرگزشت عاد کی۔

انھوں نے اپنے پروردگار کی نشانیاں (ہٹ دھرمی اور سرکشی کرتے ہوئے) جھٹلائیں اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی، اور ہر متکبر و سرکش کے حکم کی پیروی کی! اور ایسا ہوا کہ دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت پڑی (یعنی رحمت الٰہی کی برکتوں سے محرومی ہوئی) اور قیامت کے دن بھی۔

تو سن رکھو کہ قوم عاد کیلئے محرومی کا اعلان ہوا جو ہود کی قوم تھی۔ (ہود)

ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِيْنَ ○ فَأَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ أَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ○ وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُوْنَ ○ أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا أَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ○ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ○ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ○ إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِيْنَ ○ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ○ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نَادِمِيْنَ ○ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ ○ (مؤمنون ۲۳ آیت ۳۱-۴۱)

پھر ہم نے قوم نوح کے بعد قوموں کا ایک دوسرا دور پیدا کر دیا، ان میں بھی اپنا رسول بھیجا جو خود انہی میں سے تھا (اس کی پکار بھی یہی تھی) کہ "اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، کیا تم (انکار و فساد کے نتائج بد سے) ڈرتے نہیں؟ اس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی اور آخرت کے پیش آنے سے منکر تھے اور جنہیں دنیا کی زندگی میں ہم نے آسودگی دے رکھی تھی کہنے لگے "اس سے زیادہ اس کی کیا حیثیت ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے جو تم کھاتے ہو یہ بھی کھاتا ہے جو کچھ تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے، اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت کر لی تو بس سمجھ لو تم تباہ ہوئے، تم سنتے ہو یہ کیا کہتا ہے؟ یہ تمہیں امید دلاتا ہے کہ جب مرنے کے بعد محض مٹی اور ہڈیوں کا چورا ہو جاؤ گے تو پھر تمہیں موت سے نکالا جائے گا کیسی ان ہونی بات ہے جس کی تمہیں توقع باقی ہے، زندگی تو بس یہی زندگی ہے جو دنیا میں ہم بسر کرتے ہیں یہیں مرنا ہے یہیں جینا ہے، ایسا کبھی ہونے والا نہیں کہ مر کر پھر جی اُٹھیں گے، کچھ نہیں یہ ایک مفتری آدمی ہے جس نے اللہ کے نام سے جھوٹ موٹ بات بنا دی، ہم کبھی اس پر یقین لانے والے نہیں"، اس پر اُس رسول نے دعا مانگی "خدایا! انھوں نے مجھے جھٹلایا ہے، پس تو میری مدد کر" حکم ہوا "عنقریب ایسا ہونیوالا ہے کہ یہ اپنے کئے پر شرمسار ہونگے"۔

چنانچہ فی الحقیقت ایک ہولناک آواز نے اُنہیں آپکڑا اور ہم نے خس و خاشاک کی طرح انھیں پامال کر دیا، تو محرومی ہو اُس گروہ کے لئے کہ ظلم کرنے والا ہے۔ (المومنون)

كَذَّبَتْ عَادُ ۨالْمُرْسَلِيْنَ ○ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوْهُمْ هُوْدٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ○ إِنِّيْ لَكُمْ

رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ٥ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ٥ وَمَآ أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ٥ أَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ آيَةً تَعْبَثُوْنَ ٥ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ٥ وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ٥ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ٥ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ٥ أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ٥ وَجَنَّاتٍ وَّعُيُوْنٍ ٥ إِنِّيْٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ٥ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ أَوَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوَاعِظِيْنَ ٥ إِنْ هٰذَآ إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِيْنَ ٥ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ٥ فَكَذَّبُوْهُ فَأَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً وَّمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ٥ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ٥ (الشعراء، ٢٦ آیت ١٢٣۔١٤٠)

عاد نے (اللہ کے) پیغام لانے والوں کو جھٹلایا جب اُنکے بھائی ہود نے اُن کو کہا "کیا تم کو (خدا کا ڈر نہیں؟) میں تمہارے پاس پیغام لانے والا معتبر ہوں، سوڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر بدلہ میرا بدلہ اس جہان کے مالک پر ہے، کیا بناتے ہو تم ہر اونچی زمین پر ایک نشان کھیلنے کو، اور بناتے ہو کاریگریاں شاید تم ہمیشہ رہو گے اور جب ہاتھ ڈالتے ہو تو ظلم کا پنجہ، ہی مرتے ہو، سوڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور ڈرو اُس سے جس نے تم کو پہنچائیں وہ چیزیں جو تم جانتے ہو، پہنچائے تم کو چوپائے اور بیٹے، اور باغ اور چشمے، میں ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کی آفت سے۔

وہ بولے "ہم کو برابر ہے تو نصیحت کرے یا نہ کرے اور کچھ نہیں ہیں یہ باتیں مگر عادت ہے اگلے لوگوں کی، اور ہم پر آفت آنے والی نہیں، پھر اس کو جھٹلانے لگے، تب ہم نے اس کر غارت کر دیا، اس بات میں البتہ نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ ماننے والے نہیں، اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا۔

فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَكَانُوْا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُوْنَ ٥ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ أَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ٥

(حم السجدہ ٤١، آیت ١٥۔١٦)

سو وہ عاد تھے وہ تو غرور کرنے لگے ملک میں ناحق، اور کہنے لگے "کون ہے ہم سے زیادہ زور و قوت میں، کیا دیکھتے نہیں اللہ جس نے ان کو بنایا وہ زیادہ ہے ان سے زور میں؟ اور تھے ہماری نشانیوں کے منکر، پھر بھیجی ہم نے ان پر ہوا بڑے زور کی کئی دن جو مصیبت کے تھے، تاکہ چکھائیں ان کو رسوائی کا عذاب دنیا کی زندگانی میں، اور آخرت کے عذاب میں تو پوری رسوائی ہے۔

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ قَالُوا أَجِئْتَنَا لِتَأْفِكَنَا عَنْ آلِهَتِنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ وَأُبَلِّغُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ۝ فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُسْتَقْبِلَ أَوْدِيَتِهِمْ قَالُوا هَٰذَا عَارِضٌ مُمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهِ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ۝ وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا إِنْ مَكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ (احقاف ۴۶ آیت ۲۱-۲۶)

اور یاد کر عاد کے بھائی کو جب ڈرایا اُس نے اپنی قوم کو احقاف میں اور گزر چکے تھے ڈرانے والے اُس کے سامنے سے اور پیچھے سے (یہ کہتے ہوئے) کہ بندگی نہ کرو کسی کی اللہ کے سوائے، میں ڈرتا ہوں تم پر آفت سے ایک بڑے دن کی، بولے! کیا تو آیا ہمارے پاس کہ پھیر دے ہم کو ہمارے معبودوں سے! سولے آ ہم پر جو وعدہ کرتا ہے اگر ہے تو سچا۔ کہا یہ خبر تو اللہ ہی کو ہے اور میں تو پہنچا دیتا ہوں جو کچھ بھیج دیا ہے میرے ہاتھ، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ نافرمانی کرتے ہو، پھر جب دیکھا اس (عذاب کو) ابر سامنے آیا ہوا اپنی وادیوں کے، بولے! یہ ابر ہے ہمارے اوپر برسے گا "کوئی نہیں" یہ تو وہ چیز ہے جس کی تم جلدی کرتے تھے ہوا ہے جس میں عذاب ہے، دردناک، اکھاڑ پھینکے ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے، پھر کل کے دن رہ گئے کہ کوئی نظر نہیں آتا تھا سوائے ان کے گھروں کے، یوں ہم سزا دیتے ہیں گنہگار لوگوں کو اور ہم نے مقدور دیا تھا انکو ان چیزوں کا جن کا تم کو مقدور نہیں دیا اور ہم نے ان کو دیئے تھے کان اور آنکھیں اور دل، پھر کام نہ آئے کان ان کے اور نہ آنکھیں اُن کی اور نہ دل اُن کے کسی چیز میں، اس لئے کہ منکر ہوتے تھے، اللہ کی باتوں سے اور اُلٹ پڑی ان پر جس بات سے کہ وہ ٹھٹھا کرتے تھے۔

وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ ۝ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ ۝ (الذاریات)

اور قوم عاد (کے ہلاک ہونے میں بھی قدرت خدا کی بہترین نشانیاں ہیں) جب ہم نے اُن پر ایک منحوس آندھی چلائی، جس چیز سے ہو کر گزرتی اس کو بوسیدہ ہڈی کی طرح (چورا) کئے بدون نہ چھوڑتی۔

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ۝ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي

يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ○ تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ○ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ○ (القمر)

جھٹلایا عاد نے پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا۔ ہم نے بھیجی اُن پر ہوا تند، ایک نحوست کے دن جو ٹلنے والی نہ تھی اُکھاڑ پھینکا لوگوں کو گویا وہ جڑیں ہیں کھجور کی اُکھڑی پڑی، پھر کیسا رہا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا۔

وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ○ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ○ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْ بَاقِيَةٍ ○ (الحاقہ)

اور وہ جو عاد تھے سو برباد ہوئے ٹھنڈی سناٹے کی ہوا سے کہ نکلی جائے ہاتھوں سے، مقرر کر دیا اس کو ان پر سات رات اور آٹھ دن لگاتار، پھر تو دیکھے کہ وہ لوگ اس میں بچھڑ گئے گویا وہ جڑیں ہیں کھجور کی، پھر تو دیکھتا ہے کوئی اُن میں کا بچا؟

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ○ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ○ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ○ (الفجر)

تو نے دیکھا، کیسا کیا تیرے رب نے عاد ارم کے ساتھ جو تھے بڑے ستونوں والے کہ ان جیسی (چیز) سارے شہروں میں نہیں بنائی گئیں۔

حضرت ہود ﷤ کی وفات

اہلِ عرب حضرت ہود ﷤ کی وفات اور ان کی قبرِ مبارک کے متعلق مختلف دعوے کرتے ہیں، مثلاً اہلِ حضرت موت کا دعویٰ ہے کہ عاد کی ہلاکت کے بعد وہ حضر موت کے شہروں میں ہجرت کر آئے تھے، وہیں اُن کی وفات ہوئی اور وادی برہوت کے قریب حضر موت کے مشرقی حصہ میں شہر تریم سے قریباً دو مرحلے پر دفن ہوئے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک اثر منقول ہے کہ اُن کی قبر حضر موت میں کثیب احمر (سرخ ٹیلہ) پر ہے اور ان کے سرہانے جھاؤ کا درخت کھڑا ہے۔

اور اہلِ فلسطین کا دعویٰ ہے کہ وہ فلسطین میں دفن ہیں، اور انھوں نے وہاں اُن کی قبر بھی بنا رکھی ہے اور اس کا سالانہ عرس بھی کرتے ہیں۔ (قصص الانبیاء، ص ۷۴)

مگر ان تمام روایات میں سے حضر موت کی روایت صحیح اور معقول معلوم ہوتی ہے، اسلئے کہ عاد کی بستیاں حضر موت ہی کے قریب تھیں۔ لہٰذا قرینہ یہی چاہتا ہے کہ ان کی تباہی کے بعد قریب ہی کی آبادیوں میں حضرت ہود ﷤ نے قیام فرمایا ہوگا اور وہیں پیغامِ اجل کو لبیک کہا اور وہ یہی حضر موت کا مقام ہے۔

چند عبرتیں

علاوہ اس خاص عبرت کے جس کا ذکر اس طویل واقعہ میں ہو چکا ہے، یہ چند عبرتیں بھی قابل توجہ اور نظر التفات کے لائق ہیں۔

۱ جو شخص قوم عاد کے واقعہ کو پڑھتا ہے۔ اسکی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی ہستی کا تصور آ جاتا ہے جو وقار اور متانت کا مکمل مجسمہ ہے اور شرافت و نجابت چہرہ سے عیاں، جو کچھ کہتا ہے پہلے اس کو وزن کر لیتا ہے کہ اس کا انجام نیک ہے یا بد، قوم کی درشتی، تمسخر و استہزاء کا جواب ضبط و صبر سے دیتا اور پھر بھی ان کی بھلائی کا جویاں نظر آتا ہے۔ اخلاص اور حسن نیت اس کی پیشانی سے عیاں ہے۔ اس کی قوم کہتی ہے:

إِنَّا لَنَرَاكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ ○

بے شک ہم تجھ کو بے وقوف پاتے ہیں اور بے شک ہم تجھ کو جھوٹوں میں شمار کرتے ہیں۔

مگر وہ اس کا جواب یہ دیتا ہے:۔

يَاقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّيْ وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِيْنٌ ○

اے قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں، البتہ میں جہانوں کے پروردگار کی جانب سے رسول ہوں تم تک اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور میں تمہارے لئے امانتدار خیر خواہ ہوں۔

یہ سوال وجواب ہم کو توجہ دلاتے ہیں کہ خدا کے برگزیدہ انسان جب کسی کی نیک خواہی کرتے اور کج رووں کی کجی کو سیدھا کرنے کے لئے نصیحت فرماتے ہیں تو کور چشموں اور بد باطنوں کی ہرزہ سرائی تمسخر و تحقیر کی پرواہ نہیں کرتے دلگیر ہو کر رنجیدہ ہو کر امر حق سے مُنہ نہیں موڑتے ناراض ہو کر خیر خواہی اور نصیحت کوشی کو نہیں چھوڑتے، اور بلندی اخلاق اور نرمی و مہربانی کے ساتھ روحانی مریضوں کے علاج میں مشغول رہتے ہیں اور ان کی ان تمام خصوصیات میں نمایاں امتیاز یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس نصیحت و نیک خواہی کے لئے قوم سے مطلق کسی قسم کے نفع کے خواہشمند نہیں ہوئے اور ان کی زندگی بدلہ اور عوض سے یکسر بلند اور برتر ہوتی ہے۔

وَمَآ أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○

اور میں تم سے اس نصیحت پر اجرت نہیں مانگتا میرا اجر تو صرف اللہ کے ذمہ ہے اور بس۔

۲ حضرت ہود علیہ السلام نے لطف و مہربانی کے ساتھ اپنی قوم کو خدا کی وحدانیت پر ایمان لانے کی ترغیب دی، اُس کی لازوال نعمتوں کو یاد دلایا اور آئندہ کے لئے وعدہ کیا مگر بد بخت قوم نے کسی طرح مان کر نہ دیا۔ اس کا سب سے بڑا سبب وہ جاہلانہ عقیدہ تھا کہ باپ دادا کی ریت و رسم اور ان کے خود ساختہ اصنام کی قہرمانیت کے خلاف جو شخص بھی آواز اٹھائے گا وہ ان بتوں کی پھٹکار میں آ جائے گا، یہ مہلک عقیدہ جن قوموں کے اندر اپنے جراثیم پیدا کر دیتا ہے ان قوموں کا اپنے مصلح اور اپنے نبی و پیغمبر کے ساتھ

وہی سلوک ہوتا ہے جو قوم ہود اور قوم نوح کے تذکروں میں نظر آتا ہے، اپنے مصلحین اور انبیاء صادقین کے خلاف قوموں کا بغض وعناد اسی ایک عقیدہ پر مبنی رہا ہے کہ ہمارے باپ دادا کی ریت و رسم اور اُن کے خود ساختہ اصنام کی قہرمانیت کے خلاف کیوں کچھ کہا جاتا، یونان کے مشہور حکیم سقراط کو زہر کا پیالہ اسی لئے پینا پڑا کہ وہ اپنی قوم کے معبودانِ باطل کی قہرمانیت کا کیوں انکار کرتا اور ان کو کس لئے ان کے غلبہ واقتدار کا مخالف بناتا ہے۔ پس یہ جرثومہ اقوام کی روحانی زندگی کے لئے ہمیشہ تباہ کن اور ان کی فلاح وسعادتِ ابدی کیلئے ہلاکت آفریں رہا ہے۔

۳ حضرت ہود علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی یہ سنت بہترین اُسوہ ہے کہ تبلیغ و پیغام حق کی راہ میں بدی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے اور تلخی کا جواب شیریں کلامی سے پورا کیا جائے، البتہ مبلغ ان کی بد کرداری اور مسلسل سرکشی پر اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون "جزائے عمل یا پاداشِ عمل" کو ضرور یاد دلائے اور آنے والے انجامِ بد پر یقیناً ان کو تنبیہ کرے اور یہ حقیقت بار بار سامنے لائے کہ جب کوئی قوم اجتماعی سرکشی، ظلم اور بغاوت پر آمادہ ہو جاتی اور اس پر پیہم اصرار کرتی رہتی ہے تو پھر خدائے تعالیٰ کا قہر و غضب اس کو صفحۂ عالم سے مٹا دیا کرتا ہے اور اُس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے چنانچہ قومِ نوح علیہ السلام اور قومِ ہود علیہ السلام اس کی عبرت زا مثالیں ہیں۔

حضرت صالح علیہ السلام

حضرت صالح علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں

قرآن عزیز میں حضرت صالح علیہ السلام کا نام آٹھ جگہ آیا ہے، حسب ذیل اعداد اس کی تصدیق کرے ہیں:

سورۃ	آیات	میزان
اعراف	۷۳، ۷۵، ۷۷	۳
ھود	۶۱، ۶۲، ۶۶، ۸۹	۴
شعراء	۱۴۲	۸/۱

حضرت صالح علیہ السلام جس قوم میں پیدا ہوئے اُس کو ثمود کہتے ہیں اور ثمود کا ذکر نو سورتوں میں کیا گیا ہے۔ ذیل کا نقشہ اس کو واضح کرتا ہے:۔

اعراف ہود حجر نمل فُصِلَت النجم القمر الحاقّہ الشّمس

حضرت صالح اور ثمود کا نسب نامہ

علماء انساب قوم ثمود کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کے نسب نامہ میں مختلف نظر آتے ہیں۔ مشہور حافظِ حدیث امام بغویؒ نے آپ کا نسب اس طرح بیان کیا ہے:۔ صالح بن عُبید بن آسف بن ماشخ بن عبید بن حادر بن ثمود اور وہب بن منبہ، مشہور تابعی اس طرح نقل کرتے ہیں۔ صالح بن عبید بن جابر بن ثمود۔
(تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف)

اگرچہ بغویؒ زمانہ کے اعتبار سے وہب سے بہت بعد میں ہیں اور وہب تورات کے بہت بڑے عالم بھی ہیں تاہم حضرت صالح علیہ السلام سے ثمود تک نسب کی جو کڑیاں بغویؒ نے جوڑی ہیں علماءِ انساب کے نزدیک وہی تاریخی حیثیت سے راجح اور قرینِ صواب ہیں۔

اس نسب نامہ سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس قوم کو (جس کے ایک فرد حضرت صالح علیہ السلام بھی ہیں)

ثمود اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے نسب نامہ کا جدِ اعلیٰ ثمود ہے، اور اُسی کی جانب یہ قبیلہ یا قوم منسوب ہے۔

ثمود سے حضرت نوح علیہ السلام تک بھی دو قول ہیں، اوّل ثمود بن عامر بن ارم بن سام، دوم، ثمود بن عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام۔

سید محمود آلوسیؒ صاحب تفسیر روح المعانی فرماتے ہیں کہ امام ثعلبیؒ دوسرے قول کو راجح سمجھتے ہیں۔ (جلد ۹ ص ۱۴۲)

بہر حال ان دونوں روایتوں سے یہ باتفاق ثابت ہوتا ہے کہ قومِ ثمود بھی سامی اقوام ہی کی ایک شاخ ہے اور غالباً بلکہ یقیناً یہی وہ افراد قوم ہیں جو عادِ اولیٰ کی ہلاکت کے وقت ہود علیہ السلام کے ساتھ بچ گئے تھے اور یہی نسل عادِ ثانیہ کہلائی، اور بلاشبہ یہ قوم بھی عرب بائدہ (ہلاک شدہ عربی نسل) میں سے ہے۔

ثمود کی بستیاں

ثمود کہاں آباد تھے اور کس خطہ میں پھیلے ہوئے تھے؟ اس کے متعلق یہ طے شدہ امر ہے کہ اُن کی آبادیاں حجر میں تھیں، حجاز اور شام کے درمیان وادیٔ قریٰ تک جو میدان نظر آتا ہے یہ سب اُن کا مقامِ سکونت ہے، اور آجکل "فج الناقۃ" کے نام سے مشہور ہے۔ ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات اور آثار آج تک موجود ہیں، اور اس زمانہ میں بھی بعض مصری اہل تحقیق نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان کا بیان ہے کہ وہ ایک ایسے مکان میں داخل ہوئے جو "شاہی حویلی" کہی جاتی ہے، اس میں متعدد کمرے ہیں اور اس حویلی کے ساتھ ایک بہت بڑا حوض ہے اور یہ پورا مکان پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

عرب کا مشہور مؤرخ مسعودی لکھتا ہے:۔

ورممهم باقية و اثارهم بادية فى طريق من ورد من الشام۔ (ج۳ ص۱۳۹)

جو شخص شام سے حجاز کو آتا ہے اُس کی راہ میں اُن کے مٹے نشان اور بوسیدہ کھنڈرات پڑتے ہیں۔

حجر کا یہ مقام جو حجر ثمود کہلاتا ہے شہر مدین سے جنوب مشرق میں اس طرح واقع ہے کہ خلیج عقبہ اس کے سامنے پڑتی ہے اور جس طرح عاد کو عادِ ارم کہا گیا ہے (حتی کہ قرآن عزیز نے تو ارم کو ان کی مستقل صفت ہی بنا دیا) اسی طرح ان کی ہلاکت کے بعد ان کو ثمود ارم یا عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔

مشرق خصوصاً عرب کے بارہ میں یورپ کے مستشرقین[1] جس طرح اپنی حذاقت و مہارت تاریخ کا ثبوت دیا کرتے ہیں اور تحقیق کے نام سے غلط دعاوی کرنے کے عادی ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ثمود کو بھی اپنی تحقیق کا تختۂ مشق بنایا ہے، وہ سوال کرتے ہیں کہ ثمود کی اصل کیا ہے اور ان کا وجود کب ہوا اور کس زمانہ میں؟ اس سوال کے جواب میں ان کے دو گروہ ہیں، ایک فریق کہتا ہے کہ یہ یہود کا ایک گروہ تھا جو فلسطین میں داخل نہیں ہوا تھا اور یہیں بس گیا تھا، مگر یہ قول نہ صرف پایۂ تحقیق سے گرا ہوا ہے بلکہ قطعاً غلط اور مہمل ہے، اسلئے کہ تمام

---

[1] یورپ میں جو علماء مشرق کی تاریخ اور مشرقی علوم سے شغف رکھتے اور ان کے متعلق مباحث و نظریات قائم کرتے ہیں ان کو مستشرق کہتے ہیں، ان میں سے بعض اگر چہ حقیقتاً حذاقت و مہارت رکھتے ہیں، مگر اکثر محض ظنی اور تخمینی بلکہ من گھڑت نظریئے قائم کر کے مشرق سے یا تعصب کا ثبوت دیتے ہیں یا اپنی کم مائیگی علم کا۔

مورخین باتفاق آراء یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابھی وہ زمانہ قریب بھی نہ آیا تھا کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلتے کہ ثمود کی آبادیاں ہلاک و تباہ ہو چکی تھیں اور ان کا قلع قمع ہو چکا تھا، نیز قرآنِ عزیز تصریح کرتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو قوم فرعون نے جھٹلایا تو آل فرعون ہی میں سے ایک مرد مومن نے یہ کہہ کر اپنی قوم کو ڈرایا کہ تمہاری اس تکذیب کا نتیجہ کہیں وہی نہ ہو جو تم سے پہلے قوم نوح، عاد اور ثمود اور ان کے بعد کی قوموں کا اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی وجہ سے ہوا تھا۔

مستشرقین کی دوسری جماعت کہتی ہے کہ یہ عمالقہ میں سے تھے اور فرات کے مغربی ساحل سے اٹھ کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔

ان میں سے بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ ان عمالقہ میں سے تھے جن کو مصر کے بادشاہ احمس نے خارج البلد کر دیا تھا اور چونکہ مصر کے زمانہ میں فن سنگ تراشی میں انہوں نے کمال حاصل کر لیا تھا۔ اسلئے حجر جا کر پہاڑوں اور پتھروں کو تراش کر بے نظیر عمارات تعمیر کیں اور عام رائج طریقہ پر بھی عالیشان محل بنائے۔

مگر ہم عاد کے واقعہ میں یہ ثابت کر آئے ہیں کہ عاد و ثمود و سامی اقوام میں سے ہیں اور یہ کہ اہل عرب ان کو محض یہود کی غلط تقلید میں عمالقہ میں سے کہہ دیتے ہیں، حالانکہ عملیق بن اد کا اس نسل سے کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ اسلئے یہ قول بھی صحیح نہیں ہے۔

ان تمام آراء کے خلاف محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ عاد کا بقیہ ہیں اور یہی صحیح اور راجح قول ہے، اور اہلِ حضر موت کا یہ دعویٰ کہ ثمود کی آبادیاں اور محلات عاد کی صناعی کا نتیجہ ہیں، اور اس قول کا مخالف نہیں ہے کہ ثمود فنِ تعمیر میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور یہ عمارات اُن کی اپنی تعمیر ہیں، اس لئے کہ عادِ اولیٰ اور عادِ ثانیہ بہر حال عاد ہیں۔ حضرت صالح ؑ کا اپنی قوم سے یہ خطاب بھی اسی کا مؤید ہے:۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ○

اور تم اُس وقت کو یاد کرو کہ تم کو خدا نے عاد کے بعد اُن کا قائم مقام بنایا اور تم کو زمین پر جگہ دی کہ تم اس کی سطح اور نرم حصوں پر محلات بناتے ہو اور سنگ تراشی کر کے پہاڑوں میں مکان تراشتے ہو۔

رہا ثمود کے زمانہ کا مسئلہ سوا اس کے متعلق کوئی فیصلہ کُن منضبط وقت نہیں بتایا جا سکتا، اس لئے کہ تاریخ اس بارہ میں غیر مطمئن ہے، البتہ یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا زمانہ حضرت ابراہیم ؑ سے پہلے کا زمانہ ہے اور وہ اس جلیل القدر پیغمبر کی بعثت سے بہت پہلے ہلاک ہو چکے تھے۔

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ثمود کی آبادیوں کے قریب بعض ایسی قبریں پائی جاتی ہیں کہ جن پر آرامی زبان کے کتبے لگے ہوئے ہیں اور ان کتبوں پر جو تاریخ کندہ ہے وہ حضرت عیسیٰ ؑ کی ولادت سے پہلے کی ہے، تو اس سے یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ یہ قوم حضرت موسیٰ ؑ کے بعد وجود میں آئی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

یہ دراصل اُن لوگوں کی قبریں ہیں جو اس قوم کی ہلاکت کے ہزاروں برس کے بعد اتفاقاً یہاں آکر بس گئے

ہیں اور انھوں نے اپنے بزرگوں کے آثار کی قدامت ظاہر کرنے کے لئے آرامی خط میں (جو کہ قدیم خط ہے) اپنے کتبے لکھ کر لگا دیئے تاکہ یادگار رہیں ورنہ وہ قبریں نہ ثمود کی ہیں اور نہ اُن کا یہ زمانہ ہے۔

مصر کا مشہور عیسائی مئورخ جورجی زیدان اپنی کتاب "العرب قبل الاسلام" میں اسی کے قریب قریب لکھتا ہے، کہتا ہے:۔

آثار و کتبات کے پڑھنے سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ صالح ؑ کی قوم کی بستیاں ولادت مسیح سے کچھ پہلے نبطیوں کے اقتدار میں آگئی تھیں، یہ لوگ بطرہ کے ساکنین میں سے تھے، (جن کا ذکر عنقریب کتاب میں آنے والا ہے) اور ان کے آثار اور ٹیلوں کو بہت سے مستشرقین نے خود دیکھا ہے اور مقدمہ کتاب میں اس کا ذکر تفصیل سے کر چکا ہوں، ان ہی کے آثار کو انھوں نے پڑھا ہے جو پتھروں پر کندہ ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم دو کھنڈر ہیں جو قصر بنت، قبر باشا، قلعہ اور برج کے ناموں سے موسوم ہیں۔ ان پر جو کچھ تحریر ہے وہ نبطی تحریر میں ہے اور ان میں سے بعض یا سب کی سب وہی تحریریں ہیں جو قبروں پر کندہ ہیں۔

مستشرقین نے یہاں جو کچھ پایا اُن میں سے حسب ذیل ایک کتبہ بھی ہے جو پتھر پر نبطی حروف میں کندہ ہے اور ولادتِ مسیح ؑ سے قریب زمانہ کا مکتوب ہے، (کندہ عبارت کا مضمون یہ ہے)

"مقبرہ کملم بنت وائلہ بنت حرم نے اور کملم کی بیٹی کلیبہ نے اپنے لئے اور اپنی اولاد کیلئے بنوایا ہے۔

اس کی بنا بہت اچھے مہینوں میں شروع کی گئی ہے، یہ نبطیوں کے بادشاہ حارث کی تخت نشینی کا نواں سال ہے، وہ حارث جو اپنے قبیلے کا عاشقِ صادق ہے۔

پس "ذوالشری ؤعرشہ" [1] لات، عمند، منوت اور قیس کی اُن پر لعنت ہو جو ان قبروں کو فروخت کرے یا رہن رکھے، یا ان سے کسی جسم کو یا عضو کو نکالے، یا کملم، اس کی بیٹی اور اس کی اولاد کے علاوہ کسی کو دفن کرے۔

اور جو شخص بھی اس پر لکھے ہوئے کی مخالفت کرے اس پر ذوالشریٰ، ہبل، منوت کی پانچ لعنتیں ہوں، اور جو ساحر اس کے خلاف کرے اس پر ایک ہزار درہم حارثی کا تاوان واجب ہے مگر یہ کہ اس کے ہاتھ میں کملم کلیبہ یا اس کی اولاد میں سے کسی کے ہاتھ کی تحریر ہو جس میں اس اجنبی قبر کے لئے صاف اور صریح الفاظ میں اجازت موجود ہو، اور وہ اصل ہو جعلی نہ ہو۔

اس مقبرہ کو وہب اللاۃ بن عبادہ نے بنایا۔ (ص ۸۰)

اہل ثمود کا مذہب

ثمود اپنے بُت پرست پیشرووں کی طرح بت پرست تھے، خدائے واحد کے علاوہ بہت سے معبودانِ باطل کے پرستار اور شرک میں مبتلا تھے، اس لئے انکی اصلاح اور احقاقِ حق کیلئے انہی کے قبیلہ میں سے حضرت صالح کو ناصح

[1] سوالیہ نشان زدہ عربی عبارت کتبہ پر صاف نہیں پڑھی جا سکی اس لئے اصل الفاظ نقل کر دیئے گئے۔

پیغمبر اور رسول بنا کر بھیجا گیا تا کہ وہ اُن کو راہِ راست پر لائیں، اُن کو خدا کی نعمتیں یاد دلائیں جن سے صبح و شام وہ محظوظ ہوتے رہتے ہیں اور ان پر واضح کریں کہ کائنات کی ہر شئے خدا کی توحید اور یکتائی پر شاہد ہے اور یقینی دلائل اور مُسکت براہین کیساتھ اُن کی گمراہی کو ظاہر کریں اور بتائیں کہ پرستش و عبادت کے لائق ذاتِ آحد کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہے۔

قرآن عزیز میں قصص کا مطلب

قرآن عزیز کی یہ سنت ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے گذشتہ اقوام اور ان کے ہادیوں کے واقعات و حالات بیان کر کے نصیحت و موعظت کا سامان مہیا کرتا ہے، اس کے موضوع حکایات و قصص بیان کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ خدائے تعالیٰ نے جب انسان کو عقل کی روشنی عطا فرمائی ہے تو اس کی ہدایت و نجاتِ اخروی کا کیا سامان مہیا کیا ہے تا کہ وہ ان اسباب کی مدد سے اپنی عقل سے کام لے اور خدا کی مرضیات و نامرضیات کو پہچانے؟ اُس نے بتایا کہ خدائے تعالیٰ کی یہ سنتِ جاریہ ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے ان ہی میں سے پیغمبر اور رسول بھیجتا ہے، وہ اُن کو حق کی راہ بتاتے اور ہر قسم کی گمراہی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور تائید میں اقوام و امم کے واقعات بیان کرتا اور تاریخِ ماضی کو دہراتا ہے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ جن اقوام نے اپنے رسول کی ہدایات کو تسلیم کیا انھوں نے دنیا و آخرت کی فلاح پائی اور جن امتوں نے ان کی تلقین کا انکار کیا، اُن کا مذاق اڑایا اور اُن کو جھٹلایا تو خدائے تعالیٰ نے اپنے سچے رسول کی تصدیق کے لئے کبھی بطورِ خود اور کبھی قوم کے مطالبہ پر ایسی نشانیاں نازل فرمائیں جو نبیوں اور رسولوں کی تصدیق کا باعث بنیں اور ''معجزہ'' کہلائیں۔

لیکن اگر قوم نے اس نشانی ''معجزہ'' کے بعد بھی تکذیب کو نہ چھوڑا اور بغض و عناد سے وہ انکار پر اُڑے رہے تو پھر ''عذابِ الٰہی'' نے آکر اُن کو تباہ و ہلاک کر دیا اور اُن کے واقعات کو آنیوالی اقوام کے لئے عبرت و موعظت کا سامان بنا دیا۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِنَا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظَالِمُوْنَ ۝

اور تیرا رب بستیوں کو اس وقت تک ہلاک کرنے والا نہیں جب تک نہ بھیج دے اُن کے صدر مقام میں اپنا رسول جو پڑھ کر سنائے اُن کو ہماری آیات اور ہم (اُس وقت تک) بستیوں کو ہلاک نہیں کرتے جب تک اُن کے بسنے والے خود ہی ظلم پر نہ اُتر آئیں۔ (قصص رکوع ۶)

معجزہ کی حقیقت

''معجزہ'' لغت میں عاجز کر دینے اور تھکا دینے والی چیز کو کہتے ہیں اور اسلامی اصطلاح میں ایسے عمل کا نام ہے جو سلسلئہ اسباب کے بغیر عالمِ وجود میں آجائے، اس کو عام بول چال میں ''خرقِ عادت'' بھی کہتے ہیں، اور اسی بنا پر اس جگہ یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا عادت اللہ'' (کہ جس کو ناموسِ فطرت بھی کہا جاتا ہے) کا ٹوٹنا ممکن ہے؟

دوسرے الفاظ میں اس سوال کی تعبیر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ کیا قانونِ قدرت میں تبدیلی ممکن ہے؟

اس سوال کا حل یہ ہے کہ معجزہ کی یہ تعبیر کہ وہ خارقِ عادت شے کا نام ہے، غلط تعبیر ہے اس لئے کہ خدائے تعالیٰ کے قوانینِ قدرت یا نوامیسِ فطرت دراصل دو قسموں میں تقسیم ہیں، عادتِ عام اور عادتِ خاص۔ عادتِ عام سے قدرت کے وہ قوانین مراد ہیں جو باہم اسباب و مسببات کے سلسلہ میں جکڑے ہوئے ہیں مثلاً آگ جلاتی ہے اور پانی خنکی پہنچاتا ہے، اور عادتِ خاص کا مطلب یہ ہے کہ اسباب و مسببات میں علاقہ پیدا کرنے والے یدِ قدرت نے کسی خاص مقصد کیلئے سبب اور مسبب کے درمیانی رشتہ کو کسی شے سے الگ کر دیا یا بغیر سبب کے مسبب کو وجود بخش دیا، جیسا کہ جلنے کے اسباب موجود ہونے کے باوجود کسی جسم کا آگ سے نہ جلنا، یا دو تین انسانوں کے قابل خوراک سے سو دو سو انسانوں کا شکم سیر ہو جانا اور اپنی اصل مقدار کی حد تک پھر بھی باقی بچ جانا۔

یہ دونوں باتیں چونکہ عام نگاہوں میں قانونِ قدرت کے خلاف ہیں اسلئے جب یہ اور اس طرح کی کوئی شے رُونما ہوتی یا اس کے وجود پذیر ہو جانے کی اطلاع دی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قدرت کے قانون یا عادت اللہ کے خلاف ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ قوانینِ فطرت کی پہلی قسم یعنی عام عادت کے خلاف تو ہوتا ہے مگر عادتِ خاص کے خلاف نہیں ہوتا اور وہ بھی قانونِ قدرت ہی کی ایک کڑی ہوتی ہے جو عام حالات سے الگ کسی خاص مقصد کے پورا کرنے کے لئے ظاہر کی جاتی ہے، اور اس جگہ وہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس طرح خدائے تعالیٰ اپنے سچے رسول اور پیغمبر کی صداقت و حقانیت کی تصدیق کرتا اور جھٹلانے والوں کو یہ باور کراتا ہے اگر یہ مدعی رسالت اپنے دعوے میں صادق نہ ہوتا تو خدا کی تائید کبھی اس کے ساتھ نہ ہوتی، پس عام قانونِ قدرت سے جدا رسول و پیغمبر کا یہ عمل ظاہر کرتا ہے کہ درحقیقت یہ اس کا اپنا فعل نہیں ہے بلکہ یہ خدا کا فعل ہے جو عادتِ خاص کی صورت میں نبی کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا تاکہ اس کی صداقت کی دلیل بن سکے۔

اور اس میں شک نہیں کہ اگر کسی نبی اور پیغمبر کو معجزہ نہ بھی دیا جاتا تب بھی پیغمبر کی پیغمبرانہ زندگی، کتابِ ہدایت کی موجودگی، اور عقلی دلائل و براہین کی روشنی میں اُس کی صداقت پر ایمان لانا از بس ضروری ہوتا اور اُس کا انکار مذہب کی اصطلاح میں کفر و جمود مانا جاتا تاہم یہ بھی ایک حقیقت تامہ ہے کہ آفتابِ صبح سے زیادہ روشن عقلی و نقلی دلائل کے باوجود عوام کی فطرت اکثر و بیشتر حق و صداقت کے قبول کے لئے بھی دلائل سے زیادہ ایسے امور سے جلد متاثر ہوتی ہے جو عقل کو حیران اور دماغ کو مرعوب کر کے اُن پر یہ ظاہر کر دے کہ دعوائے نبوت کے ساتھ نبی کا یہ عمل بلاشبہ خدا کی دی ہوئی ایسی طاقت رکھتا ہے جس کا مقابلہ انسانی طاقت سے بالاتر ہے اور اُس کے مظاہرہ کے سامنے عاجز و درماند، اور وہ یقین کر لیتے ہیں کہ بے شک و شبہ اس ہستی کو خدا کی تائید حاصل ہے اور اس لئے یہ جو کچھ بھی کہتا ہے خدا کی جانب سے کہتا ہے۔

تب اس مرحلہ پر پہنچ کر "عقلیین کا" یہ کہنا کہ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہے سر تا سر باطل اور حق تعالیٰ کی صداقت کو جھٹلانا ہے جو کسی طرح بھی ایمان کی علامت نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب تک نبی اور رسول، معجزہ نہ دکھلائے نبی کی صداقت اُس پر موقوف نہیں ہے لیکن اگر

منکرین کے مطالبہ پر یا از خود پیغمبر خدا معجزہ کا مظاہرہ کرے تو یقیناً معجزہ دلیلِ نبوت ٹھہرے گا اور اُس کا انکار صداقت وحقانیت کا انکار اور کفر وجمود کہلائے گا۔

پس ہر خاص وعام کے لئے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ انبیاء ورسل سے جو معجزات ثبوت اور دلالت کے اعتبار سے قطعی اور یقینی ثابت ہو چکے ہیں اُن پر ایمان لائے اور ان کے وجود اور انکی حقیقت کا اعتراف کرے۔ اس لئے کہ ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار در حقیقت اسلام سے انکار ہے۔

البتہ یہ حقیقت کبھی فراموش نہ ہونی چاہئے کہ کسی شخص سے صرف اس قسم کے خارقِ عادت عمل صادر ہونے کا نام معجزہ نہیں ہے اور محض اس عمل کے بروئے کار لانے سے وہ نبی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ نبی اور رسول کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اُس کی تمام زندگی اس طرح آزمائش وامتحان کی کسوٹی پر اُتر چکی ہو کہ اُس کا کوئی شعبہ زندگی ناقص اور قابلِ اعتراض نہ ہو بلکہ اس کی تمام تر زندگی میں اخلاق کی بلندی، گناہوں سے معصومیت اور صداقتِ گفتار وکردار کا کمال ہی پایا جاتا ہو، پھر اگر ایسا شخص دعوائے نبوت کرتا اور اپنے دعوے کی صداقت میں علمی دلائل وبراہین کے علاوہ خدا کے نشانات (معجزات) بھی پیش کرتا ہے تو بلاشبہ وہ نبی ہے اور بلا ریب اس کا یہ فعل "معجزہ" ہے۔

ہم نے ابھی کہا کہ "معجزہ" در حقیقت نبی کا اپنا عمل نہیں ہوتا بلکہ وہ خدائے تعالیٰ کا فعل ہے جو نبی کے ہاتھوں سے ظاہر ہوتا اور معجزہ کہلاتا ہے، یہ اسلئے کہ نبی ورسول بھی ایک انسان اور بشر ہی ہوتا ہے اور کسی انسان کی قدرت میں یہ نہیں ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے قوانین عام وخاص میں دخل اندازی یا دراندازی کر سکے، یہ تو خدا ہی کی مرضی پر ہے کہ اگر وہ چاہے اور مناسبِ حال اور تقاضاءِ وقت سمجھے تو نبی اور رسول کے ہاتھ پر ایسے فعل کا ظہور کرادے جو اُسکے قوانین فطرت کی عادتِ خاص کی قسم میں داخل ہوں، اور اگر نہ چاہے تو نبی ورسول کیلئے بھی اسکا اظہار ناممکن اور محال ہے۔

غزوۂ بدر میں جبکہ تین سو تیرہ کے مقابلہ میں ساز وسامان سے مسلح ایک ہزار دشمنوں کا لشکر مسلمانوں پر یلغار کر کے آیا تھا تو آپ ﷺ نے اُن کی جانب مٹھی بھر خاک پھینک دی جس کی وجہ سے ہر لشکری کی آنکھ میں خاک کے ریزے پہنچے اور بے چین ہو کر آنکھیں ملنے لگا اور اس طرح مسلمانوں کو حملہ کر کے فتح حاصل ہو گئی، اس واقعہ کا مختصر اور معجزانہ انداز میں قرآنِ عزیز نے جس طرح تذکرہ کیا ہے وہ ہمارے اس دعوے کی قوی اور یقینی دلیل ہے:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (انفال)

اور تم نے (اے محمد ﷺ) وہ مٹھی بھر خاک نہیں پھینکی تھی جو تم نے (اپنے ہاتھ سے) پھینکی، لیکن وہ تو (حقیقت میں) اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔

غور فرمایئے کہ اس مقام پر نبی کے اِس عمل کا (جو اُن کے ہاتھوں انجام پایا تھا)۔ کس عجیب وغریب انداز سے معجزہ ہونا ثابت کیا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ اے پیغمبر! مٹھی بھر خاک بے شک تمہارے ہاتھ سے پھینکی گئی اس لئے

کہ تمہارے ہاتھ میں تھی۔ لیکن مٹھی بھر خاک کا یہ اثر کہ دشمن کے محاذ کی دُوری اور دشمن کے اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ان سب کی آنکھوں میں جھونک دی گئی تمہارے ہاتھ سے ناممکن تھا، یہ در حقیقت خدا کا فعل تھا کہ اُس کے ید قدرت نے ان تمام دشواریوں کو یک لخت ختم کر کے اس مٹھی بھر خاک کو اس حالت تک پہنچا دیا کہ دشمنوں کا پورا لشکر ہزیمت کھا کر فرار کر گیا۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو آپ کے سامنے اس طرح واضح کیا گیا کہ معجزہ نبی کا اپنا فعل نہیں ہوتا بلکہ وہ براہِ راست خدا کا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھوں سے اسکی تائید میں کیا جاتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَّأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ فَإِذَا جَآءَ أَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (المؤمنون)

اور کسی رسول کی طاقت میں نہیں کہ وہ کوئی نشانی (معجزہ) لاسکے خدا کی اجازت بغیر، پس جب خدا کا حکم آپہنچتا ہے تو حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اس موقع پر جھٹلانے والے خسارہ میں پڑ جاتے ہیں۔ (المومنون)

وَأَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ آيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

اور وہ اللہ کی سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آجائے تو اس پر ضرور ایمان لے آئیں گے (اے محمد! ﷺ) آپ کہہ دیجئے کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے قبضے میں ہیں۔ اور (اے مسلمانو! تم کو خبر نہیں کہ ان کے پاس اگر یہ نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ (الانعام رکوع ۱۳)

معجزہ سے متعلق ہماری یہ بحث اُسی شخص کے لئے باعثِ تسکین ہے جو مذہب کے اس بنیادی عقیدہ کا قائل ہو کہ تمام اشیاء کے خواص ان کے اپنے ذاتی خواص نہیں ہیں بلکہ کسی پیدا کرنے والے نے اُن کو عطا کئے ہیں۔ پس جو شخص اس عقیدہ کا حامی ہے وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا کرنے والے نے عام قانونِ قدرت اسلئے یہی رکھا ہے کہ جو شے اس سے چھو جائے وہ جل جائے لیکن یہ عقلاً ناممکن نہیں ہے کہ وہ کسی اہم مقصد کی تکمیل کے لئے آگ کی اس خاصیت کو کسی خاص حالت میں سلب کر لے اور وہ اس کے قانونِ قدرت کی خاص حالت یا خاص عادت شمار ہو۔

لیکن جو شخص اس بنیاد ہی کو تسلیم نہیں کرتا اور ہر شے کے خواص کو اس طرح اس کے ذاتی خواص مانتا ہے کہ کسی حالت اور کسی وقت میں بھی اس خاصیت کا اُس شے سے جدا ہونا ممکن نہیں ہے تو اس شخص سے اوّل یہ طے کرنا چاہئے کہ کیا عقل یہ باور کر سکتی ہے کہ جو شے خود اپنے وجود میں دوسرے کی محتاج ہو اس کا کوئی خاصہ بھی ذاتی اور غیر منفک ہو سکتا؟ "گذشتہ سال لندن اور امریکہ میں خدا بخش کشمیری نے دہکتی ہوئی آگ پر چلنے کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ خود بھی چلا اور دوسرے اشخاص کو بھی اپنے ساتھ آگ پر سے گذارا اور اُس کے بعد تمام سائنسدانوں نے اس کے جسم کا طرح طرح سے تجربہ کر کے یہ معلوم کرنا چاہا کہ شاید وہ فائر پروف ہو، مگر ناکام رہے اور اُن کو اقرار کرنا پڑا کہ اُس کا جسم اور آگ پر گذرنے والے دوسرے اشخاص کا جسم عام انسانوں کے جسم سے زیادہ کوئی

خاص کیفیت نہیں رکھتا اور انتہائے حیرت و استعجاب کے ساتھ اس کا اعتراف کیا کہ وہ اس حقیقت کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ آگ موجود ہے اور نہیں جلاتی" تو اس کا اُسکے پاس کیا جواب ہے۔

پس علم کی فراوانی کے باوجود جبکہ ہمارے عجز کا یہ عالم ہے تو ہم کو کیا زیبا ہے کہ علم یقین (وحی) کی بیان کردہ حقیقت (معجزہ) کا اسلئے انکار کر دیں کہ ہماری عقل عام حالات میں سبب کے بغیر کسی مسبّب کو دیکھنے کی عادی نہیں ہے۔

بہر حال ایسے شخص کو خدا اور اس کی صفات خصوصاً صفتِ قدرت پر پہلے بحث کرنی چاہئے، اس کے بعد اس مسئلہ کی نوبت آسکتی ہے مگر اس کا اصل مقام یہ نہیں بلکہ "علم کلام" ہے۔

ناقۃ اللہ

غرض حضرت صالح علیہ السلام قوم (ثمود) کو بار بار سمجھاتے اور نصیحت فرماتے رہے، مگر قوم پر مطلق اثر نہیں ہوا بلکہ اُس کا بغض و عناد ترقی پاتا رہا اور اُن کی مخالفت بڑھتی ہی رہی اور وہ کسی طرح بُت پرستی سے باز نہ آئی، اگرچہ ایک مختصر اور کمزور جماعت نے ایمان قبول کر لیا اور وہ مسلمان ہو گئی مگر قوم کے سردار اور بڑے بڑے سرمایہ دار اسی طرح باطل پرستی پر قائم رہے اور انھوں نے خدا کی دی ہوئی ہر قسم کی خوش عیشی اور رفاہیت کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے کفرانِ نعمت کو شعار بنالیا' وہ حضرتِ صالح علیہ السلام کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا کرتے کہ صالح! اگر ہم باطل پرست ہوتے، خدا کے صحیح مذہب کے منکر ہوتے اور اس کے پسندیدہ طریقہ پر قائم نہ ہوتے تو آج ہم کو یہ دھن دولت' سرسبز و شاداب باغات کی فراوانی، سیم و زر کی بہتات، بلند و عالی شان محلات کی رہائش، میوہ جات اور پھلوں کی کثرت، شیریں نہروں اور عمدہ مرغزاروں کی افزائش حاصل نہ ہوتی، تو خود کو اور اپنے پیروؤں کو دیکھ اور پھر ان کی تنگ حالی اور غربت پر نظر کر اور بتلا کہ خدا کے پیارے اور مقبول کون ہیں۔ ہم یا تم؟

حضرت صالح علیہ السلام فرماتے کہ تم اپنی اس رفاہیت اور عیش سامانی پر شیخی نہ مارو اور خدا کے سچے رسول اور اس کے دین برحق کا مذاق نہ اُڑاؤ، اس لئے کہ اگر تمہارے کبر و غرور اور عناد کا یہی حال رہا تو پل بھر میں یہ سب فنا ہو جائے گا اور پھر نہ تم رہو گے اور نہ تمہارا یہ ساز و سامان، بیشک یہ سب کچھ خدا کی نعمتیں ہیں بشرطیکہ اُن کو حاصل کرنے والے اُس کا شکر ادا کریں اور اس کے سامنے سر نیاز جھکائیں اور بلاشبہ یہی سامان عذاب و لعنت ہیں اگر ان کا استقبال شیخی اور غرور کے ساتھ کیا جائے، اس لئے یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ ہر سامانِ عیش خوشنودیِ الٰہی کا ثمرہ ہے ثمود کو یہ بھی حیرانی تھی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ہی میں کا ایک انسان خدا کا پیغمبر بن جائے اور وہ خدا کے احکام سُنانے لگے، وہ سخت تعجب سے کہتے۔

أَأُنزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنۢ بَيْنِنَا

کیا ہماری موجودگی میں اس پر (خدا کی) نصیحت اُترتی ہے۔

یعنی اگر ایسا ہونا ہی تھا تو اس کے اہل ہم تھے نہ کہ صالح' اور کبھی اپنی قوم کے کمزور افراد کو (جو کہ مسلمان ہو گئے تھے) خطاب کر کے کہتے:

---

[1] لندن ٹائمز۔

اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صَالِحاً مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔

کیا تم کو یقین ہے کہ بلاشبہ صالح اپنے پروردگار کا رسول ہے؟ اور مسلمان جواب دیتے:۔

قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ۔

انھوں نے بیشک ہم تو اُسکے لائے ہوئے پیغام پر ایمان رکھتے ہیں،

تب یہ متکبرین غصہ میں کہتے ہیں:۔

اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۔

بلاشبہ ہم تو اس شے کا جس پر تمہارا ایمان ہے انکار کرتے ہیں،

بہر حال حضرت صالح علیہ السلام کی مغرور اور سرکش قوم نے اُن کی پیغمبرانہ دعوت و نصیحت کو یُوں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور خدا کے نشان (معجزہ) کا مطالبہ کیا تب صالح علیہ السلام نے درگاہِ الٰہی میں دعا کی اور قبولیت کے بعد اپنی قوم سے فرمایا کہ تمہارا مطلوبہ نشان اونٹنی کی شکل میں یہ موجود ہے۔ دیکھو! اگر تم نے اس کو ایذا پہنچائی تو پھر یہی تمہاری ہلاکت کا نشان ثابت ہوگی اور خدائے تعالیٰ نے تمہارے اور اس کے درمیان پانی کے لئے باری مقرر فرمادی ہے ایک دن تمہارا ہے اور ایک دن اس کا لہٰذا اس میں فرق نہ آئے۔

قرآنِ عزیز نے اس کو ناقۃ اللہ (خدا کی اونٹنی) کہا ہے تاکہ پیشِ نظر رہے کہ یوں تو تمام مخلوق خدا ہی کی ملکیت ہے، مگر ثمود نے چونکہ اس کو خدا کی ایک نشانی کی شکل میں طلب کیا تھا اس لئے اس کی موجودہ خصوصیت اور اعزاز نے اس کو ناقۃ اللہ کا لقب دلایا اور نیز اس کو لکم اٰیۃ کہہ کر یہ بھی بتایا کہ یہ نشانی اپنے اندر خاص

۱: قرآن عزیز سے اس سلسلہ میں صرف دو باتیں ثابت ہیں ایک یہ کہ ثمود نے حضرتِ صالح علیہ السلام سے نشان (معجزہ) طلب کیا اور حضرت صالح علیہ السلام نے "ناقہ" کو بطور نشانی پیش کیا، دوسرے یہ کہ حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کو یہ ہدایت کردی تھی کہ وہ اس کو ضرر نہ پہنچائے اور پانی کی باری مقرر کرلے کہ ایک روز ناقہ کا اور دوسرا قوم کا، اور اگر اس کو نقصان پہنچایا تو یہی قوم کی ہلاکت کا نشان ہوگا، چنانچہ انھوں نے "ناقہ" کو ہلاک کردیا اور خدا کے عذاب سے خود بھی ہلاک ہوگئے۔
اس سے زائد جو کچھ ہے اس کا مدار یا ان روایاتِ حدیثی پر ہے جو اخبارِ آحاد کے درجہ میں شمار ہیں اور یا بائبل اور تاریخ قدیم کی روایات پر، جہاں تک اخبارِ آحاد کا تعلق ہے محدثین کے نزدیک ان میں سے بعض صحیح روایات آنے کی روایات کو سندِ روایات کے اصول پر نقل نہیں فرمایا بلکہ ایک تاریخی واقعہ کی طرح تحریر فرمایا ہے۔
واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قوم ثمود جب حضرتِ صالح علیہ السلام کی تبلیغ حق سے اکتا گئی تو اس کے سرخیل اور سرگروہ افراد نے قوم کی موجودگی میں مطالبہ کیا کہ اے صالح! اگر تو واقعی خدا کا فرستادہ ہے تو کوئی نشانی دکھا تاکہ ہم تیری صداقت پر ایمان لے آئیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ نشان آنے کے بعد بھی انکار پر مُصِر اور سرکشی پر قائم رہو، قوم کے ان سرداروں نے تاکید وعدہ کیا کہ ہم فوراً ایمان لے آئیں گے۔ تب حضرتِ صالح علیہ السلام نے انہی سے دریافت کیا کہ وہ کس قسم کا نشان چاہتے ہیں، انھوں نے مطالبہ کیا کہ سامنے والے پہاڑ میں سے یا بستی کے اس پتھر میں سے جو کنارہ پر نصب ہے ایک ایسی اونٹنی ظاہر کر کہ جو گابھن ہو اور فوراً بچہ دے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے درگاہِ الٰہی میں دعاء کی اور اُسی وقت اُن سب کے سامنے پہاڑ یا پتھر میں سے حاملہ اونٹنی ظاہر ہوئی اور اس نے بچہ دیا۔ یہ دیکھ کر ان سرداروں میں سے جندع بن عمرو تو اُسی وقت مشرف با اسلام ہوگیا اور دوسرے سرداروں نے بھی جب اس کی پیروی میں اسلام لانے کا ارادہ کیا تو ان کے ہیکلوں اور مندروں کے مہنتوں ذؤاب بن عمرو اور حباب اور اُن کے کاہن رُباب بن صفر نے اُن کو اس سے باز رکھا اور اسی طرح باقی دوسروں کو بھی اسلام لانے سے روکا۔ (جاری ہے)

اہمیت رکھتی ہے لیکن بد قسمت قوم ثمود زیادہ دیر تک اس کو برداشت نہ کر سکی اور ایک روز سازش کر کے قدار بن سالف کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ اُس کے قتل میں پہل کرے اور باقی اعانت کریں۔ اور اس طرح ناقہ کو ہلاک کر ڈالا۔ حضرت صالح علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا تو آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے۔ بد بخت قوم! آخر تجھ سے صبر نہ ہو سکا اب خدا کے عذاب کا انتظار کر تین روز کے بعد وہ نہ ٹلنے والا عذاب آئے گا اور تم سب کو ہمیشہ کے لئے

(گذشتہ سے پیوستہ)

اب حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کے تمام افراد کو تنبیہ کی کہ دیکھو یہ نشانی تمہاری طلب پر بھیجی گئی ہے، خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ پانی کی باری مقرر ہو، ایک دن اس ناقہ کا ہو گا اور ایک دن ساری قوم اور اس کے سارے چوپاؤں کا۔ اور خبر دار اس کو کوئی اذیت نہ پہنچے، اگر اس کو آزار پہنچا تو پھر تمہاری بھی خیر نہیں ہے۔

قوم نے اگر چہ اس حیرت زا معجزہ کو دیکھ کر ایمان قبول نہ کیا لیکن دلوں کے اقرار تے اُس کو آزار پہنچانے سے باز رکھا، اور یہ دستور جاری رہا کہ پانی کی باری ایک روز ناقہ کی رہتی اور تمام قوم اس کے دودھ سے فائدہ اُٹھاتی اور دوسرے روز قوم کی باری ہوتی اور ناقہ اور اُس کا بچہ بغیر روک ٹوک چراگاہوں میں چرتے اور آسودہ رہتے، مگر آہستہ آہستہ یہ بات بھی ان کو کھٹکنے لگی اور آپس میں صلح و مشورے ہونے لگے کہ اس ناقہ کا خاتمہ کر دیا جائے تو اس باری والے قصے سے نجات ملے، کیونکہ ہمارے چوپاؤں کے لئے خود ہمارے اپنے لئے یہ قید ناقابل برداشت ہے۔ یہ باتیں اگر چہ ہوتی رہتی تھیں لیکن کسی کو اُس کے قتل کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، مگر ایک حسین و جمیل مالدار عورت صدوق تے خود کو ایک شخص مصدع کے سامنے اور ایک مالدار عورت عنیزہ نے اپنی ایک خوبصورت لڑکی کو قیدار کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اگر وہ دونوں ناقہ کو ہلاک کر دیں تو یہ تمہاری ملک ہیں تم ان کو بیوی بنا کر عیش کرو۔ آخر قیدار بن سالف اور مصدع کو اس کے لئے آمادہ کر لیا گیا۔ اور طے پایا کہ وہ راہ میں چھپ کر بیٹھ جائیں گے اور ناقہ جب چراگاہ جانے لگے تو اس پر حملہ کر دیں گے اور چند دوسرے آدمیوں نے بھی مدد کا وعدہ کیا۔

غرض ایسا ہی کیا گیا اور ناقہ کو اس طرح سازش کر کے قتل کر ڈالا اور پھر آپس میں حلف لیا کہ رات ہونے پر ہم سب صالح علیہ السلام اور اس کے اہل و عیال کو بھی قتل کر دیں گے اور پھر اُس کے اولیاء کو قسمیں کھا کر یقین دلائیں گے کہ یہ کام ہمارا نہیں ہے۔

اور بچہ یہ دیکھ کر بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور چیختا اور بولتا ہوا پہاڑ میں غائب ہو گیا۔

صالح علیہ السلام کو جب یہ خبر ہوئی تو حسرت و افسوس کے ساتھ قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آخر وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا، اب خدا کے عذاب کا انتظار کرو جو تین دن کے بعد تم کو تباہ کر دے گا، اور پھر بجلی کی چمک اور کڑک کا عذاب آیا اور اس نے رات میں سب کو تباہ کر دیا، اور آنے والے انسانوں کے لئے تاریخی عبرت کا سبق دے گیا۔

اس واقعہ کے ساتھ ساتھ محدث ابن کثیر نے چند روایاتِ حدیثی بھی بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً

غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جب آپ کا گذر حجر پر ہوا تو صحابہ نے ثمود کے کنوئیں سے پانی بھرا اور آٹا گوندھ کر روٹیاں تیار کرنے لگے، نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا تو پانی گرا دیئے اور ہانڈیاں اوندھی کر دینے، اور آٹا بیکار کر دینے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ وہ بستی ہے جس پر خدا کا عذاب ہوا، یہاں نہ قیام کرو اور نہ یہاں کی اشیاء سے فائدہ اٹھاؤ، آگے بڑھ کر پڑاؤ ڈالو ایسا نہ ہو کہ تم بھی کسی بلا میں مبتلا ہو جاؤ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم ان حجر کی بستیوں میں خدا سے ڈرتے عجز و زاری کرتے اور روتے ہوئے داخل ہوا کرو، ورنہ ان میں داخل ہی نہ ہوا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی اپنی غفلت کی وجہ سے عذاب کی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جب رسولِ اکرم ﷺ حجر میں داخل ہوئے تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے نشانیاں طلب نہ کیا کرو (دیکھو صالح علیہ السلام کی قوم نے نشان طلب کیا تھا اور وہ ناقہ پہاڑ کی کھوہ سے نکلتی اور اپنی باری میں کھا پی کر وہیں واپس چلی جاتی اور جو اس کی باری کا دن تھا اس میں قوم ثمود کو اپنے دودھ سے سیراب کرتی تھی، مگر ثمود نے آخر کار سرکشی کی اور ناقہ کی کونچیں کاٹ کر اس کو ہلاک کر دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے ان پر "چیخ کا عذاب" مسلط کر دیا، اور وہ اس عذاب سے گھروں کے اندر

(جاری ہے)

تہس نہس کر جائے گا۔

سید آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی[1] میں تحریر فرماتے ہیں کہ ثمود پر عذاب آنے کی علامات اگلی صبح ہی سے شروع ہو گئیں یعنی پہلے روز ان سب کے چہرے اس طرح زرد پڑ گئے جیسا کہ خوف کی ابتدائی حالت میں ہو جایا کرتا ہے اور دوسرے روز سب کے چہرے سُرخ تھے گویا خوف و دہشت کا یہی دوسرا درجہ تھا اور تیسرے روز ان سب کے چہرے سیاہ تھے اور تاریکی چھائی ہوئی تھی، یہ خوف و دہشت کا وہ تیسرا مقام ہے جس کے بعد موت ہی کا درجہ باقی رہ جاتا ہے، تین دن کی ان علاماتِ عذاب نے اگرچہ اُن کے چہروں کو واقعی زرد، سُرخ اور تاریک بنادیا تھا، لیکن ان رنگوں کی ترتیبی خصوصیت یہ صاف بتارہی ہے کہ ان کے دلوں کو صالح علیہ السلام کے سچے ہونے کا یقین تھا اور صرف حسد و بغض سے انکار کرتے تھے، اب جبکہ خدا کے حکم کے خلاف "جرم" کر چکے اور اس کی پاداش میں صالح علیہ السلام سے عذاب کی ہولناک خبر سنی تو ان پر خوف و دہشت کے وہ فطری رنگ اور نقوش نمایاں ہونے لگے جو موت کے یقین کے وقت خوف و دہشت سے مجرموں کے اندر پیدا ہوا کرتے ہیں۔

بہر حال ان تین دن کے بعد وقت موعود آپہنچا اور رات کے وقت "ایک ہیبتناک آواز" نے ہر شخص کو اُسی حالت میں ہلاک کر دیا جس حالت میں وہ تھا، قرآنِ عزیز نے اس ہلاکت آفریں آواز کو کسی مقام پر صاعقہ (کڑک دار بجلی) اور کسی جگہ رجفہ (زلزلہ ڈال دینے والی شے) اور بعض جگہ طاغیہ (دہشتناک) اور بعض جگہ صیحہ (چیخ) فرمایا۔ سلئے کہ یہ تمام تعبیرات ایک ہی حقیقت کے مختلف اوصاف کے اعتبار سے کی گئی ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ

گذشتہ سے پیوستہ)
ہی مُردہ ہو کر رہ گئے، صرف ایک شخص ابورغال نامی باقی بچا جو حرم میں گیا ہوا تھا لیکن جب وہ حدودِ حرم سے باہر آیا تو فوراً اُسی عذاب کا شکار ہو گیا۔

حافظ ابن کثیر نے یہ تینوں روایات سند کے ساتھ مسندِ احمد سے نقل کر کے ان کی توثیق کی ہے۔ (تاریخ ابن کثیر جلد اس ۱۳۸۔۱۳۹)
اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ قرآنِ عزیز سے یہ تو یقین کے ساتھ ثابت ہے کہ "ناقۃ اللہ" خدا کا ایک نشان تھی اور اپنے اندر ضرور کوئی ایسی خصوصیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے وہ ایسا نشان کہلا سکے جس کا ذکر قرآنِ عزیز اس اہمیت کے ساتھ کر رہا ہے هذه ناقة الله لكم آية یہ ناقۃ اللہ تمہارے لئے نشان ہے اور پھر پانی کی باری جس طرح ناقہ اور قوم ثمود کے درمیان تقسیم فرمائی وہ خود ایک مستقل دلیل ہے کہ یہ ناقہ "ضرور اپنے اندر ایسی حیثیت رکھتی تھی جو نشان الٰہی کہلا سکے لیکن یہ بات کہ "ناقہ" کا وجود کس طرح ہوا اور کن وجوہ سے "نشانِ الٰہی" یا معجزہ بنی قرآنِ عزیز اس سے ساکت ہے۔ البتہ مختلف صحیح اخبار آحاد سے اس واقعہ پر ضرور روشنی پڑتی ہے جس کی تفصیل ابن کثیر سے بھی نقل ہو چکی مگر واقعہ کی تفصیل صراحت و وضاحت وہاں بھی موجود نہیں ہے بلکہ کتب تفسیر میں اسرائیلیات سے منقول ہے یا ضعیف روایات سے اخذ کی گئی ہے، لہٰذا مناسب یہی ہے کہ واقعہ کے اجمال و تفصیل میں فرقِ مراتب کا ضرور خیال رکھا جائے، جس قدر قرآنِ عزیز نے تصریح کی ہے وہ بغیر کسی تاویل کے واجب الاعتقاد ہے اور جس قدر صحیح روایات سے (اگرچہ وہ آحاد ہی کے درجہ کی ہیں) اس اجمال کی تفصیل کا پتہ ملتا ہے وہ اجمال کی تفصیل کی حیثیت سے قابلِ قبول ہیں، گو قرآنِ عزیز کی تصریحات کے وجہ کو نہ پہنچ سکیں اور ان سے زیادہ باقی تفصیلات کی حیثیت وہی ہے جو عام تاریخی وقائع اور اسرائیلیات کی حیثیت ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)
۱: ج ۸ صفحہ ۱۴۵، ۱۴۶۔

خدا تعالیٰ کے اس عذاب کی ہولناکیاں کیسی گوناگوں تھیں، تم ایک ایسی کوندنے والی بجلی کا تصور کرو جو بار بار اضطراب کے ساتھ چمکتی، کڑکتی اور گرجتی ہو اور اس طرح کوندرہی ہو کہ کبھی مشرق میں ہے تو کبھی مغرب میں، اور جب ان تمام امِ صفات کے ساتھ چمکتی کوندتی، گرجتی، لرزتی، لرزاتی ہوئی کسی مقام پر ایک ہولناک چیخ کے ساتھ گرے تو اُس مقام اور اسکے نواح کا کیا حال ہوگا؟ یہ ایک معمولی اندازہ ہے اُس عذاب کا جو ثمود پر نازل ہوا اور اُن کو اور اُن کی بستیوں کو تباہ و برباد کر کے سرکشوں کی سرکشی اور مغروروں کے غرور کا انجام ظاہر کرنے کیلئے آنے والی نسلوں کے سامنے عبرت پیش کر گیا۔

ایک طرف ثمود پر یہ عذاب نازل ہوا اور دوسری جانب صالح علیہ السلام اور ان کے پیرو مسلمانوں کو خدا نے اپنی حفاظت میں لے لیا اور اُن کو اس عذاب سے محفوظ رکھا۔

حضرت صالح علیہ السلام حزن و ملال کے ساتھ ہلاک شدگان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمانے لگے:۔

يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النَّاصِحِيْنَ ○

اے قوم! بلاشبہ میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچایا اور تم کو نصیحت کی لیکن تم تو نصیحت کرنیوالوں کو دوست ہی نہ رکھتے تھے۔

ہلاک شدہ قوم کی جانب حضرت صالح علیہ السلام کا یہ خطاب اسی طرح کا خطاب تھا جس طرح بدر میں مشرکینِ مکہ کے سرداروں کی ہلاکت کے بعد مردہ نعشوں کے گڑھے پر کھڑے ہو کر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا:۔

یا فلا ن بن فلان و فلان بن فلان ایسّر کم أنکم اطعتم اللّٰه ورسوله فانّا قد وجد نا ما وعدنا ربنا حقاً فهل وجدتم ماوعدربکم حقاً۔ (الحدیث) (بخاری، ج ۲ باب المغازی)

اے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں کیا تم کو اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت پسند آئی؟ بلاشبہ ہم نے وہ سب کچھ پالیا جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا تھا، پس کیا تم نے بھی وہ پایا جو تمہارے رب نے تم سے وعدہ کیا تھا؟

اس قسم کے خطاب کے بارہ میں علماء کی چند رائیں ہیں:۔

۱ اس قسم کا خطاب انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات میں سے ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس کلام کو بلاشبہ مُردوں کو سُنوا دیتا ہے اگرچہ وہ جواب دینے سے قاصر ہیں' اس لئے جب نبی اکرم ﷺ نے مشرکین کی لاشوں کو اس طرح مخاطب کیا تو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے تعجب سے پوچھا۔ کیا یہ سن رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! تم سے زیادہ مگر جواب سے عاجز ہیں۔"

۲ یہ طریق خطاب حزن و ملال کے اظہار کے لئے ہوتا ہے، مثلاً تم نے کسی شخص کو متنبہ کیا کہ اس باغ میں نہ جانا' سانپ بڑی کثرت سے ہیں' ڈسے جانے کا خطرہ ہے، مگر وہ شخص باغ میں گیا اور ڈسا گیا تو جب یہ تنبیہ کرنے والا اُس کی نعش پر پہنچتا ہے تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے، افسوس کیا میں نے تجھ سے کہا تھا کہ باغ میں نہ جانا ورنہ ڈسا جائے گا آخر وہی ہوا۔

۳ اس قسم کے خطاب کے اصل مخاطب وہ زندہ انسان ہوتے ہیں جو ان مردہ نعشوں کو دیکھ رہے ہیں تاکہ

ان کو عبرت حاصل ہو اور وہ اس قسم کی سرکشی کی جرأت نہ کر سکیں۔

قوم کی ہلاکت اور صالح علیہ السلام کا قیام

یہ ایک تاریخی سوال ہے کہ جب ثمود ہلاک و برباد ہو گئے تو صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے مسلمانوں نے کہاں سکونت اختیار کی؟

اس سوال کا جواب اور حتمی طور پر دینا تو قریب قریب ناممکن ہے البتہ غالب گمان یہ ہے کہ وہ قوم کی ہلاکت کے بعد علاقہ فلسطین میں آکر آباد ہوئے اس لئے کہ حجر کے قریب یہی مقام ایسا تھا جو سرسبز و شاداب اور مویشیوں کے پانی اور چارہ کے لئے بہترین تھا اور فلسطین کے علاقہ میں یہ جگہ نواحی رملہ ہو گی یا کوئی دوسرا مقام۔
علماء تفسیر اس کے جواب میں متعدد اقوال پیش فرماتے ہیں:۔

۱ وہ فلسطین کے علاقہ میں رملہ کے قریب آباد ہوئے۔ خازن نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

۲ وہ حضر موت میں آ کر آباد ہوئے اس لئے کہ ان کا اصل وطن یہی تھا اس لئے کہ یہ احقاف ہی کا ایک حصہ ہے، یہاں ایک قبر ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ صالح علیہ السلام کی قبر ہے۔

۳ وہ ثمود کی ہلاکت کے بعد ان ہی بستیوں میں آباد رہے، یہ عام مورخین کی رائے ہے۔

۴ وہ قوم کی ہلاکت کے بعد مکہ معظمہ تشریف لے آئے اور وہیں مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال فرمایا، اور ان کی قبر مبارک کعبہ سے غربی جانب حرم ہی میں ہے، سید آلوسی اسی کو راجح سمجھتے ہیں۔

سید آلوسی نے اپنی تفسیر میں ایک قول نقل کیا ہے جس میں بتایا ہے کہ صالح علیہ السلام پر ایمان لانے والے جو مسلمان ان کے ساتھ عذاب سے محفوظ اور نجات یافتہ رہے ان کی تعداد تقریباً ایک سو بیس تھی اور ہلاک شدہ تقریباً ڈیڑھ ہزار گھرانے تھے۔

اب اس تمام این و آں کے بعد اس کلام بلاغت نظام "قرآن عزیز" کی آیات کا مطالعہ فرمایئے جو ان واقعات کا حقیقی سرچشمہ ہیں اور عبرت و موعظت کا بے نظیر سامان مہیا کرتی ہیں۔

۱ وَإِلَىٰ ثَمُوْدَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَاقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ آيَةً فَذَرُوْهَا تَأْكُلْ فِيْٓ أَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ○ وَاذْكُرُوْٓا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا فَاذْكُرُوْٓا آلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُوْنَ أَنَّ صَالِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قَالُوْٓا إِنَّا بِمَآ أُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ○ قَالَ الَّذِيْنَ

اسْتَكْبَرُوْٓا إِنَّا بِالَّذِيْٓ آمَنْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ ○ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يَاصَالِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جَاثِمِيْنَ ○ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يَاقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النَّاصِحِيْنَ ○ (اعراف ع ۱۰)

اور (اسی طرح) ہم نے قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے صالح کو بھیجا، اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، دیکھو تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل تمہارے سامنے آچکی ہے، یہ خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی تمہارے لئے ایک (فیصلہ کن) نشانی ہے، پس اسے کھلا چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرے، اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ کہ (اس کی پاداش میں) عذاب جانکاہ تمہیں آپکڑے اور وہ وقت یاد کرو کہ خدا نے تمہیں قوم عاد کے بعد اس کا جانشین بنایا اور اس سرزمین میں اس طرح بسادیا کہ میدانوں سے محل بنانے کا کام لیتے ہو اور پہاڑوں کو بھی تراش کر اپنا گھر بنا لیتے ہو (یہ اس کا تم پر احسان ہے) پس اللہ کی نعمتیں یاد کرو، اور ملک میں سرکشی کرتے ہوئے خرابی نہ پھیلاؤ" قوم کے جن سربر آوردہ لوگوں کو (اپنی دولت و طاقت کا) گھمنڈ تھا انھوں نے مومنوں سے کہا، اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جنھیں (افلاس و بیچارگی کی وجہ سے) کمزور و حقیر سمجھتے تھے۔ "کیا تم نے سچ مچ کو معلوم کرلیا ہے کہ صالح خدا کا بھیجا ہوا ہے؟ (یعنی ہمیں تو ایسی کوئی بات اس میں دکھائی دیتی نہیں)" انھوں نے کہا، ہاں! بیشک جس پیام حق کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے، ہم اس پر پورا یقین رکھتے ہیں" اس پر گھمنڈ کرنیوالوں نے کہا۔ "تمہیں جس بات کا یقین ہے ہمیں اس سے انکار ہے، غرضکہ انھوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔ انھوں نے کہا، اے صالح!! اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو، تو اب وہ بات ہم پر لا دکھاؤ جس کا تم نے ہمیں خوف دلایا تھا، پس ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آلیا۔ اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے منہ پڑے تھے! پھر صالح ان سے کنارہ کش ہوگیا، اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے پروردگار کا پیام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی، مگر افسوس تم پر! تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔"

۲ وَإِلٰى ثَمُوْدَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَاقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ هُوَ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا إِلَيْهِ إِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ○ قَالُوْا يَاصَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ أَتَنْهَانَآ أَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ إِلَيْهِ مُرِيْبٍ ○ قَالَ يَاقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَآتَانِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ إِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ○ وَيَاقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ آيَةً

فَذَرُوْهَا تَأْكُلْ فِيْٓ أَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۝ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۝ فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَّالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ وَأَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جَاثِمِيْنَ ۝ كَأَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا أَلَآ إِنَّ ثَمُوْدَا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ أَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ۝ (هود ع ٦)

اور ہم نے قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، وہی ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور پھر اسی میں تمہیں بسادیا، پس چاہیے کہ اس سے بخشش مانگو اور اس کی طرف رجوع ہو کر رہو۔ یقین کرو میرا پروردگار (ہر ایک کے) پاس ہے۔ اور (ہر ایک کی) دعاؤں کا جواب دینے والا ہے!" لوگوں نے کہا "اے صالح! پہلے تو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں تجھ سے وابستہ تھیں، پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ان معبودوں کی پوجا نہ کریں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں؟ (یہ کیسی بات ہے؟) ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے، جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارے دل میں اترتی نہیں" صالح نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں اور اس نے اپنی رحمت مجھے عطا فرمائی ہو تو پھر کون ہے جو اللہ کے مقابلہ میں میری مدد کریگا اگر میں اس کے حکم سے سرتابی کروں؟ تم (اپنی توقع کے مطابق دعوت کار دیکر) مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے تباہی کی طرف لیجانا چاہتے ہو" اور اے میری قوم کے لوگو! دیکھو اللہ کی اونٹنی (یعنی اس کا نشان) تمہارے لئے ایک (فیصلہ کن) نشانی ہے، پس اسے چھوڑ دو اللہ کی زمین میں چرتی رہے، اسے کسی طرح کی اذیت نہ پہنچانا، ورنہ فوراً عذاب تمہیں آپکڑے گا"۔ لیکن لوگوں نے (اور زیادہ ضد میں آکر) اسے ہلاک کر ڈالا۔ تب صالح نے کہا "(اب تمہیں صرف)" تین دن کی مہلت ہے، اپنے گھروں میں کھاپی لو، یہ وعدہ ہے جھوٹا نہ نکلے گا پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے بچالیا اور اس دن کی رسوائی سے نجات دیدی (اے پیغمبر!) بلاشبہ تیرا پروردگار ہی ہے جو قوت والا اور سب پر غالب ہے! اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کا یہ حال ہوا کہ ایک روز کڑک نے آلیا۔ جب صبح ہوئی تو سب اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے (وہ اس طرح اچانک مرگئے) گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے! تو سن رکھو کہ ثمود نے اپنے پروردگار کی ناشکری کی، اور ہاں سن رکھو کہ ثمود کے لئے محرومی ہوئی!

۳ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَآتَيْنَاهُمْ آيَاتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝ وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا آمِنِيْنَ ۝ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ۝ فَمَآ أَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (حجر ع ٦)

اور دیکھو حجر کے لوگوں نے بھی رسولوں کی بات جھٹلائی، ہم نے اپنی نشانیاں انھیں دکھائیں، مگر وہ روگردانی ہی کرتے رہے، وہ پہاڑ تراش کر گھر بناتے تھے کہ محفوظ رہیں لیکن (یہ حفاظتیں کچھ بھی کام نہ آئیں) ایک دن صبح کو اٹھے تو ایک ہولناک آواز نے آپکڑا تھا، اور جو کچھ انھوں نے اپنی سعی و عمل سے کمایا تھا وہ کچھ بھی ان کے کام نہ آیا۔

۳ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ○ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوْهُمْ صَالِحٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ○ إِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ○ وَمَآ أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ أَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هَاهُنَا آمِنِيْنَ ○ فِيْ جَنَّاتٍ وَّعُيُوْنٍ ○ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ○ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فَارِهِيْنَ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ○ وَلَا تُطِيْعُوْٓا أَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ○ قَالُوْٓا إِنَّمَآ أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ○ مَآ أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ ○ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ○ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ فَعَقَرُوْهَا فَأَصْبَحُوْا نَادِمِيْنَ ○ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً وَّمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ○

جھٹلایا ثمود نے پیغام لانے والوں کو جب کہا ان کو ان کے بھائی صالح نے کیا تم ڈرتے نہیں میں تمہارے پاس پیغام لانے والا ہوں معتبر، سوڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ بدلہ، میرا بدلہ ہی اسی جہان کے پالنے والے پر، کیا چھوڑے رکھیں گے تم کو یہاں کی چیزوں میں بے خوف، باغوں اور چشموں میں اور کھیتوں میں اور کھجوروں میں جن کا خوشہ نرم ہے اور تراشتے ہو پہاڑوں میں گھر تکلف کے، سوڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور نہ مانو حکم بیباک لوگوں کا جو خرابی کرتے ہیں ملک میں اور اصلاح نہیں کرتے، بولے تجھ پر تو کسی نے جادو کیا ہے۔ تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم، سولے آ کچھ نشانی اگر تو سچا ہے، کہا یہ اونٹنی ہے اس کے لئے پانی پینے کی ایکباری اور تمہارے لئے باری ایک دن مقرر، اور مت چھیڑیو اس کو بری طرح سے پھر پکڑ لے تم کو آفت ایک بڑے دن کی، پھر کونچیں کاٹیں اس اونٹنی کی پھر کل کو رہ گئے پچھتاتے پھر آپکڑا ان کو عذاب نے البتہ اس بات میں نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم کرنے والا۔

۴ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَآ إِلٰى ثَمُوْدَ أَخَاهُمْ صَالِحًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَإِذَا هُمْ فَرِيْقَانِ

يَخْتَصِمُوْنَ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ۝ وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَأَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهٖ وَإِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِيْنَ ۝ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوْا إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَأَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ (النمل ۲۷ آیت ۴۵-۵۳)

اور ہم نے بھیجا تھا ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو کہ بندگی کرو اللہ کی پھر وہ تو دو فرقے ہو کر لگے جھگڑنے کہا اے میری قوم کیوں جلدی مانگتے ہو برائی کو پہلے بھلائی سے۔ کیوں نہیں گناہ بخشواتے اللہ سے شاید تم پر رحم ہو جائے، بولے ہم نے منحوس قدم دیکھا تجھ کو اور تیرے ساتھ والوں کو، کہا تمہاری بری قسمت اللہ کے پاس ہے تمہارا کہنا صحیح نہیں بلکہ تم جانچے جاتے ہو اور تھے اس شہر میں نو شخص کہ خرابی کرتے ملک میں اور اصلاح نہ کرتے بولے کہ آپس میں قسم کھاؤ اللہ کی کہ البتہ رات کو جاپڑیں ہم اس پر اور اس کے گھر پر پھر کہہ دیں گے اس کے دعوی کرنے والے کو ہم نے نہیں دیکھا جب تباہ ہوا اس کا گھر اور ہم بیشک سچ کہتے ہیں اور انھوں نے بنائی ایک خفیہ تدبیر اور ہم نے بنائی ایک پوشیدہ تدبیر اور ان کو خبر نہ ہوئی پھر دیکھ لے کیسا ہوا انجام ان کے فریب کا کہ ہلاک کرڈالا ہم نے ان کو اور ان کی قوم کو سب کو سو یہ پڑے ہیں ان کے گھر ڈھئے ہوئے بسبب ان کے انکار کے، البتہ اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں، اور بچادیا ہم نے ان کو جو یقین لائے تھے اور بچتے رہے تھے۔

۲ وَأَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَأَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ (حٰمٓ السجدہ ۴۱ آیت ۱۷-۱۸)

اور جو ثمود تھے سو ہم نے ان کو راہ بتائی پھر ان کو پسند آیا اندھا رہنا راہ سوجھنے سے، پھر پکڑا ان کو کڑک نے ذلت کے عذاب کی، بدلہ اس کا جو کماتے تھے اور بچادیا ہم نے ان لوگوں کو جو یقین لائے تھے اور بچکر چلتے تھے (برائی سے)۔

۳ وَفِيْ ثَمُوْدَ إِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ۝ فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ۝ (الذاریات)

اور نشانی ہے ثمود میں جب کہاان کو فائدہ اٹھالوایک وقت تک پھر شرارت کرنے لگے اپنے رب کے حکم سے، پھر پکڑاان کو کڑک نے اور وہ دیکھتے تھے پھر نہ ہوسکا ان سے کہ اٹھیں اور نہ ہوئے کہ بدلہ لیں۔

۸ وَأَنَّهٗٓ أَهْلَكَ عَادَاِ الْأُوْلٰى ○ وَثَمُوْدَ فَمَآ أَبْقٰى ○ (النجم ع ۳)

اور یہ کہ اس نے غارت کیا عادِاول کو، اور ثمود کو پھر کسی کو باقی نہ چھوڑا۔

۹ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ○ فَقَالُوْٓا أَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ إِنَّآ إِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ○ ءَأُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌ ○ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُ ○ إِنَّا مُرْسِلُو النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ○ وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ○ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ○ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ○ إِنَّآ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ○ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ○ (القمر ع ۲)

جھٹلایا ثمود نے ڈر سنانے والوں کو، پھر کہنے لگے کیا ایک آدمی ہم میں کا اکیلا ہم اس کے کہے پر چلیں گے تو تو ہم غلطی میں پڑے اور آگ میں جھکے کیا اتری اسی پر نصیحت ہم سب میں سے کوئی نہیں یہ جھوٹا ہے بڑائی مارتا ہے اب جان لیں گے کہ کل کو کون ہے جھوٹا بڑائی مارنیوالا، ہم بھیجتے ہیں اونٹنی ان کے جانچنے کے واسطے سو انتظار کر ان کا اور سہتا رہ اور سنادے ان کو کہ پانی کی تقسیم ہے ان میں ہر ایک (فریق) اپنی باری پر پہنچے پھر پکارا انھوں نے اپنے رفیق کو پھر ہاتھ چلایا اور کاٹ ڈالا، پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ ہم نے بھیجی ان پر ایک (خوفناک) چیخ پھر رہ گئے جیسے روندی ہوئی باڑ کانٹوں کی، اور ہم نے آسان کر دیا قرآن کو سمجھنے کے لئے، پھر ہے کوئی سوچنے والا۔

۱۰ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ ○ فَأَمَّا ثَمُوْدُ فَأُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ○

جھٹلایا ثمود اور عاد نے اس کھڑ کھڑانے والی (بات) کو سو جو ثمود تھے سو غارت کر دیے گئے اچھال کر (سخت بھونچال سے)۔

۱۱ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَا ○ إِذِ انْبَعَثَ أَشْقٰهَا ○ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ○ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا ○ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ○ (الشمس)

جھٹلایا ثمود نے اپنی شرارت سے جب اٹھ کھڑا ہوا ان میں کا بدبخت، پھر کہا ان کو اللہ کے رسول نے خبردار ہو اللہ کی اونٹنی سے اور اس کے پانی پینے کی باری سے پھر انھوں نے اس کو جھٹلایا پھر پاؤں کاٹ ڈالے اس کے پھر

الٹ مارا ان کے رب نے بسبب ان کے گناہوں کے پھر برابر کر دیا سب کو اور اللہ نہیں ڈرتا پیچھا کرنے سے۔

چند عبرتیں

۱۔ "ناقۃ اللہ" اگرچہ صالح ﷺ کی صداقتِ رسالت کا ایک نشان تھی، تاہم قرآنِ عزیز کی تصریح ہے کہ وہ ثمود کے لئے آزمائش اور ابتلاء اور نتیجہ و ثمرہ میں ان کی ہلاکت کا نشان ثابت ہوئی۔

إِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝ (القمر ع ۱)

بے شک ہم بھیجنے والے ہیں ناقہ کو ان کی آزمائش اور امتحان کے لئے پس تم ان کے انتظار میں رہ اور صبر اختیار کر۔

۲۔ سنت اللہ یہ رہی ہے کہ اگر وہ اپنے پیغمبر کو کسی قوم کی ہدایت کے لئے بھیجے اور قوم اس کی ہدایت پر کان نہ دھرے تو ضروری نہیں کہ وہ قوم ہلاک ہی کر دی جائے لیکن جو قوم اپنے نبی سے اس وعدہ پر نشان طلب کرے کہ اگر ان کا مطلوبہ نشان ظاہر ہو گیا تو وہ ضرور ایمان لے آئیں گے اور پھر وہ ایمان نہ لائے تو اس قوم کی ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے اور خدائے تعالیٰ اس کو معاف نہیں کرتا تا آنکہ وہ تائب ہو جائے اور خدا کے دین کو قبول کر لے اور یا عذابِ الٰہی سے صفحہ ہستی سے مٹ کر دوسروں کے لئے عبرت کا سبب بن جائے۔

۳۔ مگر اس سنت اللہ سے نبی اکرم ﷺ کا پیغامِ رسالت مستثنیٰ ہے۔ اسلئے کہ آپ ﷺ نے تصریح فرمائی ہے کہ میں نے خدائے تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ میری امت (امتِ دعوت ہو یا امتِ اجابت) میں عذاب عام مسلط نہ فرمائے اور اللہ تعالیٰ نے میری دعاء قبول فرمائی۔ اور قرآنِ عزیز میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اس تصریح کی یہ کہہ کر تصدیق بھی فرما دی:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيْهِمْ

اے رسول اس حال میں کہ تو ان میں موجود ہے خدائے تعالیٰ (ان کافروں) پر عام عذاب مسلط نہ کریگا۔

۴۔ یہ مہلک غلطی اور نفس کا دھوکا ہے کہ انسان، خوش عیشی، رفاہیت اور دنیوی جاہ و جلال کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ جس قوم یا جس فرد کے پاس یہ سب کچھ موجود ہے وہ ضرور خدائے تعالیٰ کے سایہ میں ہے اور یہ کہ ان کی یہ خوش عیشی اس کی علامت ہے کہ خدائے تعالیٰ کی خوشنودی ان کے ساتھ ہے۔

یہ دھوکا اور غلطی اس لئے ہے کہ اس واقعہ میں جگہ جگہ یہ تصریح موجود ہے کہ بعض مرتبہ زیادہ سے زیادہ رفاہیت اور خوش عیشی زیادہ سے زیادہ عذاب و ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے، اگرچہ قوموں کے لئے اس کی مدت چند ماہ یا چند سال نہیں بلکہ گھبرا دینے والی مدت ہی کیوں نہ ہو مگر ہمہ قسم کی دنیوی کامرانیوں اور خوش عیشیوں کے ساتھ ساتھ جب ظلم، سرکشی اور غرور کسی قوم کا مستقل شعار بن جائے تو سمجھو کہ اس کی تباہی و ہلاکت کا وقت قریب آ پہنچا۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ

تیرے خدا کی پکڑ بہت سخت ہے

البتہ ان تمام رفاہیتوں کے ساتھ اگر قوم کے اکثر افراد خدا کے شکر گذار ہوں، اس کے بندوں کے ساتھ انصاف کرنے والے اور باہم حسن نیت اور خیر خواہی پر عامل ہوں تو بلا شبہ وہ مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہیں اور ان ہی کو دنیا و آخرت کی کامرانیوں کی بشارت ہے، اور ان ہی کے لئے یہ دنیوی عیش خدا کی بے غایت نعمتوں کی علامت ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (نور ع ۷)

اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کرلیا "جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کئے ہیں" یہ کہ ان کو زمین کی خلافت دے گا جیسا کہ ان سے اگلوں کو خلیفہ بنایا تھا اور ان کے لئے ان کا دین مضبوط کردے گا جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا (جن کی شان یہ ہوگی کہ) وہ میری بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو (کسی حیثیت سے بھی) شریک نہ کریں گے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ ○ (انبیاء ع ۷)

اور بلاشبہ ہم نے نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا کہ زمین کی وراثت میرے نیک بندوں کو حاصل ہوگی۔

یہ آیات صراحت کر رہی ہیں کہ حکومت و دولت کا وعدہ "وراثت" کی حیثیت سے صرف انھی کا حصہ ہے جو مومن بھی ہیں اور خدا کے احکام پر عامل بن کر صالحین (نیکو کاروں) کی صف میں بھی شامل ہیں یعنی جن کی اجتماعی زندگی کا قالب ایک ساتھ ان دونوں صفات سے متصف ہے ان کے لئے بلا شبہ یہ حکومت و دولت اللہ کا انعام و اکرام ہے۔

اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر "حکومت و دولت" کے لئے مومن و کافر کی کوئی تخصیص نہیں خدا کی حکمتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر یہ دنیوی اسباب کی شکل میں چلتی پھرتی چھاؤں ہے اور ایسی 'حکومت دولت' کے لئے ہرگز یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے ساتھ اللہ کی خوشنودی اور اسکا فضل و کرم بھی شامل حال ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

- نسب ابراہیم علیہ السلام
- آزر کی تحقیق
- مستشرقین کی ہرزہ سرائی کا جواب
- قرآن عزیز میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ
- ابراہیم علیہ السلام کا بتوں کے ساتھ معاملہ
- اسلام کے متعلق باپ سے مناظرہ
- قوم سے مناظرہ اور محاکمہ
- بادشاہ وقت سے مناظرہ
- سکونت و قیام قوم کی ہدایت کیلئے اضطراب
- مصر کی جانب سفر
- ابراہیم وہاجرہ
- ولادت اسمٰعیل علیہ السلام
- سارہ وہاجرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) سنتِ ختنہ
- ارضِ حجاز وہاجرہ و اسمٰعیل
- اسحٰق علیہ السلام بناءِ کعبہ
- چند اہم نتائج

نسب نامہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نسب نامہ توراۃ میں اس طرح مذکور ہے:۔

ابراہیم علیہ السلام (خلیل اللہ) بن تارخ بن ناحور، بن سروج، بن رعو، بن فالح، بن عابر، بن شالح بن ارفکشاذ، بن سام، بن نوح علیہ السلام ۔[1]

یہ تصریح تورات اور تاریخ کے مطابق ہے مگر قرآن عزیز نے ان کے والد کا نام آزر بتایا ہے،

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً (انعام)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا "کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟"

آزر کی تحقیق

چونکہ تاریخ اور تورات دونوں ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ بتاتے ہیں اور قرآنِ عزیز آزر کہتا ہے اس لئے علماء اور مفسرین نے اس مسئلہ کی تحقیق میں دو راہیں اختیار کی ہیں۔

۱ ایسی صورت کی جائے کہ دونوں ناموں کے درمیان مطابقت ہو جائے اور یہ اختلاف جاتا رہے۔

۲ تحقیق کے بعد فیصلہ کن بات کہی جائے کہ ان دونوں میں کون صحیح ہے اور کون غلط یا دونوں صحیح ہیں مگر دو جدا جدا ہستیوں کے نام ہیں۔

پہلے خیال کے علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں اور تارک عَلَم اسمی (اسمی

۱: ابن کثیر جلد ۱ ص ۶۷۔

نام) ہے اور آزر۔ علم وصفی (وصفی نام)

ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ آزر عبری زبان میں "محبّ صنم" کو کہتے ہیں اور چونکہ تارخ میں بت تراشی و بت پرستی دونوں وصف موجود تھا اسلئے آزر کے لقب سے مشہور ہوا، اور بعض کا گمان ہے کہ آزر کے معنی اعوج (کم فہم) یا بے وقوف اور پیر فرتوت کے ہیں، اور چونکہ تارخ میں یہ باتیں موجود تھیں اس لئے اس وصف سے موصوف کیا گیا۔ قرآن عزیز نے اسی مشہور وصفی علم کو بیان کیا ہے۔

سہیلی نے روض الانف میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ (جلد ۱)

اور دوسرے خیال کے علماء کی تحقیق یہ ہے کہ آزر اس بت کا نام ہے تارخ جس کا پجاری اور مہنت تھا، چنانچہ مجاہد (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ قرآن عزیز کی مسطورۂ بالا آیت کا مطلب یہ ہے۔

اَتَتَّخِذُ اٰزَرَ اِلٰهًا ای اتتخذ اصناماً الهة

کیا تو آزر کو خدا مانتا ہے یعنی بتوں کو خدا مانتا ہے؟

اور صغانی کی رائے بھی اس کے قریب قریب ہے، صرف نحوی اعتبار سے تقدیرِ کلام میں وہ ایک دوسری راہ اختیار کرتے ہیں، غرض ان دونوں کے نزدیک آزر "ابیہ" کا بدل نہیں ہے بلکہ بت کا نام ہے اور اس طرح قرآن عزیز میں ان کے والد کا نام مذکور نہیں، ایک مشہور قول یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام تارخ تھا اور چچا کا آزر، اور چونکہ آزر ہی نے ان کی تربیت کی تھی اور بمنزلہ اولاد کے پالا تھا اس لئے قرآن عزیز میں آزر کو باپ کہہ کر پکارا گیا جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا بھی ارشاد ہے۔

اَلْعَمُّ صِنْوُ اَبِيْهِ

چچا باپ ہی کی طرح ہے۔

علامہ عبدالوہاب نجار کی رائے یہ ہے کہ ان اقوال میں سے مجاہد کا قول قرین قیاس اور قابل قبول ہے اس لئے کہ مصریوں کے قدیم دیوتاؤں میں ایک نام ازوریس بھی آتا ہے جس کے معنی "خدائے قوی و معین" ہیں اور اصنام پرست اقوام کا شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ قدیم دیوتاؤں کے نام ہی پر جدید دیوتاؤں میں ایک نام ازوریس بھی آتا ہے جس کے معنی "خدائے قوی و معین" ہیں، اور اصنام پرست اقوام کا شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ قدیم دیوتاؤں کے نام ہی پر جدید دیوتاؤں کے نام رکھ لیا کرتے تھے، اس لئے اس بت کا نام بھی قدیم مصری دیوتا کے نام پر آزر رکھا گیا ورنہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام تارخ تھا، ہمارے نزدیک یہ تمام تکلفاتِ باردہ ہیں، اس لئے کہ قرآنِ عزیز نے جب صراحت کے ساتھ آزر کو ابِ ابراہیم (ابراہیم علیہ السلام کا باپ) کہا ہے تو پھر محض علماءِ انساب اور بائیبل کے تخمینی قیاسات سے متاثر ہو کر قرآن عزیز کی یقینی تعبیر کو مجاز کہنے یا اس سے بھی آگے بڑھ کر خوامخواہ قرآن عزیز میں نحوی مقدرات ماننے پر کون سی شرعی اور حقیقی ضرورت مجبور کرتی ہے، بر سبیل تسلیم اگر آزر عاشقِ صنم کو کہتے ہیں، یا بت کا نام ہے تب بھی بغیر تقدیرِ کلام اور بغیر کسی تاویل کے یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ ان ہر دو وجہ سے آزر کا نام آزر رکھا گیا جیسا کہ اصنام پرست اقوام کا قدیم

۱: تاج العروس ج ۳ ص ۱۲۔

سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ کبھی اپنی اولاد کا نام بتوں کا غلام ظاہر کر کے رکھتے تھے اور کبھی خود بت ہی کے نام پر نام رکھ دیا کرتے تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ ”آدار“ کالدی زبان میں بڑے پجاری کو کہتے ہیں اور عربی میں یہی ”آزر“ کہلایا۔ تارخ چونکہ بت تراش اور سب سے بڑا پجاری تھا۔ اس لئے ”آزر“ ہی کے نام سے مشہور ہو گیا، حالانکہ یہ نام نہ تھا بلکہ لقب تھا اور جبکہ لقب نے نام کی جگہ لے لی تو قرآنِ عزیز نے بھی اسی نام سے پکارا۔

نیز جس مقدس انسان (ابراہیم علیہ السلام) کی اخلاقی بلندی کا یہ عالم ہو کہ جب بت پرستی کی مذمت کے سلسلہ میں آزر سے مناظرہ ہو گیا اور آزر نے زچ ہو کر یہ کہا:

أَرَاغِبٌ أَنْتَ عَنْ آلِهَتِي يَآإِبْرَاهِيمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ○

اے ابراہیم علیہ السلام کیا تو میرے خداؤں سے بیزار ہے تو اگر اس حرکت سے باز نہ آیا میں ضرور تجھ کو سنگسار کر دوں گا اور جا میرے سامنے سے دور ہو جا۔

تو اس سخت گیر اور دل آزار گفتگو کے موقعہ پر بھی اس نے پدری رشتہ کی بزرگی کا احترام کیا، اور جواب میں صرف یہ فرمایا:

سَلَامٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ إِنَّهُ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ○ (مریم)

تجھ پر سلامتی ہو میں عنقریب تیرے لئے اپنے پروردگار سے بخشش چاہوں گا بلاشبہ وہ میرے ساتھ بہت مہربان ہے۔

اس ہستی سے یہ کیسے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے باپ آزر کو بے وقوف پیر فرتوت اور اسی قسم کے تحقیر آمیز الفاظ کے ساتھ خطاب کرے؟

پس بلاشبہ تارخ کا تارخ، آزر ہی ہے اور علم اسمی ہے نہ کہ علم وصفی اور تارخ یا غلط نام ہے اور یا آزر کا ترجمہ ہے جو تورات کے دوسرے اعلام کی طرح ترجمہ نہ رہا بلکہ اصل بن گیا۔ مراتشی سترھویں صدی کا ایک عیسائی عالم ہے اس نے قرآن عزیز کا ترجمہ کیا ہے اور قرآن عزیز پر نہایت رکیک اور متعصبانہ حملہ کئے ہیں، اس نے اس موقعہ پر بھی عادت کے مطابق ایک مہمل اور لچر اعتراض کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یوزبیوس کی تاریخ (کنیہ) کی ایک عبارت میں یہ لفظ آیا ہے جس کو غلط صیغہ کے ساتھ محمد ﷺ نے قرآن عزیز میں درج کر دیا۔

لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ مراتشی اپنے اس دعوے کے ثبوت میں نہ تاریخ کینہ کی وہ عبارت پیش کرتا ہے جس سے یہ لفظ ماخوذ بتایا گیا ہے اور نہ اس اصل لفظ ہی کا پتہ دیتا ہے کہ جس سے یہ غلط لفظ بنالیا گیا اور نہ یہ بتلاتا ہے کہ آخر محمد ﷺ کو اس نقل کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اس لئے یہ قطعاً بے دلیل اور بے سروپا بات ہے جو محض تعصب اور جہالت کی وجہ سے کہی گئی اور حق وہی ہے جو ہم نے ابھی واضح کیا۔

شجرۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام تا حضرت نوح علیہ السلام

تورات اور تاریخ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک نسب کی جو کڑیاں شمار کرائی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔ اس شجرہ نسب کی صحت و عدم صحت کا معاملہ قیاسی اور تخمینی رائے سے زیادہ نہیں ہے اس لئے کہ جب نبی اکرم ﷺ کے سلسلۂ نسب کے متعلق اس یقین کے باوجود کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں، عدنان سے اوپر کی کڑیوں کے متعلق خود ذاتِ اقدس کا یہ فیصلہ ہے کہ "کذب النسابون" علماء نسب نے نامو ں کی تعیین میں غلط بیانی سے کام لیا ہے"۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک کا سلسلہ کس طرح اس کذب بیانی اور وضع سے پاک رہ سکتا ہے؟

نام	باپ کا نام	بیٹے کی پیدائش کے وقت باپ کی عمر
سام	نوح علیہ السلام	۵۰۰
ارفکشاذ	سام	۱۰۰
شالح	ارفکشاذ	۳۵
عابر	شالح	۳۰
فالج	عابر	۳۴
رعو	فالج	۳۰
سروج	رعو	۳۲
ناجور	سروج	۳۰
آزر (تارخ)	ناجور	۲۹
ابراہیم علیہ السلام	آزر (تارخ)	۷۰
		۸۹۰ مجموعی مدت

ان اعداد و شمار کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت سے حضرت نوح علیہ السلام تک آٹھ سو نوے سال ہوتے ہیں اور جبکہ حضرت نوح علیہ السلام کی کل عمر نو سو پچاس سال بتائی جاتی ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کے ساٹھ سال پائے اور وہ دونوں اس مدت کے اندر معاصر رہے ہیں اور یہ بلا شبہ بے سر و پابات اور قطعاً غلط اور مہمل ہے اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ تورات کے یہ اعداد و شمار محض خود تراشیدہ کہانیوں اور حکایتوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قدیم زمانہ میں یہود کے یہاں تاریخ کا باب اسی قسم کی حکایات و روایات پر قائم رہا ہے اور اس میں تاریخی حقائق اور زمانوں کے تضاد و اختلاف کا مطلق لحاظ و پاس نہیں رکھا گیا۔

مستشرقین یورپ کی ہرزہ سرائی

مستشرقینِ یورپ کی ایک جماعت اسلام دشمنی میں یدِ طولیٰ رکھتی ہے اور بغض و عناد کی مشتعل آگ میں حقائق و واقعات تک کے انکار پر آمادہ ہو جاتی ہے چنانچہ اس قسم کے مواقع میں سے کہ جہاں قرآنِ

عزیز سے خلاف بے دلیل ان کی تنقید کی تلوار چلتی رہتی ہے ایک موقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کا بھی ہے۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ[1] نے ونسنک[2] کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے اسپرنگر[3] نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میں ایک عرصہ تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کی کعبہ کے بانی اور دینِ حنیف کے ہادی کی حیثیت سے روشنی میں نہیں آئی البتہ عرصۂ دراز کے بعد انکی شخصیت کو ان صفات کے ساتھ متصف ظاہر کیا گیا ہے اور ان کی ذات کی خاص اہمیت نظر آتی ہے، چونکہ یہ دعویٰ اپنی اجمالی تعبیر کے لحاظ سے ابھی تشنۂ تکمیل تھا اس لئے ایک طویل زمانہ کے بعد اسپرنگر کے اس دعوے کو سنوگ ہیکرونیہ نے بڑے شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا اور اپنے مزعومہ دلائل کے ذریعہ اس کو خاص آب ورنگ سے رنگین بتایا۔

اس نے کہا:

"قرآن پاک میں جس قدر مکی آیات اور سورتیں ہیں ان میں کسی ایک مقام پر بھی اسمٰعیل علیہ السلام کا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رشتہ نظر نہیں آتا اور نہ ان کو اول مسلمین بتایا گیا ہے بلکہ وہ صرف ایک نبی اور پیغمبر کی حیثیت میں نظر آتے ہیں اان کے تذکرہ کی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی جو ان کو موسسِ کعبہ، اسمٰعیل علیہ السلام کا باپ، عرب کا پیغمبر وہادی' اور ملتِ حنفی کا داعی' ظاہر کرتی ہو، سورۃ الذاریات، الحجر، الصافات، الانعام، ہود، مریم، انبیاء اور عنکبوت جو سب مکی سورتیں ہیں ہمارے اس دعوے کی شاہد ہیں۔

اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سرزمینِ عرب میں کوئی نبی نہیں آیا اور یہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

البتہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی شروع ہوتی ہے تو مدنی سورتوں میں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے ذکر کے وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں کی جاتی اور اہمیت کے ساتھ روشنی میں لائی جاتی ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ اختلاف کیوں موجود ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام امور میں یہود پر اعتماد رکھتے اور انھیں کے طریقوں کو پسند فرماتے تھے، لہٰذا اس وقت تک ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو بھی انھوں نے اسی نظر سے دیکھا جس نظر سے یہود دیکھتے تھے لیکن جب مدینہ پہنچ کر انھوں نے یہود کو اپنے مشن "اسلام" کی دعوت دی تو انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور وہ آپ کے دشمن ہو گئے۔ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فکر و تامل کیا اور خوب سوچا، آخر ان کی ذکاوت اور جودتِ طبع نے رہنمائی کی اور انھوں نے عرب کے لئے یہود کی یہودیت سے جدا ایک ایسے دین کی بنیاد ڈالی جس کو یہودیتِ ابراہیمی کہنا چاہیئے، لہٰذا اس سلسلہ کی تکمیل کے لئے قرآنِ عزیز کی مدنی سورتوں میں ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا گیا کہ وہ ملتِ حنفی کے داعی، عرب کے پیغمبر، اسمٰعیل علیہ السلام

۱: جلد ص ۲۷-۲۸

۲: **Wensinck**

۳: **Sprenger**

کے والد، کعبہ کے موسس نظر آتے ہیں" انتہی۔ (Het Meh haa nsoh Feest ص ۳۰)

یہ ہے وہ دعویٰ اور اس کی دلیل جو اسپر نگر، سنوک اور اُنیسنک جیسے اسلام دشمن مستشرقین کی جانب سے محض اس لئے اختراع کئے گئے ہیں کہ اس قسم کی لچر بنیادوں پر مسیحیت کی برتری اور اسلام کی تحقیر کی عمارت تیار ہو سکے اور نیز یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ اُن کا عرب کے ساتھ نہ نسلی تعلق ہے اور نہ دینی، لیکن جب ایک مورخ اور ایک نقاد مستشرقین کے اس دعوے اور دعوے کے دلائل کو صرف تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے دیکھتا ہے تب بھی اس کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے حقائق اور واقعات سے قصداً چشم پوشی کر کے محض عداوت اور بغض و عناد کی راہ سے بے دلیل کہا گیا ہے، اسلئے کہ اس سلسلہ میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ مکی سورتوں میں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق وہ اوصاف نظر نہیں آتے جو مدنی آیات میں پائے جاتے ہیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سر تا سر غلط بلکہ قصد وارادہ کے ساتھ علمی بددیانتی ہے کہ مکی سورتوں میں سے صرف اُنہی کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو فقط ایک پیغمبر کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے، لیکن وہ مکی سورت جو ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو ہمہ حیثیت سے نمایاں کرنے کیلئے ان کے نام ہی سے معنون کر کے نازل کی گئی یعنی سورۂ ابراہیم اس کو نظر انداز کر دیا گیا تاکہ قرآنِ عزیز سے براہِ راست فائدہ نہ اٹھا سکنے والے حضرات کے سامنے جہالت کا پردہ پڑا رہے اور اُن کی کورانہ تقلید میں وہ ان کے غلط دعوے کو صحیح سمجھتے رہیں۔

سورۂ ابراہیم مکی ہے، اس کی آیات کا نزول ہجرت سے قبل مکہ ہی میں ہوا ہے اور وہ حسب ذیل حقائق کا اعلان کرتی ہے۔

۱ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام عرب (حجاز) کے اندر قیام پذیر ہیں اور خدا کے رسول کی حیثیت سے خود کو اور اپنی اولاد کو بت پرستی سے بچنے اور اُس مقام کو امنِ عالم کا مرکز بنانے کی دعاء کر رہے ہیں:۔

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَّاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ ۝ (ابراهیم ع ٦)

اے پروردگار اس شہر (مکہ) کو توامن کا مرکز بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے دُور رکھ۔

رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ابراهیم ع ٤)

اے پروردگار بلاشبہ ان (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا پس جو شخص میری پیروی کرے وہ میری جماعت میں سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے پس بلاشبہ تو بخشنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے۔

۲ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام اقرار کرتے ہیں کہ سرزمینِ حجاز (جو عرب کا قلب ہے) ان ہی کی اولاد سے آباد ہوئی اور انھوں نے ہی اس کو بسایا ہے اور وہی اس چٹیل میدان میں بیت الحرام (کعبہ) کے مئوسس ہیں۔

رَبَّنَا إِنِّيْٓ أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيٓ إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ

لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ○ (ابراهيم ع ٦)

اے ہمارے پروردگار بیشک میں نے اپنی بعض ذریت کو اس بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے گھر (کعبہ) کے نزدیک آباد کیا ہے، اے ہمارے پروردگار یہ اسلئے تاکہ وہ نماز قائم کریں پس تو لوگوں میں سے کچھ کے دل اس طرف پھیر دے کہ وہ (اس کعبہ کی بدولت) ان کی جانب مائل ہوں اور ان کو پھلوں سے رزق عطا کر تاکہ یہ شکر گذار بنیں۔

٣ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام حضرتِ اسمٰعیل و حضرتِ اسحٰق علیہما السلام کے والد ہیں اور یہی اسمٰعیل علیہ السلام اہلِ عرب کے باپ ہیں اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام اپنے اور اپنی اولاد کے لئے ملّتِ حنفی کے شعار "صلوٰۃ" کی اقامت کی دعا کر رہے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيْلَ وَإِسْحَاقَ إِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ○ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ○ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ○ (٣٩،٤٠،٤١۔ابراهيم ع ٦)

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیل علیہ السلام اور اسحٰق بخشے بلاشبہ میرا پروردگار ضرور دعاء کا سُننے والا ہے، اے پروردگار مجھ کو اور میری اولاد کو نماز قائم کرنیوالا بنادے، اے ہمارے پروردگار ہماری دعاء سُن، اے ہمارے پروردگار تو مجھ کو اور میرے والدین کو اور کل مومنون کو قیامِ حساب (قیامت) کے روز بخش دے۔ (۳۹۔۴۰۔۴۱) (ابراہیم رکوع نمبر ۶)

اِن آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لئے بھی کسی شخص کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ اِن لغو اور بے سر و پا دعووں کی تصدیق کرے جن کو مستشرقینِ یورپ نے اپنی جہالت یا ارادی جھوٹ کے ساتھ علمی تنقید کا عنوان دیا ہے، کیا یہ آیات مکی نہیں ہیں، اور کیا ان سے وہ سب کچھ ثابت نہیں ہوتا جو مدنی آیات میں مذکور ہے؟

٣ اسی طرح سورۂ ابراہیم کے علاو سورۂ انعام اور سورۃ النحل بھی مکی سورتیں ہیں ان میں بصراحت موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام شرک کے مقابلہ میں ملّتِ حنفی کے داعی ہیں اور ان کی شخصیت اِس دعوت میں بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔

إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

بلاشبہ میں اپنے چہرہ کو اُسی ذات کی طرف جھکاتا ہوں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں۔ (الانعام۔رکوع۹)

قُلْ إِنَّنِيْ هَدَانِيْ رَبِّيْٓ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (انعام ١٦١ ع٢٠)

(اے محمد ﷺ) کہہ دو بلاشبہ مجھ کو میرے رب نے سیدھی راہ کی ہدایت کی ہے جو کج مج راہ سے الگ صاف اور سیدھا دین ہے ملّت ہے ابراہیم کی جو تھے ایک خدا کی طرف جھکنے والے اور نہ تھے وہ مشرکوں میں سے۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (النحل)

بیشک ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا حکم بردار صرف ایک خدا کی طرف جھکنے والا اور نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں سے۔

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

پھر وحی کی ہم نے تیری جانب (اے محمد ﷺ) اس بات کی کہ تو پیروی کر اُس ابراہیم کی ملّت کی جو صرف خدائے واحد کی جانب جھکنے والا ہے اور نہیں ہے مشرکوں میں سے۔

تو کیا ان واضح آیات کے بعد بھی ان دلائل کو دلائل کہنا کوئی حقیقت رکھتا ہے جو اس سلسلہ میں سنوک اور اس کے ہمنواؤں نے بیان کئے ہیں؟ مکی سورتیں ہوں یا مدنی دونوں جگہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت ایک ہی طرح نمایاں نظر آتی ہے، وہ دونوں حالتوں میں ملّت حنفی کے داعی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور عرب کے باپ، کعبہ کے موسّس و بانی اور عرب کے ہادی ہیں، اور اس لئے مستشرقین یوپ کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآنِ عزیز کی مکی اور مدنی آیات میں دو جدا جدا صورتوں میں نظر آتی ہے کذب اور صریح بہتان ہے نیز یہ بھی خلاف واقعہ ہے کہ عرب میں رسول اکرم ﷺ کے دعویٰ نبوت سے قبل کوئی بھی پیغمبر نہیں گذرا اسلئے کہ ابراہیم واسمٰعیل اور ہود وصالح علیہم السلام اسی سرزمین کے ہادی و پیغمبر ہیں۔ ان مدعیانِ علم کو تعصب نے ایسا نادان بنادیا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ پر اعتراض کرتے وقت یہ بھی خیال نہ رہا کہ اس قسم کے دعوے سے ہم صرف قرآن ہی کی نہیں بلکہ بائبل (تورات) کی بھی تکذیب کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ تورات میں تصریح ہے کہ اسمٰعیل ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں اور اسمٰعیل ہی عرب کے باپ ہیں اور ابراہیم کی اسی اولاد سے حجاز کی سرزمین آباد ہوئی اور یہ دونوں باپ بیٹے عرب کی نمایاں شخصیتیں ہیں۔

نیز یہ الزام بھی قطعاً بے بنیاد اور لغو ہے کہ "مکہ" کی زندگی میں رسولِ اکرم ﷺ نے یہود اور اُن کے مذہبی امور کی تقلید کی اور جب مدینہ میں پہنچ کر یہود کے انکار اور اُن کے مخالفانہ جذبہ کو دیکھا تو یہود سے الگ ایک نئی یہودیت کی بنیاد ڈالی اور اس کو ملّتِ ابراہیمی کا لقب دیا اس لئے کہ مکہ کی زندگی میں تو یہود سے آپ کا سابقہ ہی نہیں پڑا تو پھر مخالفت و موافقت یا اتباع کا سوال ہی کیا، البتہ مدینہ میں آکر آپ ﷺ نے مشرکین کے مقابلہ میں یہود کی جانب زیادہ توجہ فرمائی اور یہ اسلئے کہ اسلام کے عقیدہ کے مطابق دینِ موسوی کے پیرو تھے اگرچہ اس میں تحریف ہو چکی تھی مگر وہ مشرکین کے خلاف توحید کے قائل تھے اور اُن کی مُحرّف کتابوں میں تحریف کے بعد بھی بہت سے جملے ایسے موجود تھے جو نبی ﷺ کی بعثت اور رسالت کے شاہد اور گواہ ہیں اور اُن سے آپ کے حق میں بشارات نکلتی ہیں، نیز بہت سے وہ احکام بھی موجود تھے جو صحیح معنی میں وحی الٰہی کی حیثیت رکھتے ہیں اور دینِ موسوی کی اساس و بنیاد رہے ہیں اسلئے آپ کو خیال تھا کہ یہ مشرکین کے مقابلہ میں جلد ہی ملت ابراہیمی یعنی اسلام قبول کرلیں گے، لیکن جب آپ ﷺ نے ان کے انکار بغض و حسد کا تجربہ کرلیا تو پھر انکے ساتھ بھی آپ کا معاملہ وہی ہو گیا جو مشرکین کے ساتھ تھا اور بمصداق الکفر ملۃ واحدۃ کفر سب ایک ملت ہے آپ نے ان سب

کو ایک ہی حیثیت میں رکھا۔

اس پر نگر سنوک اور ان کے ہمنوا اتنی صاف بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں یا عمداً سمجھنا نہیں چاہتے کہ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کے دادا تھے اور یہود اپنے دین کی نسبت حضرت اسرائیل علیہ السلام کی جانب کرتے اور نبی اسرائیل ہونے کی حیثیت سے اس پر فخر کرتے تھے تو ان کا یہ کہنا کہ ابراہیم بھی یہودی تھے کس قدر مضحکہ خیز تھا، کیا پوتے کے دین کے متعلق کسی طرح یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ عرصہ دراز کے گذرے ہوئے دادا کا دین پوتے کے دین کے تابع تھا۔

پس اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے قرآنِ عزیز نے یہ اعلان کیا:

مَا كَانَ إِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا

ابراہیم نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی البتہ وہ تھے ایک خدا کی جانب جھکنے والے مسلمان۔

مگر ان کور چشموں نے اس کے معنی یہ لئے کہ نبی اکرم ﷺ مکہ میں تو یہود کے دین پر تھے لیکن مدینہ جا کر جب یہود نے انکو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا تو یہود کے دین کے مقابلہ میں ذکاوت طبع سے یہودیت ابراہیمی ایجاد کر لی۔

سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ○

سنوک اور اس کے ہمنواؤں نے اس دعویٰ کی دلیل میں کہ نبی اکرم ﷺ سے پہلے عرب میں کوئی پیغمبر نہیں گذرا، قرآن عزیز کی اس آیت کو بھی پیش کیا ہے۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ أَتَاهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ

تاکہ تو (اے محمد ﷺ) ڈرائے ایسی قوم کو کہ نہیں آیا ان کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر ابراہیم علیہ السلام و اسمٰعیل علیہ السلام عرب کے پیغمبر ہوتے تو قرآن عزیز امت عربیہ کے متعلق اس طرح محمد ﷺ سے خطاب نہ کرتا۔

مگر یہ بھی ایک سخت مغالطہ ہے جو قرآن عزیز کے طرز خطابت، اسلوب بیان اور باطل پرستوں کی باطل پرستی کے خلاف دلائل کی ترتیب سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوا ہے یا گذشتہ اعتراضات کی طرح محض بغض و عناد کی خاطر اختیار کیا گیا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ عرب کا بہت بڑا حصہ بت پرستی میں مبتلا تھا، اور اس سلسلہ میں انھوں نے عقائد اور دین کے نام سے کچھ احکام مرتب کر رکھے تھے، مثلاً دیوتاؤں کی نذر اور قربانی کے لئے سائبہ، بحیرہ اور وصیلہ کی ایجاد، اور مختلف بتوں کی پرستش کے مختلف قواعد و ضوابط وغیرہ، اس لئے جب نبی اکرم ﷺ نے ان کو توحید اور اسلام کی دعوت دی اور شرک اور بت پرستی سے روکا تو وہ کہنے لگے کہ تمہارا یہ کہنا کہ ہم بددین ہیں اور ہمارا کوئی الہامی دین نہیں، غلط ہے ہم تو خود مستقل دین رکھتے ہیں اور وہ ہمارے باپ دادا کا قدیمی دین ہے۔

قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا

مشرکین نے کہا ہم نے اسی (بت پرستی) پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے۔

تب قرآن عزیز نے ان کے باطل عقائد کی حقیقت کو ان پر واضح کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کو بتایا جائے کہ کسی دین کے خدائی دین ہونے کے لئے دو ہی قسم کے دلائل ہو سکتے ہیں، یا حسی اور عقلی راہ سے یہ واضح ہو جائے کہ یہ خدا کا دین اور اس کا مرغوب مذہب ہے، اور یا نقلی روایات اس کا قطعی، یقینی اور ناقابلِ انکار ثبوت پیش کرتی ہوں کہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعت ہے اور اگر یہ دونوں راہیں کسی دعوے کے لئے بند ہیں تو وہ دعویٰ باطل اور اس کا مدعی کاذب ہے۔

لہٰذا قرآنِ عزیز نے مشرکین کے اس دعوے کی تردید کے لئے آیاتِ قرآنی کے تین حصے کر دیے، ایک حصہ میں ان کے اس دعویٰ کا انکار اور دعوے کی غیر معقولیت کا اظہار کیا اور بتایا کہ مشرکین کا یہ کہنا کہ اللّٰہ امرنا بہا (ہم کو خدا نے ایسا (شرک) کرنے ہی کا حکم دیا ہے) بالکل غلط اور سرتاسر باطل ہے اس لئے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (اعراف ع ۳)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ بیہودہ خرافات کا حکم نہیں دیا کرتا (اے مشرکین) کیا تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

اور دوسرا حصہ ان کے باطل دعوے پر حسی اور عقلی سند کے مطالبہ سے متعلق کیا اور بتایا کہ وہ عقل سے یہ فتویٰ صادر کریں کہ جو کچھ خدا کے ساتھ انھوں نے غلط نسبتیں قائم کر رکھی ہیں اور جن پر ان کے مزعومہ دین کی بنیاد قائم ہے وہ کس طرح صحیح اور اہل عقل کے نزدیک قابل تسلیم ہیں؟ وہ کہتا ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شَاهِدُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۝ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ ۝ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

(الصافات)

پس (اے محمد ﷺ) تم ان سے دریافت کرو کیا تمہارے پروردگار کے لئے لڑکیاں ہیں اور ان کے لئے لڑکے، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں بنایا اور وہ اس وقت موجود تھے، خبردار بلاشبہ یہ سب ان کی بہتان طرازی ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے اولاد ہے بلاشبہ یہ قطعاً جھوٹے ہیں (یہ کہتے ہیں کہ خدا نے) اپنے لئے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیوں کو پسند کر لیا ہے (اے مشرکین) تم کو کیا ہوا یہ تم کیسا (جھوٹا) حکم کرتے ہو، پس کیا تم نصیحت نہ حاصل کرو گے؟

اور تیسرا حصہ ان کے باطل عقیدوں کے متعلق نقلی سند کے مطالبہ سے وابستہ کیا، قرآن عزیز ان سے سوال کرتا ہے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اور اس کو خدا کا دین بتا رہے ہو تو کیا تمہارے پاس اس کیلئے خدا کی جانب سے کوئی حجت اور دلیل نازل ہوئی ہے یا اسکے پاس ان عقائد کی صداقت کے لئے کوئی کتاب بھیجی گئی ہے اگر ایسا ہے تو

پیش کرو؟

أَمْ لَكُمْ سُلْطَانٌ مُّبِيْنٌ ○ فَأْتُوْا بِكِتَابِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ○ (الصافات ع ۵)

کیا تمہارے پاس کوئی ظاہر حجت اور صاف دلیل ہے۔ پس تم اپنی (خدا کی جانب سے نازل شدہ) وہ کتاب لاؤ۔ اگر تم سچے ہو؟

اب اگر ان کے اپنے دعوے کی صداقت کے لئے ان کے پاس نہ کوئی حسی و عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی سند کے طور پر کوئی حجت و کتاب۔ تو پھر ان کا یہ دعویٰ کہ ان کے پاس محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے سے خدا کا دین موجود ہے اور اس کی منضبط شریعت بھی! بالکل غلط اور باطل دعویٰ ہے۔

اسی طرح مشرکین پر یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ تمہارے پاس اپنے دعوائے باطل کے سلسلہ میں نہ عقلی سند ہے اور نہ نقلی اور ان کو لاجواب بنانے کے لئے سورۂ احقاف میں بھی یہی طریق استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

أَرَأَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ اِئْتُوْنِيْ بِكِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ (احقاف ع ۱)

تم مجھے بتاؤ کہ اللہ کے ماسوا جن کو تم پوچھتے ہو مجھے دکھلاؤ کہ انہوں نے زمین سے کیا بنایا، یا کیا ان کی آسمانوں میں (اللہ کے ساتھ) کوئی شرکت ہے، اس سے پہلی کوئی کتاب اگر تمہارے پاس ہے (جو اس دعویٰ کی تصدیق کرتی ہو) تو وہ لے آؤ، یا علم (اولین میں سے کوئی بقیہ علم) تمہارے پاس ہو تو وہ پیش کرو۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک دوسرے پیرایہ میں قرآنِ عزیز کی اُن آیات میں بیان کیا گیا ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکین عرب کے پاس محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں آیا، ان آیات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سرزمینِ عرب (حجاز) ہمیشہ سے خدا کے نبی اور پیغمبر کے وجود سے محروم ہے اور اس ملک میں نبی اکرم ﷺ کی آواز سب سے پہلی آواز ہے، قرآنِ عزیز ایسی خلافِ حقیقت بات کس طرح کہہ سکتا تھا جبکہ سورۂ ابراہیم، الانعام اور النمل کی آیات میں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام و اسمٰعیل علیہ السلام کے عربی نبی ہونے کی صاف اور صریح شہادتیں موجود ہیں جو ابھی نقل کی جا چکی ہیں بلاشبہ قرآنِ عزیز اس قسم کے تضاد اور اختلاف سے قطعاً بری ہے، کہ ایک جگہ وہ ایک بات کا انکار کرے اور دوسری جگہ اسی بات کا اقرار، اس لئے کہ وہ خدائے عالم الغیب و الشہادۃ کا کلام ہے نہ کہ بھول چوک کرنے والے انسان کا کلام۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ○

کیا انھوں نے قرآن پر غور نہیں کیا اور اگر وہ ہوتا اللہ کے سوا کسی اور کا کلام تو ضرور پاتے اس میں بہت سا اختلاف۔

لہٰذا قرآنِ عزیز کے خلاف سنوک، اسپر نگر اور وینسنک کے یہ تمام دعاوی اور ان کے دلائل تاریخی حقائق اور واقعات کی روشنی میں قطعاً باطل اور افترا ہیں اور ان کے طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے ناقدین قرآنِ عزیز پر علمی دیانت کے ساتھ تنقید نہیں کرتے اور نہ ان کی فہم اور سمجھ کا قصور ہے بلکہ اس کے برعکس وہ علمی بددیانتی سے کام لے کر قرآن کے خلاف زہر اُگلتے، غلط الزام قائم کرتے، اور صریح اور واضح

مسائل میں اپنے پیش نظر مقاصد کے مطابق گنجلک پیدا کر کے ناواقف دنیا کو گمراہ کرتے ہیں، بلکہ اس قسم کے التزامات سے اُن کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے جس کو قرآنِ عزیز نے اس قسم کے معاندین کے لئے ایک مستقل قانون کی طرح واضح کر دیا ہے۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً

یہ (منکرین قرآن واسلام) یہ خواہش رکھتے ہیں کہ کاش تم بھی انکی طرح منکر بن جاؤ تاکہ وہ اور تم سب یکساں ہو جائیں۔

اس لئے ان منکرین (کافروں) کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ہمیشہ ایک ہی جواب رہا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا

اے پروردگار ہمارے دلوں کو ہدایت یافتہ اور راہیاب کرنے کے بعد کجی کی جانب مت مائل کرنا۔

بہر حال قرآنِ حکیم کی مسطورہ بالا زیرِ بحث آیت کا مطلب صاف اور واضح ہے اور اُسکے درمیان اور الانعام، النحل اور ابراہیم جیسی سورتوں میں ابراہیم ﷺ کے پیغمبر عرب ہونے کے درمیان قطعاً کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔

اس پیش کردہ تفصیل و تشریح کے علاوہ عام مفسرین نے اس قسم کی آیات کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ خطاب صرف اُن ہی لوگوں سے متعلق ہے جو نبی اکرمؐ کی زندگی مبارک میں موجود تھے ان کے گذشتہ آباءواجداد اور گذشتہ تاریخ عرب سے اس خطاب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم ﷺ کا ذکر قرآن میں

قرآن عزیز کے رشد و ہدایت کا پیغام چونکہ ملت ابراہیمی کا پیغام ہے اس لئے اس نے جگہ جگہ حضرت ابراہیم کا ذکر کیا ہے اور جیسا کہ گذشتہ سطور میں کہا جا چکا ہے حضرت ابراہیم کا ذکر مکی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں میں موجود ہے مندرجہ ذیل جدول ان تمام سورتوں اور آیتوں کو ظاہر کرتی ہے۔

سورۃ	شمار	آیات
البقرہ	۲	۱۲۴،۱۲۵،۱۲۶،۱۲۷،۱۳۰،۱۳۲،۱۳۳، ۱۳۵،۱۳۶،۱۴۰،۱۵۸،۱۶۰
آل عمران	۳	۳۳،۳۵،۶۷،۶۸،۸۴،۹۵،۹۷
النساء	۴	۵۴،۱۲۵،۱۶۳
الانعام	۶	۷۴،۷۵، ۸۳،۱۵۱
التوبہ	۹	۷۰، ۱۱۴
ہود	۱۱	۶۹، ۷۴،۷۵،۷۶

ابراهیم	۱۴	۳۶
النحل	۱۶	۱۲۰، ۱۲۳
الانبیاء	۲۱	۵۱، ۶۰، ۶۲، ۶۹
الشعراء	۲۶	۶۹
الاحزاب	۳۳	۷۰
صٓ	۳۸	۴۵
الزخرف	۴۳	۲۶
النجم	۵۳	۳۷
الممتحنه	۲۰	۴
یوسف	۱۲	۶، ۳۸
الحجر	۱۵	۵۱
مریم	۱۹	۴، ۴۶، ۵۸
الحج	۲۲	۲۶، ۴۳، ۷۸
العنکبوت	۲۹	۱۶، ۳۱
الصافات	۳۷	۸۳، ۱۰۴، ۱۰۹
الشوریٰ	۴۲	۱۳
الذاریات	۵۱	۲۴
الحدید	۵۷	۲۶
الاعلیٰ	۸۷	۱۹
مجموعہ:	۲۵ سورت	۶۳ آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے ساتھ دوسرے چند انبیاء علیہم السلام کے واقعات بھی وابستہ ہیں مثلاً حضرت لوط کا واقعہ اس لئے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے بھی ہیں اور ان کے پیرو بھی۔ اسی طرح ان کے صاحبزادوں حضرت اسمٰعیل و حضرت اسحٰق علیہ السلام کے واقعات اس لئے کہ اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ستاسی سال[1] تھی اور حضرت اسحٰق[2] کی ولادت کے وقت ان کی عمر پورے سو ۱۰۰ سال تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کل عمر ایک سو پچھتر سال[3] ہوئی لیکن ان تینوں پیغمبروں کے

۱: تورات اصحاح ۱۶ تکوین ۱۶۔
۲: تورات آیت ۱۵ اصحاح ۲۱ تکوین۔ ۳: تورات آیت ۷ اصحاح ۲۵ تکوین۔

تفصیلی واقعات مستقل عنوان میں درج کئے جائیں گے اور یہاں صرف حضرت ابراہیم کے واقعہ کے ضمن میں کہیں کہیں ذکر آئے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس عظمت شان کے پیش نظر جو انبیاء و رسل کے درمیان ان کو حاصل ہے قرآن عزیز نے ان کے واقعات کو مختلف اسلوب کے ساتھ جگہ جگہ بیان کیا ہے، ایک مقام پر اگر اختصار کے ساتھ ذکر ہے تو دوسری جگہ تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے اور بعض جگہ مختلف شؤن اور اوصاف کے پیش نظر ان کی شخصیت کو نمایاں کیا ہے اس لئے مناسب ترتیب کے ساتھ ان کو پیش کیا جاتا ہے۔

تورات یہ بتاتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام عراق کے قصبہ اُور کے باشندے اور اہل فدان میں سے تھے اور ان کی قوم بت پرست تھی اور انجیل برنابا میں تصریح ہے کہ ان کے والد نجاری کا پیشہ کرتے اور اپنی قوم کے مختلف قبائل کیلئے لکڑی کے بت بناتے اور فروخت کیا کرتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شروع ہی سے حق کی بصیرت اور رشد و ہدایت عطا فرمائی تھی اور وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ بت نہ سن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کسی کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں، اور نہ نفع و نقصان کا ان سے کوئی واسطہ، اور نہ لکڑی کے کھلونوں اور دوسری بنی ہوئی چیزوں کے اور ان کے درمیان کوئی فرق و امتیاز ہے، وہ صبح و شام آنکھ سے دیکھتے تھے کہ ان بے جان مورتیوں کو میرا باپ اپنے ہاتھوں سے بناتا اور گھڑتا رہتا ہے اور جس طرح اس کا جی چاہتا ہے، ناک، کان، آنکھیں اور جسم تراش لیتا اور پھر خریدنے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے تو کیا یہی خدا ہو سکتے ہیں یا خدا کے مثل و ہمسر کہے جا سکتے ہیں؟ حاشا و کلا پس بعثت سے سرفراز ہو کر سب سے پہلے انھوں نے اسی طرف توجہ فرمائی۔

بعثت

قرآن عزیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس حقیقت بین اور بصیرت افروز رشد و ہدایت کا اس طرح ذکر کرتا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَآ إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عَالِمِيْنَ ○ إِذْ قَالَ لِأَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ ○ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عَابِدِيْنَ ○ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَآبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ○ قَالُوْٓا أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ○ قَالَ بَل رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ وَأَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشَّاهِدِيْنَ ○ (الانبیاء ع ۵)

اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو اول ہی سے رشد و ہدایت عطا کی تھی، اور ہم اس کے (معاملہ کے) جاننے والے تھے جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا "یہ مجسمے کیا ہیں جن کو تم لئے بیٹھے ہو" کہنے لگے "ہم نے اپنے

باپ دادا کو ان ہی کی پوجا کرتے پایا ہے"۔ابراہیم علیہ السلام نے کہا" بلا شبہ تم اور تمہارے باپ، دادا کھلی گمراہی میں ہیں۔انھوں نے جواب دیا کیا تو ہمارے لئے کوئی حق لایا ہے یا یوں ہی مذاق کرنیوالوں کی طرح کہتا ہے، ابراہیم علیہ السلام نے کہا (کہ یہ بت تمہارے رب نہیں ہیں)" بلکہ تمہارا پروردگار زمینوں اور آسمانوں کا پروردگار ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اور میں اسی بات کا قائل ہوں۔اور جب کہ اس جلیل القدر ہستی پر اللہ تعالیٰ کے جود و کرم اور عطاء و نوال کا فیضان بے غایت و بے نہایت سرعت رفتار کے ساتھ ہو رہا تھا تو اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس نے انبیاء علیہم السلام کی صف میں نمایاں جگہ پائی اور اس کی دعوت و تبلیغ کا محور و مرکز "دینِ حنیف" قرار پایا۔

اس نے جب یہ دیکھا کہ قوم بت پرستی ستارہ پرستی اور مظاہر پرستی میں اس قدر منہمک ہے کہ خدائے برتر کی قدرت مطلقہ اور اس کی احدیت و صمدیت کا تصور بھی ان کے قلوب میں باقی نہیں رہا اور ان کے لئے خدا کی وحدانیت کے عقیدہ سے زیادہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں رہی، تب اس نے کمر ہمت چست کی اور ذات واحد کے بھروسہ پر ان کے سامنے دینِ حق کا پیغام رکھا اور اعلان کیا۔

اے قوم! یہ کیا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش میں مشغول ہو، کیا تم اس قدر خوابِ غفلت میں ہو کہ جس بے جان لکڑی کو اپنے آلات سے گھڑ کر مجسمے تیار کرتے ہو اور اگر وہ مرضی کے مطابق نہ بنے تو ان کو توڑ کر دوسرے بنا لیتے ہو، بنا لینے کے بعد پھر ان ہی کو پوجنے اور نفع و ضرر کا مالک سمجھنے لگے ہو، تم اس خرافات سے باز آؤ، خدا کی توحید کے نغمے گاؤ، اور اسی ایک مالک حقیقی کے سامنے سر نیاز جھکاؤ جو میرا، تمہارا اور کل کائنات کا خالق و مالک ہے۔

مگر قوم نے اس کی آواز پر مطلق کان نہ دھرا اور چونکہ گوش حق نیوش اور نگاہ حق بیں سے محروم تھی اس لئے اس نے جلیل القدر پیغمبر کی دعوت حق کا مذاق اڑایا۔اور زیادہ سے زیادہ تمرد و سرکشی کا مظاہرہ کیا۔

باپ کو دعوت اسلام اور باپ بیٹے کا مناظرہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام دیکھ رہے تھے کہ شرک کا سب سے بڑا مرکز خود ان کے اپنے گھر میں قائم ہے اور آزر کی بت سازی و بت پرستی پوری قوم کے لئے مرجع و محور بنی ہوئی ہے اس لئے فطرت کا تقاضا ہے کہ دعوت حق اور پیغامِ صداقت کے اداءِ فرض کی ابتداء گھر ہی سے ہونی چاہیے اسلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے والد "آزر" ہی کو مخاطب کیا اور فرمایا: اے باپ! خدا پرستی اور معرفت الٰہی کیلئے جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے اور جس کو آباء واجداد کا قدیم راستہ بتلاتا ہے یہ گمراہی اور باطل پرستی کی راہ ہے۔اور صراطِ مستقیم اور راہ حق صرف وہی ہے جس کی دعوت میں دے رہا ہوں، اے باپ! توحید ہی سرچشمہ نجات ہے نہ کہ تیرے ہاتھ کے بنائے ہوئے ان بتوں کی پرستش و عبادت، اس راہ کو چھوڑ او توحید حق کی راہ کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کر تاکہ تجھ کو خدا کی رضا اور دنیا و آخرت کی سعادت حاصل ہو۔

مگر افسوس کہ آزر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس پند و نصیحت کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ قبول حق کی بجائے آزر نے بیٹے کو دھمکانا شروع کیا، کہنے لگا کہ ابراہیم! اگر تم بتوں کی برائی سے باز نہ آئے گا تو میں تجھ کو

سنگسار کردوں گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ معاملہ اب حد سے آگے بڑھ گیا اور ایک جانب اگر باپ کے احترام کا مسئلہ ہے تو دوسری جانب ادائے قرض حمایت حق اطاعت امر الٰہی کا سوال تو انھوں نے سوچا اور آخر وہی کیا جو ایسے برگزیدہ انسان اور اللہ کے جلیل المرتبت پیغمبر کے شایانِ شان تھا، انھوں نے باپ کی سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا، تحقیر و تذلیل کا رویہ نہیں برتا بلکہ نرمی، ملاطفت، اور اخلاق کریمانہ کے ساتھ یہ جواب دیا، اے باپ! اگر میری بات کا یہی جواب ہے تو آج سے میرا تیرا اسلام ہی میں خدا کے سچے دین اور اس کے پیغام حق کو کو نہیں چھوڑ سکتا، اور کسی حال بتوں کی پرستش نہیں کر سکتا، میں آج سے تجھ سے جدا ہوتا ہوں، مگر غائبانہ تیرے لئے درگاہ الٰہی میں بخشش طلب کرتا رہوں گا تا کہ تجھ کو ہدایت نصیب ہو اور تو خدا کے عذاب سے نجات پائے۔

سورۂ مریم میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ إِذْ قَالَ لِأَبِيْهِ يَاأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا ۝ يَاأَبَتِ إِنِّيْ قَدْ جَاءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يَاأَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَانِ عَصِيًّا ۝ يَاأَبَتِ إِنِّيْٓ أَخَافُ أَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَانِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا ۝ قَالَ أَرَاغِبٌ أَنْتَ عَنْ آلِهَتِيْ يَآإِبْرَاهِيْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْٓ إِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَأَدْعُوْ رَبِّيْ عَسٰٓى أَلَّآ أَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝ (مریم)

اور (اے پیغمبر!) الکتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کر، یقیناً وہ مجسم سچائی تھا اور اللہ کا نبی تھا۔ اس وقت کا ذکر جب اس نے اپنے باپ سے کہا اے میرے باپ! تو کیوں ایک ایسی چیز کی پوجا کرتا ہے جو نہ تو سنتی ہے نہ دیکھتی ہے، نہ تیرے کسی کام آسکتی ہے؟ اے میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے جو تجھے نہیں ملی، پس میرے پیچھے چل میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا، اے میرے باپ! شیطان کی بندگی نہ کر، شیطان تو خدائے رحمٰن سے نافرمان ہو چکا، اے میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو، خدائے رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب تجھے گھیرے، اور تو شیطان کا ساتھی ہو جائے! باپ نے (یہ باتیں سن کر) کہا ”ابراہیم کیا تو میرے معبود سے پھر گیا ہے؟ یاد رکھ اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر کے چھوڑ دونگا۔ اپنی خیر چاہتا ہے تو جان سلامت لے کر مجھ سے الگ ہو جا۔“ ابراہیم نے کہا ”اچھا میرا اسلام قبول ہو (میں الگ ہو جاتا ہوں)“ اب میں اپنے پروردگار سے تیری بخشش کی دعا کروں گا۔ وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں نے تم سب کو چھوڑا اور انہیں بھی جنھیں تم اللہ کے سوا پکار کرتے ہو، میں اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں۔ امید ہے اپنے پروردگار کو پکار

کے میں محروم ثابت نہیں ہوں گا۔

اور سورہ انعام میں آزر کو حضرت ابراہیم کی نصیحت کا ذکر کیا گیا ہے

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً إِنِّي أَرَاكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ○ (انعام)

اور (وہ وقت یاد کر) جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا "کیا ٹھہراتا ہے تو بتوں کو خدا، میں تجھ کو اور تیری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتا ہوں۔"

قوم کو دعوت اسلام اور اس سے مناظرہ

باپ اور بیٹے کے درمیان جب اتفاق کی کوئی صورت نہ بنی اور آزر نے کسی ابراہیم علیہ السلام کی رشد و ہدایت کو قبول نہ کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آزر سے جدائی اختیار کر لی اور اپنی دعوت حق اور پیغام رسالت کو وسیع کر دیا اور اب صرف آزر ہی مخاطب نہ رہا بلکہ پوری قوم کو مخاطب بنا لیا۔ مگر قوم اپنے باپ دادا کے دین کو کب چھوڑنیوالی تھی۔ اس نے ابراہیم علیہ السلام کی ایک نہ سنی اور دعوت حق کے سامنے اپنے باطل معبودوں کی طرح گونگے، اندھے اور بہرے بن گئے۔

ان کے کان موجود تھے مگر حق کی آواز کے لئے بہرے تھے، پتلیاں آنکھوں کے حلقوں میں زندہ انسان کی آنکھوں کی طرح حرکت ضرور کرتی تھیں مگر حق کی بصارت سے محروم تھیں، زبان گویا ضرور تھی لیکن کلمہ حق کے اعتبار سے گنگ تھی۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ○

(الاعراف ع ۲۲)

ان کے دل ہیں پر سمجھتے نہیں۔ ان کی آنکھیں ہیں پر دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں، یہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ یہی ہیں جو غفلت میں سرشار ہیں۔

اور جب ابراہیم علیہ السلام نے زیادہ زور دے کر پوچھا کہ یہ تو بتاؤ کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو یہ تم کو کسی قسم کا بھی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ تو کہنے لگے کہ ان باتوں کے جھگڑے میں ہم پڑنا نہیں چاہتے، ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا یہی کرتے چلے آئے ہیں لہٰذا ہم بھی وہی کر رہے ہیں۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک خاص انداز سے خدائے واحد کی ہستی کی جانب توجہ دلائی، فرمانے لگے، میں تو تمہارے ان سب بتوں کو اپنا دشمن جانتا ہوں یعنی میں ان سے بے خوف و خطر ہو کر ان سے اعلان جنگ کرتا ہوں، کہ اگر یہ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو اپنی حسرت نکال لیں۔

البتہ میں صرف اس ہستی کو اپنا مالک سمجھتا ہوں جو تمام جہانوں کی پروردگار ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا اور راہِ

راست دکھائی، جو مجھ کو کھلاتا پلاتا یعنی رزق دیتا ہے، اور جب میں مریض ہو جاتا ہوں تو جو مجھ کو شفاء بخشتا ہے اور جو میری زیست و موت دونوں کا مالک ہے اور اپنی خطاکاری کے وقت جس سے یہ طمع کرتا ہوں کہ وہ قیامت کے روز مجھ کو بخش دے اور میں اس کے حضور میں یہ دعا کرتا رہتا ہوں اے میرے پروردگار! تو مجھ کو صحیح فیصلہ کی قوت عطا کر اور مجھ کو نیکو کاروں کی فہرست میں داخل کر اور مجھ کو زبان کی سچائی عطا کر اور جنت نعیم کے وارثوں میں شامل کر۔

نصیحت و موعظت کے اس مؤثر اندازِ خطابت کو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد اور قوم کے سامنے پیش کیا، سورۂ شعراء میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيْمَ ○ إِذْ قَالَ لِأَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ○ قَالُوْا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِيْنَ ○ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ إِذْ تَدْعُوْنَ ○ أَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ أَوْ يَضُرُّوْنَ ○ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَا آبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ○ قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ○ أَنْتُمْ وَآبَآؤُكُمُ الْأَقْدَمُوْنَ ○ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ ○ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ○ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ○ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ○ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ○ وَالَّذِيْٓ أَطْمَعُ أَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ○ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّأَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ ○ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِيْنَ ○ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ○ وَاغْفِرْ لِأَبِيْٓ إِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ○ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ○ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ○ إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ○ (شعراء ع ۵)

اور سنادے ان کو خبر ابراہیم کی جب کہا اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو تم کس کو پوجتے ہو وہ بولے ہم پوجتے ہیں مورتیوں کو پھر سارے دن انہی کے پاس لگے بیٹھے رہتے ہیں کہا کچھ سنتے ہیں تمہارا کہا جب تم پکارتے ہو یا کچھ بھلا کرتے ہیں تمہارا یا برا، بولے نہیں پر ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو یہی کام کرتے کہا: بھلا دیکھتے ہو جن کو پوجتے رہے ہو تم اور تمہارے باپ دادے اگلے، سو وہ میرے دشمن ہیں مگر جہان کا رب جس نے مجھ کو بنایا سو وہی مجھ کو راہ دکھلاتا ہے اور وہ جو مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوؤں تو وہی شفا دیتا ہے اور وہ جو مجھ کو ماریگا اور پھر جلائے گا، اور جس سے مجھ کو توقع ہے کہ بخشے میری تقصیر انصاف کے دن، اے میرے رب! دے مجھ کو حکم اور ملا مجھ کو نیکوں میں اور رکھ میرا بول سچا پچھلوں میں، اور کر مجھ کو وارثوں میں نعمت کے باغ کے اور معاف کر میرے باپ کو وہ ہے راہ بھولے ہوؤں میں، اور رسوا نہ کر مجھ کو جس دن سب جی کر اٹھیں جس دن نہ کام آوے کوئی مال اور نہ بیٹے مگر جو کوئی آیا اللہ کے پاس لے کر بے روگ دل۔

مگر آزر اور قوم آزر کے دل کسی طرح قبول حق کے لئے نرم نہ ہوئے اور ان کا انکار اور جحود حد سے

گذرتا ہی رہا۔

گذشتہ سطور میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بت پرستی کے ساتھ ساتھ کواکب پرستی بھی کرتی تھی اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ انسانوں کی موت وحیات ان کا رزق ان کا نفع وضرر، خشک سالی اور قحط سالی، فتح وظفر اور شکست وہزیمت، غرض تمام کارخانہ عالم کا نظم ونسق کواکب اور ان کی حرکات کی تاثیر پر چل رہا ہے، اور یہ تاثیر ان کے ذاتی اوصاف میں سے ہے اس لئے ان کی خوشنودی ضروری ہے اور یہ ان کی پرستش کے بغیر ممکن نہیں۔

اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس طرح ان کو ان کے سفلی معبودانِ باطل کی حقیقت واشگاف کر کے راہ حق کی طرف دعوت دی اسی طرح ضروری سمجھا کہ ان کے علوی معبودان باطل کی بے ثباتی اور فنا کے منظر کو پیش کر کے اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیں کہ تمہارا یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ ان چمکتے ہوئے ستاروں، چاند اور سورج کو خدائی طاقت حاصل ہے ہرگز نہیں یہ خیال خام اور باطل عقیدہ ہے، مگر یہ باطل پرست جبکہ اپنے خود ساختہ اصنام سے اس قدر خائف تھے کہ اُن کو برا کہنے والے کیلئے ہر آن یہ تصور کرتے تھے کہ وہ ان کے غضب میں آ کر برباد وتباہ ہو جائے گا تو ایسے اوہام پرستوں کے دلوں میں بلند ستاروں کی پرستش کے خلاف جذبہ پیدا کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اسلئے (مجد دانبیاء) ابراہیم علیہ السلام نے ان کے دماغوں کے مناسب ایک عجیب اور دلچسپ پیرایہ بیان اختیار فرمایا۔

تاروں بھری رات تھی ایک ستارہ خوب روشن تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو دیکھ کر فرمایا "میرا رب یہ ہے؟" اس لئے کہ اگر ستارے ربوبیت کر سکتے ہیں تو یہ ان سب میں ممتاز اور روشن ہے لیکن جب وہ اپنے وقت مقررہ پر نظر سے اوجھل ہو گیا اور اس کو یہ مجال نہ ہوئی کہ اپنے ستاروں کے لئے ایک گھڑی اور رونمائی کرا سکتا اور نظام کائنات سے منحرف ہو کر اپنے پوجنے والوں کے لئے زیارت گاہ بنا رہتا تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا "میں چھپ جانے والے کو پسند نہیں کرتا" یعنی جس شے پر مجھ سے بھی زیادہ تغیرات کا اثر پڑتا ہو اور جو جلد جلد ان اثرات کو قبول کر لیتا ہو وہ میرا معبود کیونکر ہو سکتا ہے پھر نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ چاند[1] آب وتاب کے ساتھ سامنے موجود ہے، اس کو دیکھ کر فرمایا "یہ میرا رب ہے؟" اس لئے کہ یہ خوب روشن ہے اور اپنی خنک روشنی سے سارے عالم کو بقعہ نور بنائے ہوئے ہے، پس اگر کواکب کو رب بنانا ہی ہے تو اسی کو کیوں نہ بنایا جائے کیونکہ یہی اس کا زیادہ مستحق نظر آتا ہے۔

اب سحر کا وقت ہونے لگا تو قمر کے بھی ماند پڑ جانے اور روپوش ہو جانے کا وقت آ پہنچا اور جس قدر طلوع آفتاب کا وقت قریب ہوتا گیا چاند کا جسم دیکھنے والوں کی آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا تو یہ دیکھ کر ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسا جملہ فرمایا جس سے چاند کے رب ہونے کی نفی کیساتھ ساتھ خدائے واحد کی ہستی کی جانب قوم کی توجہ اس خاموشی کے ساتھ پھیر دی جائے کہ قوم اس کا احساس بھی نہ کر سکے اور اس گفتگو کا جو مقصد وحید ہے

[1] قرآن عزیز نے یہ تصریح نہیں کی کہ ابراہیمؑ کی یہ گفتگو متعدد راتوں کا نتیجہ ہے یا ایک ہی شب کا، اگر ایک ہی شب کا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی رات کا واقعہ ہے جبکہ چاند کچھ رات گئے نکلتا ہے۔

"یعنی صرف خدائے واحد پر ایمان" وہ ان کے دلوں میں بغیر قصد وارادے کے پیوست ہو جائے۔ فرمایا "اگر میرا حقیقی پروردگار میری رہنمائی نہ کرتا تو میں بھی ضرور گمراہ قوم ہی میں سے ایک ہوتا۔"

پس اس قدر فرمایا اور خاموش ہو گئے اس لئے کہ ابھی اس سلسلہ کی ایک کڑی اور باقی ہی اور قوم کے پاس ابھی مقابلہ کے لئے ایک ہتھیار موجود ہے اس لئے اس سے زیادہ کہنا مناسب نہیں تھا۔

تاروں بھری رات ختم ہوئی چمکتے ستارے اور چاند سب نظر سے اوجھل ہو گئے کیوں؟ اس لئے کہ اب آفتاب عالمتاب کا رخ روشن سامنے آرہا ہے، دن نکل آیا اور وہ پوری آب و تاب سے چمکنے دمکنے لگا۔

ابراہیم علیہ السلام نے اس کو دیکھ کر فرمایا "یہ ہے میرا رب کیونکہ یہ کواکب میں سب سے بڑا ہے اور نظام فلکی میں اس سے بڑا ستارہ ہمارے سامنے دوسرا نہیں ہے؟" لیکن دن بھر چمکنے اور روشن رہنے اور تمام عالم کو روشن کرنے کے بعد وقت مقررہ پر اُس نے بھی عراق کی سرزمین سے پہلو بچانا شروع کر دیا اور شب دیجور آہستہ آہستہ سامنے آنے لگی اور آخر کار وہ نظروں سے غائب ہو گیا، تو اب وقت آپہنچا کہ ابراہیم علیہ السلام اصل حقیقت کا اعلان کر دیں اور قوم کو لاجواب بنا دیں کہ اُن کے عقیدہ کے مطابق اگر ان کواکب کو ربوبیت اور معبودیت حاصل ہے تو اس کی کیا وجہ کہ ہم سے بھی زیادہ ان میں تغیرات نمایاں ہیں اور یہ جلد جلد ان کے اثرات سے متاثر ہوتے ہیں اور اگر معبود ہیں تو ان میں "اُفول[1]" کیوں ہے، جس طرح چمکتے نظر آتے تھے اسی طرح کیوں چمکتے نہ رہے چھوٹے ستاروں کی روشنی کو ماہتاب نے کیوں ماند کر دیا اور ماہتاب کے رخ روشن کو آفتاب کے نور نے کس لئے بے نور بنا دیا۔"

پس اے قوم! میں ان مشرکانہ عقائد سے بری ہوں اور شرک کی زندگی سے بیزار، بلاشبہ میں نے اپنا رخ صرف اُسی ایک خدا کی جانب کر لیا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے۔ میں "حنیف" ہوں اور "مشرک" نہیں ہوں۔

اب قوم سمجھی کہ یہ کیا ہوا، ابراہیم علیہ السلام نے ہمارے تمام ہتھیار بیکار اور ہمارے تمام دلائل پامال کر دیے اب ہم ابراہیم علیہ السلام کے اس مضبوط و محکم برہان کا کس طرح رد کریں اور اس کی روشن دلیل کا کیا جواب دیں؟ وہ اس کے لئے بالکل عاجز و درماندہ تھے اور جب کوئی بس نہ چلا تو قائل ہونے اور صدائے حق کو قبول کر لینے کے بجائے ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑنے اور اپنے معبودان باطل سے ڈرانے لگے کہ وہ تیری توہین کا تجھ سے ضرور انتقام لیں گے اور تجھ کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کیا تم مجھ سے جھگڑتے اور اپنے بتوں سے مجھ کو ڈراتے ہو حالانکہ خدائے تعالیٰ نے مجھ کو صحیح راہ دکھادی ہے اور تمہارے پاس گمراہی کے سوا کچھ نہیں، مجھے تمہارے بتوں کی مطلق کوئی پروا نہیں جو کچھ میرا رب چاہے گا وہی ہو گا۔ تمہارے بت کچھ بھی نہیں کر سکتے کیا تم کو ان باتوں سے کوئی نصیحت حاصل نہیں ہوتی؟ تم کو تو خدا کی نافرمانی کرنے اور اس کے ساتھ بتوں کو شریک ٹھہرانے میں بھی کوئی خوف نہیں آتا جس کے لئے تمہارے پاس ایک دلیل بھی نہیں ہے اور مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ خدائے واحد کا ماننے والا اور امن عالم کا ذمہ دار ہو کر میں تمہارے بتوں سے ڈر جاؤں گا، کاش کہ تم سمجھتے کہ کون مفسد ہے اور

---

[1] چمک کر پھر ڈوب جانا

کون مصلح وامن پسند؟

صحیح امن کی زندگی اسی شخص کو حاصل ہے جو خدائے واحد پر ایمان رکھتا اور شرک سے بیزار رہتا ہے، اور وہی راہیاب ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کی یہ وہ عظیم الشان حجت تھی جو اس نے ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے بت پرستی کے خلاف ہدایت و تبلیغ کے بعد کو آپ پرستی کے رد میں ظاہر فرمائی اور ان کی قوم کے مقابلہ میں ان کو روشن دلائل و براہین کے ساتھ سربلندی عطا فرمائی۔

اس سلسلہ میں سورۂ انعام کی یہ آیات شاہد عدل ہیں۔

وَ كَذٰلِكَ نُرِيٓ إِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ○ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰى كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ الْآفِلِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَى الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَأَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ أَكْبَرُ فَلَمَّآ أَفَلَتْ قَالَ يَاقَوْمِ إِنِّيْ بَرِيٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○ إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ قَالَ أَتُحَآجُّوْنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدَانِيْ وَلَآ أَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْئًا وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا أَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ○ وَكَيْفَ أَخَافُ مَآ أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا فَأَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا إِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ آتَيْنَاهَآ إِبْرَاهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّنْ نَّشَآءُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○ (الانعام: ع ۹-۱۰)

اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی پادشاہت کے جلوے دکھائیے، تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا کہ اس پر رات کی تاریکی چھا گئی تو اس نے (آسمان پر) ایک ستارہ (چمکتا ہوا) دیکھا۔ اس نے کہا "یہ میرا پروردگار ہے" (کہ سب لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں) لیکن جب وہ ڈوب گیا تو کہا نہیں میں انہیں پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں" (یعنی طلوع و غروب ہوتے رہتے ہیں) پھر جب ایسا ہوا کہ چاند چمکتا ہوا نکل آیا، تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا یہ میرا پروردگار ہے۔ لیکن جب وہ بھی

ڈوب گیا تو کہا اگر میرے پروردگار نے مجھے راہ نہ دکھائی ہوتی تو میں ضرور اسی گروہ میں سے ہو جاتا جو راہ راست سے بھٹک گیا ہے! پھر جب صبح ہوئی اور سورج چمکتا ہوا طلوع ہوا تو ابراہیم نے کہا یہ میرا پروردگار ہے کہ یہ سب سے بڑا ہے لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو اس نے کہا اے میری قوم! تم جو کچھ خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو میں اس سے بیزار ہوں میں نے تو ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اسی ہستی کی طرف اپنا رخ کر لیا ہے جو (جو کسی کی بنائی ہوئی نہیں، بلکہ آسمان و زمین کی بنانے والی ہے (اور جس کے حکم و قانون پر تمام آسمانی اور ارضی مخلوقات چل رہی ہیں) اور میں ان میں سے نہیں جو اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے ہیں!) اور پھر ابراہیم سے اس کی قوم نے ردوکد کی، ابراہیم نے کہا" کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں ردوکد کرتے ہو، حالانکہ اس نے مجھے راہ حق دکھادی ہے جنہیں تم نے خدا کا شریک ٹھہرالیا ہے میں ان سے نہیں ڈرتا، میں جانتا ہوں کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا مگر یہ کہ میرا پروردگار ہی مجھے نقصان پہنچانا چاہے، میرا پروردگار اپنے علم سے تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے پھر کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے" اور (دیکھو) میں ان ہستیوں سے کیونکر ڈر سکتا ہوں جنہیں تم نے خدا کا شریک ٹھہرالیا ہے جبکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراؤ جن کے لئے اس نے کوئی سند و دلیل تم پر نہیں اتاری؟ بتلاؤ ہم دونوں فریقوں میں سے کس کی راہ امن کی راہ ہوئی اگر علم و بصیرت رکھتے ہو جن لوگوں نے خدا کو مانا اور اپنے ماننے کو ظلم سے (یعنی شرک سے) آلودہ نہیں کیا تو انہی کے لئے امن ہے اور وہی ٹھیک راستہ پر ہیں اور (دیکھو) یہ ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر دی تھی، ہم جس کے مرتبے بلند کرنا چاہتے ہیں اسے علم و دلیل کا عرفان دے کر بلند کر دیتے ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار حکمت والا علم رکھنے والا ہے۔

آیات کی تفسیر میں قول فیصل

اس بارہ میں کلی اتفاق کے باوجود کہ ابراہیم علیہ السلام نے کبھی کواکب پرستی نہیں کی اور ان کی تمام زندگی شرک کی تلوثیات سے پاک ہے سورۂ انعام کی مسطورۂ بالا آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں ان آیات کی تمہید میں جو کچھ لکھا گیا وہ ان اقوال میں سے ایک قول کے مطابق ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ گفتگو قوم کی کواکب پرستی کی رد میں اس کو لاجواب کرنے کے لئے تھی اس لئے کہ جب دو فریق کسی مسئلہ میں اختلاف کر بیٹھتے ہیں تو احقاق حق کے لئے مناظرانہ دلائل میں سے دلیل کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں صرف نظریوں تھیوریوں (THOREES) سے کام نہ لیا جائے بلکہ مشاہدہ اور معائنہ کی ایسی راہ اختیار کی جائے کہ مخالف اس کے دعوے کے مقابلہ میں لاجواب ہو جائے اور اس کی دلیل کے رد کرنے کی تمام راہیں اس کے سامنے بند ہو جائیں اب اگر اس میں سلامت روی باقی ہے اور اس کے قلب میں قبول حق کی گنجائش ہے تو وہ اس کو قبول کر لیتا ہے ورنہ بے دلیل لڑنے اور جھگڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تب اس طرح حق و باطل میں امتیاز ہو جاتا ہے اور اصلی اور حقیقی بات نکھر کر صاف ہو جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر ہیں اس لئے ان کی تبلیغ کا مشن منطق صغریٰ کبریٰ پر قائم نہ تھا بلکہ حقیقت کو فطری دلائل کی سادگی کے ساتھ واضح کرنا ہی ان کا طغرائے امتیاز تھا اس لئے انھوں نے یہی راستہ اختیار کیا اور قوم پر واضح کر دیا کہ ستارے خواہ شمس و قمر ہی کیوں نہ ہوں رب کہلانے کے قابل نہیں ہیں بلکہ ربوبیت

صرف اسی کو زیبا ہے جو رب العلمین ہے اور ارضی و سماوی سفلی و علوی کل کائنات کا خالق و مالک ہے اور چونکہ قوم کے پاس اس بہترین دلیل کا کوئی جواب نہ تھا اس لئے وہ زچ ہوئی اور امر حق کو قبول کرنے کی بجائے لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو گئی مگر اس کے ضمیر کو ماننا پڑا کہ یہ جو کچھ کہا گیا حق ہے اور ہمارے پاس اس کا کوئی صحیح جواب نہیں ہے، یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد تھا اور ان کے ادائے فرض کی حد یہیں تک تھی، کیونکہ دل چیر کر حق کو اس میں اتار دینا اُن کی طاقت سے باہر تھا۔

اس تفسیر کے مطابق قرآن عزیز کی ان آیات میں نہ تاویل کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ مقدرات ماننے کی نیز مشاہدۂ کواکب سے متعلق آیات کا سیاق و سباق بھی بے تکلف اسی کی تائید کرتا ہے مثلاً اس سلسلہ کی پہلی دو آیات ہیں۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيْمُ لِأَبِيْهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً إِنِّيْ أَرَاكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ○ وَكَذٰلِكَ نُرِيْ إِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ○ (الانعام ع ۹)

جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کیا تو بناتا ہے بتوں کو خدا میں تجھ کو اور تیری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتا ہوں اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت کا مشاہدہ کرادیا اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔

ان ہر دو آیات سے حسب ذیل نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

رویت کواکب کا یہ معاملہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ایسے زمانہ میں پیش آیا ہے جبکہ وہ اپنے والد اور قوم کے ساتھ تبلیغ حق کے مناظرہ میں مصروف تھے۔ اس لئے کہ پہلی آیت کے بعد دوسری آیت کو وَكَذٰلِكَ کہہ کر شروع کرنا یہی معنی رکھتا ہے پھر تیسری آیت کے شروع میں فلما کی ف یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ دوسری آیت سے وابستہ ہے اور اس طرح ان تینوں آیات کا سلسلہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے۔

۲ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جس طرح اصنام پرستی کے مقابلہ میں روشن دلائل عطا فرمائے تھے تاکہ وہ آزر اور قوم کو لاجواب کر سکیں اور راہِ ہدایت دکھائیں۔ اسی طرح کواکب پرستی کے مقابلہ میں بھی اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت کا مشاہدہ کرادیا تاکہ وہ ان سب مخلوق کی حقیقت سے آگاہ ہو جائیں اور ان کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہو جائے، اور پھر وہ کواکب پرستی کے رد میں بھی بہترین دلائل دے سکیں اور اس سلسلہ میں بھی قوم کو حق کی راہ دکھلا کر ان کی غلط روش کے متعلق لاجواب بنا سکیں۔ یہ تو آیات رویت کا سباق تھا اور اب سیاق قابل توجہ ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آخر میں آفتاب پر نظر فرمائی اور پھر وہ بھی نظروں سے غائب ہونے لگا تو اسی آیت میں یہ جملہ موجود نظر آتا ہے:

قَالَ يَاقَوْمِ إِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○

"ابراہیم نے کہا اے قوم میں شرک کرنیوالوں سے بری ہوں"۔

اور ساتھ ہی یہ آیت مذکور ہے۔

إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (سورۃ الانعام ع ۹)

بلا شبہ میں نے اپنا رخ صرف اس خدا کی جانب پھیر دیا ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، اس حالت میں کہ میں حنیف ہوں اور مشرک نہیں ہوں۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ قَالَ أَتُحَآجُّوْنِّيْ فِي اللّٰهِ ۔

اور ابراہیم کی قوم نے اس سے جھگڑنا شروع کیا ابراہیم نے کہا کیا تو مجھ سے اللہ کے بارہ میں جھگڑتی ہے۔

اور سب سے آخر آیت میں کہا گیا ہے:

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ آتَيْنَاهَآ إِبْرَاهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّنْ نَّشَآءُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○

اور یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی۔ ہم جس کا درجہ بلند کرنا چاہتے ہیں کر دیا کرتے ہیں بیشک تیرا رب دانا ہے جاننے والا

ان آیات سے یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱ رویت کواکب کا یہ معاملہ قوم سے ضرور وابستہ تھا تب ہی تیسری مرتبہ میں ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذات سے خطاب کرتے کے بجائے فوراً قوم سے خطاب شروع کر دیا۔

۲ اور قوم نے بھی یہ سب کچھ سنکر دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی جگہ ابراہیم علیہ السلام سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔

۳ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اس گفتگو کو قوم کے مقابلہ میں اپنی جانب سے حجت قرار دیا اور بتایا کہ ابراہیم علیہ السلام کا رُتبہ رسالت بہت بلند اور ارفع ہے اور اس لئے قوم ان کی رہنمائی کی سخت محتاج ہے اور ان امور کے سوا یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ارشاد فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَآ إِبْرَاهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عَالِمِيْنَ ○ (انبیاء ع ۵)

اور بلا شبہ ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے ہدایت عطا کر دی تھی اور ہم ہی اس کے واقف کار ہیں۔

لہٰذا یہ معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نہ لڑکپن کا ہو سکتا ہے اور نہ ان کے اپنے عقیدہ اور ایمان کا اس تفصیل سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری بیان کردہ تفسیر ہی آیات کی صحیح تفسیر ہے اور بلا شبہ ابراہیم

علیہ السلام کی جانب سے قوم پر یہ زبردست حجت تھی کہ افراد قوم کا کواکب کی پرستش کرنا، ان کے لئے ہیکل بنانا اپنے سفلی معبودوں کے نام ان کے نام پر رکھنا غرض ان کو معبود رب اور خدا سمجھنا قطعاً باطل اور گمراہی ہے اس لئے کہ یہ سب ایک خاص نظام میں جکڑے ہوئے اور دن اور رات کے تغیر کے ساتھ تغیرات کو قبول کرنیوالے ہیں اور اس پورے نظام کی مالک و خالق صرف وہی ہستی ہے جس کے ید قدرت میں ان سب کی تسخیر ہے اور وہ ''اللہ'' ہے۔

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَآ أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ

نہ سورج کی یہ مجال ہے کہ وہ قمر کو پا سکے اور نہ رات میں یہ قدرت کہ وہ دن کو پیچھے ہٹا کر اس کی جگہ خود لے لے۔

غرض ان تمام روشن دلائل و براہین کے بعد بھی جب قوم نے دعوت اسلام کو قبول نہ کیا اور اصنام پرستی و کواکب پرستی میں اُسی طرح مبتلا رہی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک دن جمہور کے سامنے اعلان جنگ کر دیا کہ میں تمہارے ان بتوں کے متعلق ایک ایسی چال چلوں گا جو تم کو زچ کر کے ہی چھوڑے گی۔

وَتَاللّٰهِ لَأَكِيْدَنَّ أَصْنَامَكُمْ بَعْدَ أَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ○ (انبیاء ع۵)

اور اللہ کی قسم میں تمہاری عدم موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کے ساتھ خفیہ چال چلوں گا۔

اس معاملہ سے متعلق اصل صورت حال یہ ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے آزر اور قوم کے جمہور کو ہر طرح بت پرستی کے معائب ظاہر کر کے اس سے باز رکھنے کی سعی کر لی، اور ہر قسم کے پند و نصائح کے ذریعہ ان کو یہ باور کرانے میں قوت صرف کر دی کہ یہ بت نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان اور یہ کہ تمہارے کاہنوں اور پیشواؤں نے ان کے متعلق تمہارے دلوں میں غلط خوف بٹھا دیا ہے کہ اگر ان سے منکر ہو جاؤ گے تو یہ غضبناک ہو کر تم کو تباہ کر ڈالیں گے، یہ تو اپنی آئی ہوئی مصیبت کو بھی نہیں ٹال سکتے مگر آزر اور قوم کے دلوں پر مطلق اثر نہ ہوا اور وہ اپنے دیوتاؤں کی خدائی قوت کے عقیدہ سے کسی طرح باز نہ آئے بلکہ کاہنوں اور سرداروں نے ان کو زیادہ پختہ کر دیا اور ابراہیم علیہ السلام کی نصیحت پر کان دھرنے سے سختی کے ساتھ روک دیا تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ اب مجھ کو رشد و ہدایت کا ایسا پہلو اختیار کرنا چاہیے جس سے جمہور کو یہ مشاہدہ ہو جائے کہ واقعی ہمارے دیوتا صرف لکڑیوں اور پتھروں کی مورتیاں ہیں جو گونگی بھی ہیں۔ بہری بھی ہیں اور اندھی بھی اور دلوں میں یہ یقین راسخ ہو جائے کہ ابتک ان کے متعلق ہمارے کاہنوں اور سرداروں جو کچھ کہا تھا وہ بالکل غلط اور بے سر و پا بات تھی اور ابراہیم ہی کی بات سچی ہے اگر ایسی کوئی صورت بن آئی تو پھر میرے لئے تبلیغ حق کے لئے آسان راہ نکل آئے گی یہ سوچ کر انھوں نے ایک نظام عمل تیار کیا جس کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا، اور اس کی ابتداء اس طرح کی کہ باتوں باتوں میں اپنی قوم کے افراد سے یہ کہہ گذرے کہ ''میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک خفیہ چال چلوں گا'' گویا اس طرح ان کو متنبہ کرنا تھا کہ اگر تمہارے دیوتاؤں میں کچھ قدرت ہے جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو تو وہ میری چال کو باطل اور مجھ کو مجبور کر دیں کہ میں ایسا نہ کر

سکوں مگر چونکہ بات صاف نہ تھی اس لئے قوم نے اس جانب کچھ توجہ نہ کہ حسن اتفاق کہ قریب ہی زمانہ میں قوم کا ایک مذہبی میلہ پیش آ گیا جب سب اس کے لئے چلنے لگے تو کچھ لوگوں نے ابراہیم علیہ السلام سے بھی اصرار کیا کہ وہ بھی ساتھ چلیں حضرت ابراہیم نے اول انکار فرمایا اور جب اس جانب سے اصرار بڑھنے لگا تو ستاروں کی جانب نگاہ اٹھائی اور فرمانے لگے اِنِّیْ سَقِیْمٌ ''میں آج کچھ علیل سا ہوں'' چونکہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم کواکب پرستی کی وجہ سے نجوم میں کمال بھی اور اعتقاد بھی تھا اس لئے اپنے عقیدہ کے لحاظ سے وہ یہ سمجھے کہ ابراہیم علیہ السلام کسی نحس ستارہ کے اثر بد میں مبتلا ہیں اور یہ سوچ کر بغیر کسی تشریح حال کے ابراہیم علیہ السلام کو چھوڑ کر میلہ میں چلے گئے۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ○ فَقَالَ إِنِّيْ سَقِيْمٌ ○ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ○ (الصافات ع ۳)

پس (ابراہیم نے) ایک نگاہ اٹھا کر ستاروں کی جانب دیکھا اور کہنے لگا میں کچھ علیل ہوں، پس وہ اسکو چھوڑ کر چلے گئے۔

اب جبکہ ساری قوم، بادشاہ کاہن اور مذہبی پیشوا میلہ میں مصروف اور شراب و کباب میں مشغول تھے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ وقت آ گیا ہے کہ اپنے نظام عمل کی تکمیل کروں اور مشاہدہ کی صورت میں جمہور پر واضح کر دوں کہ ان کے دیوتاؤں کی حقیقت کیا ہے؟ وہ اٹھے اور سب سے بڑے دیوتا کے ہیکل (مندر) میں پہنچے، دیکھا تو وہاں دیوتاؤں کے سامنے قسم قسم کے حلوؤں پھلوں میووں اور مٹھائیوں کے چڑھاوے رکھے تھے، ابراہیم علیہ السلام نے طنزیہ لہجہ میں چپکے چپکے ان مورتیوں سے خطاب کر کے کہا کہ یہ سب کچھ موجود ہے ان کو کھاتے کیوں نہیں؟ اور پھر کہنے لگے میں بات کر رہا ہوں کیا بات ہے کہ تم جواب نہیں دیتے؟ اور پھر ان سب کو توڑ پھوڑ ڈالا اور سب سے بڑے بت کے کاندھے پر تبر رکھ کر واپس چلے گئے۔

فَرَاغَ إِلٰى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۵ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ○ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ ○ (الانبیاء)

پس چپکے سے جا گھسا ان کے بتوں میں اور کہنے لگا ابراہیم ان کے دیوتاؤں سے کیوں نہیں کھاتے تم کو کیا ہو گیا کیوں نہیں بولتے؟ پھر اپنے داہنے ہاتھ سے ان سب کو توڑ ڈالا۔

فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا إِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ○ (انبیاء ع ۵)

پس کر دیا ان کو ٹکڑے ٹکڑے مگر ان میں سے بڑے دیوتا کو چھوڑ دیا تاکہ (اپنے عقیدہ کے مطابق) وہ اس کی طرف رجوع کریں (کہ یہ کیا ہو گیا)۔

جب لوگ میلے سے واپس آئے تو ہیکل (مندر) میں بتوں کا یہ حال پایا، سخت برہم ہوئے اور ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے کہ یہ کیا ہوا اور کس نے کیا؟ ان میں وہ بھی تھے جن کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ[1] کہہ چکے تھے انھوں نے فوراً کہا کہ یہ اس شخص کا کام ہے جس کا نام

---

[1]: تفسیر ابن کثیر جلد ۳ سورۂ انبیاء۔

ابراہیم علیہ السلام ہے وہی ہمارے دیوتاؤں کا دشمن ہے۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ۝ (الانبیاء)

وہ کہنے لگے یہ معاملہ ہمارے خداؤں کے ساتھ کس نے کیاہے بلاشبہ وہ ضرور ظالم ہے (ان میں سے بعض) کہنے لگے ہم نے ایک جوان کی زبان سے ان بتوں کا (برائی کے ساتھ) ذکر سنا ہے اس کو ابراہیم کہا جاتا ہے (یعنی یہ اس کا کام ہے) کاہنوں اور سرداروں نے جب یہ سنا تو غم وغصہ سے سرخ ہو گئے اور کہنے لگے اس کو مجمع کے سامنے پکڑ کر لاؤ تاکہ سب دیکھیں کہ مجرم کون شخص ہے۔

ابراہیم علیہ السلام سامنے لائے گئے تو بڑے رعب داب سے انھوں نے پوچھا کیوں ابراہیم علیہ السلام تو نے ہمارے دیوتاؤں کے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے؟

قَالُوْا فَأْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ۝ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ (الانبیاء)

انھوں نے کہا ابراہیم کو لوگوں کے سامنے لاؤ تاکہ وہ دیکھیں وہ کہنے لگے کیا ابراہیم تو نے ہمارے دیوتاؤں کے ساتھ یہ کیا ہے؟

ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ اب وہ بہترین موقعہ آگیا ہے جس کے لئے میں نے یہ تدبیر اختیار کی مجمع موجود ہے جمہور دیکھ رہے ہیں کہ ان کے دیوتاؤں کا کیا حشر ہو گیا، اسلئے اب کاہنوں اور مذہبی پیشواؤں کو جمہور کی موجودگی میں ان کے باطل عقیدہ پر نادم کر دینے کا وقت ہے تاکہ عوام کو آنکھوں دیکھتے معلوم ہو جائے کہ آج تک ان دیوتاؤں کے متعلق جو کچھ ہم سے کاہنوں اور پجاریوں نے کہا تھا یہ سب ان کا مکر و فریب تھا مجھے ان سے کہنا چاہئے کہ یہ سب اس بڑے بت کی کارروائی ہے اس سے دریافت کرو؟ لا محالہ وہ یہی جواب دیں گے کہ کہیں بت بھی بولتے اور بات کرتے ہیں، تب میرا مطلب حاصل ہے اور پھر میں ان کے عقیدے کا پول جمہور کے سامنے کھول کر صحیح عقیدہ کی تلقین کر سکوں گا اور بتاؤں گا کہ کس طرح وہ باطل اور گمراہی میں مبتلا ہیں اس وقت ان کاہنوں اور پجاریوں کے پاس ندامت کے سوائے کیا ہوگا اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا:

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝ (الانبیاء)

ابراہیم نے کہا بلکہ ان میں سے اس بڑے بت نے یہ کیا ہے پس اگر یہ (تمہارے دیوتا) بولتے ہوں تو ان سے دریافت کرلو؟

ابراہیم علیہ السلام کی اس یقینی حجت اور دلیل کا کاہنوں اور پجاریوں کے پاس کیا جواب ہو سکتا تھا وہ ندامت میں غرق تھے۔ دلوں میں ذلیل و رسوا تھے۔ اور سوچتے تھے کہ کیا جواب دیں؟ جمہور بھی آج سب کچھ سمجھ گئے اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھ لیا جس کیلئے وہ تیار نہ تھے اور بالآخر چھوٹے اور بڑے سب ہی کو دل میں

اقرار کرنا پڑا کہ ابراہیم علیہ السلام ظالم نہیں ہے بلکہ ظالم ہم خود ہیں کہ ایسے بے دلیل اور باطل عقیدہ پر یقین رکھتے ہیں تب نہایت شرمساری کیساتھ سرنگوں ہو کر کہنے لگے ابراہیم علیہ السلام تو خوب جانتا ہے کہ ان دیوتاؤں میں بولنے کی سکت نہیں ہے یہ تو بے جان مورتیاں ہیں۔

فَرَجَعُوٓا۟ إِلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ فَقَالُوٓا۟ إِنَّكُمْ أَنتُمُ ٱلظَّـٰلِمُونَ ۝ ثُمَّ نُكِسُوا۟ عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هَـٰٓؤُلَآءِ يَنطِقُونَ ۝ (الانبیاء ع ۵)

پس انھوں نے اپنے جی میں سوچا پھر کہنے لگے بے شک تم ہی ظالم ہو بعد ازاں اپنے سروں کو نیچے جھکا کر کہنے لگے (ابراہیم) تو خوب جانتا ہے کہ یہ بولنے والے نہیں ہیں۔

اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حجت و دلیل کامیاب ہوئی اور دشمنوں نے اعتراف کر لیا کہ ظالم ہم خود ہیں اور ان کو جمہور کے سامنے زبان سے اقرار کرنا پڑا کہ ہمارے یہ دیوتا جواب دینے اور بولنے کی طاقت نہیں رکھتے چہ جائیکہ نفع و نقصان کے مالک ہوں۔

تو اب ابراہیم نے مختصر مگر جامع الفاظ میں ان کو نصیحت بھی کی اور کلامت بھی اور بتایا کہ جب یہ دیوتا نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان تو پھر یہ خدا اور معبود کیسے ہو سکتے ہیں افسوس تم اتنا بھی نہیں سمجھتے یا عقل سے کام نہیں لیتے؟ فرمانے لگے:

أَفَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ مَا لَا يَنفَعُكُمْ شَيْـًۭٔا وَلَا يَضُرُّكُمْ ۝ أُفٍّۢ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (الانبیاء ع ۵)

کیا تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی پوجا کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان دے سکتے ہیں تم پر افسوس ہے اور تمہارے ان معبودان باطل پر بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

فَأَقْبَلُوٓا۟ إِلَيْهِ يَزِفُّونَ ۝ قَالَ أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ ۝ وَٱللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ۝ (الصافات ع ۳)

پس وہ سب یلہ کر کے ابراہیم کے گرد جمع ہو گئے، ابراہیم نے کہا کیا جن بتوں کو ہاتھ سے گھڑتے ہو انہی کو پھر پوجتے ہو، اور اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے اور ان کو بھی جن کاموں کو تم کرتے ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس نصیحت و موعظت کا اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ تمام قوم اپنے باطل عقیدہ سے تائب ہو کر ملت حنیفی کو اختیار کر لیتی اور کج روی چھوڑ کر راہ مستقیم پر گامزن ہو جاتی لیکن دلوں کی کجی، نفوس کی سرکشی، متمردانہ ذہنیت اور باطنی خباثت و دنائت نے اس جانب نہ آنے دیا، اور اسکے برعکس ان سب نے ابراہیم علیہ السلام کی عداوت و دشمنی کا نعرہ بلند کر دیا اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ اگر دیوتاؤں کی خوشنودی چاہتے ہو تو اسکو اس گستاخی اور مجرمانہ حرکت پر سخت سزا دو اور دہکتی ہوئی آگ میں جلا ڈالو تاکہ اسکی تبلیغ و

دعوت کا قصہ ہی پاک ہو جائے۔

بادشاہ کو دعوت اسلام اور اس سے مناظرہ

ابھی یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ شدہ شدہ بادشاہ وقت تک یہ باتیں پہنچ گئیں اس زمانہ میں عراق کے بادشاہ کا لقب نمرود ہوتا تھا اور یہ رعایا کے صرف بادشاہ ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ خود کو ان کا رب اور مالک جانتے تھے اور رعایا بھی دوسرے دیوتاؤں کی طرح اس کو اپنا خدا اور معبود مانتی اور اس کی بھی اسی طرح پرستش کرتی تھی، جس طرح دیوتاؤں کی، بلکہ ان سے بھی زیادہ پاس وادب کے ساتھ پیش آتی تھی، اس لئے کہ وہ صاحب عقل و شعور بھی ہوتا تھا اور مالک تخت و تاج بھی۔

نمرود کو جب یہ معلوم ہوا تو آپے سے باہر ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اس شخص کی پیغمبرانہ تبلیغ و دعوت کی سرگرمیاں اگر اسی طرح جاری رہیں تو یہ میری ربوبیت ملوکیت اور الوہیت سے بھی سب رعایا کو برگشتہ کر دے گا اور اس طرح باپ دادا کے مذہب کیساتھ ساتھ میری یہ سلطنت بھی زوال میں آجائے گی، اسلئے اس قصہ کا ابتدا ہی میں خاتمہ کر دینا بہتر ہے، یہ سوچ کر اس نے حکم دیا کہ براہیم کو ہمارے دربار میں حاضر کرو ابراہیم علیہ السلام جب نمرود کے دربار میں پہنچے تو نمرود نے گفتگو شروع کی اور ابراہیم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ تو باپ دادا کے دین کی مخالفت کسلئے کرتا ہے اور مجھ کو رب ماننے سے تجھے کیوں انکار ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں خدائے واحد کا پرستار ہوں اس کے علاوہ کسی کو اس کا شریک نہیں مانتا ساری کائنات اور تمام عالم اسی کی مخلوق ہے اور وہی ان سب کا خالق و مالک ہے تو بھی اسی طرح ایک انسان ہے جس طرح ہم سب انسان ہیں پھر تو کس طرح رب یا خدا ہو سکتا ہے۔ اور کس طرح یہ گونگے بہرے لکڑی کے بت خدا ہو سکتے ہیں؟ میں صحیح راہ پر ہوں اور تم سب غلط راہ پر ہو اس لئے میں تبلیغ حق کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں اور تمہارے باپ دادا کے خود ساختہ دین کو کیسے اختیار کر سکتا ہوں؟

نمرود نے ابراہیم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اگر میرے علاوہ تیرا کوئی رب ہے تو اس کا ایسا وصف بیان کر کہ جس کی قدرت مجھ میں نہ ہو، تب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میرا رب وہ ہے جس کے قبضہ میں موت و حیات ہے وہی موت دیتا ہے اور وہی زندگی بخشتا ہے کج فہم نمرود موت و حیات کی حقیقت سے ناآشنا نمرود کہنے لگا۔ اس طرح موت و حیات تو میرے قبضہ میں بھی ہے اور یہ کہہ کر اسی وقت ایک بے قصور شخص کے متعلق جلاد کو حکم دیا کہ اس کی گردن مار دو اور موت کے گھاٹ اتار دو جلاد نے فوراً حکم کی تعمیل کر دی اور ایک قتل کے سزا یافتہ مجرم کو جیل سے بلا کر حکم دیا کہ جاؤ ہم نے تمہاری جان بخشی کی اور پھر ابراہیم علیہ السلام کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگا دیکھا میں بھی کس طرح زندگی بخشتا اور موت دیتا ہوں پھر تیرے خدا کی خصوصیت کیا رہی؟

ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ نمرود یا تو موت و حیات کی اصل حقیقت سے ناآشنا ہے اور یا جمہور اور رعایا کو مغالطہ دینا چاہتا ہے تاکہ وہ اس فرق کو نہ سمجھ سکیں کہ زندگی بخشنا اس کا نام نہیں ہے بلکہ نیست سے ہست کرنے کا نام زندگی بخشنا ہے اور اسی طرح کسی کو قتل یا پھانسی سے بچالینا موت کا مالک ہونا نہیں ہے موت کا مالک وہی ہے جو روح انسانی کو اس کے جسم سے نکال کر اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے اس لئے بہت سے دار رسیدہ اور

شمشیر چشیدہ انسان زندگی پا جاتے ہیں اور بہت سے قتل و دار سے بچائے ہوئے انسان لقمہ اجل بن جاتے ہیں اور کوئی طاقت ان کو نہیں روک سکتی اور اگر ایسا ہو سکتا تو ابراہیم علیہ السلام سے گفتگو کرنے والا نمرود سریر آرائے سلطنت نہ ہوتا بلکہ اس کے خاندان کا پہلا شخص ہی آج بھی اس تاج و تخت کا مالک نظر آتا، مگر نہ معلوم کہ عراق کی اس سلطنت کے کتنے مدعی زیر زمین دفن ہو چکے اور ابھی کتنوں کی باری ہے تاہم ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ اگر میں نے اس موقع پر موت حیات کے دقیق فلسفہ پر بحث شروع کر دی تو نمرود کا مقصد پورا ہو جائے گا اور وہ جمہور کو مغالطہ میں ڈال کر اصل معاملہ کو الجھادے گا اور اس طرح میرا نیک مقصد پورا نہ ہو سکے گا اور تبلیغ حق کے سلسلہ میں سر محفل نمرود کو لاجواب کرنے کا موقعہ ہاتھ سے جاتا رہے گا کیونکہ بحث و مباحثہ اور جدل و مناظرہ میرا اصل مقصد نہیں ہے بلکہ لوگوں کے دماغ و قلب میں خدائے واحد کا یقین پیدا کرنا میرا مقصد وحید ہے اس لئے انھوں نے اس دلیل کو نظرانداز کر کے سمجھانے کا ایک دوسرا پیرایہ اختیار کیا اور ایسی دلیل پیش کی جس کا صبح و شام ہر شخص آنکھوں سے مشاہدہ کرتا اور بغیر کسی منطقی دلیل کے روز و شب کی زندگی میں اس سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں اس ہستی کو "اللہ" کہتا ہوں جو روزانہ سورج کو مشرق سے لاتا اور مغرب کی جانب لے جاتا ہے پس اگر تو بھی اسی طرح خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو اسکے خلاف سورج کو مغرب سے نکال اور مشرق میں چھپا یہ سن کر نمرود مبہوت اور لاجواب ہو کر رہ گیا اور اس طرح ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے نمرود پر خدا کی حجت پوری ہوئی۔

نمرود اس دلیل سے مبہوت کیوں ہوا اور اس کے پاس اس کے مقابلہ میں مغالطہ کی گنجائش کیوں نہ رہی؟ یہ اسلئے کہ ابراہیم علیہ السلام کی دلیل کا حاصل یہ تھا کہ میں ایک ایسی ہستی کو اللہ مانتا ہوں جس کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ ساری کائنات اور اس کا سارا نظام اس ہی نے بنایا ہے اور اس نے اس پورے نظام کو اپنی حکمت کے قانون سے ایسا مسخر کر دیا ہے کہ اس کی کوئی شئے نہ وقت مقررہ سے پہلے اپنی جگہ سے ہٹ سکتی ہے اور نہ ادھر اُدھر ہو سکتی ہے تم اس پورے نظام میں سے آفتاب ہی کو دیکھو کہ عالم ارضی اس سے کس قدر فائدے حاصل کرتا ہے بایں ہمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے طلوع و غروب کا بھی ایک نظام مقرر کر دیا ہے بس اگر آفتاب لاکھ بار بھی چاہے کہ وہ اس نظام سے باہر ہو جائے تو وہ اس پر قادر نہیں ہے، کیونکہ اس کی باگ خدائے واحد کے قبضہ قدرت میں ہے اور اس کو بیشک یہ قدرت ہے کہ جو چاہے کر گزرے لیکن وہ کرتا وہی ہے جو اس کی حکمت کا تقاضا ہے لہٰذا اب نمرود کے لئے تین ہی صورتیں جواب دینے کی ہو سکتی تھیں یا وہ یہ کہے کہ مجھے آفتاب پر پوری قدرت حاصل ہے اور میں نے ہی یہ سارا نظام بنایا ہے مگر اس نے یہی جواب اس لئے نہیں دیا کہ وہ خود اس کا قائل نہیں تھا کہ یہ ساری کائنات اس نے بنائی ہے اور آفتاب کی حرکت اس کے قبضہ قدرت میں ہے بلکہ وہ تو خود کو اپنی رعایا کا رب اور دیوتا کہلاتا تھا اور بس۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ کہتا "میں اس عالم کو کسی کی مخلوق نہیں مانتا اور آفتاب تو خود مستقل دیوتا ہے اس کے اختیارات میں خود بہت کچھ ہے" مگر اس نے یہ بھی اس لئے نہ کہا کہ اگر وہ ایسا کہتا تو ابراہیم علیہ السلام کا

وہی اعتراض سامنے آجاتا ہے جو انھوں نے جمہور کے سامنے آفتاب کی ربوبیت کے خلاف اٹھایا تھا کہ اگر یہ رب ہے تو عابدوں اور پجاریوں سے زیادہ اس معبود اور دیوتا میں تغیرات اور فنا کے اثرات کیوں موجود ہیں رب کو فنا اور تغیر سے کیا علاقہ اور کیا اس کی قدرت میں یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو وقت مقررہ سے پہلے یا بعد طلوع یا غروب ہو جائے۔

تیسری صورت یہ تھی کہ ابراہیم علیہ السلام کی تحدی (چیلنج) کو قبول کر لیتا اور مغرب سے نکال کر دکھا دیتا مگر نمرود چونکہ ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت میں بھی جواب پر قادر نہ تھا اس لئے مبہوت اور لاجواب ہو جانے کے علاوہ اس کے دوسرا چارہ کار باقی نہ رہا۔[1]

قرآن عزیز نے (بقرہ) میں اس واقعہ کو مختصر مگر لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْ حَآجَّ إِبْرَاهِيْمَ فِيْ رَبِّهٖٓ أَنْ آتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيْمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ قَالَ أَنَا أُحْيِيْ وَأُمِيْتُ قَالَ إِبْرَاهِيْمُ فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِيْنَ ○ (بقرہ ع ۳۵)

کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کا واقعہ جس کو اللہ نے بادشاہت بخشی تھی اس نے کس طرح ابراہیم سے اس کے پروردگار کے بارہ میں مناظرہ کیا؟ جب کہا ابراہیم نے میرا پروردگار تو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے بادشاہ نے کہا میں بھی زندگی بخشتا ہوں اور موت دیتا ہوں ابراہیم نے کہا بلاشبہ اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے پس تو اس کو مغرب سے نکال کر دکھلا پس وہ کافر (بادشاہ) مبہوت اور لاجواب ہو کر رہ گیا اور اللہ ظلم کرنے والوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔

غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے والد آزر کو اسلام کی تلقین کی، پیغام حق سنایا اور راہ

---

[1] عیسائی پادریوں اور ان کی اندھی تقلید میں آریہ سماجیوں نے ابراہیم علیہ السلام کے اس ذکر کردہ مناظرہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر نمرود یہ کہہ بیٹھتا کہ ابراہیم تو ہی اپنے خدا سے آفتاب کو مغرب سے طلوع کرا دے تو ابراہیم کے پاس کیا جواب تھا؟ یہ اعتراض بہت ہی لچر اور سطحی ہے اسلئے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے مناظرہ کی جو تشریح بیان کی ہے اور جو حقیقت واقعہ ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ نمرود جانتا تھا کہ وہ ایسا اسلئے نہیں کہہ سکتا کہ پہلے وہ خود اپنی عاجزی و درماندگی کا اقرار کرے اور ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرے کہ آفتاب ہمارا دیوتا بھی نہیں ہے اور نہ اس میں یہ قدرت کہ وہ ہماری اس استدعاء کو ابراہیم کے مقابلہ میں منظور کر لے۔ بدیں وجہ اس نے خاموشی کو ترجیح دی اور اگر وہ ایسا سوال کر ہی بیٹھتا تو ابراہیم علیہ السلام کو یہ یقین تھا کہ ایسے تحدی (چیلنج) کے وقت اللہ تعالیٰ اپنے سچے پیغمبر کو ذلیل نہیں کرے گا اور ابراہیم کی دعاء پر وہ بلاشبہ آفتاب کو مغرب سے طلوع کر کے ابراہیم کی صداقت کو واضح کر دے گا۔ البتہ یہ مسئلہ مادئیین اور خدا کی قدرت پر کنٹرول کرنے والوں کیلئے ضرور تعجب خیز ہو سکتا ہے لیکن جن کا عقیدہ یہ ہے کہ "کائنات کا یہ سارا نظام اگرچہ خاص قوانین کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے لیکن اس کا یہ شکنجہ ان اشیاء کے ذاتی خواص کی بناء پر نہیں ہے بلکہ اس شکنجہ میں کسنے والی ہستی اور ہے جو سب سے بالاتر ہے اور تمام اشیاء کی تاثیر اور اس کے خواص اسی کے ید قدرت میں ہیں۔ لہٰذا وہ چاہے تو ان کے خواص و تاثیرات کو بدل بھی سکتا ہے اور فنا بھی کر سکتا ہے اور اسی قادرِ مطلق اور بے قید مالک و متصرف کا نام "اللہ" ہے، تو ان کی نگاہ میں یہ تعجب انگیز بات نہیں ہے۔

مستقیم دکھائی اس کے بعد عوام اور جمہور کے سامنے اس دعوت کو عام کیا اور سب کو امر حق تسلیم کرانے کے لئے فطرت کے بہترین اصول و دلائل کو پیش فرمایا اور نرمی، شیریں کلامی مگر مضبوط و محکم اور روشن حجت و دلیل کے ساتھ ان پر حق کو واضح کیا اور سب سے آخر میں بادشاہ نمرود سے مناظرہ کیا اور اس پر روشن کر دیا کہ ربوبیت والوہیت کا حق صرف خدائے واحد ہی کے لئے سزاوار ہے اور بڑے سے بڑے شاہنشاہ کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کی ہمسری کا دعویٰ کرے کیونکہ وہ اور کل دنیا اسی کی مخلوق ہے اور وجود و عدم کی قید و بند میں گرفتار مگر اس کے باوجود کہ بادشاہ آزر اور جمہور، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دلائل سے لاجواب تھے اور دلوں میں قائل بلکہ بتوں کے واقعہ میں تو زبان سے بھی اقرار کرنا پڑا کہ ابراہیم علیہ السلام جو کچھ کہتا ہے وہی حق ہے اور صحیح و درست تاہم ان میں سے کسی نے راہ مستقیم کو اختیار نہ کیا اور قبول حق سے منحرف ہی رہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے برعکس اپنی ندامت و ذلت سے متاثر ہو کر بہت زیادہ غیظ و غضب میں آ گئے اور بادشاہ سے رعایا تک سب نے متفقہ فیصلہ کر لیا کہ دیوتاؤں کی توہین اور باپ دادا کے دین کی مخالفت میں ابراہیم علیہ السلام کو دہکتی آگ میں جلا دینا چاہیے کیونکہ ایسے سخت مجرم کی سزا ایسی ہو سکتی ہے اور دیوتاؤں کی تحقیر کا انتقام اسی طرح لیا جا سکتا ہے۔

آگ کا سرد ہو جانا

اس مرحلہ پر پہنچ کر ابراہیم علیہ السلام کی جدوجہد کا معاملہ ختم ہو گیا اور اب دلائل و براہین کی قوت کے مقابلہ میں مادی طاقت و سطوت نے مظاہرہ شروع کر دیا باپ اس کا دشمن جمہور اس کے مخالف اور بادشاہ وقت اس کے درپے آزار، ایک ہستی اور چہار جانب سے مخالفت کی آواز دشمنی کے نعرے اور نفرت و حقارت کے ساتھ سخت انتقام اور خوفناک سزا کے ارادے ایسے وقت میں اس کی مدد کون کرے اور اس کی حمایت کا سامان کس طرح مہیا ہو؟

مگر ابراہیم علیہ السلام کو نہ اس کی پرواہ تھی اور نہ اس کا خوف وہ اسی طرح بے خوف و خطر اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے بے نیاز اعلان حق میں سرشار اور دعوت رشد و ہدایت میں مشغول تھے البتہ ایسے نازک وقت میں جب تمام مادی سہارے ختم دنیوی اسباب ناپید اور حمایت و نصرت کے ظاہری اسباب مفقود ہو چکے تھے ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت بھی ایک ایسا بڑا زبردست سہارا حاصل تھا جو تمام سہاروں کا سہارا اور تمام نصرتوں کا ناصر کہا جاتا ہے اور وہ خدائے واحد کا سہارا تھا اس نے اپنے جلیل القدر پیغمبر قوم کے عظیم المرتبت ہادی اور رہنما کو بے یار و مددگار نہ رہنے دیا اور دشمنوں کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ ہوا یہ کہ نمرود اور قوم نے ابراہیم علیہ السلام کی سزا کے لئے ایک مخصوص جگہ بنوائی اس میں کئی روز مسلسل آگ دہکائی گئی حتیٰ کہ اس کے شعلوں سے قرب و جوار کی اشیاء تک جھلسنے لگیں، جب اس طرح بادشاہ اور قوم کو کامل اطمینان ہو گیا کہ اب ابراہیم علیہ السلام کے اس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تب ایک گوپھن میں ابراہیم علیہ السلام کو بٹھا کر دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا۔

اس وقت آگ میں جلانے کی تاثیر بخشنے والے نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام پر اپنی سوزش کا اثر نہ کرے اور ناری عناصر کا مجموعہ ہوتے ہوئے بھی اس کے حق میں سلامتی کے ساتھ سرد پڑ جائے، آگ اسی وقت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں "بردو سلام" بن گئی اور دشمن ان کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکے۔ اور ابراہیم علیہ السلام دہکتی آگ سے سالم و محفوظ دشمنوں کے نرغہ سے نکل گئے۔

"دشمن اگر قویست نگہباں قوی ترست"

اس مقام پر ایک مذہبی انسان کی طمانیت قلب اور سکون خاطر کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ آگ کے بردو سلام ہو جانے کو اس لئے صحیح اور مبنی بر حقیقت سمجھے کہ اس نے اپنی عقل اور اپنے شعور سے اول اس امر کا امتحان کر لیا ہے کہ قرآن عزیز کی تعلیم وحی الٰہی کی تعلیم ہے اور اس کی لانے والی ہستی کی زندگی کا ہر پہلو پیغمبرانہ معصومیت کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ کہ وہ جن معجزانہ حقائق کی اطلاعات بہم پہنچاتا اور وحی الٰہی کے ذریعہ ہم کو سناتا ہے وہ عقل کے لئے اگرچہ حیران کن ہیں لیکن عقل کی نگاہ میں محال اور ناممکن نہیں اس لئے ایک مخبر صادق (کہ جس کی زندگی کی صداقت کا ہر پہلو سے امتحان کر کے اطمینان کر لیا گیا ہے) کی اس قسم کی خبریں بلاشبہ صحیح اور حق ہیں اور بقول قیصر روم ہر قل اعظم (ہر کلیوس) کہ جو شخص انسانوں کے ساتھ جھوٹ نہیں بولتا اور ان سے دغا و فریب نہیں کرتا وہ ایک لمحہ کے لئے بھی خدا کی جانب کسی غلط بات کو منسوب نہیں کر سکتا اور کبھی اس پر جھوٹ بولنے کی جرات نہیں کر سکتا اور مذہبی زندگی میں صاف اور سیدھی راہ بھی یہی ہے کہ جس مذہب کی مکمل تعلیم کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر ہر طرح قابل اطمینان پالیا جائے اس کے بتائے ہوئے چند ایسے امور پر جو عقل کے لئے صرف حیران کن ہوں مگر اس کے نزدیک محال ذاتی اور ناممکن کے مرادف نہ ہوں فلسفیانہ موشگافیوں کے بغیر ایمان لے آیا جائے اور صاحب وحی علیہ السلام کی اس یقینی اور غیر مشکوک اطلاع کو آفتاب کی روشنی سے زیادہ روشن سمجھا جائے اور یقین رکھا جائے کہ تمام اشیاء میں خواص و تاثیرات پیدا کرنے والے خدا میں یہ بھی قدرت ہے کہ جب چاہے ان کو دی ہوئی تاثیر اور خاصہ کو سلب کر لے اور جب چاہے دوسری کیفیت کے ساتھ بدل ڈالے لیکن مادیین کے لئے اگر یہ راہ باعث اطمینان نہ ہو اور فلسفہ کے شیدائی مذہب کے اس مسئلہ کو بھی فلسفیانہ موشگافیوں سے پاک نہ رہنے دینا چاہتے ہوں تو ان کے لئے بھی اس معجزہ سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ آگ کا طبعی خاصہ جلا دینا ہے اور جو شے بھی اس میں پڑے گی جل جائے گی لیکن اس کی کیا وجہ کہ بعض وہ کپڑے اور وہ اشیاء جن کو فائر پروف کہا جاتا ہے آگ کے شعلوں کے اندر کیوں محفوظ رہتی ہیں اور انکو آگ جلا کر کیوں خاکستر نہیں کر دیتی۔

تم کہو گے کہ آگ بدستور جلانے کا خاصہ رکھتی ہے مگر کپڑے یا چیز پر ایک ایسا مسالہ لگا دیا گیا ہے جس پر آگ اپنا اثر نہیں کر سکتی، یہ نہیں ہے کہ آگ نے جلانے کا خاصہ ترک کر دیا ہے۔

تو ایک مذہبی انسان کے لئے اسی طرح آپ کے فلسفیانہ رنگ میں یہ جواب دینے کا کیوں حق نہیں ہے کہ نمرود اور اس کی قوم کی دہکتی آگ میں جلانے کا خاصہ بدستور اسی طرح باقی تھا جس طرح آگ کے عناصر میں موجود ہے مگر وہ ابراہیم علیہ السلام کے جسم کے لئے بے اثر ثابت ہوا، فرق صرف اس قدر ہے کہ تمہارے فائر پروف میں انسانوں کی سوچی ہوئی تدابیر کا دخل ہے اور اس لئے ہر سیکھنے والے کو ایک فن کی طرح سیکھ لینے کا موقع حاصل ہے اور ابراہیم علیہ السلام کے جسم کا آگ سے محفوظ ہو جانا بلاواسطہ خدائے برتر کی تدبیر کے زیر اثر

تھااور اس قسم کا عمل پیغمبر کی صداقت اور دشمنوں کے مقابلہ میں اس کی برتری کے لئے کبھی کبھی یہ تقاضائے حکمت اس کی جانب سے سامنے آجاتااور شریعت کی اصطلاح میں معجزہ شمار ہوتا ہے بیشک وہ نہ فن ہوتا ہے اور نہ وسائل اسباب سے پیدا کردہ تدابیر کا محتاج پس خدا کی مخلوق انسان کو اگر یہ قدرت حاصل ہے کہ کسی شے کے طبعی خاصہ کو بعض اشیاء پر مؤثر نہ ہونے دے تو اشیاء کے خواص کے خالق کو کیوں یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ کسی خاص موقع پر شئے کی تاثیر کو عمل سے روک دے۔

اور اگر آج سائنس کی دریافت پر فضا میں ایسی گیسیں موجود ہیں جن کے بدن پر اثر کرنے سے آگ کی سوزش سے محفوظ رہا جا سکتا ہے تو گیسوں کے پیدا کرنے والے خالق کے لئے کون مانع ہے کہ نمرود کی دہکتی آگ میں ان کو ابراہیم ؑ تک نہ پہنچادے اور اس طرح آگ کو بحق ابراہیم ؑ بردوسلام نہ بنادے۔

قرآن عزیز میں ابراہیم ؑ کے اس پراعجاز واقعہ کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ○ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ○ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ○ (الانبیاء ع۵)

وہ سب کہنے لگے اس (ابراہیم ؑ) کو جلاڈالو اور اپنے دیوتاؤں کی مدد کرو اگر تم کرنا چاہتے ہو ہم نے حکم دیا اے آگ! تو ابراہیم کے حق میں سرد اور سلامتی بن جا اور انھوں نے ابراہیم کے ساتھ کا ارادہ کیا پس ہم نے ان کو ان کے ارادہ میں ناکام بنادیا۔

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِى الْجَحِيْمِ ○ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ○ وَقَالَ اِنِّىْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِ ○

انھوں نے کہا اس کے لئے ایک جگہ بناؤ اور اس کو دہکتی آگ میں ڈالو، پس انھوں نے اس کے ساتھ ارادہ بد کیا تو کردیا ہم نے ان کو اس کے مقابلہ میں پست و ذلیل اور کہا ابراہیم ؑ نے میں جانے والا ہوں اپنے پروردگار کے پاس قریب ہے وہ مجھے راہ یاب کریگا۔

حدیث بخاری

ابراہیم ؑ کے واقعات میں قرآن عزیز نے اس موقعہ پر جبکہ ابراہیم ؑ اور قوم کے بعض افراد کے درمیان میلے کی شرکت کے لئے گفتگو ہو رہی تھی ابراہیم ؑ کا یہ قول نقل کیا ہے قَالَ اِنِّىْ سَقِيْمٌ ابراہیم ؑ نے فرمایا میں بیمار ہوں اور جب بتوں کی شکست وریخت کے سلسلہ میں ان سے دریافت کیا گیا تو ان کا جواب اس طرح منقول ہے

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ○ (انبیاء)

ابراہیم نے کہا بلکہ ان میں سے سب سے بڑے بت نے یہ کیا ہے پس ان سے پوچھو اگر یہ بول سکتے ہیں؟

ان دونوں جملوں کے متعلق ایک خالی الذہن انسان ایک لمحہ کے لئے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ان میں

جھوٹ کا بھی کوئی شائبہ ہو سکتا ہے؟ انی سقیم میں علالت طبع کا ذکر ہے جس کو ابراہیم علیہ السلام ہی خوب جان سکتے ہیں کہ وہ کیا بیمار ہیں اس میں دوسرے کو خواہ مخواہ شک اور تردد کا کونسا موقع ہے حتیٰ کہ اگر ایک شخص ظاہر بیں نگاہوں میں تندرست نظر آتا ہو تب بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ واقعی تندرست ہے ہو سکتا ہے کہ اس کا مزاج کسی وجہ سے حد اعتدال پر رہے اور ایسی تکلیف میں مبتلا ہو جس کا اظہار کئے بغیر دوسرا اس کو نہ سمجھ سکے۔ اسی طرح دوسری آیت کا معاملہ ہے اس لئے کہ دو مختلف الخیال انسانوں کے درمیان اگر مناظرہ اور تبادلہ خیالات کی نوبت آجاتی ہے تو معمولی حرف شناس بھی اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اپنے حریف کو اس کی غلطی پر متنبہ کرنے اور لاجواب کر دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے مسلمات میں سے کسی مسلمہ عقیدہ کو صحیح فرض کر کے اس طرح اس کا استعمال کرے کہ اس کا ثمرہ اور نتیجہ حریف کے خلاف اور اپنے موافق ظاہر ہو۔

ابراہیم علیہ السلام نے یہی کیا انکی قوم کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کے دیوتا سب کچھ سنتے اور ہماری مرادوں کو پورا کرتے ہیں وہ اپنے پجاریوں اور معتقدوں سے خوش اور اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے سخت انتقام لے لیتے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے جب ان دیوتاؤں کو توڑ پھوڑ ڈالا تو بڑے بت کو چھوڑ دیا آخر جب پوچھ گچھ کی نوبت آئی تو انھوں نے مناظرہ کا وہی بہترین اسلوب اختیار کیا جسکا تفصیلی ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے اور نتیجہ یہ نکلا کہ کاہنوں پجاریوں اور ساری قوم کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ہم ہی غلطی پر ہیں اور تو خود حقیقت شناس ہے کہ ان میں گویائی کی طاقت نہیں ہے۔

لہٰذا ان دونوں جملوں میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس کو حقیقتاً یا صورۃً جھوٹ کہا جا سکے، یہ دو باتیں تو قرآن عزیز میں مذکور ہیں لیکن صحیح بخاری صحیح مسلم اور بعض دوسری حدیث کی کتابوں میں مسطورہ بالا دونوں باتوں کے علاوہ ایک تیسری بات کا بھی ذکر ہے یہ حدیث ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔

لم یکذب ابراھیم النبی علیہ السلام قط الاثلث کذبات الخ۔ (بخاری جلد ٦ ص ۳۰۱)

نہیں جھوٹ بولا کبھی ہرگز ابراہیم نبی علیہ السلام نے مگر تین جھوٹ۔

اور پھر تفصیل کے ساتھ ان تینوں کو شمار کیا ہے ان میں سے دو کا ذکر ابھی ہو چکا اور تیسری بات میں یہ مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا جب مصر سے گذر ہوا تو انہوں نے مصر پہنچنے سے پہلے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت سارہ علیہا السلام سے یہ فرمایا کہ یہاں کا بادشاہ جابر د ظالم ہے اگر کسی حسین عورت کو دیکھتا ہے تو اسکو زبردستی چھین لیتا ہے اور اسکے ساتھی مرد کو اگر وہ اس عورت کا شوہر ہو تو قتل کر ڈالتا ہے اور اگر کوئی دوسرا عزیز ہے تو اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا تم چونکہ میری دینی بہن ہو اور اس سرزمین میں میرے اور تمہارے علاوہ دوسرا کوئی مسلمان نہیں ہے اسلئے تم اس سے کہہ دینا کہ یہ میرا بھائی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب شب میں اس نے ارادۂ بد کیا تو اس کا ہاتھ شل ہو کر رہ گیا اور وہ کسی طرح حضرت سارہ کو ہاتھ نہ لگا سکا یہ دیکھ کر اس نے سارہؓ سے کہا اپنے خدا سے دعا کر کہ میرا ہاتھ درست ہو جائے تو میں تجھ کو رہا کر دوں گا سارہ نے دعا کی مگر اس نے پھر ارادہ بد کیا دوبارہ اسکا ہاتھ شل ہو گیا تیسری مرتبہ پھر یہی تمام قصہ پیش آیا تب اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے یہ جن ہے انسان نہیں ہے۔ اسکو میرے پاس سے جلد لے جاؤ اور ساتھ ہی ہاجرہ کو حوالہ کر کے کہا کہ اسکو بھی اپنے ساتھ لے جا میں نے تیرے حوالہ کیا۔

جب سارہؓ ہاجرہؓ کو ساتھ لے کر حضرت ابرہیم علیہ السلام کے پاس پہنچیں تو انھوں نے حال دریافت کیا اور سارہؓ نے مبارک باد دی اور کہا شکر ہے خدائے عزوجل کا کہ اس نے ہم کو اس فاسق وفاجر سے نجات دی اور آپ کیلئے ایک خادمہ اور ساتھ کر دی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے یہ حدیث نقل کرکے فرمایا "اے شریف النسب اہل عرب یہ ہیں وہ ہاجرہ جو تم سب کی ماں ہیں"۔

یہ حدیث مختلف طریقوں سے کتب احادیث میں منقول ہے اس کے علاوہ بخاری میں ایک اور طویل حدیث ہے جو حدیث شفاعت کے نام سے موسوم ہے اور متعدد ابواب بخاری مثلاً سورہ بقرہ کی تفسیر کے باب میں کتاب الاستر قاق میں اور کتاب التوحید میں مذکور ہے اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو تذکرہ ہے اس کا حاصل یہ ہے۔

میدان حشر میں جب سب مخلوق آدم نوح علیہ السلام اور دوسرے انبیاء سے شفاعت کے لئے کہہ چکی تو حضرت ابراہیم کے پاس پہنچی اور ان سے کہا کہ آپ خلیل الرحمٰن ہیں آپ ہماری سفارش بارگاہ الٰی میں کیجئے کہ جلد فیصلہ ہو تو انھوں نے فرمایا کہ مجھ کو شرم آتی ہے اس لئے کہ میں دنیا میں تین جھوٹ باتیں کہی تھیں اِنِّی سَقِیْمٌ ، بَلْ فَعَلَهٗ کَبِیْرُهُمْ اور اپنی بیوی سے کہا تھا کہ انی اخوك۔

بخاری کے علاوہ یہ روایت مسلم مسند احمد صحیح ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، معجم طبرانی مصنف ابن ابی شیبہ ترمذی اور مسند ابی عوانہ میں مختلف صحابہؓ سے منقول ہے

یہ روایت کتب حدیث میں اجمال وتفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے روایت کی گئی ہے بعض میں صرف اجمالی طور اسی قدر تذکرہ ہے کہ ہر نبی اس وقت اپنی لغزش کو بیان کر کے معذرت کریں گے کہ وہ شفاعت نہیں کر سکتے اور بعض میں ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں فقط ثلث کذبات ہی کا ذکر ہے اور بعض روایات میں ان تینوں کی تفصیل ہے اور ان ہی میں سے بعض روایات میں یہ تصریح بھی موجود ہے۔

ما منها كذبة الا ما حل بها عن دين الله

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ابراہیم علیہ السلام کے ان تینوں جھوٹ میں سے ہر ایک صرف اللہ تعالیٰ کے دین کی مدافعت وحمایت ہی کے لئے بولا گیا ہے۔

بہر حال یہ دونوں روایات صحیحین (بخاری ومسلم) کی روایات ہیں جو ہر قسم کے سقم روایت سے پاک اور صاف ہیں یہ روایات ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر اور مجدد انبیاء کی جانب کذب کی نسبت کر رہی ہیں اگرچہ انہی روایات کے بعض طریق روایت نے یہ صاف کر دیا کہ نبی اکرم ﷺ نے اس موقعہ پر کذب سے مراد وہ عام معنی نہیں لئے جو اخلاقی بول چال میں نہایت شنیع اور گناہ کبیرہ میں شمار ہیں بلکہ اس کے برعکس یہ واضح کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ تینوں باتیں نہ ذاتی غرض کے لئے کہی ہیں اور نہ دینوی مصلحت کے پیش نظر بلکہ معاندین حق کے مقابلہ میں خالص اللہ تعالیٰ کے دین کی حمایت میں کہی ہیں اس کے باوجود وجوبات دل میں کھٹکتی اور قلب پر ایک بھاری بوجھ محسوس ہوتی ہے وہ حدیث کی یہ تعبیر ہے۔

یہ تسلیم کہ روایتؐ کی بعض تصریحات نے اس کو کذب کے عام معنی سے جدا کر دیا تاہم اول تو یہ "زیادت" صحیحین میں مذکور نہیں اگرچہ صحیح روایت میں موجود ہے دوسرے جبکہ صدق لسانی انبیاء علیہم السلام کی غیر منفک اور

عصمت نبی کیلئے ایک ضروری صفت ہے نیز جبکہ خصوصیت کے ساتھ قرآن عزیز نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق حسب ذیل امتیازات کا صراحت کے ساتھ ذکر فرمادیا ہے تو پھر ان کے ساتھ صورۃً بھی کذب کی نسبت کیسی؟

۱ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ۝ (مریم)

اور یاد کر کتاب میں ابراہیم کا ذکر بے شک تھا وہ صدیق (صادق النفس) نبی۔

صدیق مبالغہ کا صیغہ ہے اور اسی ہستی پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے صدق جس کی ذاتی اور نفسیاتی صفت ہو۔

۲ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ (النحل)

بے شک ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا حکم بردار خالص اللہ کی طرف جھکنے والا اور نہ تھا وہ مشرکوں میں سے، خدا کی نعمتوں کا شکر گذار تھا خدا نے اس کو چن لیا تھا اور سیدھی راہ کی اس کو ہدایت دی۔

مجتبیٰ اور مہدی ایسی صفات ہیں کہ جن کے ساتھ کذب نہ حقیقتاً جمع ہو سکتا ہے اور نہ صورۃً

۳ ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (النحل)

اے محمد ﷺ پھر ہم نے تیری طرف وحی بھیجی کہ تو ملت ابراہیمی کی پیروی کر جو ابراہیم کہ خالص خدا کی جانب جھکنے والا ہے۔

یہ وہ ابراہیم ہیں جن کی ملت کی اقتدا اور پیروی کا حکم محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کی امت مرحومہ کو دیا جا رہا ہے۔

۴ وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ ۝

اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو رشد وہدایت شروع ہی سے بخش دی تھی اور ہم ہی اس کو جاننے والے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کی بہت سی آیات حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ان خصوصی صفات کا ذکر کرتی اور نصوصِ قطعیہ پیش کرتی ہیں کہ جن کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی اس جیسی مقدس اور جلیل القدر ہستی کے متعلق "کذب" کا تصور نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ وقوع اور عمل "خواہ وہ کذب حقیقی معنیٰ میں ہو یا محض کذب کی صورت میں"۔

زیر بحث مسئلہ

اس مقام پر پہنچ کر ایک مرتبہ پھر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مسئلہ زیر بحث یہ نہیں ہے کہ "العیاذ باللہ" ابراہیم علیہ السلام نے واقعی جھوٹ بولا کیونکہ قرآن عزیز کی قطعی نصوص اور زیر بحث روایات کے علاوہ احادیثی نصوص ابراہیم علیہ السلام کو نبی پیغمبر اور رسول بتاتی اور ان کی امتیازی صفات صدیق مجتبیٰ، مہدی، نبی، حنیف اور رسول ثابت کرتی ہیں، نیز زیر بحث روایت میں بھی یہ واضح ہے کہ ان کے یہ کلمات خدا کے دین کی حمایت و مدافعت کیلئے تھے نہ کہ کسی دنیوی غرض و مصلحت سے لہٰذا ایک لمحہ کے لئے بھی اس میں تردد کی گنجائش نہیں ہے

کہ کذب ان سے ایسی طرح دور ہے جس طرح دن سے رات اور روشنی سے تاریکی، اور بلاشبہ وہ ایک نبی معصوم ہیں اور ہر قسم کی معصیت و گناہ سے پاک۔

البتہ زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ ان دو صحیح روایات میں ان تینوں باتوں کے متعلق رسول اکرم ﷺ نے ایسے جلیل القدر پیغمبر کے بارہ میں کذب کی تعبیر کیوں فرمائی جبکہ آپ کی ذات اقدس ضروریات دین اور عقائد اسلامی کے بارہ میں ایہام اور تشکک کو دور کرنے کا باعث ہے نہ کہ ایہام والتباس پیدا کرنے کا؟ خصوصاً جبکہ یہ تینوں باتیں خود اپنی جگہ کسی حال میں نہ صورت میں کذب ہیں اور نہ حقیقی معنی میں۔

بلاشبہ حضرت سارہ حضرت ابراہیم کی دینی بہن تھیں اور بیوی کے رشتہ سے اسلامی اخوت کا رشتہ منقطع نہیں ہو جاتا، نیز ابن کثیر اور دوسرے مؤرخین کی تحقیق میں وہ ان کے چچا حاران کی بیٹی تھیں، اس لئے چچازاد بہن بھی تھیں۔ اور بلاشبہ ان کا مزاج ناساز تھا گو سخت بیماری نہ سہی اس لئے اِنِّي سَقِيمٌ ہر حیثیت سے صحیح ہے اور بلاشبہ انھوں نے مناظرانہ طرز خطابت میں دشمن کو لاجواب کرنے کے لئے فرمایا بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ اور یہ علمی دنیا میں کسی حیثیت سے بھی جھوٹ نہیں تھا تو پھر ان ہر دو احادیث میں اس طرح کی تعبیر کیوں اختیار کی گئی؟

اس اشکال کے جواب میں علماء اسلام نے دو راہیں اختیار فرمائی ہیں۔

۱ یہ اخبار آحاد ہیں اسلئے جرات کے ساتھ یہ کہہ دینا چاہیے کہ اگرچہ یہ روایتیں صحیحین کی ہیں اور اسلئے مشہور کی حد تک پہنچ گئی ہیں مگر راوی کو ان روایات میں سخت مغالطہ ہوا ہے لہذا ہرگز قابل قبول نہیں ہیں اسلئے کہ ایک نبی کی جانب کذب کی نسبت کے مقابلے میں راویوں کی غلطی کا اعتراف بدرجہا بہتر اور صحیح طریق کار ہے۔

امام رازی (رحمہ اللہ) کا رجحان اسی جانب ہے اور انہوں نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

۲ یہ قطعی اور یقینی عقیدہ ہے کہ نبی اور رسول کی جانب ”کذب“ کی نسبت کسی حال میں درست نہیں ہے ایسی صورت میں اگر مستند اور صحیح روایات میں جو کہ حد شہرت و تواتر کو پہنچ چکی ہوں اس قسم کی کوئی نسبت موجود ہو جو نبی کی نبوت کی شان کے منافی ہو تو ان روایات کو صحیح مانتے ہوئے ان خصوصی جملوں کی ایسی توجیہ کرنی چاہیے جس سے اصل مسئلہ پر بھی زد نہ پڑے اور صحیح روایات کا انکار بھی لازم نہ آئے پس چونکہ صحیحین کی یہ روایات تلقی بالقبول کی وجہ سے صحت اور شہرت کے اس درجہ اور مرتبہ کو پہنچ چکی ہیں جو اخبار آحاد میں شمار نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے ان روایات کو مردود قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ ثلث کذبات کے جملہ کی یہ توجیہ کرنی چاہیے کہ اس مقام پر کذب سے مراد یہ ہے کہ ایسا کلام جو صحیح اور پاک مقصد کے لئے بولا گیا ہو لیکن مخاطب اس کا وہ مطلب نہ سمجھے جو متکلم کی مراد ہے بلکہ ان الفاظ کو اپنی ذہنی مراد کے مطابق سمجھے اور یہ معنی صرف ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کیلئے ہی نہیں تراشے گئے بلکہ علم بدیع کی اصطلاح میں اسکو معاریض کی اقسام میں شمار کیا گیا ہے اور فصحاء و بلغاء کے کلام میں اکثر رائج ہے۔

اس طرح روایات کا انکار بھی لازم نہیں آئے گا اور صداقت نبی کا مسئلہ بھی اپنی جگہ بغیر کسی غل و غش کے صحیح رہے گا چنانچہ حدیث شفاعت کے وہ الفاظ ما منها کذبة الا ماحل به عن دین اللّٰہ ہماری اس توجیہ کی تائید کرتے ہیں جمہور علماء اسلام کی یہی رائے ہے اور وہ امام رازی اور ان کے ہمنوا علماء کی پہلی رائے کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔

مشہور مصری عالم عبدالوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں امام رازیؒ کی رائے کے ساتھ موافقت کی ہے اور مصری علماء عصر کی رائے کے خلاف (جو دراصل جمہور کی تائید میں نجار کی رائے پر تنقید کی شکل میں ظاہر کی گئی ہے) کافی شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام وسارہ کے اس واقعہ سے انکار کیا ہے۔

مؤلف کی رائے

مگر ان ہر دو آراء سے الگ سادہ اور صاف راہ یہ ہے کہ صحیح حدیث کے انکار اور اس کے الفاظ کی رکیک تاویل کئے بغیر ہی مسئلہ کو اس طرح حل کر دیا جائے کہ اصل مسئلہ عصمت پیغمبر پر بھی حرف نہ آنے پائے اور اس قسم کے مواقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں اور احادیث نبوی کے ساتھ تمسخر اور مذاق کرنیوالوں کو بھی الحاد کی جرأت نہ ہو سکے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عصمت پیغمبر کا مسئلہ بلاشبہ اصول دین اور مہمات عقائد میں سے ہے بلکہ دین و مذہب کی صداقت کی اساس و بنیاد صرف اسی ایک مسئلہ پر قائم ہے کیونکہ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ بعض حالات میں نبی اور پیغمبر بھی کذب کی کوئی نہ کوئی شکل و صورت اختیار کر سکتا ہے خواہ وہ حمایت حق ہی کے لئے کیوں نہ ہو اس کی لائی ہوئی تمام تعلیم سے یہ امتیاز اٹھ جائے گا کہ اس میں سے کون سا جزء اپنی حقیقی مراد کے ساتھ وابستہ ہے اور کون سا کذب کے رنگ میں رنگا ہوا اور اگر یہ مان لیا جائے تو پھر دین دین نہیں رہ سکتا اور نہ مذہب، مذہب۔

اس لئے قرآن عزیز کا یہ منصوص عقیدہ عصمت پیغمبر اپنی جگہ غیر متزلزل اور غیر متبدل عقیدہ ہے اور اس لئے بلا شبہ جو اس عقیدہ کی صداقت پر حرف گیری کا باعث ہے وہ خود اپنی جگہ یا قابل رد و انکار ہے اور اپنی صحت تعبیر کیلئے جو ایدہ پس اس محکم عقیدہ کو اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی بلکہ اس سے معارض شے کو یا اس کے مطابق ہونا پڑے گا ورنہ تو مٹ جانا ہو گا۔

اسی طرح یہ امر بھی مسلم ہے کہ قرآن عزیز کی تفسیر و تشریح صرف لغت عرب سے ہی نہیں کی جا سکتی بلکہ جس طرح اس کے مفہوم سمجھنے کے لئے لغت کی معرفت ضروری ہے اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اعمال اور احوال کی معرفت کی ضرورت ہے جو کلام اللہ کی صحیح توجیہ تفسیر اور تشریح کے حامل ہیں۔

بلاشبہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ قرآنی احکام مثلاً اقیموا الصّلوٰة ، واٰتوا الزّکوٰة ، اتمّوا الحجّ والعُمرة ، فمن شهد منكم الشّهر فليصمه

میں نماز، زکوۃ، حج اور روزہ کے مفہوم اور معنی کو ہم کسی طرح بھی لغت عربی کے ذریعہ متعین نہیں کر سکتے اور تنہا یہ لغوی معنی و مفہوم قرآنی احکام کا مصداق نہیں بن سکتے بلکہ ان کی معرفت کے لئے ہم مجبور ہیں

کہ پیغمبر خدا ﷺ کے ان اقوال واعمال کی طرف رجوع کریں جو ان فرائض کی تفسیر وتشریح میں کہے گئے یا کئے گئے ہیں، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ صرف تعامل کے ذریعہ ہم ان فرائض کی حقیقت سے آگاہ ہو سکیں اس لئے کہ اگر دقت نظر سے کام لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تعامل کا مبدا بھی آخر کار قول وعمل رسول پر ہی جا کر منتہی ہوتا ہے، لہٰذا پیغمبر خدا ﷺ کے اس قول وعمل کو بھی جزو دین سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے اور بغیر اس تسلیم ورضا کے آیت۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ

بلا شبہ خدا کے پیغمبر محمد ﷺ میں اس شخص کیلئے عمدہ نمونہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر امید لگا تا ہو۔

کے کوئی معنی نہیں بنتے، کیونکہ یہ اسوۂ حسنہ خود قرآن عزیز اور اس کی آیات نہیں ہیں بلکہ اس پیغمبر کا قول، عمل اور حال ہی اسوۂ حسنہ ہے اور جبکہ پیغمبر خدا ﷺ کے یہ اقوال اعمال اور احوال جزو دین ہیں تو ضروری تھا کہ ان کی حفاظت کا ایسا سامان مہیا ہو جو خاتم النبین کی امت کے لئے رہتی دنیا تک محفوظ طریقے سے پہنچ سکے اور اس جوہر خالص میں جب کبھی کھوٹ کی ملاوٹ کی جائے تو اس کے محافظین اور فن کے ماہرین فوراً دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے کھرے کھوٹے کو الگ کر سکیں پس اسی طریقہ حفاظت کا نام روایت حدیث اور نقد حدیث ہے اور اسی فن کو فن حدیث کہتے ہیں اور یہی وہ شریف اور مقدس خدمت ہے جس نے اپنوں سے نہیں بلکہ غیروں سے بھی خراج تحسین حاصل کیا ہے اور اس خدمت کو اسلام کا امتیازی نشان تسلیم کرایا ہے۔

رسول خدا ﷺ کے ان اقوال واعمال کی روایت کی حفاظت کے سلسلہ میں کھرے اور کھوٹے کے امتیاز کے لئے زمانہ نبوت سے اب تک جو خدمت ہوتی آرہی ہے اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ روایت حدیث کا فن تقریباً چودہ فنون اور شاخوں میں منقسم ہے۔

لہٰذا از بس ضروری ہے کہ ہم کسی ایک ایسی روایت یا روایت کے جملہ کو جو اپنی لفظی اور ظاہری تعبیر میں مسلمہ عقیدہ کے بارہ میں ایہام پیدا کرتا ہو صحیح اور مقبول مشہور اور متواتر روایات حدیثی کے انکار پر حجت ودلیل قائم نہ کر لیں اور اس کو انکار حدیث کا ذریعہ بنا کر قرآن عزیز کو ایک ایسی اجنبی کتاب نہ بنا دیں جس کی تعبیر کے لئے نہ کسی پیغمبر کے تفسیری اقوال ہیں اور نہ تشریحی اعمال بلکہ وہ کسی ویرانہ یا پہاڑ پر نازل ہوئی ہے اور صرف اپنی زبان کی لغت اور ڈکشنری سے حل کی جا سکتی ہے البتہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہے کہ تمام احادیث رسول روایت باللفظ نہیں ہیں بلکہ بعض رویات بالمعنی ہیں یعنی یہ نہیں ہے کہ رسول پاک نے جو بھی الفاظ زبان مبارک سے فرمائے ہوں راوی نے ایک ایک لفظ اسی طرح نقل کر دیا ہو، بلکہ معنی اور مفہوم کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اس روایت کے الفاظ راوی کی اپنی تفسیر ہوتے ہیں۔

پس ان اہم اور بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھنے کے بعد اب مسئلہ زیر بحث کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ بخاری کی احادیث کو بلا شبہ "تلقی بالقبول" حاصل ہے اور یہ بھی تسلیم کہ یہ کتاب جرح ونقد پر کسے جانے اور پرکھے جانے کے بعد امت میں شہرت وقبولیت کا وہ درجہ رکھتی ہے کہ کتاب اللہ کے بعد اس کو اصح الکتب کہا جاتا ہے تاہم یہ ممکن ہے کہ روایت بالمعنی ہونے کی وجہ سے اس کی کسی روایت میں راوی سے لفظی تعبیر میں سقم پیدا ہو

گیا ہو اور روایت اگرچہ اپنے سلسلہ سند اور مجموعۂ متن کے اعتبار سے اصولاً قابل تسلیم ہو مگر اس جملہ کی تعبیر کو سقیم سمجھا جائے اور اصل روایت کو رد کرنے کی بجائے صرف اس کے سقم کو ظاہر کر دیا جائے چنانچہ اس کی بہترین مثالیں بخاری کی حدیث معراج ہے۔

محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ مسلم کی حدیث اسریٰ عن انسؓ کے مقابلہ میں بخاری کی حدیث عن عبداللہ بن ابی نمرہ میں سقم ہے اور اس کی ترتیب میں غلطیاں ہیں اور مسلم کی روایت ان اسقام و اغلاط سے پاک صاف ہے حالانکہ یہ دونوں روایتیں روایت و درایت کے اعتبار سے صحیح اور قابل تسلیم ہیں۔

تب بغیر کسی شک اور تردد کے یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق یہ دونوں طویل روایات "روایت بالمعنیٰ" کی قسم میں داخل ہیں، اور یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ الفاظ اور جملوں کی یہ پوری نشست نبی اکرم ﷺ کی زبانِ حق ترجمان کے نکلے ہوئے الفاظ اور جملوں کی نشست ہے بلکہ آپ کے مفہوم اور معنیٰ کو ادا کرتی ہیں لہذا ہو سکتا ہے کہ ہر دو روایات میں بیان کردہ واقعات کی صحت کے باوجود زیر بحث الفاظ سلسلہ سند کے کسی راوی کے اختلال لفظی کا نتیجہ ہوں اور اس سے یہ تعبیری سقم پیدا ہو گیا ہو۔

خصوصاً جبکہ اس کے لئے یہ قرینہ بھی موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام وسارہ علیہا السلام اور شاہ مصر کا یہ واقعہ توراۃ میں بھی مذکور ہے اور وہاں اس قسم کے غیر محتاط جملے بکثرت موجود ہیں لہذا یہ ممکن ہے کہ راوی سے اس اسرائیلی روایت اور صحیح روایت کے درمیان تعبیر میں خلط ہو گیا ہو اور اس لئے اس نے معاملہ کی تعبیر زیر بحث الفاظ سے کر دی ہو۔

ہدایت قوم کیلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اضطراب

گذشتہ سطور سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کی ہدایت کے لئے کس درجہ مضطرب اور بے چین تھے اور دلائل و براہین کی وہ کون سی صورت ہو سکتی ہے جو انھوں نے حق کے آشکارا کرنے میں صرف نہ کر دی ہو؟ سب سے پہلے اپنے باپ آزر کو سمجھایا پھر "جمہور" کے سامنے حق کی روشنی کو پیش کیا، اور آخر میں نمرود سے مناظرہ کر کے اس کے سامنے بھی احقاق حق کو بہتر سے بہتر اسلوب کے ساتھ ادا کیا اور ہر لمحہ یہی سب کو تلقین کی کہ خدائے واحد کے علاوہ کسی کی پرستش جائز نہیں اور اصنام پرستی اور کواکب پرستی کا نتیجہ خسران اور ذلت کے سوائے دوسرا نہیں ہے اس لئے شرک سے باز آنا چاہیے اور ملت حنفیہ ہی کو صراط مستقیم سمجھنا چاہیے جس کی اساس و بنیاد صرف توحید الٰہی پر قائم ہے۔

مگر بد بخت قوم نے کچھ نہ سنا، اور کسی طرح رشد و ہدایت کو قبول نہ کیا اور ابراہیم علیہ السلام کی بیوی حضرت سارہؓ اور ان کے برادر زادہ حضرت لوط علیہ السلام کے علاوہ کوئی ایک بھی ایمان نہیں لایا اور تمام قوم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلا دینے کا فیصلہ کر لیا اور دہکتی آگ میں ڈال دیا۔

اور جب خدائے تعالیٰ نے دشمنوں کے ارادوں کو ذلیل و رسوا کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں آگ کو "بردو سلام" بنا دیا تو اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ کسی دوسری جگہ جا کر پیغام الٰہی سنائیں اور

دعوت حق پہنچائیں اور یہ سوچ کر فدان آرام[1] سے ہجرت کا ارادہ کرلیا۔

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَى رَبِّي سَيَهْدِيْنِ ○

اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا "میں جانے والا ہوں اپنے پروردگار کی طرف قریب ہے وہ میری رہنمائی کرے گا"۔

یعنی اب مجھے کسی ایسی آبادی میں ہجرت کر کے چلا جانا چاہئے جہاں خدا کی آواز گوش حق نیوش سے سُنی جائے خدا کی زمین تنگ نہیں ہے یہ نہیں اور سہی میرا کام پہنچانا ہے خدا اپنے دین کی اشاعت کا سامان خود پیدا کر دے گا۔

اور کلدانیین کی جانب ہجرت

بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد آزر اور قوم سے جدا ہو کر فرات کے غربی کنارہ کے قریب ایک بستی میں چلے گئے جو اور کلدانیین کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کیا اور حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت سارہؓ ہم سفر رہیں اور کچھ دنوں کے بعد یہاں سے حران یا حاران کی جانب روانہ ہو گئے اور وہاں دین حنیف کی تبلیغ شروع کر دی مگر اس عرصہ میں برابر اپنے والد آزر کیلئے بارگاہ الٰہی میں استغفار کرتے اور اسکی ہدایت کیلئے دعا مانگتے رہے اور یہ سب کچھ اسلئے کیا کہ وہ نہایت رقیق القلب رحیم اور بہت ہی نرم دل و بردبار تھے اسلئے آزر کی جانب سے ہر قسم کی عداوت کے مظاہروں کے باوجود انہوں نے آزر سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگرچہ میں تجھ سے جدا ہو رہا ہوں اور افسوس کہ تو نے خدا کی رشد وہدایت پر توجہ نہ کی تاہم میں برابر تیرے حق میں خدا سے مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا آخرکار حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وحی الٰہی نے مطلع کیا کہ آزر ایمان لانے والا نہیں ہے اور یہ انہی اشخاص میں سے ہے جنھوں نے اپنی نیک استعداد کو فنا کر کے خود کو اسکا مصداق بنالیا،

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (بقرہ)

اللہ نے مہر لگادی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہو گیا تو آپ نے آزر سے اپنی برأت کا صاف صاف اعلان کر دیا کہ جو امید موہوم میں نے لگا رکھی تھی وہ اب ختم ہو گئی اس لئے اب استغفار کا سلسلہ بے محل ہے، قرآن عزیز، سورۂ توبہ میں اس واقعہ کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيْمَ لِأَبِيْهِ إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ أَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ○ (سورۂ توبہ ع ۱۶)

اور نہ تھا ابراہیم کا استغفار اپنے باپ کے لئے مگر اس وعدہ کے مطابق جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا پھر جب اس پر یہ ظاہر ہو گیا کہ یہ خدا کا دشمن ہے (یعنی اس کا آخری انجام یہی ہوگا) تو اس سے بیزاری کا اظہار کر دیا، بے شک ابراہیم علیہ السلام ہے ضرور رقیق القلب بردبار۔

---

[1] بابل کی حکومت نمارده میں ایک مشہور شہر تھا، یہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا مولد ہے۔

ہجرت فلسطین

ابراہیم علیہ السلام اس طرح تبلیغ کرتے کرتے فلسطین پہنچے، اس سفر میں بھی ان کے ہمراہ حضرت سارہ، حضرت لوط علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیوی تھیں سورۂ عنکبوت میں ہے۔

فَآمَنَ لَهُ لُوطٌ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَى رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ٥ (عنکبوت)

پس لوط، ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لے آیا اور کہنے لگا میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں بے شک وہ غالب ہے حکمت والا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت عثمان ذی النورینؓ اپنی زوجہ مطہرہ حضرت رقیہ بنت رسول ﷺ کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کر گئے تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

ان عثمان اول مهاجر باهله بعد لوط ۔ (الحدیث)

بلاشبہ لوط علیہ السلام کے بعد عثمان پہلے مہاجر ہیں جنھوں نے اپنی بیوی سمیت ہجرت کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فلسطین کے غربی اطراف میں سکونت اختیار کی، اس زمانہ میں یہ علاقہ کنعانیوں کے زیر اقتدار تھا، پھر قریب ہی شکیم (نابلس) میں چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ قیام کیا، اس کے بعد یہاں بھی زیادہ مدت قیام نہیں فرمایا اور غرب ہی کی جانب بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ مصر تک جا پہنچے۔

ہجرت مصر اور حضرت ہاجرہؓ

جب نابلس سے چل کر مصر پہنچے تو بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق ملک جبار کا وہ واقعہ پیش آیا جو گذشتہ سطور میں سپرد قلم ہو چکا ہے اور تورات میں اس قصہ کو اس طرح نقل کیا گیا ہے:

سو جب ابرام مصر پہنچا۔ مصریوں نے اس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے اور فرعون کے امیروں نے بھی اسے دیکھا اور فرعون کے حضور میں اس کی تعریف کی اور اس عورت کو فرعون کے گھر میں لے گئے اس نے اس کے سبب ابرام پر احسان کیا کہ اس کو بھیڑ بکری اور گائے بیل اور گدھے اور غلام اور لونڈیاں اور گدھیاں اور اونٹ ملے، پھر خداوند نے فرعون اور اس کے خاندان کو ابرام کی جورو سرِی کے سبب بڑی مار ماری، تب فرعون نے ابرام کو بلا کر اس سے کہا کہ تونے مجھ سے یہ کیا کیا؟ کیوں نہ جتایا کہ یہ میری جورو ہے تونے کیوں کہا کہ وہ میری بہن ہے؟ یہاں تک کہ میں نے اسے اپنی جورو بنانے کو لیا دیکھ یہ تیری جورو حاضر ہے اسکو لے اور چلا جا اور فرعون نے اسکے حق میں لوگوں کو حکم کیا تب انھوں نے اسے اور اس کی جورو کو اور جو کچھ اس کا تھا روانہ کیا۔ (پیدائش باب ۱۲ آیت ۱۴۔۲۰ تورات)

صحیحین (بخاری و مسلم) کی روایت اور تورات کی اس روایت کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ صحیحین کی روایت میں حضرت سارہؓ کے بد دعاء والے واقعہ میں ملک جبار فرعون نے شیطانی (جنی) اثر سمجھ کر سارہ سے جان چھڑائی اور حضرت ہاجرہؓ کو ان کے حوالہ کر کے ابراہیم علیہ السلام کو مع ان کے رفقاء اور سازوسامان کے مصر سے چلے

جانے کی اجازت دی، فتح الباری میں ہے کہ مصری جن کی عظمت کے قائل تھے، اس لئے شیطان سے مراد یہاں جن ہے۔

اور تورات کی روایت یہی کہتی ہے کہ فرعون مصر نے سارہ کے واقعہ کو کرامت سمجھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ عتاب کیا کہ انھوں نے شروع ہی سے یہ کیوں نہ بتادیا کہ سارہ ان کی بہن نہیں ہے بلکہ بیوی ہے اور پھر بڑے انعام واکرام اور عزت کے ساتھ ان کو مصر سے رخصت کیا۔ تورات کی روایت کے مطابق اس وقت حضرت سارہ کی عمر ستر سال کی تھی۔

بہر حال صحیحین کی روایت ہو یا تورات کی، معنی اور مفہوم کے اعتبار سے دونوں روایات قریب قریب ہیں اور دونوں کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔

البتہ ان تمام روایات سے اس قدر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی سارہؓ اور اپنے برادرزادہ حضرت لوط علیہ السلام کے ساتھ مصر تشریف لے گئے اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مصر کی حکومت ایسے خاندان کے ہاتھ میں ہے جو سامی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبی سلسلہ میں وابستہ تھا، یہاں پہنچ کر ابراہیم علیہ السلام اور فرعون مصر کے درمیان ضرور کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس سے اس کو یقین ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام اور اس کا خاندان خدا کا مقبول اور برگزیدہ خاندان ہے یہ دیکھ کر اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی حضرت سارہؓ کا بہت اعزاز کیا اور ان کو ہر قسم کے مال و منال سے نوازا، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے قدیم خاندانی رشتہ کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لئے اپنی بیٹی ہاجرہ کو بھی ان کی زوجیت میں دیدیا، جو اس زمانہ کے رسم ورواج کے اعتبار سے پہلی اور بڑی بی بی کی خدمت گذار قرار پائیں، چنانچہ اس تاریخی قیاس کی سب سے بڑی شہادت خود یہود کے یہاں بھی موجود ہے۔

سفر ایشیاء میں (جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے) مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ حضرت کا ہم وطن تھا۔ (ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۱)

اور اسی طرح یہود کی معتبر روایات سے یہ مسئلہ بھی صاف اور روشن، ہو جاتا ہے کہ حضرت ہاجرہ "شاہ مصر" فرعون کی بیٹی تھیں، لونڈی اور باندی نہیں تھیں، توراۃ کا ایک معتبر مفسر ربی شلوملو اسحٰق کتاب پیدائش باب ۱۶ آیت ۱ کی تفسیر میں لکھتا ہے

ابث برعه ها يثا كشر انسيم شنعسوا ساره امر مرتاب شتها بتی شفحه بيت زه ولو كبيرة ببيت اخير۔

جب اس نے (رقیوں شاہ مصر نے) سارہ کی وجہ سے کرامات کو دیکھا تو کہا: میں بیٹی کا اس کے گھر میں لونڈی ہو کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ ہو کر رہنے سے بہتر ہے۔ (ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۱)

اس تفسیر اور تورات کی آیت کو جمع کرنے سے یہی حقیقت بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے کہ تورات میں ہاجرہ کو صرف اسی لئے لونڈی کہا گیا کہ شاہ مصر نے ان کو سارہ اور ابراہیم علیہ السلام کے سپرد کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وہ سارہ کی خدمت گذار رہے گی، یہ مطلب[1] نہ تھا کہ وہ لونڈی بمعنی "جاریہ" ہیں اس لئے کہ ربی شلوملو تصریح کرتا ہے کہ

[1] براہین باہرہ فی حریۃ ہاجرہ از مولانا غلام رسول چڑیا کوٹی۔

ہاجرہ فرعون مصر کی بیٹی تھیں۔

بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے ملک جبار کی جو روایات مذکور ہے اس میں بھی یہ جملہ موجود ہے اور ربی شلوملو کی تفسیر کی تائید کرتا ہے۔

وَ اَخْدَمَهَا هَاجَرَہ (بخاری، باب الانبیاء، جلد ۲ ص ۳۰۱)

اور ہاجرہ کو سارہ کے حوالہ کر دیا کہ ان کی خدمت گذار رہے

اس لئے بنی اسرائیل کا یہ طعن کہ بنی اسمٰعیل ہم سے اس لئے کمتر ہیں کہ وہ لونڈی سے ہیں اور ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ سے صحیح نہیں ہے اور واقعہ اور تاریخ دونوں کے خلاف ہے اور جس طرح تورات کے دوسرے مضامین میں تحریف کی گئی ہے اسی طرح اس واقعہ میں بھی تحریف کی گئی ہے اور واقعہ کی تمام تفصیلات کو حذف کر کے صرف "لونڈی" کا لفظ باقی رہنے دیا گیا ہے۔

ہاجرہ اصل میں عبرانی لفظ ہاغار ہے جس کے معنی بیگانہ اور اجنبی کے ہیں[۱] ان کا وطن چونکہ مصر تھا اس لئے یہ نام پڑ گیا، لیکن اسی اصول کے پیش نظر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ "ہاغار" کے معنی "جدا ہونے والے" کے ہیں اور عربی میں "ہاجر" کے معنی بھی یہی ہیں، یہ چونکہ اپنے وطن مصر سے جدا ہو کر یا ہجرت کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریک حیات اور حضرت سارہ کی خدمت گذا بنیں اس لئے ہاجرہ کہلائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دو اہم مقام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیر عنوان بحث ختم کرنے سے قبل دو ایسے اہم مقامات کا ذکر کر دینا از بس ضروری ہے جن کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بہت گہرا تعلق ہے اور جو پیروان ملت ابراہیمی کے لئے مقام بصیرت کی حیثیت رکھتے اور مجد دانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ عظمت و جلال کو تابندہ تر بناتے ہیں۔

مقام اول

سورۂ ممتحنہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک خاص دعاء کا تذکرہ ہو رہا ہے وہ بارگاہ الٰہی میں دست طلب دراز کئے عجز و نیاز کے ساتھ یہ عرض کر رہے ہیں۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اے ہمارے پروردگار! ہم کو ان لوگوں کے لئے فتنہ نہ بنا جو کافر ہیں

فتنہ فتن سے ماخوذ ہے جب سونے کو اس لئے آگ میں تپاتے ہیں کہ کھوٹ اور میل جل کر خالص سونا باقی رہ جائے تو اس کے لئے "فتن الذہب" بولتے ہیں اب اصطلاح میں امتحان اور آزمائش اور پرکھ کو کہتے ہیں اور اس لئے حضرت انسان پر جو شدائد و مصائب آتے ہیں وہ اس مناسبت سے "فتنہ" کہلاتے ہیں قرآن حکیم نے بھی مال، اولاد اور منصب و جاہ کو اسی معنی کے پیش نظر فتنہ کہا ہے اور ہے اور صاف صاف اعلان کیا ہے کہ صادق و کاذب کی

---

[۱] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۰۔

جانچ سینے "مومن" کو اس کسوٹی پر ضرور پرکھا جاتا ہے۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوْٓا أَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ (عنکبوت)

کیا لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ جو لوگ دعویٰ ایمان کرتے ہیں وہ یوں ہی چھوڑ دیے جائیں گے اور آزمائے نہ جائیں گے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال)

اور ان مشرکوں سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ مٹ جائے اور دین سب کا سب خالص للہ کیلئے رہ جائے۔

تو اب قابل توجہ ہے یہ بات کہ اس دعاء ابراہیمی کی مراد کیا ہے؟ اور وہ کافروں کیلئے فتنہ نہ بننے سے متعلق کیا خواہش رکھتے ہیں؟

اختلاف ذوق کے پیش نظر علماء حق نے اس سوال کو تین طرح سے حل کیا ہے لیکن ان تینوں حقیقتوں پر غائر نظر ڈالنے کے بعد بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعاء اپنی وسعت اور دقیق تعبیر کے لحاظ سے بیک وقت تینوں باتوں پر حاوی ہے۔

۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام درگاہ رب العزت میں یہ دعاء کر رہے ہیں پروردگار عالم! مجھ کو وہ زندگی بخش کہ میرا قول، عمل اور میری رفتار و گفتار اسوۂ حسنہ کی تعبیر ہو میں اگر ہادی بنوں تو اسوۂ حسنہ کا اور مجھ کو قیادت نصیب ہو تو رشد و ہدایت کی اور پھر اس پر استقامت عطا فرما ایسا نہ ہو کہ میں اسوۂ سیئہ کا رہنما اور قائد بن جاؤں اور فردائے قیامت میں امت کے گمراہ اور کافر تیرے حضور مجھ کو یہ کہہ کر شرمندہ کریں۔

رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ (احزاب)

اے ہمارے پروردگار! اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ ہم نے اپنے قائدین اور اپنے بڑوں کی پیروی اختیار کر لی تھی پس انھوں نے ہی ہم کو راہ سے بے راہ کیا۔

یعنی وہ خواہش رکھتے ہیں کہ اگر راہنمائی اور قیادت ان کا نصیب ہے تو پھر وہ اسوہ اور قدوہ چھوڑ کر جائیں کہ کل کے دن "اولیاء الرحمن" کے زمرہ میں جگہ ملے اور ان کی زندگی کا راز "اولیاء الشیطان" کے ساتھ عداوت بن جائے۔ آیت کا سیاق و سباق اس معنی کی پوری تائید کرتا ہے اس لئے کہ آیت سے قبل مشرکین کے مقابلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی پاکباز امت کے اس اعلان کا تذکرہ ہے۔

وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ

اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کیلئے عداوت و بغض کا آغاز ہو گیا ہے تاآنکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔

اور زیر بحث آیت کے بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے "پیرو مومنین قانتین" کے اسوۂ حسنہ کا ذکر خیر ہے اور شروع سورۃ میں بھی ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کا ذکر موجود ہے۔

۲) ابراہیم علیہ السلام اپنے ان جامع کلمات میں بارگاہ حق سے اس کے طالب ہیں کہ خدایا! تو ہم کو کافروں کے ہاتھوں آزمائش کے لئے نہ چھوڑ دینا کہ وہ ہم کو ایمان سے برگشتہ اور کفر کے قبول کرنے کے لئے طرح طرح کے مصائب و آلام کا شکار بنائیں اور جبر و ظلم کے ذریعہ راہ سے بے راہ بنانے پر آمادہ و دلیر ہو جائیں۔

اس معنی کا قرینہ یہ ہے کہ آیت زیر عنوان سے قبل یہ ذکر آچکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی امت اجابت نے ذی اقتدار اور با اختیار کافر د مشرک جماعت کے سامنے جرات حق کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ ہم تمہارے معتقدات کے قطعاً منکر ہیں كَفَرْنَا بِكُمْ اور ہمارے اور تمہارے درمیان اسلام کے اقرار وانکار اور قبول وعدم قبول کیلئے کھلا چیلنج ہے تو اس صورت حال میں از بس ضروری تھا کہ ایک باخدا انسان جلیل القدر پیغمبر عظیم المرتبہ ہادی، اپنی انسانی کمزوریوں پر نظر رکھتے ہوئے درگاہ الٰہی میں دست بدعا ہو کہ اے لازوال قدرت کے مالک! تو کسی طرح اور کسی حالت میں بھی کافروں کو ہم پر غلبہ عطانہ فرما اور کافر کسی شکل میں بھی ہم پر ایسے قابو یافتہ نہ ہو سکیں کہ ایمان و کفر سے متعلق ہمارا یہ اعلان جنگ ہمارے لئے باعث امتحان و فتنہ بن جائے اور مشرک ہم کو کفر کی جانب واپس لانے کی جرات بے جا کر سکیں۔

۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام اس مقام پر فتنہ کہہ کر "عذاب" مراد لیتے ہیں اس لئے کہ فتنہ کی مختلف شکلوں میں سے ایک بھیانک شکل یہ بھی ہے اور عرض کرتے ہیں پروردگار ہم کو ایسی حالت پر کبھی نہ پہنچانا کہ ہم کافروں اور مشرکوں کے ہاتھوں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں اور نتیجہ یہ نکلے کہ اپنی پستی نکبت، ذلت و غلامی اور دشمنوں کی دنیوی عزت و جاہ، عروج و ترقی اور حاکمانہ اقتدار کو دیکھ دیکھ کر یہ کہہ اٹھیں کہ اگر ہم حق پر ہوتے تو اس ذلت و خسران میں نہ ہوتے اور اگر شرک و کفر خدا کی نگاہ میں مبغوض ہوتا تو ان کافر اور مشرک جماعتوں کو یہ عزت و جاہ اور یہ فروغ حاصل نہ ہوتا یعنی ہم سے حق و باطل کا امتیاز ہی اٹھ جائے پس ایسے فتنہ سے ہمیشہ ہمیشہ محفوظ رکھ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا یہ پہلو ہمارے لئے صد ہزار سامان عبرت و بصیرت رکھتا ہے اس لئے کہ گذشتہ ڈیڑھ صدی سے خصوصیت کے ساتھ اسلامی دنیا اپنی خود ساختہ غیر اسلامی روش کی بدولت جس طرح غیر اسلامی اقتدار، حاکمانہ جبر اور پنجۂ استبداد کے نیچے دبی ہوئی ہے اور ہر طرح بیچارہ و مجبور نظر آتی ہے اس نے ہم کو اس درجہ حقیر و ذلیل بنا دیا ہے کہ ہم سے ہمارے قوائے فکر و عمل بھی مفقود ہو چکے ہیں اور احساس کمتری میں مبتلا ہو کر ہم بے خوف و خطر یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اسلام نہ خدا پرستی کا نام ہے اور نہ عقائد و اعمال صالحہ کی زندگی کا بلکہ صرف مادی قوت و شوکت (حکومت) اور اس کے ذریعہ حصول عیش و عشرت کا دوسرا نام "مذہب" یا "اسلام" ہے اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اس مادی قوت کے حصول کے لئے ڈسپلن اور ضبط و نظم کے لئے صرف ایک طریق کار ہیں نہ کہ مقصد حیات ملی، اور صرف یہی حقیقت ہے اس جنت کی جس کا وعدہ ارباب حق کے لئے قرآن میں کیا گیا ہے پس اگر یہ حاصل نہیں تو پھر اس کا دوسرا نام جہنم ہے اور وعدۂ آخرت، بعثت و حشر اور جنت و جہنم سب محض فرضی تخیلات ہیں جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے (العیاذ باللہ)

اور یہ کہ جن قوموں کو دنیا میں اقتدار اور طاقت اور اس کے ذریعہ عیش و عشرت حاصل ہے قرآن میں مذکور

حقیقی مومن وہی ہیں اور وہی اس طغرائے امتیاز کا مستحق، نہ کہ وہ خدا پرست مسلمان جو اس دولت سے محروم اور مجبور ہیں چنانچہ کتاب "تذکرہ"[1] اسی خیال کی صدائے باز گشت ہے اور دین حق (اسلام) کی تعلیم سے نا آشنا اور مادیت سے مرعوب اکثر نوجوانان قوم کے بیباک خیالات اور ملحدانہ جذبات اسی پست اور شکست خوردہ ذہنیت کے آئینہ دار ہیں، یہی وہ خوفناک حقیقت ہے جس کے تصور نے مرکز وحدت کعبہ کے موسس ملت ابراہیمی کے داعی، دین حق کے مبلغ اور خدا کے مقدس رسول، ابراہیم علیہ السلام کو لرزہ براندام کر دیا اور انھوں نے عجز و زاری کے ساتھ اس ناپاک زندگی سے محفوظ رہنے کے لئے حضرت حق کے سامنے دست طلب دراز کیا کہ ہم پر وہ وقت کبھی نہ آئے کہ کفر کی شوکت و طاقت اس طرح کچل ڈالے کہ پرستاران توحید اس سخت اور کڑی آزمائش میں مبتلا ہو کر حق و باطل کے درمیان امتیاز بھی کھو بیٹھیں۔

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ○ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

مقام ثانی

سورۂ شعراء میں یہ سلسلۂ عبرت و بصیرت، انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ رشد و ہدایت کا جو ذکر ہو رہا ہے، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی تذکرہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کو توحید الٰہی کی تلقین اور شرک و کفر سے بیزاری و نفرت کی ترغیب دلا رہے ہیں، اسی حالت میں وہ توحید ذات صفات کا ذکر خیر کرتے ہوئے یک بیک خدائے واحد کی جانب دست بدعا ہو جاتے ہیں، گویا ایک دوسرے رنگ میں قوم کو اللہ رب العلمین کا پرستار بنانے کی سعی فرما رہے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا کرتے کرتے درگاہ ایزدی میں عرض کرتے ہیں وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ (پروردگار!) اور جس روز لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے تو اس دن مجھ کو رسوا نہ کرنا۔"

اس آیت کے تحت امام بخاریؒ اپنی الجامع الصحیح میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے جو کتاب التفسیر میں مختصر اور کتاب الانبیاء میں تفصیل کے ساتھ منقول ہے کتاب التفسیر میں منقول حدیث کا ترجمہ یہ ہے:

"حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن اپنے والد کو پراگندہ حال اور روسیاہ دیکھیں گے تو فرمائیں گے پروردگار! دنیا میں تو نے میری اس دعاء کو قبول فرمالیا تھا وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ (یعنی پھر یہ رسوائی کیسی کہ میدان حشر میں اپنے باپ کو اس حال میں دیکھ رہا ہوں) اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا، ابراہیم علیہ السلام! میں نے کافروں پر جنت کو حرام کر دیا ہے۔"

اور کتاب الانبیاء میں یہ روایت ان اضافات کے ساتھ مذکور ہے۔

جب قیامت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کو پراگندہ حال اور روسیاہ دیکھیں گے تو باپ سے مخاطب ہو کر فرمائیں گے کیا میں نے بارہا تجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ میری راہ ہدایت کی مخالفت نہ کرو۔ آزر کہے گا! "جو ہوا سو ہوا آج کے دن سے میں تیری مخالفت نہیں کرونگا" تب حضرت ابراہیم علیہ السلام

[1]: مصنفہ علامہ مشرقی۔

درگاہ الٰہی میں عرض رسا ہوں گے پروردگار! تو نے میری اس دعاء کو قبول فرمالیا تھا رب لا تخزنی یوم یبعثون مگر اس سے زیادہ رسوائی اور کیا ہوگی کہ میرا باپ (آزر) تیری رحمت سے انتہائی دور ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے بلاشبہ کافروں پر جنت کو حرام کر دیا ہے پھر ہاتف غیبی آواز دے گا (اور بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی پکارے گا) ابراہیم! قدموں کے نیچے دیکھ کیا ہے) حضرت ابراہیم علیہ السلام دیکھیں گے کہ گندگی میں لتھڑا ہوا ایک بجو پیروں میں پڑا لوٹ رہا ہے تب فرشتے ٹانگوں سے پکڑ کر جہنم میں اس کو پھینک دیں گے۔

مختصر حدیث میں قیامت کے دن آزر کی ہیئت کذائی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ ٹھیک ٹھیک قرآن عزیز سورۂ عبس کی اس آیت کی تفسیر ہے جس میں قیامت کے دن کافروں کی یہ حالت بیان کی گئی ہے۔

وُجُوْهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ○ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ○ أُولٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ○

اور کتنے (لوگوں کے) منہ اس دن (ایسے) ہوں گے کہ ان پر گرد پڑی ہوگی اور ان پر کلونس چھا رہی ہوگی، یہی وہ (وہ لوگ) ہیں (دنیا میں) کافر اور بدکار ہیں۔

اور سورہ یونس میں مومنوں اور اصحاب جنۃ کیلئے اسی حالت کی نفی کی گئی ہے۔

لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۚ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۚ أُولٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ○

جن لوگوں نے دنیا میں بھلائیکی ان کے لئے (آخرت میں بھی) بھلائی ہے اور کچھ بڑھ کر بھی اور گنہگاروں کی طرح ان کے منہ پر نہ کلونس چھائی ہوئی ہوگی اور نہ ذلت، یہی ہیں جنتی کہ وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

طویل حدیث میں دو نئی باتیں کہی گئی ہیں ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آزر کی یہ حالت دیکھ کر درگاہ الٰہی میں مسطورۂ بالا دعاء کا ذکر کریں گے جو انبیاء علیہم السلام کی دعاؤں کی طرح شرف قبول حاصل کر چکی ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ باپ کی یہ رسوائی دراصل میری رسوائی ہے دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آزر کو بجو کی شکل میں مسخ کر دیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اس حدیث کے اجزاء پر بحث کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آزر کو اس لئے مسخ کر دے گا تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ حزن وملال جاتا رہے جو آزر کے بشکل انسان رہنے کی صورت میں ناری اور جہنمی ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا اور وہ اس کی اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر متنفر ہو جائیں اور فطرت ابراہیمی اس سے بیزار ہو جائے۔

اور بجّو کی شکل میں مسخ ہو جانے کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ ماہرین علم الحیوانیات کے نزدیک بجو گندہ بھی ہے اور درندوں میں احمق بھی تو چونکہ آزر بھی بت پرست ہونے کی وجہ سے نجاست میں ملوث تھا اور ابراہیم علیہ السلام کی پیش کردہ آیات بینات اور توحید الٰہی کے روشن دلائل و براہین کے نہ قبول کرنے کی بنا پر احمق بھی تھا اس لئے قانون الٰہی "پاداش عمل از جنس عمل" کے پیش نظر اسی کا مستحق تھا کہ ایک احمق اور نجس درندہ کی شکل

میں مسخ کر دیا جائے مگر مشہور محدث اسمٰعیلی اس روایت ہی کو مجروح اور لائق طعن سمجھتے اور صحت سند کے اعتراف کے باوجود سقم درایت کی بنا پر اس کو قبول نہیں کرتے وہ فرماتے ہیں

"اس حدیث میں یہ "سقم" ہے کہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ وہ العیاذ باللہ خدائے برتر کے متعلق "خلف وعد" کا شک کرتے تھے، تب ہی تو یہ سوال کیا؟ حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اولوالعزم انبیاء میں سے ہیں اور وہ بلاشبہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی ہرگز نہیں کرتا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ لہٰذا ابراہیم علیہ السلام کی جانب ایسی بات کی نسبت کرنا قطعاً درست نہیں وہ کسی طرح بھی آزر کی مشرکانہ زندگی و موت کے علم ہوتے ہوئے ایسا سوال نہیں کر سکتے"۔

اسمٰعیلی کے علاوہ بعض دوسرے محدثین نے بھی اس تفصیلی روایت پر جرح کی ہے، وہ کہتے ہیں یہ روایت بظاہر قرآن کے خلاف ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيْمَ لِأَبِيْهِ إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ أَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ○

اور (وہ جو) ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دعاء مانگی تھی سو (وہ جو) ایک وعدہ (کی وجہ) سے مانگی تھی جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کر لیا تھا۔ پھر ان کو جب معلوم ہو گیا کہ یہ دشمن خدا ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہو گئے، بیشک ابراہیم علیہ السلام البتہ بڑے نرم دل اور بردبار تھے۔

یہ آیت ناطق ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو دنیا ہی میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا باپ آزر حیات کے آخری لمحہ تک خدا کا دشمن ہی رہا اور اسی پر اس کی موت ہوئی اس لئے انھوں نے دنیا ہی میں اس سے اپنی بیزاری اور بے تعلقی کا اعلان کر دیا تھا اور بتلا دیا تھا کہ خلیل الرحمٰن کو عدو الرحمٰن کے ساتھ کسی قسم کا واسطہ نہیں ہو سکتا۔

پس اس صورت حال کے بعد روایت کا یہ مضمون کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

حافظ ابن حجر مسطورہ بالا دونوں جرح کو نقل کرنے کے بعد ان کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

"حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ آزر سے اظہار بیزاری کس وقت پیش آیا؟ اس سلسلہ میں دو روایات منقول ہیں ایک حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ابن جریرؒ نے بسند صحیح اس طرح روایت کی ہے کہ جب آزر کا بحالت شرف و کفر انتقال ہو گیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یقین ہو گیا کہ وہ دشمن خدا ہو کر مرا لہٰذا انھوں نے آزر سے جو وعدہ استغفار کیا تھا اب اس کو ترک کر دیا اور اس سے اظہار بیزاری کر دیا۔"

اور دوسری روایت کہ وہ بھی ابن جریر ہی نے روایت کی ہے یہ۔

" ابراہیم علیہ السلام کی "تبری" (آزر سے اظہار بیزاری) کا یہ معاملہ دنیا میں نہیں قیامت کے دن پیش آئے گا اور اسی طرح پیش آئے گا جیسا کہ مسطورہ بالا تفصیلی روایت میں مذکور ہے یعنی جب آزر مسخ

کر دیا گیا تو ابراہیم علیہ السلام نے یقین کر لیا کہ اب استغفار کی قطعاً گنجائش باقی نہیں رہی۔

نقد و جرح کے اصول کو پیش نظر رکھ کر دونوں روایات کے درمیان تطبیق کی شکل یہ ہے کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا ہی میں آزر کی مشرکانہ موت کے پیش نظر اس سے اظہار بیزاری کر دیا تھا لیکن جب میدان حشر میں باپ کی زبوں حالت کو دیکھا تو صفت رافت و رحمت جوش میں آ گئی اور بہ تقاضائے فطرت انھوں نے پھر طلب مغفرت پر اقدام کیا مگر جب اللہ تعالیٰ نے آزر کو مسخ کر دیا تب ابراہیم علیہ السلام اس کے انجام سے مایوس ہو گئے اور سمجھ گئے کہ اس کی مغفرت کی قطعاً کوئی صورت نہیں ہے لہٰذا دوسری مرتبہ اس دار و گیر کے دن بھی تبری کا اعلان فرمایا۔ (انتہی)

(جلد ۸ کتاب التفسیر)

حافظ ابن حجرؒ کے اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ قرآن عزیز نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نمایاں خصوصیات میں سے اس صفت کا بھی اعلان کیا ہے اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ چنانچہ اس کے مختلف مظاہر میں سے ایک مظہر یہ بھی ہے کہ آزر کی شرک پر موت اور ابراہیم علیہ السلام کے دنیا ہی میں اس سے اظہار تبری کے باوجود کہ جس کا ذکر قرآن عزیز کی سورہ توبہ میں موجود ہے جب وہ فروائے قیامت میں آزر کو اس زبوں حال میں دیکھیں گے۔ غَبَرَةٌ عَلَیْهَا قَتَرَةٌ تو ان کی رافت و رحمت جوش میں آجائے گی اور اولوالعزم پیغمبر کی طرح حقیقت حال سے باخبر رہتے ہوئے بھی ان کی صفت کریمانہ کا اس درجہ فطری غلبہ برسر کار آجائے گا کہ وہ آزر کے لئے طلب مغفرت پر آمادہ ہو جائیں گے اور یہ دیکھ کر کہ آزر کی مشرکانہ زندگی کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں ہے کہ اس کو حیلہ شفاعت بنایا جا سکے ابراہیم علیہ السلام اپنی اس دعاء کی پناہ لیں گے جو دنیا ہی میں قبولیت کا شرف دوام حاصل کر چکی تھی اور باپ کی رسوائی کو اپنی رسوائی ظاہر کر کے درگاہ حق میں اس وعدہ کا ذکر کریں گے لیکن اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں یہ فرما کر کہ "کافر پر میں نے جنت کو حرام کر دیا ہے" ابراہیم علیہ السلام کو اس جانب توجہ دلائے گا کہ اپنی اس فطری رافت و رحمت کے باوجود تم کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ دنیائے عمل نہیں بلکہ روز جزاء ہے اور آج میزان عدل قائم ہے جس کے لئے ہمارا یہ غیر متبدل قانون ابدیت کا شرف حاصل کر چکا ہے کہ کافر و مشرک کیلئے جنت میں کوئی جگہ نہیں اور یہ، کہ مشرک کی رسوائی ہرگز مومن کی رسوائی کا باعث نہیں ہو سکتی خواہ ان دونوں کے درمیان علاقہ دنیوی کے مضبوط رشتے ہی کیوں نہ قائم رہے ہوں اور ساتھ ہی حکمت الٰہی ایسی صورت حال پیدا کر دے گی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حزن و ملال کا وہ اثر ہی باقی نہ رہے گا جس کی وجہ سے ان کے فطری ملکات نے طلب مغفرت پر آمادہ کیا تھا چنانچہ آزر کو درندہ کی شکل میں مسخ کر دیا جائے گا جس کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پاک اور سلیم فطرت اس کو دیکھ کر نفرت و کراہت کرنے لگے گی۔

غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ سوال اس لئے نہ تھا کہ وہ العیاذ باللہ اس صورت حال کو خلف وعد سمجھ رہے تھے بلکہ ایک فطری تقاضے کے پیش نظر تھا جو اگرچہ نتائج و ثمرات کو تو نہیں بدل سکتا مگر اس شخصیت کے ملکات حسنہ اور اوصاف کریمانہ کے نمایاں کرنے کا باعث ضرور بن جاتا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کا یہ جواب اگرچہ اسمٰعیلی اور بعض دوسرے محدثین کے طعن و جرح کو بلا شبہ بڑی حد تک ہلکا

کر دیتا ہے تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابوہریرہؓ سے منقول بخاری کی مختصر حدیث کے علاوہ طویل حدیث کے بعض اجزاء ضرور محل نظر ہیں تب ہی تو غالباً حافظ حدیث عماد الدین ابن کثیر نے ان روایات کو اپنی تفسیر میں نقل کرنے کے بعد مختصر حدیث کو قبول کرتے ہوئے بخاری کی کتاب الانبیاء والی طویل حدیث پر ''متفرد'' کا اور نسائی کی حدیث پر ''غرابت'' ''ونکارت'' کا حکم لگایا ہے مشہور محدث کرمانی نے بھی اس مسئلہ کو سوال و جواب کی شکل میں پیش کر کے اس کے حل کرنے کی سعی فرمائی ہے جو اپنی جگہ قابل مراجعت ہے۔ (فتح الباری جلد ۸ کتاب الانبیاء)

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت

ابراہیم علیہ السلام ابھی تک اولاد سے محروم تھے اور ان کے گھر کا مالک ایک خانہ زاد االیعر زد مشقی تھا ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں فرزند کے لئے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمالیا اور ان کو تسلی دی۔

ابرام نے کہا اے خداوند خدا تو مجھ کو کیا دے گا میں تو بے اولاد جاتا ہوں اور میرے گھر کا مختار الیعرز ہے پھر ابرام نے کہا کہ تو نے مجھے فرزند نہ دیا اور دیکھ میرا خانہ زاد میرا وارث ہوگا، تب خداوند کا کلام اس پر اترا اور اس نے کہا کہ یہ تیرا وارث نہیں ہونے کا بلکہ جو تیری صلب سے پیدا ہو وہی تیرا وارث ہوگا۔ (توارت پیدائش باب ۱۵ آیت ۲۔۴)

اور یہ دعا اس طرح قبول ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چھوٹی بی بی حضرت ہاجرہ حاملہ ہوئیں۔

اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی۔ (ایضاً باب ۱۶ آیت ۴)

جب حضرت سارہ کو یہ پتہ چلا تو انھیں بہ تقاضاء بشریت ہاجرہ سے رشک پیدا ہوگیا اور انھوں نے حضرت ہاجرہ کو تنگ کرنا شروع کردیا، حضرت ہاجرہ مجبور ہو کر ان کے پاس سے چلی گئیں۔

اور خداوند کے فرشتے نے اسے میدان میں پانی کے ایک چشمہ کے پاس پایا یعنی اس چشمہ کے پاس جو صور کی راہ پر ہے اور اس نے کہا کہ اے سری کی لونڈی ہاجرہ تو کہاں سے آئی؟ اور کدھر جاتی ہے؟ وہ بولی کہ میں اپنی بی بی سری کے سامنے سے بھاگی ہوں، اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ تو اپنی بی بی کے پاس پھر جا اور اسکے تابع رہ پھر خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی اسکا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دکھ سن لیا اور وہ وحشی (بدوی) آدمی ہوگا اسکا ہاتھ سب کے اور سب کے ہاتھ اسکے برخلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بود و باش کرے گا۔ (توارت پیدائش باب ۱۶ آیت ۷، ۱۲)

حضرت ہاجرہ جس مقام پر فرشتہ سے ہم کلام ہوئیں اس جگہ ایک کنوں تھا، ہاجرہ نے یادگار کے طور پر اس کا نام "زندہ نظر آنے والے کا کنواں" رکھا، تھوڑے عرصہ کے بعد ہاجرہ کے بیٹا پیدا ہوا اور فرشتہ کی بشارت کے مطابق اس کا نام اسمٰعیل رکھا گیا۔

"اور ہاجرہ ابرام کے لئے بیٹا جنی اور ابرام نے اپنے اس بیٹے کا نام جو ہاجرہ جنی اسمٰعیل رکھا اور جب ابرام کے لئے ہاجرہ سے اسمٰعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔" (ایضاً باب ۱۶ آیت ۱۵، ۱۶)

اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیل کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو اسحٰق کی بشارت دی جیسا کہ ابھی مفصل ذکر آئے گا، مگر ابراہیم علیہ السلام نے اس بشارت پر چنداں مسرت کا اظہار نہیں کیا اور اس کی جگہ یہ دعا مانگی:

"اور ابرام نے خدا سے کہا کہ کاش اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے"۔ (ایضاً باب ۱۷ آیت ۱۸)

اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی اس دعاء کا یہ جواب دیا۔

اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اس کو بہت بڑھاؤں گا اور اس کے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔ (ایضاً باب ۱۷ آیت ۲۰)

اسمٰعیل "اسمع" اور "ایل" دو لفظوں سے مرکب ہے عبرانی میں "ایل" اللہ کے مرادف ہے اور عربی کے اسمع اور عبرانی کے شماع کے معنی ہیں "سن" چونکہ اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سن لی اور ہاجرہ کو فرشتہ سے بشارت ملی اس لئے ان کا یہ نام رکھا گیا عبرانی میں اس کا تلفظ شماع "ایل" ہے۔

وادی غیر ذی زرع اور ہاجرہ و اسمٰعیل

حضرت ہاجرہ کے بطن سے اسمٰعیل کے پیدا ہو جانا حضرت سارہ پر بیحد شاق گذرا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اور بڑی بیوی قدیم سے گھر کی مالکہ ہاجرہ چھوٹی بیوی اور ان کی خدمت گذار یہ سب باتیں تھیں جنہوں نے بشری تقاضے کے پیش نظر اسمٰعیل کی ولادت کو حضرت سارہؓ کے لئے سوہان روح بنا دیا تھا اس لئے سارہؓ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اصرار کیا کہ ہاجرہ اور اس کا بچہ اسمٰعیل میری نگاہ کے سامنے نہ رہیں ان کو علیحدہ کسی جگہ لے جاؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ اصرار بیحد ناگوار گذرا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو مطلع کیا کہ ہاجرہ اسمٰعیل اور تیرے لئے مصلحت اسی میں ہے کہ سارہ جو کچھ کہتی ہے اس کو مان لے۔

اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو وہ ابراہیم علیہ السلام سے جنی تھی ٹھٹھے مارتا ہے تب اس نے ابراہام سے کہا کہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا پھر اپنے بیٹے کی خاطر یہ بات ابراہیم کی نظر میں نہایت بری معلوم ہوئی خدا نے ابراہام سے کہا کہ وہ بات اس لڑکے اور تیری لونڈی کی بابت تیری نظر میں بری نہ معلوم ہو ہر ایک بات کے حق میں جو سارہ نے تجھے کہی اس کی آواز پر کان رکھ کیونکہ تیری نسل اضحاق سے کہلائے گی، اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی ایک قوم پیدا کروں گا اسلئے کہ وہ تیری نسل ہے۔ (تورات پیدائش ۲۱۔ آیت ۹۔ ۱۳)

تورات کی اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت اسحٰق پیدا ہو چکے تھے، اس لحاظ سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سن رشد کو پہنچ چکے ہوں گے کیونکہ تورات ہی کی روایت کے مطابق حضرت اسمٰعیل علیہ السلام حضرت اسحٰق سے تیرہ سال بڑے ہیں۔

لیکن اسی واقعہ میں تورات کی دوسری آیات مسطورہ بالا آیات کے خلاف یہ کہتی ہیں کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ابھی شیر خوار بچہ تھے۔

تب ابراہام نے صبح سویرے اٹھا کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کو اس کے کاندھے پر دھر کر دی اور اس کے لڑکے کو بھی اور اسے رخصت کیا وہ روانہ ہوئی اور بیر سبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی، اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اس نے اس لڑکے کو ایک پہاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے سامنے ایک پتھر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی کیونکہ اس نے کہا کہ میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں۔
(ایضاً باب ۲۱ آیت ۱۴،۱۶)

اسلئے تورات کے ان مخالف و متضاد بیانات کے مقابلہ میں صحیح قول یہ ہے کہ ہاجرہ و اسمٰعیل کے خروج کے وقت اسمٰعیل شیر خوار بچہ تھے اور اسحٰق ابھی تک پیدا نہیں ہوئے تھے۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے جو روایت منقول ہے وہ بھی اسی قول کی تائید کرتی ہے اس روایت کا مضمون یہ ہے:

ابراہیم علیہ السلام ہاجرہ اور اس کے شیر خوار بچہ اسمٰعیل کو لے کر چلے اور جہاں آج کعبہ ہے اس جگہ ایک بڑے درخت کے نیچے زم زم کے موجودہ مقام سے بالائی حصہ پر ان کو چھوڑ گئے وہ جگہ ویران اور غیر آباد تھی اور پانی کا بھی نام و نشان نہ تھا اس لئے ابراہیم نے ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجور بھی ان کے پاس چھوڑ دیں اور پھر منہ پھیر کر روانہ ہوگئے ہاجرہ ان کے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی چلیں اے ابراہیم تم ہم کو ایسی وادی میں کہاں چھوڑ کر چل دیئے جہاں نہ آدمی ہے نہ آدم زاد اور نہ کوئی مونس و غمخوار ہاجرہ برابر یہ کہتی جاتی تھیں مگر ابراہیم علیہ السلام خاموش چلے جا رہے تھے آخر ہاجرہ نے دریافت کیا، کیا تیرے خدا نے تجھ کو یہ حکم دیا ہے؟ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا "ہاں، یہ خدا کے حکم سے ہے" ہاجرہ نے جب یہ سنا تو کہنے لگیں اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو بلا شبہ وہ ہم کو ضائع اور برباد نہیں کرے گا، اور پھر واپس لوٹ آئیں، ابراہیم چلتے چلتے جب ایک ٹیلہ پر ایسی جگہ پہنچے کہ ان کے اہل و عیال نگاہ سے اوجھل ہوگئے تو اس جانب جہاں کعبہ ہے رخ کیا اور ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ○ (ابراھیم)

"اے ہم سب کے پروردگار! (تو دیکھ رہا ہے کہ) ایک ایسے میدان میں جہاں کھیتی کا نام و نشان نہیں، میں نے اپنی بعض اولاد تیرے محترم گھر کے پاس لا کر بسائی ہے کہ نماز قائم رکھیں (تاکہ یہ محترم گھر عبادت گزاران توحید سے خالی نہ رہے) پس تو (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں اور ان کیلئے زمین کی پیداوار سے سامان رزق مہیا کردے تاکہ تیرے شکر گذار ہوں!"

ہاجرہ چند روز تک مشکیزہ سے پانی اور خورجی سے کھجوریں کھاتی اور اسمٰعیل کو دودھ پلاتی رہیں لیکن وہ وقت بھی آگیا کہ پانی رہا نہ کھجوریں تب وہ سخت پریشان ہوئیں، چونکہ وہ بھوکی پیاسی تھیں اس لئے دودھ بھی نہ اترتا تھا اور بچہ بھی بھوکا پیاسا رہا جب حالت وگرگوں ہونے لگی اور بچہ بیتاب ہونے لگا تو ہاجرہ اسمٰعیل کو چھوڑ کر دور جا بیٹھیں تاکہ اس حالت زار میں اس کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں، کچھ سوچ کر قریب کی پہاڑی صفا پر چڑھیں کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ نظر آجائے مگر کچھ نظر نہ آیا پھر بچہ کی محبت میں دوڑ کر وادی میں آگئیں اس کے بعد دوسری جانب کی پہاڑی مروہ پر چڑھ گئیں اور وہاں بھی جب کچھ نظر نہ آیا تو پھر تیزی سے لوٹ کر وادی میں بچہ کے پاس آگئیں اور اس طرح سات مرتبہ کیا نبی اکرم ﷺ نے اس مقام پر پہنچ کر فرمایا کہ یہی وہ ''سعی بین الصفا والمروہ'' جو حج میں لوگ کرتے ہیں آخر میں جب وہ مروہ پر تھیں تو کانوں میں ایک آواز آئی چونکیں اور دل میں کہنے لگیں کہ کوئی پکارتا ہے کان لگایا تو پھر آواز آئی ہاجرہ کہنے لگیں اگر تم مدد کر سکتے ہو تو سامنے آؤ تمہاری آواز سن گئی دیکھا تو خدا کا فرشتہ (جبرائیل) ہے فرشتہ نے اپنا پیر (یا ایڑی) اس جگہ ماری جہاں زم زم ہے اس جگہ سے پانی ابلنے لگا ہاجرہ نے یہ دیکھا تو پانی کے چاروں طرف باڑ بنانے گیں مگر پانی برابر ابلتا رہا۔ اس جگہ پہنچ کر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالی ام اسمٰعیل پر رحم کرے اگر وہ زم زم کو اس طرح نہ روکتیں اور اس کے چار جانب باڑھ نہ لگاتیں تو آج وہ زبردست چشمہ ہوتا۔

ہاجرہ نے پانی پیا اور پھر اسمٰعیل کو دودھ پلایا فرشتہ نے ہاجرہ سے کہا خوف اور غم نہ کر اللہ تعالی تجھ کو اور اس بچہ کو ضائع نہ کرے گا، یہ مقام ''بیت اللہ'' ہے جس کی تعمیر اس بچہ (اسمٰعیل) اور اس کے باپ ابراہیم کی قسمت میں مقدر ہو چکی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اس خاندان کو ہلاک نہیں کرے گا بیت اللہ کی یہ جگہ قریب کی زمین سے نمایاں تھی مگر پانی کا سیلاب داہنے بائیں اس حصہ کو برابر کرتا جارہا تھا، اسی دوران میں بنی جرہم کا ایک قبیلہ اس وادی کے قریب آکر ٹھہرا، دیکھا تو تھوڑے سے فاصلہ پر پرند اڑ رہے ہیں جرہم نے کہا یہ پانی کی علامت ہے وہاں ضرور پانی موجود ہے جرہم نے بھی قیام کی اجازت مانگی ہاجرہ نے فرمایا قیام کر سکتے ہو، لیکن پانی میں ملکیت کے حصہ دار نہیں ہو سکتے جرہم نے یہ بات بخوشی منظور کر لی اور وہیں مقیم ہو گئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہاجرہ خود بھی باہمی انس ورفاقت کے لئے یہ چاہتی تھیں کہ کوئی یہاں آکر مقیم ہو اس لئے انھوں نے مسرت کے ساتھ بنی جرہم کو قیام کی اجازت دیدی۔ جرہم نے آدمی بھیج کر اپنے باقی ماندہ اہل خاندان کو بھی بلالیا اور یہاں مکانات بنا کر رہنے سہنے لگے۔ ان ہی میں اسمٰعیل بھی رہتے اور کھیلتے اور ان سے ان کی زبان سیکھتے، جب اسمٰعیل بڑے ہو گئے تو ان کا طرز و انداز اور ان کی خوبصورتی بنی جرہم کو بہت بھائی اور انھوں نے اپنے خاندان کی لڑکی سے ان کی شادی کر دی، اس کے کچھ عرصہ کے بعد ہاجرہ کا انتقال ہو گیا ابراہیم برابر اپنے اہل وعیال کو دیکھنے آتے رہتے تھے ایک مرتبہ تشریف لائے تو اسمٰعیل گھر پر نہ تھے ان کی اہلیہ سے دریافت

کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ روزی کی تلاش میں باہر گئے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے دریافت کیا، گذاران کی کیا حالت ہے؟ وہ کہنے لگی سخت مصیبت و پریشانی میں ہیں اور سخت دکھ اور تکلیف میں ابراہیم علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا اسمٰعیل سے میرا سلام کہہ دینا اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ تبدیل کر دو اسمٰعیل علیہ السلام واپس آئے تو ابراہیم علیہ السلام کے نور نبوت کے اثرات پائے پوچھا کوئی شخص یہاں آیا تھا، بی بی نے سارا قصہ سنایا اور پیغام بھی اسمٰعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ میرے باپ ابراہیم تھے اور ان کا یہ مشورہ ہے کہ میں تجھ کو طلاق دے دوں، لہٰذا میں تجھ کو جدا کرتا ہوں۔

اسمٰعیل نے پھر دوسری شادی کر لی ایک مرتبہ ابراہیم علیہ السلام پھر اسمٰعیل علیہ السلام کی غیبت میں آئے اسی طرح ان کی بی بی سے سوالات کئے بی بی نے کہا خدا کا شکر و احسان ہے اچھی طرح گذر رہی ہے، دریافت کیا کھانے کو کیا ملتا ہے؟ اسمٰعیل کی بی بی نے جواب دیا گوشت، ابراہم علیہ السلام نے پوچھا اور پینے کو؟ اس نے جواب دیا، پانی، تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی:

اللهم بارك لهم في اللحم والماء

اللہ تعالیٰ ان کے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما۔

اور چلتے ہوئے پیغام دے گئے کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو محفوظ رکھنا، حضرت اسمٰعیل آئے، تو ان کی بی بی نے تمام واقعہ دہرایا اور پیغام بھی سنایا اسمٰعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کا پیغام یہ ہے کہ تو میری زندگی بھر رفیقۂ حیات رہے۔ (الخ)

یہ طویل روایت بخاری کتاب الرؤیا اور کتاب الانبیاء میں دو جگہ منقول ہے اور دونوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام وادی غیر ذی زرع بن کھیتی کی سرزمین سے یعنی مکہ میں بحالتِ شیر خوارگی پہنچے تھے۔

مگر سید سلیمان ندوی، ارض القرآن میں تورات کی روایت کی تردید یا تصحیح کرتے ہوئے یہ تحریر فرماتے ہیں کہ اسمٰعیل علیہ السلام اس وقت سن رشد کو پہنچ چکے تھے، اور قرآن کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ○ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ○ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَابُنَيَّ إِنِّي أَرَى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَى ط قَالَ يَاأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ○ .... وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ○ وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَى إِسْحَاقَ (صافات)

اے پروردگار! عطا کر مجھ کو نیک لڑکا پس بشارت دی ہم نے اس کو بردبار لڑکے کی، پھر جب پہنچا وہ اس سن کو کہ باپ کے ساتھ دوڑے تو باپ نے کہا میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں دیکھو تم کیا سمجھتے ہو بیٹے نے کہا میرے باپ جو حکم کیا گیا ہے کر گزرو، مجھے صابر پاؤ گے .... اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق کی بشارت دی جو نبی ہوگا، اور نیکو کاروں میں سے ہوگا اور اس پر اور اسحٰق پر برکت نازل کی۔

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ (ابراھیم)
اے ہمارے پروردگار! میں نے بسادیا ہے اپنی اولاد میں سے بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے محترم گھر کے پاس (اور آخر میں ہے)۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ
سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے بخشا مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق کو۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ صافات کی پہلی آیت میں بلغ معہ السّعی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام سن رشد تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رہے اور آخر کی آیت بتاتی ہے کہ اسحٰق علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے اور اسمٰعیل علیہ السلام سے ۱۳ سال بڑے تھے۔

اور سورۃ ابراہیم کی آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیل جب مکہ میں لائے گئے ہیں تو وہ سن رشد کو پہنچ چکے تھے تب ہی تو ابراہیم علیہ السلام نے دعاء میں دونوں کا ذکر فرمایا ہے۔ (ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۳، ۴۴)

اس استدلال کے بعد سید صاحب بخاری کی روایت کو ابن عباسؓ پر موقوف اور اسرائیلیات سے قرار دیتے ہیں مگر سید صاحب کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے اور نہ ان کی پیش کردہ آیات سے اس کی تائید نکلتی ہے۔

اول..... اس لئے کہ صافات میں بلغ معہ السّعی کا یہ مطلب لینا کہ اسمٰعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیر سایہ فلسطین ہی میں پرورش پاتے رہے تب صحیح ہو سکتا تھا کہ اس جملہ کے بعد آیت میں کوئی دوسرا جملہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے مکہ پہنچنے کے متعلق مذکور ہوتا تاکہ ذبح اسمٰعیل کے واقعہ کے ساتھ صحیح جوڑ لگ سکتا کیونکہ اس پر تمام علماءِ اسلام کا اتفاق ہے اور سید صاحب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ذبح اسمٰعیل کا واقعہ مکہ کی زندگی سے وابستہ ہے، اور آیت یہ کہتی ہے کہ "جب اسمٰعیل علیہ السلام سن رشد کو پہنچے تو ان کے باپ نے ان سے اپنا خواب بیان کیا،" پس سید صاحب کی توجیہ کے مطابق اس آیت میں سخت ابہام ہے، حالانکہ قرآن عزیز کے طرز خطابت اور اصول بیان کے یہ قطعاً خلاف ہے کہ ایک آیت کے اندر اس طرح کا ابہام پیدا کردے جس سے دو اہم زندگیوں کے درمیان کوئی ربط قائم نہ رہ سکے۔

دوم..... اس لئے کہ صافات میں اسمٰعیل علیہ السلام سے متعلق جس واقعہ کا ذکر ہے وہ ذبح عظیم کا تذکرہ ہے نہ کہ مکہ پہنچنے کا اور وہ بلاشبہ اسمٰعیل علیہ السلام کے سن رشد کا زمانہ ہے اور اسحٰق علیہ السلام اس وقت پیدا ہو چکے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اگرچہ ہاجرہ اور اسمٰعیل کو مکہ کے بیابان وصحرا میں چھوڑ آئے تھے لیکن باپ تھے نبی وپیغمبر تھے اہلیہ اور بیٹے کو کیسے بھول سکتے، اور ان کی نگہداشت سے کیسے بے پرواہ ہو سکتے تھے، وہ برابر اس بے آب وگیاہ صحرا میں آتے رہتے اور اپنے خاندان کی نگرانی کرتے رہتے تھے اور آیت "بلغ معہ السعی" سے یہی مراد ہے لہٰذا اسحٰق علیہ السلام کی بشارت کا ذکر بالکل برمحل ہے، خود سید صاحب تورات کے ایک فقرہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"تورات میں یہ مذکور نہیں کہ حضرت ابراہیم بھی ساتھ آئے تھے لیکن کون شقی ہوگا جو اپنے

عزیز بچہ کو جس کی پیدائش کی اس نے خود دعا کی، ہو جس کیلئے زندگی اس نے خدا سے مانگی ہو اس کو تنہا بے آب وگیاہ مقام میں ہمیشہ کیلئے جانے دے۔" (ارض القرآن جلد ۲ ص ۴)

اسی طرح سورۂ ابراہیم علیہ السلام کی آیت میں عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ کے بعد یہ جملہ ہے۔

رَبَّنَا لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ ۔ (ابراھیم)

اے ہمارے پروردگار (میں نے کعبہ کے پاس ان کو اس لئے بسایا تاکہ یہ نماز کو قائم کریں پس تو لوگوں کو ان کی طرف پھیر دے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعاء بیت اللہ کی تعمیر کے بعد سے متعلق ہے اور آیت کا سیاق و سباق صاف صاف اسی پر دلالت کرتا ہے اس میں قیام صلوٰۃ کا ذکر ہے اس میں حج کی طرف اشارہ ہے اور اس میں یہاں کے بسنے والوں کیلئے رزق کی وسعت کی تمنا جھلکتی ہے اور یہ سب باتیں جب ہی موزوں ہو سکتی ہیں کہ بیت اللہ اپنی تعمیر کے ساتھ موجود ہو البتہ ابن عباسؓ کی روایت میں بھی اس دعا کا ذکر آتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاندان کو یہاں چھوڑتے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا مانگی تھی وہ اسی کے قریب قریب تھی، اسلئے ابن عباسؓ کی روایت میں اس آیت کو بطور استشہاد نقل کر دیا گیا ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ بعینہ یہی وہ دعا ہے جو اس وقت انہوں نے مانگی تھی اور اس میں اسحٰق کا بھی ذکر تھا، جب ابن عباسؓ خود روایت کر رہے ہیں کہ یہ واقعہ اسمٰعیل علیہ السلام کی شیر خوارگی کا ہے تو وہ کس طرح یہ کہہ سکتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت ایسی دعا مانگی کہ جس کے آخر میں اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ اسحٰق کی ولادت کا بھی ذکر تھا۔

سوم..... اس بن کھیتی کی سرزمین (مکہ) کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں شور پانی کے سوائے شیریں پانی کا نام و نشان نہیں ہے اور آج بھی آلاتِ جدیدہ کی اعانت کے باوجود اس زمین سے شیریں پانی کا اخراج ناممکن بنا ہوا ہے تو "زمزم" کا وجود یہاں کیسے ہوا؟ یہ مذہبی اور تاریخی دونوں حیثیت سے اہم سوال ہے سو اس کے متعلق اگرچہ آیات قرآنی کوئی تصریح نہیں کرتیں، مگر بخاری کی یہی ابن عباسؓ والی ہر دو روایات اس کے وجود کی تاریخ بیان کرتی ہیں جس میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو شیر خوار ظاہر کیا گیا ہے، اور تورات میں بھی جس طرح اس کا ذکر ہے وہ ان ہی آیات میں ہے جو اسمٰعیل علیہ السلام کو شیر خوار ظاہر کرتی ہیں۔

بہر حال اگرچہ قرآن عزیز کی کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسمٰعیل علیہ السلام اس سرزمین (مکہ) میں کس سن میں پہنچائے گئے، مگر بخاری کی روایات کہتی ہیں کہ یہ زمانہ اسمٰعیل علیہ السلام کی شیر خوارگی کا تھا۔ اور یہی صحیح ہے پس ابن عباسؓ کی یہ روایت اسرائیلیات میں سے نہیں ہے بلکہ زبان وحی ترجمان کے بیان کردہ تفصیلات کی صحیح ترجمانی ہے۔

قرآنِ عزیز نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کے متعلق ان کا نام لے کر صاف صاف کوئی ذکر نہیں کیا، البتہ بغیر نام لئے ہوئے ان کی ولادت کی بشارت کا تذکرہ موجود ہے۔

ابراہیم علیہ السلام ابھی تک اولاد سے محروم ہیں اس لئے درگاہِ الٰہی میں ایک نیک اور صالح فرزند کے لئے دعا مانگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشتا اور ولادت فرزند کی بشارت دیتا ہے۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ○ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ○ (الصافات)

اے پروردگار مجھ کو ایک نکوکار لڑکا عطا کر، پس ہم نے اس کو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔

یہ "غلام حلیم" کون ہے؟ وہی اسمٰعیل جو ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوا، اس لئے کہ قرآن عزیز کی اس آیت سے دوسری آیت کے بعد حضرت اسحٰق کی بشارت کا ذکر ہے۔

وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ○ وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ (الصافات)

اور بشارت دی ہم نے ابراہیم کو اسحٰق کی جو نکوکاروں میں سے ہوگا نبی ہوگا اور برکت دی ہم نے اس پر اور اسحٰق پر۔

پس جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ابھی دو بیٹے تھے اسمٰعیل علیہ السلام اور اسحٰق علیہ السلام اور تورات و تاریخ کی متفقہ نقل کے پیش نظر اسمٰعیل بڑے ہیں اور اسحٰق چھوٹے تو صاف ظاہر ہے کہ صافات کی پہلی آیت میں جس لڑکے کی بشارت مذکور ہے اس سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے علاوہ دوسرا کون مراد ہو سکتا ہے؟

اور جب ابراہیم علیہ السلام نے ہاجرہ و اسمٰعیل کو مکہ میں آباد کیا تھا تو ان کے لئے دعا کرتے ہوئے اس طرح اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ (ابراهیم: ۳۹)

تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق عطا کئے۔

یہ آیت بھی اسی بات کی تصدیق بھی اسی بات کی تصدیق کرتی ہے کہ الصافات کی آیت میں جس بشارت کا ذکر ہے اس سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی مراد ہیں۔

ختنہ

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ننانوے سال ہوئی اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی تیرہ سال تو اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ ختنہ کرو، ابراہیم علیہ السلام نے تعمیل حکم میں پہلے اپنی ختنہ کیں، اور اس کے بعد اسمٰعیل علیہ السلام اور تمام خانہ زادوں اور غلاموں کی ختنہ کرائیں۔

> تب ابراہام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل اور سب خانہ زادوں اور اپنے سب زر خریدوں کو یعنی ابراہام کے گھر کے لوگوں میں جتنے مرد تھے سب کو لیا اور اسی روز ان کا ختنہ کیا جس طرح خدا نے اس کو فرمایا تھا جس وقت ابراہام کا ختنہ ہوا وہ ننانوے برس کا تھا اور جب اس کے بیٹے اسمٰعیل کا ختنہ ہوا وہ تیرہ برس کا تھا۔
> (پیدائش باب ۱۷ آیات ۲۳، ۲۵)

یہی رسم ختنہ آج بھی "ملت ابراہیمی" کا شعار ہے اور سنت ابراہیمی والے نام سے مشہور ہے۔

ذبح عظیم

مقربین بارگاہ الٰہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ وہ نہیں ہوتا جو عام انسانوں کے ساتھ ہے ان کو امتحان و

آزمائش کی سخت سے سخت منزلوں سے گذرنا پڑتا اور قدم قدم پر جاں سپاری اور تسلیم و رضا کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہم گروہ انبیاء اپنے اپنے مراتب کے اعتبار سے امتحان کی صعوبتوں میں ڈالے جاتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام بھی چونکہ جلیل القدر نبی اور پیغمبر تھے اس لئے ان کو بھی مختلف آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا اور اپنی جلالت قدر کے لحاظ سے ہر دفعہ امتحان میں کامل و مکمل ثابت ہوئے، جب ان کو آگ میں ڈالا گیا تو اس وقت جس صبر اور رضا بہ قضاء الٰہی کا انھوں نے ثبوت دیا، اور جس عزم واستقامت کو پیش کیا وہ انہی کا حصہ تھا، اس کے بعد جب اسمٰعیل اور ہاجرہ کو فاران کے بیابان میں چھوڑ آنے کا حکم ملا تو وہ بھی معمولی امتحان نہ تھا، آزمائش اور سخت آزمائش کا وقت تھا، بڑھاپے اور پیری کی تمناؤں کے مرکز راتوں اور دنوں کی دعاؤں کے ثمر اور گھر کے چشم و چراغ اسمٰعیل کو صرف حکم الٰہی کی تعمیل و امتثال میں ایک بے آب و گیا جنگل میں چھوڑتے ہیں اور پیچھے پھر کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شفقت پدری جوش میں آجائے اور امتثال امر الٰہی میں کوئی لغزش ہو جائے۔

ان دونوں کٹھن منزلوں کو عبور کرنے کے بعد اب ایک تیسرے امتحان کی تیاری ہے جو پہلے دونوں سے بھی زیادہ زہرہ گداز اور جاں گسل امتحان ہے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام تین شب مسلسل خواب دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ابراہیم! تو ہماری راہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے۔

انبیاء علیہم السلام کا خواب ''رویاء صادقہ'' اور وحی الٰہی ہوتا ہے اس لئے ابراہیم علیہ السلام رضاء و تسلیم کا پیکر بن کر تیار ہو گئے کہ خدا کے حکم کی جلد جلد تعمیل کریں، مگر چونکہ یہ معاملہ تنہا اپنی ذات سے وابستہ نہ تھا بلکہ اس آزمائش کا دوسرا جزو 'بیٹا' تھا جس کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا، اس لئے باپ نے بیٹے کو اپنا خواب اور خدا کا حکم سنایا، بیٹا ابراہیم جیسے مجدد انبیاء و رسل کا بیٹا تھا فوراً سر تسلیم خم کر دیا اور کہنے لگا کہ اگر خدا کی یہی مرضی ہے تو انشاء اللہ آپ مجھ کو صابر پائیں گے اس گفتگو کے بعد باپ بیٹے اپنی قربانی پیش کرنے کے لئے جنگل روانہ ہو گئے۔ باپ نے بیٹے کی مرضی پا کر مذبوح جانور کی طرح ہاتھ پیر باندھے چھری کو تیز کیا اور بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑ کر ذبح کرنے لگے فوراً خدا کی وحی ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئی، اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، بیشک یہ بہت سخت اور کٹھن آزمائش تھی، اب لڑکے کو چھوڑ اور تیرے پاس جو یہ مینڈھا کھڑا ہے اس کو بیٹے کے بدلے میں ذبح کر، ہم نکوکاروں کو اسی طرح نوازا کرتے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جھاڑی کے قریب ایک مینڈھا کھڑا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس مینڈھے کو ذبح کیا۔

یہی وہ ''قربانی'' ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسی مقبول ہوئی کہ بطور یادگار کے ہمیشہ کے ملت ابراہیمی کا شعار قرار پائی اور آج بھی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو تمام دنیا اسلام میں یہ ''شعار'' اسی طرح منایا جاتا ہے۔

مگر اس پورے واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ''ذبیح'' کون ہے۔ اسمٰعیل علیہ السلام یا اسحٰق علیہ السلام ؟

قرآن عزیز نے اگرچہ "ذبح" کا نام نہیں لیا مگر جس طرح اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے اس سے بغیر کسی کنج و کاؤ کے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نص قرآنی اسمٰعیل کو ذبیح بتاتی ہے اور یہی واقعہ اور حقیقت ہے، والصافات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا:

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِيْنَ ○ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيْمٍ ○ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَابُنَيَّ إِنِّيْ أَرٰى فِي الْمَنَامِ أَنِّيْ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ يَآأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ ○ فَلَمَّآ أَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ○ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَّآإِبْرَاهِيْمُ ○ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلَآءُ الْمُبِيْنُ ○ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ○ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِيْنَ ○ سَلَامٌ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ ○ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ إِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِيْنَ ○ وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰى إِسْحَاقَ (الصافات، ع ۳)

اے پروردگار! مجھ کو ایک نکوکار لڑکا عطا کر پس بشارت دی ہم نے ان کو بردبار لڑکے کی پھر جب وہ اس سن کو پہنچا کہ باپ کے ساتھ دوڑنے لگے، ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس تو دیکھ کیا سمجھتا ہے؟ کہا "اے میرے باپ! جس بات کا تجھے حکم کیا گیا ہے وہ کر اگر اللہ نے چاہا تو مجھ کو صبر کرنے والوں میں پائے گا۔ پس جب ان دونوں نے رضا تسلیم کو اختیار کر لیا اور پیشانی کے بل اس (بیٹے)" کو پچھاڑ دیا ہم نے اس کو پکارا اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا بے شک ہم اسی طرح نکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں بلاشبہ یہ کھلی ہوئی آزمائش ہے اور بدلہ دیا ہم نے اس کو بڑے ذبح (مینڈھے) کے ساتھ، اور ہم نے آنے والی نسلوں میں اس کے متعلق یہ باقی چھوڑا کہ ابراہیم پر سلام ہو، اس طرح ہم نکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں بے شک ہمارے مومن بندوں میں سے ہے اور بشارت دی ہم نے اس کو اسحٰق کی جو نبی ہوگا اور نکوکاروں میں سے ہوگا اور برکت دی ہم نے اس پر اور اور اسحٰق پر۔

ان آیات میں ابراہیم علیہ السلام کے دو صاحبزادوں کی بشارت کا ذکر ہے پہلے لڑکے کا نام نہیں لیا اور غلام حلیم کہہ کر اس کے ذبح عظیم کے واقعہ کا تذکرہ کیا اور اس کے بعد دوسرے لڑکے کی بشارت کا ذکر نام لے کر کیا بشرناہ باسحٰق اور یہ طے شدہ امر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دونوں صاحبزادوں اسمٰعیل و اسحٰق میں سے اسمٰعیل بڑے ہیں اور اسحٰق چھوٹے پس جبکہ چھوٹے لڑکے کا ذکر بعد کی آیت میں نام لے کر کر دیا گیا تو پہلی آیت میں اسمٰعیل کے علاوہ اور کس کا ذکر ہو سکتا ہے؟ بلاشبہ وہ اسمٰعیل علیہ السلام ہی ہیں جنہوں نے ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین کہہ کر اور وتلہ للجبین کا مظاہر کر کے وفدینہ بذبح عظیم کا اعزاز حاصل کیا علاوہ ازیں صرف قرآن عزیز ہی اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبیح نہیں کہتا بلکہ تورات کی عبارت کو اگر غور سے مطالعہ کیجئے تو وہ بھی یہی بتاتی

ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام اور صرف اسمٰعیل ہی ذبیح ہیں۔

"ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابراہام کو آزمایا اور اسے کہا کہ تو اپنے بیٹے ہاں اپنے اکلوتے بیٹے کو جس کو تو پیار کرتا ہے "اضحٰق کو لے" اور زمین موریاء میں جا اور اسے وہاں پہاڑوں میں سے ایک جو میں تجھے بتاؤں گا، سوختنی قربانی کے لئے چڑھا۔" (تورات پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۔۲)

تب خداوند کے فرشتے نے دوبارہ آسمان پر سے ابراہام کو پکارا اور کہا کہ: خداوند فرماتا ہے اسلئے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا "اپنا اکلوتا ہی بیٹا" دریغ نہ رکھا، میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا"۔ (ایضاً باب ۲۲۔ آیت ۱۵۔۱۶)

تورات کی ان ہر دو عبارات کے نشان زدہ فقروں اپنے "اکلوتے بیٹے" اور "اپنا اکلوتا ہی بیٹا" کو دیکھئے اور پھر تورات کی ان گذشتہ آیات کو پڑھیے کہ جس میں اسمٰعیل علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اکلوتا بیٹا بتایا گیا ہے کیونکہ اسمٰعیل جب چودہ برس کے ہو چکے ہیں تب اسحٰق علیہ السلام کی ولادت ہوئی ہے کیا ان سے یہ صاف طور سے واضح نہیں ہوتا کہ "ذبیح" جیسے اعزاز کو بنی اسرائیل کے ساتھ وابستہ کرنے کی یہ غلط حرص تھی جس نے یہود کو اس تحریف پر آمادہ کیا کہ انھوں نے اس عبارت میں "اکلوتے بیٹے" کے فقرے کے ساتھ "اسحٰق" کا نام بے محل جوڑ دیا؟ پس یہ اضافہ تورات کی تصریحات کے بھی خلاف ہے اور نص قرآنی کے بھی اور واقعہ و حقیقت کے بھی قطعاً خلاف ہے۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ "ذبیح اللہ" کا عظیم الشان شرف اسمٰعیل علیہ السلام ہی کے لئے مقسوم تھا۔

وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○

یہ اللہ کا فضل ہے جس کو وہ چاہے اس کو دے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

سخت تعجب ہے کہ چند علماء اسلام بھی اس غلطی میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ "ذبیح" اسمٰعیل نہ تھے، اسحٰق علیہ السلام تھے اور جو دلائل انھوں نے اس سلسلہ میں بیان کئے ہیں افسوس کہ ہم ان سے متفق نہیں ہو سکتے، کیوں کہ ان کی بنیاد و اساس محض وہم و ظن پر قائم ہے نہ کہ یقین کی روشنی پر مثلاً ان کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ "والصافات" کی مسطورۂ بالا (یات میں سے پہلی آیت "بشرنہ بغلام حلیم" میں کوئی نام مذکور نہیں ہے اور اس کے بعد کئی آیات میں اس کے ذبح سے متعلق ذکر کرتے ہوئے فرمایا "بشرنہ باسحٰق" تو کیا "غلام حلیم" بھی یہی "اسحٰق" نہیں ہیں؟ مگر آپ خود اندازہ کیجئے کہ یہ کس قدر غلط استدلال ہے اول ان آیات کے سیاق و سباق کا مطالعہ کیجئے اور پھر غور کیجئے کہ وَبَشَّرْنٰهُ بِغُلَامٍ حَلِيْمٍ کے بعد وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ کو عطف کے ذریعہ جس طرح جدا کیا گیا ہے عربی اصول نحو کے مطابق کون سی گنجائش ہے کہ ان دونوں کو ایک ہی شخصیت قرار دیا جائے خصوصاً جب کہ دونوں کی بشارت کے ذکر کے ساتھ ساتھ جدا جدا ان کے اوصاف بھی بیان کئے گئے ہیں، صاحب قصص الانبیاء عبدالوہاب نجار نے اس موقعہ پر آیت وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ میں علیہ کی ضمیر "ذبیح" کی جانب راجع کی ہے اور یہ ترجمہ کیا ہے "ہم نے برکت نازل کی اس "ذبیح" پر اور اسحٰق پر اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ پورا قصہ بیان کرنے کے بعد اسحٰق

علیہ السلام کی بشارت کا ذکر اس بات کیلئے "نص" ہے کہ صاحب قصہ لڑکا اسحٰق کے علاوہ ہے اور وہ صرف اسمٰعیل علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ واقعہ مکہ کے قریب منٰی میں پیش آیا ہے اور تورات کا جملہ "اکلوتا بیٹا" اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ ابھی تک حضرت اسحٰق علیہ السلام کی ولادت بھی نہیں ہوئی لہٰذا تورات کا اس واقعہ کو موریا کے قریب بتانا اسی قسم کی تحریف ہے جس سے تورات کا کوئی باب خالی نہیں اور جس کا انکار بداہت کا انکار ہے۔[1]

یہ مسئلہ اگرچہ بہت زیادہ تفصیل طلب ہے لیکن ہم نے صرف ضروری امور کے بیان کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔[2]

بناء کعبہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام اگرچہ فلسطین میں مقیم تھے مگر برابر مکہ میں ہاجرہ وا سمٰعیل کو دیکھنے آتے رہتے تھے، اسی اثناء میں ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ "کعبۃ اللہ" کی تعمیر کرو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے تذکرہ کیا اور دونوں باپ بیٹوں نے بیت اللہ کی تعمیر شروع کر دی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں[3] ایک روایت نقل کی ہے، جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی اساس حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں رکھی گئی اور ملائکۃ اللہ نے ان کو وہ مقام بتادیا تھا جہاں کعبہ کی تعمیر ہوئی تھی، مگر ہزاروں سال کے حوادث نے عرصہ ہوا اس کو بے نشان کر دیا البتہ اب بھی وہ ایک ٹیلہ یا ابھری ہوئی زمین کی شکل میں موجود تھا یہی وہ مقام ہے جس کو وحی الٰہی نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا اور انھوں نے اسمٰعیل علیہ السلام کی مدد سے اس کو کھودنا شروع کیا تو سابق تعمیر کی بنیادیں نظر آنے لگیں، انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر کی گئی، مگر قرآن عزیز نے بیت اللہ کی تعمیر کا معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے شروع کیا ہے اور اس سے پہلی حالت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

حاصل یہ کہ اس واقعہ سے قبل تمام کائنات اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں بتوں اور ستاروں کی پرستش کے لئے ہیکل اور مندر موجود تھے اور ان ہی کے ناموں پر بڑی بڑی تعمیرات کی جاتی تھیں۔

مصریوں کے یہاں سورج دیوتا از درلیس، ایزلیس، حورلیس اور بعل دیوتا سب ہی کے نام پر ہیکل اور مندر تھے اشوریوں نے بعل دیوتا کا ہیکل بنایا اور ابو الہول کا مجسمہ بنا کر اس کی جسمانی عظمت کا مظاہرہ کرایا۔ کنعانیوں نے مشہور قلعہ بعلبک میں اسی بعل کا مشہور ہیکل بنایا تھا جو آج تک یادگار چلا آتا ہے "غزہ کے باشندے" "داجون" مچھلی دیبی کے مندر پر چڑھاوے چڑھاتے تھے جس کی شکل انسان کی اور جسم مچھلی کا بنایا گیا تھا عمونیوں نے سورج دیوتا کے ساتھ عشتاروت (قمر) کو دیبی بنا کر پوجا اور اس کے لئے عظیم الشان ہیکل تیار کئے فارس نے آگ کی تقدیس کا اعلان کر کے آتش کدے تیار کئے رومیوں نے مسیح اور کنواری مریم کے بت بنا کر کلیساؤں کو زینت دی

---

1. تحریف کیلئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کی کتاب "اظہار الحق" قابل مطالعہ ہے۔
2. اس مسئلہ پر مولانا عبد الحمید صاحب فراہی مرحوم کا رسالہ "الرائے الصحیح فی من ھو الذبیح" بہترین معلومات کا حامل ہے۔
3. جلد ۸ ص ۱۳۸۔

اور ہندیوں نے مہاتما بدھ، شری رامچندر، شری مہادیو اور مہادیو کو دیوتا اور اوتار مان کر اور کالی دیوی سیتلا دیوی سیتا دیوی اور پاربتی دیوی ناموں سے ہزاروں بتوں کی پرستش کے لئے کیسے کیسے عظیم الشان مناور تیار کئے ہر دوار پریاگ کاشی پوری کے سلسلہ سانچی اور بودہ گیا جسے مذہبی مقامات اس کی زندہ شہادتیں ہیں۔

مگر ان سب کے برعکس صرف خدائے واحد کی پرستش اور اس کی یکتائی کے اقرار میں سر نیاز جھکانے کے لئے پایوں کہئے کہ توحید الٰہی کی سربلندی کے اظہار کے لئے دنیا کے بتکدوں میں پہلا گھر جو خدا کا گھر کہلایا وہ یہی "بیت اللہ" ہے۔

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّهُدًى لِّلْعَالَمِيْنَ ○ (آل عمران)

بے شک سب سے پہلا وہ گھر جو لوگوں کے لئے (خدا کی یاد کیلئے) بنایا گیا البتہ وہ ہے جو مکہ میں ہے وہ سرتاپا برکت ہے اور جہان والوں کے لئے ہدایات (کا سرچشمہ)

اسی تعمیر کو یہ شرف حاصل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جیسا جلیل القدر پیغمبر اس کا معمار ہے اور اسمٰعیل علیہ السلام جیسا نبی وذبیح اس کا مزدور باپ بیٹے برابر اس کی تعمیر میں مصروف ہیں اور جب اس کی دیواریں اوپر اٹھتی ہیں اور بزرگ باپ کا ہاتھ اوپر تعمیر سے معذور ہو جاتا ہے تو قدرت کی ہدایت کے مطابق ایک پتھر کو باڑ بنایا جاتا ہے جس کو اسمٰعیل علیہ السلام اپنے ہاتھ سے سہارا دیتے اور ابراہیم علیہ السلام اس پر چڑھ کر تعمیر کرتے جاتے ہیں یہی وہ یادگار ہے جو آج مقام ابراہیم علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے جب تعمیر اس حد پر پہنچی جہاں آج حجر اسود نصب ہے تو جبرائیل امین نے ان کی رہنمائی کی اور حجر اسود کو ان کے سامنے ایک پہاڑی سے محفوظ نکال کر دیا جس کو جنت کا لایا ہوا پتھر کہا جاتا ہے تاکہ وہ نصب کر دیا جائے۔

بیت اللہ تعمیر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا کہ یہ ملت ابراہیمی کیلئے (قبلہ) اور ہمارے سامنے جھکنے کا نشان ہے اسلئے یہ توحید کا مرکز قرار دیا جاتا ہے تب ابراہیم واسمٰعیل علیہ السلام نے دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کی ذریت کو اقامت صلوٰۃ وزکوٰۃ کی ہدایت دے اور استقامت بخشے اور ان کے لئے پھلوں میووں اور رزق میں برکت عطا فرمائے اور تمام اقطاع عالم کے بسنے والوں میں سے ہدایت یافتہ گروہ کو اس طرف متوجہ کرے کہ وہ دور دور سے آئیں اور مناسک حج ادا کریں اور ہدایت و رشد کے اس مرکز میں جمع ہو کر اپنی زندگی کی سعادتوں سے دامن بھریں۔

قرآن عزیز نے بیت اللہ کی تعمیر کے وقت ابراہیم علیہ السلام واسمٰعیل علیہ السلام کی مناجات اقامت صلوٰۃ اور مناسک حج کی ادا کے لئے شوق و تمنا کے اظہار اور بیت اللہ کے مرکز توحید ہونے کے اعلان کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے اور نئے اسلوب وطرز ادا سے اس کی عظمت اور جلالت وجبروت کو ان آیات میں واضح فرمایا ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّهُدًى لِّلْعَالَمِيْنَ ○ فِيْهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ

اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ ۝ (آل عمران ع ۱۰)

بلا شبہ پہلا گھر جو انسان کے لئے (خدا پرستی کا معبد و مرکز) بنایا گیا ہے وہ یہی (عبادت گاہ) ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور تمام انسانوں کے لئے سر چشمہ ہدایت اس میں (دین حق کی) روشن نشانیاں ہیں، ازانجملہ مقام ابراہیم ہے (یعنی ابراہیم کے کھڑے ہونے اور عبادت کرنے کی جگہ جو اس وقت سے لیکر آج تک بغیر کسی شک و شبہ کے مشہور و معین رہی ہے اور (ازانجملہ یہ بات ہے کہ) جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن و حفاظت میں آ گیا اور ازانجملہ یہ کہ اللہ کی طرف سے لوگوں کے لئے یہ بات ضروری ہو گئی کہ اگر اس تک پہنچنے کی استطاعت پائیں تو اس گھر کا حج کریں، بایں ہمہ جو کوئی (اس حقیقت سے) انکار کرے (اور اس مقام کی پاکی و فضیلت کا اعتراف نہ کرے) تو یاد رکھو اللہ کی ذات تمام دنیا سے بے نیاز ہے (وہ اپنے کاموں کے لئے کسی فرد اور قوم کا محتاج نہیں!)

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ط وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى ط وَعَهِدْنَا إِلَى إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْمَاعِيْلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَّارْزُقْ أَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهٗ إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(البقرہ ع ۱۵)

اور پھر دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (مکہ کے) اس گھر کو (یعنی خانہ کعبہ کو) انسانوں کی گرد آوری کا مرکز اور امن و حرکت کا مقام ٹھہرا دیا اور حکم دیا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ (ہمیشہ کے لئے) نماز کی جگہ بنائی جائے اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم دیا تھا کہ ہمارے نام پر جو گھر بنایا گیا ہے اسے طواف کرنے والوں عبادت کیلئے ٹھہرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے (ہمیشہ) پاک رکھنا (اور ظلم و معصیت کی گندگیوں سے آلودہ نہ کرنا!) اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام نے خدا کے حضور دعا مانگی تھی۔ ”اے پروردگار! اس جگہ کو (جو دنیا کی آباد سرزمینوں سے دور اور سرسبزی و شادابی سے ایک قلم محروم ہے) امن و امان کا ایک آباد شہر بنادے، اور اپنے فضل و کرم سے ایسا کر کہ یہاں کے بسنے والوں میں جو لوگ تجھ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہوں ان کے رزق کیلئے ہر طرح کی پیداوار مہیا ہو جائے! اس پر ارشاد الٰہی ہوا تھا کہ (تمہاری دعا قبول کی گئی اور یہاں کے باشندوں میں

سے) جو کوئی کفر کا شیوہ اختیار کرے گا، سوائے بھی ہم (سروسامان رزق سے) فائدہ اٹھانے دیں گے۔ البتہ یہ فائدہ اٹھانا بہت تھوڑا ہوگا کیوں کہ بالآخر اسے (پاداش عمل میں) چارو ناچار دوزخ میں جانا ہے اور (جو بد بخت نعمت کی راہ چھوڑ کر عذاب کی راہ اختیار کرلے تو کیا ہی بری اس کی راہ ہے اور) کیا ہی برا اس کا ٹھکانا ہے! اور (پھر دیکھو وہ کیسا عظیم الشان اور انقلاب انگیز وقت تھا) جب ابراہیم خانہ کعبہ کی بنیاد چن رہا تھا اور اسمٰعیل بھی اس کے ساتھ شریک تھا (ان کے ہاتھ تو پتھر چن رہے تھے، اور دل وزبان پر یہ دعا طاری تھی!) "اے پروردگار! (ہم تیرے دو عاجز بندے تیرے مقدس نام پر اس گھر کی بنیاد رکھ رہے ہیں) ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو! بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کو سننے والا اور (مصالح عالم کا) جاننے والا ہے۔ اے پروردگار! (اپنے فضل و کرم سے) ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم بچے مسلم (یعنی تیرے حکموں کے فرمانبردار) ہو جائیں اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی امت پیدا کردے جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو! خدایا ہماری عبادت کے (سچے) طور طریقے بتادے، اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو رحمت سے درگزر کرنیوالی ہے اور جس کی رحیمانہ درگزر کی کوئی انتہا نہیں! اور خدایا (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول مبعوث ہو جو انہی میں سے ہو وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے کتاب اور حکمت کی انھیں تعلیم دے اور اپنی پیغمبرانہ تربیت سے ان کے دلوں کو مانجھ دے، اے پروردگار! بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو حکمت والی اور سب پر غالب ہے۔"

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ أَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۝ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝ ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ط وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ إِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ط وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝ ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ إِلٰٓى أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝ (الحج ۲۲، آیت ۲۶-۳۳)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے ابراہیم کیلئے خانہ کعبہ کی جگہ مقرر کردی، (اور حکم دیا) کہ میرے ساتھ

کسی چیز کو شریک نہ کر اور میرا یہ گھر ان لوگوں کے لئے پاک رکھ جو طواف کرنے والے ہوں عبادت میں سرگرم رہنے والے ہوں رکوع و سجود میں جھکنے والے ہوں! اور) حکم دیا کہ ("لوگوں میں حج کا اعلان پکار دے، لوگ تیرے پاس دنیا کی تمام دور دراز راہوں سے آیا کریں گے پاپیادہ، اور ہر طرح کی سواریوں پر جو (مشقت سفر سے) تھکی ہوئی ہوں گی، وہ اس لئے آئیں گے کہ اپنے فائدہ پانے کی جگہ میں حاضر ہو جائیں اور ہم نے جو پالتو جانور چارپائے ان کے لئے مہیا کر دیئے ہیں ان کی قربانی کرتے ہوئے مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں پس قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ اور بھوکے فقیروں کو بھی کھلاؤ، پھر قربانی کے بعد وہ اپنے جسم و لباس کا میل کچیل دور کر دیں (یعنی احرام اتار دیں) نیز اپنی نذر پوری کریں اور اس خانۂ قدیم (یعنی خانۂ کعبہ) کے گرد پھیرے پھر لیں۔" تو دیکھو (حج کی) بات یوں ہوئی اور جو کوئی اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حرمتوں کی عظمت مانے، تو اس کے لئے اس کے پروردگار کے حضور بڑی ہی بہتری ہے اور (اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ) ان جانوروں کو چھوڑ کر جن کا حکم قرآن میں سنا دیا گیا ہے تمام چارپائے تمہارے لئے حلال کئے گئے ہیں پس چاہیے کہ بتوں کی ناپاکی سے بچتے رہو، نیز جھوٹ بولنے سے، صرف اللہ ہی کے ہو کر رہو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، جس کسی نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو اس کا حال ایسا سمجھو، جیسے بلندی سے اچانک نیچے گر پڑا، چیز اس طرح گرے گی اسے یا تو کوئی پرندا اچک لے گا یا ہوا کا جھونکا کسی دور دراز گوشہ میں لے جا کر پھینک دے گا! (حقیقت حال) یہ ہے، پس (یاد رکھو) جس کسی نے اللہ کی نشانیوں کی عظمت مانی تو اس نے ایسی بات مانی جو فی الحقیقت دلوں کی پرہیزگاری کی باتوں میں سے ہے، ان (چارپایوں) میں ایک مقررہ وقت تک تمہارے لئے طرح طرح کے) فائدے ہیں۔ (پھر اس خانۂ قدیم تک پہنچا کر ان کی قربانی کرنی ہے)

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ط كَذٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (الحج ع۵)

اور (دیکھو) قربانی کے یہ اونٹ (جنھیں دور دور سے حج [illegible] یا جاتا ہے (تو ہم نے اسے ان چیزوں میں سے ٹھہرا دیا ہے جو تمہارے لئے اللہ کی (عبادت کی) نشانیوں میں سے ہیں، اس میں تمہارے لئے بہتری کی بات ہے پس چاہیے کہ انھیں قطار در قطار ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام یاد کرو پھر جب وہ کسی پہلو پر گر پڑیں یعنی ذبح ہو جائیں ہو جائیں) تو ان کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور فقیروں اور زائروں کو بھی کھلاؤ، اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا تاکہ (احسان الٰہی کے) شکر گذار ہو! یاد رکھو اللہ تک ان قربانیوں کا نہ تو گوشت پہنچتا ہے نہ خون، اس کے حضور جو کچھ پہنچ سکتا ہے وہ تو صرف تمہارا تقویٰ ہے (یعنی تمہارے دل کی نیکی ہے) ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لئے مسخر کر

دیا کہ اللہ کی رہنمائی پر اسکے شکر گذار ہو اور اس کے نام کی بڑائی کا آوازہ بلند کرو، اور نیک کرداروں کیلئے (قبولیت حق کی) خوشخبری ہے۔

اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد

اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کا ذکر قرآن عزیز یا احادیث نبوی میں تفصیل کے ساتھ نہیں آتا، البتہ تورات نے ان کے ناموں کا علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ تورات کے قول کے مطابق اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ لڑکے تھے جو بارہ سردار کہلائے اور عرب کے مستقل قبائل کے جد قبیلہ بنے اور ایک لڑکی تھی جس کا نام بشامہ یا محلاۃ تھا۔

> اور ابراہام کے بیٹے اسمٰعیل کا جسے سری کی لونڈی مصری ہاجرہ ابراہیم کیلئے جنی تھی یہ نسب نامہ ہے اور یہ اسمٰعیل کے بیٹوں کے نام ہیں مطابق ان کے ناموں اور نسبوں کی فہرست کے اسمٰعیل کا پہلو ٹھا نبایوت، قیدار، ادبئیل، ہشام، مشماع، رومہ، مَسّا، عدار، تیما، یطور، نافیش، قیدما، یہ اسمٰعیل کے بیٹے ہیں، اور ان کے نام ان کی بستیوں اور قلعوں میں یہ ہیں اور یہ اپنی امتوں کے بارہ رئیس تھے۔
>
> (۲۵۔ آیت ۱۲۔۱۶ پیدائش)

ان میں دو بڑے بیٹے نابت یا نبایوت اور قیدار بہت مشہور ہیں اور ان کا ذکر تورات میں بھی کثرت سے پایا جاتا ہے اور عرب مورخین بھی ان کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہیں، یہی وہ نابت ہیں جن کی نسل اصحاب الحجر کہلائی اور قیدار کی نسل اصحاب الرس کے نام سے مشہور ہوئی ان کے علاوہ دوسرے بھائیوں اور ان کے خاندانوں کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔

قرآن عزیز میں حضرت اسمٰعیل کا تذکرہ

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں متعدد بار ہوا ہے، ان میں سے ایک جگہ صرف اوصاف مذکور نہیں ہے، یہ "ذِبحٍ عظیم" والی آیت ہے اور دو مقام پر اس بشارت کے موقع پر ذکر آیا جس میں ابراہیم علیہ السلام کی پسری اولاد کی بشارت دی گئی ہے اور سورۂ مریم میں ان کا نام لے کر ان کے اوصاف جمیلہ کا ذکر کیا گیا ہے،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ○
وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا ○ (مریم ع ٤)

اور یاد کر کتاب میں اسمٰعیل کا ذکر تھا وہ وعدہ کا سچا اور تھا رسول نبی اور حکم کرتا تھا اپنے اہل کو نماز کا اور زکوٰۃ کا اور تھا وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ۔

حضرت اسمٰعیل کی وفات

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر جب ایک سو چھتیس ۱۳۶ سال کی ہوئی تو ان کا انتقال ہو گیا اس وقت ان کے سامنے ان کی اولاد اور نسل کا سلسلہ بہت پھیل گیا تھا جو حجاز، شام، عراق، فلسطین اور مصر تک پھیلی۔

تورات ایک موقع پر اشارہ کرتی ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قبر فلسطین ہی میں ہے[1] اور یہیں ان کی وفات ہوئی اور عرب مورخین کہتے ہیں کہ وہ اور ان کی والدہ ہاجرہ بیت اللہ کے قریب حرم کے اندر مدفون ہیں۔
(تاریخ طبری جلد۱)

۱: پیدائش باب ۲۵۔

حضرت اسحٰق علیہ السلام

حضرت ابرہیم علیہ السلام کی عمر سو سال کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بشارت سنائی کہ سارہ کے بطن سے بھی تیرے ایک بیٹا ہوگا اس کا نام اسحٰق رکھنا۔

اور خدا نے ابراہام سے کہا کہ تیری جورو سری جو ہے اس کو سری مت کہا کر بلکہ اس کا نام سارہ ہے اور میں اسے برکت دوں گا اور اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا یقیناً میں اسے برکت دوں گا کہ وہ قوموں کی ماں ہوگی، اور ملکوں کے بادشاہ اس سے پیدا ہوں گے تب ابراہام منہ کے بل گرا اور ہنس کے دل میں کہا کہ کیا سو برس کے مرد کے بیٹا پیدا ہوگا اور سارہ ننانوے برس کی ہے بیٹا جنے گی؟ اور ابراہیم نے خدا سے کہا کہ کاش کہ اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے تب خدا نے کہا کہ بے شک تیری جورو سرہ تیرے لئے بیٹا جنے گی تو اس کا نام اسحٰق رکھنا۔" (باب ۱۷ آیت ۱۵ تا ۱۹)

اور قرآن عزیز میں ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلَامًا ط قَالَ سَلَامٌ فَمَا لَبِثَ أَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ○ فَلَمَّا رَاٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ إِنَّآ أُرْسِلْنَآ إِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ○ وَامْرَأَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِنْ وَّرَآءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوْبَ ○ قَالَتْ يَاوَيْلَتٰىٓ ءَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ○ قَالُوْا أَتَعْجَبِيْنَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ○ (سورہ ھود)

اور بلاشبہ ہمارے ایلچی (فرشتے) ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے انھوں نے ابراہیم کو سلام کیا اور ابراہیم نے سلام کہا تھوڑی دیر کے بعد ابراہیم بچھڑے کا بھنا گوشت لایا اور جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھتے تو ان کو اجنبی محسوس کیا اور ان سے خوف کھایا وہ کہنے لگے خوف نہ کرو ہم لوط کی قوم پر (عذاب کے لیے) بھیجے گئے ہیں، اور ابراہیم کی بیوی (سارہ) کھڑی ہوئی ہنس رہی تھی، پس ہم نے اس کو اسحٰق کی اور اس کے بعد (اس کے بیٹے) یعقوب کی بشارت دی، سارہ کہنے لگی کیا میں نگوڑی بڑھیا جنوں گی اور جب کہ ابراہیم میرا شوہر بھی بوڑھا ہے واقعی یہ تو بہت عجیب بات ہے فرشتوں نے کہا کیا تو خدا کے حکم پر تعجب کرتی ہے اے اہل بیت تم پر خدا کی رحمت و برکت ہو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر طرح قابل حمد اور بہت بزرگ۔

فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ط قَالُوْا لَا تَخَفْ ط وَبَشَّرُوْهُ بِغُلَامٍ عَلِيْمٍ ○ فَأَقْبَلَتِ

امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ○ قَالُوْا كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ○ (الذاریات ع ٤)

پس محسوس کیا (ابراہیم نے) ان سے خوف وہ (فرشتے کہنے لگے خوف نہ کھا اور بشارت دی اس کو ایک سمجھ دار لڑکے کی، پس آئی بی بی (سارہ) ابراہیم کی سخت بے چینی کا اظہار کرتی ہوئی پھر پیٹ لیا اس نے اپنا منہ اور کہنے لگی بانجھ بڑھیا (اور بچہ) فرشتوں نے کہا تیرے پروردگار نے یہی کہا ہے، ایسا ہی ہوگا وہ دانا ہے حکمت والا۔

قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ○ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ○ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ○ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ○ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ○ (الحجر)

ابراہیم نے کہا بیشک مجھ کو تم سے خوف معلوم ہوتا ہے فرشتوں نے کہا ہم سے نہ ڈر بلاشبہ ہم تجھ کو ایک سمجھ دار لڑکے کی بشارت دینے آئے ہیں ابراہیم نے کہا کیا تم مجھ کو اس بڑھاپا آجانے پر بھی بشارت دیتے ہو، یہ کیسی بشارت دے رہے ہیں فرشتوں نے کہا کہ ہم تجھ کو حق بات کی بشارت دے رہے ہیں۔ پس تو ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو ابراہیم نے کہا اور نہیں ناامید ہوتے اپنے پروردگار کی رحمت سے مگر گمراہ۔

ختنہ

جب حضرت اسحٰق آٹھ دن کے ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی ختنہ کرادیں اور ابرہام نے جیسا کہ خدا نے اسے حکم دیا تھا اپنے بیٹے اضحاق کا جب وہ آٹھ دن کا ہوا ختنہ کیا۔
(توارت باب ۲۱ آیت ۴)

اسحٰق اصل تلفظ کے اعتبار سے یصحق ہے یہ عبرانی لفظ ہے جس کا عربی ترجمہ یضحک (ہنستا ہے) ہوتا ہے۔

خدا کے فرشتوں نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سو برس اور حضرت سارہ کو نوے سال کے سن میں بیٹا ہونے کی بشارت دی تھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اچنبھا سمجھا تھا اور حضرت سارہ کو بھی یہ سن کر ہنسی آگئی تھی اس لئے ان کا یہ نام تجویز ہوا، یا اس لئے یہ نام رکھا گیا کہ ان کی پیدائش حضرت سارہ کی مسرت و شادمانی کا باعث ہوئی۔

عربی قاعدہ سے یضحق مضارع کا صیغہ ہے اہل عرب کا ہمیشہ سے ہی یہ دستور رہا ہے کہ وہ مضارع کے صیغوں کو بھی بطور نام کے استعمال کرتے ہیں چنانچہ یعرب یملان جیسے نام عرب میں معروف و مشہور ہیں۔

اسحٰق علیہ السلام کی شادی

قرآن عزیز میں اس کے متعلق کوئی ذکر نہیں ہے البتہ تورات میں اس سلسلہ میں ایک طویل قصہ مذکور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خانہ زاد الیعزر دمشقی سے فرمایا کہ میں یہ طے کرچکا

ہوں کہ اسحٰق کی شادی فلسطین کے ان کنعانی خاندانوں میں ہرگز نہ کروں گا بلکہ میری یہ خواہش ہے کہ اپنے خاندان اور باپ دادا کی نسل میں اس کا رشتہ کروں اس لئے تو سازو سامان لے کر جا اور فدان آرام میں میرے بھتیجے بتوئیلبن ناحور کو یہ پیغام دے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اسحٰق سے کردے، اگر وہ راضی ہو جائے تو اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں اسحٰق کو اپنے پاس سے جدا کرنا نہیں چاہتا لہٰذا لڑکی کو تیرے ساتھ رخصت کردے، الیعزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حکم کے مطابق فوراً آرام کو روانہ ہو گیا جب آبادی کے قریب پہنچا تو اپنے اونٹ کو بٹھایا تاکہ حالات معلوم کرے، الیعزر نے جس جگہ اونٹ بٹھایا تھا، اسی کے قریب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی بتوئیل کا خاندان آباد تھا۔ ابھی یہ اس میں مشغول تھا کہ سامنے ایک حسین لڑکی نظر آئی جو پانی کا گھڑا اٹھا کر مکان کو لئے جارہی تھی۔

الیعزر نے اس سے پانی مانگا لڑکی نے اس کو بھی پانی پلایا اور اس کے اونٹ کو بھی اور پھر حال دریافت کیا، الیعزر نے بتوئیل کا پتہ دریافت کیا، لڑکی نے کہا کہ وہ میرے باپ ہیں اور الیعزر کو مہمان بنا کر لے گئی، مکان پر پہنچ کر اپنے بھائی لابان کو اطلاع دی، لابان نے الیعزر کی بیحد مدارات کی اور آمد کی وجہ دریافت کی، الیعزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام سنایا۔ لابان کو اس پیغام سے بے حد مسرت ہوئی اور اس نے بہت سا سازو سامان دے کر اپنی بہن رفقہ کو الیعزر کے ہمراہ رخصت کر دیا۔

حضرت اسحٰق کی اولاد

رفقہ سے حضرت اسحٰق علیہ السلام کے توأم اور دو لڑکے علی الترتیب عیسو اور یعقوب پیدا ہوئے اس وقت حضرت اسحٰق علیہ السلام کی عمر ساٹھ سال کی تھی، اسحٰق علیہ السلام عیسو کو زیادہ چاہتے تھے اور رفقہ یعقوب سے سے زیادہ پیار رکھتی تھیں، عیسو شکاری تھا اور بوڑھے ماں باپ کو شکار کا گوشت لا کر دیتا تھا اور یعقوب خیمہ ہی میں رہتا تھا۔

ایک روز عیسو تھکا ماندہ آیا یعقوب سے کہنے لگا میں ماندہ ہوں اور آج شکار بھی ہاتھ نہ آیا تو اپنے کھانے مسور اور لپسی میں سے مجھے بھی کچھ دے یعقوب نے کہا کہ فلسطینیوں کا یہ دستور ہے کہ میراث بڑے لڑکے کو ملتی ہے اس لئے باپ کا وارث تو ہوگا اگر تو اس حق سے دست بردار ہو جائے تو میں تجھ کو کھانا کھلاؤں گا، عیسو نے کہا مجھے اس میراث کی کوئی پرواہ نہیں تو ہی وارث ہو جانا تب یعقوب نے عیسو کو کھانا کھلایا۔

ایک مرتبہ حضرت اسحٰق علیہ السلام نے (جبکہ بہت بوڑھے اور ضعیف البصر ہو گئے تھے) یہ چاہا کہ عیسو کو برکت دیں، اور اس سے کہا کہ جا شکار کر کے لا اور عمدہ کھانا پکا کر میرے سامنے پیش کر، رفقہ نے یہ سنا تو دل سے چاہا کہ یہ برکت یعقوب کو ملے فوراً یعقوب کو بلا کر کہا کہ جلدی عمدہ کھانا تیار کر کے باپ کے سامنے لیجا اور دعاء برکت کا طالب ہو، یعقوب نے نام بتائے بغیر ایسا ہی کیا اور اسحٰق سے دعاء برکت حاصل کر لی، جب عیسو آیا اور اس نے سب قصہ سنا تو انتہائی ناگواری محسوس کی اور یعقوب سے کینہ رکھنے لگا۔ تب رفقہ نے یعقوب کو رائے دی کہ وہ یہاں سے اپنے ماموں لابان کے پاس کچھ دنوں کے لئے چلا جائے۔ یعقوب ماموں کے یہاں پہنچا اور وہیں کچھ مدت گذاری اور یکے بعد دیگرے لابان کی دونوں لڑکیوں لئیہ اور راحیل سے شادی کر لی۔ (پیدائش باب ۲۹۔ آیت ۱۔۲۵)

یہ روایت اگرچہ اپنے مضامین کے اعتبار سے بہت زیادہ ناقابل اعتماد ہے اور اس میں جو اخلاقی زندگی پیش کی گئی ہے وہ تورات کی دوسری محرف روایات کی طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے خاندان کے شایانِ شان بھی نہیں ہے مگر اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی شادی ان کے ماموں کے یہاں ہوئی اور وہ ایک عرصہ تک ان کے پاس رہے، اور عیسو بھاگ کر اپنے چچا اسمٰعیل علیہ السلام کے پاس چلے گئے اور وہاں ان کی صاحبزادی بشامہ یا بسمہ یا محلاۃ (جو بھی نام صحیح ہو) سے شادی کر لی، اور ان کے علاوہ بھی شادیاں کیں، اور اپنے خاندان کو لے کر سعیر (یا ساعیر) کو اپنا وطن بنا لیا، اور یہاں ادوم کے نام سے مشہور ہوئے اور اس لئے ان کی نسل بنی ادوم کے نام سے مشہور ہوئی اور اس لئے ان کی نسل بنی ادوم کے نام سے مشہور ہوئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حق الیقین کی طلب

گذشتہ سطور میں چونکہ حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق علیہما السلام کا ذکر آ گیا تھا اس لئے ان سے متعلق واقعات کو تفصیل سے بیان کر دینا مناسب سمجھا گیا تاکہ واقعات کے تسلسل میں انتشار پیدا نہ ہو، نیز یہ واقعات بھی درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی زندگی سے متعلق ہیں اس لئے ان کا تذکرہ بے محل نہیں ہے اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باقی حالات قابل توجہ ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حقائق اشیاء کی جستجو اور طلب کا طبعی ذوق تھا، اور وہ ہر شے کی حقیقت تک پہنچنے کی سعی کو اپنی زندگی کا خاص مقصد سمجھتے تھے تاکہ ان کے ذریعہ ذات واحد (اللہ جل جلالہ) کی ہستی اس کی وحدانیت اور اس کی قدرت کاملہ کے متعلق علم الیقین کے بعد حق الیقین حاصل کر سکیں۔

آزر، جمہور اور نمرود کے ساتھ مناظروں میں ان کے اس طبعی ذوق کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "حیات بعد الممات" یعنی مر جانے کے بعد جی اٹھنے کے متعلق خدائے تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ کس طرح ایسا کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا اے ابراہیم! کیا تم اس مسئلہ پر یقین و ایمان نہیں رکھتے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فوراً جواب دیا کیوں نہیں! میں بلا توقف اس پر ایمان رکھتا ہوں لیکن میرا یہ سوال ایمان و یقین کے خلاف اسلئے نہیں ہے کہ میں علم الیقین کے ساتھ ساتھ عین الیقین اور حق الیقین کا خواستگار ہوں۔ میری تمنا یہ ہے کہ تو مجھ کو آنکھوں سے مشاہدہ کرا دے کہ "حیات بعد الممات" کی شکل کیا ہوگی، تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا اگر تم کو اس کے مشاہدہ کی طلب ہے تو چند پرند لو، اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سامنے والے پہاڑ پر ڈال دو اور پھر فاصلہ پر کھڑے ہو کر ان کو پکارو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا جب ابراہیم علیہ السلام نے ان کو آواز دی تو ان سب کے اجزاء علیحدہ علیحدہ ہو کر فوراً اپنی اپنی شکل پر آ گئے اور زندہ ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس اڑتے ہوئے چلے آئے۔

سورۂ بقرہ میں اس واقعہ کو اس معجزانہ بلاغت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَى قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلَى

وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ط قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا وَّاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ (البقرہ ع ۳۵)

(یاد کر) جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اے میرے پروردگار! مجھے دکھلا تو کس طرح مردوں کو زندہ کردیگا کہا کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ کہا کیوں نہیں لیکن دلی اطمینان چاہتا ہوں، کہا پس چار پرندلے پھر ان کو اپنے ساتھ مانوس کر پھر رکھ دے ہر ہر پہاڑ پر ان کے جزء جزء ڈال کر پھر ان کو بلا وہ آئیں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور تو جان بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا۔

سلف صالحین سے ان آیات کی تفسیر یہی ثابت ہے اور بعض روایات حدیثی بھی اس کی تائید کرتی ہیں، اس لئے جن حضرات نے اس مسئلہ کی غرابت کے پیش نظر ان آیات میں طرح طرح کی تاویلات کر کے دوراز کار باتیں بیان کی ہیں وہ نا قابل التفات ہیں ہم اس سے قبل واضح کر چکے ہیں کہ جس طرح یہ راہ غلط ہے کہ ہر موقعہ پر اچنبھوں اور عجوبہ کاریوں کی داستاں سرائی ہو اور رطب ویابس روایات کے اعتماد پر بے اصل باتوں پر یقین کیا جائے اسی طرح یہ بھی گمراہی کی راہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے متعلق جن خوارق عادات (معجزات) کا ذکر نصوص قرآنی اور صحیح روایات سے معلوم ہو جائے ان کا بھی اس لئے انکار کیا جائے یا باطل تاویلات گھڑی جائیں کہ مدعیان عقل وفلسفہ (مادیین) ہمارے اس یقین وعلم پر ٹھٹھا کریں گے اور اس کا مذاق اڑائیں گے۔

بنی قطورہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہؓ کے علاوہ ایک اور شادی کی تھی ان بی بی کا نام قطورہ تھا، ان کے بطن سے ابراہیم علیہ السلام کے چھ (۶) بیٹے پیدا ہوئے۔

اور ابراہیم علیہ السلام نے ایک اور جورو کی جسکا نام قتورہ تھا، اور اس سے زمران یقسان مدان، مدیان، یشباق اور شوحا پیدا ہوئے اور یقسان سے صبا اور دوان پیدا ہوئے اور ان کے فرزند اسوری اور لطوسی اور لومی تھے اور مدیان کے فرزند عیفہ، عفر، حنوک، ابیداع اور دعا تھے، یہ سب بنی قطورہ تھے۔ (پیدائش ۲۵۔ آیت ۱۔ ۴)

مدین یا مدیان" کی نسل نے اپنی آبادی اپنے باپ کے نام پر مدین کے نام سے بسائی اور یہ اصحاب مدین کہلائے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ودان کی نسل اصحاب الایکہ کے نام سے مشہور ہوئی یہی اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ کے نام سے مشہور ہوئی یہی اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ دو قومیں ہیں جن میں ہدایت وسعادت کی پیغامبری کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ یہ قتادہ کی روایت اور بعض مورخین حاضر کی تحقیق ہے اس کے خلاف حافظ ابن کثیر اصحاب مدین وایکہ کو ایک ہی تسلیم کرتے ہیں اور یہی تحقیق راجح ہے، تفصیل حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعہ میں آئے گی۔

حضرت لوط علیہ السلام

لوط و ابراہیم علیہ السلام

صفحات گذشتہ میں ذکر آچکا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادر زادہ ہیں، ان کے والد کا نام ہاران تھا، حضرت لوط علیہ السلام کا بچپن حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے زیر سایہ گذرا اور ان کی نشونما حضرت ابرہیم علیہ السلام کی ہی آغوش تربیت کی رہین منت تھی۔

اسی لئے وہ اور حضرت سارہ "ملت ابراہیمی" کے پہلے مسلم اور "السابقون الاولون" میں داخل ہیں۔

فَآمَنَ لَهُ لُوطٌ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَى رَبِّي

پس ایمان لایا لوط ابراہیم (کے دین) پر اور کہا میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رب کی جانب۔

یہ اور ان کی بی بی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرتوں میں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر میں تھے تو اس وقت بھی یہ ہم سفر تھے۔

تورات میں ہے کہ مصر کے قیام میں چونکہ دونوں کے پاس کافی ساز و سامان تھا اور مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ تھے اس لئے ان کے چرواہوں اور محافظوں کے درمیان بہت زیادہ کشمکش رہتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چرواہے چاہتے تھے کہ اس چراگاہ اور سبزہ زار سے پہلے ہمارے ریوڑ فائدہ اٹھائیں اور حضرت لوط علیہ السلام کے چرواہوں کی خواہش ہوتی کہ اول ہمارا حق سمجھا جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت حال کا اندازہ کر کے حضرت لوط علیہ السلام سے مشورہ کیا، اور دونوں کی صلاح سے یہ طے پایا کہ باہمی تعلقات کی خوشگواری اور دائمی محبت والفت کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام مصر سے ہجرت کر کے شرق اردن کے علاقہ سدوم اور عامورہ چلے جائیں اور وہاں رہ کر دین حنیف کی تبلیغ کرتے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رسالت کا پیغام حق سناتے رہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پھر واپس فلسطین چلے جائیں اور وہاں رہ کر اسلام کی تعلیم و تبلیغ کو سر بلند کریں۔

سدوم

اردن کی وہ جانب جہاں آج بحر میت یا بحر لوط واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جس میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں آباد تھیں، اسکے قریب بسنے والوں کا یہ اعتقاد ہے کہ پہلے یہ تمام حصہ جو اب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانہ میں خشک زمین

---

1. آیۃ مُهَاجِرٌ إِلَى رَبِّي میں وطنی اور روحانی دونوں قسم کی ہجرتیں مراد ہیں، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے استھ خدا کے دین کی خاطر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا وطنی ہجرت ہے اور باپ دادا کے قدیم مذہب (مظاہر پرستی) کو، چھوڑ کر ملت حنفی کو اختیار کر لینا روحانی ہجرت ہے۔

تھی اور اس پر شہر آباد تھے، سدوم وعاموره کی آبادیاں اسی مقام پر تھیں۔ یہ مقام شروع سے سمندر نہیں تھا بلکہ جب قوم لوط پر عذاب آیا اور اس سرزمین کا تختہ الٹ دیا گیا اور سخت زلزلے اور بھونچال آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی ابھر آیا، اسی لئے اس کا نام بحر میت اور بحر لوط ہے۔ (بستانی جلد ۹ ص ۔ ۵۳)

یہ صحیح ہو یا غلط بہر حال یہ مسئلہ حقیقت رکھتا ہے کہ اسی بحر میت کے ساحل پر وہ حادثہ رونما ہوا جو قوم لوط کے عذاب سے موسوم ہے اور جو گذشتہ دو سال کی اثری تحقیق نے بحر میت کے ساحل پر لوط علیہ السلام کی بستیوں کے بعض تباہ شدہ آثار ہویدا کر کے اس علم و یقین کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے جس کا اعلان ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن عزیز نے کر دیا تھا۔

قوم لوط

لوط علیہ السلام نے جب سدوم میں آکر قیام کیا تو دیکھا کہ یہاں کے باشندے فواحش اور معصیتوں میں اس قدر مبتلا ہیں کہ الامان، الحفیظ، دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں تھی جو ان میں موجود نہ ہو اور کوئی خوبی ایسی نہیں تھی جو ان میں پائی جاتی ہو، دنیا کی سرکش، متمرد، اور بد اخلاق و بد اطوار اقوام کے دوسرے عیوب و فواحش کے علاوہ یہ قوم ایک خبیث عمل کی موجد تھی، یعنی اپنی نفسیاتی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وہ عورتوں کی بجائے امرد لڑکوں سے اختلاط رکھتے تھے دنیا کی قوموں میں اس عمل کا اس وقت تک قطعاً کوئی رواج نہ تھا، یہی بد بخت قوم ہے جس نے اس ناپاک عمل کی ایجاد کی، اس عمل کا نام "لواطت" مشہور ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ شرارت، خباثت اور بے حیائی یہ تھی کہ وہ اپنی اس بدکرداری کو عیب نہیں سمجھتے تھے، اور علی الاعلان فخر و مباہات کے ساتھ اس کو کرتے رہتے تھے۔

> وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِيْنَ ۝ إِنَّكُمْ لَتَأْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝ (الاعراف ع ۱۰)
>
> اور (یاد کرو) لوط کا واقعہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسے فحش کام میں مشغول ہو جس کو دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ یہ کہ بلاشبہ تم عورتوں کی بجائے اپنی شہوت کو مردوں سے پوری کرتے ہو یقیناً تم حد سے گذرنے والے ہو۔

عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ میں عبرانی ادب کی ایک کتاب میں ان کی بعض بد اعمالیوں کا حال پڑھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل سدوم کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ باہر سے آنیوالے تاجروں اور سوداگروں کے مال کو ایک نئے اور اچھوتے انداز سے لوٹ لیا کرتے تھے، چنانچہ ان کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی سوداگر باہر سے آکر سدوم میں مقیم ہوتا تو اس کے مال کو دیکھنے کے بہانے سے ہر شخص تھوڑی تھوڑی چیزیں اٹھاتا اور لے کر چل دیتا اور تاجر بیچارہ حیران و پریشان ہو کر رہ جاتا اب اگر اس نے اپنے ضیاع مال کا شکوہ کیا اور رونے دھونے لگا تو ان لٹیروں میں سے ایک آتا اور لوٹی ہوئی دو ایک چیزیں دکھلا کر کہنے لگتا کہ بھائی میں تو یہ لے گیا تھا، اور

تمہاری یہ چیز موجود ہے، وہ رنجیدہ آواز میں کہتا کہ میں اس کو لے کر کیا کروں گا جہاں میرا سارا مال لٹ گیا وہاں یہ بھی سہی، جا تو ہی اپنے پاس رکھ، جب یہ معاملہ ختم ہو جاتا تو اب دوسرا آتا اور وہ بھی اسی طرح کوئی معمولی سی چیز دکھا کر وہی کہتا جو پہلے نے کہا تھا اور سوداگر رنج و غم اور غصہ میں اس سے بھی پہلی بات لوٹا کر کہہ دیتا۔ اسی طرح سب اس کا مال ہضم کر جاتے اور سوداگر کو لوٹ کھسوٹ کر بھگا دیتے۔

اسی کتاب میں یہ عجیب قصہ بھی نقل کیا ہے کہ ابراہیم ؑ اور سارہؓ نے ایک مرتبہ حضرت لوط کی عافیت و خیر معلوم کرنے کیلئے اپنے خانہ زاد الیعزر دمشقی کو سدوم بھیجا، یہ جب بستی کے قریب پہنچا تو اجنبی سمجھ کر ایک سدومی نے اس کے سر پر پتھر کھینچ مارا الیعزر کے سر سے خون جاری ہو گیا، تب آگے بڑھ کر سدومی کہنے لگا کہ میرے پتھر کی وجہ سے یہ تیرا سر سرخ ہوا ہے لہذا مجھے اس کا معاوضہ ادا کر، اور اس مطالبہ کے لئے کھینچتا ہوا سدوم کی عدالت میں لے گیا حاکم سدوم نے مدعی کا بیان سن کر کہا کہ بیشک الیعزر کو سدومی کے پتھر مارنے کی اجرت دینی چاہیے، الیعزر یہ سن کر غصہ میں آ گیا اور ایک پتھر اٹھا کر حاکم کے سر پر دے مارا اور کہنے لگا کہ میرے پتھر مارنے کی جو اجرت ہے وہ تو اس سدومی کو دیدینا اور یہ کہہ کر وہاں سے بھاگ گیا۔

یہ واقعات صحیح ہوں یا غلط لیکن ان سے یہ روشنی ضرور پڑتی ہے کہ اہل سدوم اس قدر ظلم، فحش، بے حیائی، بد اخلاقی اور فسق و فجور میں مبتلا تھے کہ اس زمانہ کی قوموں میں ان کی جانب اس قسم کے واقعات عام طور پر منسوب کئے جاتے تھے۔

حضرت لوط اور تبلیغ حق

ان حالات میں حضرت لوط ؑ نے ان کو ان کے بے حیائیوں اور خباثتوں پر ملامت کی اور شرافت و طہارت کی زندگی کی رغبت دلائی، اور حسن خطابت، لطافت اور نرمی کے ساتھ جو ممکن طریقے سمجھانے کے ہو سکتے تھے ان کو سمجھایا اور موعظت و نصیحت کی اور گذشتہ اقوام کی بداعمالیوں کے نتائج و ثمرات بتا کر عبرت دلائی، مگر ان بدبختوں پر مطلق اثر نہ پڑا بلکہ اس کا یہ الٹا اثر ہوا کہ کہنے لگے:

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُم مِّن قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ○ (اعراف ع ۱۰)

لوط کی قوم کا جواب اس کے سوائے کچھ نہ تھا کہ کہنے لگے ان (لوط اور اس کے خاندان) کو اپنے شہر سے نکال دو، یہ بے شک بہت ہی پاک لوگ ہیں۔

"بیشک یہ پاک لوگ ہیں" قوم لوط کا یہ مذاقیہ فقرہ تھا۔ گویا حضرت لوط ؑ اور ان کے خاندان پر طنز کرتے اور ان کو ٹھٹھا اڑاتے تھے کہ بڑے پاکباز ہیں ان کا ہماری بستی میں کیا کام یا ناصح مشفق کی مربیانہ نصیحت سے غیظ و غضب میں آ کر کہتے تھے کہ اگر ہم ناپاک اور بے حیا ہیں اور وہ بڑے پاک باز ہیں تو ان کا ہماری بستی سے کیا واسطہ ان کو یہاں سے نکالو، حضرت لوط ؑ نے پھر ایک مرتبہ بھری محفل میں ان کو نصیحت کی اور فرمایا: تم کو اتنا بھی احساس نہیں رہا ہے کہ یہ سمجھ سکو کہ مردوں کے ساتھ بے حیائی کا تعلق لوٹ مار، اور اسی قسم کی بداخلاقیاں بہت

برے اعمال ہیں، تم یہ سب کچھ کرتے ہو اور بھری محفلوں اور مجلسوں میں کرتے ہو اور شرمندہ ہونے کے بجائے بعد میں ان کا ذکر اس طرح سناتے ہو کہ گویا یہ کارنمایاں ہیں جو تم نے انجام دیئے ہیں۔

أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنْكَرَ (عنکبوت ع ۳)

کیا تم ہی وہ نہیں ہو کہ تم مردوں سے بد عملی کرتے، لوگوں کی راہ مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں اور اہل و عیال کے روبرو فواحش کرتے ہو۔

قوم نے اس نصیحت کو سنا تو غم و غصہ سے تلملا اٹھی اور کہنے لگی: لوط! بس یہ نصیحتیں اور عبرتیں ختم کر اور اگر ہمارے ان اعمال سے تیرا خدا ناراض ہے تو وہ عذاب لا کر دکھا جس کا ذکر کر کے بار بار ہم کو ڈراتا ہے اور اگر تو واقعی اپنے قول میں سچا ہے تو ہمارا تیرا فیصلہ ہو جانا ہی اب ضروری ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللَّهِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ○ (عنکبوت ع ۳)

پس اس (لوط) کی قوم کا جواب اسکے سوائے کچھ نہ تھا کہ وہ کہنے لگے تو ہمارے پاس اللہ کا عذاب لے آ، اگر تو سچا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ملائکۃ اللہ

ادھر یہ ہو رہا تھا اور دوسری جانب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جنگل میں سیر کر رہے تھے انھوں نے دیکھا کہ تین اشخاص سامنے کھڑے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت متواضع اور مہماں نواز تھے اور ہمیشہ ان کا دستر خوان مہمانوں کے لئے وسیع تھا، اس لئے تینوں کو دیکھ کر وہ بیحد مسرور ہوئے اور ان کو اپنے گھر لے گئے اور بچھڑا ذبح کر کے تکے بنائے اور بھون کر مہمانوں کے سامنے پیش کئے مگر انھوں نے کھانے سے انکار کیا یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ یہ کوئی دشمن ہیں جو حسب دستور کھانے سے انکار کر رہے ہیں اور کچھ خائف ہوئے کہ آخر یہ کون ہیں؟

مہمانوں نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اضطراب دیکھا تو ان سے ہنس کر کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں! ہم خدا کے فرشتے ہیں اور قوم لوط کی تباہی کیلئے بھیجے گئے ہیں اس لئے سدوم جا رہے ہیں۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اطمنان ہو گیا کہ یہ دشمن نہیں ہیں بلکہ ملائکۃ اللہ ہیں تو اب ان کی رقت قلب، جذبۂ ہمدردی اور محبت و شفقت کی فراوانی غالب آئی اور انھوں نے قوم لوط علیہ السلام کی جانب سے جھگڑنا شروع کر دیا اور فرمانے لگے کہ تم اس قوم کو کیسے برباد کرنے جا رہے ہو جس میں لوط جیسا خدا کا برگزیدہ نبی موجود ہے اور وہ میرا برادر زادہ بھی ہے، اور ملت حنیف کا پیرو بھی فرشتوں نے کہا: ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں مگر خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ قوم لوط اپنی سرکشی بد عملی، بے حیائی اور فواحش پر اصرار کی وجہ سے ضرور ہلاک کی جائے گی، اور لوط اور اس کا خاندان اس عذاب سے محفوظ رہے گا البتہ لوط کی بیوی قوم کی حمایت اور ان کی بداعمالیوں اور بدعقیدگیوں میں شرکت کی وجہ سے قوم لوط ہی کے ساتھ عذاب پائے گی۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ○ إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ○ يَآإِبْرَاهِيْمُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا إِنَّهٗ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَإِنَّهُمْ آتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ○ (سورۂ ہود ع ۷)

پھر جب ابراہیم سے خوف جاتا رہا اور اس کو ہماری بشارت (ولادت اسحق) کی پہنچ گئی تو وہ ہم سے قوم لوط کے متعلق جھگڑنے لگا، بے شک ابراہیم بردبار غمخوار، رحیم ہے، اے ابراہیم! اس معاملہ میں نہ پڑ بلا شبہ تیرے رب کا حکم آچکا ہے اور بلاشبہ ان پر عذاب آنے والا ہے جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا،

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ○ قَالُوْآ إِنَّآ أُرْسِلْنَا إِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ○ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ○ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ○

(الذاریات ع ۲)

ابراہیم نے کہا "اے خدا کے بھیجے ہوئے فرشتو! تم کس لئے آئے ہو؟ انھوں نے کہا "ہم مجرم قوم کی جانب بھیجے گئے ہیں تا کہ ہم ان پر پتھروں کی بارش کریں یہ نشان کردیا گیا ہے تیرے رب کی جانب سے حد سے گذرنے والوں کیلئے۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ إِبْرَاهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْآ إِنَّا مُهْلِكُوْآ أَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوْا ظَالِمِيْنَ ○ قَالَ إِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ط قَالُوْا نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَأَهْلَهٗٓ إِلَّا امْرَأَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِيْنَ ○ (عنکبوت ع ۲)

اور جب ہمارے فرشتے، ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے کہنے لگے بے شک ہم ہلاک کرنے والے ہیں اس (سدوم) قریہ کے بسنے والوں کو بلا شبہ اس کے باشندے ظالم ہیں ابراہیم نے کہا کہ اس بستی میں تو لوط ہے فرشتوں نے کہا ہمیں خوب معلوم ہے جو اس بستی میں آباد ہیں، ہم البتہ لوط کو اور اس کے خاندان کو نجات دیں گے مگر اس کی بی بی کو نہیں کہ وہ بھی بستی میں رہ جانے والوں کے ساتھ ہے۔

غرض حضرت لوط کے ابلاغ حق، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا قوم پر مطلق کچھ اثر نہ ہوا اور وہ اپنی بداخلاقیوں پر اسی طرح قائم رہی حضرت لوط نے یہاں تک غیرت دلائی کہ تم ہی بات کو نہیں سوچتے کہ میں رات دن جو اسلام اور صراط مستقیم کی دعوت و پیغام کیلئے تمہارے ساتھ حیران و سرگرداں ہوں کیا کبھی میں نے تم سے اس سعی و کوشش کا ثمرہ طلب کیا، کیا کوئی اجرت مانگی کسی نذر و نیاز کا طالب ہوا؟ میرے پیش نظر تو تمہاری دینی و دنیوی سعادت و فلاح کے سوائے اور کچھ بھی نہیں ہے مگر تم ہو کہ مطلق توجہ نہیں کرتے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ الْمُرْسَلِيْنَ ○ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوْهُمْ لُوْطٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ○ إِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ○ وَمَآ أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ

أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ (الشعراء ع ۹)

جھٹلایا قوم لوط نے پیغمبروں کو جب کہ کہا ان کے بھائی لوط نے کیا تم نہیں ڈرتے بے شک میں تمہارے لئے پیغامبر ہوں امانت والا پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو اور میری پیروی کرو اور میں تم سے (اس نصیحت پر) اجرت نہیں مانگتا، میرا اجر اللہ رب العلمین کے سوائے کسی کے پاس نہیں ہے۔

مگر ان کے تاریک دلوں پر اس کہنے کا بھی مطلق کچھ اثر نہ ہوا اور وہ حضرت لوط کو "اخراج" اور سنگساری کی دھمکیاں دیتے رہے، جب نوبت یہاں تک پہنچی اور ان کی سیہ بختی نے کسی طرح اخلاقی زندگی پر آمادہ نہ ہونے دیا، تب ان کو بھی وہی پیش آیا جو خدا کے بنائے ہوئے قانون جزا کا یقینی اور حتمی فیصلہ ہے یعنی بدکرداریوں پر اصرار کی سزا بربادی و ہلاکت، غرض ملائکۃ اللہ حضرت ابراہیم کے پاس سے روانہ ہو کر سدوم پہنچے اور لوط کے یہاں مہمان ہوئے یہ اپنی شکل وصورت میں حسین وخوبصورت اور عمر میں نوجوان لڑکوں کی شکل وصورت میں تھے، حضرت لوط نے ان مہمانوں کو دیکھا تو گھبرا گئے اور ڈرے کہ بد بخت قوم میرے ان مہمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرے گی، کیونکہ ابھی تک ان کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ خدا کے پاک فرشتے ہیں۔

ابھی حضرت لوط اسی حیص وبیص میں تھے کہ قوم کو خبر لگ گئی اور لوط کے مکان پر چڑھ آئے اور مطالبہ کرنے لگے کہ تم ان کو ہمارے حوالہ کرو، حضرت لوط نے بہت سمجھایا، اور کہا کیا تم میں کوئی بھی سلیم فطرت انسان "رجل رشید" نہیں ہے کہ وہ انسانیت کو برتے اور حق کو سمجھے؟ تم کیوں اس لعنت میں گرفتار ہو، اور خواہشات نفس کے ایفاء کیلئے فطری طریق عمل کو چھوڑ کر اور حلال طریقہ سے عورتوں کو رفیقۂ حیات بنانے کی جگہ اس ملعون بے حیائی کے درپے ہو، اے کاش میں "رکن شدید" کی زبردست حمایت حاصل کر سکتا۔

حضرت لوط کی اس پریشانی کو دیکھ کر فرشتوں نے کہا، آپ ہماری ظاہری صورتوں کو دیکھ کر گھبرائیے نہیں ہم ملائکہ عذاب ہیں اور خدا کے قانون "جزائے اعمال" کا فیصلہ ان کے حق میں اٹل ہے وہ اب ان کے سر سے ٹلنے والا نہیں، آپ اور آپ کا خاندان عذاب سے محفوظ رہے گا مگر آپ کی بیوی ان ہی بے حیاؤں کی رفاقت میں رہے گی اور تمہارا ساتھ نہ دے گی۔

آخر عذاب الٰہی کا وقت آپہنچا ابتداء شب ہوئی تو ملائکہ کے اشارہ پر حضرت لوط اپنے خاندان سمیت دوسری جانب سے نکل کر سدوم سے رخصت ہوگئے اور ان کی بیوی نے ان کی رفاقت سے انکار کر دیا اور راستہ ہی سے لوٹ کر سدوم واپس آ گئی، آخر شب ہوئی تو اول ایک ہیبت ناک چیخ نے اہل سدوم کو تہ وبالا کر دیا اور پھر آبادی کا تختہ اوپر اٹھا کر الٹ دیا گیا اور اوپر سے پتھروں کی بارش نے ان کا نام ونشان تک مٹا دیا اور وہی ہوا جو گذشتہ قوم کی نافرمانی اور سرکشی کا انجام ہو چکا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوْطِ ِالْمُرْسَلُوْنَ ○ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ○ قَالُوْا بَلْ جِئْنَاكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ○ وَأَتَيْنَاكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّا لَصَادِقُوْنَ ○ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ

بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنكُمْ أَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ○ وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ ذٰلِكَ الْأَمْرَ أَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ○ وَجَآءَ أَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○ قَالَ إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ○ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ○ قَالُوْٓا أَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعَالَمِيْنَ ○ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْٓ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِيْنَ ○ لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ○ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ○ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ○ (الحجر ۱۵، آیت ۶۱-۷۵)

اور پھر جب ایسا ہوا کہ بھیجے ہوئے (فرشتے) خاندان لوط کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا تم لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہو انھوں نے کہا نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ ہم تمہارے پاس وہ بات لے کر آئے ہیں، جس میں لوگ شک کیا کرتے تھے (یعنی ہلاکت کے ظہور کی خبر جس کا لوگوں کو یقین نہ تھا) ہمارا آنا ایک امر حق کے لئے ہے اور ہم اپنے بیان میں سچے ہیں پس چاہئے کہ کچھ رات رہے اور اپنے گھروں کے لوگوں کو لے کر نکل جاؤ اور ان کے پیچھے قدم اٹھاؤ، اور اس بات کا خیال رکھو کہ کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے جہاں جانے کا حکم دیا گیا ہے (اسی طرف رخ کئے چلے جائیں) غرض کہ ہم نے لوط پر حقیقت حال واضح کر دی کہ ہلاکت کا ظہور ہونے والا ہے اور باشندگان شہر کی بیخ و بنیاد صبح ہوتے ہوتے اکھڑ جانے والی ہے اور اس (اثناء میں ایسا ہوا کہ) شہر کے لوگ خوشیاں مناتے ہوئے آپہنچے، لوط نے کہا دیکھو یہ (نئے آدمی) میرے مہمان ہیں تم میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو، تم میری رسوائی کے کیوں درپے ہوگئے ہو؟" انھوں نے کہا کیا ہم نے تجھے اس بات سے نہیں روک دیا تھا کہ کسی قوم کا آدمی ہو لیکن اپنے یہاں نہ ٹھہراؤ" لوط نے کہا اگر ایسا ہی ہے تو دیکھو یہ میری بیٹیاں (کھڑی) ہیں (یعنی باشندگان شہر کی بیویاں جن کی طرف وہ ملتفت نہیں ہوتے تھے) ان کی طرف ملتفت ہو" (تب فرشتوں نے لوط سے کہا) تمہاری زندگی کی قسم، یہ لوگ تو اپنی بدمستیوں میں کھوئے گئے ہیں (تمہاری باتیں ماننے والے نہیں) غرضیکہ سورج نکلتے نکلتے ایک ہولناک آواز نے انہیں آلیا، پس ہم نے وہ بستی زیروزبر کر ڈالی اور پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی ان پر بارش کی بلاشبہ اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو (حقیقت کی) پہچان رکھنے والے ہیں۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ○ وَجَآءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُوْنَ إِلَيْهِ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ قَالَ يَاقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِيْ فِيْ ضَيْفِيْ أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ○ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ وَّإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ○ قَالَ لَوْ أَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِيْٓ إِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ○ قَالُوْا

يَالُوْطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا إِلَيْكَ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا امْرَأَتَكَ إِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ أَصَابَهُمْ إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ○ فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ○ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ○ (ھود ۱۱، آیت ۷۷_۸۳)

اور پھر جب ایسا ہوا کہ ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے تو وہ ان کے آنے سے خوش نہ ہوا اور ان کی موجودگی نے اسے پریشان کر دیا وہ بولا آج اک دن تو بڑی مصیبت کا دن ہے! اور اس کی قوم کے لوگ (اجنبیوں کے آنے کی خبر سن کر) دوڑتے ہوئے آئے وہ پہلے سے برے کاموں کے عادی ہو رہے تھے لوط نے کہا "لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں (یعنی بستی کی عورتیں جنھیں وہ اپنی بیٹیوں کی جگہ سمجھتا تھا اور جنھیں لوگوں نے چھوڑ رکھا تھا) یہ تمہارے لئے جائز اور پاک ہیں، پس (ان کی طرف ملتفت ہو، دوسری بات کا قصد نہ کرو اور) اللہ سے ڈرو میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوانہ کرو کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟" ان لوگوں نے کہا "تجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تیری ان بیٹیوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں اور تو اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں "لوط نے کہا "کاش تمہارے مقابلہ کی مجھے طاقت ہوتی یا کوئی اور سہارا ہوتا جس کا آسرا پکڑ سکتا" (تب) مہمانوں نے کہا "اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں (گھبرانے کی کوئی بات نہیں) یہ لوگ کبھی تجھ پر قابو نہ پا سکیں گے تو یوں کر کہ جب رات کا ایک حصہ گذر جائے تو اپنے گھر کے آدمیوں کے ساتھ لیکر نکل چل اور تم میں سے کوئی ادھر نہ دیکھے (یعنی کسی بات کی فکر نہ کرے) مگر ہاں تیری بیوی (ساتھ دینے والی نہیں، وہ پیچھے رہ جائے گی، اور) جو کچھ ان لوگوں پر گذرتا ہے وہ اس پر بھی گذرے گا، ان لوگوں کے لئے عذاب کا مقررہ وقت صبح کے آنے میں کچھ دیر نہیں" پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا تو (اے پیغمبر!) ہم نے اس (بستی) کی تمام بلندیاں پستی میں بدل دیں (یعنی بستی کو الٹ دیا) اور زمین کے برابر کر دیا) اور اس پر آگ میں پکے ہوئے پتھر لگاتار برسائے تا کہ تیرے پروردگار کے حضور (اس غرض سے) نشانی کئے ہوئے تھے، یہ (بستی) ان ظالموں سے (یعنی اشرار مکہ سے) کچھ دور نہیں ہے۔ (یہ اپنی سیر و سیاحت میں وہاں سے گذرتے رہتے ہیں اور اگر چاہیں تو اس سے عبرت پکڑ سکتے ہیں)

فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهٗٓ أَجْمَعِيْنَ ○ إِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغَابِرِيْنَ ○ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِيْنَ ○ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ○ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً وَّمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ○ (الشعراء ع۹)

پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو سب کو مگر ایک بڑھیا رہ گئی رہنے والوں میں۔ پھر اٹھا مارا ہم نے ان دوسروں کو اور برسایا ان پر ایک برساؤ، سو کیا برا برساؤ تھا ان ڈرائے ہوؤں کا البتہ اس بات میں نشانی ہے، اور ان میں بہت لوگ نہیں تھے ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَأَةَ نُوْحٍ وَّامْرَأَةَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِيْنَ ○ (سورۃ التحریم ع۲)

اللہ نے بتلائی ایک مثال منکروں کے واسطے عورت نوح کی اور عورت لوط کی گھر میں تھیں دونوں دو نیک بندوں کے ہمارے نیک بندوں میں سے پھر انھوں نے ان سے خیانت کی پھر وہ کام نہ آئے ان کے اللہ کے ہاتھ سے کچھ بھی اور حکم ہوا کہ چلی جاؤ دوزخ میں جانے والوں کے ساتھ۔

مسائل

۱ مسطورۂ بالا آیات میں حضرت لوط علیہ السلام کے یہ مقولے مذکور ہیں هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ یعنی حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کی مزاحمت اور مہمانوں سے متعلق مطالبہ سے تنگ آکر یہ فرمایا کہ "تم ان مہمانوں سے تعرض نہ کرو اگر نفس کی فطری خواہش پوری کرنا چاہتے ہو تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمہارے لئے پاک ہیں" اس کا کیا مطلب ہے؟ ایک با عصمت و باعزت انسان اور پھر وہ بھی نبی معصوم کس طرح یہ گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنی باعصمت لڑکیوں کو ایسے بے حیا اور خبیث انسانوں کے سامنے پیش کرے؟ اس سوال کے حل میں علماءِ محققین نے مختلف جواب دیئے ہیں۔"

الف حضرت لوط علیہ السلام نبی ہیں اور ہر ایک نبی اپنی قوم کا روحانی باپ ہوتا ہے قوم مسلمان ہو کر اسکی اطاعت گذار ثابت ہو، یا انکار کر کے متمرد و منحرف دونوں صورتوں میں وہ اسکی "امت" میں داخل ہے اگرچہ پہلی امت اجابت ہے اور دوسری امت دعوت اور اسلئے تمام امت اسکی اولاد ہوتی ہے اور نبی اور رسول اسکا روحانی باپ۔

لہٰذا حضرت لوط علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ بد بختو! تمہارے گھروں میں یہ سب میری بیٹیاں تمہاری رفیقۂ حیات ہیں اور تمہارے لئے حلال پھر تم ان کو چھوڑ کر اس ملعون اور خبیث کام پر اصرار کرتے ہو ایسا نہ کرو "العیاذ للہ" یہ مقصد نہ تھا کہ وہ اپنی صلبی لڑکیاں ان کو پیش فرما رہے تھے۔

ب تورات اور دیگر روایات سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو "اسحٰق" کی بشارت دے کر قوم لوط کو ہلاک کرنے آئے تھے تین تھے اس لئے یہ ناممکن تھا کہ تین افراد کے لئے پوری بستی خواہش مند ہو جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے بلکہ اصل بات یہ تھی کہ اس قوم میں دو سردار تھے اور انھوں نے ہی لوط علیہ السلام کے مہمانوں کا مطالبہ کیا تھا، باقی قوم اپنی اس عام بد کرداری کی وجہ سے ان کی حمایت میں جمع ہو گئی تھی اور چونکہ حضرت لوط کی دو بیٹیاں کنواری موجود تھیں اس لئے انھوں نے ان دونوں سرداروں کو سمجھایا کہ تم اپنے اس خبیث و شنیع مطالبہ سے باز آجاؤ، اور میں اس کے لئے تیار ہوں کہ اپنی دونوں لڑکیوں کا نکاح تم سے کر دوں مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا اور کہنے لگے، لوط! تجھے معلوم ہے کہ ہم عورتوں کی جانب رغبت نہیں رکھتے۔

ت حضرت لوط علیہ السلام نے بے شک اپنی بیٹیوں ہی کے متعلق یہ جملہ فرمایا تھا مگر اسکی حیثیت اس بزرگ کے مقولہ کی طرح ہے جو کسی کو ناحق پٹتا ہوا دیکھ کر ظالم مارنے والے سے یہ کہے کہ اسکو نہ مار، اسکے عوض مجھ کو مار لے، حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کبھی ایسی جرأت نہیں کر سکے گا کیوں کہ وہ اس کا چھوٹا ہے یا ماتحت۔

پس جس طرح اس شخص کا مقصد مارنے والے کو عار اور شرم دلانا ہوتا ہے اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو شرم اور عار دلانے اور اس قبیح فعل پر ذلیل اور نادم کرنے کے لئے یہ جملہ فرمایا اور ان کو یہ یقین تھا کہ نہ یہ بد بخت اس طرف راغب ہوں گے اور نہ وہ عملاً ایسا کریں گے۔

امام رازی، اصفہانی اور ابو سعود اسی توجیہ کو پسند فرماتے ہیں اور عبد الوہاب نجار مصری کی بھی یہی رائے ہے مگر میرے نزدیک پہلی توجیہ زیادہ صحیح اور قابل قبول ہے اور علامہ عبد الوہاب کا اس کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "یہ قول اس لئے کمزور ہے کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام ان کافر عورتوں کے باپ تسلیم کئے جائیں" اس لئے کہ ہم شروع جواب ہی میں تصریح کر چکے ہیں کہ "نبی معصوم" اپنی اس تمام امت کا روحانی باپ ہوتا ہے جس کی جانب اس کو مبعوث کیا گیا ہے یہ جدا بات ہے کہ امت اجابت اسکی عطا کردہ سعادت و فلاح سے متغیر ہوتی ہے اور امت دعوت اس سے محروم رہتی ہے، نیز آج بھی یہ دستور ہے کہ کافر و مسلم کے امتیاز کے بغیر بڑے بوڑھے بستی کی لڑکیوں کو اپنی بیٹیاں کہا کرتے ہیں۔

۲ حضرت لوط علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ قوم انکے مہمانوں کیساتھ بداخلاقی پر تلی ہوئی ہے اور کسی طرح ان پر عار دلانے کا اثر ہوتا ہے نہ حیاء و مروت اور اخلاق و انسانیت کے نام پر اپیل کا تب پریشان خاطر ہو کر فرمایا:

قَالَ لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِيٓ إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ۝

کاش میرے لئے تم سے (مقابلہ کی) طاقت ہوتی یا پناہ ملتی کسی زبردست قوت پناہ کے ساتھ۔

اس "رکن شدید" سے کیا مراد ہے، کیا حضرت لوط علیہ السلام "العیاذ باللہ" خدا کی قدرت پر بھروسہ نہیں رکھتے تھے جو کسی "رکن شدید" کی پناہ کے طالب تھے؟

اس مشکل کا حل بخاری کی روایت نے بخوبی کر دیا ہے اس روایت میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یغفر اللّٰہ للوط ان کان لیاوی الی رکن شدید، وھو ربہ و خالقہ۔[1] (الحدیث)

اللہ تعالیٰ لوط کی بخشش کرے (کہ وہ اس درجہ پریشان کئے گئے) کہ رکن شدید کی پناہ کے طلب ہوئے اور ان کیلئے رکن شدید ان کا پروردگار اور ان کا خالق ہے۔

[1] تفسیر کی بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ "رکن شدید" میں رکن سے مراد خاندان ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے سدوم کے باشندوں کی بے مروتی اور وحشت کو محسوس کیا تو بہ تقاضائے بشریت فرمایا، کاش کہ میں خاندان والوں سے وابستہ ہوتا تو یہ پریشانی نہ ہوتی، چنانچہ اس کے بعد حق تعالیٰ نے انبیاء ورسل کو انکے اپنے خاندان اور برادری ہی میں مبعوث کیا، مگر یہ توجیہ مضبوط نہیں ہے اور اپنے اندر کافی سقم رکھتی ہے۔ اسلئے صحیح توجیہ وہی ہے جو صحیح بخاری میں خود ذات اقدس ﷺ سے منقول ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام خدا کو بھول کر کسی اور قوت کی پناہ کے طالب نہ تھے بلکہ وہ اس درجہ قابل رحم حالت میں تھے کہ اس وقت ان کی یہ تمنا ہوئی کاش کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی قوت عطا کرتا کہ میں اسی وقت ان سب بد بختوں کو ان کی خباثت کا مزہ چکھا سکتا اور "رکن شدید" یعنی اس کے پروردگار نے آخر ان کی مدد کی اور ان پر فرشتوں نے اپنا راز ظاہر کر دیا اور ان کو تسلی اور اطمینان بخشا کہ آپ پریشان نہ ہوں تھوڑا ہی وقت گذرتا ہے کہ یہ اپنی بد کرداری کے عبرتناک انجام کو پہنچ جائیں گے۔

۳ بعض مفسرین نے بِكُمْ قُوَّةً میں "کم" کا مخاطب فرشتوں کو سمجھا ہے اور مراد یہ لیتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا کاش تم اس کثرت سے ہوتے کہ انکے مقابلہ میں مجھ کو تم سے قوت پہنچتی یا خدا کوئی ایسی صورت پیدا کر دیتا کہ میں ان کو سزا دے سکتا، اسی لئے حضرت لوط علیہ السلام کے اس قول کو سن کر فرشتوں نے کہا:

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ (ھود)

فرشتوں نے کہا اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں (مجبور انسان نہیں ہیں) یہ تجھ کو ہرگز گزند نہیں پہنچا سکتے۔

تورات میں ہے کہ حضرت لوط مع اپنے خاندان کے سدوم سے ہجرت کر کے صنوعر یا صغر کی بستی میں چلے گئے جو سدوم سے قریب ہی آباد تھی۔[1] آفتاب نکلنے کے بعد جب انھوں نے سدوم کی جانب دیکھا تو وہاں ہلاکت و بربادی کے نشانات کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔

حضرت لوط علیہ السلام نے پھر صغر کو بھی چھوڑ دیا، اور اس کے قریب ایک پہاڑی پر جا آباد ہوئے، اور امن و امان سے رہنے سہنے لگے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام مجدد انبیاء

ان مسلسل واقعات سے بہت سے بصائر و عبر حاصل ہونے کے علاوہ ایک سب سے اہم بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت منصب نبوت و رسالت میں بھی خاص امتیازی شان رکھتی ہے یوں تو خدا کا ہر ایک پیغمبر توحید کا داعی اور شرک کا دشمن ہے اور اس لئے تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں یہ دو باتیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ روحانی دعوت و ارشاد کی اساس و بنیاد صرف انہی دو مسئلوں پر قائم ہے مگر یہ خصوصیت حضرت ابرہیم علیہ السلام ہی کے حصہ میں آئی تھی کہ اس دنیا میں وہ پہلی ہستی ہیں جنھیں اس راہ عزیمت میں سخت سے سخت آزمائشوں اور کڑی سے کڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور وہ ان مصائب کے مقابلے میں کامران و کامیاب ثابت ہوئے۔

۱ غور کیجئے بڑھاپے اور یاس کی عمر میں ہزاروں دعاؤں اور لاکھوں آرزوؤں کے بعد ایک بچہ پیدا ہوا تھا اور ابھی بچہ شیر خوار ہے کہ خدائے تعالیٰ کا حکم آتا ہے "ابراہیم: اس کو اور اس کی والدہ کو اپنے گھر سے جدا کرو، اور ایک لق و دق بیابان اور بن کھیتی کی زمین میں" جہاں نہ پانی ہے نہ سبزہ" ان دونوں کو چھوڑ آؤ پھر کیا ہوا؟ کیا ابراہیم

---

[1] پیدائش، باب ۱۹ آیت ۲۲۔

علیہ السلام نے ایک لمحہ بھی تامل کیا اور تعمیل ارشاد میں کسی قسم کا کوئی عذر سامنے آیا؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ بے چون وچرا ان دونوں کو مکہ کی سرزمین پر چھوڑ آئے۔

اور اس کے بعد جب وہ سن رشد کو پہنچا اور ماں باپ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنتا ہے تو اب پھر ابراہیم علیہ السلام کو خدا کا حکم ملتا ہے کہ اس کو ہمارے نام پر قربان کرو اور اپنی فداکاری واطاعت شعاری کا ثبوت دو۔

اس نازک وقت میں ایک مطیع سے مطیع اور فرمانبردار سے فرمانبردار ہستی کے ایمان ویقین کی کشتی کس طرح بھنور میں آجاتی ہے اس کا اندازہ خود کرو اور پھر ابراہیم علیہ السلام کی جانب دیکھو کہ نہ خدا کی وحی کی جو "خواب اور رویا کی شکل میں" دکھائی گئی تھی انھوں نے کوئی تاویل کی، نہ اس کے لئے حیلہ بہانہ سوچا اور نہ اس کو ٹالنے کے لئے کوئی فکر وتردد کیا صبح اٹھے اور اپنے لخت جگر کو لیا اور تعمیل ارشاد الٰہی میں وہ سب کچھ کیا جو ان کے انسانی ہاتھ کر سکتے تھے اور اس طرح اپنی محیر العقول وفا کیشی کا ثبوت دیا۔

اور تیسری سخت آزمائش کا وہ وقت تھا کہ جب باپ، قوم اور بادشاہ وقت سب نے متفق ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ ابراہیم علیہ السلام یا اپنے پیغام حق سے باز آجائے ورنہ تو اس کو دہکتی آگ میں ڈال کر خاکستر کر دیا جائے، تب ظالموں کا یہ فیصلہ اور اتحاد کیا ابراہیم علیہ السلام کے قدم ڈگمگا سکا نہیں! بلکہ وہ ایک عزم کا پہاڑ بن کر اسی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا اور پیغام حق اور خدا کی رشد وہدایت کو اسی عزم وثبات کے ساتھ سناتا رہا جس طرح شروع سے کرتا رہا پھر دشمنوں نے جو کچھ کہا تھا آخر کر دکھایا اور اس کو دہکتی آگ میں جھونک دیا، مگر ابراہیم علیہ السلام کے سکون واطمینان میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا، البتہ دشمنوں کی دشمنی اور ان کے تمام مکر وفریب کو ابراہیم علیہ السلام کے خدا نے پادر ہوا کر دیا اور خاک میں ملا دیا اور آگ کے شعلے اس کے لئے "برد وسلام" بن گئے، اور اس طرح ابراہیم علیہ السلام اپنے قوی تر نگہبان کے زیر سایہ سعادت وہدایت کے فیضان سے بندگان خدا کو برابر منور وروشن کرتا رہا اور اس کی جرأت حق اور دعوت الی اللہ تیز تر ہو گئی، ان تمام سخت امتحانوں اور آزمائشوں اور پھر ان میں ثبات قدمی اور استقامت کے علاوہ ابراہیم علیہ السلام کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے شرک اور توحید کی متضاد زندگی کے لئے ایک ایسا امتیاز قائم کر دیا جو انہی جیسے جلیل القدر پیغمبر کے شایان شان تھا۔

یعنی انھوں نے اصنام پرستی اور کواکب پرستی کی تردید وتذلیل اور انکی شفاعت کا اظہار کرتے ہوئے یہ تصریح فرمائی:

إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (انعام)

بلاشبہ میں نے اپنا رُخ اُسی ذات کی طرف جھکا دیا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کروانے والا ہے، خالص اس کا ہو کر اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

ابراہیم علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے تصور کی دو راہیں ہیں ایک صحیح اور دوسری غلط، غلط راہ یہ ہے کہ یہ عقیدہ قائم کر لیا جائے کہ خدا کو راضی کرنے، اس کو خوش رکھنے اور اس کی عبادت و پرستش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بتوں اور ستاروں کی پوجا کی جائے کیونکہ جب یہ ارواح ہم سے خوش ہو جائیں گی تو یہ خدا کو ہم سے راضی کر دیں گی، اس عقیدہ کا نام "شرک اور صابئیت" ہے کیونکہ اس عقیدہ کے مطابق عبودیت و پرستش کے تمام وہ خصوصی امتیازات جو صرف "ذات واحد" کے لئے مخصوص رہنے چاہیے تھے دوسروں کے لیئے بھی مشترک ہو جاتے ہیں، اور یہی شرک کی حقیقت ہے۔

اس کے مقابلہ میں صحیح راہ یہ ہے کہ اس علم و یقین کو عقیدہ بنایا جائے کہ خدائے تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کا طریقہ اس کے علاوہ دوسرا نہیں ہے کہ خود اسی کی پرستش کی جائے اسی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، نفع و ضرر صحت و مرض افلاس و تمول، رزق کا قبض و بسط اور موت و زیست غرض تمام امور میں اسی کو اور صرف اسی کو مالک و مختار مطلق تسلیم کیا جائے اور اس کی رضاء و عدم رضاء کی معرفت کے لئے اس کے بھیجے ہوئے سچے پیغمبروں اور رسولوں کی ہی ہدایت و رشد پر عمل کیا جائے گویا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیا جائے کہ خدا کو راضی رکھنے اور اس سے قربت حاصل کرنے کے لئے دیوی دیوتاؤں کو ذریعہ بنانے کی حاجت نہیں بلکہ صرف اس ذات احدیت کی عبودیت و بندگی کو سرمایۂ حیات بنایا جائے اسی عقیدہ کا نام "اسلام" اور "حنیفیت" ہے۔

اسلئے یہ پہلا دن تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلی راہ کو "شرک و صابیت اور دوسری راہ کو اسلام و حنیفیت کا نام دے کر دونوں راہوں کے درمیان مستقل امتیاز قائم کر دیا اور یہ امتیاز ایسا مقبول ہوا کہ آنے والی تمام پیغمبرانہ تعلیم و دعوت کی بنیاد و اساس اسی نام سے موسوم کی گئیں حتیٰ کہ خاتم الانبیاء محمد ﷺ والہ صحبہ و بارک وسلم کے آخری پیغام کا نام بھی "ملت حنیف" اور اس کے پیرو کا نام "مسلم" قرار پایا۔

وَاتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا (بقرہ)

اور پیروی کرو ملت ابراہیم کی جو حنیف تھا۔

هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (حج)

اس ابراہیم نے تمہارا نام پہلے ہی سے مسلمان رکھا ہے اور اس قرآن میں بھی (یہی نام پسند رہا)

یہی وجہ ہے کہ سورۂ "ابراہیم" کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں انبیاء علیہم السلام کے ظہور اور ان کے حالات و تشخصات اور نتائج کو مجموعی طور پر پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ پیغمبروں کی دعوت رشد و ہدایت کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ اور یہ کہ خیر و شر، طاعت بغاوت اور تسلیم و انکار میں کیا غیر اللہ کی خوشنودی کو بھی کوئی مقام حاصل ہے یا صرف رضاء و عدم رضاء الٰہی ہی اصل ایمان ہے؟

پس ان مجموعی خصوصیات ابراہیمی کے پیش نظر بلاشبہ یہ کہنا صحیح ہے کہ نبیوں اور رسولوں کی مقدس زندگی میں ابراہیم علیہ السلام کا مقام "مجدد انبیاء و رسل" کا مقام ہے۔

واقعات زیر بحث سے متعلق چند عبرتیں

۱۔ جب انسان کسی عقیدہ کو علم و یقین کی روشنی میں قائم کر لیتا ہے، اور وہ اس کے قلب میں جاگزیں اس کی روح میں پیوست، اور اس کے سینہ میں نقش کالحجر ہو جاتا ہے تو اس کا فکر و خیال اس کا سوچ بچار اور اس کا استغراق اس بارہ میں اس درجہ زبردست اور ثابت و راسخ ہو جاتا ہے کہ کائنات کا کوئی حادثہ اور دنیا کی کوئی سخت سے سخت مصیبت بھی اس کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی وہ اس کیلئے آگ میں بے خطر کود پڑتا، سمندر میں بے جھجک چھلانگ مار دیتا اور سولی کے تختہ پر بے خوف جان دے دیتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عزم و ثبات کی مثال اس کے لئے ایک زندہ اور روشن مثال ہے۔

۲۔ حمایت حق کے لئے ایسے دلائل و براہین پیش کرنے چاہیں جو دشمن اور باطل پرست کے تہ قلب میں اتر جائیں اور وہ زبان سے خواہ اقرار حق نہ کرے لیکن اس کا ضمیر اور اس کا قلب حق کے اقرار پر مجبور ہو جائے بلکہ بعض مرتبہ زبان بھی بے اختیار اعلان حق سے باز نہ رہ سکے آیت قرآن وجادلہم بالتی ھی احسن اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہے۔

۳۔ پیغمبروں اور رسولوں کی راہ یہی ہے، وہ جدل و مخاصمت کی منطقیانہ راہوں پر نہیں چلتے، ان کے دلائل و براہین کی بنیاد محسوسات و مشاہدات پر ہوتی ہے یا سادہ وجدانیات و عقلیات پر، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصنام پرستی و کواکب پرستی کے متعلق جمہور سے مناظرہ اور مناظرۂ نمرود، اسکی واضح اور روشن مثال ہے۔

۴۔ کسی امر حق کو ثابت کرنے کے لئے دلیل میں مخالف کے باطل عقیدہ کو فرضی طور پر تسلیم کر لینا جھوٹ یا اس باطل عقیدہ کا اقرار نہیں ہے بلکہ اس کو "فرض الباطل مع الخصم" یا "معاریض" کہا جاتا ہے اور یہ طریقۂ استدلال مخالف کو اپنی غلطی کے اعتراف پر مجبور کر دیتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جمہور کے ساتھ مناظرہ میں دلیل کا یہی پہلو اختیار کیا تھا جس نے صنم پرستوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اقرار کر لیں کہ بے شک بت کسی حال میں بھی نہ سنتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔

۵۔ اگر ایک مسلم کے والدین مشرک ہوں اور کسی طرح شرک سے باز نہ آتے ہوں تو ان کی مشرکانہ زندگی سے بیزار اور علیحدہ رہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ دنیوی معاملات اور آخرت کی پند و نصائح میں عزت و حرمت کا معاملہ کرنا چاہیے اور سختی اور درشتی کو کام میں نہ لانا چاہیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طرز عمل آزر کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کا طریق عمل ابو طالب کے ساتھ اس مسئلہ کیلئے قطعی اور یقینی شہادت ہے۔

۶۔ اگر قلب مومن صحیح عقائد پر اطمینان قلب اور زبان و قلب کی مطابقت کے ساتھ ایمان رکھتا ہے مگر عینی اور حقیقی مشاہدہ و محسوس کیلئے یا اس کو حق الیقین کے درجے تک حاصل کرنے کیلئے کسی ایمانی یا اعتقادی مسئلہ میں بھی سوال و جستجو کی راہ اختیار کرتا اور طمانیت قلب کا طالب ہوتا ہے تو یہ جستجو ریب و کفر نہیں ہے بلکہ عین ایمان ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب ولکن لیطمئن قلبی سے اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

۷ دستر خوان کی وسعت اگر ریاء و نمود سے پاک ہو اور فطری تقاضے کے پیش نظر مہماں نوازی میں وسعت قلب اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہو تو اخلاق کریمانہ میں بہت فضیلت شمار ہوتی ہے اور "سخاء نفس" اور "کرم" کے نام سے موسوم ہے۔

یہ وصف گرامی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حقیقت نفس بن چکا تھا اور فطری تھا۔

مہماں نوازی، دستر خوان کی وسعت آنے والوں کا احترام ایسے اوصاف تھے جو ابراہیم علیہ السلام میں "مثل اعلیٰ" کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔

بعض کتابوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہماں نوازی کے سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ منقول ہے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حسب دستور حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی مہمان کے انتظار میں جنگل میں کھڑے تھے، کیوں کہ بغیر مہمان کے نہ ان کا دستر خوان بچھتا تھا اور نہ وہ کھانا کھاتے تھے سامنے سے ایک بہت بوڑھا آدمی نظر پڑا جس کی کمر بھی کج ہو گئی تھی اور لکڑی کے سہارے بمشکل چل رہا تھا، ابراہیم علیہ السلام آگے بڑھے اور مسرت کے ساتھ اس کو سہارا دیتے ہوئے گھر لائے دستر خوان بچھا، اور کھانا چنا گیا جب سب فارغ ہو گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا، اس خدائے یکتا کا شکر ادا کر جس نے ہم سب کو یہ نعمتیں عطا فرمائیں، بوڑھے نے خشمناک ہو کر کہا میں نہیں جانتا کہ تیرا خدائے واحد کون ہے، میں تو اپنے معبود (بت) کا شکر ادا کرتا ہوں جو میرے گھر میں رکھا ہے یہ جواب ابراہیم علیہ السلام کو بہت شاق گذرا، اور اس کو فوراً گھر سے رخصت کر دیا، لیکن کچھ وقفہ نہ گذرا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے دل پر اپنے اس طرز عمل سے تکدر رہا، انھوں نے سوچا کہ جس خدائے واحد کا شکر میں اس سے کرانا چاہتا تھا اس کی شان تو یہ ہے کہ اس بوڑھے کی اس طویل عمر میں وہ برابر اپنی نعمتوں سے اس کو نوازتا رہا اور اس کی بت پرستی، کفر، اور شرک سے ناراض ہو کر ایک وقت بھی اس پر رزق کا دروازہ بند نہیں کیا پھر تجھ کو کیا حق تھا کہ اگر اس نے تیری بات نہ مانی اور حق کے کلمہ کو قبول نہ کیا تو خفا ہو کر اس کو گھر سے نکال دیا۔

یہ واقعہ اپنی تاریخی حیثیت میں قابل قبول ہو یا ناقابل قبول لیکن اس حقیقت کا ضرور اعلان کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اخلاق کریمانہ کی وہ بلندی جو "حقیقی مثل اعلیٰ" تک پہنچی ہوئی تھی ضرب المثل اور زبان زد خلائق تھی، اور بلاشبہ ان کا یہ فکر پیغام حق اور دعوت اسلام کے لئے بہترین اسوہ ہے۔

۸ اللہ تعالیٰ جن ہستیوں کو اپنے ابلاغ حق کے لئے چن لیتا ہے ان کے قلب و دماغ کو اپنے نور سے اس درجہ روشن کر دیتا ہے کہ ان کے سامنے عشق حق و صداقت کے سوائے دوسری کوئی چیز باقی ہی نہیں رہتی اور اس لئے ان میں شروع ہی سے یہ استعداد ودیعت ہوتی ہے کہ وہ عہد طفولیت ہی سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور نمایاں نظر آنے لگتے اور راہ حق میں ابتلاء و امتحان کو خوشی سے سہتے اور صبار و رضا کا اسوۂ حسنہ پیش کرتے رہتے ہیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا واقعہ اس کی شہادت کے لئے شاہد عدل اور باعث صد ہزار عبرت و عظمت ہے۔

۹ حضرت لوط علیہ السلام اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادر زادہ اور ان کے پیرو تھے مگر شرف نبوت سے

بھی سرفراز ہو چکے تھے اور خدا کے ایلچی بنا دیئے گئے تھے اس لئے سدوم اور عامورہ میں ہمہ قسم کے مصائب اور وطن سے دور دشمنوں کے نرغہ کی تکالیف کے باوجود انھوں نے صبر واستقامت سے کام لیا اور اپنے بزرگ چچا اور خاندان کی مدد کی طلب کی بجائے صرف خدائے عزوجل ہی پر بھروسہ رکھتے ہوئے اس کے احکام کے سامنے رضاو تسلیم کا ثبوت دیا۔ یہ مقام "مقربین وانبیاء" کا مقام ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام

- نسب نامہ
- قرآن مجید میں ذکر یعقوب علیہ السلام
- اولادِ یعقوب
- ولادتِ یوسف

نسب نامہ

حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے بتوئیل کے نواسہ ان کی والدہ کا نام رفقہ یا ربقہ تھا، یہ اپنی والدہ کے چہیتے اور پیارے تھے اور ان کا حقیقی بھائی عیسو والد کا محبوب اور پیارا اور دونوں حقیقی بھائی تھے۔

تورات سے ان دونوں بھائیوں کی باہم ناراضی کا واقعہ گذشتہ سطور میں نقل کیا جا چکا ہے حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی والدہ کے اشارہ پر جب فدان آرام چلے گئے تو ان کے ماموں لابان نے ان سے یہ عہد لیا کہ وہ دس سال ان کے یہاں رہ کر ان کی بکریاں چرائیں تو وہ اس مدت کو مہر قرار دے کر اپنی لڑکی سے شادی کر دیں گے جب یعقوب علیہ السلام نے اس مدت کو پورا کر دیا تو لابان نے اپنی بڑی لڑکی لئیہ سے ان کا نکاح کرنا چاہا مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنا رحجان طبع چھوٹی لڑکی راحیل کی جانب ظاہر کیا لابان نے یہ عذر کیا کہ یہاں کے دستور کے مطابق بڑی لڑکی کے نکاح سے قبل چھوٹی لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا، اس لئے تم اس رشتہ کو منظور کرو اور اپنے قیام کو دس سال اور طویل کرو اور میری خدمت میں رہو تو راحیل بھی تمہارے نکاح میں دی جا سکے گی (کیونکہ اس زمانہ میں دو بہنوں کا ایک نکاح میں جمع ہونا شرعاً ممنوع نہ تھا) چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے اس مدت کو بھی پورا کر دیا اور راحیل سے شادی کر لی، ان دونوں کے علاوہ وہ لئیہ کی خانہ زاد زلفا اور راحیل کی خانہ زاد بلہا بھی ان کی زوجیت کے رشتہ میں منسلک ہو گئیں اور ان سب سے اولاد بھی ہوئی۔ اور بنیامین کے علاوہ یعقوب علیہ السلام کی تمام اولاد اپنے ماموں کے ہی یہاں پیدا ہوئی اور جب یعقوب علیہ السلام وطن واپس آگئے تو یہاں بنیامین پیدا ہوئے لابان نے یعقوب علیہ السلام کو بیس سال اپنے پاس رکھنے کے بعد بہت سامال و متاع اور ریوڑ دے کر رخصت کیا اور یہ پھر اپنے دادا کے دارالہجرت فلسطین میں آکر مقیم ہو گئے۔

یعقوب علیہ السلام جس زمانہ میں فدان آرام چلے گئے تھے، اس زمانہ میں عیسو ناراض ہو کر اپنے چچا اسمٰعیل علیہ السلام کے پاس آ بسے تھے اور ان کی بیٹی سے شادی کر کے قریب ہی آباد ہو گئے تھے یہ تاریخ میں ادوم کے نام سے مشہور رہیں، اس عرصہ میں دونوں بھائیوں کے درمیان جو چپقلش تھی وہ بھی دور ہو گئی اور دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ پھر استوار ہو گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو تحائف بھیجنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

یہ تمام واقعات تورات کی کہانی اور داستان ہے، قرآن عزیز ان تفصیلات کے حق میں قطعاً خاموش ہے اور صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کے جلیل القدر نبی صاحب صبر و عزیمت اور یوسف علیہ السلام کے برگزیدہ باپ ہونے کا ذکر کرتا ہے اور اسی ضمن میں نام لئے بغیر یوسف علیہ السلام کے دوسرے بھائیوں کا بھی ذکر آجاتا ہے۔

ذکر یعقوب علیہ السلام قرآن مجید میں

قرآن عزیز میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام دس جگہ آتا ہے اور اگرچہ سورۂ یوسف میں جگہ جگہ ضمائر اور اوصاف کے لحاظ سے بعض دوسری سورتوں مثلاً "مومنون" میں اوصاف کے اعتبار سے ان کا تذکرہ موجود ہے مگر نام کے ساتھ صرف دو ہی جگہ ان کا ذکر کیا گیا ہے مسطورۂ ذیل جدول اس کی وضاحت کرتی ہے۔

سورۃ	آیت	شمار
بقرہ	۱۴۰،۱۳۳،۳۷	۳
انعام	۸۵	۱
مریم	۶	۱
انبیاء	۷۲	۱
نساء	۱۶۳	۱
یوسف	۳۸،۶	۲
صٓ	۴۵	۱

اسرائیل

حضرت یعقوب کا نام عبرانی میں اسرائیل ہے، یہ اسرأ (عبد) اور ایل (اللہ) دو لفظوں سے مرکب ہے، اور عربی میں اس کا ترجمہ "عبداللہ" کیا جاتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ اسحاقی خاندان جو ان کی نسل سے ہے اسی لئے "بنی اسرائیل" کہلاتا ہے اور آج بھی یہود و نصاریٰ کے قدیم خاندان اسی نسبت کے ساتھ منسوب ہیں۔

اولادِ یعقوب

یعقوب علیہ السلام کے بارہ لڑکے تھے اور گذشتہ سطور میں واضح ہو چکا ہے کہ بنیامین کے علاوہ ان کی تمام اولاد فدان آرام ہی میں پیدا ہو چکی تھی، صرف بنیامین فلسطین (اور ارض کنعان) میں پیدا ہوئے، حضرت یعقوب علیہ السلام کی یہ اولاد چونکہ چند بیبیوں سے ہے اس لئے ان کی تفصیل یہ ہے:

لئیہ یالیا بنت لابان سے (۱) رادبین (۲) شمعون (۳) لاوی (۴) یہودا (۵) ویساکر (۶) ذلوبون پیدا ہوئے۔

راحیل بنت لابان سے (۷) یوسف (۸) بنیامین پیدا ہوئے۔

بلہاجاریہ لئیہ سے (۹) دان (۱۰) نفتالی۔

اور زلفاجاریہ لئیہ سے (۱۱) جاد اور (۱۲) اشیر پیدا ہوئے۔ (تورات پیدائش باب ۳۵۔ آیات ۲۱۔۲۶)

پیغمبری

حضرت یعقوب علیہ السلام خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے اور کنعانیوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے انھوں نے برسوں اس خدمت حق کو انجام دیا، قرآن عزیز میں چونکہ ان کا ذکر بیشتر حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا ہے اسلئے وہیں قابل مراجعت ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام

- یوسف علیہ السلام کا نسب نامہ
- سورۂ یوسف کا نزول
- یوسف علیہ السلام کا خواب
- یوسف علیہ السلام آزمائشوں میں
- یوسف علیہ السلام بحالت غلامی
- عزیز مصر کی بی بی اور یوسف علیہ السلام
- شاہی خاندان کی عورتیں اور یوسف علیہ السلام
- قید خانہ میں دعوت و تبلیغ
- شاہ مصر اور یوسف علیہ السلام
- برادران یوسف علیہ السلام کا قافلہ
- حضرت یعقوب کی مصر میں آمد اور لخت جگر سے ملاقات
- آخری وصیت
- یوسف علیہ السلام کا ذکر قرآن حکیم میں
- برادران یوسف علیہ السلام
- برادران یوسف علیہ السلام کی سازش
- چاہ کنعان
- عزیز مصر اور یوسف علیہ السلام
- یوسف علیہ السلام اور آیت ولقد ہمت بہ
- قید خانہ
- تعبیر خواب
- یوسف علیہ السلام تخت شاہی پر
- حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن سلوک عذر خواہی اور معافی
- یوسف علیہ السلام کی وفات
- حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں وصیت پر عمل

نسب نامہ

یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پڑپوتے ہیں اور ان کی والدہ کا نام راحیل بنت لابان ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان کے ساتھ بے حد محبت تھی بلکہ عشق تھا، اور اس لئے کسی وقت بھی ان کی جدائی گوارانہ کرتے تھے۔

یہ بھی اپنے والد، دادا، اور پردادا کی طرح سن رشد کو پہنچ کر خدائے برتر کے جلیل القدر پیغمبر بنے اور ملت ابراہیمی کی دعوت و تبلیغ کی خدمت سرانجام دی، یہی وجہ ہے کہ ابتدائے زندگی ہی سے ان کی دماغی اور فطری استعداد دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں بالکل جدا اور نمایاں تھی، یعقوب علیہ السلام کے عشق و محبت کا یک سبب یہ بھی تھا کہ وہ یوسف علیہ السلام کی پیشانی کا چمکتا ہوا نور نبوت پہچانتے، اور وحی الٰہی کے ذریعہ اس کی اطلاع پاچکے تھے۔

قرآن عزیز میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر

حضرت یوسف علیہ السلام کا نام قرآن عزیز نے چھبیس مرتبہ ذکر کیا ہے جن میں سے چوبیس جگہ صرف سورۂ یوسف میں اور ایک جگہ سورۂ انعام میں اور ایک جگہ سورۂ غافر میں ذکر آیا ہے اور ان کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ یہ دادا ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان کے نام پر بھی قرآن عزیز کی ایک سورت (سورۂ یوسف) نازل ہوئی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات سے متعلق عبرت و موعظت کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔

سورۃ	آیات	شمار
انعام	۸۴	۱
یوسف	۴، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۷، ۲۱، ۲۹، ۴۶، ۵۱، ۵۶، ۶۱، ۶۶، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۸۷، ۸۹، ۹۴، ۹۹	۲۴
غافر	۳۴	۲۶/۱

سورۂ یوسف

قرآن عزیز نے یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو "احسن قصص" کہا ہے اس لئے کہ اس ایک واقعہ میں جس قدر عبرتیں، حکمتیں اور مواعظ و نصائح ودیعت ہیں دوسرے کسی واقعہ میں یکجا میسر نہیں ہیں، در حقیقت یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب دل کش اور زمانہ کے عروج و زوال کے زندہ یادگار ہے، یہ ایک فرد کے ذریعہ قوموں کے بننے اور بگڑنے، گرنے اور ابھرنے کی ایسی بولتی ہوئی تصویر ہے جو کسی تشریح و توضیح کی محتاج نہیں رہتی، یہ بدوی اور خانہ بدوش قبیلہ کے ایک ایسے فرد یگانہ اور انمول موتی کی حیرت زا تاریخ ہے جس کو خدائے تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے اعجاز نے اس زمانہ کی بڑی سے بڑی متمدن قوم کی رہنمائی اور ان پر حاکمانہ اقتدار کے لئے چن لیا تھا اور شرف نبوت سے نوازا تھا۔

قرآن عزیز تورات کی طرح داستان گوئی یا محض اشخاص و اقوام کے تاریخی حالات کا مرقع نہیں ہے بلکہ وہ جن واقعات تاریخی کو بیان کرتا ہے اس کے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ عبرت و موعظت و تذکیر و پند کا مقصد وحید ہے۔ پس جبکہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بے نظیر عبرتیں اور بصیرتیں پنہاں تھیں مثلاً رشد و ہدایت کی اہمیت، ابتلاء اور آزمائشوں پر صبر و استقامت، رضاء و تسلیم کے مظاہرے، افراد و اقوام کے عروج و اقبال کے وقائع، خدائے تعالیٰ کے عدل و رحم کی کرشمہ سازیاں انسانی اور بشری لغزشیں اور ان کے انجام و مال عصمت اور ضبط نفس کی عجوبہ کاریاں تو بلاشبہ وہ "احسن قصص" ہے اور کتاب ماضی کا وہ حسین ورق جو اپنی شان زیبائی میں یکتا اور فرد کہلانے کا مستحق ہے۔

الٓرٰ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ ○ إِنَّآ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ○ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْآنَ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغَافِلِيْنَ ○ (سورۂ یوسف)

الرٰ۔ یہ روشن کتاب کی آیتیں ہیں، ہم نے اس قرآن کو عربی میں نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو، اے پیغمبر! ہم اس قرآن کے ذریعہ سے جو ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے ایک نہایت اچھا قصہ (واقعہ) سناتے ہیں اور تم اس سے پہلے بے خبر تھے۔

سورۂ یوسف کے شان نزول کے بارہ میں حدیثی روایات اور مفسرین کے اقوال کا حاصل یہ ہے کہ کفار مکہ نے ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے متعلق "یہود" سے گفتگو کی اور اپنی درماندگی اور پریشانی کا اظہار کیا اس پر یہود نے ان سے کہا کہ اس مدعی نبوت کو زچ کرنے اور جھوٹا بنانے کے لئے تم ان سے یہ سوال کرو کہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد شام سے مصر کیوں منتقل ہوئی اور یوسف علیہ السلام سے متعلق جو واقعات ہیں ان کی تفصیل کیا ہے؟ اگر یہ نبی نہیں ہے تو ہرگز نہ بتا سکے گا۔

کفار مکہ نے یہود کی ہدایت کے مطابق ذات اقدس ﷺ سے یہ دونوں سوال کئے اور آپ ﷺ نے وحی الٰہی کے ذریعہ وہ سب کچھ ان کو سنادیا جو سورۂ یوسف میں موجود ہے۔

یوسف کا خواب اور برادران یوسف علیہ السلام

ان واقعات کا حاصل یہ ہے کہ جبکہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی تمام اولاد میں حضرت یوسف علیہ السلام سے بیحد محبت رکھتے تھے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کا حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ والہانہ عشق و محبت برادران یوسف علیہ السلام کیلئے بیحد شاق اور ناقابل برداشت تھا، اور وہ ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ یا حضرت یعقوب علیہ السلام کے قلب سے اس محبت کو نکال ڈالیں اور یا پھر یوسف علیہ السلام ہی کو اپنے راستہ سے ہٹادیں تاکہ قصہ پاک ہو جائے۔

ان بھائیوں کے حاسدانہ تخیل پر مزید تازیانہ یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور شمس و قمر ان کے سامنے سجدہ ریز ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے چہیتے بیٹے کا یہ خواب سنا تو سختی کے ساتھ ان کو منع کر دیا کہ اپنا یہ خواب کسی کے سامنے نہ دہرانا، ایسا نہ ہو کہ اس کو سن کر تیرے بھائی برے پیش آئیں، کیوں کہ شیطان انسان کے پیچھے لگا ہے اور تیرا خواب اپنی تعبیر میں بہت صاف اور واضح ہے۔

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَآأَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ○ قَالَ يَابُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَى إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ○ وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَى آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَى أَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○ (یوسف)

جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا: اے باپ! میں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے؟ دیکھتا کیا ہوں کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں انھوں نے کہا: اے میرے بیٹے! تو اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کو

نہ سنانا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے ساتھ کوئی چال چل جائیں بلا شبہ شیطان انسان کیلئے کھلا دشمن ہے اور اس طرح تیرا پروردگار تجھ کو برگزیدہ کرے گا اور سکھائیگا تاویل احادیث، اور اپنی نعمت کو تجھ پر اور اولاد یعقوب پر تمام کریگا جس طرح کہ اس نعمت (نبوت) کو پورا کیا تیرے اجداد پر پہلے سے (یعنی) ابراہیم و اسحٰق پر بے شک تیرا پروردگار جاننے والا حکمت والا ہے۔

اس مقام پر تورات اور قرآن عزیز کے بیانات میں تفاوت و اختلاف پایا جاتا ہے۔

۱۔ قرآن عزیز بیان کرتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جب اپنا خواب حضرت یعقوب علیہ السلام کو سنایا تو دوسرے بھائی وہاں موجود نہ تھے، اور تورات کہتی ہے کہ یہ معاملہ بھائیوں کی موجودگی میں پیش آیا۔

۲۔ قرآن عزیز سناتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اس خواب سے بحق یوسف علیہ السلام بے حد مسرور ہوئے اور ان کو نبوت و علوم الٰہیہ کی بشارت سنائی مگر تورات کہتی ہے کہ یعقوب علیہ السلام خواب سن کر بہت خفا ہوئے اور فرمانے لگے کہ شاید اس سے تیرا منشاء یہ ہے کہ میں تیری والدہ، اور تیرے سب بھائی تیرے سامنے سجدہ ریز ہوں گے؟

واقعات کی اس ترتیب کے اعتبار سے جو آگے چل کر قرآن عزیز اور تورات میں مشترک ہے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عزیز ہی کا بیان صحیح اور درست ہے، نیز تقاضائے فطرت اسی کا داعی ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے اس خواب کو بھائیوں سے الگ ہو کر بیان کریں اور یعقوب علیہ السلام بیٹے کے اس خواب کو سن کر مسرور ہوں کہ ہر ایک باپ اپنی اولاد کی ترقی درجات اور بلندی مناصب کا خواہش مند ہوتا ہے خصوصاً جبکہ یعقوب علیہ السلام نبی ہونے کی وجہ سے خواب کی تعبیر میں یوسف علیہ السلام کے لئے جو بلندی دیکھ رہے تھے وہ موجب صد ہزار مسرت تھی نہ کہ باعث رنج والم۔

آخر کار حسد کی بھڑکتی ہوئی آگ نے ایک روز برادران یوسف علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کے خلاف سازش کرنے پر مجبور کر ہی دیا۔

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ○ اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ○ قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ○ (سورۂ یوسف ع۲)

جبکہ وہ کہنے لگے البتہ یوسف اور اس کا بھائی (بنیامین) ہمارے باپ کو زیادہ پیارا ہے اور ہم ان سے زیادہ قوت والے ہیں، بلاشبہ ہمارا باپ صریح خطا پر ہے یوسف کو مار ڈالو یا کسی ملک میں پھینک دو تاکہ تمہارے باپ کی توجہ تمہاری طرف سمٹ آئے اور ہو رہنا بعد میں نیک قوم ان میں سے ایک نے کہا یوسف کو قتل نہ کرو اور اس کو گمنام کنوئیں میں ڈال دو کہ اٹھا لے جائے اس کو کوئی مسافر اگر تم کو کرنا ہی ہے۔

اس مشورہ کے بعد سب جمع ہو کر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ

یوسف علیہ السلام کو ہمارے ساتھ سیر کرنے کس لئے نہیں بھیجتے، کیا آپ کو ہم پر اعتماد نہیں ہے ہم سے زیادہ اس کا محافظ دوسرا کون ہو سکتا ہے؟

مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُوْنَ ○ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ ○ (یوسف ع۲)

(اے باپ) کیا بات ہے کہ تجھ کو یوسف کے بارہ میں ہم پر اعتماد نہیں ہے حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں، کل اس کو ہمارے ساتھ بھیج کہ وہ کھائے پئے اور کھیلے کودے اور بلاشبہ ہم اس کے نگہبان ہیں۔

حضرت یعقوب سمجھ گئے ان کے دلوں میں کھوٹ ہے اور یہ یوسف علیہ السلام کو نقصان پہنچانے کے در پے ہیں۔ مگر صاف لفظوں میں اس بات کو ظاہر نہیں فرمایا تاکہ بگڑ کر وہ علانیہ دشمنی پر آمادہ نہ ہو جائیں اور یہ بھی خیال کیا کہ اشارہ کنایہ سے ممکن ہے وہ اپنی ظالمانہ سازش سے باز رہیں اس لئے اشارہ اشارہ میں ان پر حقیقت حال واضح کر دی کہ واقعی مجھ کو یوسف کے بارہ میں تم سے اندیشہ ہے۔

قَالَ إِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ أَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَأَخَافُ أَنْ يَّأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُوْنَ ○ (یوسف ع۲)

یعقوب نے کہا مجھے اس سے رنج اور دکھ پہنچتا ہے کہ تم اس کو (اپنے ساتھ) لیجاؤ، اور مجھے یہ خوف ہے کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے اور تم غافل رہو۔

برادران یوسف علیہ السلام نے یہ سن کر بہ یک زبان کہا:

لَئِنْ أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّآ إِذًا لَّخَاسِرُوْنَ ○ (سورۃ یوسف)

اگر کھا گیا اس کو بھیڑیا جبکہ ہم سب طاقتور ہیں تو بلاشبہ ایسی صورت میں تو ہم نے سب کچھ گنوا دیا۔

اس جگہ تورات کا بیان یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے خود اپنے حکم سے یوسف علیہ السلام کو اسکے بھائیوں کے ساتھ جنگل میں کھیلنے کودنے کیلئے بھیجا تھا[1]، مگر آگے کے واقعات خود تورات کے بیان کی تغلیط کرتے ہیں۔

چاہ کنعان

غرض برادران یوسف علیہ السلام، یوسف علیہ السلام کو جنگل کی سیر کرانے کے بہانے لے گئے اور مشورہ کے مطابق ایک ایسے کنوئیں میں اس کو ڈال دیا جس میں پانی نہ تھا اور عرصہ سے خشک پڑا تھا اور واپسی میں اس کے قمیص کو کسی جانور کے خون میں تر کر کے روتے ہوئے حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آئے اور کہنے لگے: اے باپ! اگر چہ ہم اپنی صداقت کا کتنا ہی یقین دلائیں مگر تجھ کو ہرگز یقین نہ آئے گا کہ ہم دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں مشغول تھے کہ اچانک یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا۔

1: پیدائش باب ۳۷ آیات ۱۳۔۱۴۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے پیراہن یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو خون آلود تھا مگر کسی ایک جگہ سے بھی پھٹا ہوا نہ تھا اور نہ چاک داماں تھا، فوراً حقیقت حال سمجھ گئے مگر جھڑ کنے، طعن و تشنیع کرنے اور نفرت و حقارت کا طرز عمل اختیار کرنے کی بجائے پیغمبرانہ علم و فراست اور علم و سماحت کے ساتھ یہ بتادیا کہ باوجود حقیقت حال کو چھپانے کی سعی کے تم اسے چھپا نہ سکے۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ○ (سورۂ یوسف ع ۲)

(حضرت یعقوب علیہ السلام نے) کہا یہ ہر گز نہیں بلکہ بنادی ہے تمہارے نفسوں نے تمہارے لئے ایک بات، اب صبر ہی بہتر ہے، اور جو بات تم ظاہر کرتے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔

یوسف علیہ السلام اور غلامی

یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور یوسف علیہ السلام کے ساتھ یہ قصہ پیش آیا کہ حجازی اسمٰعیلیوں (مدیانیوں) کا ایک قافلہ شام سے مصر کو بخورات، بلساں اور مسالہ لاد کر لئے جا رہا تھا، کہ کنواں دیکھ کر انھوں نے پانی کے لئے ڈول ڈالا یوسف علیہ السلام سمجھے کہ شاید بھائیوں کو رحم آ گیا ڈول پکڑ کر لٹک گئے، تاجر نے ڈول نکالا تو یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر جوش سے شور مچایا۔

يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلَامٌ ط

بشارت ہو ایک غلام ہاتھ آیا

تورات میں ہے کہ براداران یوسف علیہ السلام نے جب اسمٰعیلی قافلہ کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ یوسف کو کنوئیں سے نکال کر اس قافلہ کے ہاتھ فروخت کر دو مگر اس سے پہلے ہی مدیانیوں (اسمٰعیلیوں) نے ان کو نکال کر غلام بنالیا اور سب سے بڑا بھائی راوبین جب کنوئیں پر پہنچا اور دیکھا کہ یوسف علیہ السلام وہاں نہیں ہے تو روتا ہوا واپس آ گیا، راؤبین کو یہ رائے یہودا نے دی تھی اور راؤبین شروع ہی سے اس فکر میں تھا کہ یوسف علیہ السلام کو کنوئیں سے نکال کر خاموشی سے باپ کے سپرد کر آئے اسی لئے اس نے قتل یوسف علیہ السلام کی سخت مخالفت کی تھی۔

اس مقام پر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو خود براداران یوسف علیہ السلام نے ہی کنوئیں سے نکال کر اسمٰعیلیوں کے قافلہ میں فروخت کر دیا تھا، مگر مفسرین کے اس قول کی نہ تورات موافقت کرتی ہے اور نہ قرآن عزیز بلکہ دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ والوں نے ہی یوسف علیہ السلام کو کنوئیں سے نکالا اور اپنا غلام بنالیا۔

اسی طرح صاحب قصص الانبیاء کو تورات کے بیان سے قافلہ کے متعلق غلط فہمی ہو گئی ہے، اور وہ یہ کہ انھوں نے اسمٰعیلی اور مدیانی کو دو جدا جدا قافلے سمجھا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ شام

سے مصر جانے والا یہ قافلہ ایک ہی قافلہ تھا جو نسلی اعتبار سے اسمٰعیلی اور ملکی اعتبار سے مدیانی[1] (حجازی) تھا۔

غرض اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو اسمٰعیلی تاجروں کے قافلہ نے اپنا غلام بنالیا اور مال تجارت کے ساتھ ان کو بھی مصر لے گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا یہ پہلو اپنے اندر کیسی عظمتیں پنہاں رکھتا ہے اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جو چشم بصیرت رکھتا ہو، چھوٹی سی عمر ہے، والدہ کا انتقال ہو چکا ہے باپ کی آغوش محبت تھی وہ بھی چھوٹی، وطن چھوٹا، بھائیوں نے بے وفائی کی، آزادی کی جگہ غلامی نصیب ہوئی مگر ان تمام باتوں کے باوجود نہ شور و شیون ہے، نہ واویلا، نہ جزع و فزع ہے اور نہ الحاح وزاری، قسمت پر شاکر، مصائب پر صابر اور خدا کے فیصلہ پر راضی بہ رضا، سر نیاز خم کئے مصر کے بازار میں فروخت ہونے جارہے ہیں سچ ہے۔ نزدیکاں رابیش بود حیرانی۔

یوسف مصر میں

تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح "مصر" "تمدن و تہذیب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا، یہاں کے حکمراں عمالقہ (ہیکسوس) تھے جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کنعان سے ایک بدوی غلام کی حیثیت میں مصر میں داخل ہوئے، مصر کا دارالسلطنت اس زمانہ میں رعمسیس تھا، یہ غالباً اُس مقام پر واقع تھا جہاں آج صان کی بستی آباد ہے۔ جغرافی حیثیت سے اس کا جائے وقوع مشرق کی جانب دریائے نیل کے قریب بتایا جاتا ہے، مصری افواج کا افسر، شاہی خاندان کا ایک رئیس فوطیفار تھا۔ یہ سیر کیلئے مصر کے بازار سے گذر رہا تھا کہ یوسف علیہ السلام پر نظر پڑی اور اس نے معمولی قیمت دے کر ان کو خرید لیا۔

ابھی ذکر ہو چکا ہے کہ اُس زمانہ میں مصری خود کو دُنیا کی بہترین مہذب اور متمدن قوم سمجھتے تھے اور بدوی اور صحرائی قبائل کو نہایت ذلّت و حقارت سے دیکھتے اور اپنے شہروں میں اُن کے ساتھ اچھوت کی طرح معاملہ کرتے تھے، انہی قبائل میں سے ایک قبیلہ نسل ابراہیمی کی یادگار کنعان میں آباد تھا، یہاں مدنیت و حضارت کا نام و نشان تک نہ تھا، شکار پر اُن کے رزق کا مدار تھا خس پوش جھونپڑیاں اور بکریوں کے گلے اُن کے دھن دولت تھے۔

ان حالات میں یوسف علیہ السلام کے متعلق خدائے تعالیٰ کی کارسازی اور معجز نمائی دیکھئے کہ ایک بدوی اور وہ بھی غلام، ایک متمدن اور صاحبِ شوکت و حشمت رئیس کے یہاں جب پہنچتا ہے تو اپنی عصمت مآب زندگی، حلم و وقار اور امانت و سلیقہ مندی کے پاک اوصاف کی بدولت اُس کی آنکھوں کا تارا اور دل کا مالک بن جاتا ہے اور وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے،

أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا (یوسف ع۳)

(دیکھو) اس کو عزت سے رکھو کچھ عجب نہیں کہ یہ ہم کو فائدہ بخشے یا ہم اس کو اپنا بیٹا بنالیں۔

---

[1] جدید نسلی و جغرافی تحقیق نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جس مقام کو توراۃ میں مدین یا مدیان کہا ہے۔ اس سے وہ علاقہ مراد ہے۔ جو ساعیر (سراۃ) سے بحر احمر کے کنارے شام سے یمن تک چلا گیا ہے۔ اس کو حضرت موسیٰ کے زمانہ سے بنی اسرائیل مدین اور اسمٰعیلی شروع سے ہی حجاز کہتے تھے۔ اس لئے ایک ہی مقام کے یہ دونام ہیں۔ (ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۹،۴۸)

اور یہ کس لئے ہوا، اور یوسف علیہ السلام میں پسندیدہ اطوار و اخلاق کہاں سے پیدا ہو گئے، ایک بدوی نے کس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی، اور ایک غلام نے کس مربّی سے اس پاک طینت کو پایا؟ اس کے متعلق قرآن عزیز جواب دیتا ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (یوسف ع ۳)

اور جب وہ سن رشد کو پہنچ گیا تو ہم نے اسکو فیصلہ کی قوت اور علم عطا کئے اور ہم اسی طرح نیکوکاروں کو جزادیا کرتے ہیں۔

بہر حال فوطیفار نے حضرتِ یوسف علیہ السلام کے ساتھ غلاموں کا سامعاملہ نہیں کیا، بلکہ اپنی اولاد کی طرح عزت و احترام کے ساتھ رکھا اور اپنی ریاست، دولت و ثروت اور گھریلو زندگی کی تمام ذمہ داریاں اُن کے سپرد کر دیں اور ان سب کا امین بنا دیا، گویا کنعان کے گلہ بان کو عنقریب جو جہانداری و جہاں بانی سپرد ہونے والی تھی یہ اُس کی تمہید تھی۔ اسی لئے ارشاد ہوا:

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَأْوِيْلِ الْأَحَادِيْثِ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى أَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یوسف ع ۳)

اور اسی طرح جگہ دی ہم نے یوسف کو اس ملک میں اور اس واسطے کہ اس کو سکھائیں باتوں کا نتیجہ اور مطلب نکالنا اور اللہ طاقتور رہتا ہے اپنے کام میں، لیکن اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔

عزیزِ مصر کی بیوی اور یوسف علیہ السلام

ایک مشہور صوفی ابن عطاء اللہ السکندری کا قول ہے "رُبما کمنت المنن فی المحن" (خدا کے اکثر احسانات و کرم مصائب کے اندر مستور ہوتے ہیں) حضرت یوسف علیہ السلام کی ساری زندگی اسی مقولہ کا ہو بہو مصداق ہے۔

بچپن کی پہلی مصیبت یا آزمائش نے کنعان کی بدوی زندگی سے نکال کر تہذیب و تمدن کے گہوارہ "مصر" کے ایک بہت بڑے گھرانے کا مالک بنا دیا، غلامی میں آقائی اسی کو کہتے ہیں، اب وقت کی دوسری اور کٹھن آزمائش شروع ہوئی، وہ یہ کہ حضرتِ یوسف علیہ السلام کا جوانی کا عالم تھا، حُسن و خوبروئی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو اُن کے اندر موجود نہ ہو، جمال و رعنائی کا پیکر مجسم رُخِ روشن شمس و قمر کی طرح منور، عصمت و حیا کی فراوانی سونے پر سہاگہ اور پھر ہر وقت کا ساتھ، عزیزِ مصر کی بیوی دل پر قابو نہ پاسکی اور یوسف علیہ السلام پر پروانہ وار نثار ہونے لگی، مگر ابراہیم علیہ السلام کا پوتا، اسحاق علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام کا نورِ دیدہ، خانوادۂ نبوت کا چشم و چراغ اور منصبِ نبوت کیلئے منتخب' بھلا اس سے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ناپاکی اور فحش میں مبتلا ہو اور عزیز کی بیوی کے ناپاک عزائم کو پورا کرے۔

لیکن مصر کی اس آزاد عورت نے جب اس طرح جادو چلتے نہ دیکھا تو ایک روز بے قابو ہو کر مکان کا دروازہ بند کر دیا اور اصرار کرنے لگی کہ مجھے شاد کام کر، حضرتِ یوسف علیہ السلام کیلئے یہ وقت سخت آزمائش کا

وقت تھا، شاہی خاندان کی نوجوان عورت، شعلہ حسن سے لالہ رو، محبوب نہیں بلکہ عاشق، آرائش حسن و زینت کی بے پناہ نمائش، عشوہ طرازیوں کی بارش، ادھر یوسف علیہ السلام خود نوجوان حسین اور حسن کی خوبی سے آشنا، دروازے بند، رقیب کا خوف نہ ڈر، مالکہ خود ذمہ دار، مگر ان تمام ساز گار حالات نے کیا یوسف علیہ السلام کے دل میں ایک لمحہ کیلئے بھی عزیزِ مصر کی بیوی کی حوصلہ افزائی کی، کیا اس کے دل نے قرار چھوڑ کر بے قراری اختیار کی بر عکس اُس پیکر عصمت 'امینِ نبوت 'مہبط وحیِ الٰہی نے دو ایسے دلکش اور محکم دلائل سے ''مصری عورت'' کو سمجھایا جو ایک ایسی ہستی سے ہی ممکن تھے جس کی تربیت براہِ راست آغوشِ الٰہی میں ہوئی ہو۔ فرمایا ''یہ ناممکن ہے'' ''پناہ بخدا'' میں اور اس کی نافرمانی کروں جس کا اسمِ جلالت ''اللہ'' ہے، اور وہ تمام کائنات کا مالک 'اور کیا میں اپنے اُس مربّی ''عزیزِ مصر'' کی امانت میں خیانت کروں جس نے غلام رہنے کی بجائے یہ حرمت و عزت عطا کی؟ اگر میں ایسا کروں تو ظالم ٹھہروں گا اور ظالموں کے لئے انجام و مآل کے اعتبار سے کبھی فلاح نہیں ہے۔

مگر عزیزِ مصر کی بیوی پر اس نصیحت کا مطلق اثر نہ ہوا اور اس نے اپنے ارادہ کو عملی شکل دینے پر اصرار کیا تب یوسف علیہ السلام نے اپنے اس بُرہانِ رب کے پیشِ نظر جس کا ذکر وہ کر چکا تھا صاف انکار کر دیا۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ إِنَّهٗ رَبِّيْٓ أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ أَنْ رَّاٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ إِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝ (سورۂ یوسف)

اور پھسلایا یوسف کو اس عورت نے جس کے گھر میں وہ رہتے تھے اس کے نفس کے معاملہ میں اور دروازے بند کر دیئے اور کہنے لگی آ میرے پاس آ، یوسف نے کہا، پناہ بخدا! بلاشبہ وہ (عزیز مصر) میرا مربی ہے جس نے مجھ کو عزت سے رکھا بلاشبہ ظالم فلاح نہیں پاتے، اور البتہ اس عورت نے یوسف سے ارادہ بد کیا، اور وہ بھی ارادہ کرتے اگر اپنے پروردگار کے برہان کو نہ دیکھ لیتے، اس طرح ہوا تا کہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو، بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا کی تفسیر

مفسرین نے آیت وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا کی مختلف تفسیریں کی ہیں لیکن ہم نے جو معنی بیان کئے ہیں وہی زیادہ موزوں اور مناسب مقام ہیں قرآن عزیز نے اول سے آخر تک اس واقعہ میں عزیز مصر کی بیوی کی شناعت کار حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت و جلالت قدر کا تذکرہ فرمایا ہے، اسلیئے یوسف علیہ السلام کے ''معاذ اللّٰہ'' ''انہ احسن مثوای''، ''انہ لا یفلح الظّٰلمون'' فرمانے کے بعد یہی معنی بر محل ہو سکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کی زبان سے بُرہانِ رب کو سن لینے کے بعد بھی جب عورت اپنی ہٹ سے باز نہ آئی اور اپنے ارادہ پر مصر رہی تو یوسف علیہ السلام نے اس کے ارادہ کو قطعاً رد کر دیا اور ''برہان رب'' کے سامنے اس کے ''ھم'' کی مطلق

پرواہ کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ یوسف علیہ السلام اس سے بچنے کے لئے دروازہ کی طرف بھاگے اور عزیز مصر کی بیوی نے ان کا پیچھا کیا۔

بعض مفسرین نے اس تفسیر پر یہ اعتراض کیا ہے کہ عربی گرامر کا تقاضا ہے کہ لولا کلام کے شروع میں استعمال ہو اس لئے کہ وسط کلام میں اس کا استعمال نحوی قاعدہ کے خلاف ہے مگر اس تفسیر کے مطابق لولا وسط کلام میں استعمال ہوگا اور تعبیر یہ ہوگی۔

وَ هَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ط

اور یوسف علیہ السلام بھی گناہ کا قصد کر لیتا اگر اپنے رب کے برہان کو نہ دیکھ لیتا''

مگر یہ اعتراض اس لئے درست نہیں کہ اس مقام پر بھی ''لولا'' کا استعمال شروع کلام ہی میں ہوا ہے اور نحوی قاعدہ کے مطابق دال علی الجواب مقدم ہے اور ''لولا'' کا جواب جو بعد میں مذکور ہوتا اس دال علی الجواب کی وجہ سے مقدر اور محذوف ہے۔ اور یہ اسلئے صحیح ہے کہ فصاحت وبلاغت کا تقاضا ہے کہ ایک جانب مناسبت کلام کو قائم رکھا جائے یعنی دونوں کے ارادہ وعدم ارادہ کا ایک ہی جگہ ذکر ہو اور دوسری جانب نحوی قاعدہ کے پیش نظر لولا کا جواب اس کے بعد میں آئے اور یہ دونوں باتیں جب ہی ہو سکتی ہیں کہ هَمَّ بِهَا کو دال علی الجواب بنا کر هَمَّتْ بِهٖ کے ساتھ ذکر کیا جائے اور لولا کا جواب فَهَمَّ بِهَا کو مقدر تسلیم کیا جائے۔

لہٰذا مسطورہ بالا تفسیر ہی شک وشبہ سے بالاتر حقیقت حال کو واضح اور ظاہر کرتی ہے۔ کلام مجید میں اس کی نظیر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے تذکرہ سے متعلق یہ آیت ہے،

اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا

قریب تھا کہ وہ (والدہ موسیٰ) اس کو ظاہر کر دے اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ بنا دیتے۔

یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل کو مضبوط کر دیا تو وہ موسیٰ علیہ السلام کے راز کو ظاہر نہ کر سکیں اور اگر ہم ایسا نہ کرتے تو وہ ظاہر کر دیتیں۔

دیکھئے یہاں بھی ''لو لا'' سے دال علی الجواب مقدم ہے اور ''لو لا'' کا جواب لَتُبْدِيْ بِهٖ مقدر رو محذوف ہے، اسی طرح اس مقام پر یہ معنی ہیں کہ اگر یوسف علیہ السلام کو بُرہانِ رب حاصل نہ ہوتا تو وہ بھی ارادۂ بد کر لیتے لیکن انھوں نے ارادۂ بد نہیں کیا کیونکہ وہ برہان رب دیکھ چکے تھے۔

اس جگہ یہ بھی ایک سوال ہے کہ وہ ''برہان رب'' کیا تھا جس کا قرآن عزیز یہاں ذکر کر رہا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن عزیز نے اپنی بلیغانہ اور معجزانہ خطابت میں خود ہی اس کو اس طرح ادا کر دیا ہے کہ سوال کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، دروازہ بند ہو جاتے پر عزیز کی بیوی کو حضرت یوسف علیہ السلام نے جو جواب دیا ایسے مقام کے لحاظ سے اس سے بہتر جواب کیا ہو سکتا تھا سو یہی وہ ''برہان رب'' تھا جو یوسف علیہ السلام کو عطا ہوا اور جس نے عصمت یوسف علیہ السلام کو بے داغ رکھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے بڑے شد ومد سے اس کے بعد یہ بیان کیا كَذٰلِكَ (یونہی ہوا) لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ تاکہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے) یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کا دامن اس قسم کے

ہے اسلئے پاک رہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عصمت وپاکی کا فیصلہ شروع ہی سے کر دیا تھا، پھر کیسے ممکن تھا کہ اس کی عصمت و حفاظت کے بعد اس کے خلاف کوئی شائبہ بھی ان میں پایا جاتا؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت نظر آنا اور ان کا اشارہ سے منع کرنا یا فرشتہ کا ظاہر ہو کر ان کو اس سے روکنا یا عزیز مصر کا گھر میں رکھے ہوئے صنم پر اس کی بیوی کا پردہ ڈالنا اور حضرت یوسف علیہ السلام کا اس سے عبرت حاصل کرنا یہ اور اس قسم کے تمام اقوال کے مقابلہ میں ''برہان رب'' کی تفسیر وہی بہتر تفسیر ہے جو خود قرآن عزیز کی نظم و ترتیب سے ثابت ہے یعنی (۱) ایمان باللہ کا حقیقی تصور (۲) اور مربی مجازی کے احسان کی احسان شناسی اور وصف امانت، عزیز مصر نے یوسف علیہ السلام کے متعلق اپنی بیوی سے کہا تھا اکرمی مثواہ (اس (یوسف) کو عزت سے رکھنا) یوسف علیہ السلام نے اسی کو پیش نظر رکھ کر فرمایا احسن مثوای (اس (عزیز مصر) نے مجھ کو عزت دی) تب یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں خیانت کر کے اس کو بے عزت کروں۔

بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام جب دروازہ کی جانب بھاگے تو عزیز کی بیوی نے پیچھا کیا دروازہ کسی طرح کھل گیا سامنے عزیز مصر اور عورت کا چچازاد بھائی کھڑے نظر آئے عورت کا عشق ابھی خام تھا اس لئے وہ صحیح حال کہنے پر قادر نہ ہوئی اور اصل حقیقت کو چھپانے کیلئے غیظ و غضب میں آکر کہنے لگی کہ ایسے شخص کی سزا قید خانہ یا دردناک عذاب کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے جو تیرے اہل کے ساتھ ارادۂ بد رکھتا ہو؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسکے مکر و فریب کو سنا تو فرمایا کہ یہ اسکا بہتان ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ خود اس نے میرے ساتھ ارادۂ بد کیا تھا مگر میں نے کسی طرح نہ مانا اور بھاگ کر باہر نکل جانا چاہتا تھا کہ اس نے پیچھا کیا اور سامنے آپ نظر آگئے تو اس نے یہ جھوٹ گھڑ لیا۔

عزیز کی بیوی کا چچازاد بھائی ذکی، فطین اور بہت ہوشیار تھا اس نے کہا کہ یوسف علیہ السلام کا پیراہن دیکھنا چاہیے اگر وہ سامنے سے چاک ہے تو عورت راستباز ہے، اور اگر پیچھے سے چاک ہے تو یوسف علیہ السلام صادق القول ہے اور عورت جھوٹی ہے، دیکھا تو پیراہن یوسف علیہ السلام پیچھے سے چاک تھا عزیز مصر نے اصل حالت کو بھانپ لیا مگر اپنی عزت و ناموس کی خاطر معاملہ کو ختم کرتے ہوئے کہا، یوسف علیہ السلام سچے تم ہی ہو، اور اس عورت کے معاملہ سے درگزر و، اس کو یہیں ختم کر دو، اور پھر بیوی سے کہا یہ سب تیرا مکر و فریب ہے اور تم عورتوں کا مکر و فریب بہت ہی بڑا ہوتا ہے، بلاشبہ تو ہی خطاکار ہے لہٰذا اپنی اس حرکت بد کے لئے استغفار کر اور معافی مانگ۔

قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوٓءًا إِلَّآ أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ كَانَ قَمِيصُهُۥ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ ۝ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُۥ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَأٰى قَمِيصَهُۥ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُۥ مِنْ كَيْدِكُنَّ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ ۝ يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْبِكِ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ

الْخَاطِئِيْنَ ۝ (سورۂ یوسف)

کہنے لگی اس شخص کی کیا سزا ہے جو تیرے اہل کے ساتھ برائی کا ارادہ رکھتا ہو مگر یہ کہ قید کر دیا جائے یا دردناک عذاب میں مبتلا کیا جائے یوسف علیہ السلام نے کہا اسی نے مجھ کو میرے نفس کے بارے میں پھسلایا تھا، اور فیصلہ کیا عورت ہی کے گھرانے کے ایک شخص نے کہ اگر پیراہن یوسف علیہ السلام سامنے سے چاک ہے تو عورت سچی ہے اور یوسف علیہ السلام جھوٹا اور اگر پیچھے سے چاک ہے تو عورت کاذب ہے اور یوسف علیہ السلام صادق، پس جب اس کی قمیص کو دیکھا تو پیچھے سے چاک تھا، کہا بے شک اے عورت یہ تیرے مکر و فریب سے ہے، بلا شبہ تمہارا مکر بہت بڑا ہے یوسف علیہ السلام تو اس معاملہ سے درگزر اور اے عورت تو اپنے گناہ کی معافی مانگ! تو بلا شبہ خطاکار ہے۔

عزیز مصر نے اگرچہ فضیحت و رسوائی سے بچنے کے لئے اس معاملہ کو یہیں پر ختم کر دیا مگر بات پوشیدہ نہ رہ سکی اور شدہ شدہ شاہی خاندان کی عورتوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ عزیز مصر کی بیوی کس قدر بے حیا ہے کہ اپنے غلام پر ریجھ گئی، اتنے بڑے مرتبہ کی عورت اور غلام سے اختلاط کا ارادہ؟ آہستہ آہستہ یہ خبر عزیز کی بیوی تک بھی پہنچ گئی، اس کو یہ طعن بے حد شاق گذرا اور اس نے چاہا کہ اس کا انتقام لے، اور ایسا انتقام لے کہ جس بات پر وہ مجھ پر طعن کرتی ہیں اسی میں ان کو بھی مبتلا کیا جائے، یہ سوچ کر ایک روز اس نے شاہی خاندان اور عمائدین شہر کی عورتوں کو دعوت دی، جب سب دستر خوان پر بیٹھ گئیں اور سب نے کھانا کھانے کے لئے چھریاں ہاتھ میں لے لیں تاکہ اس سے گوشت یا ترنج جیسی چیزوں کو کاٹیں، تب عزیز کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ باہر آئیں، حضرت یوسف علیہ السلام مالکہ کے حکم سے باہر نکلے تو تمام عورتیں جمال یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر حیران رہ گئیں، اور رخ انور کی تجلی و تابانی سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ چیزیں کاٹنے کی بجائے چھریوں سے ہاتھ کاٹ لئے اور بے ساختہ کہنے لگیں کہ کون کہتا ہے یہ انسان ہے، بخدا یہ تو نور کا پتلا اور بزرگ فرشتہ ہے یہ دیکھ کر عزیز کی بیوی بے حد محظوظ ہوئی اور اپنی کامیابی اور ان کی شکست پر فخر کرتے ہوئے کہنے لگی یہی تو وہ غلام ہے جس کے عشق و محبت کے بارہ میں تم نے مجھ کو مطعون کر رکھا ہے اور تیر ملامت کا نشانہ بنایا ہوا ہے اب اس کو دیکھ کر یہ تمہارا حال کیا ہے؟ بتاؤ میرا یہ عشق بے جا ہے یا بجا، اور تمہاری ملامت بے محل یا با محل؟

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَأَةُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَّفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَّآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ فَلَمَّا رَأَيْنَهٗ أَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ (سورۂ یوسف ع ۴)

اور (جب اس معاملہ کا چرچا پھیلا) تو شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں دیکھو عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے لگی ہے اسے رجھالے، وہ اس کی چاہت میں دل ہار گئی ہمارے خیال میں تو وہ صریح بد چلنی میں پڑ گئی، پس

جب عزیز کی بیوی نے ان عورتوں کے مکر کو سنا تو ان کو بلا بھیجا اور ان کے لئے مسندیں آراستہ کیں اور (دستور کے موافق) ہر ایک کو ایک ایک چھری پیش کر دی، پھر یوسف علیہ السلام سے کہا ان سب کے سامنے نکل آؤ، جب یوسف علیہ السلام کو ان عورتوں نے دیکھا تو اس کی بڑائی کی قائل ہو گئیں، انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور (بے اختیار) پکار اٹھیں یہ تو انسان نہیں ہے ضرور ایک فرشتہ ہے بڑے مرتبہ والا فرشتہ (عزیز کی بیوی) بولی تم نے دیکھا یہ ہے وہ آدمی جس کے بارہ میں تم نے مجھے طعنے دیئے۔

عزیز کی بیوی نے یہ بھی کہا کہ بے شک میں نے اس کا دل اپنے قابو میں لینا چاہا تھا مگر وہ بے قابو نہ ہوا، مگر میں یہ کہہ دیتی ہوں کہ اگر اس نے میرا کہانہ مانا تو یہ ہو کر رہے گا کہ وہ قید کیا جائے اور بے عزتی میں پڑے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ سنا اور پھر عزیز کی بیوی کے علاوہ اور سب عورتوں کے چلتر اپنے بارہ میں دیکھے تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں دست بدعاء ہوئے اور کہنے لگے، خدایا! جس بات کی جانب یہ عورتیں بلا رہی ہیں، اس کے مقابلہ میں مجھے قید میں رہنا کہیں زیادہ پسند ہے، اگر تو نے میری مدد نہ کی اور مجھ کو ان مکاریوں سے نہ بچایا تو عجب نہیں کہ میں ان کی جانب مائل ہو جاؤں اور نادانوں میں سے بن جاؤں، یوسف علیہ السلام کی دعاء درگاہ الٰہی میں قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے سب مکرو فریب دفع کر دیے، اور کامیابی کا سہرا یوسف علیہ السلام ہی کے سر رہا۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِيٓ إِلَيْهِ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِّنَ الْجَاهِلِيْنَ ○ فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ (سورۂ یوسف ع ۴)

یوسف نے کہا اے میرے پروردگار جس بات کی طرف یہ مجھ کو بلاتی ہیں مجھے اس کے مقابلہ میں قید خانہ زیادہ پسند ہے۔ اور اگر تو نے ان کے مکر کو مجھ سے نہ ہٹایا اور میری مدد نہ کی تو میں کہیں ان کی جانب جھک نہ جاؤں اور نادانوں سے نہ ہو جاؤں، پس اسکے رب نے اسکی دعا قبول کی اور اس سے ان کا مکر ہٹا دیا بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

اس واقعہ میں مذکور ہے قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ (ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے) عام طور پر مفسرین اس کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ جمال یوسف سے مدہوش ہو کر واقعی یہ حالت ہو گئی تھی کہ ان کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا اور کاٹنے والی چیز کی بجائے ہاتھوں کو کاٹ لیا۔

مگر بعض مفسرین عصر[1] نے اس تفسیر کو صحیح نہیں سمجھا، ان کے نزدیک مصری عورتوں کا یہ بھی تریا چرتر تھا اور وہ یوسف علیہ السلام کو اپنی جانب مائل کرنے کے لئے یہ بتانا چاہتی تھیں "کہ ہم تیرے حسن کے اس قدر متوالے ہیں کہ تیری صورت دیکھ کر ہوش و حواس بھی جاتے رہے اور ہاتھوں کو زخمی کر لیا" اور اپنی اس تفسیر کی تائید میں اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ أَلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ یعنی یوسف علیہ السلام نے ان کی اس حالت کو "کید" (مکر) سے تعبیر کیا ہے، اگر یہ اضطراری حالت ہوتی تو پھر وہ بے قصور تھیں۔ ایسی حالت میں ان کے اس طرزِ عمل

[1] مولانا آزاد (ترجمان القرآن، سورۂ یوسف)

کو "کہہ" کہنے کے کیا معنی؟ نیز جب یوسف کو شاہ مصر نے زندان سے نکالنے کا حکم دیا ہے تو اس وقت بھی حضرت یوسف نے یہ فرمایا تھا کہ

فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ○
(یوسف)

پس تو بادشاہ سے جاکر دریافت کر کہ ان عورتوں کا معاملہ کیا تھا جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، بلاشبہ میرا رب ان کے مکر سے خوب واقف ہے۔

بہر حال عزیز پر چونکہ حضرت یوسف کی صداقت ظاہر ہو چکی تھی اس لئے اس نے نہ چاہا کہ یوسف کو کسی قسم کی گزند پہنچائے لیکن اس کی بیوی پر عشق کا بھوت بری طرح سوار تھا سو جب اس نے خوشامد، چاپلوسی، مکر و حیلہ، کسی طرح سے مطلب براری نہ دیکھی تو دھمکیوں سے کام لینا شروع کیا اور جب کوہ استقامت کو اس کے باوجود بھی مطلق حرکت نہ ہوئی تو اب عزیز نے یوسف کی صداقتوں کی تمام نشانیاں دیکھنے اور سمجھ لینے کے باوجود اپنی بیوی کی فضیحت و رسوائی ہوتی دیکھ کر یہ طے کر ہی لیا کہ یوسف کو ایک مدت کے لئے زندان میں بند کر دیا جائے تاکہ یہ معاملہ لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے اور یہ چرچے بند ہو جائیں اس طرح حضرت یوسف کو زندان جانا پڑا۔

اس موقعہ پر حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (رحمہ اللہ) نے تحریر فرمایا[1] ہے کہ یوسف نے اپنی دعاء کے ساتھ چونکہ یہ بھی کہہ دیا کہ مجھے ان کی بے حیائی کی دعوت کے مقابلہ میں زندان زیادہ پسند ہے تو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مکر سے تو ان کو بچا لیا مگر قید ان کی قسمت میں مقدر کر دی، ان کو چاہئے تھا کہ وہ یہ جملہ نہ کہتے اور بلاؤ و امتحان کو دعوت نہ دیتے اور حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے اس لطیفہ کو قوی بننے کیلئے ایک دوسرے محقق مفسر نے ایک حدیث کا حوالہ بھی دے دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص خدا سے دعاء مانگا کرتا تھا

"اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ الصَّبْرَ"

اے اللہ میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں۔

نبی اکرم نے سنا تو فرمایا تو بلاء و مصیبت کیوں مانگتا ہے، کہ اس سے عافیت کا طالب کیوں نہیں ہوتا۔

ہمیں ان دونوں بزرگوں کی جلالت قدر کے پیش نظر اگرچہ جرأت گویائی نہیں ہے لیکن یوسف جیسے عظیم المرتبت پیغمبر کی زندگی کے اس عدیم النظیر کارنامہ کو ایک لطیفہ کی نذر ہوتے دیکھ کر رہا نہیں جاتا، اور بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ حضرت یوسف کا یہ جملہ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْهِ ان کے علو شان، تقرب الی اللہ، استقامت فی الدین، عزیمت فی الحق اور رضاء و تسلیم کا وہ بے نظیر مظاہرہ ہے جو ان جیسے اولو العزم پیغمبروں کا ہی حصہ ہے۔

غور کیجئے، عزیز کی بیوی اور گھر کی مالکہ نے خوشامد و چاپلوسی کی کون سی راہ اختیار نہیں کی جس سے یوسف کو

---

[1] موضح القرآن۔

رام کیا جا سکے پھر اس میں ناکامی کے بعد دوسری عورتوں کی مدد حاصل کی اور انھوں نے اپنے ممکن داؤ گھات یوسف پر استعمال کئے مگر پھر بھی ناکامی رہی، اب آخری درجہ یہ تھا کہ اس نے دھمکی دی کہ یا یوسف اس کو شاد کام کرے ورنہ قید خانہ میں ڈالا جائے گا۔ ایسی حالت میں ایک باخدا انسان، صاحب عزیمت و استقامت ہستی، اور خوف خدا کو تمام کائنات کے غیظ و غضب پر غالب رکھنے والا انسان، اس سے بہتر اور کیا جواب دے سکتا تھا کہ خدایا میں اس عمل بد کے مقابلہ میں زندان کو ترجیح دیتا ہوں مجھے قید و بند سب کچھ منظور ہے مگر تیری نافرمانی منظور نہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قید کی طلب ہے، زندان کے شوق کا اظہار ہے، بلاء و مصیبت کو دعوت ہے ہرگز نہیں بلکہ یہاں تو لطیف پیرایہ میں وہ کہا جا رہا ہے جو اعلان حق اور خدارسی کا صحیح درجہ ہے یوسف نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ عزیز کی بیوی کو مخاطب کرے یا مہمان عورتوں کو اپنی گفتگو میں مخاطب کا موقع دے بلکہ اس نے اپنے خدا کو پکارا، مگر ان گمراہ اور بدقماش عورتوں پر یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھا کہ جس طرح ان کے تمام مکر و فریب، خوشامد اور چاپلوسی ناکام رہیں، اسی طرح ان کی دھمکی اور ان کا عذاب بھی میرے ارادۂ حق، اور خدارسی کو باطل نہیں کر سکتا، یہ کہتی ہے کہ یوسف یا مجھ کو شاد کام کرے ورنہ جیل خانہ جائے۔ تو میں جیل خانہ کو اس کے ارادۂ بد کے مقابلہ میں لاکھ بار ترجیح دوں گا: رب السجن احب الی مما یدعوننی الیہ۔

اب فرمایئے کہ اس اعلان حق اور اظہار استقامت کا اس دعا سے کیا تعلق جو ایک شخص خواہ مخواہ اپنے لئے "صبر" مانگ کر خود کو آزمائش میں پڑنے کی دعوت دے رہا تھا وہاں نہ آزمائش تھی نہ امتحان بلکہ مفت میں بلاء و مصیبت کا داعی بن رہا تھا۔ اور یہاں امتحان سر پر ہے، آزمائش موجود ہے، مصیبت کی دھمکی دی جا رہی ہے، بلا نازل کرنے کا خوف دلایا جا رہا ہے کیا ایسے نازک موقع پر صرف یہ جواب کافی ہوتا کہ یوسف گڑ گڑا کر جناب باری میں امرأۃ عزیز سے چھٹکارا پا لینے کی دعا کرتے اور بس اگر ایسا ہوتا تو امتحان آزمائش اور بلاء و مصیبت کے وقت استقامت، اعلان حق، بے خوفی اور تمام دنیوی رعونتوں کے مقابلہ میں اعلاء کلمۃ اللہ کا سبق کون سکھاتا، عزیمت کی زندگی کون بتاتا باطل سے بے خوفی کی تعلیم کس سے ملتی اور حق و باطل میں امتیاز کی شان کون پیدا کرتا؟

یوسف زندان میں

بہر حال یوسف کو قید خانہ بھیج دیا گیا اور ایک بے خطا کو خطاکار اور معصوم کو مجرم بنا دیا گیا تا کہ عزیز کی بیوی فضیحت سے بچ جائے اور مجرم کو کوئی مجرم نہ کہہ سکے۔

تورات میں ہے کہ یوسف کے علمی اور عملی جوہر قید خانہ میں بھی نہ چھپ سکے اور قید خانہ کا داروغہ اس کے حلقۂ ادارت میں داخل ہو گیا اور جیل کا تمام انتظام و انصرام اس کے سپرد کر دیا وہ قید خانہ کا بالکل مختار ہو گیا اور خداوند نے وہاں بھی اسے اس کے تمام کاموں میں اقبال مند کیا۔ (پیدائش باب ۳۹ آیت ۲۳)

قرآن عزیز سے بھی اس کی تائید نکلتی ہے اس لئے کہ اس زمانے کے قید خانوں کے حالات کے پیش نظر

یوسف علیہ السلام کے پاس قیدیوں کا اس طرح آنا جانا اور پھر ان کی عظمت و نیک نفسی کا اعتراف، اس کو واضح کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے پاک اوصاف کی قید خانہ میں کافی شہرت تھی۔

دعوت و تبلیغ

حسن اتفاق کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو نوجوان اور قید خانہ میں داخل ہوئے ان میں سے ایک شاہی ساقی تھا اور دوسرا شاہی باورچی خانہ کا داروغہ[1] ایک روز دونوں خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور ان میں سے ساقی کہنے لگا میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں شراب بنانے کے لئے انگور نچوڑ رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا میں نے یہ دیکھا ہے کہ میرے سر پر روٹیوں کا خوان ہے اور پرندا اس سے کھا رہے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نبی زادہ تھے، اسلام کی تبلیغ کا ذوق ان کے ریشہ ریشہ میں پیوست تھا، پھر خدا نے ان کو بھی نبوت کے لئے چن لیا تھا اس لئے دین حق کی اشاعت ان کی زندگی کا نصب العین تھا، گو قید میں تھے مگر مقصد حیات کو کیسے بھول جاتے اور اگرچہ مصیبت و محن میں تھے لیکن اعلاء کلمۃ اللہ کو فراموش کر دیں یہ کیسے ممکن تھا، موقعہ کو غنیمت جانا اور ان سے نرمی اور محبت سے فرمایا ہے، کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے جو باتیں مجھے تعلیم فرمائی ہیں منجملہ ان کے یہ علم بھی اس نے عطا فرمایا ہے بڑھاپے میں اس سے پہلے کہ تمہارا مقرر کھانا تم تک پہنچے تمہارے خوابوں کی تعبیر بتادوں گا مگر میں تم سے ایک بات کہتا ہوں ذرا اس پر بھی غور کرو اور سمجھو بوجھو۔

"میں نے ان لوگوں کی ملت کو اختیار نہیں کیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی منکر ہیں، میں نے اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیم علیہ السلام، اسحٰق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی ملت کی پیروی کی ہے ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک ٹھہرائیں یہ اللہ کا ایک فضل ہے جو اس نے ہم پر اور لوگوں پر کیا ہے لیکن اکثر لوگ اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے"۔

"اے دوستو! تم نے اس پر بھی غور کیا جدا جدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یکتا اور سب پر غالب ہے؟ تم اس کے علاوہ جن کی عبادت بھی کرتے ہو ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جن کو تمہارے باپ دادا نے گھڑ لیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ہرگز کوئی سند نہیں اتاری، حکومت تو صرف اللہ کے ہی لئے ہے، اس نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر آدمی نہیں جانتے"

يَاصَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِلَّآ أَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ أَنْتُمْ وَآبَآؤُكُمْ مَّا أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوْٓا إِلَّآ إِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (سورۂ یوسف ع ۵)

---

[1] پیدائش باب ۴۰ آیت ا۔

"اے یارانِ مجلس! (تم نے اس پر بھی غور کیا کہ) جدا جدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یکتا اور سب پر غالب ہے تم اس کے سوا جن ہستیوں کی بندگی کرتے ہو ان کی حقیقت اس سے زیادہ کیا ہے کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے ہیں اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نہیں اتاری حکومت تو اللہ ہی کیلئے ہے اسکا فرمان یہ ہے کہ صرف اسکی بندگی کرو اور کسی کی نہ کرو، یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔"

رشد و ہدایت کے اس پیغام کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام ان کے خوابوں کی تعبیر کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے۔

دوستو! جس نے یہ دیکھا ہے کہ وہ انگور نچوڑ رہا ہے وہ پھر آزاد ہو کر بادشاہ کے ساقی کی خدمت انجام دے گا اور جس نے روٹیوں والا خواب دیکھا ہے اس کو سولی دی جائے گی، اور پرند اس کے سر کو نوچ نوچ کھائیں گے، جن باتوں کے بارہ میں تم نے سوال کیا تھا وہ فیصل ہو چکی، اور فیصلہ یہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ساقی اور داروغہ باورچی خانہ پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے بادشاہ کے کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ملایا، جب تحقیقات ختم ہو گئی تو داروغہ پر یہ جرم ثابت ہو گیا اور ساقی کو بری کر دیا گیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام جب تعبیر خواب سے فارغ ہو گئے تو ساقی سے یہ سمجھ کر کہ وہ نجات پا جائے گا، فرمانے لگے اُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ اپنے بادشاہ سے میرا ذکر کرنا، ساقی جب رہا ہو گیا تو اس کو اپنی مشغولیتوں میں کچھ بھی یاد نہیں رہا کہ زندان میں کیا وعدہ کر آیا تھا، اور شیطان نے اس کے دماغ سے یہ سب بھلا دیا اور اس طرح چند سال تک یوسف علیہ السلام کو قید خانہ ہی میں رہنا پڑا۔

اس مقام پر اکثر مفسرین کی تفسیر کا ماحصل یہ ہے کہ اُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ سے یوسف علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ بادشاہ سے کہنا کہ ایک بے قصور اور بے گناہ انسان اس طرح مجرم بنا کر زنداں میں ڈال دیا گیا ہے اور اس تفسیر کے بعد وہ یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ اگرچہ مصائب اور ضرورت کے موقعہ پر انسان کا انسانوں سے مدد لینا اور استعانت طلب کرنا حق کوشی اور خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے تاہم بمصداق حسناتُ الابرار سیئاتُ المقرّبین (نیکوں کی بعض بھلائیں مقربین بارگاہِ الٰہی کے شایانِ شان نہیں ہوتیں) حضرتِ یوسف علیہ السلام جیسی ہستی کیلئے یہ موزوں نہ تھا کہ وہ خدا پر بھروسہ کے ساتھ ساتھ دنیوی اسباب پر بھروسہ کریں، اور بادشاہ سے اپنی مظلومیت کے دفاع کے طالب ہوں، اس لئے خدا کا فیصلہ یہ ٹھہرا کہ ان کو ابھی چند سال اور قید خانہ میں رکھے اور ساقی کو شیطان نے ایسا بھلایا کہ وہ یوسف علیہ السلام کا کچھ بھی ذکر نہ کر سکا۔ اور ابن جریر اور بغوی نے بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ وہ "فانساہ" کی ضمیر کو یوسف علیہ السلام کی جانب پھیرتے، اور یہ معنی کرتے ہیں کہ شیطان نے یوسف علیہ السلام کو بھلا دی کہ ان کا بادشاہ کی مدد کیلئے ساقی سے کہنا موزوں ہے، مگر ابن کثیر نے اس کو سختی کے ساتھ رد کر دیا اور اس تفسیر کو غلط ثابت کیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر سورۂ یوسف)

آئندہ سطور میں توراۃ سے اس سلسلہ میں جو نقل کیا گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے۔

اس تفسیر کے برعکس بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا کہ ایسا ایک شخص ہم کو اس طرح دین حق کی تلقین کرتا ہے اور وہ اپنی ملت کو ہماری ملت سے جدا بتاتا اور اس پر بہترین دلائل دیتا ہے"۔

اور اس تفسیر کی صحت کیلئے قرینہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر قرآن عزیز میں یوسف علیہ السلام اور ان دو شخصوں کے درمیان صرف دو ہی باتوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے، ایک دعوت و تبلیغ اسلام کا اور دوسرے خواب اور اس کی تعبیر کا، تیسری کسی بات کا اشارہ تک نہیں، یعنی کسی اشارہ اور کنایہ سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان ہر دو اشخاص کے سامنے اپنا قصہ بیان کیا ہو، اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہو پھر بغیر ذکر سابق کے اس طرح "اذکرنی عند ربک" میں اجمال کے کیا معنی؟ علاوہ ازیں اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے زندان سے باہر آنے کی طلب و جستجو کا یہ حال تھا تو جب ساقی کے یاد آنے، اور بادشاہ کے خواب کی تعبیر دینے کے بعد بادشاہ نے ان کی رہائی کا حکم دے دیا تو کیوں فوراً باہر نہ نکل آئے اور تفتیش حال کا مطالبہ کیوں کیا، یہ تو رہائی کے بعد بھی ہو سکتی تھی اور عصمت اور بے گناہی کا فیصلہ باہر آکر بھی کیا جا سکتا تھا۔

آیات کی ترتیب و انسجام کے پیش نظر یہی تفسیر قابل ترجیح ہے۔

تورات میں اس واقعہ کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

> تب یوسف بولا اس کی تعبیر یہ ہے کہ یہ تین ڈالیاں تین دن ہیں اور فرعون اب سے تین دن میں تیری روبکاری کرے گا، اور تجھے تیرا منصب پھیر دے گا اور آگے کی طرح جب تو فرعون کا ساقی تھا اس کے ہاتھ میں پھر جام دے گا، لیکن جب تو خوش حال ہو تو مجھے یاد کیجئیو اور مجھے اس سے مخلصی دلوائیو کہ وہ عبرانیوں کی ولایت سے مجھے چرا لائے اور یہاں بھی میں نے ایسا کام نہیں کیا کہ وہ مجھے اس قید میں رکھیں۔ (پیدائش باب ۴۰ آیت ۱۲-۱۵)

فرعون کا خواب

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ واقعہ "فراعنہ مصر" کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ خاندان شاہی نسلی اعتبار سے "عمالقہ" میں سے تھا، مصر کی تاریخ میں ان کو "ہکسوس" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کی اصلیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ چرواہوں کی ایک قوم تھی۔ جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قوم عرب سے آئی تھی اور دراصل یہ "عرب عاربہ" ہی کی ایک شاخ تھی۔ نیز قدیم قبطی اور عربی زبانوں کی باہمی مشابہت ان کے عرب ہونے کی مزید دلیل ہے۔ (ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۳۶۶)

اور مصر کے مذہبی تخیل کی بنا پر ان کا لقب "فاراع"[1] (فرعون) تھا۔ اس لئے کہ مصری دیوتاؤں میں سب سے

---

[1] مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور ان سب سے بلند تر "آمن راع" تھا۔ یعنی سورج دیوتا نیز مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشو ونما پا چکا تھا اور تاجداران مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ان کا لقب فاراع اسی لئے ہوا کہ وہ راع یعنی سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۹۲)
پھر یہی فاراع عربی میں جا کر فرعون بن گیا۔

بڑا اور مقدس دیوتا آمن راع (سورج دیوتا) تھا اور بادشاہ وقت اس کا اوتار اور "فاراع" کہلاتا تھا، یہی فاراع عبرانی میں فارعن اور عربی میں فرعون کہلایا اور اس زمانہ کے فرعون کا نام عرب مؤرخوں نے ریان بتایا ہے اور مصری آثار میں آپوفی کے نام سے موسوم ہے۔

بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام ابھی زندان ہی میں تھے کہ وقت کے فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دبلی اور دبلی گائیں موٹی کو نگل گئیں، اور سات سرسبز وشاداب بالیں ہیں اور سات خشک اور خشک بالوں نے سرسبز کو کھالیا، بادشاہ صبح اٹھا تو پریشان خاطر تھا اور اس عجیب وغریب خواب سے حیران، فوراً دربار کے مشیروں سے اپنا خواب کہا اور خواب کی تعبیر چاہی درباری بھی اس کو سن کر فکر وتردد میں پڑ گئے اور جب حل نہ کر سکے تو اپنی درماندگی وبیچارگی کو چھپانے کیلئے کہنے لگے، بادشاہ! یہ خواب نہیں ہے بلکہ پریشان خیالات ہیں جن کا کوئی خاص مطلب نہیں، ہم سچے خواب کی تعبیر تو دے سکتے ہیں لیکن پریشان خیالات حل نہیں کر سکتے۔

بادشاہ کو درباروں کے اس جواب سے اطمینان نہ ہوا، کہ اس اثناء میں ساقی کو اپنا خواب اور یوسف علیہ السلام کی تعبیر کا واقعہ یاد آ گیا، اس نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر کچھ مہلت دیجئے تو میں اس کی تعبیر لا سکتا ہوں، مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دیجئے۔ بادشاہ کی اجازت سے وہ اسی وقت قید خانہ پہنچا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو بادشاہ کا خواب سنایا اور کہا کہ آپ اس کو حل کیجئے کیوں کہ آپ سچائی اور تقدس کے پیکر ہیں، آپ ہی اس کو حل کر سکتے ہیں اور کیا عجب ہے کہ جن لوگوں نے مجھے بھیجا ہے جب میں صحیح تعبیر لے کر ان کے پاس واپس جاؤں تو وہ آپ کی حقیقی قدر ومنزلت معلوم کر لیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا کمال صبر واستقلال، اور جلالت قدر کا اندازہ کیجئے، ساقی کو نہ ملامت کی اور نہ برسوں تک بھولے رہنے پر جھڑکا اور نہ عطاء علم میں بخل سے کام لیا اور نہ یہ سوچا کہ جن ظالموں نے مجھ کو بے قصور زندان میں ڈالا ہے وہ اگر تباہ ہو جائیں اور اس خواب کا حل نہ پا کر برباد ہو جائیں تو اچھا ہے، انکی یہی سزا ہے، نہیں ایسا کچھ بھی نہیں کیا بلکہ اسی وقت خواب کی تعبیر دی اور اپنی جانب سے اس سلسلہ میں صحیح تدبیر بھی بتلا دی اور ساقی کو پوری طرح مطمئن کر دیا۔ فرمایا:

اس خواب کی تعبیر، اور اس کی بنا پر جو کچھ تم کو کرنا چاہئے وہ یہی ہے کہ تم سات برس تک لگاتار کھیتی کرتے رہو گے اور یہ تمہاری خوش حالی کے سال ہوں گے، جب کھیتی کے کٹنے کا وقت آئے تو جس قدر مقدار تمہارے سال بھر کھانے کیلئے ضروری ہو اس کو الگ کر لو اور باقی غلہ کو ان کی بالوں ہی میں رہنے دو تاکہ محفوظ رہے اور گلے سڑے نہیں۔ اس کے بعد سات برس بہت سخت مصیبت کے آئیں گے۔ وہ تمہارا جمع کیا ہوا تمام ذخیرہ ختم کر دیں گے، اس کے بعد پھر ایک برس ایسا آئے گا کہ خوب پانی برسے گا، کھیتیاں ہری بھری ہوں گی اور لوگ پھلوں اور دانوں سے عرق اور تیل بہتات کے ساتھ نکالیں گے۔ یعنی موٹی گائیں اور بالیں خوش حالی کے سال ہیں اور دبلی گائیں اور بالیں خشک سالی کے برس جو خوش حالی کی پیداوار کو کھا جائیں گے۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا

مِّمَّا تَأْكُلُوْنَ ○ ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ○ ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ○

کہا تم کھیتی کرو گے سات برس جم کر سو جو کاٹو اسکو چھوڑ دو اس کی بال میں مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ، پھر آئیں گے اس کے بعد سات برس سختی کے کھا جائیں گے جو رکھا تم نے ان کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے، پھر آئے گا، ایک برس اس کے پیچھے اس میں مینہ برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے۔

یہ قرآن عزیز کی بلاغت کلام کا اعجاز ہے کہ اس نے حضرت یوسف کی تعبیر خواب اور اس سے متعلق تدبیر کو ایک ہی جملہ میں ساتھ ساتھ بیان کر دیا ہے، تاکہ کلام میں تکرار اور دہرانے کی ضرورت باقی نہ رہے۔

ساقی نے یہ سب معاملہ بادشاہ کے سامنے جا سنایا، بادشاہ نے ساقی کی زبان سے پہلے کچھ جملے یوسف علیہ السلام کی تعریف میں سنے تھے، تعبیر خواب کا معاملہ دیکھ کر ان کے علم و دانش اور جلالت قدر کا قائل ہو گیا اور نادیدہ مشتاق بن کر کہنے لگا کہ ایسے شخص کو میرے پاس لاؤ۔

جب بادشاہ کا پیامبر یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا اور باشاہ کے طلب و اشتیاق کا حال سنایا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے سے باہر آنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اس طرح تو میں جانے کو تیار نہیں ہوں، تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ یہ تحقیق کرے کہ ان عورتوں کا معاملہ کیا تھا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیئے تھے؟ پہلے یہ بات صاف ہو جائے کہ انہوں نے کیسی کچھ مکاریاں کی تھیں اور میرا پروردگار تو ان کی مکاریوں سے خوب واقف ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام بے قصور اور بے خطا برسوں سے قید خانہ میں بند تھے اور بلاوجہ ان کو زندانی بنایا ہوا تھا۔ اب جبکہ بادشاہ نے مہربان ہو کر رہائی کا مژدہ سنایا تو چاہئے تھا کہ وہ مسرت و خوشی کے ساتھ زندان سے باہر نکل آتے، مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا، اور گذشتہ معاملہ کی تحقیق کا مطالبہ شروع کر دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام خانوادۂ نبوت سے ہیں اور خود بھی برگزیدہ نبی و پیغمبر ہیں، اس لئے غیرت و حمیت اور عزت نفس کے بدرجہ اتم مالک ہیں، انھوں نے سوچا کہ اگر بادشاہ کی اس مہربانی پر میں رہا ہو گیا تو یہ بادشاہ کا رحم و کرم سمجھا جائے گا اور میرا بے قصور اور صاحب عصمت ہونا پردۂ خفا میں رہ جائے گا، اس طرح صرف عزت نفس ہی کو ٹھیس نہیں لگے گی بلکہ دعوت و تبلیغ کے اس اہم مقصد کو بھی نقصان پہنچے گا جو میری زندگی کا نصب العین ہے۔ پس اب بہترین وقت ہے کہ معاملہ کی اصل صورت سامنے آ جائے اور حق ظاہر و واضح ہو جائے۔

صحیحین (بخاری و مسلم) کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کا ذکر فرماتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کے ضبط و صبر کو بہت سراہا اور تواضع و کسر نفسی کی حد تک اس کو بڑھا کر یہ ارشاد فرمایا:

لولبثت فی السجن ما لبث یوسف لاجبت الداعی۔ (الحدیث) (بخاری کتاب الانبیاء)

اگر میں اس قدر دراز مدت تک قید میں رہتا جس قدر کہ یوسف رہے تو بلانے والے کی دعوت فوراً قبول کر لیتا۔

اس جگہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگرچہ یوسف علیہ السلام کا معاملہ براہ راست عزیز کی بیوی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ ان مصری عورتوں کا حوالہ دیا جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا کیوں کیا، اس کی دو وجہیں تھیں، ایک یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اگرچہ عزیز ہی کی بیوی سے زیادہ تکلیف پہنچی تھی مگر قید کے اس معاملہ میں ان عورتوں کی بھی سازش تھی اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک یوسف علیہ السلام کی عاشق اور ان کو اپنی جانب مائل کرنے کی آرزومند تھی، اور ناکامی کی صورت میں سب نے مل کر عزیز کی بیوی کو اس کے قید والے فیصلہ میں شہ دی اور عملی جامہ پہنا کر چھوڑا یہی وجہ ہے کہ زندان کا معاملہ ان عورتوں کے قضیہ کے بعد پیش آیا، دوسری وجہ یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام سمجھتے تھے کہ عزیز نے میرے ساتھ ممکن حسن سلوک برتا ہے، میری عزت اور میرا احترام کیا ہے اس لئے موزوں نہیں ہے کہ میں اس کی بیوی کا نام لے کر اس کی رسوائی کا باعث بنوں۔

غرض بادشاہ نے جب یہ سنا تو ان عورتوں کو بلوایا اور ان سے کہا کہ صاف صاف اور صحیح صحیح بتاؤ کہ اس معاملہ کی اصل حقیقت کیا ہے جب کہ تم نے یوسف علیہ السلام پر ڈورے ڈالے تھے تاکہ تم اس کو اپنی طرف مائل کر لو؟ وہ ایک زبان ہو کر بولیں:

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ (یوسف ع ۷)

بولیں ماشاللہ ہم نے اس میں برائی کی کوئی بات نہیں پائی۔

مجمع میں عزیز کی بیوی بھی موجود تھی اور اب وہ عشق و محبت کی بھٹی میں خام نہ تھی کندن تھی، اور ذلت و رسوائی کے خوف سے آگے نکل چکی تھی اس نے جب یہ دیکھا کہ یوسف علیہ السلام کی خواہش ہے کہ حقیقت حال سامنے آجائے تو بے اختیار بول اٹھی:

اَلْاٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

جو حقیقت تھی وہ اب ظاہر ہو گئی، ہاں وہ میں ہی تھی جس نے یوسف پر، ڈورے ڈالے کہ اپنا دل ہار بیٹھے، بلا شبہ وہ (اپنے بیان میں) بالکل سچا ہے

اور یہ بھی کہا:

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝ وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (یوسف)

یہ میں نے اس لئے کہا کہ اس (یوسف) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کے معاملہ میں خیانت نہیں کی نیز اسلئے کہ (واضح ہو جائے) اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی (کامیابی) کی راہ

نہیں کھوتا، میں اپنے نفس کی پاکی کا دعوی نہیں کرتی، آدمی کا نفس تو برائی کے لئے بڑا ہی ابھارنے والا ہے مگر ہاں اسی حال میں کہ میرا پروردگار رحم کرے بلا شبہ میرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا، بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔

ہم نے اس آیت کا ترجمہ مشہور مفسر ابن حیان اندلسی کی تفسیر کے مطابق کیا ہے، دوسرے مفسرین اس کے علاوہ تفسیر کرتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) اور ان کے شاگرد رشید حافظ عماد الدین بن کثیر اپنی تفسیر میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں۔

"یہ میں نے اس لئے کہا کہ اس (عزیز) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی (اس سے زیادہ اور کوئی) خیانت نہیں کی (جس کا حال اسے معلوم ہے) اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے مکر کو کامیاب نہیں کرتا (سوا گر میں نے اس سے زیادہ خیانت کی ہوتی تو اس کا بھی پردہ فاش ہو کر رہتا) اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتی، بے شک نفس البتہ برائی کیلئے بڑا ہی برا ابھارنے والا ہے مگر جس پر میرا پروردگار رحم کر دے، بے شک میرا پروردگار بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔"

یعنی انھوں نے اس مقولہ کو عزیز کی بیوی کا مقولہ قرار دے کر لم اخنہ کی ضمیر کا مرجع عزیز کو قرار دیا ہے۔

اور عام مفسرین اس پورے مقولے کو حضرت یوسف علیہ السلام کا مقولہ قرار دیتے ہیں اور لم اخنہ کی ضمیر کو اسی طرح عزیز کی بیوی کی جانب پھیرتے ہیں جس طرح حافظ ابن تیمیہ کی رائے ہے اور آیت کا اس طرح ترجمہ کرتے ہیں:۔

"یوسف نے کہا یہ اس واسطے کہ عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اسکے پیٹھ پیچھے اسکی خیانت نہیں کی اور اللہ تعالیٰ دغابازوں کا فریب کامیاب نہیں کرتا، اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتا، بے شک نفس سکھلاتا ہے برائی مگر یہ کہ رحم کرے میرا پروردگار، بے شک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔"

اور ما ابرئ نفسی کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے چونکہ اپنی عصمت نفس کا اس موقعہ پر زبردست مظاہرہ کیا تھا تو ایک جلیل القدر نبی اور مقرب بارگاہ الٰہی ہونے کی وجہ سے یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری تھا کہ میری پاکبازی اور عصمت کا یہ معاملہ میرے اپنے نفس کی بدولت نہیں ہے کیوں کہ نفس انسانی تو اکثر برائی پر ابھارتا ہے بلکہ یہ محض خدائی رحمت و عنایت کا صدقہ ہے اور یہی رحمت، عصمت انبیاء کی کفیل ہے۔

بہر حال وقت آ پہنچا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت و پاکبازی اور صداقت و طہارت کا معاملہ تہمت لگانے والوں کی زبان ہی سے واضح ہو جائے چنانچہ واضح اور ظاہر ہو گیا اور شاہی دربار میں مجرموں نے اعتراف جرم کر کے یہ بتا دیا کہ یوسف علیہ السلام کا دامن ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک اور منزہ ہے۔

لطیفہ

امام رازی (رحمۃ اللہ) فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام خدا کے سچے اور نبی معصوم تھے اس لئے ان کا دامن ہر قسم کی آلائش سے پاک صاف تھا، اور ان کی مقدس زندگی کا یک لمحہ بھی کسی آلودگی سے ملوث نہیں ہوا تھا۔ اسلئے خدائے تعالیٰ کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق جس قدر بھی شخصیتیں تھیں ان سب کی زبانی ان کی طہارت نفس اور عصمت کا اعتراف کرایا۔

اَلفَضلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ

اچھا یوسف علیہ السلام کے علاوہ اس واقعہ کی شخصیتیں کون ہیں؟ عزیز مصر کی بیوی، شہری عورتیں، اور عزیز کی بیوی کا رشتہ دار یہی افراد ہیں جو کسی طرح تحقیق طلب معاملہ سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سب پہلے عزیز کی بیوی کا رشتہ دار سامنے آتا ہے اور پیراہن کے چاک ہونے کا عاقلانہ فیصلہ دے کر یوسف علیہ السلام کی پاکی کا اظہار کرتا اور عورت کو مجرم ٹھہراتا ہے، اس کے بعد حقیقت حال واضح ہو جانے پر عزیز بھی اقرار کرتا ہے کہ یوسف علیہ السلام بے گناہ بے خطاء اور معصوم ہے اور يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا کہہ کر یوسف علیہ السلام سے معذرت کرتا اور اپنی ناموس کی حفاظت کی خاطر معاملہ کو ختم کرنے کی درخواست کرتا ہے تیسرا نمبر شہری عورتوں کا ہے۔ جب بادشاہ بھرے دربار میں یوسف کے معاملہ کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے بے تامل کہہ دیا حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ اور اس طرح یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی پر مہر لگادی یہ سب شہادتیں اگر یوسف علیہ السلام کے عزیزوں، رشتہ داروں اور حامیوں کی جانب سے نہ تھیں بلکہ ایک اجنبی ملک عزیز کی بیوی کے ہم قوم اور اہل خاندان کی شہادتیں تھیں، تاہم وہم وگمان ہو سکتا تھا کہ کچھ عجب نہیں کہ اس معاملہ میں کسی حد تک "اگر چہ بہت تھوڑا ہی سہی" یوسف علیہ السلام کا بھی ضرور قصور ہوگا لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم الشان فضل وکرم تھا کہ اس نے اپنے پاک اور مقدس بندہ کی عصمت کے اعلان اور اس کے بارہ میں شائبہ سوء ظن کے انہدام کیلئے علی رؤس الاشہاد خود مجرم سے اقرار جرم کرایا، اور اس ہی کی زبان سے یوسف علیہ السلام کی عصمت وصداقت کی شہادت دلا کر حقیقت حال آشکارا کر دی اور شاہی دربار میں عزیز کی بیوی کو یہ کہنا پڑا کہ اَلْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ (اب حق ظاہر ہو گیا میں نے ہی اس کو اپنے نفس کے لئے پھسلایا تھا اور بلا شبہ وہ سچا ہے)۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ (سورۂ یوسف)

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

فرعون پر جب حقیقت حال منکشف ہوگئی تو اس کے قلب میں حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت وجلالت قدر کا سکہ بیٹھ گیا ساقی کا حسن عقیدت کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی عقل ودانش کا ذکر اپنی خواب کی بہترین اور دل لگتی تعبیر اور عصمت نفس کا یہ انکشاف یہ سب امور تھے جنھوں نے مل کر بادشاہ کو اس بزرگ اور پر عظمت ہستی کی دید اور اس سے استفادہ کا عاشق بنادیا وہ کہنے لگا:

اِئْتُوْنِیْ بِہٖٓ اَسْتَخْلِصْہُ لِنَفْسِیْ (یوسف ع ۷)

اس کو (جلد) میرے پاس لاؤ کہ میں اس کو خاص اپنے کاموں کیلئے مقرر کر دوں۔

یوسف علیہ السلام اب بایں رعنائی و دلبری، بایں عصمت و پاکبازی، اور بایں عقل و دانش زنداں سے نکل کر بادشاہ کے دربار میں تشریف لائے، بات چیت ہوئی تو بادشاہ حیران رہ گیا کہ اب تک جس کی راست بازی امانت دار اور وفاء عہد کا یہ کچھ تجربہ کیا تھا وہ عقل و دانش اور حکمت و فطانت میں بھی آپ اپنی نظیر ہے اور مسرت کے ساتھ کہنے لگا:

اِنَّکَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَکِیْنٌ اَمِیْنٌ ○

بلا شبہ آج کے دن تو ہماری نگاہوں میں بڑا صاحب اقتدار اور امانت دار ہے

پھر ان سے دریافت کیا کہ میرے خواب میں جس قحط سالی کا ذکر ہے اس کے متعلق مجھ کو کیا کیا تدابیر اختیار کرنی چاہییں، حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ○

یوسف نے کہا: اپنی مملکت کے خزانوں پر آپ مجھے مختار کیجئے میں حفاظت کر سکتا ہوں اور میں اس کام کا جاننے والا ہوں۔

چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور حضرت یوسف کو اپنی تمام مملکت کا امین و کفیل بنا دیا اور شاہی خزانوں کی کنجیاں ان کے حوالہ کر کے مختار عام کر دیا، تورات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> یہ تعبیر فرعون کی نگاہ میں اور اسکے سب نوکروں کی نظر میں اچھی معلوم ہوئی، فرعون نے اپنے نوکروں کو کہا کیا ہم ایسا جیسا یہ مرد کہ جس میں خدا کی روح ہے پا سکتے ہیں؟ اور فرعون نے یوسف سے کہا از بس کہ خدا نے تجھے اس سب میں بینائی دی ہے سو کوئی تجھ سا عاقل و دانشور نہیں ہے تو میرے گھر کا مختار ہو اور اپنا حکم میری سب رعیت پر جاری کر، فقط تخت نشینی میں میں تجھ سے بزرگ تر رہوں گا، پھر فرعون نے یوسف سے کہا دیکھ میں نے تجھے ساری زمین مصر پر حکومت بخشی اور فرعون نے اپنی انگشتری اپنے ہاتھ سے نکال کر یوسف کے ہاتھ میں پہنا دی اور اس کو کتان کا لباس پہنایا اور سونے کا طوق اس کے گلے میں ڈالا اور اس نے اسے مصر کی ساری مملکت پر حاکم کیا، اور فرعون نے یوسف کو کہا میں فرعون ہوں اور بغیر تیرے مصر کی ساری زمین میں کوئی انسان اپنا ہاتھ یا پاؤں نہ اٹھائے گا۔" (پیدائش باب ۴۱ آیات ۳۷-۴۴)

اللہ اللہ! خدائے تعالیٰ کی قدرت اور اس کے عطاء و کرم کی یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ کل جس ہستی کو مصر کی متمدن قوم، بدوی اور صحرائی سمجھتی تھی، جو بدوی تھا اور غلام بھی اس کو پہلے ایک سردار کے گھر کا مختار اس کی نگاہوں میں محترم و معزز اور امین و فطین بنایا، اور پھر قید خانہ کی زندگی سے نکالا تو مملکت مصر، اور قوم مصر کا مالک و مختار بنا دیا، اور اس مرتبہ پر پہنچا دیا کہ اسباب دنیوی کے ماتحت جس کا تصور بھی ممکن نہ تھا یہ قادر مطلق کی کارفرمائی

کا معجزانہ مظاہر نہیں تو اور کیا ہے کہ کل جو کنعان میں گلہ بانی کر رہا تھا وہ آج وقت کی سب سے بڑی متمدن قوم کا مختار و مالک بن کر جہاں بانی کر رہا ہے سچ ہے جس کو وہاں قبولیت کا شرف حاصل ہو گیا اس کے لئے راہ کی تمام دشواریاں ہیچ ہیں اور حالات کی نامساعدت پرکاہ کی وقعت بھی نہیں رکھتی۔

اسی لئے حق تعالیٰ نے "عزیز" کے کاروبار کا مختار بنا کر یوسف علیہ السلام کے لئے یہ فرمایا تھا کہ ہم نے اس کو "تمکین فی الارض" عطا کر دی اور اب جبکہ اس آغاز کی یہ انتہا نمود میں آ گئی تو پھر ارشاد فرمایا:

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ○ وَلَأَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○ (یوسف)

اور اسطرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف علیہ السلام کے قدم جمادئے کہ جس جگہ سے چاہے حسب مرضی رہنے سہنے کا کام لے ہم جسے چاہتے ہیں (اسی طرح) اپنی رحمت سے فیض یاب کر دیتے ہیں اور نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے اور جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور بدعملیوں سے بچتے رہے ان کیلئے تو آخرت کا اجر اس سے کہیں بہتر ہے۔

سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے دو جگہ "تمکین فی الارض" (زمین کا مالک بنا دینا) کی بشارت سنائی گئی ہے اور دونوں مقام پر تعبیر کا نیا اسلوب اختیار کیا گیا ہے اس کے متعلق مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں کیا خوب کہا ہے:

حضرت یوسف علیہ السلام کی مصری زندگی کے دو انقلاب انگیز نقطے تھے، ایک وہ جب غلام ہو کر بکے اور پھر عزیز کی نظروں میں ایسے معزز ہوئے کہ اس کے علاقے کے مختار ہو گئے، دوسرا یہ کہ قید خانہ سے نکلے اور نکلتے ہی وہاں پہنچ گئے کہ حکمرانی کی مسند اجلال پر جلوہ آرا نظر آئے پس جب پہلے انقلاب تک سرگزشت پہنچی تھی تو آیت (۲۱) میں حکمت الٰہی کی کرشمہ سنجیوں پر توجہ دلائی تھی کہ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْأَرْضِ اور اب کہ دوسرا انقلاب پیش آیا تو اسی طرح آیت (۵۲) میں فرمایا كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْأَرْضِ ، وہاں چونکہ معاملہ مصر کی ابتدا ہوئی تھی اور ابھی حضرت یوسف علیہ السلام کو حکمرانی کی دانش سیکھنی باقی تھی اس لئے فرمایا تھا وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ یہاں چونکہ تکمیل کار کے بعد اس کا نتیجہ ظاہر ہو گیا تھا اسلئے فرمایا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ یہ اس لئے ہوا کہ ہمارا قانون ہے نیک عمل کا بیج کبھی ضائع نہیں ہوتا ضروری ہے کہ پھل لائے۔ (ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۲۳۵ (نوٹ))

شروع واقعہ میں یہ کہا گیا ہے کہ سورۂ یوسف کا نزول یہودیوں کے اس سوال پر ہوا جو انھوں نے مشرکین مکہ کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا: وہ یہ کہ "ابراہیم علیہ السلام کی نسل مصر میں کیسے آئی؟"

اس لئے آیت زیر بحث کی تفسیر میں شاہ عبدالقادر (نوراللہ مرقدہ) ارشاد فرماتے ہیں:

یہ جواب ہوا ان کے سوال کا کہ "اولاد ابراہیم علیہ السلام اس طرح شام سے آئی مصر میں" اور بیان ہوا کہ بھائیوں نے حضرت یوسف کو گھر سے دور پھینکا تا کہ ذلیل ہو، اور اللہ نے زیادہ عزت دی اور ملک پر اختیار دیا ویسا ہی ہوا ہمارے حضرت ﷺ کو۔ (موضح القرآن سورہ یوسف)

غرض حضرت یوسف علیہ السلام نے سلطنت مصر کے مختار کل ہونے کے بعد خواب سے متعلق وہ تمام تدابیر شروع کر دیں جو چودہ سال کے اندر مفید کار ہو سکیں اور رعایا قحط سالی کے ایام میں بھی بھوک اور پریشان حالی سے محفوظ رہ سکے۔ چونکہ یہ تفصیل، خواب اور اس کی تعبیر کے ضمن میں خود بخود ذہن میں آجاتی ہے، اسلئے قرآن عزیز نے واقعہ کے ان غیر ضروری حصوں کو بیان نہیں کیا۔ البتہ تورات نے ان تفصیلات کو بھی دہرایا ہے۔

یوسف علیہ السلام جس وقت مصر کے بادشاہ فرعون کے حضور کھڑا ہوا تمیں برس کا تھا اور یوسف فرعون کے حضور سے نکل کر مصر کی ساری زمین میں پھرا، اور بڑھتی کے سات برس میں زمین مالا مال ہوئی تب اس نے ان سات برسوں کی ساری چیزیں کھانے کی جو سر زمین مصر میں تھیں جمع کیں اور اس نے ان کھانے کی چیزوں کو ذخیرہ کیا اور ان کھیتیوں کی جو ہر بستی کے آس پاس تھے کھانے کی چیزیں اسی بستی میں رکھیں، اور یوسف علیہ السلام نے غلہ بہت کثرت سے جیسے دریا کی ریت ایسا کہ وہ حساب کرنے سے باز رہا جمع کیا، کیونکہ وہ بے حساب تھا، اور سات برس سستی کے جو زمین مصر میں تھے آخر ہوئے اور گرانی کے سات برس جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے کہا تھا آنے شروع ہوئے اور سب زمین میں گرانی ہوئی پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی پھر جب ساری زمین مصر بھوک سے ہلاک ہونے لگی تو خلق روٹی کے فرعون کے آگے چلائی، فرعون نے سب مصریوں کو کہا کہ یوسف علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ جو تمہیں کہے سو کرو، اور تمام روئے زمین پر کال تھا، اور یوسف علیہ السلام نے ذخیرے کے کھتے کھول کے مصریوں کے ہاتھ بیچے اور مصر کی زمین میں کال بہت بڑھا اور سارے ملک مصر میں مول لینے آئے، کیونکہ سب ملکوں میں سخت کال تھا۔

جب یعقوب علیہ السلام نے دیکھا کہ مصر میں غلہ ہے تب یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم کیوں ایک دوسرے کو تاکتے ہو، دیکھو، میں نے سنا ہے کہ مصر میں غلہ ہے تم وہاں جاؤ اور وہاں سے ہمارے لئے مول لو، تا کہ ہم جئیں اور مریں نہیں۔

(پیدائش باب ۴۱ آیات ۴۶، ۴۷، ۵۳، ۵۷، ۵۶، باب ۴۲ آیت ۱۔ ۲)

غرض جب قحط سالی کا زمانہ شروع ہوا تو مصر اور اس کے قرب جوار کے علاقہ میں بھی سخت کال پڑا اور کنعان میں خاندان یعقوب بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا جب حالت نزاکت اختیار کر گئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں سے کہا کہ مصر میں عزیز مصر نے اعلان کیا ہے کہ اس کے پاس غلہ محفوظ ہے تم سب جاؤ اور غلہ خرید کر لاؤ چنانچہ باپ کے حکم کے مطابق یہ کنعانی قافلہ عزیز مصر سے غلہ لینے کے لئے مصر روانہ ہوا، خدا کی قدرت دیکھئے کہ برادران یوسف کا یہ قافلہ اسی بھائی سے غلہ لینے چلا ہے جس کو اپنے خیال میں وہ کسی مصری گھرانے کا ایک

معمولی اور گمنام غلام بنا چکے تھے، مگر اس یوسف علیہ السلام فروش قافلہ کو کیا معلوم کہ وہ کل کا غلام آج مصر کے تاج و تخت کا مالک و مختار کل ہے اور اس کو اسی کے سامنے عرض حال کرنا ہے بہر حال کنعان سے چلے اور مصر جا پہنچے اور جب دربار یوسفی میں پیش ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا۔ اور کیوں نہ پہچانتے رنگ ڈھنگ بول چال، لب و لہجہ، نقشہ و صورت اور ساری ادائیں یوسف علیہ السلام کی جانی پہچانی تھیں البتہ وہ یوسف علیہ السلام کو نہ پہچان سکے، اور کس طرح پہچانتے؟ کل جو چھوٹا سا بچہ تھا آج وہ تقریباً چالیس سالہ تجربہ کار انسان ہے، نقشہ و رنگ اور بول چال سے کچھ شبہ بھی کرتے تو کس طرح؟ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یوسف علیہ السلام اور تخت شاہی! مگر یہ واقعہ تھا، حقیقت تھی اور اپنے برگزیدہ بندہ کے ساتھ رب العلمین کا وہ معاملہ تھا جو صفحۂ دنیا پر ثبت ہو کر رہا۔

وَجَآءَ إِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ○ (یوسف)

اور (پھر ایسا ہوا کہ قحط سالی کے زمانہ میں) یوسف علیہ السلام کے بھائی (غلہ خریدنے مصر میں) آئے، وہ جب یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے تو اس نے فوراً ان کو پہچان لیا اور وہ یوسف علیہ السلام کو نہ پہچان سکے۔

تورات کا بیان ہے کہ برادران یوسف پر جاسوسی کا الزام لگایا گیا اور اس طرح ان کو یوسف علیہ السلام کے سامنے حاضر ہو کر بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقعہ ملا۔

غرض حضرت یوسف علیہ السلام نے والد، حقیقی بھائی، اور گھر کے حالات کو خوب کرید کرید کر پوچھا اور آہستہ آہستہ سب کچھ معلوم کر لیا، اور پھر ان کو حسب مرضی غلہ بھر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ قحط اس قدر سخت ہے کہ تم کو دوبارہ یہاں آنا پڑے گا اس لئے یاد رکھو کہ اب کی مرتبہ اگر تم اپنے چھوٹے بھائی بنیامین کو ساتھ نہ لائے جس کے متعلق تم نے مجھ سے کہا ہے کہ اس کا بھائی یوسف علیہ السلام گم ہو گیا ہے اور اس لئے تمہارا باپ اس کو کسی طرح جدا نہیں کرتا، تو تم کو ہرگز غلہ نہیں ملے گا۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِأَخٍ لَّكُمْ مِّنْ أَبِيْكُمْ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّيْٓ أُوْفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ○ فَإِنْ لَّمْ تَأْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ○

اور جب یوسف علیہ السلام نے ان کا سامان مہیا کر دیا تو کہا اب کے آنا تو اپنے سوتیلے بھائی بنیامین کو بھی ساتھ لانا، تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ میں تمہیں (غلہ) پوری تول دیتا ہوں اور باہر سے آنے والوں کیلئے بہتر مہماں نواز ہوں لیکن اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو پھر یاد رکھو نہ تو تمہارے لئے میرے پاس خرید و فروخت ہو گی نہ تم میرے پاس جگہ پاؤ گے۔

برادران یوسف علیہ السلام نے کہا کہ ہم اپنے والد سے کہیں گے اور ہر طرح ترغیب دیں گے کہ وہ بنیامین کو ہمارے ساتھ یہاں بھیجنے پر راضی ہو جائے پھر جب وہ چلنے لگے اور یوسف علیہ السلام سے رخصت ہونے آئے تو انھوں نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ خاموشی کے ساتھ ان کے کجاووں میں ان کی پونجی بھی رکھ دو جو انھوں نے

غلہ کی قیمت کے نام سے دی ہے تاکہ جب گھر جا کر اس کو دیکھیں تو شاید پھر دوبارہ واپس آئیں جب یہ قافلہ کنعان واپس پہنچا تو انھوں نے اپنی تمام سرگذشت اپنے باپ یعقوب علیہ السلام کو سنائی اور ان سے کہا کہ مصر کے والی نے صاف صاف ہم سے کہہ دیا ہے کہ اس وقت تک یہاں نہ آنا اور نہ غلہ کی خرید کا دھیان کرنا جب تک کہ اپنے سوتیلے بھائی بنیامین کو ساتھ نہ لاؤ لہذا تم کو چاہیے کہ اسکو ہمارے ساتھ کردو ہم اسکے ہر طرح نگہبان اور محافظ ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کیا تم پر اسی طرح اعتماد کروں جس طرح اس کے بھائی یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں کر چکا ہوں اور تمہاری حفاظت ہی کیا؟ خدا ہی سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی رحم کرنے والا نہیں ہے۔

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ (سورۂ یوسف)

(یعقوب نے) کہا کیا میں تم پر اس (بنیامین) کے بارہ میں ایسا ہی اعتماد کروں جیسا اس سے پہلے اسکے بھائی (یوسف) کے بارہ میں کر چکا ہوں سو اللہ ہی بہترین حفاظت کرنے والا ہے اور وہی سب سے بڑھ کر رحم کرنیوالا ہے۔

اس گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد اب انھوں نے اپنا سامان کھولنا شروع کیا، دیکھا تو ان کی پونجی ان ہی کو واپس کر دی گئی ہے، یہ دیکھ کر وہ کہنے لگے اے باپ! اس سے زیادہ اور کیا ہم کو چاہیے؟ دیکھئے غلہ بھی ملا اور ہماری پونجی بھی جوں کی توں لوٹا دی گئی اس نے تو ہم سے قیمت بھی نہ لی، اب ہمیں اجازت دے کہ ہم دوبارہ اس کے پاس جائیں اور گھر والوں کے لئے رسد لائیں اور بنیامین کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دے ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ اور زیادہ لائیں گے کیوں کہ یہ غلہ جو پہلے ہم لائے تھے تھوڑا ہے۔

اور توراۃ میں ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام پونجی کو دیکھ کر ڈر گئے تھے کہ نہ معلوم اب کیا نئی آفت آئے مگر واقعات کی ترتیب اور حضرت یوسف علیہ السلام کے طرز عمل کے پیش نظر جس کا ذکر قرآن اور توراۃ دونوں میں یکساں طور پر کیا گیا ہے یہی صحیح ہے جو قرآن عزیز نے بیان کیا ہے برادران یوسف علیہ السلام خود اپنے ہاتھ سے غلہ کی قیمت ادا کر چکے تھے لین دین کے بعد ہی قافلہ کو روانگی کی اجازت ملی تھی پھر ہر ایک بھائی کے کجاوہ میں سے علیحدہ علیحدہ اس طرح قیمت کی واپسی، ہر عقلمند کے لئے یہی راہنمائی کرتی ہے کہ جس طرح والی مصر نے دوران قیام میں ہمارا اعزاز کیا اسی طرح یہ پونجی بھی اس نے واپس کر دی اور منت واحسان سے بچانے کے لئے اس کا اظہار بھی مناسب نہ سمجھا۔

بہر حال یعقوب علیہ السلام نے فرمایا میں بنیامین کو ہر گز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک تم اللہ کے نام پر مجھ سے عہد نہ کرو اور وہ یہ کہ جب تک ہم خود نہ گھیر لئے جائیں اور ہر طرح مجبور نہ کر دیے جائیں ہم ضرور ضرور اس کو تیرے پاس صحیح وسلامت لوٹائیں گے، جب ان سب نے متفق ہو کر باپ کے سامنے اس کا پختہ عہد

۱ پیدائش باب ۴۳۔ آیت ۳۵۔

کیااور ہر طرح اطمینان دلایاتب حضرت یعقوب نے فرمایاکہ یہ جو کچھ ہوا محض اسباب ظاہری کی بناپر ہے ورنہ کیاتم اور کیا تمہاری حفاظت اور کیاہم اور کیاہمارا عہد، ہم سب کواپنے اس معاملہ کو خدا کی نگہبانی میں دیناچاہیے۔

قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ○

یعقوب نے کہاہم نے جو قول وقرار کیاہے اس پر اللہ نگہبان ہے،

عہد و پیان کے بعد برادران یوسف کا قافلہ دوبارہ کنعان سے مصر کو روانہ ہو رہاہے اور اس مرتبہ بنیامین بھی ہمراہ ہے، حضرت یعقوب نے رخصت کرتے وقت نصیحت فرمائی کہ دیکھو سب ایک ہی دروازہ سے مصر میں داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے شہر میں داخل ہونااور یہ بھی فرمایاکہ اس نصیحت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تم اپنی تدابیر پر مغرور ہو بیٹھو کیونکہ میں تمہیں کسی ایسی بات سے ہر گز نہیں بچاسکتاجو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہونے والی ہو، فرمان روائی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے میں نے اسی پر بھروسہ کیااور تمام بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرناچاہیے اس لئے میں نے جو کچھ کہاہے وہ صرف احتیاطی تدابیر کے طور پر ہے اور خدا پر بھروسہ اور یقین کے ساتھ اسباب ظاہری کو احتیاطی تدبیر کے لئے استعمال کرنا خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے۔

علماء تفسیر عام طور پر حضرت یعقوب کی اس نصیحت کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ عزیز مصر (حضرت یوسف) نے چونکہ پہلی مرتبہ ان کا کافی اعزاز کیاتھااور یہ قافلہ خاص شان کے ساتھ یوسف کی دعوت پر مصر میں داخل ہو رہاہے تو کہیں ایسانہ ہو کہ مصری ان سے حسد کرنے لگیں اور یہ ان کی تکلیف کا باعث بن جائے۔

لیکن بعض مفسرین اور مؤرخین اس کی وجہ دوسری بتلاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ تورات سے اس قدر ثابت ہو چکاہے کہ پہلی مرتبہ برادران یوسف پر جاسوسی کا گمان کیاجاچکاتھااور اگرچہ یوسف نے یہ الزام نہ لگایاہو لیکن مصریوں نے ضرور ان پر شبہ کیاتھا، اور حضرت یعقوب بیٹوں کی زبانی پوری تفصیل سن چکے تھے لہٰذا انھوں نے سوچاکہ اگر گیارہ نوجوان اس کروفر سے ایک ساتھ شہر میں داخل ہوں گے تو کہیں ایسانہ ہو کہ عزیز مصر کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی جاسوسی کے الزام میں گرفتار کرلئے جائیں، اس لئے نصیحت فرمادی کہ ایک جتھہ بناکر شہر میں داخل نہ ہوناجداجدادروازوں سے ایک مسافر کی طرح داخل ہونا۔

اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ یعقوب چونکہ صاحب علم و بصیرت تھے اور یہ دولت علم ہم نے ہی اس کو بخشی تھی اسلئے اس نے بیٹوں سے یہ نصیحت کی بات کہہ دی جو اس کے خیال میں آگئی تھی ورنہ توباپ کے حکم کی تعمیل کرنے کے باوجود بھی خدائے تعالیٰ کی مشیت نے جو کچھ مقرر کردیاتھااس کے مقابلہ میں ان کی یہ احتیاط کچھ بھی کام نہ آسکی۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ مَّا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ

النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۂ یوسف)

پھر جب یہ مصر میں اسی طرح داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے ان کو حکم کیا تھا تو یہ (احتیاط) ان کو اللہ تعالیٰ (کی مشیت) کے مقابلہ میں کچھ کام نہ آئی مگر یہ ایک خیال تھا یعقوب کے جی میں جو اس نے پورا کرلیا اور بلاشبہ وہ صاحب علم تھا اور ہم نے ہی اس کو یہ علم سکھایا تھا لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

مطلب یہ ہے کہ یعقوب نے جو کچھ کیا اس کو بمقتضائے علم یہی کرنا چاہئے تھا کیونکہ علم کی یہ دولت ہم نے ہی اس کو بخشی تھی مگر یہ ضروری نہیں کہ احتیاطی تدابیر ہر جگہ راست ہی آئیں اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کے برعکس مصلحت دیکھتی ہے تو پھر وہی ہو کر رہتا ہے اور سب تدبیریں بیکار ہو جاتی جیسا کہ آنے والے واقعہ میں بنیامین کے ساتھ پیش آیا کہ وہ روک لئے گئے اور ایسی مصلحت کے زیر اثر روک لئے گئے کہ اس کا انجام تمام خاندان یعقوب کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔

صورت یہ پیش آئی کہ جب برادران یوسف کنعان سے روانہ ہوئے تو راستہ میں بنیامین کو تنگ کرنا شروع کردیا۔ کبھی اسکو باپ کی محبت و عشق کا طعنہ دیتے اور کبھی اس بات پر حسد کرتے کہ عزیز مصر نے خصوصیت کے ساتھ اسکو کیوں بلایا ہے۔ بن یمین یہ سب کچھ سنتا اور خاموش رہتا، جب یہ سب منزل مقصود پر پہنچے تو حضرت یوسفؑ نے بنیامین کو اپنا تمام حال سنایا اور بتایا کہ میں تیرا حقیقی بھائی یوسف ہوں اور پھر تسلی و تشفی کی کہ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ان کی بدسلوکیوں کا دور ختم ہو گیا اب یہ تجھ کو کسی قسم کی ایذاء نہیں پہنچا سکیں گے۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰى إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّيْٓ أَنَا أَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۂ یوسف)

اور جب یہ سب یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی (بنیامین) کو اپنے پاس بٹھالیا اور اس سے (آہستہ سے) کہا میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں، بس جو بدسلوکی یہ تیری ساتھ کرتے آئے ہیں، تو اس پر غمگین نہ ہو۔

تورات میں ہے کہ یوسف نے بھائیوں کی بڑی مدارات کی اور نوکروں کو حکم دیا کہ ان کو شاہی مہمان خانہ میں اتاریں، اور ان کے لئے پر تکلف دعوت کا سامان کیا، چند روز کے قیام کے بعد جب یہ رخصت ہونے لگے تو یوسف نے حکم دیا کہ ان کے اونٹوں کو اس قدر لاد دو جتنا کہ یہ لے جا سکیں، حضرت یوسف کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح اپنے عزیز بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لیں مگر انتہائی اضطراب اور بے قراری کے باوجود ان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا اس لئے کہ حکومت مصر کے قانون میں کسی غیر مصری کو بغیر کسی معقول وجہ کے روک لینا سخت ممنوع تھا، اور حضرت یوسف یہ کسی طرح نہیں چاہتے تھے کہ اس وقت لوگوں پر یا ان کے بھائیوں پر اصل حقیقت منکشف ہو، بدیں وجہ خاموش رہے اور جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو کسی کو اطلاع کئے بغیر نشانی کے طور پر اپنا چاندی کا پیالہ بنیامین کے کجاوہ میں رکھ دیا۔

کنعان کے اس قافلہ نے ابھی تھوڑی ہی مسافت طے کی ہو گی کہ یوسف کے کارندوں نے شاہی

برتنوں کی دیکھ بھال کی تو اس میں پیالہ ندار دپایا سمجھے کہ شاہی محل میں کنعانیوں کے سوا دوسرا کوئی نہیں آیا اس لئے انھوں نے ہی یہ چوری کی ہے، فوراً دوڑے اور چلائے، قافلہ والو ٹھہرو تم چور ہو، برادرانِ یوسف علیہ السلام کار ندوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے ہم کو خواہ مخواہ کیوں الزام لگاتے ہو آخر معلوم تو ہو کہ تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے کارندے کہنے لگے کہ پادشاہ کا پیمانہ (پیالہ) گم ہو گیا ہے اور ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا کہ جو شخص اس چوری کا پتہ لگادے گا اس کو ایک اونٹ غلہ انعام میں ملے گا اور میں اس بات کا ضامن ہوں، برادران یوسف علیہ السلام نے کہا خدا علیم ہے کہ ہم مصر میں فساد اور شرارت کی غرض سے نہیں آئے اور تم جانتے ہو کہ ہم اس سے پہلے بھی غلہ لینے آچکے ہیں، ہم میں چوری کی قطعاً عادت نہیں ہے۔ کارندوں نے کہا "اچھا جس کے پاس سے یہ چوری نکلے اس کی سزا کیا ہونی چاہیے۔" انھوں نے جواب دیا کہ وہ خود آپ اپنی سزا ہے یعنی وہ تمہارے حوالے کر دیا جائے گا تاکہ وہ اپنے جرم کی پاداش میں پکڑ جائے، اور ہم اپنے یہاں ایسی زیادتی کرنے والوں کو یہی سزا دیا کرتے ہیں۔

کارندوں نے یہ جواب سنا تو پہلے دوسرے بھائیوں کے بوروں کی تلاشی لی اور جب ان میں پیالہ نہ نکلا تو آخر میں بنیامین کی خورجی کی تلاشی لی تو اس میں موجود تھا، انھوں نے وہ پیالہ نکال لیا اور قافلہ کو واپس لوٹا کر عزیز مصر "یوسف علیہ السلام" کی خدمت میں معاملہ کو پیش کیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے معاملہ کی نوعیت کو سنا تو دل میں بیحد مسرور ہوئے اور خدائے تعالیٰ کی کارسازی پر شکر ادا کیا جس بات کے لئے میں بیقرار تھا کہ کسی طرح بنیامین میرے پاس رک جائے اور وہ میرے ہاتھوں کسی طرح نہ بن پڑی اس کو قادر مطلق نے اس حکمت کے ساتھ پورا کر دیا اور یہ سوچ کر قطعاً خاموش رہے یہ ظاہر نہیں فرمایا کہ یہ پیالہ میں نے خود بنیامین کی خورجی میں اپنی نشانی کے طور پر رکھ دیا تھا ادھر بنیامین بھی جو کہ قبل ہی اپنے برادر بزرگ یوسف علیہ السلام سے واقف ہو چکا تھا اس واقعہ کو مرضی کے مطابق پا کر خاموش رہا۔

بردران یوسف علیہ السلام نے جب یہ دیکھا تو ان کی حاسدانہ رگ پھیڑک اٹھی اور انھوں نے یہ جھوٹ بولنے کی جرأت کی کہ اگر بنیامین نے یہ چوری کی ہے تو تعجب کا مقام نہیں ہے اس سے پہلے اس کا بڑا بھائی یوسف بھی چوری کر چکا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دیکھ کر بھی کہ میرے منہ پر ہی جھوٹ بول رہے ہیں ضبط سے کام لیا اور راز فاش نہ کیا اور دل میں کہنے لگے "تمہارے لئے سب سے بری جگہ ہے کہ تم ایسا جھوٹا الزام لگا رہے ہو اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت کا خوب جاننے والا ہے" یا خود ان ہی سے مخاطب ہو کر فرمایا جیسا کہ بعض مفسرین تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے یعنی ان کو شرمندہ کرتے ہوئے کہا کہ ابھی تو یہ کہتے تھے کہ ہم چوری کے قریب تک نہیں ہیں اور یا اب غیر حاضر بھائی پر چوری کا الزام لگا رہے ہو جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا خاندان ہی چوری پیشہ ہے، یہ کیسا برا مقام ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔

برادران یوسف علیہ السلام نے جب یہ رنگ دیکھا تو بہت گھبرائے اور باپ کا عہد و پیمان یاد آ گیا آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کس صورت سے بنیامین کو حاصل کریں؟ ہم تو پہلے ہی قول ہار چکے صرف ایک ہی پہلو باقی تھا کہ التجائیں اور خوشامدانہ عرض معروض کر کے عزیز مصر کو بنیامین کی واپسی کی ترغیب دلائیں، کہنے لگے "عزیز مصر!

ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے اس کو اس کے پہلے بھائی کا بھی بے حد غم ہے اور اسی لئے اسکا عاشق و متوالا ہے اس پر رحم کیجئے اور اسکی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو سزا کیلئے روک لیجئے، آپ ہم پر مہربان رہے ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جو احسان کرنے والے ہیں"۔ "عزیز مصر یوسف علیہ السلام نے کہا "پناہ بخدا!" یہ کیسے ممکن ہے، ہم اگر ایسا کریں تو ظالم ہوں گے۔"

جب اس جانب سے مایوس ہو گئے تو اب الگ خلوت میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے، ان میں سے بڑے نے کہا "بھائی تم کو معلوم ہے کہ والد نے بنیامین کے متعلق کس قدر سخت اور پختہ عہد و پیمان ہم سے لیا ہے اور اس سے پہلے تم یوسف کے ساتھ جو ظلم و زیادتی کر چکے ہو وہ بھی سامنے ہے۔ اس لئے میں تو اب اس جگہ سے اس وقت تک ٹلنے والا نہیں کہ یا والد مجھ کو کنعان آنے کی اجازت دیں اور یا خدا میرے لئے کوئی دوسرا فیصلہ کر دے، جاؤ تم سب ان کے پاس جاؤ اور عرض کرو کہ تمہارے بیٹے بنیامین نے چوری کی اور جو بات ہمارے جاننے میں آئی وہی سچ سچ آپ کے سامنے کہہ دی ہم کو کچھ غیب کا علم تو تھا نہیں کہ پہلے سے جان لیتے کہ اس سے ایسی حرکت سرزد ہونے والی ہے، اور یہ بھی کہنا کہ آپ مصر کے لوگوں سے اس کی تصدیق کر لیں نیز اس قافلہ سے بھی کہ جس کے ساتھ ہم مصر سے یہاں آئے ہیں کہ ہم اس معاملہ میں بالکل سچے ہیں۔"

اس مشورہ کے مطابق وہ کنعان واپس آئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے بے کم و کاست سارا واقعہ کہہ سنایا، قرآن عزیز نے یوسف علیہ السلام کے سوتیلے بھائیوں کی اس گفتگو کو جو اس سلسلہ میں انھوں نے یعقوب علیہ السلام کو سے کی اس طرح نقل کیا ہے:

فَقُوْلُوْا یٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَکَ سَرَقَ

پس (باپ کے پاس جا کر) کہنا اے باپ تیرے بیٹے نے چوری کر لی۔

اور اس سے وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے ان سوتیلے بھائیوں کی شقاوت کا اندازہ کیجئے کہ ایسے سخت وقت میں بھی بوڑھے باپ کو طعن و تشنیع اور ملامت سے نہ چھوڑا اور یہ نہ کہا کہ ہمارے بھائی سے یہ غلطی ہو گئی بلکہ ان کی طرف نسبت کر کے یہ کہا کہ تیرے بیٹے ہاں چہیتے اور پیارے بیٹے نے چوری کر کے ہم سب کو ذلیل کیا ہم کو کیا معلوم تھا کہ اس کے ایسے گن ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ان کی صداقت کا تجربہ کر چکے تھے اس لئے فرمایا نہیں تمہارے جی نے ایک بات بنالی ہے واقعہ یوں نہیں ہے "بنیامین اور چوری؟" یہ نہیں ہو سکتا۔ خیر اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں "ایسا صبر کہ بہتر سے بہتر ہو" خدائے تعالیٰ سے کیا بعید ہے کہ وہ ایک دن ان گم گشتگان کو پھر جمع کر دے اور ایک ساتھ ان دونوں کو مجھ سے ملا دے، بلاشبہ وہ دانا، حکمت والا ہے اور ان کی جانب سے رخ پھیر لیا اور فرمانے لگے: "آہ فراق یوسف کی غم انگیزی" حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں شدت غم میں روتے روتے سپید پڑ گئی تھیں اور سینہ غم کی سوزش سے جل رہا تھا مگر صبر کیساتھ اللہ پر تکیہ کئے بیٹھے تھے،

بیٹے یہ حال دیکھ کر کہنے لگے "بخدا تم ہمیشہ اسی طرح یوسف کی یاد میں گھلتے رہو گے یا اسی غم میں جان دیدو گے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا "میں کچھ تو شکوہ نہیں کرتا اور نہ تم کو ستاتا ہوں"

إِنَّمَآ أَشْكُوْ بَثِّيْ وَحُزْنِيْ إِلَى اللّٰهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (یوسف)

بلکہ میں تو اپنی حاجت اور اپنا غم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہوں میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

ہم نے شاہی پیالہ کے واقعہ کی تفسیر میں عام تفاسیر سے جدا مفسرین کے اس قول کو اختیار کیا ہے جس کو متاخرین کے یہاں "قول شاذ کا درجہ" حاصل ہے مگر اس مقام پر سب سے بہتر اور بے غل و غش تفسیر ہے، کتب تفاسیر میں عام طور پر آیت جعل السقاية في رحل اخيه (رکھ دیا یوسف نے پیالہ کو بھائی (بنیامین) کے کجاوہ میں) میں حضرت یوسف علیہ السلام کے اس عمل کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ وہ چونکہ بنیامین کو روکنا چاہتے تھے اور مصر کا قانون اس کی اجازت نہ دیتا تھا اس لئے انھوں نے یہی سمجھ کر یہ پیالہ رکھ دیا تھا کہ اس طرح بنیامین چور بن جائے گا اور میں اس کو روک سکوں گا اور پھر آیت اذن مؤذن میں پکارنیوالی شخصیت بھی یوسف علیہ السلام ہی کو بتاتے ہیں، اور اس طرح جب ان پر جھوٹ کا الزام عائد ہونے لگتا ہے تو اس کو "توریہ" سے تعبیر کر کے ان کی معصوم شخصیت کو اس الزام سے بری کرتے ہیں، حالانکہ قرآن عزیز کے اسلوب بیان میں کوئی ایسا اشارہ تک موجود نہیں ہے جس سے حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت پر جھوٹ کا شبہ بھی ہو سکتا ہو یا توریہ کہنے کی ضرورت پیش آتی ہو۔

یہ مانا کہ کسی محمود اور نیک مقصود کی خاطر "توریہ" بری اور معیوب بات نہیں ہے، بلکہ اچھی بات ہے لیکن یہ کہنے والے اس کو قطعاً بھول جاتے ہیں کہ معاملہ ہمارا تمہارا یا صالحین اور ابرار کا نہیں ہے بلکہ خدا کے پیغمبر اور رسول کا معاملہ ہے، ان کی اخلاقی زندگی کا معیار اس قسم کی اصطلاحی تعبیروں سے بہت بلند اور برتر ہے، وہ اپنی نیک خواہشات میں بھی عزیمت کی بلندی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، پھر کیا ضرور کہ ایسے موقعہ پر جہاں قرآن عزیز اسلوب بیان مجبور نہ کرتا ہو اور احادیث صحیحہ اس کی تائید نہ کرتی ہوں خواہ مخواہ ان کی جانب ایسی بات منسوب کی جائے جس کے درست کرنے اور پیغمبرانہ معصومیت کو محفوظ رکھنے کے لئے "توریہ" کی پناہ لینی پڑے۔

اس مقام پر قرآن عزیز میں حضرت یوسف علیہ السلام کا صرف یہ عمل مذکور ہے کہ انھوں نے شاہی پیمانہ (چاندی کے کٹورے) کو بنیامین کی خورجی میں رکھ دیا (تاکہ بھائی کے پاس ایک نشانی رہے)

جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ أَخِيْهِ

اس (یوسف) نے اپنے بھائی (بنیامین) کے کجاوہ میں کٹورہ رکھ دیا۔

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کا کوئی ذکر نہیں بلکہ تمام گفتگو کا معاملہ بھائیوں اور کارندوں کے درمیان دائر نظر آتا ہے۔

ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيْرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُوْنَ ○ قَالُوْا وَأَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّا ذَا تَفْقِدُوْنَ ○ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّأَنَا بِهٖ

زَعِيْمٌ ○ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِيْنَ ○ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ إِنْ كُنْتُمْ كَاذِبِيْنَ ○ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِيْنَ ○ (یوسف)

پھر پکارا پکارنے والے نے اے قافلہ والو! تم تو البتہ چور ہو، وہ کہنے لگے ان کی جانب منہ کر کے تمہاری کیا چیز گم ہو گئی، وہ کارندے بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ (یوسف) کا پیمانہ (کٹورا) اور جو کوئی اس کو لائے اس کو ملے ایک اونٹ کا بوجھ (غلہ) اور میں ہوں اس کا ضامن۔ وہ بولے خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ ہم شرارت کرنے کو نہیں آئے ملک (مصر) میں اور نہ ہم کبھی چور تھے، وہ (کارندے) بولے پھر کیا سزا ہے اس کی اگر تم نکلے جھوٹے۔ کہنے لگے اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں سے ہاتھ آئے وہی اس کے بدلے میں جائے، ہم یہی سزا دیتے ہیں ظالموں کو۔

اس تمام مرحلے کے بعد یہ معاملہ قانونی طور عزیز مصر (یوسف علیہ السلام) کے سامنے پیش ہوا اور ان کی تلاشی لی گئی تو بنیامین کے کجادہ میں چاندی کا وہ پیمانہ موجود تھا۔

فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ أَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ أَخِيْهِ (یوسف)

پھر یوسف نے ان کی خورجیاں دیکھنی شروع کیں اپنے بھائی کی خورجی سے پہلے، آخر میں وہ برتن نکالا اپنے بھائی کی خورجی سے۔

اس تفصیل کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے احسان و انعام کا ذکر کرتا اور بتاتا ہے کہ یوسف علیہ السلام جس بات کے لئے بے قرار تھے اور مصری قانون کے تحت اس کو نہیں کر سکتے تھے ہم نے اپنی خفیہ تدبیر سے اس کا سامان بہم پہنچایا۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّنْ نَّشَآءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ○ (یوسف)

یوں خفیہ تدبیر کر دی ہم نے یوسف کے لئے وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی بنیامین کو اس بادشاہ (مصر) کے طریقے کے مطابق مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی چاہے ہم درجے بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں، اور ہر جاننے والے سے اوپر جاننے والا ہے۔

پس اس قدر صاف اور واضح بات کی ایسی تشریح کس لئے کی جائے کہ جس میں یوسف علیہ السلام کے کلام کو توریہ پر محمول کرنے کی ضرورت پڑے اور کیوں نہ وہ معنی لئے جائیں کہ جس سے نہ کوئی شبہ پیدا ہو اور نہ اس کے لئے تاویلات کی ضرورت پیش آئے۔

بہر حال حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے فرمایا "دیکھو ایک مرتبہ پھر مصر جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کی تلاش و جستجو کرو اور خدا کی رحمت سے ناامید و مایوس نہ ہو، اس لئے کہ خدا کی رحمت سے ناامیدی کافروں کا شیوہ ہے۔"

يَابَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَأَخِيْهِ وَلَا تَيْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِنَّهٗ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ ۝ (سورۂ یوسف)

اے میرے بیٹو (مصر) جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بلاشبہ اللہ کی رحمت سے کافروں کے سوا کوئی ناامید نہیں ہوتا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کے ساتھ یوسف علیہ السلام کا بھی نام لیا۔ حالانکہ بظاہر اس مقام پر ان کے سراغ کا کوئی جوڑ نہیں لگتا، معلوم ہوتا ہے کہ اب حضرت حق نے یعقوب علیہ السلام کے غم اور دکھ کی زندگی ختم کرنے کا ارادہ کر لیا اور یعقوب علیہ السلام کو یہ اشارہ کر دیا کہ بنیامین کے اس قصہ میں یوسف علیہ السلام کی ملاقات کا راز بھی محفوظ ہے اور تب ہی تو یوسف علیہ السلام کے پیغام بشارت آنے پر (جس کی تفصیل آنے والی ہے) انھوں نے یہ ارشاد فرمایا:

أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّيْٓ أَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (یوسف)

کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

غرض برادران یوسف علیہ السلام نے "کچھ تو باپ کے اصرار پر اور کچھ اس لئے کہ واقعی قحط کی شدت انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی تھی اور غلہ کا آس پاس نام و نشان نہ تھا" تیسری بار پھر مصر کا ارادہ کیا، اور جب دربار شاہی میں پہنچے تو کہنے لگے "اے عزیز! ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط نے سخت پریشانی میں ڈال دیا ہے اور اس مرتبہ ہم پونجی بھی بہت تھوڑی لائے ہیں یہ حاضر ہے اب معاملہ خرید و فروخت اور لین دین کا نہیں تھے ہم سے قیمت ادا نہیں ہو سکتی، اس لئے تیری خدمت میں ہماری یہ درخواست ہے کہ ازراہ کرم ہم کو غلہ کی پوری تول دیجئے اور ہمیں ضرورت مند سمجھ کر اپنی جانب سے احسان فرمایئے، اللہ تعالیٰ صدقہ خیرات کرنے والے کو نیک بدلہ دیتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین اور بھائیوں کی اس پریشانی کا حال سنا اور ان کی اس عاجزانہ درخواست اور نیازمندانہ طلب کی مجبور کن حالت پر غور کیا تو دل بھر آیا اور اب ضبط نہ ہو سکا کہ خود کو چھپائیں اور راز ظاہر نہ ہونے دیں، آخر فرمانے لگے:

هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَأَخِيْهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُوْنَ ۝ (سورۂ یوسف)

کیوں جی تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا معاملہ کیا جبکہ تم جہالت میں سرشار تھے،

بھائیوں نے اس موقع پر غیر متوقع گفتگو کو سنی تو چونکے اور لب و لہجہ پر غور کر کے ایک دم ان کو کچھ خیال آیا اور کہنے لگے

قَالُوْٓا أَئِنَّكَ لَأَنْتَ يُوْسُفُ

(انھوں نے کہا) کیا تو واقعی یوسف ہی ہے۔

یعنی اس حیرانی و پریشانی میں تھے کہ ہم "عزیز مصر" کے دربار میں کھڑے ہیں، اس سے باتیں کر رہے ہیں یہ

بے محل یوسف کا ذکر کیسا؟ صورت شکل اور گفتگو کے طرز وانداز کو اب دوسری نیت سے دیکھا تو یوسف ؑ کی شکل نگاہ کے سامنے پھر گئی اور سمجھ گئے کہ بے شک یہ یوسف ہے مگر حالات موجودہ کے پیش نظر قدرتی طور پر یہ جرأت نہیں کی کہ یہ کہہ اٹھیں کہ تو یوسف ہے بلکہ ایسے موقعہ کے مناسب لب ولہجہ سے کہنے لگے کیا آپ واقعی یوسف ؑ ہی ہیں؟

حضرت یوسف ؑ نے فرمایا

أَنَا يُوسُفُ وَهٰذَآ أَخِي قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَآ إِنَّهُ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ○ (سورۂ یوسف)

ہاں میں یوسف ہوں اور یہ (بنیامین) میرا ماں جایا بھائی ہے اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا اور جو شخص بھی برائیوں سے بچے اور (مصیبتوں میں) ثابت قدم رہے تو اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

اب برادران یوسف ؑ کے پاس ندامت، شرمساری، خفت اور اعتراف خطا وجرم کے سوا کیا تھا معاً یوسف کی تباہی و بربادی کے لئے اپنی تمام بیہودگیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور جب ان پر یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ جس کو کل کنعان کے کنوئیں میں پھینک کر آئے تھے

وہ آج "عزیز مصر" بلکہ مصر کے تاج وتخت کا مالک ہے، تو سر جھکا کر کہنے لگے:

قَالُوا تَاللّٰهِ لَقَدْ آثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخَاطِئِينَ ○ (سورۂ یوسف)

(انھوں نے کہا) بخدا! اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو ہم پر برتری بلندی بخشی اور بلاشبہ ہم سر تا سر قصوروار تھے۔

حضرت یوسف ؑ نے اپنے سوتیلے بھائیوں کی اس خستہ حالی اور پشیمانی کو دیکھا تو ان کی اخلاقی برتری اور پیغمبرانہ رحمت ورافت اس کو برداشت نہ کر سکی اور عفو ودرگزر اور حلم وکرم کے ساتھ فوراً یہ ارشاد فرمایا:

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ○ (سورۂ یوسف)

آج کے دن میری جانب سے تم پر کوئی سرزنش نہیں، اللہ تعالیٰ تمہارا قصور بخش دے اور وہ تمام رحم کرنے والا ہے۔

یعنی جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب ہم سب کو یہ تمام داستان فراموش کر دینی چاہئے میں درگاہ الٰہی میں دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہاری اس غلطی کو معاف فرمادے کیونکہ وہی سب سے بڑھ کر رحیم وکریم ہے۔

اب تم کنعان واپس جاؤ اور میرا پیراہن لیتے جاؤ، یہ والد کی آنکھوں پر ڈال دینا۔ انشاء اللہ شمیم یوسف ان کی آنکھوں کو روشن کر دے گی اور تمام خاندان مصر لے آؤ برادران یوسف ؑ کے لئے بھی اس سے بڑھ کر سعادت اور کیا ہو سکتی تھی؟ یوسف ؑ کو چاہ کنعان میں ڈال کر یعقوب ؑ کے پاس خون آلود پیراہن لے کر آئے تھے اور جھوٹ اور فریب کے ساتھ ان کے دل وجگر کو زخمی کیا تھا، آج بھی انہی کو پیراہن یوسف

ؑ لے جانا چاہئے تاکہ اس زخم کا مرہم بنے اور رنج و غم، مسرت و شادمانی سے بدل جائے۔

یہاں یہ باتیں ختم ہو کر برادرانِ یوسف ؑ کا کارواں کنعان کو پیراہن یوسف ؑ لے کر چلا تو ادھر خدا کے برگزیدہ پیغمبر یعقوب ؑ کو وحی الٰہی نے شمیم یوسف ؑ سے مہکادیا، فرمانے لگے اے خاندان یعقوب! اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں اس کی عقل ماری گئی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھ کو یوسف ؑ کی مہک آرہی ہے، وہ سب کہنے لگے "بخدا تم تو اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہو، یعنی اس قدر عرصہ گذر جانے کے بعد بھی جبکہ یوسف ؑ کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا تمہیں یوسف ؑ ہی کی رٹ لگی ہوئی ہے۔"

کنعان کا قافلہ بخیریت تمام پہنچ گیا اور برادران یوسف ؑ نے حضرت یوسف ؑ کے ارشاد کے مطابق ان کا پیراہن یعقوب ؑ کی آنکھوں پر ڈال دیا اور یعقوب ؑ کی آنکھیں فوراً روشن ہو گئیں۔ اور وہ فرمانے لگے "دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

پھر جب بشارت دینے والا آپہنچا تو اس نے پیراہن یوسف ؑ کو یعقوب ؑ کے چہرہ پر ڈال دیا، پس اس کی آنکھ روشن ہو گئیں (بینائی لوٹ آئی) یعقوب ؑ نے کہا کیا میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

برادران یوسف ؑ کے لئے یہ وقت بہت کٹھن تھا، شرم و ندامت میں غرق سر جھکائے ہوئے بولے، اے باپ! آپ خدا کی جناب میں ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لئے دعا فرمایئے، کیوں کہ اب یہ تو ظاہر ہی ہو چکا کہ بلاشبہ ہم سخت خطاکار اور قصوروار ہیں۔

حضرت یعقوب ؑ نے فرمایا

سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (سورۂ یوسف)

عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لئے مغفرت کی دعاء کروں گا، بلاشبہ وہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ برادرانِ یوسف ؑ نے مصر میں اپنی خطا کا اعتراف کرتے ہوئے یوسف ؑ سے بھی مغفرت کی دعاء کی استدعاء کی تھی اور کنعان میں اپنے والد یعقوب ؑ سے بھی یہی درخواست کی، مگر حضرت یوسف ؑ نے تو اسی وقت ان کی بات منظور کرلی اور یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ کہہ دیا، مگر حضرت یعقوب ؑ نے یہ نہیں کیا بلکہ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ کہہ کر صرف توقع ہی دلائی، اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ اور پھر حسب ذیل دو جواب دیتے ہیں۔

۱ برادرانِ یوسف ؑ کی ان تمام خطاکاریوں کا معاملہ براہ راست حضرت یوسف ؑ سے تعلق رکھتا تھا اور حضرت یعقوب سے بالواسطہ اس لئے حضرت یوسف ؑ نے اخلاق کریمانہ کی راہ سے

اس وقت ان اطمینان کر دیا۔ مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ سمجھ کر کہ چونکہ اس معاملہ تعلق یوسف علیہ السلام سے ہے اسلئے اسکی مرضی بھی معلوم کر لینا ضروری ہے، اس طرح جواب دیا کہ توقع اور امید تک بات رہے اور ساتھ ہی اپنی طبیعت رجحان بھی ظاہر کر دیا کہ انکی خواہش یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ان خطا ریوں کو معاف کر دے۔

۲ حضرت یوسف علیہ السلام نوجوان تھے اس لئے ان کے کریمانہ وصف میں حزم و احتیاط پہلو نہ تھا انھوں نے فوراً معاف کر دیا، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام تجربہ ر، محتاط اور پھر باپ تھے اس لئے چاہتے تھے کہ بیٹوں امتحان کریں کہ انکا یہ افعال اور ندامت اظہار محض وقتی اور ہنگامی ہے اور صرف دفع الوقتی کیلئے ہے یا اب ان کی طبیعت میں حقیقی ندامت و شرم ساری جذبہ پیدا ہو چکا ہے اور یہ واقعی اپنی خطا پر صداقت سے نادم ہیں، اسلئے ان کو بالکل مایوس بھی نہیں کیا اور رجحان طبیعت اظہار کرتے ہوئے صرف توقع اور امید تک ہی معاملہ کو چھوڑ دیا،

خاندان یعقوب علیہ السلام مصر میں

غرض حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے سب خاندان کو لے کر مصر روانہ ہوگئے، تورات میں اس واقعہ کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

> اور یہی ذکر فرعون کے گھر میں سنا گیا کہ یوسف کے بھائی آئے اور اس سے فرعون اور اس کے چاکر بہت خوش ہوئے، اور فرعون نے یوسف کو کہا کہ اپنے بھائیوں کو کہہ تم یہ م کرو اپنے جانور لادو اور جاؤ، اور کنعان کی سرزمین میں جا پہنچو اور اپنے باپ اور اپنے گھرانے کو لو اور میرے پاس آؤ اور میں تم کو مصر کی سرزمین کی اچھی چیزیں دوں گا اور تم اس سرزمین کے تحائف کھاؤ گے، اب تجھے حکم ملا تو ان کو کہہ تم یہ کرو کہ اپنے لڑکوں اور اپنی جوروؤں کے لئے مصر کی زمین سے گاڑیاں لیجاؤ اور اپنے باپ کو لے آؤ اپنے اسباب کچھ افسوس نہ کرو کیوں کہ مصر کی ساری زمین کی خوشی تمہارے لئے ہے اور اسرائیل کے فرزندوں نے یہی کیا اور یعقوب اپنی سب نسل سمیت مصر میں آیا وہ اپنے بیٹوں اور اپنے بیٹوں کے بیٹوں کو جو اسکے ساتھ تھے اور اپنی بیٹیوں اور اپنے بیٹوں کی بیٹیوں کو اور اپنی سب نسل کو اپنے ساتھ مصر میں لایا، سو وہ سب جو یعقوب علیہ السلام کے گھرانے کے تھے اور مصر میں آئے ستر جانیں تھیں۔
>
> (پیدائش باب ۴۵ آیات ۱۶ و ۲۰ و باب ۴۶ آیات ۱ء ۲)

جب حضرت یوسف علیہ السلام کو اطلاع ہوئی کہ ان کے والد خاندان سمیت شہر کے قریب پہنچ گئے تو وہ فوراً استقبال کے لئے باہر نکل آئے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب مدت دراز کے بچھڑے ہوئے لخت جگر کو دیکھا تو سینہ سے چمٹا لیا اور جب یہ مسرت افزا اور رقت آمیز ملاقات ہو چکی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے والد سے عرض کیا کہ اب آپ عزت و احترام اور امن و حفاظت کیساتھ شہر میں تشریف لے چلیں۔

اس وقت مصر دارالسلطنت رعمسیس تھا اور وہ "جشن شہر" کہلاتا تھا، حضرت یوسف علیہ السلام والد

ماجد اور تمام خاندان کو بڑے کر و فر کے ساتھ شاہی سواریوں میں بٹھا کر شہر میں لائے اور شاہی محل میں اتارا۔

جب ان تمام باتوں سے فراغت پائی تو اب ارادہ کیا کہ دربار منعقد کریں تاکہ مصریوں کا بھی بزرگ باپ اور خاندان سے تعارف ہو جائے اور تمام درباری ان کے عزت و احترام سے آگاہ ہو جائیں، دربار منعقد ہوا، تمام درباری اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھ گئے یوسف علیہ السلام کے حکم سے ان کے والدین[1] کو تخت شاہی پر ہی جگہ دی گئی اور باقی تمام خاندان نے حسب مراتب نیچے جگہ پائی جب یہ سب انتظامات مکمل ہو گئے تب حضرت یوسف علیہ السلام شاہی محل سے نکل کر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے اسی وقت تمام درباری "حکومت کے دستور کے مطابق" تخت کے سامنے تعظیم کے لئے سجدہ میں گر پڑے موجودہ صورت کو دیکھ کر تمام خاندان یوسف علیہ السلام نے بھی یہی عمل کیا۔[2] یہ دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو فوراً اپنے بچپنے کا خواب یاد آگیا، اور اپنے والد سے کہنے لگے:

وَقَالَ يَآأَبَتِ هٰذَا تَأْوِيْلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا وَقَدْ أَحْسَنَ بِيْٓ إِذْ أَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ أَنْ نَّزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ إِخْوَتِيْ إِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ إِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○

(سورۂ یوسف)

اور یوسف نے کہا اے باپ! یہ ہے تعبیر اس خواب کی جو مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا میرے پروردگار نے اسے سچا ثابت کر دیا، یہ اسی کا احسان ہے کہ مجھے قید سے رہائی دی تم سب کو صحرا سے نکال کر میرے پاس پہنچا دیا اور یہ سب کچھ اس کے بعد ہوا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈال دیا تھا، بلاشبہ میرا پروردگار ان باتوں کیلئے جو وہ کرنی چاہے بہتر تدبیر کرنے والا ہے کہ وہ سب کچھ جاننے والا اور (اپنے کاموں میں) حکمت والا ہے۔

اور جب کہ یہ تمام واقعات ایک عجیب و غریب ترتیب سے وقوع میں آئے اور قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سنجیوں اور چارہ سازیوں کے بینظیر مظاہرے پیش آتے رہے تو ان تمام آغاز و انجام کے اس حسن خاتمہ کو دیکھ کر یوسف علیہ السلام بے اختیار ہو گئے اور خدا کی جناب میں شکر و دعاء کا اس طرح اظہار فرمانے لگے۔

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَأْوِيْلِ الْأَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَلِيِّ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ ○

(یوسف)

---

[1] حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔

[2] تعظیم کا یہ طریقہ انبیاء سابقین میں شاید جائز رہا ہو۔ اگرچہ مجھے اس میں بھی ہے اور میرے نزدیک اس آیت کی دوسری تفسیر ہے۔ جس کو میں نے اس جگہ قصداً ذکر نہیں کیا۔ تاہم نبی اکرم ﷺ نے اس قسم کی تعظیم کو اپنی امت کیلئے حرام قرار دیا ہے اور اس کو صرف ذات الٰہی کیلئے ہی مخصوص بتایا ہے؟ (ترمذی، ابوداؤد، باب النکاح)

اے پروردگار! تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا اے آسمان اور زمین کے بنانے والے تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، تو یہ بھی کیجیئو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔

توراۃ میں ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضرت یوسف (علیہ السلام) کا تمام خاندان مصر ہی میں آباد ہو گیا، کیوں کہ فرعون نے حضرت یوسف (علیہ السلام) سے اصرار کے ساتھ یہ کہا کہ تم اپنے خاندان کو مصر ہی میں آباد کرو۔ ان کو بہت عمدہ زمین دوں گا اور ہر طرح ان کی عزت کرونگا۔

یہ دیکھ کر حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والد بزرگوار اور خاندان کے دوسرے افراد کو یہ سمجھا دیا کہ فرعون جب ان سے مصر میں رہنے کی درخواست کرتے ہوئے زمین اور مقام کے انتخاب کے لئے کہے تو تم فلاں حصۂ زمین طلب کرنا اور کہنا کہ چونکہ ہم قبائلی زندگی کے عادی اور مویشی چرانے کا شوق رکھتے ہیں اس لئے ہم عام شہری زندگی سے علیحدگی پسند کرتے ہیں چنانچہ فرعون نے خاندان یوسف (علیہ السلام) کو وہ سرزمین بطور جاگیر بخش دی اور اس طرح بنی اسرائیل سرزمین مصر میں آباد ہو گئے۔

اور فرعون نے یوسف کو کہا کہ اپنے بھائیوں کو کہہ تم یہ کام کرو اپنے جانور لادو اور جاؤ کنعان کی سرزمین میں جا پہنچو اور اپنے باپ اور اپنے گھرانے کو لو اور مجھ پاس آؤ اور میں تم کو مصر کی سرزمین کی اچھی چیزیں دوں گا اور تم اس زمین کے تحائف کھاؤ گے، اب تجھے حکم ملا کہ تو ان کو کہہ اپنے لڑکوں اپنے جوروؤں کیلئے مصر کی زمین سے گاڑیاں لے جاؤ۔ اپنے باپ کو لے آؤ اور اپنے اسباب کا کچھ فکر نہ کرو کیونکہ مصر کی ساری زمین کی خوشی تمہارے لئے ہے اور اسرائیل کے فرزندوں نے یہی کیا۔ (پیدائش باب ۴۵ آیات ۱۶-۱۹)

اور یوں ہو گا کہ جب فرعون تم کو بلائے اور کہے کہ تمہارا پیشہ کیا ہے؟ تو تم کہیو کہ تیرے غلام جوانی سے لے کر اب تک چوپانی کرتے رہے ہیں، کیا ہم اور کیا ہمارے آباء، تاکہ تم جشن کی زمین میں رہو اسلئے کہ مصریوں کو ہر ایک چوپان سے نفرت ہے۔ (پیدائش باب ۴۶ آیات ۳۳-۳۴)

حضرت یوسف (علیہ السلام) کا مطلب یہ تھا کہ اس طرح مصریوں سے الگ رہنے سے بنی اسرائیل اپنی مذہبی زندگی پر قائم، مصری بت پرستی سے متنفر اور مصری بد اخلاقی اور مبتذل شہری عادات و خصائل سے محفوظ رہیں گے اور اپنی شجاعانہ بدویانہ زندگی کو کبھی نہ بھولیں گے۔

وفات

بہر حال حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنی زندگی کے طویل حصۂ عمر کو مصر ہی میں گذارا اور جب ان کی عمر ایک سو دس سال کو پہنچی تو ان کی وفات ہو گئی، حضرت یوسف (علیہ السلام) نے وفات سے پہلے اپنے خاندان والوں سے یہ عہد لیا کہ وہ مجھ کو مصر کی زمین میں نہ دفن کرینگے۔

بلکہ جب خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کہ بنی اسرائیل دوبارہ فلسطین یعنی آباؤاجداد کی سرزمین میں واپس ہوں تو میری ہڈیاں وہیں لے جا کر سپرد خاک کرنا، چنانچہ انھوں نے وعدہ کیا اور جب حضرت یوسف کا انتقال ہو گیا تو ان کو حنوط

(ممی) کر کے تابوت کو بھی ساتھ لیتے گئے اور آباؤاجداد کی سرزمین ہی میں لے جا کر سپرد خاک کر دیا۔ حموی کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کی قبر بلاطہ میں ہے جو فلسطین کے علاقہ نابلس کا یک گاؤں ہے یہ قبر ایک درخت کے نیچے ہے، اور توراۃ میں ہے:

> اور یوسف اور اس کے باپ کے گھرانے نے مصر میں سکونت کی اور یوسف علیہ السلام ایک سودس برس جیا اور یوسف نے افرائیم کے لڑکے جو تیسری پشت تھے دیکھے اور منسی کے بیٹے مکیر کے بیٹے بھی یوسف علیہ السلام کے گھٹنوں پر پالے گئے اور یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا میں مرتا ہوں اور خدا یقیناً تم کو اس سرزمین میں جس کی بابت اس نے ابراہام اور اسحٰق اور یعقوب سے قسم کی ہے لیجائے گا اور یوسف علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے قسم لے کے کہا خدا یقیناً تم کو یاد کرے گا، اور تم میری ہڈیوں کو یہاں سے لیجائیو، سو یوسف علیہ السلام ایک سودس برس کا بوڑھا ہو کے مر گیا اور انھوں نے اس میں خوشبو بھری اور اسے مصر میں صندوق میں رکھا...... (پیدائش باب ۵۰ آیات ۲۲-۲۶)

اور موسیٰ علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی ہڈیاں ساتھ لیں کیونکہ اس نے بنی اسرائیل کو تاکیداً قسم دیکر کہا تھا کہ خدا یقیناً تمہاری خبر گیری کرے گا تم یہاں سے میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے جائیو۔ (خروج باب ۱۳ آیت ۱۹)

اہم اخلاقی مسائل

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ عجیب و غریب قصہ ارباب بصیرت کے لئے اپنی آغوش میں نہایت اہم اخلاقی مسائل رکھتا ہے دراصل یہ قصہ ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ فضائل اخلاق کی ایسی زرین داستان ہے جس کا ہر پہلو موعظت و بصیرت کے جواہر سے لبریز ہے۔

قوت ایمانی، استقامت، ضبطِ نفس، صبر، شکر، عفت، دیانت و امانت، عفوودر گذر، جذبۂ تبلیغ و اعلاء کلمۃ اللہ کا عشق اور اصلاح و تقویٰ جیسے اخلاق فاضلہ اور صفات کاملہ کا ایک نادر سلسلۃ الذہب ہے جو اس قصہ کے ہر نقش میں منقش نظر آتا ہے مگر ان میں سے یہ چند امور خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

۱ اگر کسی شخص کی ذاتی سرشت عمدہ ہو اور اس کا ماحول بھی پاک، مقدس اور لطیف ہو تو اس شخص کی زندگی اخلاق کریمانہ میں نمایاں اور صفات عالیہ میں ممتاز ہوگی اور وہ ہر قسم کے شرف و مجد کا حامل ہوگا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی مقدس زندگی اس کی بہترین مثال ہے، وہ یعقوب، اسحٰق اور ابراہیم علیہم السلام جیسے جلیل القدر نبیوں اور پیغمبروں کی اولاد تھے اس لئے نبوت و رسالت کے گہوارہ میں نشوونما پائی اور خانوادۂ نبوت کے ماحول میں تربیت حاصل کی، ذاتی نیک نہادی اور فطری پاکی نے جب ایسے لطیف ماحول کو دیکھا تو تمام فضائل و اوصاف حمیدہ چمک اٹھے اور بچپن جوانی اور سہولت کی زندگی کے تمام گوشے تقویٰ، عفت، صبر و استقامت، دیانت اور عشق الٰہی کے ایسے روشن مظہر بن گئے کہ عقل انسانی اس مجموعہ کمالات ہستی کو دیکھ کر محو حیرت ہو جاتی ہے۔

۲ اگر کسی شخص میں ایمان باللہ مستقیم و مستحکم ہو اور اس پر اس کا یقین راسخ اور مضبوط ہو تو پھر اس راہ کی تمام صعوبتیں اور مشکلات اس پر آسان بلکہ آسان تر ہو جاتی ہیں اور رویت حق کے بعد تمام خطرات اور مصائب

ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کی تمام زندگی میں یہ بات نمایاں نظر آتی ہے۔

۳ ابتلاء و آزمائش، مصیبت و ہلاکت کی شکل میں ہو یا دولت و ثروت اور خواہشات نفسانی کے خوبصورت اسباب کی صورت میں، ہر حالت میں انسان کو خدائے تعالیٰ کی جانب ہی رجوع کرنا چاہیے اور اسی سے التجا کرنی چاہیے کہ وہ امر حق پر ثابت قدم رکھے اور استقامت بخشے۔

عزیز کی بیوی اور حسین مصری عورتوں کی ترغیبات اور ان کی مرضیات پوری نہ کرنے پر قید کی دھمکیاں اور پھر قید و بند کے مصائب، ان تمام حالات میں حضرت یوسف علیہ السلام کا اعتماد اور ان کی دعاؤں اور التجاؤں کا مرکز صرف ایک ہی ہستی سے وابستہ نظر آتا ہے وہ نہ عزیز مصر کے سامنے عرض رساں نظر آتے ہیں نہ فرعون کے سامنے ملتجی، وہ نہ ان خوبرویانِ مصر اور عشوہ طرازان حسن و جمال سے جی لگاتے ہیں اور نہ اپنے مربی کی خوبرو بیوی سے، بلکہ ہر موقعہ پر خدائے تعالیٰ ہی سے مدد کے طالب نظر آتے ہیں۔

رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ ط مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ

۴ جب خدائے تعالیٰ کی محبت اور اس کا عشق، قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے تو پھر انسان کی زندگی کا تمام تر مقصد وہی بن جاتا ہے اور اس کے دین کی دعوت و تبلیغ کا عشق ہر وقت رگ و پے میں دوڑ تا رہتا، چنانچہ قید خانہ کی سخت مصیبت کے وقت اپنے رفیقوں سے سب سے پہلا کلام یوسف علیہ السلام کا یہی تھا۔ یَاصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔

۵ دیانت و امانت ایک ایسی نعمت ہے کہ اس کو انسان کی دینی و دنیوی سعادتوں کی کلید کہنا چاہیے، عزیز مصر کے یہاں یوسف علیہ السلام جس طرح داخل ہوئے تھے واقعہ کی تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دیانت و امانت ہی کا نتیجہ تھا کہ پہلے وہ عزیز مصر کی نظروں میں بلند و باوقار اور محبوب بنے پھر مصر کی حکومت کے مالک ہو گئے۔

۶ خود اعتمادی انسان کے بلند اوصاف میں سے ایک بڑا وصف ہے خدائے تعالیٰ نے جس شخص کو یہ دولت بخش دی ہے وہی دنیا کے مصائب و آلام سے گذر کر دنیوی و دینی رفعت و بلندی حاصل کر سکتا ہے۔

خود اعتمادی کی مختلف اقسام میں سے ایک قسم "عزت نفس" بھی خودداری اور عزت نفس سے محروم ہے وہ انسان نہیں ایک مضغۂ گوشت ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کی عزت نفس کے تحفظ کا یہ عالم ہے کہ برسوں کے بعد جب قید خانہ سے رہائی کا حکم ملتا اور بادشاہ وقت کا پیغام سربلندی حاصل ہوتا ہے تو مسرت و شادمانی کے ساتھ فوراً اسکو لبیک نہیں کہتے بلکہ صاف انکار کر دیتے ہیں کہ میں اس وقت تک قید خانہ سے باہر نہیں آؤں گا تاوقتیکہ یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ مصری عورتوں نے مکر و فریب سے جس قسم کا معاملہ میرے ساتھ کیا تھا اسکی اصل حقیقت کیا ہے؟

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللّٰتِیْ قَطَّعْنَ أَیْدِیَهُنَّ

۷ صبر ایک عظیم الشان "خلق" ہے اور بہت سی برائیوں کے لئے سپر اور ڈھال کا کام دیتا ہے قرآن حکیم میں

ستر سے زیادہ مقامات پر اس کی فضیلت کا اعلان کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بہت سے مراتب علیا اور درجات رفیعہ کا مدار اسی فضیلت پر رکھا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا (سورۃ اعراف)

اور ہم نے ان میں سے مقتدا بنائے، جو ہمارے احکام کے ہادی بنے جبکہ وہ فضیلت صبر سے مزین ثابت ہوئے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا

اور پورا ہوا تیرے رب کا نیک کلمہ بنی اسرائیل پر اس وجہ سے کہ وہ صابر رہے۔

وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝ (سورہ بقرہ)

اور بشارت دے دو ان صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو کہہ اٹھتے ہیں "بے شک ہم اللہ ہی کیلئے ہیں اور بیشک ہم اسی جانب لوٹ جانے والے ہیں۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ

(اے محمد ﷺ) تم اسی طرح صبر کرو جس طرح بلند عزیمت والے پیغمبروں نے کیا۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (سورہ بقرہ)

اور (اللہ) سے مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعہ۔

وقال رسول اللہ ﷺ الصبر نصف الایمان۔ (بیھقی فی شعب الایمان)

"صبر نصف ایمان ہے"

و سئل عن الایمان فقال الصبر والسماحۃ۔

پوچھی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا "صبر اور دریادلی"۔

حقیقت میں "صبر" ایک ایسی صفت کا نام ہے جس کے ذریعہ انسان برائیوں سے باز رہ سکے اور نفس ان کی طرف اقدام سے رک جائے اسلئے یہ صرف انسان ہی کا خاصہ ہے اور تمام حیوانات سے اس کو امتیاز بخشتا ہے۔

صبر کی مختلف اقسام ہیں یا یوں کہئے کہ ان اشیاء کی نسبت کے لحاظ سے جن کی جانب "صبر" کو منسوب کیا جاتا ہے وہ مختلف ناموں سے موسوم ہے۔

پس اگر پیٹ اور شرم گاہ کی خواہشات کے مقابلہ میں صبر ہے تو اس کا نام "عفت" ہے اور اگر مصائب پر صبر ہے تو اس کو "صبر" ہی کہتے ہیں اور اس کی ضد کا نام "جزع و فزع" ہے اور اگر ثروت و دولت کی بہتات کی حالت میں صبر ہے تو اس کا نام "ضبط نفس" ہے اور اس کی ضد کو "بطر" (چھچھورپن) کہتے ہیں، اور اگر

میدان جنگ اور اسی قسم کے مہلک حالات پر صبر ہے تو وہ "شجاعت" کہلاتا ہے اور اس کی ضد کا نام "جبن" (بزدلی) ہے، اور اگر غیظ و غضب کے حالات پر صبر ہے تو اس کو "حلم" کہتے ہیں اور اس کی ضد کو "تذمر" (بے قابو ہونا) کہا جاتا ہے، اور اگر حوادثات زمانہ پر صبر ہے تو اس کا نام "وسعتِ صدر" ہے (کشادہ دلی اور حوصلہ مندی) ہے اور اس کی مخالفت صفت کو "ضجر" (تنگ دلی اور بے صبری) کہتے ہیں اور اگر دوسروں کے پوشیدہ رازوں پر صبر ہے تو اس کا نام "کتمان سر" (پردہ پوشی) ہے اور اگر بقدر کفاف معیشت پر صبر ہے تو اس کو "قناعت" کہتے ہیں اور اگر ہر قسم کی عیش پسندی کے مقابلہ میں صبر ہے تو اس کا نام "زہد" ہے۔

صبر کی ان تمام اقسام کا بیان جامع ایجاز و اعجاز کے ساتھ قرآن عزیز کی اس آیت میں کیا گیا ہے۔

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

اور ہر قسم کی مصیبتوں اور مضرتوں اور میدان جنگ کی ہولناکیوں میں صبر کرنے والے یہی دراصل صادق ہیں اور یہی متقی و پرہیزگار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف [illegible] کو صبر و رضا کے ان تمام مراحل میں وہ کمال عطا فرمایا تھا جس کو "مثل اعلیٰ" کہا جاتا ہے، مثلاً:

۱) برادران یوسف کی ایذارسانیوں پر صبر۔
۲) آزاد ہونے کے باوجود غلام بن جانے اور ایسے ملک اور ایسی قوم کے ہاتھوں میں فروخت ہو جانے پر صبر جو معاشرت و معیشت میں بھی مخالفت اور دین و ایمان میں بھی دشمن تھی۔
۳) عزیز مصر کی بیوی اور مصری عورتوں کی پرفریب ترغیبات پر صبر۔
۴) قید خانہ کے مصائب پر صبر۔
۵) عزیز مصر کی تمام دولت و ثروت کے وکیل بن جانے پر صبر یعنی خدا کی شکرگذاری کا اظہار اور شیخی سے پرہیز۔
۶) مملکتِ مصر کے حاکم مطلق ہونے پر صبر یعنی ظلم، کبر شیخی سے پرہیز۔
۷) ہر دو حالتوں میں قناعت و زہد کی زندگی کو ترجیح۔
۸) ایذا رسا بھائیوں کی ندامت کے وقت اختیار صبر یعنی وسعت قلب کا ثبوت [illegible]۔

۹) اخلاق حسنہ میں "شکر" بھی بہترین خلق ہی اس لئے کہ یہ اخلاق الٰہیہ میں سے بہت بلند خلق ہے قرآن عزیز میں ہے [illegible] انسانی اوصاف میں "شکر" ایسی صفت کا نام ہے جس کے ذریعہ منعم حقیقی کی نعمت کا اعتراف کیا جائے اور اس پر مسرت و شادمانی کا اظہار ہو اور اس کو محسن و منعم کے مرغوب اور پسندیدہ طریقہ پر استعمال کیا جائے، قرآن عزیز میں ہے۔

فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ۝ (بقرہ)

پس تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور ناشکری نہ کرو۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ (سورہ نساء)

اللہ تم پر عذاب نہ لائے گا اگر تم اس کے شکر گذار اور اس پر ایمان والے رہے۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (ابراھیم)

اگر تم شکر گذار ہو تو ہم (تمہاری نعمتوں میں) اضافہ کرتے رہیں گے،

مگر افسوس یہ ہے کہ انسانی دنیا میں حقیقی شکر گذار اور سپاس گذار بہت ہی کم ہیں:

وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ۝

اور میرے بندوں میں حقیقی شکر گذار بہت ہی کم ہیں۔

لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ صفت بھی بدرجہ کمال عطا فرمائی تھی، ان کی زندگی کے حالات پڑھو اور اندازہ کرو کہ کس طرح جگہ جگہ شکر اور سپاس گذاری کا مظاہرہ نمایاں نظر آتا ہے خصوصاً ختم قصہ پر ان کی جو دعاء مذکور ہے وہ ان کے اس وصف کو اور زیادہ نمایاں کرتی ہے۔

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ۝

(سورہ یوسف)

اے پروردگار! بلاشبہ تو نے مجھ کو حکومت بخشی اور باتوں کے فیصلہ کی سمجھ بوجھ عطا فرمائی اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا مددگار ہے تو مجھ کو اپنی اطاعت پر موت دیجیو اور صالحین کے زمرہ میں شامل کرلیجیو۔

۱۰ حسد اور بغض کا انجام حاسد اور بغض کرنے والے کے حق میں ہی مضر ہوتا ہے اور اگرچہ کبھی محسود و مبغوض کو بھی دنیوی نقصان پہنچ جانا ممکن ہے لیکن حاسد کسی حال میں بھی فلاح نہیں پاتا، اور خسر الدنیا والاخرة کا مصداق ہی رہتا ہے الا یہ کہ تائب ہو جائے اور حاسدانہ زندگی کو ترک کردے۔ برادران یوسف علیہ السلام کے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ان کا انجام بھی مگر چشم بصیرت شرط ہے۔

۱۱ صداقت، دیانت، امانت، صبر اور شکر جیسے صفات عالیہ سے متصف زندگی ہی حقیقی اور کامیاب زندگی ہے اور اگر انسان میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے تو پھر وہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہے بلکہ اس سے بھی بدتر۔

أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (بقرہ)

(یہ متمرد و سرکش انسان) چوپاؤں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے۔

۱۲ حضرت یوسف علیہ السلام کے اخلاق کریمانہ اور صفات عالیہ کی مدحت و منقبت میں سب سے اہم وہ جملہ ہے

جو نبی اکرم نے ان کے حق میں فرمایا "الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم ، یعنی وہ سلسلہ نسب جو چار پشتوں سے کرامت نبوت سے مستفیض ہی یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم کا سلسلہ ہے، اور ایک روایت میں ہے:

"اکرم الناس یوسف نبی اللّٰہ بن نبی اللّٰہ بن نبی اللّٰہ بن خلیل اللّٰہ" ۔

(بخاری کتاب التفسیر)

حضرت شعیب علیہ السلام

- حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں
- قوم شعیب
- مدین واصحاب ایکہ
- زمانہ بعثت، دعوت حق
- قوم کی سرکشی
- سرکشی کا انجام
- بصائر وعبر

حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر قرآن میں

قرآن حکیم میں حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا تذکرہ اعراف، ہود اور شعراء میں قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے اور حجر اور عنکبوت میں مختصر ہے ان سورتوں میں حجر کے علاوہ حضرت شعیب علیہ السلام کا نام دس جگہ مذکور ہے، ذیل کا نقشہ اس کی تصدیق کرتا ہے،

سورۃ	آیات	شمار
اعراف	۸۵، ۸۸، ۹۰، ۹۲	۴
ہود	۸۴، ۸۷، ۹۰، ۹۵	۴
شعراء	۱۷۷	۱
عنکبوت	۳۶	۱
	ٹوٹل:	۱۰

قوم شعیب

حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت مدین یا مدیان میں ہوئی تھی مدین کسی مقام کا نام نہیں بلکہ "قبیلہ"[1] کا نام ہے، یہ قبیلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدین کی نسل سے تھا جو ان کی تیسری بیوی قطورا سے پیدا ہوا، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ خاندان بنی قطورا کہلاتا ہے۔

"مدین" اپنے اہل وعیال کے ساتھ اپنے سوتیلے بھائی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے پہلو ہی میں حجاز میں آباد ہو گیا تھا یہی خاندان آگے چل کر ایک بڑا قبیلہ بن گیا اور شعیب علیہ السلام بھی چونکہ اسی نسل ور اسی قبیلہ سے تھے اسلئے ان کی بعثت کے بعد یہ "قوم شعیب" کہلایا۔

۱: اسی قبیلہ کے نام پر بستی کا نام "مدین" مشہور ہوا۔

مدین یا اصحاب ایکہ

یہ قبیلہ کس مقام پر آباد تھا؟ اس متعلق عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ یہ حجاز میں شام کے متصل ایسی جگہ آباد تھا کہ جس کا عرض البلد افریقہ کے جنوبی صحرا کے عرض البلد کے مطابق پڑتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ شام کے متصل معان کے حصہ زمین پر آباد تھا۔

قرآن عزیز نے اس قبیلہ کی آبادی کے متعلق ہم کو دو باتوں سے تعارف کرایا ہے۔

ایک یہ کہ وہ "امام مبین" پر آباد تھا۔

وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ؕ

ور لوط کی قوم اور مدین دونوں بڑی شاہراہ پر آباد تھے۔

عرب کے جغرافیہ میں جو شاہرہ حجاز کے تاجر قافلوں کو شام، فلسطین، یمن بلکہ مصر تک لیجاتی اور بحر قلزم کے مشرقی کنارے سے ہو کر گذرتی تھی قرآن اسی کو امام مبین (کھلی اور صاف شاہراہ) کہتا ہے، کیونکہ صیف (گرمی) اور شتا، (سردی) دونوں زمانوں میں قریشی قافلوں کے لئے یہ متعارف اور بڑی تجارتی سڑک تھی جس کا سلسلہ بری مسافت کے ساتھ بحری کے بھی ڈانڈے ملا دیتا تھا۔

دوسرے یہ کہ وہ "اصحاب ایکہ" (جھنڈے والے) تھے، عربی میں ایکہ ان سرسبز و شاداب جھاڑیوں کو کہتے ہیں جو ہرے بھرے درختوں کی کثرت کی وجہ سے جنگلوں اور بنوں میں اگی رہتی ہیں، اور جھاندے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

ان دونوں باتوں کے جان لینے کے بعد مدین کی آبادی کا پتہ آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے وہ یہ کہ مدین کا قبیلہ بحر قلزم کے مشرقی کنارہ اور عرب کے مغرب شمال میں ایسی جگہ آباد تھا جو شام کے متصل حجاز کا آخری حصہ کہا جا سکتا ہے اور حجاز والوں کو شام، فلسطین بلکہ مصر تک جانے میں اس کے کھنڈر راہ میں پڑتے تھے اور جو تبوک کے بالمقابل واقع تھا۔ (معجم البلدان جلد ۵ ص ۴۱۸)

مفسرین اس بارہ میں مختلف ہیں کہ مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ کے دو نام ہیں یا دو جدا جدا قبیلے ہیں، بعض کا خیال ہے کہ دونوں جدا جدا قبیلے ہیں، مدین متمدن اور شہری قبیلہ تھا اور "اصحاب ایکہ" دیہاتی اور بدوی قبیلہ جو جنگل اور بن میں آباد تھا اس لئے اس کو "بن والا" یا "جنگل والا" کہا گیا اور آیت اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ میں "ھما" ضمیر تثنیہ سے یہی دونوں مراد ہیں نہ کہ مدین اور قوم لوط۔

اور دوسرے مفسرین دونوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آب و ہوا کی لطافت نہروں اور آبشاروں کی کثرت نے اس مقام کو اس قدر شاداب و پر فضا بنا دیا تھا اور یہاں میووں، پھلوں اور خوشبو دار پھولوں کے اس قدر باغات اور چمن تھے کہ اگر ایک شخص آبادی سے باہر کھڑے ہو کر نظارہ کرتا تھا تو اس کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ نہایت خوبصورت اور شاداب گھنے درختوں کا ایک جھنڈ ہے، اسی وجہ سے قرآن عزیز نے اس کو "ایکہ" کہہ کر تعارف کرایا۔

ان مفسرین میں سے حافظ عماد الدین ابن کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہاں "ایکہ" نام ایک درخت تھا، اہل قبیلہ چونکہ اس کی پرستش کرتے تھے لہٰذا اس کی نسبت سے "مدین" کو "اصحاب ایکہ" کہا گیا، نیز چونکہ یہ نسبت نسبی نہ تھی بلکہ مذہبی تھی اس لئے جن آیات میں ان کو اس لقب سے یاد نہیں کیا گیا ہے۔ ان میں حضرت شعیب کو اخوھم ان کا بھائی یا اسی قسم کے نسبی علاقہ سے یاد نہیں کیا۔ البتہ جن آیات میں، قوم شعیب کو مدین کہہ کر یاد کیا ہے، ان میں حضرت شعیب کو بھی ان کے نسبی رشتہ میں منسلک ظاہر کیا ہے۔

بہر حال راجح یہی ہے کہ مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ ہے جو باپ کی نسبت سے مدین کہلایا اور زمین کی طبعی اور جغرافی حیثیت سے "اصحاب ایکہ" کے لقب سے مشہور ہوا۔

زمانۂ بعثت اور ایک غلطی کا ازالہ

عبد الوہاب نجار اپنی کتاب "قصص الانبیاء" میں تحریر فرماتے ہیں کہ ابو العباس احمد قلقشندی نے "صبح الاعشیٰ" جلد ۴ ص ۱۶ میں تحریر کیا ہے:

ثم ملك بعده يعنى يوثام، ابنه احازست عشرة سنة ايضا و كانت الحرب بينه و بين ملك دمشق و فى زمنه كان شعيب ۔

پھر یوثام کے بعد آحاز نے بھی سولہ سال تک حکومت کی اور اس کے اور دمشق کے بادشاہ کے درمیان جنگ رہی اور اسی زمانہ میں حضرت شعیب کی بعثت ہوئی۔

قلقشندی کی عبارت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت شعیب حضرت موسیٰ سے صدیوں بعد پیدا ہوئے یعنی سات سو برس بعد آٹھویں صدی کے اوائل میں، کیونکہ آحاز کی حکومت کا یہی زمانہ تھا، حالانکہ یہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے، اس لئے کہ حضرت شعیب حضرت موسیٰ سے بڑے ہیں اور حضرت موسیٰ نے حضرت شعیب کا زمانہ پایا ہے یا نہیں یہ بات البتہ اختلافی ہے۔

اسی بنا پر قرآن عزیز نے سورہ اعراف میں حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب کے ذکر کے بعد فرمایا ثُمَّ بَعَثْنَا مِن بَعْدِهِم مُّوسَىٰ اور اسی طرح سورہ یونس، سورہ حج سورہ ہود اور سورہ عنکبوت میں بیان کیا گیا۔

تو قلقشندی سے اس جگہ لغزش ہو گئی ہے کہ اس نے شعیاء کی جگہ شعیب تحریر کر دیا بلا شبہ آحاز کی حکومت کا زمانہ شعیاء نبی کا زمانہ ہے۔ (قصص الانبیاء للنجار ص ۱۸۵)

دعوت حق

بہر حال شعیب جب اپنی قوم میں مبعوث ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ خدا کی نافرمانی اور معصیت کا ارتکاب صرف افراد و احاد میں ہی نہیں پایا جاتا بلکہ ساری قوم گرداب ہلاکت میں مبتلا ہے اور اپنی بد اعمالیوں میں اس قدر سرمست و سرشار ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے معصیت اور گناہ ہے بلکہ وہ اپنے ان اعمال کو باعث فخر سمجھتے ہیں۔

ان کی بہت سی بداخلاقیوں اور نافرمانیوں سے قطع نظر جن قبیح امور نے خصوصیت کے ساتھ ان میں رواج پا لیا تھا وہ یہ تھے۔

(۱) بت پرستی اور مشرکانہ رسوم و عوائد (۲) خرید و فروخت میں پورا لینا اور کم تولنا یعنی دوسرے کو اس کے حق سے کم دینا اور اپنے لئے حق کے مطابق لینا بلکہ اس سے زیادہ (۳) تمام معاملات میں کھوٹ اور ڈاکہ زنی۔

قوموں کے عام رواج کے مطابق دراصل ان کی رفاہیت، خوش عیشی، دولت و ثروت کی فراوانی، زمین اور باغوں کی زرخیز اور شادابی نے ان کو اس قدر مغرور بنا دیا تھا کہ وہ ان تمام امور کو اپنی ذاتی میراث اور اپنا خاندانی ہنر سمجھ بیٹھے تھے، اور ایک ساعت کے لئے بھی ان کے دل میں یہ خطرہ نہیں گذرتا تھا کہ یہ سب کچھ خدائے تعالیٰ کی عطاء و بخشش ہے کہ شکر گذار ہوتے اور سرکشی سے باز رہتے، غرض ان کی فارغ البالی نے ان میں طرح طرح کی بداخلاقیاں اور قسم قسم کی عیوب پیدا کر دیئے تھے۔

آخر غیرت حق حرکت میں آئی اور سنت اللہ کے مطابق ان کو راہ حق دکھانے، فسق و فجور سے بچانے اور امین و متقی اور بااخلاق بنانے کے لئے ان ہی میں سے ایک ہستی کو چن لیا اور شرف نبوت و رسالت سے نواز کر اس کو دعوت اسلام اور پیغام حق کا امام بنایا یہ ہستی حضرت شعیب کی ذات گرامی تھی۔

خدا کی توحید اور شرک سے بیزاری کا اعتقاد و تو تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کی مشترک بنیاد اور اصل ہے جو حضرت شعیب کے حصہ میں بھی آئی تھی مگر قوم کی مخصوص بداخلاقیوں پر توجہ دلانے اور ان کو راہ راست پر لانے کے لئے انھوں نے اس قانون کو بھی اہمیت دی کہ خرید و فروخت کے معاملہ میں یہ ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ جو جس کا حق ہے وہ پورا پورا اس کو ملے کہ دنیوی معاملات میں یہی ایک ایسی بنیاد ہے جو متزلزل ہو جانے کے بعد ہر قسم کے ظلم، فسق و فجور اور مہلک خرابیوں اور بداخلاقیوں کا باعث بنتی ہے۔

الحاصل حضرت شعیب نے بھی اپنی قوم کی بداعمالیوں کو دیکھ کر سخت دکھ محسوس کیا اور رشد و ہدایت کی تعلیم دیتے ہوئے قوم کو انہی اصول کی طرف بلایا جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت وارشاد کا خلاصہ ہے۔

انھوں نے فرمایا۔ "اے قوم! ایک خدا کی عبادت کر! اس کے علاوہ کوئی پرستش کے قابل نہیں اور خرید و فروخت میں ناپ تول کر پورا رکھ، اور لوگوں کے ساتھ معاملات میں کھوٹ نہ کر کل تک ممکن ہے کہ تجھ کو ان بداخلاقیوں کی برائیوں کا حال معلوم نہ ہوا ہو، مگر آج تیرے پاس خدا کی حجت، نشانی اور برہان آچکا اب جہل و نادانی، عفو و درگذر کے قابل ہیں ہے، حق کو قبول کر اور باطل سے باز آ، کہ یہی کامرانی اور کامیابی کی راہ ہے اور خدا کی زمین میں فتنہ و فساد نہ کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صلاح و خیر کے تمام سامان مہیا کر دیئے اگر تجھ میں ایمان و یقین کی صداقت موجود ہے تو سمجھ کہ یہی فلاح و بہبودی کی راہ ہے اور دیکھ ایسا نہ کر کہ دعوت حق کی راہ کو روکنے اور لوگوں کو لوٹنے کے لئے ہر راہ پر جا بیٹھے اور جو آدمی بھی ایمان لائے اس کی خدا کی راہ اختیار کرنے پر دھمکیاں دینے لگے اور اس میں کج روی پیدا کرنے کے درپے ہو جائے اے افراد قوم اس وقت کو یاد کرو، اور خدا کا احسان مانو کہ تم بہت تھوڑے تھے پھر اس نے امن و عافیت دے کر تمہاری تعداد

کو بیش از بیش بڑھادیا۔"

اے میری قوم! ذرا اس پر بھی غور کر کہ جن لوگوں نے خدا کی زمین پر فساد پھیلانے کا شیوہ اختیار کیا تھا ان کا انجام کس قدر عبرت ناک ہوا، اور اگر تم میں سے ایک جماعت مجھ پر ایمان لے آئی اور ایک جماعت ایمان نہیں لائی تو صرف اتنی ہی بات پر معاملہ ختم ہو جانے والا نہیں، بلکہ صبر کے ساتھ انتظار کر، تا آنکہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان آخری فیصلہ کر دے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے، شیریں کلامی، حسن خطابت طرز بیان اور طلاقت لسانی میں بہت نمایاں امتیاز رکھتے تھے، اسی لئے مفسرین ان کو خطیب الانبیاء کے لقب سے یاد کرتے ہیں پس انھوں نے نرم و گرم ہر طریقہ سے قوم کو رشد و ہدایت کے یہ کلمات اور ارشاد فرمائے مگر اس بد بخت قوم پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا، اور چند ضعیف اور کمزور ہستیوں کے علاوہ کسی نے پیغام حق پر کان نہ دھرا، خود بھی اسی طرح بد اعمال رہے اور دوسروں کی راہ بھی مارتے رہے، وہ راستوں میں بیٹھ جاتے اور حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس آنے جانے والوں کو قبول حق سے روکتے اور اگر موقعہ لگ جاتا تو لوگوں کو لوٹ لیتے اور اگر اس پر بھی کوئی خوش قسمت حق پر لبیک کہہ دیتا تو اس کو ڈراتے، دھمکاتے اور طرح طرح سے کج روی پر آمادہ کرتے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت حق کا سلسلہ برابر جاری رہا تو ان میں سے سربر آوردہ اشخاص نے کہ جن کو اپنی شوکت و طاقت پر غرور تھا، حضرت شعیب علیہ السلام سے کہا"اے شعیب! دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو کر رہے گی یا ہم تجھ کو اور تجھ پر ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے اور تیرا دیس نکالا کریں گے یا تم کو مجبور کریں گے کہ پھر ہمارے دین میں واپس آجاؤ۔"

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا"اگر ہم تمہارے دین کو غلط اور باطل سمجھتے ہوں تب بھی زبردستی مان لیں یہ تو بڑا ظلم ہے؟ اور جبکہ ہم کو خدائے تعالیٰ نے تمہارے اس دین سے نجات دیدی تو پھر ہم اس کی طرف لوٹ جائیں تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم نے جھوٹ بول کر خدائے تعالیٰ پر بہتان باندھا یہ ناممکن ہے ہاں اگر اللہ کی (جو کہ ہمارا پروردگار ہے) یہی مرضی ہو تو ہو جو چاہے گا کرے گا، ہمارے رب کا علم تمام اشیاء پر چھایا ہوا ہے، ہمارا تو صرف اسی پر بھروسہ ہے۔ اے پروردگار: تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق اور سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دے تو ہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ قوم کے سرداروں نے جب شعیبؑ کا عزم و استقلال دیکھا تو اب ان سے روئے سخن پھیر کر اپنی قوم کے لوگوں سے کہنے لگے:"خبردار! اگر تم نے شعیب علیہ السلام کا کہنا مانا تو تم ہلاک و برباد ہو جاؤ گے۔"

حضرت شعیب علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا"دیکھو خدائے تعالیٰ نے مجھ کو اس لئے بھیجا ہے کہ میں اپنے مقدور بھر تمہاری اصلاح کی سعی کروں اور میں جو کچھ کہتا ہوں اس کی صداقت اور سچائی کے لئے خدا کی حجت و ردلیل اور نشانی بھی پیش کر رہا ہوں، مگر افسوس کہ تم اس واضح حجت کو دیکھ کر بھی سرکشی و نافرمانی پر قائم ہو اور مخالفت کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو تم سے چھوٹا ہوا ہو پھر میں تم سے اپنی اس رشد و ہدایت کے بدلہ میں کوئی اجرت بھی نہیں مانگتا اور نہ کوئی دنیوی نفع کا طالب ہوں میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے، اور اگر تم اب بھی نہ مانو گے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں خدا کا عذاب تم کو ہلاک و برباد نہ کر ڈالے، اس کا فیصلہ اٹل ہے اور کسی کی مجال نہیں

کہ اس کو رد کر دے۔"

قوم کے سردار تیوری چڑھا کر بولے۔ شعیب! کیا تیری نماز ہم سے یہ چاہتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے دیوتاؤں کو پوجنا چھوڑ دیں اور ہمکو اپنے مال و دولت میں یہ اختیار نہ رہے کہ جس طرح چاہیں معاملہ کریں اگر ہم کم تولنا چھوڑ دیں لوگوں کے کاروبار میں کھوٹ نہ کریں تو مفلس و قلاش ہو کر رہ جائیں۔ پس کیا ایسی تعلیم دینے میں تجھ کو کوئی متین اور سچا رہبر کہہ سکتا ہے؟

حضرت شعیب علیہ السلام نے نہایت دل سوزی اور محبت کے ساتھ فرمایا "اے قوم! مجھے یہ خوف لگ رہا ہے کہ تیری یہ بے باکیاں اور خدا کے مقابلہ میں نافرمانیاں کہیں تیرا بھی وہی انجام نہ کر دیں، جو تجھ سے پہلے قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، اور قوم لوط کا ہوا، اب بھی کچھ نہیں گیا، خدا کے سامنے جھک جا، اور اپنی بد کرداریوں کے لئے بخشش کی طلب گار بن اور ہمیشہ کے لئے ان سے تائب ہو جا، بلا شبہ میرا پروردگار رحم کرنے والا اور بہت ہی مہربان ہے وہ تیری تمام خطائیں بخش دے گا۔"

قوم کے سرداروں نے یہ سن کر جواب دیا "شعیب علیہ السلام! ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ تو کیا کہتا ہے؟ تو ہم سب سے کمزور اور غریب ہے، اگر تیری باتیں سچی ہوتیں تو تیری زندگی ہم سے زیادہ اچھی ہوتی اور ہم کو صرف تیرے خاندان کا خوف ہے ورنہ تجھ کو سنگسار کر چھوڑتے تو ہرگز ہم پر غالب نہیں آ سکتا۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا "افسوس ہے تم پر! کیا تمہارے لئے خدا کے مقابلہ میں میرا خاندان زیادہ ڈر کا باعث بن رہا ہے حالانکہ میرا رب تمہارے تمام اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور وہ دانا بینا ہے۔

خیر اگر تم نہیں مانتے تو تم جانو، تم وہ سب کچھ کرتے رہو جو کر رہے ہو عنقریب خدا کا فیصلہ بتا دے گا کہ عذاب کا مستحق کون ہے اور کون جھوٹا اور کاذب ہے تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں؟

آخر وہی ہوا جو قانون الٰہی کا ابدی و سرمدی فیصلہ ہے "یعنی حجت و برہان کی روشنی آنے کے بعد بھی جب باطل پر اصرار ہو اور اس کی صداقت کا مذاق اڑایا جائے اور اس کی اشاعت میں رکاوٹیں ڈالی جائیں تو پھر خدا کا عذاب اس مجرمانہ زندگی کا خاتمہ کر دیتا اور آنے والی قوموں کے لئے اس کو عبرت و موعظت بنا دیا کرتا ہے۔"

نوعِ عذاب

قرآن عزیز کہتا ہے کہ نافرمانی اور سرکشی کی پاداش میں قوم شعیب علیہ السلام کو دو قسم کے عذاب نے آگھیرا ایک زلزلہ کا عذاب اور دوسرا آگ کی بارش کا عذاب یعنی جب وہ اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے تو یک بیک ایک ہولناک زلزلہ آیا اور ابھی یہ ہولناکی ختم نہ ہوئی تھی کہ اوپر سے آگ برسنے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ صبح کو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کل کے سرکش اور مغرور آج گھٹنوں کے بل اوندھے جھلسے ہوئے پڑے ہیں۔

فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُواْ فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ○ (اعراف)

پھر آ پکڑا ان کو زلزلے نے پس صبح کو رہ گئے اپنے اپنے گھروں کے اندر اوندھے پڑے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ إِنَّهُ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ (الشعراء)

پھر انھوں نے شعیب کو جھٹلایا پس آ پکڑا انکو بادل والے عذاب نے (جس میں آگ تھی) بے شک وہ بڑے ہولناک دن کا عذاب تھا۔

وَإِلٰى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَاقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ إِنِّيْ أَرَاكُمْ بِخَيْرٍ وَّإِنِّيْ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ○ وَيَاقَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○ بَقِيَّةُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ وَمَآ أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ○ قَالُوْا يَاشُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ أَمْوَالِنَا مَا نَشَآءُ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ○ قَالَ يَاقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا وَمَآ أُرِيْدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلٰى مَآ أَنْهَاكُمْ عَنْهُ إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ○ وَيَاقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ أَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ أَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ أَوْ قَوْمَ هُوْدٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ وَّمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ○ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا إِلَيْهِ إِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ○ قَالُوْا يَاشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ وَمَآ أَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ○ قَالَ يَاقَوْمِ أَرَهْطِيْٓ أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا إِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ○ وَيَاقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ إِنِّيْ عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّأْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ وَارْتَقِبُوْا إِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ○ وَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَأَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جَاثِمِيْنَ○ كَأَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ○

اور ہم نے (قبیلہ) مدین کی طرف اس کے بھائی شعیب کو بھیجا اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوشحال ہو (یعنی خدا نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے پس کفران نعمت سے بچو) میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایسا

دن نہ آجائے جو سب پر چھا جائے گا۔" اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں (ان کے حق سے) کم نہ دو ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو، اگر تم میرا کہا مانو تو جو کچھ اللہ کا دیا (کاروبار میں) بچ رہے، اسی میں تمہارے لئے بہتری ہے اور دیکھو (میرا کام تو صرف نصیحت کر دینا ہے) میں کچھ تم پر نگہبان نہیں (کہ جبراً اپنی راہ چلادوں) لوگوں نے کہا اے شعیب! کیا تیری یہ نمازیں (جو تو اپنے خدا کے لئے پڑھتا ہے) تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں آکر کہے: ان معبودوں کو چھوڑ دو جنھیں ہمارے باپ دادے پوجتے رہے ہیں، یا یہ کہ ہمیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہیں کریں بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو، شعیب علیہ السلام نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن رکھتا ہوں اور اس کے فضل و کرم کا یہ حال ہو کہ اچھی (سے اچھی) روزی عطا فرمارہا ہو (تو پھر بھی میں چپ رہوں اور تمہیں راہ حق کی طرف نہ بلاؤں) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جس بات سے تمہیں روکتا ہوں اس سے تمہیں تو روکوں اور خود اس کے خلاف چلوں میں تمہیں جو کچھ کہتا ہوں اسی پر عمل بھی کرتا ہوں میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ جہاں تک میرے بس میں ہے اصلاح حال کی کوشش کروں، میرا کام بنتا ہے تو اللہ ہی کی مدد سے بنتا ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع ہوں" اور اے میری قوم کے لوگو! میری ضد میں آکر کہیں ایسی بات نہ کر بیٹھنا کہ تمہیں بھی ویسا ہی معاملہ پیش آجائے جیسا قوم نوح کو یا قوم ہود کو یا قوم صالح کو پیش آچکا ہے، اور قوم لوط (کا معاملہ) تم سے کچھ دور نہیں، اور دیکھو اللہ سے (اپنے گناہوں کی) معافی مانگو۔ اور اس کی طرف لوٹ جاؤ۔ میرا پروردگار بڑا ہی رحمت والا۔ بڑی ہی محبت والا ہے لوگوں نے کہا "اے شعیب! تم جو کچھ کہتے ہو اس میں سے اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہم لوگوں میں ایک کمزور آدمی ہو، اگر (تمہارے ساتھ) تمہاری برادری کے آدمی نہ ہوتے تو ہم ضرور تمہیں سنگسار کر دیتے، تمہاری ہمارے سامنے کوئی ہستی نہیں، شعیب علیہ السلام نے کہا اے میری قوم کے لوگو! کیا اللہ سے بڑھ کر تم پر میری برادری کا دباؤ ہوا؟ اور اللہ تمہارے لئے کچھ نہ ہوا کہ اسے پیچھے ڈال دیا؟ (اچھا) جو تم کرتے ہو میرے پروردگار کے احاطہ (علم) سے باہر نہیں، اے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ، میں بھی اپنی جگہ سرگرم عمل ہوں بہت جلد معلوم کر لوگے کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کریگا اور کون فی الحقیقت جھوٹا ہے انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں اور پھر جب ہماری ٹھہرائی ہوئی بات کا وقت آپہنچا تو ایسا ہوا کہ ہم نے شعیب علیہ السلام کو اور ان کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا اور جو لوگ ظالم تھے انھیں ایک سخت آواز نے آپکڑا، پس جب صبح ہوئی تو اپنے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے (وہ اس طرح اچانک ہلاک ہو گئے گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے! تو سن رکھو کہ قبیلہ مدین کے لئے بھی محرومی ہوئی جس طرح ثمود کے لئے محرومی ہوئی تھی۔

قبر شعیب علیہ السلام

حضر موت میں ایک قبر ہے جو زیارت گاہِ عوام و خواص ہے۔ وہاں کے باشندوں کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ شعیب

علیہ السلام کی قبر ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام مدین کی ہلاکت کے بعد یہاں بس گئے تھے اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔ حضر موت کے مشہور شہر "شیون" کے مغربی جانب میں ایک مقام ہے جس کو "شبام" کہتے ہیں۔ اس جگہ اگر کوئی مسافر وادی ابن علی کی راہ ہوتا ہوا شمال کی جانب چلے تو وادی کے بعد وہ جگہ آتی ہے جہاں یہ "قبر" ہے۔ یہاں مطلق کوئی آبادی نہیں ہے اور جو شخص بھی یہاں آتا ہے صرف زیارت ہی کیلئے آتا ہے۔

عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ مجھ کو اس قبر کے متعلق شک ہے کہ یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر ہے، لیکن انہوں نے اس شک کیلئے کوئی وجہ نہیں بیان فرمائی۔

بصائر و عبرت

پچھلی امتوں اور قوموں کے یہ واقعات کہانیاں نہیں ہیں بلکہ عبرت میں نگاہوں کیلئے سرمایۂ صد ہزار عبرت ہیں۔ اگر زیادہ غور و فکر سے بھی کام نہ لیا جائے تب بھی بآسانی مسطورۂ بالا واقعات سے ہم حسب ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

۱۔ سورۂ اعراف میں مذکور ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی حجت و بینہ آچکی قد جاءتکم بینۃ من ربکم مگر قرآن عزیز نے دیگر انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت شعیب علیہ السلام کے کسی معجزہ "آیۃ اللّٰہ" کا ذکر نہیں کیا۔ علماء نے اس سے دو نتیجے نکالے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر نبی اور پیغمبر کسی قسم کا معجزہ نہ بھی لائے اور صرف خدا کے پیغام کیلئے روشن دلائل و براہین کی حجت ہی پیش کرے تو یہ روشن برہان ہے اس کا سب سے بڑا اور عظیم الشان معجزہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس مقام پر "بینہ" کی تفصیلات کو خدا کے سپرد کرنا چاہئے۔ اسلئے کہ ہو سکتا ہے کہ شریعت کے روشن دلائل کے علاوہ حضرت شعیب علیہ السلام کو بھی خدا کی جانب سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح کوئی نشان (آیۃ اللہ) بطور معجزہ عطا کیا گیا ہو اور اگرچہ قرآن نے اس جگہ اس کی تصریح نہیں کی۔ مگر شعیب علیہ السلام کے اس خطاب میں اسی جانب اشارہ ہو۔

۲۔ ہماری غلطیوں میں سب سے بڑی مہلک غلطی عرصہ سے یہ رہی ہے کہ ہم قرآن عزیز کی تعلیم سے یکسر غافل ہونے کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ اسلامی زندگی کے ارکان میں صرف "عبادات" ہی اہم رکن ہیں اور معاملات میں درست کاری اور اصلاحِ معاشرت کو اسلام میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں فساقِ امت کا تو ذکر ہی کیا۔ اکثر اتقیاء اور پرہیزگار بھی حقوق العباد اور معاملات میں بے پروا نظر آتے ہیں۔ مگر حقوق العباد کی حفاظت معاشرتی درستکاری اور معاملات میں دیانت و امانت کو اسلام میں کس درجہ اہم شمار کیا گیا ہے۔ وہ اس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جلیل القدر پیغمبر کی بعثت کا مقصد اسی کو قرار دیا اور ان کو انہی امور کی اصلاح حال کیلئے رسول بنا کر بھیجا۔

۳۔ خرید و فروخت میں دوسروں کے حق کو پورا نہ دینا انسانی زندگی میں ایسا روگ لگا دیتا ہے کہ یہ بد اخلاقی بڑھتے بڑھتے تمام حقوق العباد کے بارے میں حق تلفی کی خصلت پیدا کر دیتی اور اس طرح انسانی شرافت اور باہمی اخوت و مودت کے رشتہ کو منقطع کر کے لالچ، حرص، خود غرضی اور خست و دنائت جیسے رذائل کا حامل بنا دیا

کرتی ہے۔ اسی لیئے خدائے برتر کا ارشاد ہے:۔

وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ ۝ الَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ ۝ وَاِذَا كَالُوۡهُمۡ اَوْ وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ ۝ (مطففین)

ہلاکت ہے ان لوگوں کیلئے جو دوسروں سے جب لیتے ہیں تو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں اور کم تولتے اور ناپتے ہیں۔

پس ... (ہود پ ۱۲ آیت ۸۵) کہہ کر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ ناپ تول میں انصاف صرف اشیاء کی خرید و فروخت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ انسانی کردار کا یہ کمال ہونا چاہئے کہ خدا اور اس کے بندوں کے تمام حقوق و فرائض میں ایک اصل کو بنیاد کار بنائے اور کسی موقع اور کسی حالت میں بھی عدل و انصاف کی ترازو کو ہاتھ سے نہ دے اور خرید و فروخت کے درمیان ناپ تول میں کمی نہ کرنا اور انصاف کو برقرار رکھنا گویا ایک کسوٹی ہے جو انسانی زندگی کے معمولی لین دین میں عدل و انصاف نہیں برتتا اس سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اہم معاملات دینی و دنیوی میں عدل و قسط کو کام میں لائے گا؟

۴۔ اصلاح حال کے بعد خدا کی زمین میں فساد پیدا کرنے سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں ہے اس لئے کہ ظلم، کبر، قتل اور عصمت ریزی جیسے بڑے بڑے جرائم کی بنیاد اور اصل یہی رذیلہ ہے۔

۵۔ باطل کی ایک بڑی شناخت یہ ہے کہ نہ وہ اپنے لئے دلائل کی روشنی رکھتا ہے اور نہ روشن دلائل کو برداشت کرتا ہے بلکہ جب اس کے سامنے روشنی آتی ہے تو وہ منہ پھیر لیتا، اور آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اس کی موجودگی کو برداشت نہ کرتے ہوئے دلائل کا جواب غصہ دھمکی اور قتل سے دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے، تم انبیاء ﷺ اور ان کے پیروان حق کی زندگی اور پھر ان کے مقابل اور مخالف باطل پرستوں کی زندگی کا موازنہ کرو اور تاریخ کے اوراق سے واضح شہادت لو تو تم کو قدم قدم پر یہ حقیقت آشکار اور روشن نظر آئے گی کہ انبیاء ﷺ روشن دلائل دے رہے ہیں، آیات اللہ اور خدا کی نشانیاں دکھا رہے ہیں، محبت اور رحم کے جذبات کا اظہار کر رہے ہیں اور اپنی دعوت و تبلیغ پر مخاطبین پر مالی دباؤ نہ ڈالنے کا اطمینان دلا رہے ہیں مگر ان تمام باتوں کے باوجود دوسری جانب سے ان کو کہا جا رہا ہے کہ ہم تمہارا دیس نکالا کر دیں گے ہم تم کو سنگسار کر دینگے ہم تم کو قتل کر دیں گے، اور اگر خدا کے پیغمبر آخری طور پر یہ کہتے ہیں کہ اگر تم ہماری آواز پر لبیک نہیں کہتے تو کم از کم ہمارے وجود کو برداشت کرو اور اتنا تو صبر کرو کہ خدا تمہارے اور ہمارے درمیان حق و باطل کا خود ہی فیصلہ کر دے تو دوسری جانب انکار تمسخر اور یہ مطالبہ پیش ہوتا ہے کہ بس اب اپنی نصیحت ختم کرو اور اگر سچے ہو تو جس عذاب سے ڈراتے ہو۔ وہ ابھی لے آؤ ورنہ تو ہم ہمیشہ کے لئے تمہارا اور تمہارے مشن کا خاتمہ کر دیں گے۔

۶۔ حق و باطل کا یہی وہ آخری مرحلہ ہے جس کے بعد خدائے تعالیٰ کا وہ قانون جس کو قانون پاداش عمل کہا جاتا ہے ایسی سرکش اور متکبر قوموں کیلئے دنیا ہی میں نافذ ہو جاتا ہے اور ان کو ہلاک و تباہ کر کے آنے والی نسلوں اور قوموں کے لئے سامان عبرت و موعظت مہیا کر دیتا ہے۔

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام

- بنی اسرائیل مصر میں
- نسب وولادت موسیٰ علیہ السلام
- وادی مقدس و بعثت موسیٰ علیہ السلام
- آیات اللہ اور فرعون کا انکار
- بنی اسرائیل کی ہجرت اور فرعون کی مزاحمت
- عبور قلزم کے بعد بنی اسرائیل کا پہلا مطالبہ
- دیگر مطالبات اور آیات بینات کا ظہور
- نزول تورات
- سامری؟
- حیات بعد الموت
- ارض مقدس اور بنی اسرائیل
- حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قارون
- حضرت ہارون کی وفات
- حضرت موسیٰ کی وفات
- بنی اسرائیل کا قومی مزاج اور خدا کی جانب سے تذکیر نعمت
- موسیٰ علیہ السلام وہارون علیہ السلام کا ذکر قرآن میں
- ارض مدین اور موسیٰ علیہ السلام کا مصر سے خروج
- واپسی مصر اور فرعون کو دعوت اسلام
- قتل موسیٰ علیہ السلام کا مشورہ
- نجات بنی اسرائیل و غرق فرعون
- قومی پستی کا مظاہرہ
- موسیٰ علیہ السلام کا طور پر اعتکاف
- گوسالہ پرستی کا واقعہ
- ستر سرداروں کا انتخاب
- بنی اسرائیل اور جبل طور
- ذبح بقرہ کا واقعہ
- حضرت موسیٰ اور ایذاء بنی اسرائیل
- حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام
- حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ثناء و منقبت قرآن میں
- ایک لطیف تاریخی نکتہ
- بصیرتیں اور عبرتیں

بنی اسرائیل مصر میں

قرآن عزیز نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں بنی اسرائیل کا ذکر صرف اسی قدر کیا تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کا خاندان حضرت یوسف علیہ السلام سے ملنے مصر میں آئے مگر اس کے بعد صدیوں بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں پھر ایک مرتبہ قرآن حکیم بنی اسرائیل کے واقعات تفصیل سے سناتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر ہی میں بس گئے تھے اور ان تمام پچھلی صدیوں میں ان کی تاریخ مصر ہی سے وابستہ رہی ہے تورات کی یہ تفصیلات بھی اسی کی

تائید کرتی ہیں۔

"تب فرعون یوسف سے متکلم ہوا اور کہا کہ تیرا باپ اور تیرے بھائی تجھ پاس آئے ہیں، مصر کی زمین تیرے آگے ہے۔ اپنے باپ اور اپنے بھائیوں کو اس سرزمین کے ایک مقام میں جو سب سے بہتر ہے بسا جشن کی زمین میں انہیں رہنے دے۔ اور اگر تو جانتا ہے کہ بعضے ان کے درمیان چالاک ہیں تو ان کو میری مواشی پر مختار کر۔ (پیدائش باب ۴۷ آیات ۵۔۶)

اور یوسف نے اپنے باپ اور بھائیوں کو ملک مصر کی ایک بہتر زمین میں جو رعمیس کی زمین ہے۔ جیسا فرعون نے فرمایا تھا بٹھایا اور انہیں اس کا مالک کیا اور یوسف نے اپنے باپ اور اپنے بھائیوں اور اپنے باپ کے سب گھرانے کی، ان کے لڑکے بالوں کے موافق روٹی سے پرورش کی۔

(پیدائش باب ۴۷ آیات ۱۱۔۱۲)

اور اسرائیل نے مصر کی زمین میں جشن کے ملک میں سکونت کی اور وہ وہاں ملکیتیں رکھتے تھے اور وہ بڑھے اور بہت زیادہ ہوئے اور یعقوب مصر کی زمین میں ستر برس جیا۔ سو یعقوب کی ساری عمر ایک سو سینتالیس برس کی ہوئی۔ (پیدائش باب ۴۷ آیات ۲۷۔۲۸)

تورات میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت یوسف نے فرعون سے اپنے باپ اور اہل خاندان کیلئے "ارض جاشان" طلب کی جو فرعون نے بخوشی ان کے سپرد کر دی۔ (پیدائش باب ۴۷ آیات ۳۰۔۳۱)

مصر کے نقشہ میں یہ جگہ بلبیس کے شمال میں واقع ہے۔ اس علاقہ کا ایک موجودہ شہر فکوسہ (سفط الحنہ) ہے)۔

حضرت یوسف کے واقعہ میں ہم بتا چکے ہیں کہ شہری آبادی سے دور حضرت یوسف نے اپنے خاندان کیلئے یہ جگہ غالباً اسلئے منتخب کی تھی کہ یہاں رہ کر ان کے خاندان کی بدویانہ زندگی بحالہ باقی رہے گی اور اس کی وجہ سے مصری بت پرست ان کے ساتھ اختلاط نہ کر سکیں گے اور ان کی مشرکانہ رسوم اور بداخلاقیاں بنی اسرائیل میں سرایت نہ کر سکیں گی کیونکہ مصری لوگ چرواہوں، کاشتکاروں اور بدوی لوگوں کو کمتر اور نجس سمجھتے اور ان کے ساتھ اختلاط کو معیوب جانتے تھے۔

تورات میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت یعقوب کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے حضرت یوسف کو بلا کر وصیت کی کہ مجھ کو سرزمین مصر میں دفن نہ کیا جائے بلکہ باپ دادا کے وطن فلسطین میں میری قبر بنائی جائے۔ حضرت یوسف نے باپ کو پورا اطمینان دلایا اور انتقال کے بعد ان کے جسد اطہر کو حنوط (ممی) کر کے تابوت میں رکھا اور فلسطین لے جا کر سپرد خاک کیا۔

حضرت یعقوب نے وفات سے پہلے ساری اولاد کو جمع کیا اور حضرت یوسف کے صاحبزادوں افرائیم اور منسی کو بھی بلایا اور ان سب کو اول دعاء برکت دی اور محبت و شفقت کے ساتھ ان کو نوازا اس کے بعد ان کو نصیحت کی کہ "دیکھو میرے بعد اپنے ایمانیات و اعتقادات کو کہیں خراب نہ کر لینا اور خدا کے اس پاک رشتہ کو جو میں نے اور میرے باپ دادا نے ہمیشہ مضبوط رکھا مشرکانہ رسوم و عوائد سے شکست و ریخت نہ کر دینا۔"

(پیدائش باب ۴۸ آیات ۳۰۔۳۱)

قرآن عزیز نے بھی یعقوب ؑ کی اس مقدس وصیت کا ان معجزانہ جملوں میں ذکر کیا ہے۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ آبَآئِكَ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحَاقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

(اے محمد ﷺ) کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت تھا، جبکہ اس نے اپنی اولاد سے کہا "میرے بعد کس کی پرستش کرو گے (یعنی کون سا دین اختیار کرو گے) تو انہوں نے جواب دیا۔ "ہم اسی ایک خدا کی پرستش کریں گے جو تیرا اور تیرے باپ دادا ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق کا خدا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں اور ہم تو اسی کے فرمانبردار ہیں۔

تورات نے حضرت یوسف ؑ کی وفات کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان کی عمر اور ان کی نسل کا بھی ذکر حسب ذیل عبارت میں کیا ہے:۔

> اور یوسف ؑ اور اس کے باپ کے گھرانے نے مصر میں سکونت کی اور یوسف ؑ ایک سو دس برس جیا، اور یوسف ؑ نے افرائیم کے لڑکے جو تیسری پشت میں تھے دیکھے اور منسی کے بیٹے مکیر کے بیٹے بھی یوسف ؑ کے گھٹنوں پر پالے گئے اور یوسف ؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا میں مرتا ہوں اور خدا یقیناً تم کو یاد کریگا اور تم اس زمین سے باہر اس زمین میں جس کی بابت اس نے ابراہام اور اسحٰق ؑ اور یعقوب سے قسم کی ہے لیجائیگا، اور یوسف ؑ نے بنی اسرائیل سے قسم لے کے کہا خدا یقیناً تم کو یاد کریگا اور تم میری ہڈیوں کو یہاں سے لیجائیو، سو یوسف ؑ ایک سو دس برس کا بوڑھا ہو کے مر گیا اور انہوں نے اس میں خوشبو بھری اور اسے مصر میں صندوق میں رکھا۔ (پیدائش باب ۵ آیات ۲۲-۲۶)
>
> اور موسیٰ نے یوسف ؑ کی ہڈیاں ساتھ لیں کیونکہ اس نے بنی اسرائیل کو تاکیداً قسم دے کے کہا تھا کہ خدا یقیناً تمہاری خبر گیری کریگا، تم یہاں سے میری ہڈیاں ساتھ لے جائیو۔
> (خروج باب ۱۳ آیات ۱۹)

چنانچہ حضرت یوسف ؑ کی وصیت کے مطابق ان کی اولاد نے ان کے جسم مبارک کو بھی حنوط (ممی) کر کے تابوت میں محفوظ کر دیا اور جب موسیٰ ؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر سے ہجرت کر کے چلے ہیں تو یوسف کی وصیت کو پورا کرنے کے لئے ان کا تابوت بھی ساتھ لے گئے اور نبیوں کی سرزمین میں لا کر دفن کر دیا یہ مقام کونسا ہے؟ اس کے متعلق اہل جبرون یہ کہتے ہیں کہ وہ جبرون میں مدفون ہیں اور حرم خلیلی میں مکفیلہ کے قریب ایک محفوظ تابوت کے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہی تابوت یوسف ؑ ہے لیکن عبدالوہاب مصری اس کو وہم بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت فاضل محمد نمر حسن نابلسی اور نابلس کے سرکردہ عالم حضرت فاضل امین بک عبدالہادی نے بیان کیا کہ حضرت یوسف ؑ کی ضریح مبارک نابلس میں ہے اور یہی صحیح ہے اس لئے کہ توریت کہتی ہے کہ حضرت یوسف ؑ ارض فرائیم میں دفن ہوئے اور نابلس ارض

فرائیم ہیں میں ہے اور اس کو قدیم زمانہ میں شکیم کہتے تھے۔ (قصص الانبیاء ص ۱۸۷)

بہر حال ان تفصیلات سے یہ واضح ہو گیا کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درمیانی صدیوں میں مصر میں آباد رہے۔

فرعون موسیٰ

گذشتہ واقعات میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ "فرعون" شاہان مصر کا لقب ہے کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہو کر عہد سکندر تک فراعنہ کے اکتیس خاندان مصر پر حکمراں رہے ہیں، سب سے آخری خاندان فارس کی شہنشاہی کا جو ۳۳۲ قبل از مسیح سکندر کے ہاتھوں مفتوح ہو گیا ان میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون (ہیکسوس) (عمالقہ) کے خاندان سے تھا جو دراصل عرب خاندانوں ہی کی ایک شاخ تھی تواب سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد کا فرعون کون ہے اور کس خاندان سے متعلق ہے؟

عام مؤرخین عرب اور مفسرین اس کو بھی "عمالقہ" ہی کے خاندان کا فرد بتاتے ہیں، اور کوئی اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان بتاتا اور کوئی مصعب بن ریان کہتا ہے اور ان میں سے ارباب تحقیق کی رائے یہ ہے کہ اس کا نام ریان یا ریان ابا تھا ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس کی کنیت ابو مرہ تھی،

یہ سب اقوال قدیم مؤرخین کی تحقیقی روایات پر مبنی تھے مگر اب جدید مصری اثری تحقیقات اور حجری کتبات کے پیش نظر اس سلسلہ میں دوسری رائے سامنے آئی وہ یہ کہ موسیٰ کے زمانہ کا فرعون رعمسیس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے جس کا دور حکومت ۱۲۹۲ ق م سے شروع ہو کر ۱۲۲۵ ق م پر ختم ہوتا ہے۔

اس تحقیقی روایت کے متعلق احمد یوسف احمد آفندی نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے یہ مصری دار الآثار کے مصور ہیں اور اثری و حجری تحقیق کے بہت بڑے عالم ہیں ان کے اس مضمون کا خلاصہ نجار نے قصص الانبیاء میں نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے۔

> "یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ یوسف علیہ السلام جب مصر میں داخل ہوئے ہیں تو یہ فراعنہ کے سولہویں خاندان کا زمانہ تھا اور اس فرعون کا نام "اباپی الاول" تھا میں نے اس کی شہادت اس حجری کتبہ سے حاصل کی جو عزیز مصر "فوتی فارع" (فوطیفار) کے مقبرہ میں پایا گیا، اور سترھویں خاندان کے بعض آثار سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اس خاندان سے قبل مگر قریب ہی زمانہ میں مصر میں ہولناک قحط پڑ چکا تھا، لہٰذا ان تعینات کے بعد آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا داخلۂ مصر "اباپی الاول" کے زمانے میں تقریباً ۱۷۰۰ ق م ہوا ہے اور حضرت یوسف کا عزیز مصر کے یہاں رہنا اور پھر قید خانہ کی زندگی بسر کرنا ان دونوں کی مدت کا اندازہ کر کے کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف سے تقریباً ستائیس سال بعد مصر میں اس نشان سے داخل ہوئے جس کا ذکر قرآن حکیم اور تورات میں کیا گیا۔ ہم اگر چہ فراعنۂ مصر

کی حکومت اور شاہی خاندانوں کے متعلق اچھی طرح آگاہی پاچکے ہیں اور مصری آثار نے اس میں ہم کو کافی مدد دی ہے۔ مگر ابھی تک ان اثریات میں وہ تفصیلی تصریحات دستیاب نہیں ہوئیں جو فرعون اور بنی اسرائیل کی عداوت، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور غرق فرعون و نجات بنی اسرائیل سے متعلق ہیں۔ تورات میں مذکور ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ عداوت کا معاملہ کیا اور ان کو سخت مصائب میں مبتلا رکھا۔ اس نے بنی اسرائیل سے دو شہروں (رعمسیس اور فیثوم) کی تعمیر کی خدمت بھی لی اور ان کو مزدور بنایا، تو اثری حفریات (پرانے آثار کی کھدائی) میں ان دو شہروں کا پتہ تو لگ چکا ہے۔ ایک کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام "بر۔ توم" یا "فیثوم" ہے، اس کا ترجمہ ہے "خدائے توم کا گھر" اور دوسرے کا نام "برر عمسیس" ہے جس کا ترجمہ "قصر رعمسیس" ہوتا ہے۔

اور شرقی جانب میں جو مقام اب "تل مسخوطہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں "فیثوم" کی آبادی تھی اور جس جگہ اب "قنتیر" یا قدیم مصری زبان کے اعتبار سے "خت نفر" واقع ہے اس مقام پر "رعمسیس" آباد تھا۔ اس کو "رعمسیس ثانی" نے اسلئے آباد کیا تھا کہ یہ مصر کی بحری جانب کے سینٹر میں بہترین قلعہ کا کام دے اور فیثوم کی آبادی کا بھی یہی مقصد تھا۔ اس شہر کی چہار دیواری کے جو کھنڈر معلوم ہوئے ہیں، وہ بلا شبہ اس کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ دونوں شہر مصر کے بہترین حفاظتی قلعے تھے نہ کہ تورات کے بیان کے مطابق غلوں کے گودام۔

اس تمام قیل و قال کا مطلب یہ ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل کو مصائب میں مبتلا کیا وہ یہی "ریمسیس دوم" ہو سکتا ہے۔ یہ مصر کے حکمرانوں کا انیسواں خاندان تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور اسی کی آغوش میں پرورش پائی، تاریخ اثریات سے پتہ چلتا ہے کہ "اسیویہ" قبائل جو مصر کے قریب آباد تھے ان کے اور فراعنہ کے اس خاندان کے درمیان پیہم نو سال تک سخت جنگ و پیکار رہی بدیں وجہ یہ قرین قیاس ہے کہ ریمسیس دوم نے اس خوف سے کہ کہیں بنی اسرائیل کا یہ عظیم الشان قبیلہ جو لاکھوں نفوس پر مشتمل تھا، اندرونی بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے۔ بنی اسرائیل کو ان مصائب میں مبتلا کرنا ضروری سمجھا جن کا ذکر توراۃ اور قرآن حکیم میں کیا گیا ہے۔[1]

ریمسیس دوم اس زمانہ میں بہت مسن اور معمر ہو چکا تھا، اسلئے اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے "منفتاح" کو شریک حکومت کر لیا تھا۔ ریمسیس کی ڈیڑھ سو اولاد میں سے یہ تیرھواں لڑکا تھا۔ لہٰذا منفتاح ہی وہ "فرعون" ہے۔ جس کو حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام نے اسلام کی دعوت دی اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کیا اور اسی کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے

---

[1] تورات سے بھی اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے "اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا دیکھو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں۔ آؤ ہم ان سے دانشمندانہ معاہدہ کریں تاکہ یہ نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل جائیں اور ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں (خروج باب ۱ آیت ۱۔۱۱)

اور یہی غرق دریا ہوا، چونکہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے گھر میں پرورش پاتے دیکھا تھا اسلئے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اسلام کا پیغام سنایا تو قرآن عزیز کے ارشاد کے مطابق اس نے یہ طعنہ دیا!

أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ (شعراء)

کیا ہم نے اپنے یہاں تیرے بچپن میں تیری پرورش نہیں کی؟ اور تو اپنی عمر کے چند سال ہم میں رہ چکا ہے۔

تورات میں ہے کہ خروج سے پہلے مصر کے بادشاہ کا انتقال ہو گیا، اس سے مراد وہی ریمسیس دوم ہے جو منفتاح کا باپ تھا۔

علامہ فلاندرس نے ایک حجری کتبہ دریافت کیا ہے جس پر سیاہ حروف کندہ ہیں اور وہ ۱۸۹۹ء مصری میں لکھا گیا ہے یہ دراصل ایک بہت بڑی چٹان ہے جس کی بلندی ۳ میٹر اور ۱۴ سم ہے، یہ "کتبہ" دو وجہ سے معرض تحریر میں آیا تھا، ایک یہ کہ ان تمام تفصیلات کو بیان کیا جائے جو اٹھارہویں خاندان کے بادشاہ "امنتحب" نے معبد امون کی خدمات کے متعلق انجام دی تھیں اور دوسرے یہ کہ انیسویں خاندان کے بادشاہ منفتاح بن ریمیسس دوم کی تعریف میں کچھ لکھا جائے اس لئے اس کتبہ کی عبارت شاعرانہ اسلوب پر لکھی گئی ہے اور منفتاح نے لوبیین پر جو فتح حاصل کی تھی اس کے بڑے فخر ومباہات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور عسقلان جیرز، بانوعیم جو فلسطین کے علاقہ کے مشہور شہر تھے ان کے سقوط کی جانب اشارات کئے گئے ہیں،

اسی کے ضمن میں بنی اسرائیل کے متعلق بھی مختصر عبارت میں اظہار خیال کیا گیا اور یہ سب سے پہلا اثری نقش اور حضریات مصری کا پہلا کتبہ ہے جس میں بنی اسرائیل کا صراحت کے ساتھ ذکر موجود ہے اس کا ترجمہ یہ ہے۔

لقد سحق بنو اسرائيل ولم يبق لهم بذر -

بنی اسرائیل تمام ہلاک ہوگئے اور اب ان کی نسل کا خاتمہ ہو گیا۔

ایک باریک بین اس عبارت کو دیکھ کر بآسانی یہ علم حاصل کر سکتا ہے کہ یہ تحریر منفتاح کے زمانے میں نہیں لکھی گئی ورنہ تو مصری دستور کے مطابق بنی اسرائیل جیسے عظیم الشان قبیلہ کی ہلاکت کے واقعہ کو اس معمولی اور مختصر الفاظ میں درج نہ کیا جاتا، بلکہ منفتاح کی شان میں بڑے زبردست قصیدہ کے ساتھ اس دشمن پر کامیابی کا اظہار کیا جاتا اور جن واقعات پر اس کتبہ میں اشارہ کیا گیا ہے ان کی اہمیت اور عظمت کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ یونہی ضمنی طور پر اور وہ بھی سابق بادشاہ کے حالات سے متعلق کتبہ پر درج نہ کر دیئے جاتے بلکہ ان اہم واقعات کیلئے منفتاح کے زمانہ میں مستقل الگ ایک کتبہ اسی غرض سے تحریر کیا جاتا۔

میٹر = ۱.۰۹۴ گز

سم (سینٹی میٹر) میٹر ۱۰۰/۱ حصہ۔

مگر ایسا کیوں نہ ہوا؟ سو بات بہت واضح ہے وہ یہ کہ مصری کاہنوں کو اس واقعہ ہائلہ کی ہرگز توقع نہ تھی جو موسیٰ (علیہ السلام) کے واقعہ میں غرق فرعون کی شکل میں ظاہر ہوا اور وہ منفتاح کی موت کیلئے اس قلت کے متوقع نہ تھے اس زمانہ کی عمر طبعی لحاظ سے ابھی کافی زمانہ تھا کہ منفتاح کے کاہن مصری دستور کے مطابق اس انیسویں خاندان کے بادشاہ کے ان حالات کو مرتب کر کے لوح پر محفوظ کر دیں تاکہ وہ بادشاہ کے مقبرہ پر کندہ ہو سکے اب جبکہ یہ واقعہ ہائلہ پیش آ گیا تو اصل حقیقت کو چھپانے کی سعی کی گئی تاکہ آئندہ قبطی نسلیں اس ذلت و رسوائی کو معلوم نہ کر سکیں جو ان کے واجب الاحترام دینی عقائد پر خدائی طرف سے سخت ضرب کا باعث بن چکی تھی پس انہوں نے بے جا جسارت اور تاریخی بددیانتی کے ساتھ حالات کو منقلب کر کے معاملہ کو بالکل مخالف شکل میں تحریر کر دیا اور بنی اسرائیل کی کامیاب واپسی وطن کو ان مسطورہ بالا الفاظ میں ظاہر کیا تاکہ غرق فرعون کا قصہ آئندہ مصریوں کے سامنے باقی ہی نہ رہے۔

اس نتیجہ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مصری دستور کے مطابق ہر ایک بادشاہ کا مقبرہ جدا ہوتا تھا اور اس کے تمام حالات اور خصوصی نمایاں امتیازات کی تاریخ اور اس کے زمانہ کی بعض شاہی اشیاء اور جواہرات اس کی قبر کے ساتھ ہی محفوظ کر کے رکھے جاتے تھے۔

لیکن منفتاح کی اس شان کے باوجود جس کا مذکورہ بالا کتبہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ نہ اس کا علیحدہ مقبرہ بنایا گیا اور نہ وہ تمام رسوم انجام پا سکیں جو ہمیشہ بادشاہوں کیلئے ضروری سمجھی جاتی تھیں، بلکہ اس کو قلت کے ساتھ امنحتب کے مقبرہ ہی میں دفن کر دیا گیا اور اٹھارھویں خاندان کے بادشاہ اور انیسویں خاندان کے بادشاہ کی نعشیں ایک ہی جگہ جمع کر دی گئیں۔

(قصص الانبیاء نجار ص ۲۲۹، ۲۲۱)

مصری عجائب خانہ میں یہ نعش آج بھی محفوظ ہے اور قرآن عزیز کے اس کلام بلاغت نظام کی تصدیق کر رہی ہے۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً

پس آج کے دن ہم تیرے جسم کو (دریا سے) نجات دیں گے تاکہ وہ تیرے بعد آنے والوں کیلئے (خدا کا) نشان رہے)۔

اور محمد احمد عدوی کتاب "دعوۃ الرسل الی اللہ" میں لکھتے ہیں کہ اس نعش کی ناک کے سامنے کا حصہ ندارد ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حیوان کا کھایا ہوا ہے غالباً دریائی مچھلی نے خراب کیا ہے اور پھر اس کی نعش خدائی فیصلہ کے مطابق کنارہ پر پھینک دی گئی۔ (دعوۃ الرسل الی اللہ ص ۱۸۱)

ان نقول کیلئے کسی شرح کی ضرورت نہیں ہے، البتہ یہ یورپ کے ان مقلدین کیلئے ضرور سرمایہ صد عبرت ہیں جو جلد بازی کے ساتھ مستشرقین کی ہر ایک تحقیق پر بغیر کسی پس و پیش کے آمنا و صدقنا کہہ دینے کے عادی ہیں۔ جو قرآن اور خدا کے نبی کے احکام پر شک کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں مگر یورپین مورخین اور مستشرقین

کی تحقیقات علمی کو وحی الٰہی سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ جو اپنے علماء اسلام کی تقلید کو حرام جانتے۔ مگر علماء یورپ کے ہر نوشتہ کو نوشتۂ الٰہی یقین کرتے ہیں۔

چنانچہ یورپ کے مورخین جدید نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ (علیہما السلام) اور فراعنۂ مصر کے درمیان جو واقعات، تورات و قرآن عزیز سے ثابت ہوتے ہیں وہ تاریخی معیار پر اسلئے غلط اور بے اصل ہیں کہ مصری "حضریات واثریات" میں ان اہم اور عظیم الشان حالات و واقعات کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ یہ مسلم ہے کہ مصری اپنی تاریخ کی تدوین میں بہت زیادہ چست و چالاک اور سب سے پیش پیش ثابت ہوئے ہیں اور آج ان کے اس طرز عمل کی بدولت تین ہزار سال قبل مسیح کے حالات کی صحیح تاریخ مرتب ہو سکی ہے۔

تو اس دعویٰ کی کورانہ تقلید میں ہندوستان کے بعض یورپ زدہ مسلمانوں نے بھی ان واقعات کی صحت سے انکار کر دیا اور خدا کی سچی وحی سے اعراض کرتے ہوئے ان تخمینی قیاسات کو یقینی اور الہامی نوشتہ کی حیثیت دی،
[illegible]

لیکن آج جبکہ مصری حضریات واثریات میں صراحت کے ساتھ اس زمانہ کے فرعون اور بنی اسرائیل کی عداوت کا حال روشنی میں آچکا ہے اور مسطورہ بالا ترتیبی واقعات خود بخود ان حقائق کو سامنے لے آتے ہیں۔ جن کا ذکر قرآن عزیز میں موجود ہے۔ تو اب نہ معلوم جلد بازی سے انکار کرنے والے ان مدعیانِ علم کی علمی روش کیا صورت اختیار کرے گی؟ اپنی نادانی اور کورانہ تقلید کی پردہ دری کے خوف سے انکار پر اصرار، یا حقیقت کے اقرار کے ساتھ ساتھ پیغمبر خدا کی بتائی ہوئی راہِ یقین (وحی الٰہی) کے سامنے اظہار ندامت و تاسف؟

بہر حال وہ اپنا معاملہ جو کچھ بھی رکھیں یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اذعان اور یقین کی جو راہ "وحی الٰہی" یعنی قرآن عزیز کے ذریعہ حاصل ہو چکی ہے۔ اسکو ذرہ برابر اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئیگی اور استقراء و قیاس سے حاصل شدہ علم اس وقت تک برابر گردش میں رہے گا۔ جب تک قرآنی صداقت پر آکر نہ ٹھہر جائے۔

فرعون کا خواب

تورات اور مورخین کہتے ہیں کہ فرعون کو بنی اسرائیل کے ساتھ اسلئے عداوت ہو گئی تھی کہ اس زمانہ کے کاہنوں، نجومیوں اور قیافوں نے اس کو بتایا تھا کہ تیری حکومت کا زوال ایک اسرائیلی لڑکے کے ہاتھ سے ہوگا اور بعض تاریخی روایات میں ہے کہ فرعون نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر دربار کے منجموں اور کاہنوں نے وہی دی تھی جس کا ذکر ابھی گذر چکا ہے۔ مفسرین نے بھی انہی روایات کو کتب تفسیر میں نقل فرمایا ہے۔ تورات میں یہ اور اضافہ ہے کہ فرعون نے "دایہ" مقرر کر دی تھیں کہ قلمرو مصر میں جس اسرائیلی کے یہاں لڑکا پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے۔ مگر ان عورتوں کے دلوں میں ایسی ہمدردی پیدا ہوئی کہ انہوں نے اس عمل کیلئے کوئی اقدام نہیں کیا اور جب فرعون نے بازپرس کی تو یہ معذرت پیش کی کہ

اسرائیلی عورتیں شہری عورتوں کی طرح نازک اندام نہیں ہیں۔ وہ خود ہی بچہ جن لیتی ہیں اور ہم کو مطلق خبر نہیں دیتیں۔ اس پر فرعون نے ایک جماعت کو اسلئے مقرر کیا کہ وہ تفتیش اور تلاش کے ساتھ اسرائیلی لڑکوں کو قتل کر دیں اور لڑکیوں کو چھوڑ دیا کریں۔ (خروج باب آیات ۱۵۔ ۲۲)

حضرت موسیٰ اور ہارون کا ذکر قرآن میں

قرآن عزیز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر بے شمار مقامات میں آیا ہے۔ چونکہ ان کے بیشتر حالات نبی اکرم ﷺ کے مبارک حالات سے بہت زیادہ مطابقت رکھتے ہیں اور ان واقعات میں غلامی اور آزادی کے باہم معرکہ آرائی اور حق و باطل کے مقابلہ کی بے نظیر داستان ودیعت ہے نیز ان کے اندر بصائر و مواعظ کا نادر ذخیرہ جمع ہے، اسلئے قرآن عزیز نے حسب ضرورت اور حسب موقع و محل جگہ جگہ اس قصہ کے اجزاء کو مجمل اور مفصل طریقہ پر بیان کیا ہے۔

مندرجہ ذیلی نقشہ سے "اعداد و شمار کے ساتھ ساتھ" اس واقعہ کی اہمیت کا بھی صحیح اندازہ ہو سکے گا اور اس اولو العزم پیغمبر کی عظمت شان کا بھی۔

اس نقشہ کے دو حصہ ہیں پہلے حصے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام یا بنی اسرائیل اور فرعون کے واقعات کن کن سورتوں اور کتنی آیات میں مذکور ہیں اور دوسرا حصہ یہ واضح کرتا ہے کہ قرآن عزیز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون کے نامہائے مبارک کتنی جگہ مذکور ہیں اور ان کی مجموعی تعداد کیا ہے؟

نقشہ۔ ۱

سورۃ	آیات	شمار
بقرہ	۴۷ تا ۶۱، ۶۳ تا ۷۵، ۸۳ تا ۲۵ ۸۷، ۹۲ تا ۹۳، ۱۰۸، ۱۳۶، ۲۴۳، ۲۵۱	
نساء	۱۵۳، تا ۱۵۶، ۱۶۴	۱۲
مائدہ	۱۲، ۱۳، ۲۰ تا ۲۵، ۲۶، ۴۵، ۳۷ ۷۰، ۷۱، ۷۸، ۷۹	
انعام	۸۴، تا ۹۰، ۱۴۶، ۱۵۴، ۱۸۹	۲۱
اعراف	۱۰۳، تا ۱۵۷، ۱۵۹ تا ۱۷۱	۶۷
انفال	۵۴	۱
یونس	۷۴ تا ۹۳	۲۰

ہود	۹۶تا۹۹،۱۱۰	۱۵
ابراھیم	۵،۶،۸	۳
نحل	۱۲۴	۱
بنی اسرائیل	۲تا۷،۱۰۱تا۱۰۴	۱۱
کہف	۶۰تا۸۲	۲۳
مریم	۵۱تا۵۳	۳
طٰہ	۹۰تا۹۸	۹
انبیاء	۴۸،۴۹	۲
مؤمنین	۴۵تا۴۹	۵
فرقان	۳۵-۳۶	۲
شعراء	۱۰تا۶۶	۵۷
نمل	۷تا۱۴	۸
قصص	۳تا۴۸	۴۶
عنکبوت	۳۹،۴۰	۲
سجدہ	۲۳،۲۴	۲
احزاب	۲۹	۱
الصّٰفّٰت	۱۱۴تا۱۲۲	۹
مؤمن	۲۳تا۴۵	۲۰
زخرف	۳۶تا۵۶	۲۱
دخان	۱۷تا۳۳	۱۷
جاثیہ	۱۶،۱۷	۲
الذاریات	۳۸تا۴۰	۳
قمر	۴۱تا۵۵	۱۵
صف	۵	۱
جمعہ	۵،۶	۲
تحریم	۱۱	۱

الحاقہ	۹،۱۰	۲
مزمل	۱۵،۱۶	۲
النازعات	۱۵تا۲۵	۱۱
فجر	۱۰تا۱۳	۴

ٹوٹل = ۵۱۴

نقشہ-۳

موسیٰ علیہ السلام		ہارون علیہ السلام	
سورۃ	شمار	سورۃ	شمار
بقرہ	۱۲	بقرہ	۱۰
نساء	۲	نساء	۱
مائدہ	۲	۰	۰
انعام	۲	انعام	۱
اعراف	۱۶	اعراف	۱
یونس	۸	یونس	۱
ھود	۲	۰	۰
ابراھیم	۳	۰	۰
بنی اسرائیل	۳	۰	۰
کہف	۲	۰	۰
مریم	۱	۰	۰
طٰہٰ	۱۴	طٰہٰ	۳
انبیاء	۱	انبیاء	۱
مومنون	۲	مومنون	۱
فرقان	۱	فرقان	۱
شعراء	۸	شعراء	۲
نمل	۲	۰	۰
قصص	۱۴	قصص	۱

سجدہ	۱	•	•
احزاب	۱	•	•
صٰفّٰت	۲	•	•
مؤمن	۴	•	•
زخرف	۱	•	•
ذاریات	۱	•	•
صف	۱	•	•
النازعات	۱	•	•
	ٹوٹل = ۱۰۷		ٹوٹل = ۱۴

نسب وولادت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچتا ہے ان کے والد کا نام عمران اور والدہ کا نام یوکابد تھا باپ کا سلسلہ نسب یہ ہے:

عمران بن قامت بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حقیقی اور بڑے بھائی تھے۔

عمران کے گھر میں موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ایسے زمانہ میں ہوئی جبکہ فرعون اسرائیلی لڑکوں کے قتل کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس لئے ان کی والدہ اور اہل خاندان ان کی ولادت کے وقت سخت پریشان تھے کہ کس طرح بچہ کو قاتلوں کی نگاہ سے محفوظ رکھیں؟ بہر حال جوں توں کر کے تین مہینہ تک ان کو ہر ایک کی نگاہ سے اوجھل رکھا اور ان کی پیدائش کی مطلق کسی کو خبر نہ ہونے دی، لیکن جاسوسوں کی دیکھ بھال اور حالات کی نزاکت کی وجہ سے زیادہ دیر تک اس واقعہ کے پوشیدہ رہنے کی توقع نہ ہو سکی اور اس لئے ان کی والدہ سخت پریشان رہنے لگیں، اس سخت اور نازک وقت آخر خدائے قدوس نے مدد کی اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں یہ القاء کیا کہ ایک تابوت کی طرح کا صندوق بناؤ جس پر رال اور روغن کی پالش کرو تاکہ پانی اندر اثر نہ کر سکے اور اس میں اس بچہ کو محفوظ رکھ دو اور پھر اس صندوق کو نیل کے بہاؤ پر چھوڑ دو۔ (خروج ۲ آیت ۲۰)

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ایسا ہی کیا اور ساتھ ہی اپنی بڑی لڑکی اور موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ کو مامور کیا کہ وہ اس صندوق کے بہاؤ کے ساتھ کنارے کنارے چل کر صندوق کو نگاہ میں رکھے اور دیکھے کہ خدا اس کی حفاظت کا وعدہ کس طرح پورا کرتا ہے کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو خدائے تعالیٰ نے یہ بشارت پہلے ہی دی تھی کہ ہم اس بچہ کو تیری ہی جانب واپس کر دیں گے اور یہ ہمارا پیغمبر اور رسول ہوگا۔

فرعون کے گھر میں تربیت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر برابر صندوق کے بہاؤ کیساتھ ساتھ کنارے کنارے نگہداشت کرتی جا رہی تھیں کہ انہوں نے دیکھا کہ صندوق تیرتے ہوئے شاہی محل کے کنارے آلگا اور فرعون کے گھرانے میں سے ایک عورت نے اپنے خادموں کے ذریعے اس کو اٹھوالیا اور شاہی محل میں لے گئی حضرت موسیٰ کی ہمشیر یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور حالات کی صحیح تفصیل معلوم کرنے کے لئے شاہی محل کی خادماؤں میں شامل ہو گئیں۔

قرآن عزیز نے اس شاہی خاندان کو فرعون کی بیوی بتایا ہے اور تورات کے حصہ مُخروج میں اس کو فرعون کی بیٹی کہا ہے مگر مؤرخین اس اختلاف کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ پانی میں بہتے ہوئے صندوق کو فرعون کی بیٹی نے اٹھایا ہو اور پھر بیٹا بنانے کی آرزو، اور فرعون سے اس بچہ کے قتل نہ کرنے اور خود پالنے کی خواہش کا اظہار اور فرعون سے سفارش فرعون کی بیوی (آسیہ) نے کی ہے۔

قرآن کریم کے اسلوب بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کیوں کہ اس نے موسیٰ کو دریا سے نکالنے والے کے متعلق کہا ہے فالتقطہ آل فرعون (اس کو اٹھایا فرعون کے گھر والوں نے) اور بیٹا بنانے کی آرزو اور اس کے قتل نہ کرنے کی سفارش کرنیوالے کے متعلق فرمایا وقالت امرء ۃ فرعون (اور فرعون کی بیوی نے کہا) حضرت ابن عباسؓ سے یہی منقول ہے۔ (روح المعانی جلد ۲۰، سورۃ قصص)

بہر حال فرعون کے گھروالوں نے جب صندوق کھولا تو دیکھا کہ ایک حسین اور تندرست بچہ آرام سے لیٹا ہوا انگوٹھا چوس رہا ہے فرعون کی بیٹی فوراً اس کو محل میں لے گئی۔ فرعون کی بیوی نے بچہ کو دیکھا تو باغ باغ ہو گئی اور انتہائی محبت سے اس کو پیار کیا محل کے شاگرد پیشہ میں سے کسی نے کہا کہ یہ تو اسرائیلی معلوم ہوتا ہے اور ہمارے دشمنوں کے خاندان کا بچہ ہے اس کا قتل کر دینا ضروری ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی ہمارے خواب کی تعبیر ثابت ہو؟ اس بات کو سن کر فرعون کو بھی خیال پیدا ہوا فرعون کی بیوی نے شوہر کے تیور دیکھے تو کہنے لگی کہ ایسے پیارے بچہ کو قتل نہ کرو کیا عجب کہ یہ میرے اور تیرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنے، یا ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنالیں اور ہمارے لئے اس کا وجود نفع بخش ثابت ہو یعنی اگر یہ وہی اسرائیلی بچہ ثابت ہو جو تیرے خواب کی تعبیر بننے والا ہے تو ہماری محبت آغوش تربیت شاید اس کو مضر ہونے کے بجائے مفید ثابت کر دے، مگر فرعون اور اس کے خاندان کو یہی کیا معلوم کہ خدا کی تقدیر ان پر ہنس رہی ہے کہ رب العالمین کی کرشمہ سازی دیکھو کہ تم اپنی نادانی اور بے خبری میں اپنے دشمن کی پرورش پر نگراں مقرر کئے گئے ہو۔

غرض اب یہ سوال پیدا ہوا کہ بچہ کے لئے دودھ پلائی مقرر کی جائے مگر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے کئے گئے وعدہ کو پورا کرنے کیلئے بچہ کی طبیعت میں یہ بات پیدا کر دی کہ وہ کسی عورت کے پستان کو منہ ہی نہیں لگاتا، شاہی دایہ تھک کر بیٹھ گئی مگر موسیٰ نے کسی ایک پستان سے بھی دودھ نہ پیا یہ سارا حال موسیٰ کی ہمشیرہ مریم دیکھ رہی تھیں کہنے لگیں اگر اجازت ہو تو ایک ایسی دایہ کا پتہ بتاؤں جو نہایت نیک اور اس خدمت کے لئے بہت موزوں ہے بلکہ حکم ہو تو میں خود اس کو ساتھ لے کر آؤں؟ فرعون کی بیوی نے دایہ کو لانے کا حکم دے دیا، اور

موسیٰ کی ہمشیر خوش خوش گھر کو روانہ ہوئیں کہ والدہ کو لے کر آئیں۔

شاہ عبدالقادر دہلوی موضح القرآن میں فرماتے ہیں:

"فرعون کی عورت تھی بنی اسرائیل میں کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چچا کی بیٹی اس لفظ سے وہ پہچان گئی کہ لڑکا ان کا ہے۔"[1]

یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا ادھر برا حال تھا ایک الہامی خیال سے بچہ کو سپرد دریا تو کر آئیں مگر ماں کی مامتا نے زور کیا اور بے چین ہو کر اس پر آمادہ ہو گئیں کہ اپنے اس راز کو افشاء کر دیں اسی اضطراب و بے چینی کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے فضل و کرم کی بارش کی اور ان کے قلب میں اطمینان و سکون نازل کیا اب لطیفہ غیبی کے انتظار میں چشم براہ تھیں کہ لڑکی نے آکر پوری داستان کہہ سنائی اور بتایا کہ جب موسیٰ نے کسی دایہ کا بھی دودھ نہ پیا تو میں نے کہا اسرائیلی قبیلہ میں ایک نہایت شریف اور نیک عورت ہے وہ اس بچہ کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کر سکتی ہے فرعون کی بیوی نے یہ سن کر مجھ کو حکم دیا کہ فوراً آپ کو لیکر آؤں یہ ہم پر خدا کا بڑا احسان اور فضل و کرم ہوا۔ اب تم چل کر اپنے بچہ کو سینے سے لگاؤ اور آنکھیں ٹھنڈی کرو اور اس کا شکر ادا کرو کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ○ فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا إِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِئِينَ ○ وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ لَا تَقْتُلُوهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○ وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَارِغًا إِن كَادَتْ لَتُبْدِي بِهِ لَوْلَا أَن رَّبَطْنَا عَلَىٰ قَلْبِهَا لِتَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ○ وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ فَبَصُرَتْ بِهِ عَن جُنُبٍ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِن قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ وَهُمْ لَهُ نَاصِحُونَ ○ فَرَدَدْنَاهُ إِلَىٰ أُمِّهِ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○ (قصص ع ١)

اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلاتی رہو پھر جب تجھ کو ڈر ہو اس کا تو ڈال دے اس کو دریا میں اور نہ خطرہ کر اور نہ غمگین ہو ہم پھر پہنچا دیں گے اس کو تیری طرف اور کریں گے اس کو رسولوں سے پھر اٹھا لیا

(١) مفسرین نے فرعون کی اس بیوی کا نام "آسیہ" بتایا ہے اور قرآن عزیز امرأۃ فرعون کو مومنہ قرار دیتا ہے، بایں ہمہ یہ قول کہ وہ اسرائیلی تھیں اور حضرت موسیٰ کی چچازاد بہن، ضعیف ہے، صحیح یہ ہے کہ وہ فرعون ہی کے خاندان سے تھیں۔ (روح المعانی جلد ٢٠ ص ١)

اس کو فرعون کے گھر والوں نے کہ ہو ان کا دشمن اور غم میں ڈالنے والا بے شک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر تھے چوکنے والے اور بولی فرعون کی عورت یہ تو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے لئے اور تیرے لئے اس کو مت مارو کچھ بعید نہیں جو ہمارے کام آئے یا ہم اس کو بنالیں بیٹا اور ان کو کچھ خبر نہ تھی اور صبح کو موسیٰ کی ماں کے دل میں قرار نہ رہا۔ قریب تھی کہ ظاہر کردے بیقراری کو اگر ہم نہ مضبوط کردیتے اس کے دل کو تاکہ رہے یقین کرنیوالوں میں اور کہہ دیا اس کی بہن کو پیچھے چلی جا پھر دیکھتی رہی اس کو اجنبی ہو کر اور ان کو خبر نہ ہوئی اور روک رکھا تھا ہم نے موسیٰ سے دائیوں کو پہلے سے پھر بولی میں بتاؤں تم کو ایک گھر والے کہ اس کو پال دیں تمہارے لئے اور وہ اس کا بھلا چاہنے والے ہیں، پھر ہم نے پہنچا دیا اس کو اس کی ماں کی طرف کہ ٹھنڈی رہے اس کی آنکھ اور غمگین نہ ہو اور جانے کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے پر بہت لوگ نہیں جانتے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ ۝ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ ۝ أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ ۚ وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي ۝ إِذْ تَمْشِي أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَن يَكْفُلُهُ ۖ فَرَجَعْنَاكَ إِلَىٰ أُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ (طٰہٰ ع۲)

اور تجھے معلوم ہے) ہم تجھ پر پہلے بھی ایک مرتبہ کیسا احسان کر چکے ہیں؟ ہم تجھے بتاتے ہیں اس وقت کیا ہوا تھا جب ہم نے تیری ماں کے دل میں بات ڈال دی تھی ہم نے اسے سمجھایا تھا کہ بچہ کو ایک صندوق میں ڈال دے اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے دریا اسے کنارے پر دھکیل دے گا پھر اسے وہ اٹھالے گا جو میرا (یعنی میری مسلم قوم کا) دشمن ہے نیز اس بچہ کا بھی دشمن اور اے موسیٰ! ہم نے اپنے فضل خاص سے تجھ پر محبت کا سایہ ڈال دیا تھا کہ اجنبی بھی تجھ سے محبت کرنے لگے اور یہ اس لئے تھا کہ ہم چاہتے تھے تو ہماری نگرانی میں پرورش پائے تیری بہن جب وہاں سے گذری تو (یہ ہماری ہی کارفرمائی تھی کہ) اس نے (فرعون کی لڑکی سے) کہا میں تمہیں ایسی عورت بتلا دوں جو اسے پالے پوسے؟ اور اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کی گود میں لوٹا دیا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور (بچہ کی جدائی سے) غمگین نہ ہو۔

تورات میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے موسیٰ علیہ السلام کا دودھ چھڑایا تو انہوں نے ان کو فرعون کی بیٹی کے سپرد کر دیا، اور اس کے بعد عرصہ تک وہ شاہی محل میں زیر تربیت رہے اور وہیں نشو ونما پائی مگر تورات کا یہ کہنا واقعہ کے بالکل خلاف ہے کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کی لڑکی کے بیٹے بنے۔ جب لڑکا بڑھا وہ اسے فرعون کی بیٹی پاس لائی اور وہ اس کا بیٹا ٹھہرا اور اس نے اس کا نام موسیٰ (عبرانی موشی) رکھا اور کہا اس سبب سے کہ میں نے اسے پانی سے نکالا۔ (خروج باب ۲ آیت ۱۰)

موسیٰ علیہ السلام کا مصر سے نکلنا

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک عرصہ تک شاہی تربیت میں بسر کرتے کرتے شباب کے دور میں داخل ہوئے تو نہایت قوی الجثہ اور بہادر جوان نکلے چہرہ سے رعب ٹپکتا اور گفتگو سے ایک خاص وقار اور شان عظمت ظاہر

ہوتی تھی، ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اسرائیلی ہیں اور مصری خاندان سے ان کا کوئی رشتہ قرابت نہیں ہے انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ بنی اسرائیل پر سخت مظالم ہو رہے ہیں اور وہ مصر میں نہایت ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں یہ دیکھ کر ان کا خون کھولنے لگتا اور موقعہ بہ موقعہ عبرانیوں کی حمایت و نصرت میں پیش پیش ہو جاتے۔

طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام جوان ہو گئے اور قوی ہیکل جوان ثابت ہوئے تو عبرانیوں کے معاملات میں ان کی نصرت و حمایت کا یہ اثر ہوا کہ مصری گماشتوں کے مظالم عبرانیوں پر کم ہونے لگے۔ (طبری جلد ص)

اور اس میں شک نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کی ذلت و غلامی پر غم و غصہ اور ان کی حمایت و نصرت کا عمیق اور بے پناہ جذبہ ایک فطری اور قدرتی جذبہ تھا۔

اب اللہ تعالیٰ کے عطاء نوال کا ہاتھ اور آگے بڑھا اور جسمانی طاقت و قوت کے ساتھ اس نے ان کو زیور علم و حکمت سے بھی نوازا اور سن رشد کو پہنچ کر ان کی قوت فیصلہ اور دقت علم و نظر بھی عروج تک پہنچ گئے اور اس طرح ان کو جسمانی و روحانی تربیت کا کمال حاصل ہو گیا،

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَى آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ○

اور جب (موسیٰ) پہنچا اپنے زور پر اور سنبھالا تو بخشا ہم نے اس کو (قوت) فیصلہ اور علم اور اس طرح ہم نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔

غرض موسیٰ علیہ السلام شہر میں گشت کرتے ہوئے اکثر ان حالات کا مشاہدہ کرتے رہتے اور گاہے گاہے بنی اسرائیل کی مدد کرتے۔

ایک مرتبہ شہری آبادی سے ایک کنارہ جا رہے تھے کہ دیکھا ایک مصری ایک اسرائیلی کو بیگار کیلئے گھسیٹ رہا ہے، اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو لگا فریاد کرنے اور مدد چاہنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصری کی اس جابرانہ حرکت پر سخت غصہ آیا اور اس کو باز رکھنے کی کوشش کی، مگر مصری نہ مانا موسیٰ علیہ السلام نے غصہ میں آکر ایک طمانچہ رسید کر دیا مصری اس ضرب کو برداشت نہ کر سکا اور اسی وقت مر گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو بہت افسوس کیا کیوں کہ ان کا ارادہ ہرگز اسکے قتل کا نہ تھا اور ندامت و شرمندگی کے ساتھ دل میں کہنے لگے کہ بلاشبہ یہ کار شیطان ہے وہی انسان کو ایسی غلط راہ پر لگاتا ہے اور خدائے تعالیٰ کی درگاہ میں عرض کرنے لگے کہ یہ جو کچھ ہوا نادانستگی میں ہوا، میں تجھ سے مغفرت کا خواستگار ہوں خدا نے بھی ان کی غلطی کو معاف کر دیا اور مغفرت کی بشارت سے نوازا۔ ادھر شہر میں مصری کے قتل کی خبر شائع ہو گئی مگر قاتل کا کچھ پتہ نہ چلا، آخر مصریوں نے فرعون کے پاس استغاثہ کیا کہ یہ کام کسی اسرائیلی کا ہے لہٰذا آپ دادرسی فرمایئے فرعون نے کہا کہ اس طرح ساری قوم سے تو بدلہ نہیں لیا جا سکتا تم قاتل کا پتہ لگاؤ میں ضرور اس کو کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔

سوء اتفاق کہئے یا حسن اتفاق کہ دوسرے دن بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر کے آخری کنارے پر سیر

فرما رہے تھے کہ دیکھا وہی اسرائیلی ایک قبطی سے جھگڑ رہا ہے اور قبطی غالب ہے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر کل کی طرح آج بھی اس نے فریاد کی اور دادرسی کا خواستگار ہوا۔

اس واقعہ کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوہری ناگواری محسوس کی ایک جانب قبطی کا ظلم تھا اور دوسری جانب اسرائیلی کا شور و غوغا اور گذشتہ واقعہ کی یاد تھی، اسی جھنجھلاہٹ میں ایک طرف انہوں نے مصری کو باز رکھنے کیلئے ہاتھ بڑھایا اور ساتھ ہی اسرائیلی کو بھی جھڑکتے ہوئے فرمایا اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ تو بھی بلاشبہ کھلا ہوا گمراہ ہے یعنی خواہ مخواہ جھگڑا مول لے کر داد فریاد کرتا رہتا ہے۔

اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہاتھ بڑھاتے اور پھر اپنے متعلق ناگوار اور تلخ الفاظ کہتے سنا تو یہ سمجھا کہ یہ مجھ کو مارنے کیلئے ہاتھ بڑھا رہے ہیں اور مجھ کو گرفت میں لینا چاہتے ہیں اسلئے شرارت آمیز انداز سے کہنے لگا:

أَتُرِيْدُ أَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْأَمْسِ

جس طرح تو نے کل ایک جان (قبطی) کو ہلاک کر دیا تھا اسی طرح آج مجھ کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔

مصری نے جب یہ سنا تو اسی وقت فرعونیوں سے جا کر ساری داستان کہہ سنائی انہوں نے فرعون کو اطلاع دی کہ مصری کا قاتل موسیٰ ہے فرعون نے یہ سنا تو جلاد کو حکم دیا کہ موسیٰ کو گرفتار کر کے حاضر کرے مصریوں کے اس مجمع میں ایک معزز مصری وہ بھی تھا جو دل و جان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محبت رکھتا اور اسرائیلی مذہب کو حق جانتا تھا یہ فرعون ہی کے خاندان کا فرد تھا اور دربار کا حاضر باش، اس نے فرعون کا یہ حکم سنا تو فرعونی جلادوں سے پہلے ہی دربار سے نکل کر دوڑتا ہوا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے سارا قصہ بیان کیا اور ان کو مشورہ دیا کہ اس وقت مصلحت یہی ہے کہ خود کو مصریوں سے نجات دلایئے اور کسی ایسے مقام میں ہجرت کر جایئے جہاں ان کی دسترس نہ ہو سکے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے مشورہ کو قبول فرمالیا اور ارض مدین کی جانب خاموشی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

اس مقام پر یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن عزیز نے اس شخص کے متعلق صرف اس قدر کہا ہے:

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَى الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى

اور شہر کے آخری کنارہ سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔

مگر ہم نے اس کے اوصاف میں "شریف" اور "معزز" کا اضافہ کر دیا تو بقول نجار اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس آنے والے شخص کے متعلق دو صفات بیان کی ہیں۔

۱ وہ شہر کے آخری کنارے سے آیا تھا اور عرب میں مثل مشہور ہے کہ الاطراف سکنی الاشراف (شہر کے کنارے شرفاء کے رہنے کی جگہ ہیں)۔

۲ اس نے آکر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ (بھری جماعت تیرے قتل کا مشورہ کر رہی ہے) اور یہ ظاہر ہے کہ یہ علم اسی شخص کو ہو سکتا ہے جو فرعون اور اسکے ارکان کے درمیان نمایاں حیثیت رکھتا ہو۔ (قصص الانبیاء ص ۱۹۷)

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ إِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ○ قَالَ رَبِّ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ إِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ قَالَ رَبِّ بِمَآ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ○ فَأَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَائِفًا يَّتَرَقَّبُ فَإِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْأَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ○ فَلَمَّآ أَنْ أَرَادَ أَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا قَالَ يَامُوْسٰى أَتُرِيْدُ أَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْأَمْسِ إِنْ تُرِيْدُ إِلَّآ أَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْأَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ أَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ○ وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَى الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يَامُوْسٰى إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ إِنِّيْ لَكَ مِنَ النَّاصِحِيْنَ ○ فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَّتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ ○

اور آیا شہر کے اندر جس وقت بے خبر ہوئے تھے وہاں کے لوگ پھر پائے اس میں دو مرد لڑتے ہوئے یہ ایک اس کے رفیقوں میں اور یہ دوسرا اس کے دشمنوں میں۔ پھر فریاد کی اس سے اس نے جو تھا اس کے رفیقوں میں اس کے مقابلہ میں جو تھا اس کے دشمنوں میں پھر پکارا اس کو موسیٰ (علیہ السلام) نے پھر اس کو تمام کر دیا بولا یہ ہوا شیطان کے کام سے بے شک وہ دشمن ہے بہکانے والا صریح موسیٰ (علیہ السلام) بولا! اے میرے رب میں نے برا کیا اپنا سو بخش مجھ کو پھر اس کو بخش دیا بے شک وہی ہے بخشنے والا مہربان بولا اے رب جیسا تو نے فضل کر دیا مجھ پر پھر میں کبھی نہ ہوں گا مددگار گناہگاروں کا پھر صبح کو اٹھا اس شہر میں ڈرتا ہوا انتظار کرتا ہوا پھر ناگہاں دیکھا جس نے کل مدد مانگی تھی۔ وہ آج پھر فریاد کرتا ہے اس سے کہا موسیٰ نے بے شک بے راہ ہے صریح پھر جب چاہا کہ ہاتھ ڈالے اس پر جو دشمن تھا ان دونوں کا بول اٹھا فریاد کرنے والا اے موسیٰ کیا تو چاہتا ہے کہ خون کرے میرا جیسے خون کر چکا ہے کل ایک جان کا تیرا یہی جی چاہتا ہے کہ زبردستی کرتا پھرے ملک میں اور نہیں چاہتا کہ ہو صلح کرا دینے والا، اور آیا شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا کہا اے موسیٰ (علیہ السلام)! دربار والے مشورہ کرتے ہیں تیرے متعلق کہ تجھ کو مار ڈالیں سو نکل جا میں تیرا بھلا چاہنے والا ہوں پھر نکلا وہاں سے ڈرتا ہوا راہ دیکھتا بولا! اے رب بچا لے مجھ کو اس قوم بے انصاف سے۔ (قصص، ع ۲)

وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَاكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنَّاكَ فُتُوْنًا

اور تو نے ایک شخص کو مار ڈالا پھر ہم نے تجھ کو غم سے نجات دی اور جانچا تجھ کو معمولی جانچنا۔

اس مقام پر قرآن عظیم اور تورات کے بیانات میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے:

۱ قرآن حکیم نے دوسرے دن کے جھگڑا کرنے والوں میں سے ایک کو عبرانی بتایا ہے، اور دوسرے کو مصری (فرعونی) اور تورات دونوں کا عبرانی ہونا ظاہر کرتی ہے۔
۲ تورات میں اس شخص کا کوئی ذکر نہیں ہے جس نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعونیوں کے مشورہ کی اطلاع دی تھی۔

مگران دونوں باتوں کے متعلق (بلالحاظ جانبداری) عقل اور فطرت اسی جانب رہنمائی کرتی ہے کہ قرآن عزیز کی تفصیلات صحیح ہیں اور اسی پر یقین رکھنا ضروری ہے اسلئے کہ فرعون اور فرعونیوں کے نزدیک تو اسرائیلیوں کی جان کی کوئی وقعت ہی نہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے شاہی خاندان میں رہنے والے شخص کے مقابلہ میں قصاص کے طالب ہوتے اور دوسری بات تورات کے بیان پر ایک فطری اضافہ ہے جو علم و یقین کے ساتھ کیا گیا۔

موسیٰ اور ارض مدین

حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعات میں "مدین" کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے حضرت موسیٰ نے جب مصر سے روانہ ہونے کا ارادہ کیا تو اسی جگہ کو منتخب فرمایا مدین کی آبادی مصر سے آٹھ منزل پر واقع تھی۔[۱] غالباً یہ انتخاب اسلئے کیا گیا کہ یہ قبیلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نزدیک کی قرابت رکھتا تھا اسلئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت اسحٰق بن ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور یہ قبیلہ اسحٰق کے بھائی مدین بن ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ فرعون کے خوف سے بھاگے تھے اسلئے ان کے ہمراہ نہ کوئی رفیق اور رہنما تھا اور نہ زادِ راہ اور تیز روی کی وجہ سے برہنہ پا تھے طبری بروایت سعید بن جبیرؓ لکھتے ہیں کہ اس تمام سفر میں موسیٰ کی خوراک درختوں کے پتوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھی اور برہنہ پا ہونے کی وجہ سے سفر کی طوالت نے پاؤں کے تلووں کی کھال تک اڑا دی تھی، اس پریشان حالی میں موسیٰ علیہ السلام ارض مدین میں داخل ہوئے۔
(تاریخ طبری جلد اول ص ۲۰۵)

ماءِ مدین

جب مدین کی سرزمین میں قدم رکھا تو دیکھا کہ کنوئیں کے سامنے پانی کے حوض (پیاؤ) پر بھیڑ لگی ہوئی ہے اور جانوروں کو پانی پلایا جا رہا ہے مگر اس جماعت سے ذرا فاصلہ پر دو لڑکیاں کھڑی ہیں اور اپنے جانوروں کو پانی پر جانے سے روک رہی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہاں بھی وہی سب ہو رہا ہے جو دنیا کی ظالم طاقتوں نے اختیار کر رکھا ہے اور خدائے برتر کے بہترین قانون کو توڑ کر قوموں کا سارا نظام ظلم کی بنیادوں پر قائم کر دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیاں کمزور اور ضعیف گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں تب ہی تو اس انتظار میں ہیں کہ قوی اور سرکش جب اپنے جانوروں کو سیراب کر چکیں اور ہر وارد و صادر پانی پر سے چلا جائے تو بچا کھچا پانی ان کے جانوروں کا

۱ طبری عن سعید بن جبیرؓ جلد ا ص ۲۰۵۔

حصہ ہے، ہر قوی نے ضعیف کیلئے یہی قانون تجویز کر دیا ہے کہ ہر فائدے میں وہ مقدم ہے اور ضعیف مؤخر اور قوی کا "اولش خور"

عرب کا مشہور شاعر عمرو بن کلثوم کہتا ہے:

وَ نَشْرَبُ اِنْ وَرَدْنَا الْمَاءَ صَفْواً
وَ يَشْرَبُ غَيْرُنَا كَدُرًا وَ طِيْنًا

اور ہم جب کسی پانی پر آتے ہیں تو عمدہ اور صاف پانی ہمارے حصہ میں آتا ہے اور ہمارے غیروں کے (جو ہم سے کمزور ہیں) حصہ میں گدلا پانی اور مٹی ہے۔

درحقیقت یہ شعر تنہا عمرو بن کلثوم اور اس کے قبیلے کی حالت کا نقشہ نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کے ظالمانہ نظام کا ٹھیک ٹھیک آئینہ دار ہے۔

بہر حال حضرت موسیٰ سے یہ حالت نہ دیکھی گئی اور آگے بڑھ کر لڑکیوں سے دریافت کیا "تم کیوں پانی نہیں پلاتیں، پیچھے کس لئے کھڑی ہو؟ دونوں نے جواب دیا "ہم مجبور ہیں اگر جانوروں کو آگے لے کر بڑھتے ہیں تو یہ طاقتور زبردستی ہم کو پیچھے ہٹا دیتے ہیں، اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں ان میں اب یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ ان کی مزاحمت کو دور کر سکیں پس جب یہ سب پانی پلا کر واپس ہو جائیں گے تب بچا ہوا پانی ہم پلا کر لوٹیں گے، یہی ہمارا روز کا دستور ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوش آ گیا اور آگے بڑھ کر تمام بھیڑ کو چیرتے ہوئے کنوئیں پر جا پہنچے اور کنوئیں کا بڑا ڈول اٹھایا اور تنہا کھینچ کر لڑکیوں کے مویشیوں کو پانی پلا دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مجمع کو چیرتے ہوئے درّانہ گھسنے لگے تو اگرچہ لوگوں کو ناگوار گذرا مگر ان کی پر جلال صورت اور جسمانی طاقت سے مرعوب ہو گئے اور ڈول کو تنہا کھینچتے دیکھ کر اسی قوت سے ہار مان گئے جس کے بل بوتے پر کمزوروں اور ناتوانوں کے پیچھے ہٹا دیا کرتے اور ان کی حاجات کو پامال کرتے رہتے تھے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ موسیٰ نے دیکھا کہ کنوئیں کے منہ پر بہت بڑا پتھر ڈھکا ہوا ہے جو ایک جماعت کے متفقہ زور لگانے سے اپنی جگہ سے ہٹتا ہے مگر وہ آگے بڑھے اور تنہا اس کو ہٹا کر لڑکیوں کے مویشیوں کیلئے پانی بھر دیا عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ یہ قول قرآن حکیم کی تصریح کے خلاف ہے، قرآن کہتا ہے:

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ

اور جب وہ مدین کے پانی پر پہنچے تو اس پر ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ پانی پلا رہی ہے۔

تو پھر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ کنوئیں کا منہ پتھر سے ڈھکا ہوا ہو اور جس طرح یہ قول صحیح نہیں ہے اسی طرح یہ تاویل بھی درست نہیں ہے کہ اس مقام پر دو کنوئیں تھے ایک سے مدین کے لوگ پانی پلا رہے تھے اور دوسرے کے منہ پتھر سے ڈھکا ہوا تھا اور یہ کہ اس زمانہ میں بھی اس مقام پر دو کنوئیں موجود پائے گئے ہیں۔

اس تاویل کے درست نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اول تو قرآن حکیم نے دوسرے کنوئیں کا قطعی کوئی ذکر نہیں کیا اور جو کچھ بیان کیا ہے ایک ہی سے متعلق بیان کیا ہے دوسرے بعد میں اس جگہ دو کنوئیں ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس وقت بھی وہاں اسی طرح دو کنوئیں موجود تھے ہو سکتا ہے کہ عرصۂ دراز کے بعد ایک اسلامی عہد میں ضرورت کے لحاظ سے یہاں دوسرا کنواں تیار کی گیا ہو، پس قرآن حکیم کے صاف اور سادہ بیان کو محض ایک غیر مستند روایت کی خاطر پیچیدہ بنانا قطعی بے محل اور غیر مناسب ہے۔

غرض جب ان لڑکیوں کے گلے نے پانی پی لیا تو وہ گھر کو واپس چلیں۔ گھر پہنچیں تو خلاف عادت جلد واپسی پر ان کے والد کو سخت تعجب ہوا دریافت کرنے پر لڑکیوں نے گذرا ہوا ماجرا کہہ سنایا کہ کس طرح ایک "مصری" نے ان کی مدد کی باپ نے کہا عجلت سے جاؤ اور اس کو میرے پاس لیکر آؤ۔

یہاں تو باپ بیٹی کے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی اور ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام پانی پلانے کے بعد قریب ہی ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر ستانے لگے، مسافرت و غربت اور پھر بھوک پیاس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعاء کی "پروردگار! اس وقت جو بھی بہتر سامان میرے لئے تو اپنی قدرت سے نازل کرے میں اس کا محتاج ہوں۔"

لڑکی تیزی سے وہاں پہنچی تو دیکھا کہ کنوئیں کے قریب ہی وہ بیٹھے ہوئے ہیں شرم و حیاء کے ساتھ نیچی نظریں کئے لڑکی نے کہا "آپ ہمارے گھر چلئے والد بلاتے ہیں وہ آپ کے اس احسان کا بدلہ دیں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوچا کہ شاید اس سلسلہ میں کوئی بہتر صورت نکل آئے اسلئے چلنا ہی بہتر ہے اور اس کی دعوت کو رد کرنا مناسب نہیں خدا نے میری دعاء سن لی اور یہ اسی کا پیش خیمہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اٹھ کھڑے ہوئے اور لڑکی کو ہدایت کی کہ وہ آگے نہ چلے بلکہ میرے پیچھے پیچھے چلے اور ٹھکری یا اشارے کے ساتھ راہ کی رہنمائی کرے۔"

موسیٰ علیہ السلام چل تو پڑے لیکن طبعی اور فطری غیرت اور عزت نفس کے پیش نظر بار بار اس جملہ سے متاثر ہو رہے تھے "میرا باپ تم کو اس محنت کا عوض دینا چاہتا ہے" مگر مسافرت اور حالات کی نزاکت نے آخر یہی مشورہ دیا کہ اس وقت اس گرانی کو بھی انگیز کر لو تاکہ اس غربت میں ایک غمخوار اور مونس و ہمدم کی مستقل ہمدردی کو حاصل کیا جا سکے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام چلتے چلتے منزل مقصود پر پہنچے اور اس بزرگ صورت و سیرت انسان کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف ملاقات سے بہرہ اندوز ہوئے بزرگ نے پہلے کھانا کھلایا اور پھر اطمینان کے ساتھ بٹھا کر ان کے حالات سنے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے من و عن اپنی ولادت اور فرعون کے بنی اسرائیل پر مظالم سے شروع کر کے آخر تک ساری داستان کہہ سنائی سب کچھ سننے کے بعد بزرگ نے موسیٰ کو تسلی دی اور فرمایا کہ خدا کا شکر کرو کہ اب تم کو ظالموں کے پنجہ سے نجات مل گئی اب کوئی خوف کا مقام نہیں ہے۔

یہاں قوم ظالمین کے ظلم سے بنی اسرائیل کے بچوں کا قتل اور ان کی غلامی و تباہ حالی کے واقعات ہی مراد ہو سکتے ہیں نیز ان کا کفر اور فساد فی الارض، ورنہ تو قبطی کے قتل میں تو خود موسیٰ علیہ السلام بھی اپنے فعل پر نادم تھے اور

نہیں قصور وار سمجھتے تھے۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ○ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدَانِ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ○ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ○ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ قَالَ لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○

اور جب منہ کیا مدین کی سیدھ پر بولا امید ہے کہ میرا رب لیجائے مجھ کو سیدھی راہ پر اور جب پہنچا مدین کے پانی پر پایا وہاں ایک جماعت کو لوگوں کی پانی پلاتے ہوئے اور پایا ان سے ورے دو عورتوں کو روکے ہوئے کھڑی تھیں اپنی بکریاں بولا تمہارا کیا حال ہے بولیں ہم نہیں پلاتیں پانی چرواہوں کے پھیر لیجانے تک اور ہمارا باپ بوڑھا ہے بڑی عمر کا پھر اس نے پانی پلا دیا اس کے جانوروں کو پھر ہٹ کر آیا چھاؤں کی طرف بولا اے رب تو جو چیز اتارے میری طرف اچھی میں اس کا محتاج ہوں پھر آئی اس کے پاس ان دونوں میں سے ایک چلتی تھی شرم سے بولی میرا باپ تجھ کو بلاتا ہے کہ بدلے میں دے حق اس کا کہ تو نے پانی پلا دیا ہمارے جانوروں کو پھر جب پہنچا اس کے پاس اور بیان کیا اس سے احوال کہا مت ڈر بچ آیا تو اس قوم بے انصاف سے۔ (قصص ع ۳)

تورات میں اس واقعہ پر بھی دو جگہ اختلاف موجود ہے:

وہ لڑکیوں کی تعداد دو کی جگہ سات بتاتی ہے۔

اس کا بیان ہے کہ لڑکیوں نے حوض کو پانی سے بھر لیا تھا مگر دوسرے لوگوں نے زبردستی ان کو ہٹا کر اپنے جانوروں کو پانی پلانا شروع کر دیا یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ کو غصہ آیا۔

ہم کو اس موقعہ پر بھی قرآن عزیز کے بیان پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے اول اس لئے کہ سابق اختلافات میں قرآن عزیز کے بیانات کی روش عقل اور فطرت کے مطابق رہی ہے دوسرے اس لئے کہ اس جگہ بھی تعداد کے معاملہ سے قطع نظر توراۃ کی دوسری بات اس لئے صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ لڑکیاں مدین ہی کے قبیلہ اور ان ہی کی بستی کی ساکن تھیں اور پانی کا معاملہ روزانہ ہی ان کے ساتھ پیش آتا رہتا تھا، لہٰذا ان کو یہ معلوم تھا کہ یہ قوی گروہ کسی حالت میں بھی ہم کو پیش قدمی نہیں کرنے دے گا، اور عرب کے شعراء کے کلام سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پانی کے معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ ان کے یہاں قوی کو ضعیف پر ترجیح حاصل تھی اور عرب کے ماسواء دنیا کے ہر گوشہ میں یہی حال تھا، تو وہ کیسے اس اقدام کی جرأت کر سکتی تھیں۔ صحیح بات یہی ہے کہ وہ ضعیف گھرانے کی فرد ہونے اور پھر عورت ہونے کی وجہ سے اسی پر اکتفا کرتی تھیں۔ کہ جب سب پانی پلا

کر واپس ہو جائیں تو بچے ہوئے پانی سے یہ فائدہ اٹھالیں اور بس۔

رہا لڑکیوں کی تعداد کا معاملہ سو ابن کثیر (رحمۃ اللہ) نے ہر دو اقوال کی مطابقت کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ مدین کے اس بزرگ کے سات لڑکیاں ہوں جیسا کہ تورات میں مذکور ہے مگر مدین کے پانی پر جو واقعہ پیش آیا اس میں صرف دو لڑکیاں ہی موجود تھیں جیسا کہ قرآن حکیم کی تصریح سے ظاہر ہوتا ہے۔

شیخ سے رشتۂ مصاہرت

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قبیلۂ مدین کے بزرگ میزبان کے درمیان یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اس لڑکی نے جو موسیٰ علیہ السلام کو بلانے گئی تھی اپنے باپ سے کہا اے باپ! آپ اس مہمان کو اپنے مویشیوں کے چرانے اور پانی مہیا کرنے کیلئے اجیر رکھ لیجئے اجیر وہی بہتر ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی۔"

مفسرین کہتے ہیں کہ باپ کو لڑکی کی یہ گفتگو عجیب سی معلوم ہوئی اور اس نے دریافت کیا، "تجھ" کو اس مہمان کی قوت وامانت کا حال کیا معلوم؟" لڑکی نے جواب دیا "میں نے مہمان کی قوت کا اندازہ تو اس سے کیا کہ کنوئیں کا بڑا ڈول (چرس) اس نے تنہا بھر کر کھینچ لیا اور امانت کی آزمائش اس طرح کی کہ جب میں اس کو بلانے گئی تو اس نے مجھے دیکھ کر نیچی نظریں کر لیں، اور گفتگو کے دوران میں ایک مرتبہ بھی میری طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا اور جب یہاں آنے لگا تو مجھ کو پیچھے چلنے کو کہا اور خود آگے آگے چلا اور صرف اشاروں ہی میں اس کی رہنمائی کرتی رہی۔ (تفسیر ابن جریر سورۂ قصص)

بزرگ باپ نے بیٹی کی ان باتوں کو سنا تو بہت مسرور ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اگر تم آٹھ سال تک میرے پاس رہو اور میری بکریاں چراؤ تو میں اس بیٹی کی تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں اور اگر تم اس مدت کو دو سال بڑھا کر دس سال کر دو تو اور بھی بہتر ہے یہی اس لڑکی کا مہر ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شرط کو منظور کر لیا اور فرمایا کہ یہ میری خوشی پر چھوڑ یئے کہ میں ان دونوں مدتوں میں سے جس کو چاہوں پورا کر دوں، آپ کی جانب سے مجھ پر اس بارہ میں کوئی جبر نہ ہوگا۔ طرفین کی اس باہمی رضا مندی کے بعد بزرگ میزبان نے اس بیان کردہ مدت کو مہر قرار دے کر موسیٰ علیہ السلام سے اپنی اس بیٹی کی شادی کر دی۔

اور بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مدت ختم ہونے پر "عقد" عمل میں آیا اور عقد کے فوابعد ہی موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کو لے کر روانہ ہو گئے مفسرین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیوی کا نام "صفورہ" بتایا ہے۔

قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَٰأَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِيْنُ ○ قَالَ إِنِّيٓ أُرِيْدُ أَنْ أُنكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ عَلَىٰٓ أَنْ تَأْجُرَنِي ثَمَانِيَ حِجَجٍ فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ وَمَآ أُرِيْدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِيٓ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّالِحِيْنَ ○ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ

عَلٰي ۙ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ○

بولی ان دونوں میں سے ایک اے باپ اس کو نوکر رکھ لے، البتہ بہتر نوکر جس کو تو نوکر رکھنا چاہے وہ ہے جو زور آور ہو امانت دار، کہا میں چاہتا ہوں کہ بیاہ دوں تجھ کو ایک بیٹی اپنی ان دونوں میں سے اس شرط پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ برس پھر اگر تو پورے کر دے دس برس تو وہ تیری طرف سے ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر تکلیف ڈالوں تو پائے گا مجھ کو اگر اللہ نے چاہا نیک بختوں سے بولا یہ وعدہ ہو چکا میرے اور تیرے بیچ جو سی مدت ان دونوں میں پوری کر دوں سو زیادتی نہ ہو مجھ پر اور اللہ پر بھروسہ ہے اس چیز کا جو ہم کہتے ہیں۔

فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ○ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ○

پھر تو نے مدین میں چند سال قیام کیا پھر تو اے موسیٰ مقررہ اندازہ پر پورا اتر آیا اور میں نے تجھ کو اپنے لئے (اپنے خاص کام کیلئے) بنایا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے خسر کون ہیں؟

قرآن عزیز نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور مدین کے شیخ کے متعلق جو واقعات بیان کئے ہیں ان میں کسی ایک جگہ بھی اس شیخ کا نام نہیں بتایا اس لئے تاریخی حیثیت سے شیخ مدین کے نام میں مؤرخین و مفسرین کے مختلف اقوال پائے جاتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:-

۱ مفسرین اصحاب سیر اور ادباء عرب کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال ہے کہ یہ حضرت شعیب علیہ السلام ہیں یہ قول بہت مشہور اور شائع ذائع ہے۔

مشہور مفسر امام ابن جریر طبریؒ نے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے لوگ کہتے ہیں کہ صاحب موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام ہیں۔ (تفسیر سورۂ قصص)

اور حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ حسن بصریؒ اسی طرف مائل ہیں کہ مدین کے شیخ حضرت شعیب علیہ السلام ہیں اور فرماتے ہیں کہ ابن ابی حاتم نے سلسلۂ سند کے ساتھ مالک بن انسؒ سے روایت نقل کی ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ صاحب موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۸۴)

۲ ایک جماعت کہتی ہے کہ شیخ کا نام یثرون تھا اور یہ حضرت شعیب علیہ السلام کے بھتیجے تھے طبری نے سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے کہ ابو عبیدہ فرماتے تھے کہ جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اجیر بنایا وہ شعیب علیہ السلام کا برادر زادہ یثرون تھا"۔ (ابن جریر جلد ا ص ۳۰۶)

۳ بعض کہتے ہیں کہ صاحب موسیٰ علیہ السلام کا نام "یثری" تھا طبری نے سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اجیر رکھنے والا مدین کا شیخ "یثری" نامی تھا اور اسی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں "عورت کے والد کا نام "یثری" تھا مگر یثری والی روایت میں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ

حضرت شعیب علیہ السلام کا برادر زادہ تھا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۴۸)

اور توراۃ نے اسی سے ملتا جلتا نام "یثرو" بتایا ہے۔[1]

۴۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ "شیخ" حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا ایک "مرد مومن" تھا۔

۵۔ ایک جماعت کا گمان ہے کہ یہ "شیخ" نہ شعیب علیہ السلام ہو سکتے ہیں اور نہ ان کے بھتیجے اس لئے کہ قرآن عزیز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے کا زمانہ ہے جس کے درمیان صدیاں ہیں قرآن حکیم کہتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ○

اور قوم لوط (کا معاملہ) تم سے کچھ دور نہیں ہے

یہ ظاہر ہے کہ قوم لوط کی ہلاکت کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ہے اور ان کے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کی درمیانی مدت چار سو سال سے بھی زیادہ ہے اور جن لوگوں نے اس مدت کو قریب کر دینے کیلئے یہ کہا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی عمر غیر معمولی طور طویل ہوئی تو یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۴۸)

اس قول کی تائید کیلئے یہ دلیل بھی قوت رکھتی ہے کہ اگر "صاحب موسیٰ" شعیب علیہ السلام ہوتے تو قرآن عزیز ضرور ان کے نام کی تصریح کرتا اور اس طرح مجمل و مبہم نہ چھوڑتا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۴۸)

ان مختلف پانچ اقوال کی نقل کے بعد ہمارے نزدیک راجح اور صحیح مسلک وہی معلوم ہوتا ہے جو ابن جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر محدثین و مفسرین نے اختیار کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ نام کی تصریح کے بارہ میں کوئی روایت صحت کو نہیں پہنچتی اور جو روایات نقل کی گئی ہیں۔ وہ قابل احتجاج نہیں ہیں اس لئے جس طرح تصریح کئے بغیر قرآن عزیز نے انکا ذکر کیا ہے اسی طرح ہم بھی ان کے نام کی تصریح کو خدا کے علم کے حوالہ کر دیں ابن کثیر کی عبارت یہ ہے:

قال ابو جعفر (الطبری) وهذا مما لا يدرك علمهٗ الا بخبر ولا خبر بذالك تجب حجة فلا قول فی ذلك اولى با الصواب مما قاله الله جل ثناءهٗ الخ۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۴۸)

ابو جعفر طبری نے کہا ہے کہ نام کی تصریح کا یہ معاملہ خبر اور اطلاع کے بغیر طے نہیں ہو سکتا اور اس سلسلہ میں کوئی خبر (روایت) ایسی موجود نہیں ہے جو حجت اور دلیل بن سکے پس سب سے بہتر قول اس سلسلہ میں وہی ہے جو قرآن میں اللہ جل شانہ نے اختیار فرمایا (یعنی سکوت)

---

[1] ان حوالہ جات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سید سلیمان صاحب کا یہ فرمانا صحیح نہیں کہ "مسلمان مفسرین بھی علی العموم یثرو، حوباب اور شعیب کو ایک ہی سمجھتے ہیں"۔

ابن جریر کا اشارہ قرآن عزیز کے اس جملہ کی جانب ہے وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ عبدالوہاب نجار فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک بڑے فاضل عالم نے یہ بحث کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر نبی تھے اس لئے ان کو کوئی معمولی شخص اپنا اجیر رکھنے کا حوصلہ نہیں کر سکتا اور نہ وہ اس کو منظور فرماتے بلکہ ان کا مستاجر نبی اور پیغمبر ہی ہو سکتا ہے اس لئے مدین کے "شیخ کبیر" حضرت شعیب علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ آپ کا یہ ارشاد نہ عقلی حجت و برہان کی حیثیت رکھتا ہے اور نہ نقلی دلیل و حجت کی زیادہ سے زیادہ استحسان کے درجہ کا قیاس ہے اور اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا بلکہ یہ یقین اور قطعیت کو چاہتا ہے علاوہ ازیں اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی نہ تھے نبوت سے بعد کو فراز کئے گئے۔ (قصص الانبیاء ص ۲۰۴)

بہر حال یہ طے شدہ امر ہے کہ "شیخ کبیر" کے نام کی تصریح میں کوئی قابل حجت روایت موجود نہیں ہے اور ابن جریر اور ابن کثیر نے "وفاء مدت" کے سلسلہ میں بھی جس قدر روایات نقل کی ہیں ان میں بھی بزار اور ابن ابی حاتم کی طویل روایات کے علاوہ کسی میں بھی نام کا ذکر موجود نہیں ہے اور ان دونوں روایات کی اس "زیادت" کے بارہ میں ابن کثیر فرماتے ہیں:

مدار هذا الحديث على عبد الله بن لهيعة المصرى و فى حفظه سوءٌ واخشىٰ ان تكون رفعه خطاءً۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۷ ص ۲۵۷)

اس (نام کی تصریح والی) حدیث کا مدار ابن لہیعہ مصری پر ہے اور اس کا حافظہ خراب تھا اور مجھے خوف ہے کہ اس حدیث کو مرفوع کہنے میں غلطی ہوئی ہے۔

اور ابن جریر فرماتے ہیں:

ثم قدروى ايضا نحوه من حديث عتبة من المنذر بزيادةٍ غريبةٍ جداً۔

نیز اسی طرح عتبہ بن المنذر سے روایت کی گئی ہے (مگر) ایک یقینی نادر اور غیر معروف زیادت کیساتھ (وہ زیادت یہی نام کی صراحت ہے)۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۷)

ایفاء مدت

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے خسر کے یہاں مدت اجارہ پوری کرنے یعنی بکریاں چرانے کیلئے مقیم رہے مفسرین مستند روایات کے پیش نظر فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے کامل مدت یعنی دہ (۱۰) سالہ مدت کو پورا کیا۔

قرآن عزیز نے یہ نہیں بتایا کہ مدت پوری ہونے کے کس قدر بعد تک موسیٰ علیہ السلام نے "شیخ" کے پاس قیام کیا؟ البتہ مفسرین یہ کہتے ہیں کہ مدت ختم ہونے کے فوراً بعد ہی موسیٰ علیہ السلام مصر کو روانہ ہو گئے اور ان کے خسر نے روانگی کے سال میں بکریوں نے جس قدر بچے دیئے تھے ان کے حوالے کر دیئے اور وہ اپنی بیوی اور اس ریوڑ کو لے کر چل پڑے۔ (معالم جلد ۵ ص ۱۴۳)

شاید ان کا یہ قول اس آیت کے پیش نظر ہو:

فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ آنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ نَارًا (قصص ع ۴)

پس جب موسیٰ علیہ السلام نے مدت پوری کردی اور اپنے اہل کو لے کر چل دیا تو محسوس کیا طور کی جانب آگ کو۔

ان حضرات نے مدت کے ایفاء اور روانگی کے بیان میں جو قربت ہے اس سے یہ اندازہ کر لیا کہ وہ فوراً ہی روانہ ہو گئے حالانکہ جب تک خاص قرینہ موجود نہ ہو اس وقت تک "واؤ" نہ تعقیب پر دلالت کرتی ہے اور نہ ترتیب پر۔

اور معالم التنزیل میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وفاء مدت کے بعد دس سال مزید اپنے خسر کے ہاں مقیم رہے۔ (حاشیہ خازن جلد ۵ ص ۱۴۳)

تورات اسی قول کی تائید کرتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام مدت ختم ہونے پر فوراً ہی مصر روانہ نہیں ہو گئے تھے بلکہ بکریاں چراتے ہوئے بھولے بھٹکے جب "وادی مقدس" میں پہنچ کر خدا کا حکم ملا کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے رہا کراؤ اور مصر جا کر فرعون کے ظلم سے ان کو نجات دلاؤ تب وہ مصر روانہ ہوئے،

> اور موسیٰ اپنے سسر یثرو کے جو مدیان کا کاہن تھا گلے کی نگہبانی کرتا تھا تب اس نے گلے کو بیابان کی طرف ہانک دیا اور خدا کے پہاڑ حورب کے نزدیک آیا، اس وقت خدا کا فرشتہ ایک بوٹے میں سے آگ کے شعلہ میں اس پر ظاہر ہوا اس نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوٹا آگ کا روشن ہے اور وہ جل نہیں جاتا......... اب دیکھ بنی اسرائیل کی فریاد تجھ تک آئی اور میں نے وہ ظلم جو مصری ان پر کرتے ہیں دیکھا ہے پس اب تو جا میں تجھے فرعون پاس بھیجتا ہوں میرے لوگوں کو جو بنی اسرائیل ہیں مصر سے نکال۔
> (خروج باب ۳ آیت ۱-۱۰)
>
> تب موسیٰ روانہ ہوا اور اپنے سسر یثرو پاس گیا اور اسے کہا کہ میں تیری منت کرتا ہوں کہ مجھے رخصت دے کہ اپنے بھائیوں کے پاس جو مصر میں ہیں جاؤں۔ (خروج باب ۴ آیت ۱۸)

بہتر یہی ہے کہ حقیقت حال کو علم الٰہی کے ہی سپرد کر دیا جائے "واللہ اعلم بحقیقة الحال" تاہم قرآن حکیم کا اسلوب بیان یہ ضرور رہنمائی کرتا ہے کہ عام کتب تفسیر میں جو یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ روانگی جو "طٰہٰ" اور "قصص" میں مذکور ہے فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ مصر کیلئے تھی غالباً صحیح نہیں ہے اسلئے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام گھر کے ارادہ سے چلے تھے تو جب وادی مقدس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو کہا گیا کہ ظالم فرعون اور اس کی قوم کی طرف جاؤ اور ان کو سمجھاؤ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جواب میں یہ نہ فرماتے:

قَالَ رَبِّ إِنِّي قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَأَخَافُ أَنْ يَّقْتُلُوْنِ ○

موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے پروردگار میں نے ان (فرعونیوں) کے ایک آدمی کو مار ڈالا تھا پس مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھ کو نہ مار ڈالیں (اگر میں مصر گیا) (قصص)

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَّقْتُلُوْنِ ○

اور ان (مصریوں) کا میں نے ایک گناہ کیا ہے پس میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھ کو قتل کر دیں گے۔ (الشعراء)

یہ جواب خود بول رہا ہے کہ اس گفتگو کے وقت تک قتل والے معاملہ کی وجہ سے حضرت موسیٰ کو مصر جانے کا حوصلہ نہیں تھا البتہ جب خدائے تعالیٰ کی عطاء و بخشش نے ان کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا اور اس وقت مصر جانے کا حکم ملا تو موسیٰ اللہ تعالیٰ سے اپنا اطمینان کر کے یہیں سے مصر روانہ ہو گئے اور حکم الٰہی کے سامنے خسر کے پاس جا کر اجازت لینے کی بھی پرواہ نہ کی۔

بہر حال حضرت موسیٰ نے مدین میں ایک عرصہ قیام کیا اور اس پوری مدت میں اپنے خسر کے مویشیوں کی گلہ بانی کرتے رہے تورات میں مذکور ہے کہ اس قیام میں حضرت موسیٰ کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جیر سون رکھا مدیانی عبرانی میں اس کے معنی "غربت و مسافرت" کے ہیں۔ گویا حضرت موسیٰ نے بیٹے کے نام میں اپنی "مسافرت" کو بطور یادگار قائم رکھا تاکہ خاندان والوں کو یاد رہے کہ اس بچہ کی ولادت غربت و مسافرت میں ہوئی تھی تورات کی عبارت یہ ہے:

"اور اس نے اپنی بیٹی صفورہ موسیٰ کو دی وہ بیٹا جنی اس نے اس کا نام جیر سون رکھا کیونکہ اس نے کہا میں اجنبی ملک میں مسافر ہوں۔" (خروج باب ۲ آیت ۲۱-۲۲)

وادیٔ مقدس

ایک روز حضرت موسیٰ اپنے اہل و عیال سمیت بکریاں چراتے چراتے مدین سے بہت دور نکل گئے گلہ بان قبائل کیلئے یہ بات کوئی قابل تعجب نہ تھی مگر رات ٹھنڈی تھی اس لئے سردی آگ کی جستجو پر مجبور کر رہی تھی سامنے کوہ سینا کا سلسلہ نظر آرہا تھا یہ سینا کا مشرقی گوشہ تھا اور مدین سے ایک روز کے فاصلہ پر بحر قلزم کے دو شاخے کے درمیان مصر کو جاتے ہوئے واقع تھا حضرت موسیٰ نے چقماق استعمال کیا مگر سخت خنکی تھی اس نے کام نہ دیا۔ سامنے کی وادی (وادی ایمن) میں نگاہ دوڑائی تو ایک شعلہ چمکتا ہوا نظر پڑا بیوی سے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو میں آگ لے آؤں تاپنے کا بھی انتظام ہو جائے گا اور اگر وہاں کوئی رہبر مل گیا تو بھٹکی ہوئی راہ کا بھی کھوج لگ جائے گا۔

فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوٓا إِنِّيٓ آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيٓ آتِيكُم مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝

پھر موسیٰ نے اپنی بیوی سے کہا تم یہاں ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے شاید اس میں سے کوئی چنگاری تمہارے لئے لا سکوں یا وہاں الاؤ پر کسی رہبر کو پا سکوں۔ (طٰہٰ ع ۱)

بعثت

خدا کے فضل کا موسیٰ سے پوچھئے احوال — کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

حضرت موسیٰ نے دیکھا کہ عجیب آگ ہے درخت پر روشنی نظر آتی ہے مگر نہ درخت کو جلاتی ہے اور نہ گل ہی ہو جاتی ہے یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھے لیکن جوں جوں آگے بڑھتے جاتے تھے آگ دور ہوتی جاتی

تھی یہ دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام کو خوف سا پیدا ہوا اور انہوں نے ارادہ کیا کہ واپس ہو جائیں جوں ہی وہ پلٹنے لگے آگ قریب آ گئی اور قریب ہو گئی اور قریب ہوئے تو سنا کہ یہ آواز آ رہی ہے:

يَامُوسَىٰ إِنِّيْ أَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ○ (قصص)

اے موسیٰ علیہ السلام! میں ہوں میں اللہ پروردگار جہانوں کا

فَلَمَّا أَتَاهَا نُوْدِيَ يَامُوْسَىٰ ○ إِنِّيْ أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ○ وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحَىٰ ○ (طٰہٰ)

پس جب موسیٰ اس (آگ) کے قریب آئے تو پکارے گئے اے موسیٰ! میں ہوں تیرا پروردگار پس اپنی جوتی اتار دے تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے اور دیکھ! میں نے تجھ کو اپنی رسالت کیلئے چن لیا ہے پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سن۔ (طہ ع۱)

قرآن عزیز کی سابق آیت اور ان آیات کے پیش نظر دو باتیں کتب تفسیر میں زیر بحث لائی جاتی ہیں:

۱) موسیٰ علیہ السلام نے جس روشنی کو آگ سمجھا تھا وہ آگ نہ تھی بلکہ تجلی الٰہی کا نور تھا لیکن جو آواز اس پردہ نور سے سنی گئی وہ فرشتے کی آواز تھی اور اس کے واسطہ سے خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہم کلامی بخشا یا خود اللہ تعالیٰ کی ندا تھی؟ بعض مفسرین کہتے ہیں یہ فرشتے کی آواز تھی اور اس کے واسطہ سے موسیٰ علیہ السلام کو خدا کی ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا یہ خدا کی آواز نہ تھی اس لئے کہ

قول او را لحن نے آواز نے

اور ارباب تحقیق کی رائے یہ ہے کہ یہ براہ راست ندائے الٰہی تھی اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کو کسی واسطہ سے بھی نہیں سنا بلکہ اسی طرح سنا جس طرح پیغمبران خدا وحی الٰہی کو سنتے اور مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ (صفوۃ الکلام ابن تیمیہ ص ۲۷)

۲) وادی مقدس میں موسیٰ علیہ السلام کو جوتی اتارنے کا حکم دیا گیا حالانکہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام اور رضی اللہ عنہم مساجد میں جوتیوں سمیت نماز ادا کیا کرتے تھے اور آج امت کیلئے بھی یہی اسلامی مسئلہ ہے کہ اگر جوتیاں پاک ہوں تو ان سے بے تامل نماز پڑھنا درست ہے تو پھر اس جگہ موسیٰ علیہ السلام سے یہ کیوں کہا گیا کہ یہ وادی مقدس ہے لہٰذا جوتی اتار دو تو اس کا جواب صحیح حدیث میں موجود ہے اور رسول اکرم ﷺ نے خود اس کی وجہ بیان فرمائی ہے۔

كانتا من جلد حمار ميّتٍ۔ (تفسیر ابن کثیر مع فتح البیان ج۶ ص ۳۲۹)

(موسیٰ علیہ السلام) کی جوتیاں مردہ گدھے کی کھال سے بنائی گئی تھیں (یعنی غیر مدبوغ تھیں اس لئے طاہر نہ تھیں)

بہر حال اب حضرت موسیٰ علیہ السلام خدائے تعالیٰ کے پیغمبر اور جلیل القدر رسول ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو انبیاء کے سچے دین کی تلقین اور فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کی رہائی کی اہم خدمات کے لئے چن لیا ہے

اوہ اب وادی مقدس میں حق تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کر رہے ہیں، وہ موسیٰ جو مدین کی راہ سے بھٹکے ہوئے تھے آج مصر جیسے متمدن و مہذب ملک اور اس کے سرکش و مغرور بادشاہ کی رہنمائی کرنے کیلئے منتخب کئے گئے ہیں اور جو کل تک اونٹوں اور بکریوں کی گلہ بانی کر رہے تھے آج انسانوں کی قیادت کے فرض کو انجام دینے کیلئے چنے گئے اور جو نصاب زندگی کل بکریوں کے گلہ کی چرائی سے شروع ہوا تھا وہ آج وادی مقدس میں خدا کی بہترین مخلوق حضرت انسان کی گلہ بانی پر تکمیل کو پہنچ رہا ہے اور کل کا گلہ بان آج جہاں بان بن رہا ہے۔

خدائے تعالیٰ کے ید قدرت کی یہی کرشمہ سازیاں ہیں جو زبان سے انکار کرنے والوں کے دلوں میں بھی اقرار کا کانٹا چبھوئے رکھتی ہیں کجا خانہ بدوش چرواہا اور کجا متمدن حکومتوں کیلئے خدا کی صداقت کی پیغامبری!

حضرت موسیٰ نے جب اللہ کی اس آواز کو سنا اور ان کو یہ معلوم ہوا کہ آج ان کے نصیب میں وہ دولت آگئی ہے جو انسانی شرافت طغرائے امتیاز اور اللہ کی موہبت کا آخری نشان ہے تو پھولے نہ سمائے اور والہانہ فریفتگی میں مثل مورت حیران کھڑے رہ گئے، آخر پھر اسی جانب سے ابتدا ہوئی اور پوچھا:

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يَامُوْسٰى ۝

موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟

بس پھر کیا تھا محبوب حقیقی کا سوال عاشق صادق سے ع

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

وارفتگی عشق میں یہ بھی خیال نہ رہا کہ سوال کے پیمانہ ہی پر جواب کو تولا جائے اور جو کچھ پوچھا گیا ہے صرف اسی قدر جواب دیا جائے بولے:

هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ

یہ میری لاٹھی ہے: اس پر (بکریاں چراتے وقت) سہارا لیا کرتا ہوں اور اپنی بکریوں کیلئے پتے جھاڑ لیتا ہوں۔

جواب میں صرف یہ کہنا چاہیے تھا "عصا" مگر محبت کے اس ولولہ کو کیسے روکیں جو محبوب کے ساتھ ہمکلامی کے شرف کو طول دے کر سوختہ جانی کے سامان مہیا کرنا چاہتا ہے کہتے ہیں کہ یہ میری لاٹھی ہے اور اس کے فوائد بیان کرنے لگتے ہیں مگر یکایک جذبۂ شوق کی جگہ محبوب حقیقی کا پاس ادب دل میں چٹکی لیتا ہے موسیٰ! خبردار کس دربار میں کھڑے ہو کہیں یہ طول بیانی گستاخی اور بے ادبی میں نہ شمار ہو جائے موسیٰ نے یہ سوچ کر فوراً پہلو بدلا اور جناب باری میں عرض کی:

وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ أُخْرٰى ۝

اور میرے لئے اس سے متعلق اور ضروریات بھی ہیں۔

خدایا! دل کے ولولے اور روح کی بیتابیاں تو چاہتی ہیں کہ کہے جاؤں اور اس لطف بے پایاں کی لذت کو حاصل

کئے جاؤں لیکن پاس ادب مانع اور چشم حقیقت بین کا حکم ہے کہ خاموش ہو جاؤں اس لئے قصہ کو تاہ کرتا ہوں ورنہ داستان عشق تو بہت طویل ہے۔ ع

عشق کہتا ہے جنوں کا جوش رہنا چاہئے
ضبط کی تاکید ہے خاموش رہنا چاہئے
قصۂ موسیٰ سبق ہے ہوش والوں کیلئے
کس طرح عشاق کو خاموش رہنا چاہئے

آیات اللہ

اب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

أَلْقِهَا يَامُوْسٰى ۝

موسیٰ! اپنی اس لاٹھی کو زمین پر ڈال دو

اور موسیٰ علیہ السلام نے اس ارشاد عالی کی تعمیل کی:

فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝

موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی کو زمین پر ڈال دیا پس ناگاہ وہ اژدہا بن کر دوڑنے لگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ حیرت زا واقعہ دیکھا تو گھبرا گئے اور بشریت کے تقاضہ سے متاثر ہو کر بھاگنے لگے پیٹھ پھیر کر بھاگے ہی تھے کہ آواز آئی:

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْأُوْلٰى ۝

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا) موسیٰ! اس کو پکڑ لو اور خوف نہ کھاؤ ہم اس کو اس کی اصل حالت پر لوٹا دیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لکڑی دو شاخہ تھی اب وہی دو شاخہ اژدہے کا منہ نظر آ رہا تھا سخت پریشان تھے مگر قربت الٰہی نے طمانیت و سکون کی حالت پیدا کر دی اور انہوں نے بے خوف ہو کر اس کے منہ پر ہاتھ ڈال دیا اس عمل کے ساتھ ہی فوراً وہ دو شاخہ پھر لاٹھی بن گیا۔

اب موسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ پکارا گیا اور حکم ہوا کہ اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر لیجا کر بغل سے مس کیجئے اور پھر دیکھئے وہ مرض سے پاک اور بے داغ چمکتا ہوا نکلے گا۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوْءٍ آيَةً أُخْرٰى ۝ (طٰہٰ)

اور ملا دے اپنے ہاتھ کو اپنی بغل کے ساتھ نکل آئے گا وہ روشن بغیر کسی مرض کے (یعنی برص سے پاک) یہ دوسری نشانی ہے۔

موسیٰ ! یہ ہماری جانب سے تمہاری نبوت ورسالت کے دو بڑے نشان ہیں یہ تمہارے پیغام صداقت اور دلائل و براہین حق کی زبردست تائید کریں گے پس جس طرح ہم نے تم کو نبوت ورسالت سے نوازا اسی طرح تم کو یہ دو عظیم الشان (معجزے) بھی عطا کئے۔

لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرٰى ۝

تاکہ ہم تجھ کو اپنی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کرادیں

فَذَانِكَ بُرْهَانَانِ مِنْ رَّبِّكَ إِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهٖٓ إِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فَاسِقِيْنَ ۝

پس تیرے پروردگار کی جانب سے فرعون وراس کی جماعت کے مقابلہ میں تیرے لئے یہ دو برہان ہیں بلاشبہ وہ فرعون اوراس کی جماعت نافرمان قوم ہیں۔

اب جاؤاور فرعون اوراس کی قوم کو راہ ہدایت دکھاؤ انہوں نے بہت سرکشی اور نافرمانی اختیار کررکھی ہے اور اپنے غرور و تکبر اور انتہاء ظلم کے ساتھ انہوں نے بنی اسرائیل کو غلام بنارکھا ہے سو ان کو غلامی سے رستگاری دلاؤ۔

حضرت موسیٰ نے جناب باری میں عرض کیا" پروردگار! میرے ہاتھ سے ایک مصری قتل ہو گیا تھا اس لئے یہ خوف ہے کہ کہیں وہ مجھ کو قتل نہ کردیں مجھے یہ بھی خیال ہے کہ وہ میری بڑی زور سے تکذیب کریں گے اور مجھ کو جھٹلائیں گے یہ منصب عالی جب تونے عطا فرمایاہے تو میرے سینہ کو فراخ اور نور سے معمور کردے اوراس اہم خدمت کو میرے لئے آسان بنادے اور زبان میں پڑی ہوئی گرہ کو کھول دے تاکہ لوگوں کو میری بات سمجھنے میں آسانی ہواور چونکہ میری گفتگو میں روانی نہیں ہے اور میری بہ نسبت میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح بیان ہے اسلئے اس کو بھی اس نعمت (نبوت) سے نواز کر میرا شریک کار بنادے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اطمینان دلایا کہ تم ہمارا پیغام لے کر ضرور جاؤاور ان کو حق کی راہ دکھاؤ، وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے ہماری مدد تمہارے ساتھ ہے اور جو نشانات ہم نے تم کو بخشے ہیں وہ تمہاری کامیابی کا باعث ہوں گے اور انجام کار تم ہی غالب رہو گے ہم تمہاری درخواست منظور کرتے ہیں اور تمہارے بھائی ہارون کو بھی تمہارا شریک کار بناتے ہیں دیکھو تم دونوں فرعون اوراس کی قوم کو جب ہماری صحیح راہ کی جانب بلاؤتواس پیغام حق میں نرمی اور شیریں کلامی سے پیش آنا کیا عجب ہے کہ وہ نصیحت قبول کرلیں اور خوف خدا کرتے ہوئے ظلم سے باز آجائیں۔"

داخلۂ مصر

سدی کہتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ منصب نبوت سے سرفراز ہو کر کلام ربانی سے فیضیاب بن کر اور دعوت و تبلیغ حق میں کامیابی وکامرانی کا مژدہ پاکر وادی مقدس سے اترے تو اپنی بیوی کے پاس پہنچے جو وادی کے سامنے جنگل میں ان کی منتظر اور چشم براہ تھیں ان کو ساتھ لیا اور یہیں سے تعمیل حکم الٰہی کے لئے مصر میں داخل ہو کر اپنے مکان پہنچے مگر اندر داخل نہ ہوئے اور والدہ کے سامنے ایک مسافر کی حیثیت میں ظاہر

ہوئے یہ بنی اسرائیل میں مہماں نواز گھر تھا۔ حضرت موسیٰ کی خوب خاطر مدارات کی گئی اسی دوران میں ان کے بڑے بھائی حضرت ہارون آپہنچے یہاں پہنچنے سے قبل ہی ہاروں کو خدا کی طرف سے منصب رسالت عطا ہو چکا تھا اس لئے ان کو بذریعہ وحی حضرت موسیٰ کا سارا قصہ بتا دیا گیا تھا وہ بھائی سے آکر لپٹ گئے اور پھر ان کے اہل و عیال کو گھر کے اندر لے گئے اور والدہ کو سارا حال سنایا تب سب خاندان آپس میں گلے ملا اور بچھڑے ہوئے بھائیوں نے ایک دوسرے کی گذشتہ زندگی سے تعارف پیدا کیا اور والدہ کی دونوں آنکھوں نے ٹھنڈک حاصل کی۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ا ص ۲۵۲)

توارت میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> اور خداوند نے ہارون کو کہا کہ بیابان میں جا کے ملاقات کر وہ گیا اور خدا کے پہاڑ پر اسے ملا اور اسے بوسہ دیا اور موسیٰ نے خدا کی جس نے اسے بھیجا ساری باتیں اور معجزے کہ جن کا اس نے حکم کیا تھا ہارون سے بیان کئے۔ (خروج باب ۴ آیت ۲۷۔۲۸)

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي

حضرت موسیٰ نے وادی مقدس میں خدائے تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا تھا کہ میری زبان میں جو گرہ ہے اس کو کھول دے اور یہ کہ میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح ہے تو مفسرین نے اس "عقدہ" کے متعلق ایک حکایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ زمانہ طفولیت میں ایک روز فرعون کی آغوش میں بیٹھے ہوئے تھے اور فرعون کی ڈاڑھی جواہرات اور موتیوں سے مرصع تھی بچوں کی عادت کے مطابق حضرت موسیٰ نے ڈاڑھی پر ہاتھ چلا دیا اور چمکتے ہوئے موتیوں کے ساتھ فرعون کی ڈاڑھی کے چند بال بھی اکھڑ آئے فرعون کو سخت غصہ آیا اور چاہا کہ ان کو قتل کر دے زوجۂ فرعون نے شوہر کا یہ رنگ دیکھا تو عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ بچہ ہے اس کو نہ مار، یہ ان احترامات سے کیا واقف ہے اس کے نزدیک تو تمرہ (کھجور) اور جمرہ (چنگاری) دونوں برابر ہیں "راج ہٹ" پرانی مثل ہے بادشاہ نے کہا کہ میں ابھی اس کا امتحان کرتا ہوں اگر اس نے انگارہ کو دیکھ کر ہاتھ کھینچا تو ضرور قتل کرادوں گا خدائے تعالیٰ کو موسیٰ سے کام لینا تھا اس لئے ان کی حفاظت کی ذمہ داری کا وعدہ کر لیا تھا لہذا جب فرعون نے چند کھجور کے دانے اور چند دہکتی آگ کے سرخ انگارے منگا کر موسیٰ کے سامنے رکھے تو موسیٰ نے جلد ہاتھ بڑھا کر ایک سرخ انگارے کو اٹھا کر منہ میں رکھ لیا سکنڈ بھر کا کام تھا ہو گذرا مگر زبان پر داغ پڑ گیا اور زبان موٹی ہو گئی اس وقت سے موسیٰ کی زبان میں لکنت آ گئی اور مسلسل گفتگو میں رکاوٹ ہونے لگی پس وادیٔ مقدس میں خدائے تعالیٰ کے سامنے موسیٰ نے اسی "عقدہ" (گرہ) کا ذکر کیا[1] لیکن عام مفسرین کی اس نقل حکایت سے جدا نجار مصری نے اس سلسلہ میں اپنی ایک قیاسی رائے بیان کی ہے وہ فرماتے ہیں۔

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ا ص ۲۴۹۔

میں اس قصہ کو صحیح نہیں سمجھتا میرے خیال میں تو صرف موسیٰ کی غیر فصیح بیانی اور گفتگو میں رکاوٹ کی دو وجہوں میں سے ایک ہو سکتی ہے۔

۱۔ قرآن عزیز میں مذکور ہے یہ جب موسیٰ کو دریائے نیل میں سے نکال کر شاہی محل پہنچایا گیا تو دودھ پلانے کے لئے دایہ کی فکر ہوئی شہر کی بیسیوں دایہ آئیں مگر انہوں نے کسی کا دودھ منہ سے نہ لگایا تو اس واقعہ میں ضرور عرصہ لگا ہوگا اور موسیٰ ایک عرصہ دودھ سے محروم رہے ہوں گے ایسی حالت میں یہ تجربہ کیا گیا ہے کہ بچہ کی زبان موٹی ہو جاتی ہے اور بات کرنے میں رکاوٹ کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حضرت موسیٰ کو بھی یہی صورت پیش آئی ہوگی۔

۲۔ حضرت موسیٰ ابتداء جوانی ہی میں مصر سے مدین چلے گئے اور وہاں ایک طویل عرصہ رہے اگر "صاحب معالم التنزیل" یا تورات کی روایات کو صحیح مان لیا جائے تو بیس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ تک ہے ایسی صورت میں یہ قدرتی بات ہے کہ وہ مصری زبان سے ایک حد تک ناآشنا اور اس کے محاورات اور اس زبان میں تقریر کے ملکہ سے محروم ہو چکے ہونگے اسی کو انہوں نے "عقدۂ لسانی" فرمایا اور ہارون کے متعلق فرمایا هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ اس دوسری وجہ میں البتہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کو صحیح مان لیا جائے تو پھر حضرت موسیٰ کس طرح حضرت ہارون سے بے تکلف بات چیت کرنے پر قادر رہے ہوں گے جبکہ حضرت ہارون کبھی مصر سے باہر ہی نہیں گئے اور صرف مصری زبان ہی میں بات چیت کر سکتے تھے، سو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ہارون مصری اور عبرانی زبان ان کی مادری زبان تھی جس کو صدیاں گذرنے کے باوجود بھی بنی اسرائیل نے محفوظ رکھا تھا اور باہمی بات چیت اور نوشت و خواند میں اسی کو استعمال کرتے تھے اور مدیانی اور عبرانی میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اس لئے کہ دونوں زبانیں ایک ہی جداعلیٰ (حضرت ابراہیم) کی نسل سے متعلق تھیں۔

اور ان ہر دو وجوہ کو نقل کرنے کے بعد نجار کہتے ہیں کہ میری طبیعت کا میلان پہلی وجہ کی جانب ہے اور میں اسی کو راجح سمجھتا ہوں۔ (قصص الانبیاء عربی ص ۲۰۸، ۲۰۹)

مگر ہمارے نزدیک پہلی وجہ تو کسی طرح بھی قرین قیاس نظر نہیں آتی اس لئے کہ "دایہ" کی تفتیش کا معاملہ قرآن عزیز اور صحیح احادیث میں تو بہت ہی مختصر ہے اور اس کی تفصیل جو توراۃ اور تاریخی روایات سے نقل کی گئی ہے ان سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ صرف چند گھنٹوں کے اندر طے ہو گیا موسیٰ کی والدہ ان کو دودھ پلانے کیلئے لے گئیں اور شاہی حکم کے بعد ایک بچہ کے دودھ پلانے کے معاملہ میں دنوں کی تاخیر بھی کیسے ہو سکتی تھی۔ نیز دوسری وجہ بھی کچھ زیادہ قابل قبول نہیں ہے اسلئے کہ اس توجیہ کے مطابق حضرت ہارون کے متعلق هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ کا فقرہ تو سمجھ میں آسکتا ہے لیکن مصری زبان کی فراموشی کو عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے علاوہ ازیں اگر یہ صحیح ہے تو حضرت موسیٰ کی دعاء تو قبول کر لی گئی پھر اس فراموشی کے کیا معنی؟

بلکہ صاف اور بے غل و غش بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ ایسی حالت میں مولود

ہوئے کہ ان کی زبان میں لکنت تھی اور بات کرنے میں رکاوٹ واقع ہو جاتی تھی اور حضرت ہارون لسان اور فصیح البیان تھے پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے متعلق صرف اسی قدر دعا مانگی کہ زبان کا یہ حصر اور اسکی لکنت اس درجہ شدید نہ رہے کہ گفتگو میں عاجز ہو جانا پڑے اگر فطری رکاوٹ دور نہیں ہوتی نہ ہو، صرف اس قدر خواہش ہے کہ مخاطبین گفتگو کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور فصاحت و طلاقت لسانی کیلئے میری خواہش یہ ہے کہ میرے بھائی ہارون کو میرا قوت بازو بنا دیجئے کہ وہ میرا ویسے بھی دست و بازو ہے چنانچہ دربار الٰہی میں دونوں باتیں قبول اور منظور ہو گئیں۔

بعض علماء تفسیر نے یفقھوا قولی میں ایک اور نکتہ پیدا کیا اور فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف یہ دعا مانگی کہ ان کی زبان کی گرہ اس حد تک کھل جائے کہ جس قوم کو تبلیغ کرنے جا رہے ہیں وہ ان کی گفتگو سمجھ سکے لہٰذا اسی درجہ دعا قبول ہوئی اور ان کی زبان میں قدرے لکنت اور رکاوٹ پھر بھی باقی رہی، موسیٰ علیہ السلام نے شرط لگا کر دعاء کا دائرہ خود ہی تنگ کر دیا ورنہ وہ بھی فصاحت اور طلاقت لسانی میں فرد ہو جاتے۔

میرے خیال میں اس نکتہ سنجی کی بھی یہاں مطلق ضرورت نظر نہیں آتی اس لئے کہ جس مقام پر اور جس وقت میں موسیٰ علیہ السلام نے درگاہ الٰہی میں یہ دعا فرمائی ہے اس کی برکت اور عظمت کو ان نکتہ سنجوں نے بالکل فراموش کر دیا اور یہ غور نہیں فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام منصب نبوت سے سرفراز کئے جا رہے ہیں خدا کا انتہائی فضل و کرم بارش کی طرح ان پر برس رہا ہے آغوش رحمت وا ہے اس حالت میں موسیٰ علیہ السلام معاملہ اور ذمہ داری کی اہمیت کو محسوس فرماتے ہوئے آسانی کار کیلئے دعائیں اور استدعائیں کر رہے ہیں اور خدائے تعالیٰ خود موسیٰ علیہ السلام کی مشکلات اور مہم کی نزاکت کا عالم و دانا ہے تو پھر کیا ایسے وقت میں خدائے تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا یہ تقاضا ہو سکتا تھا کہ وہ عطاء و نوال کی بجائے اس نوازش کی جگہ مول تول اور سودے کی طرح لین دین کا سا معاملہ کرتی یا حقیقت حال کے پیش نظر موسیٰ علیہ السلام کے دعائیہ الفاظ کی لفظی گرفت سے درگذر فرما کر وہ سب کچھ عطا کرتی جو ان کی مشکلات کو ختم کرنے کیلئے معاون و مددگار ثابت ہو سکتے بے شک اس نے ایسا ہی کیا البتہ موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد میں ایک راز تھا جس کو وہ اور ان کا پروردگار دونوں سمجھتے تھے ان کی خواہش تھی کہ ان کی اس اہم خدمت میں ان کے بھائی ہارون علیہ السلام ضرور شریک کار بنیں اسلئے کہ وہ بھائی بھی ہیں اور فطری فصاحت و طلاقت لسانی کے مالک بھی لہٰذا وہ اس سے زیادہ کے خواہش مند ہی نہ تھے کہ ان کو حصر کی دشواری سے نجات مل جائے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ہارون علیہ السلام کو بھی یہ دولت نبوت عطا ہو پس ان کی سفارش کیلئے اسی وصف "فصاحت بیانی" کو خدا کی درگاہ میں پیش کیا یہ نہ تھا کہ انہوں نے الفاظ دعاء میں تنگی کی تھی تو خدا نے بھی کم دینے کی خاطر ان کے الفاظ کو پکڑ لیا اور اسی قدر دیا جو ان کی دعاء کے الفاظ میں محدود تھا۔

وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ○ إِذْ رَأَىٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَعَلِّي آتِيكُمْ مِنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ○ فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يَا مُوسَىٰ ○ إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ○ وَأَنَا

اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ إِنَّنِيْ أَنَا اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝ إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى ۝ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدٰى ۝ (طٰہٰ)

اور اے پیغمبر! موسیٰ کی حکایت تو نے سنی؟ جب اس نے (دور سے) آگ دیکھی تو اپنے گھر کے لوگوں سے کہا "ٹھہرو مجھے آگ دکھائی دی ہے میں جاتا ہوں ممکن ہے تمہارے لئے ایک انگارہ لیتا آؤں یا (کم از کم) الاؤ پر کوئی راہ دکھانے والا ہی مل جائے پھر جب وہ وہاں پہنچا تو اس وقت پکارا گیا (ایک آواز اٹھی کہ) اے موسیٰ میں ہوں تیرا پروردگار! پس اپنی جوتی اتار دے تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے اور دیکھ میں نے تجھے (اپنی رسالت کیلئے) چن لیا ہے پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سن میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی بندگی کر اور میری ہی یاد کیلئے نماز قائم کر بلاشبہ (مقررہ) وقت آنے والا ہے میں اسے پوشیدہ رکھنے کو ہوں تاکہ (لوگوں کے یقین و عمل کی آزمائش ہو جائے اور) جس شخص کی جیسی کچھ کوشش ہو اسی کے مطابق بدلہ پائے، پس دیکھ ایسا نہ ہو کہ جو لوگ اس وقت کے ظہور پر یقین نہ رکھتے ہوں اور اپنی خواہش کے بندے ہوں وہ تجھے بھی (قدم بڑھانے سے) روک دیں اور نتیجہ یہ نکلے تو تباہ ہو جائے۔

إِذْ قَالَ مُوْسٰى لِأَهْلِهٖٓ إِنِّيْٓ آنَسْتُ نَارًا سَآتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ أَنْ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ يَامُوْسٰى إِنَّهٗٓ أَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(النمل)

جب کہا موسیٰ نے اپنے گھر والوں کو میں نے دیکھی ہے ایک آگ اب لاتا ہوں تمہارے پاس وہاں سے کچھ خبر یا لاتا ہوں انگارہ سلگا کر تاکہ تم تاپو پھر جب پہنچا اس کے پاس آواز ہوئی کہ برکت ہے اس پر جو کوئی آگ میں ہے اور جو اس کے آس پاس ہے اور پاک ہے ذات اللہ کی جو رب ہے سارے جہان کا اے موسیٰ وہ میں اللہ ہوں زبردست حکمتوں والا۔"

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يَامُوْسٰى ۝ قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَآرِبُ أُخْرٰى ۝ قَالَ أَلْقِهَا يَامُوْسٰى ۝ فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْأُوْلٰى ۝ وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ آيَةً أُخْرٰى ۝ لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرٰى ۝

اور صدائے غیبی نے پوچھا: اے موسیٰ علیہ السلام! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ عرض کیا "میری لاٹھی ہے

چلنے میں اس کا سہارا لیا ہوں اسی سے اپنی بکریوں کیلئے درختوں کے پتے جھاڑ لیتا ہوں میرے لئے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں حکم ہوا "اے موسیٰ! اسے ڈال دے" موسیٰ نے ڈال دیا اور کیا دیکھتا ہے ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے حکم ہوا "اسے اب پکڑ لے خوف نہ کھا ہم اسے پھر اس کی اصلی حالت پر کئے دیتے ہیں اور نیز حکم ہوا اپنا ہاتھ اپنے پہلو میں رکھ اور پھر نکال بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو چمکتا ہوا نکلے گا یہ (تیرے لئے) دوسری نشانی ہوئی (اور یہ دونوں (نشانیاں) اس لئے دی گئی ہیں کہ آئندہ تجھے اپنی قدرت سے بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔ (طٰہٰ)

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَآ إِلَى مُوْسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ ○ وَلٰكِنَّآ أَنْشَأْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيٓ أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ○ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ إِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ أَتَاهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ○ (قصص)

اور تو نہ تھا غرب کی طرف جب ہم نے بھیجا موسیٰ کو حکم اور نہ تھا تو دیکھنے والا لیکن ہم نے پیدا کیں کئی جماعتیں پھر دراز ہوئی ان پر مدت اور تو نہ رہتا تھا مدین والوں میں کہ ان کو سناتا ہماری آیتیں پر ہم رہے رسول بھیجتے اور تو نہ تھا طور کے کنارے جب ہم نے آواز دی، لیکن یہ انعام ہے تیرے رب کا کہ تو ڈر سنادے ان لوگوں کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈر سنانے والا تجھ سے پہلے تا کہ وہ یاد رکھیں۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ○ إِذْ نَادَاهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ○ اِذْهَبْ إِلٰى فِرْعَوْنَ إِنَّهٗ طَغٰى ○ فَقُلْ هَلْ لَّكَ إِلٰٓى أَنْ تَزَكّٰى ○ وَأَهْدِيَكَ إِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ○ (النازعات)

کچھ پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی، جب پکارا اس کو اس کے رب نے پاک میدان میں جس کا نام طویٰ ہے۔ جا فرعون کے پاس اس نے سر اٹھایا پھر کہہ تیرا جی چاہتا ہے کہ تو سنور جائے اور راہ بتاؤں تجھ کو تیرے رب کی طرف پھر تجھ کو ڈر ہو؟

اِذْهَبْ إِلٰى فِرْعَوْنَ إِنَّهٗ طَغٰى ○ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ○ وَيَسِّرْ لِيٓ أَمْرِيْ ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ○ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ○ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ أَهْلِيْ ○ هَارُوْنَ أَخِي ○ اشْدُدْ بِهٖٓ أَزْرِيْ ○ وَأَشْرِكْهُ فِيٓ أَمْرِيْ ○ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ○ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ○ إِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ○ قَالَ قَدْ أُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يَامُوْسٰى ○ (طٰہٰ)

(حکم ہوا) ”اے موسیٰ! تو فرعون (یعنی پادشاہ مصر) کی طرف جا وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے“ ”موسیٰ نے عرض کیا ”اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے (کہ بڑے سے بڑا بوجھ اٹھانے کیلئے مستعد ہو جاؤں) میرا کام میرے لئے آسان کر دے (کہ راہ کی کوئی دشواری بھی غالب نہ آسکے) میری زبان کی گرہ کھول دے کہ خطاب و کلام میں پوری طرح رواں ہو جائے اور) میری بات لوگوں کے دلوں میں اتر جائے نیز میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنادے اس کی وجہ سے میری قوت مضبوط ہو جائے وہ میرے کام میں میرا شریک ہو ہم دونوں ایک دل ہو کر تیری پاکی اور بڑائی کا بکثرت اعلان کریں تیری یاد میں زیادہ سے زیادہ لگے رہیں اور بلاشبہ تو ہمارا حال دیکھ رہا ہے (ہم سے کسی حال میں غافل نہیں) ارشاد ہوا اے موسیٰ! تیری درخواست منظور ہوئی۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ○ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ○ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ○ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ○ فَاْتِيَاهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ○ (طٰہٰ)

اب تو اور تیرا بھائی دونوں میری نشانیاں لے کر جائیں اور میری یاد میں کوتاہی نہ کریں ہاں تم دونوں (یعنی موسیٰ اور ہارون کیونکہ اب دونوں اکٹھے ہو گئے تھے اور مصر کے قریب وحی الٰہی نے انہیں دوبارہ مخاطب کیا تھا) فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکشی میں بہت بڑھ چلا ہے پھر جب اس کے پاس پہنچو تو سختی کے ساتھ پیش نہ آنا۔ نرمی سے بات کرنا (تمہیں کیا معلوم؟) ہو سکتا ہے کہ نصیحت پکڑے یا (عواقب سے) ڈر جائے دونوں نے عرض کیا ”پروردگار!“ ہمیں اندیشہ ہے فرعون ہماری مخالفت میں جلدی نہ کرے یا سرکشی سے پیش آئے“ ارشاد ہوا کچھ اندیشہ نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں میں سب کچھ سنتا ہوں سب کچھ دیکھتا ہوں! تم اس کے پاس بے دھڑک جاؤ اور کہو ہم تیرے پروردگار کی نشانی لے کر تیرے سامنے آگئے اس پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ○ فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ○ (فرقان)

اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور کر دیا ہم نے اس کے ساتھ اس کا بھائی ہارون کام بٹانے والا پھر کہا ہم نے دونوں جاؤ ان لوگوں کے پاس انہوں نے جھٹلایا ہماری باتوں کو پھر دے مارا ہم نے ان کو اکھاڑ کر۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا يَتَّقُوْنَ ○ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ○ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ○ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ○ قَالَ كَلَّا

فَاذْهَبَا بِآيَاتِنَا إِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۝ فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَا إِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝

اور جب پکارا تیرے رب نے موسیٰ کو کہ جا اس قوم گنہگار کے پاس قوم فرعون کے پاس کیا وہ ڈرتے نہیں بولا اے رب میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھٹلائیں اور رک جاتا ہے میرا جی اور نہیں چلتی ہے میری زبان سو پیغام دے ہارون کو اور ان کو مجھ پر ایک گناہ کا دعویٰ ہے۔ سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں فرمایا کبھی نہیں تم دونوں جاؤ لے کر ہماری نشانیاں ہم ساتھ تمہارے سنتے ہیں سو جاؤ فرعون کے پاس اور کہو ہم پیغام لے کر آئے ہیں پروردگار عالم کا۔ (الشعراء)

وَأَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ يَامُوْسٰى لَا تَخَفْ إِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَإِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ فِيْ تِسْعِ آيَاتٍ إِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖٓ إِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فَاسِقِيْنَ ۝ (النمل)

اور ڈال دے لاٹھی اپنی پھر جب دیکھا اس کو پھن ہلاتے جیسے سفید پتلا سانپ لوٹا پیٹھ پھیر کر اور مڑ کر نہ دیکھا۔ اے موسیٰ! مت ڈر میں جو ہوں میرے پاس نہیں ڈرتے رسول مگر جس نے زیادتی کی پھر بدلے میں نیکی کی برائی کے پیچھے تو میں بخشنے والا ہوں اور ڈال دے ہاتھ اپنا اپنے گریبان میں کہ نکلے سفید ہو کر بغیر کسی عیب کے یہ دونوں مل کر نو نشانیاں لے کر جا فرعون اور اس کی قوم کی طرف بے شک وہ تھے لوگ نافرمان۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهٖ آنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوْٓا إِنِّيْٓ آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ آتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝ فَلَمَّآ أَتَاهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَنْ يَّامُوْسٰٓى إِنِّيْٓ أَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ۝ وَأَنْ أَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ يَامُوْسٰٓى أَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ إِنَّكَ مِنَ الْآمِنِيْنَ ۝ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذَانِكَ بُرْهَانَانِ مِنْ رَّبِّكَ إِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهٖٓ إِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فَاسِقِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَأَخَافُ أَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝ وَأَخِيْ هَارُوْنُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُّصَدِّقُنِيْٓ إِنِّيْٓ أَخَافُ أَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۝ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ

بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا بِآيَاتِنَا اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُوْنَ ○ (قصص)

پھر جب پوری کر چکا موسیٰ وہ مدت اور لے کر چلا اپنے گھر والوں کو دیکھی کوہ طور کی طرف سے ایک آگ کہا اپنے گھر والوں کو ٹھہرو میں نے دیکھی ہے آگ شاید لے آؤں تمہارے پاس وہاں کی کچھ خبر یا انگارہ آگ کا تاکہ تم تاپو پھر جب پہنچا اس کے پاس آواز ہوئی میدان کے داہنے کنارے سے برکت والے تختہ میں ایک درخت سے کہ اے موسیٰ میں ہوں میں اللہ جہان کا رب اور یہ کہ ڈال دے اپنی لاٹھی پھر جب دیکھا اس کو پھن ہلاتے جیسے پتلا سانپ الٹا پھرا منہ موڑ کر اور نہ دیکھا پیچھے پھر کر اے موسیٰ! آگے آ اور مت ڈر تجھ کو کچھ خطرہ نہیں ڈال اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں نکل آئے سفید ہو کر نہ کہ کسی برائی سے اور لائے اپنی طرف اپنا بازو ڈر سے سو یہ دو سندیں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے سرداروں پر بیشک وہ تھے لوگ نافرمان بولا اے رب میں نے خون کیا ہے ان میں ایک جان کا سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں گے اور میرا بھائی ہارون اس کی زبان چلتی ہے مجھ سے زیادہ سو اس کو بھیج میرے ساتھ مدد کو میری تصدیق کرے میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھوٹا کریں فرمایا ہم مضبوط کر دینگے تیرے بازو کو تیرے بھائی سے اور دیں گے تم کو غلبہ پھر وہ نہ پہنچ سکیں گے تم تک ہماری نشانیوں سے تم اور جو تمہارے ساتھ ہو غالب رہو گے۔

وَآتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ○ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ○

اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور کیا اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے واسطے کہ نہ ٹھہراؤ میرے سوا کسی کو کارساز تم جو اولاد ہو ان لوگوں کی جن کو چڑھایا ہم نے نوح کے ساتھ بے شک وہ تھا بندہ حق ماننے والا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهٖ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ ○ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِآيَاتِنَا يُوْقِنُوْنَ ○

اور ہم نے دی ہے موسیٰ کو کتاب سو تو مت رہ دھوکے میں اس کے ملنے سے اور کیا ہم نے اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے واسطے اور کئے ہم نے ان میں پیشوا جو راہ چلاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے اور رہے ہماری باتوں پر یقین کرتے تیرا رب جو ہے وہی فیصلہ کرے گا ان میں دن قیامت کے جس بات میں کہ وہ اختلاف کرتے تھے۔

ان آیات میں "عصاءِ موسیٰ علیہ السلام معجزہ یا آیۃ اللہ ہونے کو "مختلف تعبیرات سے ادا کیا گیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں حَیَّۃٌ تَسْعٰی فرمایا اور سورۂ نمل اور قصص میں جَانٌّ کہا گیا اور شعراء میں ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ظاہر کیا مفسرین فرماتے ہیں کہ "عصاء موسیٰ علیہ السلام "کی اگرچہ یہ تعبیرات لفظی اعتبار سے مختلف ہیں لیکن حقیقت اور معنی کے لحاظ سے مختلف نہیں ہیں بلکہ ایک حقیقت کے مختلف اوصاف کو ادا کیا گیا ہے یعنی جنس کے اعتبار سے وہ حیہ سانپ

تھا اور تیز روی کے اعتبار سے جان (تیز رو سانپ) تھا اور جسامت کے پیش نظر وہ "ثعبان" (اژدہا) تھا۔

اور سورۂ قصص میں موسیٰ ؑ کے دونوں معجزوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ

اور اپنی جانب اپنے بازو لے خوف کی حالت میں

اس آیت میں کس قسم کے خوف کا ذکر ہے؟ اس کے متعلق حضرت شاہ صاحب دہلوی نور اللہ مرقدہ ارشاد فرماتے ہیں "بازو ملا ڈر سے یعنی سانپ کا ڈر جاتا رہے"۔ (موضح القرآن)

اور بعض علماء کہتے ہیں کہ اس خوف سے فرعون کے دربار کا خوف مراد تھا یعنی اگر فرعون کے سامنے کسی وقت خوف محسوس ہونے لگے تو اے موسیٰ! تو اپنے بازو کو بدن کے ساتھ ملا لینا فوراً ڈر جاتا رہے گا اور دل میں سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یہ دو نشانیوں کے علاوہ تیسری نشانی نہیں تھی بلکہ خوف اور ڈر دور کرنے کا ایک فطری علاج بتلایا گیا تھا جو ایسے موقع پر عموماً فائدہ مند ثابت ہوتا ہے اور اب جبکہ خدائے تعالیٰ کا فرمودہ تھا تو اس کے راست آنے میں موسیٰ ؑ کو شک کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ (قصص الانبیاء النجار ص ۲۱۲)

ہمارے نزدیک آیت کا سیاق حضرت شاہ عبدالقادرؒ کی تائید کرتا ہے اور نجار کی توجیہ ایک دور کی بات معلوم ہوتی ہے۔

فرعون کے دربار میں دعوتِ حق

بہر حال حضرت موسیٰ ؑ و حضرت ہارون ؑ کے درمیان جب ملاقات اور گفتگو کا سلسلہ ختم ہوا تو اب دونوں نے طے کیا کہ خدائے تعالیٰ کے امتثال حکم کیلئے فرعون کے پاس چلنا اور اس کو پیغام الٰہی سنانا چاہیے۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جب دونوں بھائی فرعون کے دربار میں جانے لگے تو والدہ نے غایت شفقت کی بنا پر روکنا چاہا کہ تم ایسے شخص کے پاس جانا چاہتے ہو جو صاحب تخت و تاج بھی ہے اور ظالم و مغرور بھی وہاں نہ جاؤ وہاں جانا بے سود ہوگا مگر دونوں نے والدہ کو سمجھایا کہ خدائے تعالیٰ کا حکم ٹالا نہیں جا سکتا اور اس کا وعدہ ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے۔

غرض دونوں بھائی اور خدا کے سچے پیغمبر و نبی فرعون کے دربار میں پہنچے اور بغیر خوف و خطر اندر داخل ہو گئے جب فرعون کے تخت کے قریب پہنچے تو حضرت موسیٰ وہارون علیہم السلام نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی اور گفتگو شروع ہوئی اور انہوں نے فرمایا:

"فرعون! ہم کو خدا نے اپنا پیغمبر اور رسول بنا کر تیرے پاس بھیجا ہے ہم تجھ سے دو اہم باتیں چاہتے ہیں ایک یہ کہ خدا پر یقین لا اور کسی کو اس کا ساجھی اور سہیم نہ بنا دوسرے یہ کہ ظلم سے باز آ، اور بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے نجات دے ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یقین رکھ کہ یہ بناوٹ اور تصنع نہیں ہے اور نہ ہم کو یہ جراءت ہو سکتی ہے کہ خدائے تعالیٰ کے ذمہ غلط بات لگائیں ہماری صداقت کے لئے جس طرح ہماری یہ تعلیم خود شاہد ہے اسی طرح

خدائے تعالیٰ نے ہم کو اپنی دو زبردست نشانیاں (معجزات) بھی عطا فرمائی ہیں، لہٰذا تیرے لئے مناسب یہی ہے کہ صداقت و حق کے اس پیغام کو قبول کر اور بنی اسرائیل کو رستگاری دے کر میرے ساتھ کر دے تاکہ میں انہیں پیغمبروں کی اس سرزمین میں لے جاؤں جہاں بجز ذات واحد کے یہ اور کسی کی پرستش نہ کریں کہ یہی راہ حق ہے اور ان کے باپ دادوں کا ابدی شعار۔

وَقَالَ مُوْسٰى يَافِرْعَوْنُ إِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ حَقِيْقٌ عَلٰٓى أَنْ لَّآ أَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ ○ (سورہ اعراف)

اور موسیٰ نے کہا اے فرعون! میں جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا ایلچی ہوں میرے لئے کسی طرح زیبا نہیں کہ اللہ پر حق اور سچ کے علاوہ کچھ اور کہوں بلاشبہ میں تمہارے لئے تمہارے پروردگار کے پاس سے دلیل اور نشان لایا ہوں پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔

فرعون نے جب یہ سنا تو کہنے لگا کہ "موسیٰ! آج تو پیغمبر بن کر میرے سامنے بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کرتا ہے وہ دن بھول گیا جب تو نے میرے ہی گھر میں پرورش پائی اور بچپن کی زندگی گذاری اور کیا تو یہ بھی بھول گیا کہ تو نے ایک مصری کو قتل کیا اور یہاں سے بھاگ گیا حضرت موسیٰ نے فرمایا فرعون! صحیح ہے کہ میں نے تیرے گھر میں پرورش پائی اور ایک مدت تک شاہی محل میں رہا اور مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ غلطی کی بنا پر مجھ سے نادانستہ ایک شخص قتل ہو گیا اور میں اس خوف سے چلا گیا تھا لیکن یہ خدائے تعالیٰ کی رحمت کا کرشمہ ہے کہ اس نے تمام بیکسانہ مجبوریوں کی حالت میں تیرے ہی گھرانے میں میری پرورش کرائی اور پھر مجھ کو اپنی سب سے بڑی نعمت نبوت ورسالت سے سرفراز کیا۔"

فرعون! کیا یہ طریقہ عدل وانصاف کا طریقہ ہو گا کہ مجھ ایک اسرائیلی کی پرورش کا بدلہ ٹھہرے کہ بنی اسرائیل کی تمام قوم کو تو غلام بنائے رکھے؟"

فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ إِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ أَنْ أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ ○ قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ○ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ ○ قَالَ فَعَلْتُهَا إِذًا وَّأَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ○ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ ○ (شعراء)

پھر وہ دونوں فرعون کے پاس آئے پس انہوں نے کہا "ہم بلاشبہ جہانوں کے پروردگار کے پیغمبر اور ایلچی ہیں یہ پیغام لے کر آئے ہیں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے فرعون نے کہا کیا ہم نے تجھ کو اپنے یہاں لڑکا سا نہیں پالا اور تو ہمارے یہاں ایک مدت نہیں رہا اور تو نے جو کچھ اس زمانے میں کام کیا وہ تجھے خود بھی

یہ معلوم ہے اور تو ناشکر گذار ہے موسیٰ نے کہا" میں نے وہ کام (مصری کا قتل) ضرور کیا اور میں اس میں چوک جانے والوں میں سے ہوں پھر یہاں سے تمہارے خوف سے بھاگ گیا پھر میرے رب نے مجھ کو صحیح فیصلہ کی سمجھ دی اور مجھ کو اپنے پیغمبروں میں سے بنالیا (یہ اس کی حکمت کی کرشمہ سازیاں ہیں) اور میری (پرورش) کا یہ احسان جس کو تو مجھ سے جتارہا ہے کیا ایسا احسان ہے کہ تو بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھے۔

سورۂ شعراء کی اس آیت و تلك نعمة الخ کا ترجمہ عام مفسرین کی تفسیر کے مطابق کیا گیا ہے لیکن اس کے برعکس عبدالوہاب نجار اس آیت کے یہ معنی کرتے ہیں "اور تیرا یہ انعام ہوگا اور تو مجھ پر احسان کرے گا کہ تو بنی اسرائیل کو عزت بخشے یعنی ان کو میرے ساتھ بھیج دے کہ وہ اپنے خدا کی عبادت میں آزاد ہو جائیں۔"

اور اس معنی کے جواز میں فرماتے ہیں کہ عَبَّدْتَّ بمعنی کَرَّمْتَ لغت عرب سے ثابت ہے چنانچہ لسان العرب ص ۲۶۳ جلد ۴ میں ہے "المعبد، المکرم" اور یہاں یہ معنی لینے اس لئے ضروری ہیں کہ قرآن عزیز میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تلقین کر دی تھی کہ فرعون کے سمجھانے میں نرمی اور لطف و مہربانی کو پیش نظر رکھنا غصہ یا سخت کلامی کا اظہار نہ کرنا لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ بعید ہے کہ وہ اس ہدایت الٰہی کے خلاف طعن تشنیع یا معاریض و مجازات سے کام لیں جو رفق و تلطف کے قطعاً خلاف ہے اور جو معنی عام مفسرین نے لئے ان میں طعن و معاریض کا پہلو نکلتا ہے۔ (قصص الانبیاء، عربی۔ ص ۲۱۶)

مگر نجار نے اس موقعہ پر جو کچھ کہا ہے وہ خود تکلف بارد اور رکیک تاویل کی حیثیت سے زیادہ نہیں ہے اسلئے کہ عام مفسرین کے معنی کے مطابق یہاں نہ طعن و تشنیع ہے اور نہ معاریض و مجازات بلکہ روشن دلیل اور واضح حجت کے ذریعہ فرعون کو اس کی کج روی اور متمدانہ سرکشی پر توجہ دلانا ہے جو ایک پیغمبر اور خدا کے سچے رسول کا فرض منصبی ہے۔

فرعون نے اپنی مغرورانہ سرشت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیغمبر خدا ہونے کا استخفاف کیا اور مذاق و تحقیر کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت سے بحث شروع کر دی، اپنے گھرانے کے احسان جتائے اور مصری کے قتل والا معاملہ یاد دلا کر خوف زدہ کرنے کی سعی کی مگر موسیٰ علیہ السلام چونکہ ان سب مراحل کے متعلق خدائے برحق سے ہر قسم کا اطمینان کر چکے تھے اس لئے ان پر مطلق نہ خوف کا اثر ہوا اور نہ ان کو غصہ آیا بلکہ انہوں نے فرعون کے گھرانے کی تربیت کا اعتراف بھی کیا اور مصری کے قتل کی غلطی کو بھی تسلیم کیا مگر ساتھ ہی ایک ایسا مسکت برہان اور خاموش کن دلیل بھی پیش کر دی کہ فرعون واقعی لاجواب ہو گیا اور اس نے ناراضی اور غصہ کے اظہار کی بجائے گفتگو کا پہلو فوراً بدل دیا اور موسیٰ علیہ السلام سے رب العلمین کے متعلق بات چیت شروع کر دی اور وہ دلیل و حجت یہی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا "تو نے جو کچھ کہا میری شخصیت اور ذات سے متعلق ہے لیکن کیا یہ باتیں اس کیلئے جواز کا سبب بن سکتی ہیں کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم کو تو غلام بنائے رہے یہ تو صریح ظلم ہے۔

لہٰذا مفسرین کی تفسیر اور ترجمہ ہی صحیح ہے اور نجار کے ترجمہ کو تسلیم کر لینے کے بعد کلام کی تمام لطافت اور خوبی فنا ہو جاتی ہے اور سیاق و سباق کیساتھ بھی بے تکلف اس کا جوڑ نہیں لگتا۔

ربوبیت الٰہی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام و فرعون کا مذاکرہ

فرعون نے دوران گفتگو میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو یہ طعن کیا تھا کہ تو نے ہمارے یہاں تربیت پائی ہے اور میں تیرا مربی ہوں تو اس کے معنی صرف اسی قدر نہیں تھے بلکہ اس کی تہ میں وہ عقیدہ کام کر رہا تھا جس کی شکست و ریخت کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث کئے گئے تھے یعنی سلطنت مصر کا بادشاہ صرف بادشاہ ہی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ "راع" (سورج) کا اوتار مانا جاتا تھا اور اس لئے فرعون کے لقب سے ملقب تھا مصریوں کے عقیدہ میں تربیت کائنات کا معاملہ "راع" دیوتا کے سپرد تھا اور دنیا میں اس کا صحیح مظہر شاہ مصر (فرعون) تھا، اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب خدائے واحد کی پرستش اور دیوتاؤں کی پوجا کے خلاف آواز بلند کی اور فرمایا اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ تو اول اس نے اپنی اور اپنے باپ دادا کی ربوبیت کو اس طرح ثابت کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت پر اس کا بوجھ پڑے اور جب اس طرح اصل مسئلہ کو حل ہوتے نہ دیکھا تو اب مسئلہ کو زیادہ عریاں کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مناظرہ پر آمادہ ہو گیا اور کہنے لگا موسیٰ علیہ السلام! یہ تو نئی بات کیا سناتا ہے کیا میرے علاوہ بھی کوئی رب ہے کہ جس کو تو رب العلمین کہتا ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو اس کی حقیقت بیان کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا "اگر تجھ میں یقین اور ایمان صحیح کی گنجائش ہے تو تجھ کو سمجھنا چاہیے کہ میں جس ہستی کو رب العلمین کہتا ہوں وہ ذات اقدس ہے جس کے قبضہ قدرت میں آسمان زمین اور ان دونوں کے درمیان کی کل مخلوقات کی ربوبیت ہے فرعون! کیا تو دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان آسمانوں، زمینوں اور ان کے درمیان تمام مخلوقات کو تو نے پیدا کیا ہے یا انکی ربوبیت کا کارخانہ تیرے ید قدرت میں ہے؟ اگر نہیں اور بلاشبہ نہیں! تو پھر رب العلمین کی ربوبیت عام سے انکار کیوں؟ فرعون نے یہ سنا تو درباروں کی جانب مخاطب ہو کر تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ کیا تم سنتے ہو؟ یہ کیسی عجیب بات کہہ رہا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے درباریوں کے اس تعجب اور حیرانی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اور اپنے سلسلہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا "رب العلمین" وہ ہستی ہے جس کی ربوبیت کے اثر سے تیرا اور تیرے باپ کا وجود بھی خالی نہیں ہے یعنی جس وقت تو عالم وجود میں نہ آیا تھا، تو تجھ کو پیدا اور تیری تربیت کی اور اسی طرح وہ تجھ سے پہلے تیرے آباءواجداد کو عالم وجود میں لایا اور ان کو اپنی ربوبیت سے نوازا۔ فرعون نے جب اس مسکت اور زبردست دلیل کو سنا اور کوئی جواب نہ بن پڑا تو درباریوں سے کہنے لگا: "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو خود کو تمہارا پیغمبر اور رسول کہتا ہے، مجنون اور پاگل ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ

ا: مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے جن میں سے بعض تو خاص خاص قبیلوں اور علاقوں کے تھے، جیسے نیفات فتاء اور مات اور بعض عالم گیر قوتوں کے الگ مظاہر تھے۔ جیسے اوزیرس عالم آخرت کا خدا، میہ اورت آسمان کا قدام کینمو، جمس بنانے والا، ایزیر روح بخشنے والی دیوی، طوطا عمر کی مقدار مقرر کرنے والا، ہوارس درد و غم دور کرنے والا، حاثو (گائے) رزق بخشنے والی دیوی اور ان سب سے بلند تر آمن راع تھا یعنی سورج دیوتا۔

نیز مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشوونما پا چکا تھا اور تاجداران مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کر لی تھی، ان کا لقب "فاراع" اسلئے ہوا کہ وہ "راع" یعنی سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ (ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۴۶۳) دائرۃ المعارف للبستانی جلد ۵ مادہ "راع"۔

اس سے اب کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو سوچا یہ بہتر ہے کہ اور زیادہ دل نشین پیرایہ بیان میں خدا کی ربوبیت کو واضح کیا جائے اسلئے فرمایا: یہ جو مشرق و مغرب اور اس کے درمیان ساری کائنات نظر آتی ہے اس کی ربوبیت جس کے ید قدرت میں ہے اسی کو میں "رب العلمین" کہتا ہوں تم اگر ذرا بھی عقل و سمجھ سے کام لو تو بآسانی اس حقیقت کو پا سکتے ہو۔

غرض حضرت موسیٰ اللہ رب العلمین کے حکم کے مطابق برابر شیریں کلامی، نرم گفتاری اور رفق و لطف کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کو راہ حق دکھاتے اور رسالت کا فرض ادا فرماتے رہے اور فرعون کی تحقیر و توہین اور مجنون جیسے سخت الفاظ کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے اس کی رشد و ہدایت کیلئے بہترین دلائل اور مسکت جوابات دیتے رہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ○ قَالَ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ○ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ أَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ○ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَآئِكُمُ الْأَوَّلِيْنَ ○ قَالَ إِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ○ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ (سورہ شعراء)

بولا فرعون کیا معنی ہیں پروردگار عالم کے؟ کہا پروردگار آسمان اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے، اگر تم یقین کرو۔ بولا اپنے گرد والوں سے کیا تم نہیں سنتے ہو؟ کہا پروردگار تمہارا اور پروردگار تمہارے اگلے باپ دادوں کا بولا تمہارا پیغام لانے والا جو تمہاری طرف بھیجا گیا ضرور باؤلا ہے کہا پروردگار مشرق کا اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں موجود ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو یاد دلایا کہ جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے یہ صحیح نہیں ہے بلکہ رب العلمین ہی وہ ذات ہے جو لائق پرستش ہے اور اسکے مقابلہ میں کسی انسان کا دعوائے ربوبیت کھلا ہوا شرک ہے۔ اے فرعون! تو اس سے باز آ کیونکہ اس ہستی نے جس کو میں رب العلمین کہہ رہا ہوں ہم پر یہ وحی نازل کی ہے کہ جو شخص اس قول حق کی خلاف ورزی اور تکذیب کرے گا اور اس سے منہ موڑے گا وہ خدا کے عذاب کا مستحق ٹھہرے گا۔

إِنَّا قَدْ أُوْحِيَ إِلَيْنَآ أَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ○

جو کوئی اور سرتابی کرے تو ہم پر وحی اتر چکی کہ اس کے لیے عذاب کا پیام ہے۔

فرعون نے پھر وہی پہلا سوال دہرایا دیا "اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں ایسی لاجواب بات کہی کہ فرعون حیران رہ گیا اور پہلو بدل کر بات کا رخ دوسری جانب پھیرنے کی اس طرح سعی کرنے لگا جس طرح باطل کوش مناظرین کا قاعدہ ہے کہ جب صحیح جواب نہ بن پڑے اور حقیقت حال صاف سامنے آ جائے تو پھر اس کو دبانے کے لئے کجروی کے ساتھ بات کا رخ دوسری جانب پھیر دیا کرتے ہیں۔

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا" ہمارا پروردگار تو وہ ایک ہی پروردگار ہے جس نے دنیا کی ہر چیز کو اس کا وجود بخشا اور پھر ہر طرح کی ضروری قوتیں (حواس عقل وغیرہ) دے کر اس پر زندگی و عمل کی راہ کھول دی جس نے ہر شئے کو نعمت جسم و وجود عطا کی اور پھر سب کو منزل کمال کی طرف چلنے کی راہ دکھائی" تب فرعون نے لاجواب ہو کر بات کا رخ یوں بدلا کہنے لگا فما بال القرون الاولی تو پھر پہلے لوگوں کا حال کیا ہوا مطلب یہ تھا کہ اگر تیری یہ بات صحیح ہے تو پھر ہم سے پہلے لوگ اور ہمارے باپ دادا جن کا عقیدہ تیرے عقیدے کی تائید میں نہ تھا کیا وہ سب عذاب میں گرفتار ہیں اور سب جھوٹے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی کج بحثی کو سمجھ گئے اور انھیں یقین ہو گیا کہ یہ اصل مقصد کو الجھانا چاہتا ہے۔ اسلئے فوراً جواب دیا علمها عند ربي في كتاب لا يضل ربي ولا ينسى ان پر کیا گذری اور ان کے ساتھ خدا کا کیا معاملہ رہا اسکی ذمہ داری نہ مجھ پر ہے اور نہ تجھ پر ان کا علم میرے پروردگار کے پاس محفوظ ہے ہاں یہ بتادینا ضروری ہے کہ میرا پروردگار بھول چوک اور خطا سے پاک ہے جس نے جو کچھ کیا ہے اس کے معاملہ میں کوئی بھول یا ظلم نہ ہوگا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر گفتگو کو اصل مسئلہ کی طرف پھیر دیا اور رب العالمین کے اوصاف کا ذکر کر کے مسئلہ کی حقیقت کو اچھی طرح واضح اور مستحکم بنایا:

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يَامُوْسٰى ○ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ أَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى○ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْأُوْلٰى ○ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتَابٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ○ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّأَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجْنَا بِهٖٓ أَزْوَاجًا مِّنْ نَبَاتٍ شَتّٰى ○ كُلُوْا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّأُولِي النُّهٰى ○ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى ○ (طٰہٰ)

فرعون نے پوچھا" اگر ایسا ہی ہے تو بتلاؤ تمہارا پروردگار کون ہے اے موسیٰ علیہ السلام ؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر اس پر (زندگی و عمل کی)" راہ کھول دی" فرعون نے کہا پھر ان کا کیا حال ہونا ہے جو پچھلے زمانوں میں گذر چکے ہیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اس بات کا علم میرے پروردگار کے پاس نوشتہ میں ہے میرا پروردگار جس نے تمہارے لئے زمین بچھونے کی طرح بچھا دی، نقل و حرکت کیلئے اس میں راہیں نکال دیں آسمان سے پانی برسایا اس کی آبپاشی سے ہر طرح کی نباتات کے جوڑے پیدا کر دیئے، خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشی بھی چراؤ، اس بات میں عقل والوں کے لئے کیسی کھلی نشانیاں ہیں؟ اس نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا اسی زمیں میں لوٹنا ہے اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ اٹھائے جاؤ گے۔

ہندوستان کے ایک مشہور معاصر عالم نے سورۃ طٰہٰ کی آیت اعطى كل شيء خلقه ثم هدى میں "ہدایت" کے معنی رہنمائی حواس و عقل تسلیم کرتے ہوئے مفسرین کو بے محل مورد طعن بنایا ہے کہ انہوں نے قرآن عزیز کی آیت زیر بحث کی روح کو نہ پاتے ہوئے غلطی سے یہاں بھی "ہدیٰ" کے معنی ہدایت دین و مذہب

کے لئے ہیں اور گویا صرف انہوں نے ہی سب سے پہلی مرتبہ اس روح کو پہچانا اور اس حقیقت پر آگاہی حاصل کی ہے حالانکہ چند مفسرین کے علاوہ قدیم اور جدید عام مفسرین اور محققین نے بھی اس مقام پر "ہدیٰ" کے وہی معنی بیان کئے ہیں جن کو اچھوتا اور طبع زاد بتایا گیا ہے۔[1]

علماء تفسیر کہتے ہیں کہ فرعون اور موسیٰ (علیہ السلام) کے ان مکالمات میں حضرت ہارون (علیہ السلام) دونوں کے درمیان ترجمان ہوتے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے دلائل و براہین کو نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ ادا فرماتے تھے۔

بہر حال مختلف مجالس میں مکالمت کا یہ سلسلہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کے درمیان جاری رہا فرعون حضرت موسیٰ و حضرت ہارون (علیہ السلام) کے روشن اور پر از صداقت دلائل سن سن کر اگرچہ پیچ و تاب کھاتا مگر لاجواب ہو جانے کی وجہ سے کوئی صورت نہیں بنتی تھی کہ موسیٰ (علیہ السلام) سے رستگاری حاصل کرے وہ خوب جانتا تھا کہ میری ربوبیت اور الوہیت کی بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ دلائل موسیٰ کی صداقت کے سامنے تار عنکبوت کی طرح تار تار ہو جاتی ہے اور درباری بھی اس کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لئے فرعون کیلئے یہ بات سخت ناقابل برداشت تھی اور جس قلمرو میں اس کے رعب شاہی اور دبدبۂ حکومت کے ساتھ ساتھ اس کی ربوبیت والوہیت کا جاہ و جلال بھی مانا جاتا ہو وہاں موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون (علیہ السلام) کی یہ جرأت حق اندر ہی اندر اس کو سخت خائف اور پریشان کر رہی تھی اس لئے فرعون نے اب سلسلہ بحث کو ختم کرنے کیلئے دوسرے طریقے اختیار کئے جن میں اپنی طاقت و قہرمانیت کا مظاہرہ مصری قوم کو موسیٰ اور بنی اسرئیل کے خلاف مشتعل کرنا اور "رب العالمین" سے جنگ کا اعلان کر کے اس بحث کا خاتمہ کر دینا شامل تھا چنانچہ اس نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَاأَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرِيْ (قصص)

اور فرعون نے کہا اے جماعت میں تمہارے لئے اپنے سوائے کوئی خدا نہیں جانتا۔

اور پھر (اپنے مسیر یا وزیر) ہامان کو حکم دیا۔

فَأَوْقِدْ لِيْ يَاهَامَانُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَل لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْ أَطَّلِعُ إِلٰى إِلٰهِ مُوْسٰى وَإِنِّيْ لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ ○

اے ہامان! اینٹیں پکا اور ایک بہت بلند عمارت بنا شائد اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کا پتہ لگا سکوں اور میں تو بلاشبہ اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَاهَامَانُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْ أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ ○ أَسْبَابَ السَّمَاوَاتِ فَأَطَّلِعَ إِلٰى إِلٰهِ مُوْسٰى وَإِنِّيْ لَأَظُنُّهُ كَاذِبًا وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ

---

[1]: ثم هدیٰ، الی طریق الانتفاع والارتفاق بما اعطاہ و عرفہ کیف یتوصل الی بقائہ و کمالہ اما اختیاراً کما فی الحیوانات او طبعاً کما فی الجماد الخ (روح المعانی جلد ۱۶، ص ۱۸۳)

سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ۝ (غافر)

فرعون نے کہا! اے ہامان! میرے لئے ایک بلند عمارت تیار کر تاکہ میں آسمانوں کی بلندیوں اوران کے ذرائع تک دسترس حاصل کرسکوں اوراس طرح موسیٰ کے خداکا حال معلوم کرسکوں اور میں تواس کو جھوٹا سمجھتا ہوں اسی طرح فرعون کے لئے اس کی بد عملی کوخوبصورت کردیا گیااور وہ راہ حق سے (بد عملی پراصرار کی وجہ سے)روک دیا گیااور فرعون کے مکر کا آخری انجام ہلاکت ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) موضح القرآن میں ارشاد فرماتے ہیں کہ آیت مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون دہری (ناستک) تھااور کتب تفسیر و تاریخ میں جو مصر قدیم کے تاریخی حوالجات نقل کئے گئے ہیں ان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ مصری دیوتاؤں کے پرستار تھے اوران کا سب سے بڑادیوتا آمن راع (سورج دیوتا) تھااور وہ خدائے واحد کے کسی معنی میں کبھی قائل نہ تھے بلکہ تمام کائنات کی تخلیق اوران کے ہر قسم کے معاملات و حادثات کا تعلق کواکب و سیارات اوران دیوتاؤں ہی سے متعلق سمجھتے تھے غالباً فرعون اوراس کی قوم کا عقیدہ ہندوستان کے جین مت کے قریب قریب تھا کیونکہ جینی بھی خدا کے منکر مگر دیوتاؤں کے پرستار ہیں۔

ہامان؟

ہامان کے متعلق قرآن عزیز نے کوئی تصریح نہیں کی کہ یہ کسی شخصیت کا نام ہے یا عہدہ اور منصب کا اور اس کا منصب و عہدہ فرعون کے دربار میں کیا تھااور نہ اس نے اس پر روشنی ڈالی کہ ہامان نے عمارت تیار کرائی یا نہیں اور فرعون نے پھراس پر چڑھ کر کیا کیا؟ کیونکہ یہ اس کے مقصد کیلئے غیر ضروری تھا تورات نے بھی اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں کیا بلکہ اس نے فرعون کے عمارت بنانے کے حکم کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا البتہ مفسرین نے یہ قصہ ضرور نقل کیا ہے کہ جب ہامان نے ایک بہت اونچا مینارہ تیار کراکے فرعون کواطلاع دی تو فرعون اس پر چڑھااور تیر کمان ہاتھ میں لے کر آسمان کی طرف تیر پھینکا، قدرت الٰہی کے فیصلہ کے مطابق وہ تیر خون آلود ہو کر واپس ہوا فرعون نے یہ دیکھ کر غرور اور شیخی کے ساتھ مصریوں سے کہا کہ لواب میں نے موسیٰ کے خداکا بھی قصہ تمام کردیا، واللہ اعلم۔

فرعون نے درباریوں، عام قبطیوں اور ہامان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنی شکست کو چھپانے کیلئے اگرچہ مسطورۂ بالا طریقہ اختیار کیا مگر وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ یہ ایک دھوکا ہے اور بس اس سے دلوں کی تسلی نہیں ہو سکتی اور بہت ممکن ہے کہ بہت سے مصری بھی اس کو سمجھتے ہوں تاہم درباریوں اور خواص و عوام میں ایک بھی ایسا رجل رشید نہ تھا جو جرأت و حق گوئی کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کر دیتااور رشد و ہدایت کی قبولیت کادروازہ واکرتا۔

فرعون کے دربار میں "آیات اللہ" کا مظاہرہ

غرض فرعون کا خدشہ بڑھتا ہی رہااس کو حق و باطل کی اس کشمکش میں اپنے لئے سخت خطرہ نظر آرہا تھا

اسلئے اس نے معاملہ کو صرف یہیں ختم نہیں کر دیا بلکہ ضروری سمجھا کہ اپنی سطوت و جبروت اور قہرمانیت کا اثر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام پر بھی ڈالے اور اس طرح ان کو مرعوب کر کے پیغام حق کے فرض سے ان کو باز رکھے، چنانچہ کہنے لگا "موسیٰ علیہ السلام! اگر تو نے میرے سوائے اور کسی کو معبود قرار دیا تو میں تجھ کو قید میں ڈال دونگا" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "اگر چہ میں تیرے پاس خدائے واحد کی جانب سے واضح نشان لے کر آیا ہوں تب بھی تیرے غلط راستے کو اختیار کر لوں؟ فرعون نے کہا جا اگر واقعی تو اس بارہ سچا ہے تو کوئی "نشان" دکھا۔"

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلٰهًا غَيْرِيْ لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ○ قَالَ أَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ○ قَالَ فَأْتِ بِهٖٓ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ (سورہ شعراء)

فرعون نے کہا اگر تو نے میرے سوائے کسی کو معبود بنایا تو میں تجھے ضرور قید کر دوں گا موسیٰ علیہ السلام نے کہا اگر چہ میں تیرے پاس ظاہر نشان لایا ہوں تب بھی؟ فرعون نے کہا اگر تو سچا ہے تو وہ نشان دکھا۔

قَالَ إِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَأْتِ بِهَآ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ (سورہ اعراف)

فرعون نے کہا اگر تو اپنے خدا کے پاس سے کوئی نشانی لایا ہے تو اس بارے میں سچا ہے تو لا وہ نشان دکھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور بھرے دربار میں فرعون کے سامنے اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈالا اسی وقت اس نے اژدہا کی شکل اختیار کر لی اور یہ حقیقت تھی۔ نظر کا دھوکا نہ تھا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر لیجا کر باہر نکالا تو وہ ایک روشن ستارہ کی طرح چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا یہ دوسری نشانی اور دوسرا معجزہ تھا۔

فرعون کے درباریوں نے جب اس طرح ایک اسرائیلی کے ہاتھوں اپنی قوم اور اپنے بادشاہ کی شکست کو دیکھا تو تلملا اٹھے اور کہنے لگے: بلا شبہ یہ بہت بڑا ماہر جادوگر ہے اور اس نے یہ سب ڈھونگ اسلئے رچایا ہے کہ تم پر غالب آکر تم کو تمہاری سرزمین (مصر) سے باہر نکال دے۔ لہٰذا اب ہم کو سوچنا ہے کہ اس کے متعلق کیا ہونا چاہیے آخر فرعون اور فرعونیوں کے باہمی مشورہ سے یہ طے پایا کہ فی الحال تو اس کو اور ہارون علیہ السلام کو مہلت دو اور اس دوران میں تمام قلمرو سے ماہر جادوگروں کو دار السلطنت میں جمع کرو اور پھر موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کراؤ بلا شبہ یہ شکست کھا جائے گا اور اسکے تمام ارادے خاک میں مل جائیں گے تب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: موسیٰ علیہ السلام ہم خوب سمجھ گئے کہ تو اس حیلہ سے ہم کو سرزمین مصر سے بے دخل کرنا چاہتا ہے لہٰذا اب تیرا علاج اس کے سوائے کچھ نہیں ہے کہ بڑے بڑے ماہر جادوگروں کو جمع کر کے تجھ کو شکست دلائی جائے اب تیرے اور ہمارے درمیان مقابلہ کے دن کا معاہدہ ہونا چاہیے اور پھر نہ ہم اس سے ٹلیں گے اور نہ تو وعدہ خلافی کرنا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کام کیلئے سب سے پہلا وقت "یوم الزینۃ" (جشن کا روز) ہے اس دن سورج بلند ہونے پر ہم سب کو میدان میں موجود ہونا چاہئے۔

فَأَلْقٰى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ○ وَنَزَعَ يَدَهٗ فَإِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ○

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيْمٌ ○ يُرِيْدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِّنْ أَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَأْمُرُوْنَ ○ قَالُوْٓا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَأَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حَاشِرِيْنَ ○ يَأْتُوْكَ بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِيْمٍ ○ (سورہ یونس)

پس موسیٰ نے اپنی لاٹھی کو ڈالا پھر اچانک وہ اژدہا تھی صاف اور ظاہر اور اس نے ہاتھ کو گریبان سے نکالا تو دیکھنے والوں کے لئے چمکتا ہوا روشن تھا فرعونیوں کی ایک جماعت نے کہا بلاشبہ یہ ماہر جادوگر ہے اس کا ارادہ ہے کہ تم کو تمہاری سرزمین (مصر) سے نکال دے پس تمہارا کیا مشورہ ہے انہوں نے کہا اس کو اور اس کے بھائی ہارون کو مہلت دو اور شہروں میں ایک جماعت کو بھیجو جو ماہر جادوگروں کو اکٹھا کر کے لائے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَائِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ○ فَلَمَّا جَآئَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ قَالَ مُوْسٰى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآئَكُمْ ط اَسِحْرٌ هٰذَا ط وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ○ قَالُوْا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ط وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ○ وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ○ (ع ۸ یونس)

پھر ہم نے ان رسولوں کے بعد موسیٰ اور ہارون کو بھیجا فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف وہ ہماری نشانیاں اپنے ساتھ رکھتے تھے مگر فرعون اور اس کے درباریوں نے گھمنڈ کیا ان کا گروہ مجرموں کا گروہ تھا پھر جب ہماری جانب سے سچائی ان میں نمودار ہو گئی تو کہنے لگے یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جادو ہے صریح جادو موسیٰ نے کہا تم سچائی کے حق میں جب وہ نمودار ہو گئی ایسی بات کہتے ہو؟ کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر تو کبھی کامیابی نہیں پا سکتے انہوں نے جواب میں کہا کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا اس سے ہمیں ہٹا دو اور ملک میں تم دونوں کے لئے سرداری ہو جائے؟ ہم تو تمہیں ماننے والے نہیں اور فرعون نے کہا لاؤ میرے پاس ہر قسم کے ماہر ساحر۔

قَالَ أَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يَامُوْسٰى ○ فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ أَنْتَ مَكَانًا سُوًى ○ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَأَنْ يُحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ○ (سورہ طٰہٰ)

اس نے کہا اے موسیٰ کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہمیں ہمارے ملک سے نکال باہر کرے؟ اچھا ہم بھی اسی طرح کے جادو کا کرتب لا دکھائیں گے ہمارے اور اپنے درمیان ایک دن (مقابلہ کا) مقرر کر دے نہ تو ہم اس سے پھریں نہ تو دونوں کی جگہ برابر ہوئی موسیٰ علیہ السلام نے کہا جشن کا دن تمہارے لئے مقرر ہوا دن چڑھے لوگ اکٹھے ہو جائیں۔

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان "یوم الزینہ" طے پا گیا اور فرعون نے اسی وقت اپنے

اعیان وارکان کے نام احکام جاری کر دیئے کہ تمام قلمرو میں جو مشہور اور ماہر جادوگر ہوں ان کو جلد از جلد دارالحکومت روانہ کردو۔

نجار مصری کہتے ہیں کہ غالباً "یوم الزینۃ" سے مصریوں کی عید کا وہ دن مراد ہے جو "وفاء النیل" کے نام سے مشہور ہے کیونکہ ان کے یہاں تمام عیدوں میں سب سے بڑی عید کا دن یہی تھا۔ (قصص الانبیاء)

ساحرین مصر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا زمانہ مصری تمدن کی جو تاریخ پیش کرتا ہے اس میں یہ بات بہت نمایاں نظر آتی ہے کہ مصری علوم وفنون میں "سحر" کو ایک مستقل علم وفن کی حیثیت حاصل تھی اور اسی بنا پر ساحرین کا رتبہ مصریوں میں بہت بڑا سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ ان کو شاہی دربار میں بھی بڑا رسوخ حاصل تھا اور جنگ وصلح پیدائش و وفات کی زائچہ کشی اور اہم سرکاری معاملات میں بھی انہیں کی جانب رجوع کیا جاتا تھا اور ان کے ساحرانہ نتائج کو بڑی وقعت دی جاتی تھی حتیٰ کہ مذہبی معاملات میں بھی ان کو اہم جگہ دی جاتی تھی قدیم شاہی مقبروں میں ممی (حنوط شدہ نعشوں) کے ساتھ جو کاغذات و دستاویزات برآمد ہوئی ہیں اور ان حجروں میں جو تصاویر و نقوش پائے جاتے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

قدیم قوموں کی عام گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ وہ جادو پر مذہبی حیثیت سے اعتقاد رکھتے اور اس کو اپنی مذہبی زندگی میں اثرانداز یقین کرتے تھے اور اسی اعتقاد کے پیش نظر وہ اس کو سیکھتے اور سکھاتے بھی تھے اور اس میں طرح طرح کی ایجادات واختراعات کرتے رہتے تھے چنانچہ بابل (عراق) مصر چین اور ہندوستان کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مصری قوم پر فرعون اور اس کے اعیان وارکان حکومت کا یہ جادو چل گیا کہ موسیٰ علیہ السلام جادوگر ہے اور یہ اپنے جادو کی مہارت کے اثر ورسوخ کو کام میں لاکر مصری حکومت پر قابض ہونا اور تم کو اس سے خارج کر دینا چاہتا ہے اور اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اپنے قلمرو کے ماہر جادوگروں کو جمع کر کے موسیٰ علیہ السلام کو شکست دیدی جائے اور اس کی اس چال کو پادر ہوا بنا دیا جائے موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس بات کو اس لئے غنیمت جانا کہ وہ خدائے تعالیٰ کے جس قدر نشانات (معجزات) فرعون اور قوم فرعون کو دکھا چکے تھے انہوں نے ان کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ یہ تو جادو اور سحر ہے لہٰذا اب جبکہ ساحروں اور جادوگروں سے مقابلہ کے بعد بھی خدا کا معجزہ غالب رہے گا تو ناچار ان کو صداقت اور حق کے سامنے جھکنا پڑیگا اور اقرار کئے بغیر کوئی چارہ نہ رہے گا نیز یہ سوچا کہ اگرچہ "وحی الٰہی" کے یقین اور روشن حجت و برہان کے ذریعہ آیات اللہ (معجزات) کی صداقت کا کافی یقین دلایا جا چکا ہے تاہم فرعون اور اعیان سلطنت ہمیشہ ان واقعات کو سحر اور جادو کہہ کہ عوام کو اصل حقیقت سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرتے رہے یا شدید حسد اور تعصب نے خود ان کو بھی حقیقی روشنی سے محروم رکھا پس اگر جشن کے روز خواص وعوام کے مجمع میں ساحر اور جادوگر عاجز ہو کر میری صداقت کا اقرار کرلیں تو پھر کسی کو بھی لب کشائی کا موقع نہ رہے گا اور برسرعام حق کا مظاہرہ منصب تبلیغ کیلئے بہترین ذریعہ ثابت ہوگا۔

لغت میں "سحر" کے معنی امر خفی اور پوشیدہ چیز کے ہیں چنانچہ صبح کے اول وقت کو "سحر" اسلئے کہتے ہیں کہ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نمودار نہیں ہوئی اور قدرے تاریکی ہے اور علمی اصطلاح میں ایسے عجیب و غریب امور کا نام ہے جنکے وجود پذیر ہونے کے اسباب نظر سے اوجھل ہوں اور بادی النظر میں محسوس نہ ہوتے ہوں۔

اعلم ان لفظ السحر فی عرف الشرع مختص بکل امر یخفی سببه و یتخیل علی غیر حقیقة۔ الخ (تفسیر کبیر جلد اص ۴۲۰)

واضح رہے کہ لفظ "سحر" شریعت کی اصلاح میں ایسے امر کیلئے مخصوص ہے جس کا سبب پوشیدہ ہو اور وہ اصل حقیقت کے خلاف خیال میں آنے لگے۔

سحر کی حقیقت کچھ ہے یا وہ محض نظر کا دھوکا اور بے حقیقت شے ہے؟ اس کے متعلق جمہور علماء اہل سنت کی یہ رائے ہے کہ سحر واقعی ایک حقیقت ہے اور مضرت رساں اثرات رکھتا ہے حق تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ اور مصلحت کاملہ کے پیش نظر اس میں اسی طرح مضر اثرات رکھ دیئے ہیں جس طرح زہر میں یا دوسری نقصان رساں ادویہ میں، یہ نہیں ہے کہ "سحر قدرت الٰہی" سے بے نیاز ہو کر "العیاذ باللہ" خود موثر بالذات ہے کیونکہ یہ عقیدہ تو کفر خالص ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہؒ، ابو بکر جصاصؒ صاحب احکام القرآن ابو اسحٰق اسفرائنی شافعی علامہ ابن حزم ظاہریؒ اور معتزلہ کہتے ہیں کہ "سحر" کی حقیقت شعبدۂ نظر بندی، اور فریب خیال کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے بلا شبہ وہ ایک باطل اور بے حقیقت شے ہے چنانچہ ابو بکر رازیؒ فرماتے ہیں۔

و متی اطلق فهو اسم لکل امرٍ مموه باطل لا حقیقة لهٗ و لا ثبات۔

(احکام القرآن جلد ۱ ص ۴۸)

اور جب "سحر کو کسی قید کے بغیر استعمال کیا جائے تو وہ ایک ایسے امر کا نام ہے جو محض دھوکا اور باطل ہو کہ جس کی اس سے زیادہ نہ کوئی حقیقت ہو اور نہ اس کو ثبات حاصل ہو۔"

اور حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

و قد ذکر الوزیر ابو المظفر یحیٰی بن محمد بن هبیرة فی کتابه "الاشراف فی مذهب الاشراف" بابًا فی السحر فقال اجمعوا علی ان السحر له حقیقة لهٗ عندهٗ۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۱۴۷)

اور وزیر ابو المظفر یحیٰی بن محمد ہبیرہ نے اپنی کتاب "الاشراف فی مذہب الاشراف" میں ایک باب سحر کے متعلق بھی رکھا ہے اس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ سحر کی بھی حقائق کی طرح ایک حقیقت ہے مگر امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ وہ قطعاً بے حقیقت شے ہے۔

قال ابو عبد اللّٰه القرطبی وعندنا ان السحر حق وله حقیقة و یخلق اللّٰه عنده ما یشاء خلافاً للمعتزلة و ابی اسحق الاسفرائینی من الشافعیة حیث قالوا

انه تمويه او تخييل۔ الخ (جلد ۱ ص ۱٤٧)

ابو عبداللہ قرطبی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سحر حقیقت ہے اور ایک واقعی شے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے مگر معتزلہ اور شوافع میں سے ابو اسحٰق اسفرائنی اس قول کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ سحر محض فریب نظر اور خیال بندی کا نام ہے۔

اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ تحریر فرماتے ہیں۔

واختلف فی السحر فقیل هو تخییل فقط ولا حقیقة لهٗ و هذا اختیار ابی جعفر الاستر ابادی من الشافعیة و ابی بکر الرازی من الحنفیة و ابن حزم الظاهری و طائفة قال النووی و الصحیح ان لهٗ حقیقة و به قطع الجمهور و علیه عامة العلماء۔

(فتح الباری جلد ۱۰ ص ۱۸۲)

اور سحر کے متعلق اختلاف ہے بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ فقط تخیل کا نام ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ ابو جعفر شافعی ابو بکر رازی حنفی اور ابن حزم ظاہری اور ایک چھوٹی جماعت کا خیال ہے اور نووی فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ سحر حقائق میں سے ایک حقیقت ثابتہ ہے اور جمہور اسی پر یقین رکھتے ہیں اور عام علماء کا یہی مسلک ہے۔

اور جو علماء سحر کو حقیقت تسلیم کرتے ہیں ان کے درمیان پھر یہ اختلاف رائے ہے کہ کیا خدائے تعالیٰ نے سحر میں یہ تاثیر بخشی ہے کہ وہ حقائق اور ماہیات میں بھی انقلاب کر دے یا مضرت رساں اشیاء کی طرح صرف نقصان دہ ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اس کے اثر سے انسان کی حقیقت گھوڑے میں تبدیل ہو جائے یا گدھا مثلاً انسان ہو جائے پس ایک چھوٹے سے گروہ کا خیال یہ ہے کہ اس کے اندر انقلاب ماہیت کی تاثیر بھی ودیعت ہے اور جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس میں یہ تاثیر قطعاً ودیعت نہیں اور سحر کے ذریعہ کسی بھی ماہیت کا انقلاب نہیں ہوتا بلکہ اس مرحلہ پر وہ محض نظر بندی اور قوت متخیلہ کی شعبدہ بازی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا چنانچہ حافظ ابن حجرؒ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لکن محل النزاع هل یقع بالسحر انقلاب عین اولا فمن قال انه تخییل فقط منع ذلك و من قال ان لهٗ حقیقة اختلفوا هل لهٗ تاثیر فقط بحیث یغیر المزاج فیکون نوعًا من الامراض او ینتهی الی الاحالة بحیث یصیر الجماد حیواناً مثلاً و عکسه فالذی علیه الجمهور هو الاوّل و ذهبت طائفة قلیلة الی الثّانی۔ الخ

(فتح الباری جلد ۱ ص ۱۸٤، احکام القرآن جلد ۱ ص ۵۰)

لیکن محل نزاع یہ امر ہے کہ سحر سے ذات کا انقلاب ہو جاتا ہے یا نہیں پس جس شخص نے یہ کہا ہے کہ محض تخیل کا نام ہے وہ تو انقلاب کے منکر ہیں اور جو سحر کو حقیقت مانتے ہیں وہ اس بارہ میں مختلف الرائے ہیں آیا سحر کی تاثیر اسی حد تک ہے کہ مزاج میں اس قسم کے تغیرات پیدا کر دے جس طرح امراض میں ہوا کرتا ہے اور وہ بھی ایک مرض شمار ہو یا اس کی تاثیر اس سے زیادہ ہے کہ ایک شے کی حقیقت کو بدل ڈالے مثلاً جماد کو حیوان بنا دے یا اسکے عکس کر دے پس جمہور پہلی بات کے قائل ہیں اور ایک چھوٹی سی جماعت دوسری بات کی!

اور اس تمام ایں و آں کے بعد ساحرین فرعون کیا س ساحرانہ مظاہرہ کے متعلق جو جشن کے دن حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں کیا گیا حافظ ابن حجر تصریح کرتے ہیں کہ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ محض تخییل اور تمویہ کی حد تک تھا اور ابو بکر حصاصؒ اور ابن حجرؒ دونوں یہ تفصیل دیتے ہیں کہ ساحرین فرعون کی لاٹھیاں اور چمڑے کی رسیاں سانپ نہیں بن گئی تھیں بلکہ ان کے اندر پارہ بھر دیا گیا تھا اور جس زمین میں یہ مظاہرہ کیا گیا تھا اس کو کھوکھلا کر کے اس کے اندر آگ بھر دی گئی تھی چنانچہ وقت معین پر نیچے کی گرمی سے پارہ میں حرکت پیدا ہوگئی اور وہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ کی طرح دوڑتی نظر آنے لگیں۔

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں "سحر" پر بحث کرتے ہوئے لغوی معنی کے پیش نظر ان تمام اشیاء کو بھی اقسام سحر میں شمار کرایا ہے جو عام نگاہوں میں تعجب خیز اور حیرت زا سمجھے جاتے ہیں مثلاً مسمریزم، ہپناٹزم، تعویذات، حیرت زا نقاشی اور سائینس کی ایجادات اور دنیا کے مختلف عجائبات حتیٰ کہ مقرر کی جادو بیانی کو بھی اس عمومیت میں شامل کر لیا ہے ایک موقعہ پر نبی اکرم ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ہے:

ان من البیان لسحرا۔ (بخاری جلد ۲ باب السحر)

بلاشبہ بعض بیان جادو ہوتے ہیں

پس یہ واضح رہے کہ ان اقسام کا اس سحر سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں ہے جو مذہب اور اخلاق کی نگاہ میں مذموم گمراہی یا کفر سمجھا جاتا ہے۔

سحر اور مذہب

فقہائے اسلام نے سحر کے متعلق تصریح کی ہے کہ جن اعمال سحر میں شیاطین ارواح خبیثہ اور غیر اللہ سے استعانت کی جائے اور ان کو حاجت روا قرار دے کر منتروں کے ذریعہ ان کی تسخیر سے کام لیا جائے تو وہ شرک کے مترادف ہے اور اس کا عامل کافر ہے۔

اور جن اعمال میں ان کے علاوہ دوسرے طریقے استعمال کئے جائیں اور ان سے دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے ان کا مرتکب حرام اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے۔

قرآن عزیز میں حضرت سلیمان ؑ کے واقعہ میں مذکور ہے:

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ

اور سلیمان نے کفر نہیں کیا لیکن شیاطین نے کفر کیا سکھاتے تھے وہ لوگوں کو سحر۔ (فتح الباری جلد ۱۰ ص ۱۸۳)

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم قال اجتنبو الموبقات الشرك باللّٰہ و السحر۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مہلک باتوں سے بچو یعنی شرک سے اور جادو سے۔ (فتح الباری جلد ۱۰ ص ۱۸۳)

یہ تفصیل ہے ان اقوال کی جو سحر کے متعلق علماءِ سلف و خلف میں دائر رہے ہیں۔ ہم نے فریقین کے دلائل اور ان سے متعلق معرکۃ الآراء مباحث کو اس مقام پر قصداً ترک کر دیا ہے۔ اسلئے کہ اس حیثیت سے اس مسئلہ کو چھیڑنا ایسی طوالت کا باعث ہے۔ جو ہم کو کتاب کے مقصد سے دور لے جاتا ہے اور اختصار کے ساتھ بیان کرنا بجائے فائدہ کے نقصان دہ نظر آتا ہے۔

اور حافظ ابن حجرؒ "حدیث سحر" پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں

قال النووی عمل السحر حرام وهو من الكبائر بالاجماع و قد عده النبی صلی الله علیه و سلم من السبع الموبقات و منه مایكون كفراً و منه لا یكون كفراً بل معصیة كبیرة فان كان فیه قول او فعل یقتضی الكفر فهو كفر و الافلا و اما تعلمه و تعلیمه فحرام۔ الخ (ایضا)

نوویؒ کہتے ہیں عمل سحر حرام ہے اور وہ بالاجماع کبائر میں سے ہے اور نبی کریم ﷺ نے اسکو سات مہلک چیزوں میں سے شمار کیا ہے اور سحر کی بعض صورتیں کفر ہیں اور بعض کفر تو نہیں ہیں مگر سخت معصیت ہیں پس اگر سحر کا کوئی منتر یا کوئی عمل کفر کا مقتضی ہے تو وہ کفر ہے ورنہ نہیں بہر حال سحر کا سیکھنا اور سکھانا قطعاً حرام ہے۔

معجزہ اور سحر میں فرق

علماء اسلام میں یہ بحث ہمیشہ سے معرکۃ الآراء رہی ہے کہ سحر اور معجزہ میں کیا فرق ہے؟ایک شخص یہ کیسے اندازہ لگائے کہ یہ نبی و پیغمبر کا معجزہ ہے یا ساحر اور جادوگر کا سحر اور جادو؟اس سلسلہ میں جو اہم علمی دلائل و براہین پیش کئے گئے ہیں اس کے لئے علم کلام کی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے خصوصاً شیخ الاسلام ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) کی کتاب النبوات اور شیخ محمد رحمہ اللہ سفارینی کی شرح عقیدہ سفارینی قابل مطالعہ ہیں البتہ اس مقام پر ایک سہل الوصول اور آسان دلیل پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نبی اور رسول کا اصل معجزہ اس کی وہ تعلیم ہوتی ہے جو وہ گم گشتگان راہ حق اور بھٹکی ہوئی قوموں کی ہدایت کیلئے نسخہ کیمیا اور دینی و دنیوی فلاح و کامرانی کیلئے بے نظیر قانون کی شکل میں پیش کرتا ہے یعنی "کتاب اللہ" لیکن جس طرح ارباب علم و حکمت اسکے لائے ہوئے علوم و حکم اور بتائی ہوئی رشد و ہدایت کی صداقت و کمال کو پرکھتے ہیں۔ اسی طرح عام انسانی دنیا کی سرشت و نہاد اس پر قائم ہے کہ وہ سچائی اور صداقت کیلئے بھی بعض ایسی چیزوں کے خواہش مند ہوتے ہیں لانے والے کے روحانی کرشموں سے تعلق رکھتی ہوں اور جن کے مقابلہ سے تمام دنیوی طاقتیں عاجز ہو جاتی ہوں کیونکہ ان کا مبلغ علم کسی صداقت کیلئے اسی کو معیار قرار دیتا ہے۔

اس لئے "سنۃ اللہ" یہ جاری رہی ہے کہ وہ انبیاء و رسل کو دین حق کی تعلیم و پیغام کے ساتھ ایک یا چند "نشانات" (معجزات) بھی عطا کرتا ہے اور جب وہ دعویٰ نبوت کے ساتھ بغیر اسباب کے ایسا "نشان" دکھاتا ہے جس کا کوئی دنیوی طاقت مقابلہ نہیں کر سکتی تو اس کا نام "معجزہ" ہوتا ہے۔

اور اسی لئے یہ بھی "سنۃ اللہ" ہے کہ کسی نبی و رسول کو جو معجزہ یا نشان دیا جاتا ہے وہ اسی نوع میں سے ہوتا ہے جس میں اس قوم کو جس کو کہ سب سے پہلے اس پیغمبر نے خطاب کیا ہے "درجہ کمال" حاصل ہو۔ اور وہ اس کے تمام دقائق سے بخوبی آگاہ ہو تاکہ اس کو یہ سمجھنے میں آسانی ہو سکے کہ پیغمبر کا یہ نشان انسانی اور بشری طاقت سے بالاتر قوت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اگر تعصب اور ہٹ دھرمی حائل نہ ہو تو وہ بے ساختہ یہ اقرار کر لے کہ:

این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اور اسی طرح ہر فرد بشر پر خدا کی حجت تمام ہو جائے۔

پس معجزہ در اصل براہ راست خدائے تعالیٰ کا فعل ہے جو بغیر اسباب کے ایک صادق نبی کی صداقت کے لئے وجود میں آتا ہے اور وہ کسی اصول و قوانین پر مبنی نہیں ہوتا کہ ایک فن کی طرح سیکھا جا سکے اور نبی ہر وقت اسکے کر دکھانے پر قادر ہو تاوقتیکہ مخالفین صداقت کے سامنے بطور تحدی (چیلنج) اسکو دکھانے کی ضرورت پیش نہ آجائے، سو جب وہ اہم وقت آتا ہے اور "نبی" خدا سے رجوع کرتا ہے تو خدائے تعالیٰ کی جانب سے اسکو کر دکھانے کی قوت عطا ہو جاتی ہے بخلاف سحر اور جادو کے کہ وہ ایک فن ہے کہ جس کو اسکے اصول و قوانین کی پابندی کے ساتھ ہر فن داں ساحر ہر وقت کام میں لا سکتا ہے۔ اسکے اسباب اگرچہ عام نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن اس فن کے تمام واقف کار اس سے واقف ہوتے ہیں اسی لئے وہ دوسرے علوم فنون کی طرح مدون و مرتب فن ہے جس کو مصریوں چینیوں، اور ہندیوں نے بہت فروغ دیا اور حد کمال کو پہنچایا۔

یہ مسئلہ کی علمی حیثیت ہے کہ جس سے معجزہ اور سحر کی حدود قطعاً جدا اور ممتاز ہو جاتی ہیں رہا حس اور مشاہدہ کا معاملہ تو معجزہ اور سحر میں یہ فرق ہے کہ ساحر کی عام زندگی خوف و دہشت ایذا رسانی اور بد عملی سے وابستہ ہوتی ہے اور لوگ اس نظر سے ساحر سے خوف کھاتے ہیں یا اس کے سامنے مرعوب ہو جاتے ہیں بخلاف نبی اور رسول کے کہ اس کی تمام زندگی صداقت خلوص، مخلوق خدا کی ہمدردی و غمگساری، اور تقویٰ و طہارت سے وابستہ ہوتی ہے اور اس کا کیرکٹر بے داغ اور صاف اور روشن ہوتا ہے اور وہ معجزہ کو پیشہ نہیں بناتا بلکہ خاص اہم موقع پر صداقت اور حق کی حمایت میں اس کا مظاہرہ کرتا ہے اور وہ ایسے وقت معجزہ دکھاتا ہے جبکہ دشمن بھی اس کی عصمت و صداقت اور کیرکٹر کی پاکیزگی کے پہلے سے معترف ہوتے ہیں مگر اس کی دعوت کو یا شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یا جحود وانکار کے نقطۂ نظر سے اور پھر اس سے معجزہ کے طالب ہوتے ہیں نیز اگر سحر اور معجزہ کا مقابلہ آن پڑے تو معجزہ غالب رہے گا اور اعلیٰ سے اعلیٰ سحر بھی مغلوب و عاجز اور اس کا عکس محال اور ناممکن ہے چنانچہ ساحرین اور انبیاء و رسل کے مقابلہ کی تاریخ اس کی شاہد عدل ہے۔

الحاصل موسیٰ علیہ السلام کو عصاء اور ید بیضا کے نشانات (معجزہ) اسلئے عطا کئے گئے کہ ان کے زمانے میں مصر سحر اور جادو کا مرکز تھا اور فن سحر شباب پر، اور مصریوں نے تمام دنیا کے مقابلہ میں اس کو اوج کمال تک پہنچا دیا تھا۔

لہٰذا "سنۃ اللہ" کا تقاضا تھا کہ ایسے زمانہ میں موسیٰ علیہ السلام کو ایسے نشانات (معجزات) عطا کئے جائیں جو اسی نوع سے متعلق ہوں تاکہ جب انکار پر اصرار حد سے بڑھ جائے اور معاندین و مخالفین اپنے محیر العقول سحر اور جادو کے ذریعہ ان کے مقابلہ پر آجائیں تو خدا کے نشان (معجزات و آیات اللہ) مخالفوں کو یہ باور کرا دیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جو قوت و طاقت ہے وہ انسانی صنعتوں اور عجوبہ کاریوں سے بلند اور بشری دسترس سے باہر ہے اور اس طرح عوام و خواص کو ان کی صداقت اور ان کے "من اللہ" ہونے کا یقین آجائے اور خواہ زبان اقرار کرے یا نہ کرے لیکن ان کا عجز اور ان کی درماندگی علی رؤس الاشہاد ان کے دلوں کے اقرار کی شہادت دینے لگے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساحروں کا مقابلہ

بہر حال یوم جشن آپہنچا میدان جشن میں تمام شاہانہ کروفر کے ساتھ فرعون تخت نشین ہے اور درباری بھی حسب مراتب بیٹھے ہیں اور لاکھوں انسان حق و باطل کے معرکہ کا نظارہ کرنے کو جمع ہیں ایک جانب مصر کے مشہور جادوگروں کا گروہ اپنے سازو سامان سحر سے لیس کھڑا ہے اور دوسری جانب خدا کے رسول حق کے پیغامبر سچائی اور راستی کے پیکر حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت ہارون علیہ السلام کھڑے ہیں فرعون بہت مسرور ہے اور اس یقین پر کہ ساحرین مصران دونوں کو جلد ہی شکست دے دیں گے۔ ساحروں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔ اگر تم نے موسیٰ کو شکست دیدی تو نہ صرف انعام واکرام سے مالامال کئے جاؤ گے بلکہ میرے دربار میں خاص جگہ پاؤ گے، ساحر بھی اپنی کامیابی کے یقین پر فرعون سے اپنے اعزاز واکرام کا وعدہ لے رہے ہیں اور مستقبل کے تصور سے بہت شاداں اور مسرور ہیں۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوٓا إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِيْنَ ○ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ○ (اعراف)

اور جادوگر فرعون کے پاس آئے اور کہنے لگے کیا اگر وہ موسیٰ علیہ السلام پر غالب آجائیں تو ہمارے انعام واکرام ہے؟ فرعون نے کہا ضرور' اور یہی نہیں بلکہ مقربین بارگاہ شاہی بنو گے۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ○ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ○ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ إِنْ كَانُوْا هُمُ الْغَالِبِيْنَ ○ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ أَئِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِيْنَ ○ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ○ (سورہ شعراء)

پھر وعدہ کے دن جادوگر جمع ہو گئے اور لوگوں سے کہا گیا کہ تم (اس میدان میں جمع ہو گے شاید ہم جادوگروں کی پیروی کریں اگر وہ غالب رہیں، سو جب جادوگر آگئے تو انہوں نے فرعون سے کہا کیا ہمارے لئے انعام ہے اگر ہم غالب رہیں؟ (فرعون نے کہا ہاں، اور تم اس صورت میں (ہمارے) مقربین میں سے ہو گے۔

جادوگروں نے جب اس طرف سے اطمینان کر لیا تو اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے مگر قبل اس کے کہ ایک دوسرے کو چیلنج کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تبلیغ ادا فرماتے ہوئے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا: تمہاری حالت پر سخت افسوس ہے تم کیا کرتے ہو؟ تم ہم کو جادوگر کہہ کر خدا پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ مجھ کو ڈر ہے کہیں وہ تم کو اس بہتان طرازی کی سزا میں عذاب دے کر تم کو جڑ سے نہ اکھڑا پھینکے کیونکہ جس کسی نے بھی بہتان باندھا ہو نامراد ہی رہا لوگوں نے یہ سنا تو آپس میں ردو کد شروع کر دی اور سرگوشیاں کرنے لگے اور درباریوں نے یہ حال دیکھا تو یہ جادوگروں کو مخاطب کر کے کہنے لگے یہ دونوں بھائی بلاشبہ جادوگر ہیں یہ چاہتے ہیں کہ جادو کے زور سے تم کو تمہارے وطن سے نکال دیں اور تم پر غلبہ کر لیں تم اپنا کام شروع کر دو اور پرے باندھ کر

موسیٰ کے مقابلہ میں ڈٹ جاؤ آج جو بھی غالب آجائے گا وہی کامیاب ثابت ہوگا۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ۝ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ۝ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ۝ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ۝ (سورہ طٰہٰ)

موسیٰ علیہ السلام نے کہا افسوس تم پر دیکھو اللہ پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی عذاب بھیج کر تمہاری جڑا کھاڑ دے جس کسی نے جھوٹ بات بنائی وہ ضرور نامراد ہوا بس لوگ آپس میں ردوکد کرنے لگے اور پوشیدہ سرگوشیاں شروع ہو گئیں پھر (درباری) بولے یہ دونوں بھائی ضرور جادوگر ہیں یہ چاہتے ہیں اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال باہر کریں اور پھر تمہارے شرف اور تمہاری عظمت کے مالک ہو جائیں پس اپنے سارے داؤں جمع کرو اور پرا باندھ کر ڈٹ جاؤ جو آج بازی لے گیا وہی کامیاب ہوگا۔

جادوگروں نے آگے بڑھ کر موسیٰ علیہ السلام سے کہا موسیٰ! اس قصہ کو چھوڑ اور یہ بتا کہ ابتداء تیری جانب سے ہو گی یا ہماری جانب سے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ ان پر اس تنبیہ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تو فرمایا کہ ابتداء تم ہی کرو اور اپنے کمال فن کی پوری حسرت نکال لو چنانچہ ساحروں نے اپنی رسیاں بان اور لاٹھیاں زمین پر ڈالیں جو سانپ اور اژدہے کی شکل میں دوڑتی نظر آنے لگیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو دل میں خوف و ہراس محسوس کیا کہ کہیں لوگ اس مظاہرہ سے متاثر نہ ہو جائیں اور ساحروں کے سحر کو حقیقت نہ سمجھ لیں کیونکہ اگر ایسا ہوا تو یہ تاثر اور رعب قبول حق کیلئے سد راہ بن جائے گا تب خدائے تعالیٰ نے ان کو مطمئن فرمایا اور وحی کے ذریعہ مطلع کیا کہ موسیٰ علیہ السلام خوف نہ کھاؤ ہمارا وعدہ ہے کہ تم ہی غالب رہو گے اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈالو موسیٰ علیہ السلام نے جب لاٹھی کو ڈالا تو اژدہا بن کر اس نے ساحروں کے تمام شعبدوں کو نگل لیا اور تھوڑی سے دیر میں سارا میدان صاف ہو گیا اور اس طرح ساحر اپنے سحر میں ناکامیاب رہے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ۝ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۝ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْٓا اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝ (سورہ طٰہٰ)

جادوگروں نے کہا اے موسیٰ علیہ السلام! تم پہلے اپنی لاٹھی پھینکو یا پھر ہماری طرف سے پہل ہو موسیٰ علیہ السلام نے کہا نہیں تم ہی پہلے پھینکو چنانچہ انہوں نے اپنا کرتب دکھایا اور اچانک موسیٰ علیہ السلام کو ان کے جادو کی وجہ سے ایسا دکھائی دیا کہ ان کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ کی طرح دوڑ رہی ہیں! موسیٰ علیہ السلام نے دل میں ہراس

محسوس کیا (کہ اس منظر سے لوگ متاثر نہ ہو جائیں) ہم نے کہا "اندیشہ نہ کر تو ہی غالب رہے گا تیرے دائیں ہاتھ میں جو لاٹھی ہے فوراً پھینک دے، جادوگروں کی تمام بناوٹیں نگل جائے گی انہوں نے جو کچھ کیا ہے محض جادوگروں کا فریب ہے اور جادوگر کسی راہ سے آئے کبھی کامیابی نہیں پا سکتا۔"

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ○ قَالَ اَلْقُوْا فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ○ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ○ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ○ (اعراف)

جادوگروں نے کہا اے موسیٰ! یا تم اپنی لاٹھی پھینکو یا پھر ہم پھینکیں موسیٰ علیہ السلام نے کہا تم ہی پہلے پھینکو پھر جب جادوگروں نے جادو کی بنائی ہوئی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں تو لوگوں کی نگاہیں جادو سے ماردیں اور اپنے کرتبوں سے ان میں دہشت پھیلا دی اور بہت بڑا جادو بنانے والا اور اس وقت ہم نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی کی کہ تم بھی اپنی لاٹھی ڈال دو جونہی اس نے لاٹھی پھینکی تو اچانک کیا ہوا کہ جو کچھ جھوٹی نمائش جادوگروں کی تھی سب اس نے نگل کر نابود کر دی پس حق قائم ہو گیا اور وہ جو عمل کر رہے تھے باطل ہو کر رہ گیا پس اس موقعہ پر وہ مغلوب ہو گئے اور ذلیل ہو کر بولے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ○ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ○ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ○ (یونس)

جب جادوگر آموجود ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا "تمہیں جو کچھ میدان میں ڈالنا ہے ڈال دو جب انہوں نے جادو کی رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دیں تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا تم جو کچھ بنا کر لائے ہو یہ جادو ہے اور یقیناً اسے اللہ ملیا میٹ کر دے گا، اللہ کا یہ قانون ہے کہ وہ مفسدوں کا کام نہیں سنوارتا، وہ حق کو اپنے احکام کے مطابق ضرور ثابت کر دکھائے گا، اگرچہ مجرموں کو ایسا ہونا پسند نہ آئے"۔

جادوگروں نے جو کہ اپنے فن کے ماہر و کامل تھے جب عصاء موسیٰ علیہ السلام کا یہ کرشمہ دیکھا تو وہ حقیقت حال سمجھ گئے اور جس کو اس وقت تک فرعون اور اس کے درباری لوگ پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے رہے تھے وہ اس کو نہ چھپا سکے اور انہوں نے برسر مجلس یہ اقرار کر لیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ عمل جادو سے بالاتر خدا کا معجزہ ہے اس کا سحر سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور پھر فوراً سجدہ میں گر پڑے اور اعلان کر دیا کہ ہم موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے پروردگار پر ایمان لے آئے کیوں کہ وہی رب العلمین ہے۔

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ○ (سورہ طٰہ)

پس سب جادوگر سجدہ میں گر گئے اور کہنے لگے ہم ہارون علیہ السلام اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے۔

وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِيْنَ ○ قَالُوْا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ رَبِّ مُوْسٰى وَهَارُوْنَ ○

(سورہ اعراف)

اور سب جادوگر سجدہ میں گر پڑے کہنے لگے ہم تو جہانوں کے پروردگار پر ایمان لے آئے کو، جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے۔

فرعون نے جب یہ دیکھا کہ میرا تمام دام فریب تار تار ہو گیا اور موسیٰ کو شکست دینے کی جو آخری تھی وہ بھی منہدم ہو گئی اب کہیں ایسا نہ ہو کہ مصری عوام بھی ہاتھ سے جائیں اور موسیٰ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو اس نے مکر و فریب کا دوسرا طریقہ اختیار کیا اور ساحروں سے کہنے لگا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ تم سب کا استاذ ہے اور تم سب نے آپس میں سازش کر رکھی ہے تب ہی تو میری رعایا ہوتے ہوئے میری اجازت کے بغیر تم نے موسیٰ کے خدا پر ایمان لانے کا اعلان کر دیا، اچھا! میں تم کو عبرتناک سزا دوں گا تاکہ آئندہ کسی کو ایسی غداری کی جرأت نہ ہو پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں الٹے سیدھے کٹواؤں گا اور پھر سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔

قَالَ آمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ إِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ أَيُّنَا أَشَدُّ عَذَابًا وَّأَبْقٰى ○ (سورہ طہ)

فرعون نے کہا "تم بغیر میرے حکم کے موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے اچھا دیکھو میں کیا کرتا ہوں تمہارے ہاتھ پاؤں الٹے سیدھے کٹواؤں گا اور کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا پھر تمہیں پتہ چلے گا ہم دونوں میں کون سخت عذاب دینے والا ہے اور کس کا عذاب دیرپا ہے۔"

قَالَ فِرْعَوْنُ آمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ إِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَا أَهْلَهَا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○ (سورہ اعراف)

فرعون نے کہا مجھ سے اجازت لئے بغیر تم موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ ایک پوشیدہ تدبیر ہے جو تم نے مل جل کر شہر میں کی ہے تاکہ اس کے باشندوں کو اس سے نکال باہر کرو اچھا تھوڑی دیر میں تمہیں اس کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔

مگر سچا ایمان جب کسی کو نصیب ہو جاتا ہے خواہ وہ ایک لمحہ کا ہی کیوں نہ ہو وہ ایسی بے پناہ روحانی قوت پیدا کر دیتا ہے کہ کائنات کی کوئی زبردست سے زبردست طاقت بھی اس کو مرعوب نہیں کر سکتی، دیکھئے وہی جادوگر جو فرعون سے تھوڑی دیر پہلے انعام و اکرام اور عزت و جاہ کی آرزوئیں اور التجائیں کر رہے تھے ایمان لانے کے بعد ایسے نڈر اور بے خوف ہو گئے کہ ان کے سامنے سخت سے سخت مصیبت اور دردناک عذاب بھی ہیچ ہو کر رہ گیا اور کوئی دہشت بھی ان کے ایمان کو متزلزل نہ کر سکی اور انہوں نے فرعون کی موجودگی ہی میں بے دھڑک اسلام کا اعلان کر دیا اور جب انہوں نے فرعون کی ان جابرانہ دھمکیوں کو سنا تو کہنے لگے:

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ أَنْتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ○ إِنَّآ آمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطَايَانَا وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى ○

انہوں نے کہا ہم یہ کبھی نہیں کر سکتے کہ سچائی کی جو روشن دلائل ہمارے سامنے آگئیں اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اس سے منہ موڑ کر تیرا حکم مان لیں تو جو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر گذر تو زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ دنیا کی اس زندگی کا فیصلہ کر دے ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے کہ وہ ہماری خطائیں بخش دے خصوصاً جادوگری کی خطا کہ جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا ہمارے لئے اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔

قَالُوْا لَا ضَيْرَ إِنَّآ إِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ○ إِنَّا نَطْمَعُ أَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطَايَانَآ أَنْ كُنَّآ أَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (سورہ شعراء)

جادوگروں نے کہا (تیرا یہ عذاب ہمارے لیئے) کوئی نقصان کی بات نہیں بلاشبہ ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جانیوالے ہیں بیشک ہم اسکے حریص ہیں کہ وہ ہماری خطاؤں کو بخش دے کیونکہ ہم ہوگئے مومنوں میں اول۔

غرض حق و باطل کی اس کشمکش میں فرعون اور اس کے اعیان وارکان کو سخت شکست اٹھانی پڑی اور وہ برسر عام ذلیل اور رسوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خدا کا وعدہ پورا ہوا اور کامیابی کا سہرا ان ہی کے سر رہا۔

اس صورت حال کو دیکھ کر جادوگروں کے علاوہ اسرائیلی نوجوانوں میں سے بھی ایک مختصر جماعت مسلمان ہو گئی مگر وہ فرعون کے ظلم و ستم کی وجہ سے اعلان نہ کر سکی کیونکہ مسلمانوں کے ساتھ اس کی عام قاہرانہ ستم کیشیوں اور ظلم پرستیوں کے علاوہ اس وقت کی ذلت نے اس کو اور زیادہ غضبناک بنادیا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تلقین فرمائی کہ اب مومن ہونے کے بعد تمہارا سہارا صرف خدا پر ہونا چاہیے جماعت مومنین نے اس پر لبیک کہا اور وہ خدا کے سامنے گڑ گڑا کر رحمت و مغفرت کی دعائیں اور ظالموں کے عذاب و معصیت سے محفوظ رہنے کی التجائیں کرنے لگے۔

فَمَا آمَنَ لِمُوْسٰى إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ أَنْ يَّفْتِنَهُمْ وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ○ وَقَالَ مُوْسٰى يَاقَوْمِ إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْآ إِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ○ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ ○ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ ○ (سورہ یونس)

پھر موسیٰ علیہ السلام پر کوئی ایمان نہیں لایا مگر صرف ایک گروہ جو اس قوم کے نوجوانوں کا گروہ تھا وہ بھی

فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتا ہوا کہ کہیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دے اور اس میں شک نہیں کہ فرعون سرزمین مصر پر متمردانہ قابض اور ظلم واستبداد میں بالکل چھوٹ تھا اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: لوگو! اگر تم فی الحقیقت اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس کی فرمانبرداری کرنی چاہتے ہو تو چاہیے کہ صرف اسی پر بھروسہ کرتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہم کو ظالم قوم کی آزمائش میں نہ ڈال اور ہم کو اپنی رحمت سے منکروں سے نجات دے۔

الحاصل فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روحانی قوت کا یہ مظاہرہ دیکھ کر بیحد مرعوب ہو گیا اور اگرچہ وہ جادوگروں پر اپنے انتہائی غیظ وغضب کا اظہار کرتا رہا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس وقت کچھ کہنے کی مطلق ہمت نہ پڑی اور درباریوں اور ارکان سلطنت نے جب یہ احتجاج کیا کہ تو موسیٰ کو قتل کیوں نہیں کرا دیتا، کیا اسکو اور اسکی قوم کو یہ موقع دیا جارہا ہے کہ وہ مصر میں فساد پھیلائیں اور تجھ کو اور تیرے دیوتاؤں کو ٹھکراتے رہیں؟ تو کہنے لگا کہ تم گھبراتے کیوں ہو؟ میں اسرائیلیوں کی طاقت کو بڑھنے نہ دونگا اور مقابلہ کے قابل ہی نہ رکھوں گا، ابھی یہ حکم جاری کرتا ہوں کہ ان کی اولاد نرینہ کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا کرو اور صرف لڑکیوں کو چاکری کیلئے زندہ رہنے دو۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَآءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ ○

(سورہ اعراف)

اور فرعون کی قوم میں سے ایک جماعت نے فرعون سے کہا کیا تو موسیٰ علیہ السلام اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ وہ زمین (مصر) میں فساد کرتے پھریں اور تجھ کو اور تیرے دیوتاؤں کو ٹھکرائیں۔ فرعون نے کہا ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی لڑکیوں کو (باندیاں بنانے کیلئے) زندہ رکھیں گے اور ہم ان پر ہر طرح غالب ہیں اور وہ ہمارے ہاتھوں میں بے بس ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ ○ إِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سَاحِرٌ كَذَّابٌ ○ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا أَبْنَآءَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ وَمَا كَيْدُ الْكَافِرِيْنَ إِلَّا فِيْ ضَلَالٍ ○ (غافر)

اور بلاشبہ ہم نے فرعون ہامان اور قارون کی طرف موسیٰ علیہ السلام کو رسول بنا کر اور واضح نشان دے کر بھیجا پس انہوں نے کہا کہ یہ تو جادوگر ہے جھوٹا پھر جب وہ ہمارے پاس سے ان کے پاس حق لے کر آیا تو کہنے لگے کہ جو لوگ اس (موسیٰ علیہ السلام) پر ایمان لے آئے ہیں ان کے لڑکوں کو مار ڈالو اور ان کی لڑکیوں کو باقی رہنے دو، اور (انجام کار) کافروں کا مکر و فریب باطل و برباد ہو کر رہا۔

گویا فرعون کا یہ دوسرا اعلان تھا جو بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل سے متعلق کیا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل

تاریخ کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ جب کسی قوم پر غلامی کی حالت میں صدیاں گذر جاتی ہیں تو اس کی زبوں حالی اور پستی کے حدود یہیں ختم نہیں ہو جاتے کہ وہ مفلس و بد حال ہوں اور کاہل و پریشان بال بلکہ قوائے عملی کی خرابی سے زیادہ ان کے قوائے دماغی بیکار مضمحل اور ناکارہ ہو جاتے ہیں، ان میں سے ہمت و شجاعت مفقود ہو جاتی ہے اور وہ پستی پر ہی قناعت کر لیتے ہیں، ناامیدی ان کا شیوہ ہو جاتا ہے اور ذلت و نکبت کو وہ صبر و قناعت سمجھنے لگتے ہیں اس لئے جب کوئی مصلح یا پیغمبر اور رسول اس دماغی و عملی پستی سے نکالنے کے لئے ان کو پکارتا اور ہمت و شجاعت پر آمادہ کرتا ہے تو یہ ان کے لئے سب سے مشکل اور ناممکن العمل پیغام نظر آتا ہے اور کبھی وہ اس راہ کی سختیوں سے گھبرا کر آپس میں دست بگریباں ہونے لگتے اور کبھی اپنے نجات دہندہ پر شک و شبہ کی نگاہ ڈالنے لگتے ہیں اور اگر اس جدوجہد میں ان کو کوئی فائدہ حاصل ہو جاتا ہے تو وقار اور سنجیدگی سے بھی گذر کر اظہار مسرت کرنے لگتے ہیں اور اگر اس راہ میں کوئی آزمائش اور مصیبت کا سوال آپڑتا ہے تو مصلح یا پیغمبر کو الزام دینے لگتے ہیں کہ ہم کو خواہ مخواہ تو نے اس مصیبت میں پھنسایا ہم تو اپنی حالت پر ہی صابر و شاکر تھے۔

یہی حال بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تبلیغ حق سے لے کر مصر سے خروج کے وقت تک جو حالات پیش آئے وہ اس امر کی زندہ شہادت ہیں۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون اور اس کے درباریوں کی گفتگو کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے بنی اسرائیل کو جمع کر کے صبر اور توکل الی اللہ کی تلقین کی بنی اسرائیل نے سن کر جواب دیا کہ موسیٰ علیہ السلام! ہم پہلے ہی مصیبتوں میں گرفتار تھے اب تیرے آنے پر کچھ امید بندھی تھی مگر تیرے آنے کے بعد بھی وہی مصیبت باقی رہی یہ تو سخت آفت کا سامنا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی کہ خدا کا وعدہ سچا ہے گھبراؤ نہیں تم ہی کامیاب ہو گے اور تمہارے دشمن کو ہلاکت کا منہ دیکھنا پڑے گا زمین کا مالک فرعون یا اس کی قوم نہیں ہے بلکہ رب العالمین اور مختار مطلق خدا ہے پس وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کا مالک بنا دے اور انجام کار یہ انعام متقیوں کا ہی حصہ ہے۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ○ (سورہ اعراف)

"موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا" اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو بلاشبہ زمین اللہ کی ملک ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے اور انجام (کی کامیابی) متقیوں کیلئے ہی ہے انہوں نے جواب دیا تیرے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبت میں تھے اور تیرے پیغام لانے کے بعد بھی مصیبت ہی میں گرفتار ہیں موسیٰ علیہ السلام نے کہا وہ وقت قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو برباد کر دے گا اور تم کو اس زمین کا

خلیفہ بنادے گا اور پھر دیکھے گا کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔"

اس کے بعد حضرت موسیٰ نے مسلمانوں سے کہا کہ فرعون کے مظالم کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا اور بنی اسرائیل اور قبطی مومنوں کو آزادی کے ساتھ مصر سے چلے جانے پر راضی نہیں ہے اس لئے خدا کے فیصلہ تک تم سرزمین مصر ہی میں اپنے گھروں کو مساجد بنالو اور ان کو قبلہ رخ کر کے خدائے واحد کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ کہ خدا کی وحی کا یہی فیصلہ ہے اور ساتھ ہی خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاء کی بار الہا! فرعون اور فرعونیوں کو تو نے جو دولت و سطوت عطا فرمائی ہے اس پر شکریہ ادا کرنے کے بجائے وہ تیرے بندوں پر جبر اور ظلم و ستم کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور تیری راہ حق کو نہ یہ خود قبول کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو قبول کرنے دیتے ہیں بلکہ جبر و تشدد سے کام لے کر ان کے آڑے آتے ہیں لہٰذا اب تو ان کے مظالم کا ذائقہ چکھا اور ان کی اس دولت و ثروت کو تباہ و ہلاک کر دے جس پر یہ نازاں ہیں اور جس طرح یہ ایمان کی سچائی کو ٹھکرا رہے ہیں تو بھی ان کو ایما کی دولت کے بجائے اب ایسا دردناک عذاب دے کہ ان کی داستان دوسروں کے لئے عبرت بن جائے۔

وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوْسٰى وَأَخِيْهِ أَنْ تَبَوَّآ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّأَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِيْنَةً وَّأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيْمَ ○ قَالَ قَدْ أُجِيْبَتْ دَعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعَآنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

(سورہ یونس)

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون پر وحی کی کہ اپنی قوم کے لئے مصری مکان بناؤ اور ان کو قبلہ رخ تعمیر کرو اور ان میں نماز قائم کرو اور جو ایمان لائے ہیں انہیں کامیابی کی بشارت دو اور موسیٰ نے دعا مانگی خدایا تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو اس دنیا کی زندگی میں زیب و زینت کی چیزیں اور مال و دولت کی شوکتیں بخشی ہیں تو خدایا! کیا یہ اس لئے ہے کہ تیری راہ سے یہ لوگوں کو بھٹکائیں خدایا ان کی دولت زائل کر دے اور ان کے دلوں پر مہر لگا دے کہ اس وقت تک یقین نہ کریں کہ جب تک عذاب دردناک اپنے سامنے نہ دیکھ لیں اللہ نے فرمایا! میں نے تم دونوں کی دعا قبول کی تو اب تم اپنی راہ میں جم کر کھڑے ہو جاؤ اور ان لوگوں کی پیروی نہ کرو جو میرا طریق کار نہیں جانتے۔

فرعون نے اپنے سرداروں سے اگرچہ اطمینان کا اظہار کر دیا تھا لیکن حضرت موسیٰ کے روحانی غلبہ کا خیال اس کو اندر ہی اندر گھلائے ڈالتا تھا اور بنی اسرائیل کی اولاد نرینہ کے قتل کے حکم سے بھی اس کو سکون قلب نصیب نہ تھا آخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ موسیٰ کو قتل کئے بغیر یہ معاملہ ختم نہیں ہو گا لہٰذا سرداروں اور ندیموں سے ایک روز کہنے لگا کہ اگر موسیٰ کو ہم نے یوں ہی چھوڑ رکھا تو مجھے یہ خوف ہے کہ یہ تمہارے دین کو بھی آہستہ آہستہ بدل ڈالے گا اور تمام مصر میں فساد مچا دے گا اب یہی بات ٹھیک معلوم

ہوتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو قتل کردیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میں ایسے متکبر و مغرور سے کیا ڈرتا ہوں جو خدا کے یوم حساب سے نہیں ڈرتا میرا پشت پناہ تو وہ ہے جو میرا بھی پروردگار ہے اور تم سب کا بھی میں صرف اسی کی پناہ چاہتا ہوں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ أَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ إِنِّيْٓ أَخَافُ أَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ أَوْ أَنْ يُّظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰٓى إِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ (سورہ مومن)

اور فرعون نے کہا! مجھے موسیٰ علیہ السلام کو قتل ہی کر لینے دو اس کو چاہیے کہ اپنے رب کو پکارے میں ڈرتا ہوں کہ وہ تمہارے دین کو بدل ڈالے یا زمین میں فساد برپا کردے اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا! میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ چاہتا ہوں ہر اس متکبر سے جو حساب کے دن پر ایمان نہیں لاتا ہے۔

فرعون اور اس کے سردار جب اس گفتگو میں مصروف تھے تو اس مجلس میں ایک مصری مرد مومن بھی تھا جس نے ابھی تک اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا تھا اس نے جب یہ سنا تو اپنی قوم کے ان افراد کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے مدافعت کی کوشش شروع کی اور ان کو سمجھایا کہ تم ایسے شخص کو قتل کرنے چلے ہو جو یہ سچی بات کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور جو تمہارے سامنے اپنی صداقت پر بہترین دلائل و نشانات لایا ہے اور بالفرض اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ سے تم کو کچھ نقصان نہیں پہنچ رہا ہے اگر وہ سچا ہے تو پھر اس کی ان وعیدوں سے ڈرو جو وہ تم کو خدا کی جانب سے سناتا ہے۔

فرعون نے مرد مومن کا کلام قطع کرتے ہوئے کہا کہ میں تم کو وہی مشورہ دے رہا ہوں جس کو اپنے خیال میں درست سمجھتا ہوں اور تمہاری بھلائی کی بات کہہ رہا ہوں۔

مرد مومن نے آخری نصیحت کے طور پر پھر کہا "اے میری قوم! مجھے یہ خوف ہے کہ ہمارا حال کہیں ان پچھلی قوموں کا سا نہ ہو جائے جو قوم نوح عاد اور ثمود کے نام سے مشہور ہیں یا ان کے بعد جو قومیں آئیں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا بلکہ ان قوموں کی سوچ رہے ہو تم تو آج دنیا کی وجاہت کے سوچ میں پڑے ہو اور میں تمہارے لئے اس دن سے ڈرتا ہوں جب قیامت کا دن ہوگا اور سب ایک دوسرے کو پکاریں گے مگر اس وقت تمہیں کوئی خدا کے عذاب سے بچانے والا نہ ہوگا۔"

اے قوم کے سردارو! تمہارا حال تو یہ ہے کہ اس سرزمین میں جب حضرت یوسف علیہ السلام نے خدا کا پیغام سنایا تھا تب بھی تم یعنی تمہارے باپ دادا اسی شک و تردد میں پڑے رہے اور ان پر ایمان نہ لائے اور جب ان کی وفات ہوگئی تو کہنے لگے کہ اب خدا اپنا کوئی رسول نہیں بھیجے گا اب یہی معاملہ تم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کر رہے ہو خدارا سمجھو اور سیدھی راہ اختیار کرو۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيْمَانَهٗٓ أَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا أَنْ يَّقُوْلَ

رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَّبِّكُمْ وَإِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ وَإِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ○ يَاقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَاهِرِيْنَ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْ بَأْسِ اللّٰهِ إِنْ جَآءَنَا قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ أُرِيْكُمْ إِلَّا مَآ أَرٰى وَمَآ أَهْدِيْكُمْ إِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ○ وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يَاقَوْمِ إِنِّيْٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ ○ مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ○ وَيَاقَوْمِ إِنِّيْٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ○ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ○ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ حَتّٰى إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ ○ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْ اٰيَاتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ○ (سورہ مومن)

اور بولا ایک مرد ایماندار فرعون کے لوگوں میں سے جو چھپاتا تھا اپنا ایمان کیا مارے ڈالتے ہو ایک مرد کو اس بات پر کہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے اور لایا ہمارے پاس نشانیاں تمہارے رب کی اور اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس پر پڑے گا اس کا جھوٹ اور اگر وہ سچا ہوگا تو تم پر پڑیگا کوئی نہ کوئی وہ وعدہ جو تم سے کرتا ہے بے شک اللہ راہ نہیں دیتا جو ہو بے لحاظ جھوٹا، اے میری قوم! آج تمہارا راج ہے غالب ہو رہے ہو ملک میں پھر کون مدد کرے گا ہماری اللہ کی آفت سے اگر آگئی ہم پر! بولا فرعون میں تو وہی بات سمجھاتا ہوں تم کو جو سوجھی مجھ کو اور وہی راہ بتاتا ہوں جس میں بھلائی ہے اور کہا اس ایماندار نے، اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں کہ آئے تم پر دن اگلے فرقوں کا سا، جیسے حال ہوا قوم نوح کا اور عاد اور ثمود کا اور جو لوگ ان کے پیچھے ہوئے اور اللہ بے انصافی نہیں چاہتا بندوں پر اور اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں کہ تم پر آئے دن چیخ و پکار کا جس دن بھاگو گے پیٹھ پھیر کر کوئی نہیں تم کو اللہ سے بچانے والا اور جس کو غلطی میں ڈالے اللہ تو کوئی نہیں اس کو سمجھانے والا اور تمہارے پاس آچکا ہے یوسف (علیہ السلام) اس سے پہلے کھلی باتیں لے کر پھر تم رہے دھوکے ہی میں ان چیزوں سے جو وہ تمہارے پاس لے کر آیا یہاں تک کہ جب مر گیا لگے کہنے ہرگز نہ بھیجے گا اللہ اس کے بعد کوئی رسول اسی طرح بھٹکاتا ہے اللہ اس کو جو ہو بے باک شک کرنے والا وہ جو کہ جھگڑتے ہیں اللہ کی باتوں میں بغیر کسی سند کے جو پہنچی ہو انکو بڑی بے زاری ہے (اس جھگڑے سے) اللہ کے یہاں اور ایمانداروں کے یہاں اسی طرح مہر لگا دیتا ہے اللہ ہر دل پر غرور والے سرکش کے۔

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۡ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۝ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ۝ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۡ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ (مومن)

اور کہا اس ایماندار نے اے قوم! راہ چلو میری پہنچادوں تم کو نیکی کی راہ پر اے میری قوم! یہ جو زندگی ہے دنیا کی سو کچھ فائدہ اٹھالینا ہے اور وہ گھر جو پچھلا ہے وہی ہے تم کو رہنے کا گھر جس نے کی ہے برائی تو وہی بدلا پائے گا اس کی برابر اور جس نے کی ہے بھلائی مرد ہو یا عورت اور وہ یقین رکھتا ہو سو وہ لوگ جائیں گے بہشت میں روزی پائیں گے وہاں بے شمار اور اے قوم! مجھ کو کیا ہوا ہے بلاتا ہوں تم کو نجات کی طرف اور تم بلاتے ہو مجھ کو آگ کی طرف تم چاہتے ہو مجھ کو کہ منکر ہو جاؤں اللہ سے اور شریک ٹھہراؤں اس کا اس کو جس کی مجھ کو خبر نہیں اور میں بلاتا ہوں تم کو اس زبردست گناہ بخشنے والے کی طرف آپ ہی ظاہر ہے کہ جس کی طرف تم مجھ کو بلاتے ہو اس کا بلاوا کہیں نہیں دنیا میں اور نہ آخرت میں اور یہ کہ ہم کو پھر جانا ہے اللہ کے پاس اور یہ کہ زیادتی والے وہی ہیں جو دوزخ کے لوگ سو آگے یاد کرو گے جو میں کہتا ہوں تم کو اور میں سونپتا ہوں اپنا معاملہ اللہ کو بیشک اللہ کی نگاہ میں ہیں سب بندے۔

جب فرعون اور اس کے سرداروں نے اس مرد مومن کی یہ باتیں سنیں تو ان کا رخ موسیٰ سے ہٹ کر اس کی طرف ہو گیا اور فرعونیوں نے چاہا کہ پہلے اس ہی کی خبر لیں اور اس کو قتل کر دیں مگر اللہ تعالیٰ نے اس ناپاک ارادہ میں ان کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ (سورہ مومن)

سو اللہ تعالیٰ نے اس کو ان کی تدبیروں کے شر سے بچالیا اور فرعون کے لوگوں کو برے عذاب نے آلیا۔ نار جہنم ہے جس پر وہ صبح شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت آجائے گی (تو کہا جائیگا) فرعونیوں کو سخت عذاب

میں دخل کردو۔

تورات میں اگرچہ گذشتہ واقعات کا اکثر حصہ مذکور ہے مگر دو باتوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا ایک فرعون کے اس دوسرے حکم کا تذکرہ نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کی اولادِ نرینہ کو قتل کیا جائے اور دوسرے اس واقعہ کا کہ فرعون کی قوم میں سے بھی بعض آدمی ایمان لائے تھے اور ان میں سے ایک مردِ مومن نے فرعون اور اپنی قوم کو حضرت موسیٰ کے قتل سے باز رکھنے کی کوشش کی اور ان کو دین کی تبلیغ کی سچائی کو قبول کرنے کی دعوت دی۔

غالباً اس دوسرے واقعہ کے ترک کردینے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون اور قبطیوں سے مظالم کی وجہ سے انتہائی رنج و غصہ تھا اور اس نے بغض و کینہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ لہٰذا اس نے اجازت نہ دی کہ اس قوم کے کسی فرد کیلئے بھی یہ ثابت کریں کہ اس میں سعادت اور حمایت کی روح موجود تھی۔

فرعون کا دعویٰ ربوبیت والوہیت

فرعون اور اس کے سرداروں کا موسیٰ کو شکست دینے میں جب کوئی مکر و فریب اور غیظ و غضب کام نہ آیا اور ارادۂ قتل کے باوجود موسیٰ کو قتل کرنے کی بھی ہمت نہ پڑی تو اب فرعون نے دل کا بخار نکالنے کا یہ طریقہ نکالا کہ ایک جانب حضرت موسیٰ کی توہین کے درپے رہتا اور دوسری جانب یہ اعلان کرتا کہ تمہارا رب اعلیٰ اور معبود میرے علاوہ کوئی نہیں ہے موسیٰ بن دیکھے خدا کو رب بتا رہا ہے اور میں با ایں صد ہزار شوکت و سطوت تمہارے سامنے موجود ہوں چنانچہ مصری قوم پر جو اثر حضرت موسیٰ کے آیات بینات دیکھ کر ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا اور دنیوی شوکت و سطوت کی مرعوبیت اور عزت و جاہ کی حرص میں دب کر رہ گیا اور اس طرح وہ سب حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی مخالفت میں پھر فرعون کے ہم نوا ہوگئے۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ۝ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ۝ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ [illegible]

اور فرعون نے اپنی قوم میں اعلان کیا اے قوم! کیا میں مصر کے تاج و تخت کا مالک نہیں ہوں اور کیا یہ میری حکومت کے قدموں کے نیچے یہ نہریں بہہ رہی ہیں کیا تم (میرے اس جاہ و جلال کو) نہیں دیکھتے اب بتاؤ) میں بلند و بالا ہوں یا یہ جس کو نہ عزت نصیب اور جو بات بھی صاف نہ کر سکتا ہو (اگر یہ اپنے خدا کے یہاں عزت والا ہے) تو کیوں اس پر (آسمان سے) سونے کے کنگن نہیں گرتے یا فرشتے ہی اس کے ساتھ پرے باندھ کر کھڑے نہیں ہوتے پس عقل کھو دی فرعون نے اپنی قوم کی سو انہوں نے اس کی اطاعت کی اور تھے وہ نافرمان بندے۔

فرعون نے اس جگہ بلند و بالا ہونے کا معیار دو باتوں پر رکھا اور عام طور پر دنیا کو مقصد زندگی سمجھنے والوں کی یہی شان رہی ہے ایک دولت و ثروت دوسرے دنیوی جاہ و حشم اور یہ دونوں فرعون کے پاس موجود تھے موسیٰ ؑ کے پاس نہ تھے۔

حضرت شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) نے ان دونوں باتوں کو موضح القرآن میں ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

"وہ آپ کنگن پہنتا تھا جو امیر کے مکلف اور جس پر مہربان ہوتا سونے کے کنگن پہناتا تھا اور اس کے سامنے فوج کھڑی ہوتی تھی پرا باندھ کر۔" (فوائد سورۂ زخرف)

اس لئے اس نے انہی باتوں کا ذکر کیا کہ اگر موسیٰ ؑ کا خدا مجھ سے الگ کوئی اور ہستی ہے تو وہ موسیٰ کو سونے کے کنگن آسمان سے کیوں نہیں برساتا اور فرشتے اس کے جلو میں پرا باندھ کر کیوں کھڑے نہیں ہوتے اور چونکہ قوم کی نگاہ میں دینی و دنیوی عزت کا معیار یہی تھا اس لئے فرعون کا داؤں ان پر چل گیا اور انہوں نے یک زبان ہو کر فرعون کی اطاعت کا دوبارہ اعلان کر دیا یہ بدبخت یہ نہ سمجھے کہ خدائے تعالیٰ کے یہاں عزت کا معیار "صدق و خلوص" اور خدا کی وفاداری اور عبودیت ہے نہ کہ دنیوی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت، البتہ جو شخص اصل عزت کو حاصل کر لیتا ہے تو خدائے تعالیٰ یہ چیزیں بھی اس کے قدموں پر نثار کر دیتا ہے اور صرف دنیوی عظمت پر اترانے والوں کو ابدی ذلت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا چنانچہ آخر میں یہی صورت موسیٰ ؑ اور ان کی قوم بنی اسرائیل اور فرعون اور اس کی قوم کے ساتھ پیش آئی۔

فَلَمَّا آسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِيْنَ ○ فَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْآخِرِيْنَ ○ (زخرف)

پھر جب ہم کو غصہ آیا تو ہم نے (ان کی بدکرداریوں کا) بدلہ لیا پس ڈبو دیا ان سب کو اور کر دیا گذرے اور آنے والی نسلوں کے واسطے ان کو کہاوت بنا دیا۔

ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْعٰى ○ فَحَشَرَ فَنَادٰى ○ فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلٰى ○ فَأَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُوْلٰى ○ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ○ (النازعات)

پس پیٹھ پھیر کر چل دیا پھر (قوم کو) جمع کیا پھر پکارا اور کہنے لگا "میں ہی تمہارا سب سے بڑا رب ہوں" پس اس کو پکڑے (آخرت کے) اور (دنیا کے) عذاب نے آ پکڑا بلاشبہ اس واقعہ میں اس شخص کے لئے عبرت ہے جو خوف خدا رکھتا ہو۔

مصریوں پر قہر خدا

غرض حضرت موسیٰ ؑ کی رشد و ہدایت کا فرعون اور اس کے سرداروں پر مطلق اثر نہیں ہوا اور معدودے چند کے سوائے عام مصریوں نے بھی ان ہی کی پیروی کی اور صرف یہی نہیں بلکہ فرعون کے حکم سے بنی اسرائیل کی تربیت اور قتل کی جانے لگی موسیٰ ؑ کی توہین و تذلیل ہونے لگی اور فرعون نے اپنی

ربوبیت اور معبودیت کی زور شور سے تبلیغ شروع کر دی تب حضرت موسیٰ پر وحی آئی کہ فرعون کو مطلع کر دو کہ اگر تمہارا یہی طور طریق رہا تو عنقریب تم پر خدا کا عذاب نازل ہونے والا ہے چنانچہ جب انہوں نے اس پر بھی دھیان نہ دیا تو اب یکے بعد دیگرے عذاب الٰہی آنے لگے یہ دیکھ کر فرعون اور اس کی قوم نے اب یہ وطیرہ اختیار کیا کہ جب عذاب الٰہی کسی ایک شکل میں ظاہر ہوتا تو فرعون اور قوم فرعون حضرت موسیٰ سے وعدہ کرنے لگتی کہ اچھا ہم ایمان لے آئیں گے تو اپنے خدا سے دعا کر کہ یہ عذاب جاتا رہے اور جب وہ عذاب جاتا رہتا تو پھر سرکشی و نافرمانی پر اتر آتے پھر عذاب جب دوسری شکل میں آتا تو کہتے کہ اچھا ہم بنی اسرائیل کو آزاد کر کے تیرے ساتھ روانہ کر دیں گے۔ دعاء کر کہ یہ عذاب دفع ہو جائے اور جب حضرت موسیٰ کی دعاء سے ان کو پھر مہلت مل جاتی اور عذاب دفع ہو جاتا تو پھر اسی طرح مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے اس طرح خدا کی جانب سے مختلف قسم کے نشانات ظاہر ہوئے اور فرعون اور قوم فرعون کو بار بار مہلت عطا ہوتی رہی لیکن جب انہوں نے اس کو بھی ایک مذاق بنالیا تب خدا کا آخری عذاب آیا اور فرعون اور اس کے سرکش سردار سب ہی غرق کر دیئے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بہت سے نشانات (معجزات) عطا فرمائے تھے جن کا ذکر بقرہ، اعراف، نمل، قصص، اسراء، طہٰ، زخرف، مومن، قمر اور النازعات میں مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے چنانچہ اسراء میں ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَاسْئَلْ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ إِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ إِنِّيْ لَأَظُنُّكَ يَامُوْسٰى مَسْحُوْرًا ۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ أَنْزَلَ هٰؤُلَآءِ إِلَّا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ بَصَآئِرَ وَإِنِّيْ لَأَظُنُّكَ يَافِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (سورہ بنی اسرائیل)

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو نو نشانات واضح عطا کئے پس تو بنی اسرائیل سے دریافت کر کہ جب یہ نشانات ان کے پاس آئے تو حضرت موسیٰ سے فرعون نے یہ کہا! اے موسیٰ بلاشبہ میں تجھ کو جادو کا مارا ہوا سمجھتا ہوں موسیٰ نے کہا تو خوب جانتا ہے کہ ان کو بصیرتیں بنا کر آسمانوں اور زمین کے پروردگار کے سوائے اور کسی نے نہیں اتارا اور (اس لئے) بلاشبہ اے فرعون میں تجھ کو ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔

اور طہٰ، نمل، زخرف، اور النازعات میں شمار بتائے بغیر صرف کہہ کر ذکر کیا گیا ہے، پھر کسی جگہ اور کہیں اور کسی موقعہ پر اور کہیں صرف سے تعبیر کیا ہے۔

اور ان تفصیل اور اجمالی تعبیرات کے علاوہ مسطورۂ بالا تمام سورتوں میں علیحدہ علیحدہ نشانات (معجزات) کا بھی ذکر موجود ہے اور اگر ان سب کو یکجا جمع کیا جائے تو حسب ذیل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔

۱	عصاء	۲	ید بیضا
۳	سنین (قحط)	۴	نقص ثمرات (پھلوں کا نقصان)
۵	طوفان	۶	جراد (ٹڈی دل)
۷	قمل (جوں)	۸	ضفادع (مینڈک)
۹	دم (خون)	۱۰	فلق بحر (قلزم کا پھٹ کر دو حصہ ہو جانا)
۱۱	منّ و سلویٰ (حلوا و بٹیر)	۱۲	غمام (بادلوں کا سایہ)
۱۳	انفجار عیون (پتھر سے چشموں کا بہہ پڑنا)	۱۴	نتق جبل (پہاڑ کا اکھڑ کر سروں پر آ جانا)
۱۵	نزول تورات		

پس مسطورہ بالا مختلف تعبیرات و تفصیلات کی بناء پر مفسرین[۱] کو حیرانی ہے کہ کونسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے کی تعیین بھی ہو جائے اور باقی آیات اللہ کی تفصیل بھی صحیح اسلوب پر باقی رہ جائے چنانچہ قاضی بیضاوی اور بعض دوسرے مفسرین نے یہ تشریح فرمائی کہ سورۂ اسراء میں جن کا تذکرہ ہے ان سے وہ نشان (معجزات) مراد نہیں ہیں جو فرعون اور قوم فرعون کے مقابلہ میں بطور سرزنش عذاب اور عبرت کیلئے بھیجے گئے بلکہ اس سے وہ احکام مراد ہیں جو بنی اسرائیل کو قلزم عبور کر لینے کے بعد دیئے گئے تھے اور اپنی اس تشریح کی تائید میں حضرت صفوان بن عسال کی حدیث کی جسکا مفہوم یہ ہے کہ ایک مرتبہ دو یہودیوں نے آپس میں مشورہ کیا، نبی اکرم کے دعویٰ نبوت کا امتحان لیا جائے اور مشورہ کے بعد آپ سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو جو دیئے تھے ان کی تشریح؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ احکام یہ ہیں: شرک نہ کرنا، زنانہ کرنا، ناحق کسی کو قتل نہ کرنا، چوری نہ کرنا، جادو نہ کرنا، حکام رس کے ذریعے جرم سے پاک انسان کو قتل نہ کرانا، سود نہ کھانا پاکدامن کو تہمت نہ لگانا، میدان جنگ سے نہ بھاگنا (شعبہ کو شک ہو گیا کہ نواں حکم یہی فرمایا یا کوئی اور) اور اے یہود! تمہارے لئے خصوصیت کے ساتھ یہ کہ سبت کی خلاف ورزی نہ کرنا۔ (ترمذی کتاب التفسیر جلد ۲ ص ۱۵۹)

مگر ان مفسرین کی یہ تشریح اس لئے صحیح نہیں کہ اسراء میں تِسۡعَ اٰیٰت کے ذکر کے ساتھ فرعون اور حضرت موسیٰ کا مقابلہ بھی درج ہے فرعون ان آیات کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اے موسیٰ یہ سب جادو کا دھندا ہے اور حضرت موسیٰ فرماتے ہیں اے فرعون! یہ اللہ تعالیٰ کے نشانات ہیں اور تو انکار کر کے ہلاکت میں پڑ رہا ہے۔ پس اس جگہ احکام مراد لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کیونکہ ان کا نزول خود ان مفسرین کے نزدیک بھی غرق فرعون کے بعد ہوا ہے۔ چنانچہ یہی اشکال ترمذی کی حدیث پر بھی وارد ہوتا ہے، نیز یہ بات بھی خدشہ

۱: مفسرین کہتے ہیں کہ جوں اور مینڈک کے عذاب کی صورت یہ تھی کہ برتنے، کھانے، پینے اور رہنے سہنے کی کوئی شے اور کوئی جگہ ایسی نہ تھی جس کو ان دونوں نے فاسد اور خراب نہ کر دیا ہو اور زندگی تلخ نہ کر دی ہو اور خون کے عذاب کی شکل یہ تھی کہ قلزم اور کنوؤں کا تمام پانی خون آلود ہو گیا تھا۔ جس کو کسی حالت میں پیا نہ جا سکتا تھا۔

سے خالی نہیں کہ قرآن عزیز کی آیات زیر بحث میں تو نو آیات کا ذکر ہے اور صفوان کی حدیث میں دس احکام شمار کئے ہیں تو یہ نفی کا تعارض ہے اور پھر احکام عشرہ کو تسع آیات کی تشریح بتانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

ان دو اہم خدشات کے علاوہ اس قول اور حدیث صفوان کی تشریح پر جو سخت اشکال لازم آتا ہے وہ یہ ہے کہ سورۂ نمل میں تسع آیات کا ذکر کرتے ہوئے ید بیضاء کو نو میں کا ایک بتایا گیا اور یہ بھی صراحت کی گئی ہے کہ یہ آیات (نشانات) فرعون اور قوم فرعون کی عبرت و بصیرت کیلئے بھیجے گئے تھے۔

وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ (سورہ نمل)

اور داخل کر تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں وہ نکلے گا روشن بغیر کسی مرض کے (یہ ان) نو آیات میں سے (ہے) جو فرعون اور اس کی قوم کے لئے (بھیجی گئیں) بلاشبہ تھے وہ نافرمان گروہ،

پس قرآن عزیز کی اس صراحت کے بعد نہ حدیث نکارت سے خالی رہتی ہے اور نہ مفسرین کا یہ قول صحیح ہو سکتا ہے اس لئے حافظ حدیث ابن کثیرؒ نے اس حدیث کے متعلق یہ فرمایا ہے۔

فھذا الحدیث رواہ ھکذا الترمذی والنسائی و ابن ماجہ و ابن جریر فی تفسیرہ من طرق عن شعبۃ بن الحجاج بہ و قال الترمذی حسن صحیح و ھو حدیث مشکل و عبد اللہ بن سلمۃ فی حفظہ شیء و قد تکلموا فیہ و لعلہ اشتبہ علیہ التسع الایات بالعشر الکلمات و صایا فی التوراۃ لا تعلق لھا لقیام الحجۃ علیٰ فرعون و اللہ اعلم و لھذا قال موسیٰ لفرعون لقد علمت ما انزل ھؤلاء الا ربّ السمٰوٰت والارض بصائر ای حجۃ و ادلۃ علیٰ صدق ما جئتك طہ و انی لاظنك یا فرعون مثبورا۔
(تفسیر ابن کثیر جلد ٦ ص ۱۱۲)

پس اس حدیث کو ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں مختلف طریقوں سے شعبہ بن الحجاج سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حسن صحیح ہے مگر اس حدیث اس میں اشکال ہیں اور عبداللہ بن سلمہ راوی کے حفظ میں خرابی ہے اور محدثین نے اس کے بارے میں کلام کیا ہے اور شاید اس کو اشتباہ ہو گیا کہ اس نے نبی اکرم ﷺ کے فرمودہ دس احکام کو تسع آیات سمجھ کر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا، حالانکہ وہ دس نصیحتیں ہیں جو تورات میں بیان کی گئیں ہیں، ان کا فرعون پر قیام حجت و دلیل سے کوئی تعلق نہیں، (واللہ اعلم) اور تسع آیات میں قیام حجت مقصود ہے اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہ فرمایا "تو خوب جانتا ہے کہ ان آیات (معجزات) کو آسمانوں اور زمین کے پروردگار نے نہیں اتارا مگر عبرت و بصیرت کیلئے یعنی جو حق کا پیغام میں لے کر آیا ہوں اس کی تصدیق کیلئے حجت و دلیل بنا کر بھیجا ہے اور میں بلاشبہ اے فرعون! تجھ کو ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔"

تورات میں بھی ان احکام کا ذکر موجود ہے اور اس نے ان لوگوں پر ان عہد کی باتوں کو یعنی موجودہ دس احکام کو لکھ کر۔
(خروج باب ۳۴ آیت ۲۸)

بہر حال یہ تشریح قطعاً مخدوش و مجروح ہے اور بعض مفسرین نے اس کے خلاف تسع آیات کی تعیین میں ان ہی آیات (معجزات) کو شمار کرایا ہے جو عبرت و بصیرت اور مخالفین کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ کی صداقت کیلئے عطا کئے گئے تھے لیکن یہ اقوال بھی مختلف ہیں اور ان میں کافی انتشار موجود ہے اس لئے کہ ان میں قبل عبور اور بعد عبور نشانات کو خلط کر دیا گیا ہے البتہ ان سب اقوال میں قابل ترجیح حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول ہے کہ سے مراد حسب ذیل آیات اللہ مراد ہیں۔

عصا	ید بیضاء	سنین
نقص ثمرات	طوفان	جراد
قمل	ضفادع	دم

اور حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ مجاہد، عکرمہ، شعبی اور قتادہؒ بھی اسکی تائید فرماتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس تشریح کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو جس قدر بھی آیات (معجزات) عطا کئے گئے ایک حصہ بحر قلزم کے عبور سے قبل اور دوسرا حصہ عبور کے بعد سے متعلق ہے اور پہلے حصہ کا تعلق ان تمام واقعات سے ہے جو حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان پیش آئے اور معرکہ حق و باطل کا باعث بنے اور یہ نو ہیں ان میں سے عصاء اور ید بیضاء آیات کبریٰ ہیں۔

فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرٰى ۝ (سورہ النازعات)

پس دکھایا اس (فرعون) کو ایک بڑا نشان (یعنی عصاء کا نشان)

وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوْءٍ فِي تِسْعِ آيَاتٍ (نمل)

اور داخل کر تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں نکلے گا وہ روشن بغیر کسی مرض کے نو نشانات (معجزات) میں سے۔

اور باقی سات آیات عذاب ہیں جس نے فرعون اور اہل مصر (قبطیوں) کی زندگی تنگ کر دی تھی۔

وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ فَإِذَا جَاءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ أَلَا إِنَّمَا طَائِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالُوْا مَهْمَا تَأْتِنَا بِهٖ مِنْ آيَةٍ لِتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ ...... (سورہ الاعراف)

اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں اور میووں کے نقصان میں تاکہ وہ نصیحت مانیں۔ پھر جب پہنچی ان کو بھلائی کہنے لگے یہ ہے ہمارے لائق اور اگر پہنچتی برائی تو نحوست بتلاتے موسیٰ کی اور اس کے ساتھ والوں کی سن لو ان کی شومی تو اللہ کے پاس ہے پر اکثر لوگ نہیں جانتے اور کہنے لگے جو کچھ تو لائے گا ہمارے پاس نشانی کہ ہم پر اس کی وجہ سے جادو کرے سو ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے پھر ہم نے بھیجا ان پر طوفان اور

ٹڈی اور چیچڑی اور مینڈک اور خون بہت سی نشانیاں جدا جدا دیں۔

اور "آیت بینات" کے دوسرے حصہ کا تعلق حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل سے متعلق واقعات سے ہے جن میں سے بعض (معجزات) ان کو ہلاکت سے محفوظ رکھنے اور صداقت موسیٰ کو قوت دینے کیلئے ہیں۔ مثلاً من و سلویٰ کا نزول، غمام (بادلوں کا سایہ) اور انفجار عیون (پتھر سے بارہ چشموں کا پھوٹ نکلنا) اور بعض بنی اسرائیل کی سرکشی پر تہدید و تخویف کے لئے ہیں مثلاً نتق جبل (طور کے ایک حصہ کا اپنی جگہ سے اکھڑ کر بنی اسرائیل کے سر پر آجانا)۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ (سورہ بقرہ)

اور اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر من (حلواء شیریں) اور سلویٰ (بٹیریں) نازل کیا پس تم ان پاک چیزوں کو کھاؤ جو ہم نے تم کو رزق بنا کر دی ہیں اور اے بنی اسرئیل ہم نے تم پر بادل کا سایہ قائم کر دیا

وَإِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (بقرہ)

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو ہم نے کہا (اے موسیٰ) تو پتھر پر اپنی لاٹھی مار، پس بہہ پڑے اس سے بارہ چشمے۔

اور دو دونوں قسم کے نشانات کیلئے حد فاصل وہ عظیم الشان نشان ہے جو فلق بحر (قلزم) کے دو ٹکڑے ہو کر راہ نکل آنا) کے عنوان سے معنون ہے اور دراصل ظلم و قہر کی ہلاکت اور مظلومانہ زندگی کی نصرت و حمایت کیلئے ایک فیصلہ کن نشان تھا، یا یوں کہہ دیجئے کہ واقعات قبل از عبور کے انجام اور بعد از عبور روشن آغاز کیلئے حد فاصل کی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ اعراف، اسراء، طہٰ شعراء، قصص، زخرف، دخان، اور الذاریات میں اسکو تفصیل کیساتھ بیان کیا گیا ہے اور یہ تمام نشانات (معجزات ۵) در حقیقت توطیہ اور تمہید تھے ایک ایسے عظیم الشان اور جلیل المرتبت نشان کے جو اس پوری تاریخ کا حقیقی مقصد اور بنیاد و اساس تھا اور وہ نزول تورات کا نشان اعظم ہے۔

إِنَّآ أَنْزَلْنَا التَّوْرٰاةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ

اور ہم نے اتاری تورات جس میں ہدایت اور نور (کاذخیرہ) ہے۔

الحاصل حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ اثر زیر بحث مسئلہ کے لئے قول فیصل ہے اسی لئے حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ نے اس کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے

وهذا القول ظاهر جلي قوي[1]

[1] حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ کریں۔

اور یہ قول صاف ہے واضح ہے عمدہ ہے اور قوی ہے۔

بہر حال فرعون اور کی پیہم اور مسلسل سرکشی، ظلم، حق کے ساتھ استہزاء، تمسخر، اور نافرمانی کے باعث خدائے تعالیٰ کی جانب سے مصریوں پر مختلف ہلاکتیں اور عذاب آتے رہے اور وقفہ کے ساتھ ان "نشانات" کا ظہور ہوتا رہا جب ایک عذاب آتا تو سب واویلا کرنے لگتے اور حضرت موسیٰ سے کہتے کہ اگر اس مرتبہ تو نے اپنے خدا سے کہہ کر اس عذاب کو ٹال دیا تو ہم سب ایمان لے آئیں گے اور جب وہ ٹل جاتا تو پھر سرکشی شروع کر دیتے آخر پھر دوسرا عذاب آپکڑتا اور پھر وہی صورت پیش آجاتی۔

اس تفصیلی واقعہ کا ذکر ابھی سورہ اعراف کی آیات میں گذر چکا ہے

ان آیات میں بیان کردہ نشانیوں میں سے قمل[1] (جوں) اور ضفادع (مینڈک) کے متعلق علماء سیر نے لکھا ہے کہ ان دونوں چیزوں کی یہ حالت تھی کہ بنی اسرائیل کے کھانے پینے پہننے اور برتنے کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جس میں یہ موجود نظر نہ آتے ہوں حتی کہ قوم فرعون کی عافیت تنگ ہو گئی اور وہ عاجز آگئے اور خون کے متعلق لکھا ہے کہ دریائے نیل کا پانی لہو کی رنگت کا ہو گیا تھا اور اس کے ذائقہ نے اس کا پینا دشوار کر دیا تھا اور پانی میں مچھلیاں تک مر گئی تھیں۔

تورات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَاسْأَلْ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ إِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ إِنِّيْ لَأَظُنُّكَ يَامُوْسٰى مَسْحُوْرًا ○ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ أَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ إِلَّا

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

۱: تفسیر کثیر ج۶ ص۱۱۱۔

اس بحث کیلئے روح المعانی، ابن کثیر، تفسیر کبیر اور البحر المحیط خصوصیت کے ساتھ قابل مراجعت ہیں، ان کے مطالعہ کے بعد مؤلف کے قولِ فیصل کی اہمیت ولطافت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ و ذلك فضل الله يؤته من يشاء والله ذو الفضل العظيم۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

۱: قمل سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ وہ کیڑا مراد ہے جو اناج میں پیدا ہو کر اس کو خراب کر دیتا ہے (اردو میں اس کو سرسری کہتے ہیں اور انہی سے ایک روایت ہے کہ اس سے وہ چھوٹی ٹڈی مراد ہے جس کے پر نہیں ہوتے اور وہ بھی غلہ کو گھن لگا دیتی ہے۔ مجاہد، عکرمہؒ، قتادہؒ کی بھی یہی رائے ہے اور ابن جریرؒ کہتے ہیں کہ جوں کی طرح کا ایک کیڑا ہوتا ہے جو اونٹوں میں ہلاکت پیدا کرتا ہے اور راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ چھوٹی مکھی ہے جو انسانی صحت کیلئے بے حد مضرت رساں ہے۔ قمل عربی میں عام طور پر جوں کو کہتے ہیں۔ تورات میں اس جگہ جوں اور مکھی دونوں کا ذکر ہے لیکن ابن عباسؓ، مجاہد، قتادہؒ، عکرمہؒ، ابن جریرؒ اور راغب جیسے ائمہ لغت اس لفظ کا اطلاق مسطورۂ بالا مختلف کیڑوں پر کر رہے ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قمل اپنے معنی میں ان مصادیق کیلئے وسیع ہے۔ اسلئے ان تمام اطلاقات کی تطبیق کیلئے یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں پر یہ عذاب نازل فرمایا کہ انسانوں پر جوئیں مسلط کر دیں۔ ان کے کھانے پینے کی چیزوں میں چھوٹی مکھیوں کو پھیلا دیا۔ ان کے جانوروں میں ہلاک کرنے والا کیڑا پیدا کر دیا اور ان کے اناج اور غلہ میں گھن لگا کر خراب کر دینے والی سرسری کی تباہی پھیلا دی اور ان سب مہلک کیڑوں کو قرآن کے اعجاز نے قمل کی وسیع تعبیر میں بیان فرما دیا ہے۔ (مؤلف)

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ بَصَآئِرَ وَإِنِّيْ لَأَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ○ (سورہ بنی اسرائیل)

اور بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو ظاہر نشانات دیئے پس (اے محمد! ﷺ) تو بنی اسرائیل سے دریافت کر کہ جب وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا اے موسیٰ علیہ السلام! میں تجھ کو جادو کا مارا ہوا گمان کرتا ہوں موسیٰ علیہ السلام نے کہا "خوب جانتا ہے کہ آسمان و زمین کے پروردگار نے ان نشانات کو بصیرت بنا کر اتارا ہے اور اے فرعون میں سمجھتا ہوں کہ تو نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے

وَلَقَدْ أَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبٰى ○ (طٰہٰ)

اور بے شک ہم نے فرعون کو اپنے نشانات (معجزے) دکھائے پھر بھی اس نے جھٹلایا اور انکار ہی کیا۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ○ (سورہ نمل)

پھر جب ان کے پاس ہمارے نشانات بصیرت کے لئے آپہنچے تو وہ کہنے لگے یہ تو صریح جادو ہے اور انہوں نے اپنے جی میں یہ یقین رکھتے ہوئے کہ یہ "صحیح ہیں" ظلم اور غرور کی وجہ سے انکار کر دیا۔
پس دیکھ (اے مخاطب) مفسدوں کا انجام کیسا ہوا؟

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْأَوَّلِيْنَ ○ وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ أَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ إِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (سورہ قصص)

پھر جب ان کے پاس ہماری صریح نشانیاں پہنچیں کہنے لگے یہ کچھ نہیں ہیں مگر گھڑا ہوا جادو اور ہم نے اپنے پہلے باپ دادوں میں یہ باتیں نہیں سنیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا! میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون شخص ہدایت کو لایا ہے اسکے پاس سے اور کون ہے جس کیلئے آخرت کا انجام مقرر ہے بلاشبہ وہ بے انصافوں کو فلاح نہیں دیتا۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ إِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ إِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ إِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ○ وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا وَأَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ وَقَالُوْا يٰٓأَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ إِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ○ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ○ (سورہ زخرف)

اور بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف اپنی نشانیاں دے کر بھیجا پس موسیٰ علیہ السلام

کہ میں جہانوں کے پروردگار کا رسول ہوں پھر جب وہ ہماری نشانیاں لایا اچانک وہ اس کا مذاق اڑانے لگے اور ہم نے جو نشان ان کو دکھایا ان میں سے ایک دوسرے سے بڑا ہی تھا اور ہم نے ان کو (دنیوی) عذاب میں گرفتار کیا تاکہ وہ باز آجائیں اور وہ کہنے لگے اے جادوگر! تو اپنے پروردگار سے اپنے اس عہد (نبوت) کی بنا پر ہمارے لیے دعا کر (کہ یہ مصیبت جاتی رہے) تو ہم بلاشبہ ہدایت قبول کرلیں گے پھر جب ہم نے ان سے عذاب کو دور کردیا تو پھر وہ بد عہد ہوگئے۔

وَلَقَدْ جَآءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۝ كَذَّبُوْا بِاٰيَاتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ (سورۃ قمر)

اور بلاشبہ آل فرعون کے پاس (بدکرداریوں کے انجام سے ڈرانے والے آئے انہوں نے ہماری سب نشانیوں کو جھٹلایا پس ہم نے ان کو (اپنے عذاب میں) پکڑ لیا ایک غالب اور قدرت والے کی پکڑ کی طرح۔

فَاَرٰهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝ (سورۃ النازعات)

پھر دکھائی (موسیٰ علیہ السلام نے) اس کو بڑی نشانی پس اس (فرعون) نے جھٹلایا اور نافرمانی کی۔)

بنی اسرائیل کا خروج اور فرعون کا تعاقب

جب معاملہ اس حد کو پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ تم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر باپ دادا کی سرزمین کی جانب لے جاؤ۔

مصر فلسطین یا ارض کنعان جانے کے دو راستے ہیں ایک خشکی کا راستہ ہے اور وہ قریب ہے اور دوسرا بحر احمر (قلزم) کا راستہ یعنی اس کو عبور کرکے بیابان سور اور سینا (تیہ) کی راہ ہے اور یہ دور کی راہ ہے مگر خدائے تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ خشکی کی راہ چھوڑ کر دور کی راہ اختیار کریں اور قلزم کو پار کرکے جائیں۔

واقعات رونما ہو جانے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ اس راہ کو حق تعالیٰ نے اسلئے ترجیح دی کہ خشکی کی راہ سے گذرنے میں فرعون اور اسکی فوج سے جنگ ضروری ہو جاتی کیونکہ انہوں نے بنی اسرائیل کو قریب ہی آلیا تھا اور اگر دریا کا معجزہ پیش نہ آتا تو فرعون نے بنی اسرائیل کو بزدل اور پست ہمت بنادیا تھا۔ اسلئے وہ خوف اور رعب کی وجہ سے کسی طرح فرعون کے ساتھ جنگ پر آمادہ نہ ہوتے، تورات سے بھی اس توجیہ کی تائید نکلتی ہے اس میں مذکور ہے۔

"اور جب فرعون نے ان لوگوں کو جانے کی اجازت دے دی تو خدا ان کو فلستیوں کے ملک کے راستہ سے نہیں لے گیا اگرچہ ادھر سے نزدیک پڑتا کیوں کہ خدا نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ لڑائی بھڑائی دیکھ کر پچتانے لگیں اور مصر کو لوٹ جائیں بلکہ خداوند ان کو چکر کھلا کر بحر قلزم کے بیابان کے راستے لے گیا۔" (خروج باب ۱۳ آیت ۱۷، ۱۸)

علاوہ ازیں فرعون اور قوم فرعون کو ان کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش اور عظیم الشان اعجاز کے ذریعہ ظالم و قاہر اقتدار سے مظلوم قوم کی نجات کا عدیم النظیر مظاہرہ کرنا بھی مقصود تھا اسی لئے یہ راستہ موزوں

سمجھا گیا۔

غرض حضرت موسیٰ اور ہارون بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات بحر ا کی راہ پر ہو لئے اور روانہ ہونے سے پہلے مصری عورتوں کے زیورات اور قیمتی پارچہ جات جو ایک تہوار میں مستعار لئے تھے وہ بھی واپس نہ کر سکے کہ کہیں مصریوں پر اصل حال نہ کھل جائے۔

ادھر پرچہ نویسوں نے فرعون کو اطلاع کی کہ بنی اسرائیل مصر سے فرار ہونے کے لئے شہروں سے نکل گئے فرعون نے اسی وقت ایک زبردست فوج کو ساتھ لیا اور رعمسیس سے نکل کر ان کا تعاقب کیا اور صبح ہونے سے پہلے پہلے ان کے سر پر جا پہنچا۔

بنی اسرائیل کی تعداد بقول تورات علاوہ بچوں اور چوپایوں کے چھ لاکھ تھی مگر پو پھٹنے کے وقت جب انہوں نے پیچھا پھر کے دیکھا تو فرعون کو سر پر پایا گھبرا کر کہنے لگے:

> "کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو مرنے کے لئے بیابان میں لے آیا ہے؟ تو نے ہم سے یہ کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں؟ کیوں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہوتا۔" (خروج باب ۱۴ آیات ۱۱،۱۲)

غرقِ فرعون

حضرت موسیٰ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا خوف نہ کرو خدا کا وعدہ سچا ہے وہ تم کو نجات دے گا اور تم ہی کامیاب ہو گے، اور پھر درگاہ الٰہی میں دست بدعاء ہوئے وحی الٰہی نے موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنی لاٹھی کو پانی پر مارو تاکہ پانی پھٹ کر بیچ میں راستہ نکل آئے، چنانچہ موسیٰ نے ایسا ہی کیا جب انہوں نے قلزم پر اپنا عصا مارا تو پانی پھٹ کر دونوں جانب دو پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا اور بیچ میں راستہ نکل آیا اور حضرت موسیٰ کے حکم سے تمام بنی اسرائیل اس میں اتر گئے، اور خشک زمین کی طرح اس سے پار ہو گئے، فرعون نے یہ دیکھا تو اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا! یہ میری کرشمہ سازی ہے کہ بنی اسرائیل کو تم جا کر پکڑ و لہٰذا بڑھے چلو چنانچہ فرعون اور اس کا تمام لشکر بنی اسرائیل کے پیچھے اسی راستے پر اتر لئے لیکن اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ جب بنی اسرائیل کا ہر فرد دوسرے کنارہ پر سلامتی کے ساتھ پہنچ گیا تو پانی بحکم الٰہی پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور فرعون اور اس کا تمام لشکر جو ابھی درمیان ہی میں تھا غرق ہو گیا۔

جب فرعون غرق ہونے لگا اور ملائکہ عذاب سامنے نظر آنے لگے تو پکار کر کہنے لگا "میں" اسی ایک وحدہ لاشریک لہ ہستی پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں مگر یہ ایمان چونکہ حقیقی ایمان نہ تھا بلکہ گذشتہ فریب کاریوں کی طرح نجات حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ایک مضطربانہ بات تھی اس لئے خدا کی طرف سے یہ جواب ملا:

أَلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (سورہ یونس)

اب یہ کہہ رہا ہے حالانکہ اس سے پہلے جو اقرار کا وقت تھا اس میں انکار اور خلاف ہی کرتا رہا اور درحقیقت تو مفسدوں میں سے تھا۔

یعنی خدا کو خوب معلوم ہے کہ تو "مسلمین" میں سے نہیں بلکہ "مفسدین" میں سے ہے۔

درحقیقت فرعون کی یہ پکار ایسی پکار تھی جو ایمان لانے اور یقین حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ عذاب الٰہی کا مشاہدہ کرنے کے بعد اضطراری اور بے اختیاری کی حالت میں نکلتی ہے اور مشاہدۂ عذاب کے وقت اس کی یہ صدائے "ایمان و یقین" حضرت موسیٰ کی اس دعاء کا نتیجہ تھی جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ○ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا (سورہ یونس)

پس یہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک اپنی ہلاکت اور عذاب کو آنکھوں سے نہ دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا "بلاشبہ تم دونوں کی دعاء قبول کرلی گئی۔"

اس موقعہ پر فرعون کی پکار پر درگاہ الٰہی کی جانب سے یہ بھی جواب دیا گیا۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً (الآیۃ)

آج کے دن ہم تیرے جسم کو ان لوگوں کیلئے جو تیرے پیچھے آنے والے ہیں نجات دیں گے کہ وہ (عبرت) کا نشان بنے۔

پس اگر گذشتہ "مصری مقالہ" کا مضمون صحیح ہے کہ منفتاح (رعمسیس ثانی) ہی فرعون موسیٰ تھا تب تو بے شبہ اس کی نعش آج تک محفوظ ہے اور سمندر میں تھوڑی دیر غرق رہنے کی وجہ سے اس کی ناک کو مچھلی نے کھالیا ہے اور آج وہ مصریات (ایجپٹالوجی) کے مصری عجائب خانہ میں تماشاگاہ خاص و عام ہے۔

اور بالفرض یہ وہ فرعون نہیں ہے تب بھی آیت کا مطلب اپنی جگہ صحیح ہے، اس لئے کہ توراۃ میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنی آنکھوں سے غرق شدہ مصریوں کی نعشوں کو کنارے پر پڑے ہوئے دیکھا تھا۔

"اور اسرائیلیوں نے مصریوں کو سمندر کے کنارے مرے ہوئے پڑے دیکھا"۔ (خروج باب ۱۴، آیت ۳۱)

قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کی روانگی اور فرعون کے غرق اور بنی اسرائیل کی نجات کے واقعہ کو بہت مختصر بیان کیا ہے اور اس کے صرف ضروری اجزاء ہی کا تذکرہ کیا ہے البتہ اس سے متعلق عبرت و بصیرت اور موعظت کے معاملہ کو قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے چنانچہ ارشاد باری ہے۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَا تَخَافُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ○ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ

الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ○ وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدٰى ○ (سورۃ طٰہٰ)

اور (پھر دیکھو) ہم نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی تھی کہ (اب) میرے بندوں کو راتوں رات (مصر سے) نکال لے جا پھر سمندر میں ان کے گذرنے کیلئے خشکی کی راہ نکال لے تجھے نہ تو تعاقب کرنے والوں سے اندیشہ ہوگا نہ اور کسی طرح کا خطرہ پھر (جب موسیٰ اپنی قوم کو لے کر نکل گیا تو) فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ اس کا پیچھا کیا پس پانی کا ریلا جیسا کچھ ان پر چھانے والا تھا چھا گیا یعنی جو کچھ ان پر گذرنی تھی گذر گئی) اور فرعون نے اپنی قوم پر راہ (نجات) گم کردی انہیں سیدھی راہ نہیں دکھائی۔

وَأَوْحَيْنَا إِلٰى مُوْسٰى أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِيْ إِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ○ فَأَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِيْنَ ○ إِنَّ هٰؤُلَاءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ○ وَإِنَّهُمْ لَنَا لَغَائِظُوْنَ ○ وَإِنَّا لَجَمِيْعٌ حَاذِرُوْنَ ○ فَأَخْرَجْنَاهُمْ مِّنْ جَنَّاتٍ وَّعُيُوْنٍ ○ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ○ كَذٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ ○ فَأَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ○ فَلَمَّا تَرَاءَ الْجَمْعَانِ قَالَ أَصْحَابُ مُوْسٰى إِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ○ قَالَ كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ○ فَأَوْحَيْنَا إِلٰى مُوْسٰى أَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ○ وَأَزْلَفْنَا ثَمَّ الْآخَرِيْنَ ○ وَأَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهُ أَجْمَعِيْنَ ○ ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخَرِيْنَ ○ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً وَّمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ○ (سورۃ شعراء)

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کہ رات کو لے نکل میرے بندوں کو البتہ تمہارا پیچھا کریں گے پھر بھیجے فرعون نے شہروں میں نقیب، یہ لوگ جو ہیں سو ایک جماعت ہے تھوڑی سی اور وہ مقرر ہم سے دل جلے ہوئے ہیں اور ہم سارے ان سے خطرہ رکھتے ہیں پھر نکال باہر کیا ہم نے ان کو باغوں اور چشموں سے اور خزانوں اور مکانوں سے اسی طرح اور ہاتھ لگا دیں ہم نے یہ چیزیں بنی اسرائیل کے پھر پیچھے پڑے ان کے سورج نکلتے کے وقت پھر جب مقابل ہوئیں دونوں فوجیں کہنے لگے موسیٰ علیہ السلام کے لوگ ہم تو پکڑے گئے کہا ہرگز نہیں میرے ساتھ ہے میرا رب وہ مجھ کو راہ بتائے گا پھر حکم بھیجا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کہ مار اپنے عصا سے دریا کو پھر دریا پھٹ گیا تو ہو گئی ہر ایک پھانک جیسے بڑا پہاڑ اور پاس پہنچا دیا ہم نے اس جگہ دوسروں کو اور بچا دیا ہم نے موسیٰ کو اور جو لوگ تھے اس کے ساتھ سب کو پھر ڈبا دیا ہم نے ان دوسروں کو اس چیز میں ایک نشانی ہے اور نہیں تھے بہت لوگ ان میں ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِآيَاتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غَافِلِيْنَ ○ وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا

وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ○ (الاعراف)

بالآخر ہم نے (ان کی بد عملیوں پر) انھیں سزا دی یعنی اس جرم کی پاداش میں کہ ہماری نشانیں جھٹلائیں اور ان کی طرف سے غافل رہے انھیں سمندر میں غرق کر دیا اور جس قوم کو کمزور حقیر خیال کرتے تھے اسی کو ملک کے تمام پورب کا اور اس کے مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے وارث کر دیا اور اس طرح (اے پیغمبر!) تیرے پروردگار کا فرمان پسندیدہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کہ (ہمت و ثبات کے ساتھ جمے رہے تھے اور فرعون اور اس کا گروہ (اپنی طاقت و شوکت کیلئے) جو کچھ بناتا رہا تھا اور جو کچھ (عمارتوں کی) بلندیاں اٹھائی تھیں وہ سب درہم برہم کر دیں!

وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَآئِيْلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهُ بَغْيًا وَّعَدْوًا حَتّٰٓى إِذَآ أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنْتُ أَنَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا الَّذِيٓ آمَنَتْ بِهِ بَنُوْٓ إِسْرَآئِيْلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○ آٰلْاٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ○ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً وَإِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُوْنَ ○ (سورہ یونس)

اور پھر ایسا ہوا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا یہ دیکھ کر فرعون اور اس کے لشکر نے پیچھا کیا۔ مقصود یہ کہ ظلم و شرارت کریں، لیکن جب حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ فرعون سمندر میں غرق ہونے لگا تو اس وقت پکار اٹھا "میں یقین کرتا ہوں کہ اس ہستی کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں، اور میں بھی اسی کے فرماں برداروں میں ہوں!" (ہم نے کہا) "ہاں، اب تو ایمان لایا حالانکہ پہلے برابر نافرمانی کرتا رہا اور تو دنیا کے مفسد انسانوں میں سے ایک (بڑا ہی) مفسد تھا" پس آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچا لیں گے، تاکہ ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں، (قدرت حق کی) ایک نشانی ہو) اور اکثر انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں کی طرف سے یک قلم غافل رہتے ہیں۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ○ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُوْدَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِيْنَ ○

(سورہ قصص)

اور بڑائی کرنے لگے وہ اور اس کے لشکر ملک میں ناحق اور سمجھے کہ وہ ہماری طرف پھر کر نہ آئیں گے پھر پکڑا ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو پھر پھینک دیا ہم نے ان کو دریا میں سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام گناہگاروں کا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ○ أَنْ أَدُّوْٓا إِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ إِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ○ وَأَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ إِنِّيٓ آتِيْكُمْ بِسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ ○

وَإِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ ۝ وَإِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوا لِي فَاعْتَزِلُونِ ۝ فَدَعَا رَبَّهُ أَنَّ هٰؤُلَاءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُونَ ۝ فَأَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُمْ مُّتَّبَعُونَ ۝ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا إِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُونَ ۝ كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَّعُيُونٍ ۝ وَّزُرُوعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيمٍ ۝ وَّنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ ۝ كَذٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ ۝ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنْظَرِينَ ۝ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ ۝ مِنْ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِينَ ۝ (سورہ الدخان)

اور جانچ چکے ہم ان سے پہلے فرعون کی قوم کو اور آیا ان کے پاس رسول عزت والا کہ حوالہ کرو میرے بندے خدا کے تمہارے پاس آیا ہوں بھیجا ہوا معتبر اور یہ کہ سرکشی نہ کرو اللہ کے مقابل میں لایا ہوں تمہارے پاس سند کھلی ہوئی اور میں پناہ لے چکا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو اور اگر تم نہیں یقین کرتے مجھ پر تو مجھ سے پرے ہو جاؤ پھر لے نکل رات میں میرے بندوں کو البتہ تمہارا پیچھا کریں گے اور چھوڑ جا دریا کو تھما ہوا البتہ وہ لشکر ڈوبنے والے ہیں بہت سے چھوڑ گئے باغ اور چشمے کھیتیاں اور گھر عمدہ اور آرام کا سامان جس میں باتیں بنایا کرتے تھے، یونہی ہوا اور وہ سب ہاتھ لگا دیا ہم نے ایک دوسری قوم کے پھر نہ رویا ان پر آسمان اور زمین اور نہ ملی ان کو ڈھیل اور ہم نے بچا نکالا بنی اسرائیل کو ذلت کی مصیبت سے جو فرعون کی طرف سے تھی بے شک وہ تھا چڑھ رہا حد سے بڑھ جانے والا۔

فَأَرَادَ أَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِنَ الْأَرْضِ فَأَغْرَقْنَاهُ وَمَنْ مَّعَهُ جَمِيعًا ۝ وَقُلْنَا مِنْ بَعْدِهِ لِبَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ اسْكُنُوا الْأَرْضَ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا ۝

(سورہ بنی اسرائیل)

پھر چاہا بنی اسرائیل کو چین نہ دے اس زمین میں پھر ڈبا دیا ہم نے اس کو اور اس کے ساتھ والوں کو سب کو اور کہا ہم نے اس کے پیچھے آباد رہو تم زمین میں پھر جب آئے گا وعدہ آخرت کا لے آئیں گے ہم تم کو سمیٹ کر۔

وَفِي مُوسٰى إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۝ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهِ وَقَالَ سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ۝ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ ۝

(سورۃ الذاریات)

اور نشانی ہے موسیٰ کے حال میں جب بھیجا ہم نے اس کو فرعون کے پاس دے کر کھلی سند پھر اس نے منہ موڑ لیا اپنے زور پر اور بولا یہ جادوگر ہے یا دیوانہ پھر پکڑا ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو پھر پھینک دیا ان کو دریا میں اور اس پر لگا الزام۔

البتہ تورات نے بیان کردہ واقعات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تفصیلات بیان کی ہیں اور بنی اسرائیل کے کوچ

اور پڑاؤ کے اکثر مقامات کے نام بھی بتائے ہیں جو دنیا کے لئے نامعلوم ہیں۔

تورات کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ فرعون اور اسکی قوم پر جب خدا کی بھیجی ہوئی آفات کا سلسلہ جاری ہو گیا اور موسیٰ ؑ کے ارشاد کے مطابق یکے بعد دیگرے "نشانات" کا ظہور ہونے لگا تو اس نے حضرت موسیٰ ؑ کو بلا کر کہا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لیجا مگر ان کے چوپائے اور پالتو جانور یہیں چھوڑنے ہوں گے حضرت موسیٰ ؑ نے اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ایک جانور بھی تو روکنے کا حق نہیں رکھتا، تب فرعون غضبناک ہو کر کہنے لگا کہ اب بنی اسرائیل نہ جا سکیں گے اور تو اب میرے سامنے کبھی نہ آنا ورنہ میرے ہاتھ سے مارا جائیگا، احضرت موسیٰ ؑ سے فرمایا کہ یہ تو نے ٹھیک کہا اب میں کبھی تیرے سامنے نہ آؤں گا، میرے خدا کا یہی فیصلہ ہے اور اس نے مجھ کو بتا دیا ہے کہ تجھ پر اور تیری قوم پر ایسی سخت آفت آئے گی کہ تیرا کسی مصری کا پہلوٹھا زندہ نہیں رہے گا۔

موسیٰ ؑ فرعون سے یہ گفتگو کر کے دربار سے باہر نکل آئے اور پھر بنی اسرائیل سے یہ فرمایا کہ خداوند خدا کا ارشاد ہے کہ فرعون کا دل سخت ہو گیا ہے وہ اب تم کو یہاں سے اس وقت تک نہ جانے دے گا جب تک مزید نشان نہ دیکھ لے کہ جس سے تمام مصریوں میں کہرام مچ جائے مگر تم کو تیاری کر لینی چاہیے کہ مصر سے نکلنے کا وقت آپہنچا اور خدائے تعالیٰ نے موسیٰ ؑ کے ذریعہ بنی اسرائیل کو نکلنے سے پہلے قربانی اور عید فسح کا بھی حکم دیا اور اس کا طریقہ اور شرائط بھی بتا دیں، موسیٰ ؑ نے ان سے یہ بھی کہا کہ اپنی عورتوں سے کہو کہ وہ مصری عورتوں کے پاس جائیں اور ان سے عید کیلئے سونے چاندی کے زیور قیمتی پارچہ جات مستعار مانگ لائیں اور مصری عورتوں نے آخر ان کو زیورات دے دیئے پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک رات فرعون سے لیکر معمولی مصری کا پہلوٹھا مر گیا اور تمام گھرانوں میں کہرام مچ گیا۔

یہ دیکھ کر مصری فرعون کے پاس دوڑتے آئے اور اس کو مجبور کیا کہ اسی وقت تمام بنی اسرائیل کو مصر سے نکا دے تا کہ یہ نحوست یہاں سے دور ہو ہم پر یہ سب آفتیں انہی کی بدولت آتی رہتی ہیں۔

تب فرعون نے حضرت موسیٰ ؑ سے کہا کہ اسی وقت تم سب یہاں سے نکل جاؤ اور اپنے جانوروں، مویشیوں، اور سب سامان کو بھی ساتھ لے جاؤ، جب بنی اسرائیل رعمسیس (جشن کے شہر) سے نکلے تو بچوں اور جانوروں کے علاوہ وہ سب چھ لاکھ تھے اور جب وہ نکلے تو مصریوں کے زیورات کو بھی واپس نہ کر سکے اور مصریوں نے بھی مطالبہ نہ کیا۔

جب بنی اسرائیل نے جنگل کی راہ لی تو اب فرعون اور اس کے سرداروں کو اپنے فیصلہ پر سخت افسوس ہوا، اور انہوں نے آپس میں کہا کہ ہم نے مفت میں ایسے اچھے چاکر اور غلام ہاتھ سے کھو دیئے اور فرعون نے حکم دیا کہ فوراً سرداروں، مصری نوجوانوں اور فوج کو تیاری کا حکم دو اور وہ کر و فر کے ساتھ رتھوں میں سوار ہو کر نکل کھڑے ہوئے اور بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔

بنی اسرائیل رعمسیس سے سکات اور وہاں سے ایتام اور پھر مڑ کر مجدال اور بحر احمر کے درمیان فی ہیخروت کے پاس بعل صفون کے سامنے خیمہ زن ہو چکے تھے بنی اسرائیل کے اس پورے سفر میں خدا ان کے ساتھ رہا اور وہ

نورانی ستون کی تجلی کے ساتھ رات میں بھی ان کی راہنمائی کرتا اور دن میں بھی آگے آگے چلتا غرض صبح کی پو پھٹ رہی تھی کہ فرعون نے سمندر کے کنارے بنی اسرائیل کو آلیا۔ انہوں نے پیچھا پھر کر دیکھا اور فرعون کو لاؤ لشکر کے ساتھ اپنے قریب پایا تو بددل اور خائف ہو کر حضرت موسیٰ سے جھگڑا کرنے لگے حضرت موسیٰ نے ان کو بہت کچھ تسلی و تشفی دی اور بتایا کہ تمہارے دشمن ہلاک ہوں گے اور تم سلامتی و عافیت کے ساتھ نجات پاؤ گے، اور پھر دربار خداوندی میں مناجات کرنے لگے۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو کیوں مجھ سے فریاد کر رہا ہے، بنی اسرائیل سے کہو کہ وہ آگے بڑھیں اور تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصے کر اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے..... پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے"۔

.... خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہ و بالا کر دیا اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا غرق کر دیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوڑا، پھر بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ دیواروں کی طرح رہا۔

... اور اسرائیلیوں نے وہ بڑی قدرت جو خداوند نے مصریوں پر ظاہر کی دیکھی اور وہ لوگ خداوند سے ڈرے اور خداوند پر اور اس کے بندے موسیٰ پر ایمان لائے۔

(خروج باب ۱۴ آیت ۱۵ تا ۳۱)

تورات کی ان تفصیلات میں اگرچہ بہت زیادہ رطب و یابس اور دور از کار باتیں بھی ضمناً آگئی ہیں مگر وہ اور قرآن عزیز دونوں اس بارہ میں ہم آہنگ ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قہرمانیت کے مظالم سے موسیٰ اور بنی اسرائیل کو ایک عظیم الشان نشان (معجزہ) کے ذریعہ نجات دی۔ قرآن عزیز کہتا ہے کہ یہ معجزہ اس طرح ظاہر ہوا کہ خدا کے حکم سے موسیٰ نے قلزم پر لاٹھی ماری اور دریا کا پانی بیچ میں خشکی دے کر دونوں جانب پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔

فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝ (الشعراء)

پس (دریا) پھٹ گیا پھر ہر ایک جانب ایک بڑے پہاڑ کی مانند ہو گئی۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ (بقرہ)

اور جب ہم نے ٹکڑے کر دیا تمہارے لیئے سمندر پس نجات دی ہم نے تم کو اور غرق کر دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم دیکھ رہے تھے۔

اور تورات بھی اسی کی تائید کرتی ہے چنانچہ اس میں مذکور ہے۔

"تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصے کر اور پانی ان کے دائیں بائیں دیوار کی طرح رہا۔"

البتہ تورات میں یہ اضافہ اور ہے کہ "رات بھر تند پوربی ہوا چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا" سو اول تو تورات کی تحریف اور مختلف سنین کے مختلف تراجم کے پیش نظر تاریخی اور مذہبی اور دونوں حیثیتوں سے قرآن عزیز کے بیان ہی کو قابل اعتماد سمجھا جائے گا کیوں کہ وہ باتفاق دوست و دشمن ہر قسم کی تحریف و تبدیل اور اضافہ و ترمیم سے محفوظ ہے۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۝

اس پر باطل کا کسی جانب سے گذر نہیں نہ سامنے سے اور نہ پیچھے سے وہ اتارا ہوا ہے ایسی ہستی کی جانب سے جو حکمت والا خوبیوں والا ہے۔

علاوہ ازیں اس اضافہ کی تطبیق کی بہترین صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موسیٰ کے ہاتھ بڑھا کر عصا چلانے سے اول دریا کے دو حصے ہو گئے اور دونوں جانب پانی کھڑا ہو گیا اور پھر لاکھوں انسانوں نے جب اس کے درمیان سے گذرنا شروع کیا تو زمین کی نمی اور تری کو خشک کرنے کے لئے برابر پوربی تند ہوا چلتی رہی تاکہ بچہ سے بوڑھے تک اور انسان سے حیوان تک کسی کو بھی گذرنے میں زحمت و تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔

یہ بدقسمتی سے مسلمانوں میں بعض ایسے افراد بھی ہیں جو "علم" کے نام سے مذہب کے ہر مسئلہ کو مبادیات ہی تک محدود دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسلئے خدا کے دیئے ہوئے ان نشانات (معجزات) کا بھی انکار کرتے ہیں جو انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کی تائید اور دلیل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں ان کے انکار کے وہی معنی ہیں جو گذشتہ صفحات پر معجزہ کی بحث میں زیر بحث آچکے ہیں یعنی وہ خدا کے کسی فعل کو بھی کسی حالت میں اس محسوس اور مادی دنیا کے اسباب و علل سے مستثنیٰ مان لینے کو آمادہ نہیں ہیں کیونکہ ان کے الحاد و زندقہ کی بنیاد دراصل مغربی الحاد و زندقہ پر قائم ہے اور ان کا دل و دماغ اس ہی سے مرعوب اور متاثر ہے جسکا لازمی نتیجہ میٹریلزم (Materialism) پر اعتقاد و اعتماد کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

پس منجملہ دوسرے مقامات کے انہوں نے اس مقام پر بھی یہ کوشش کی ہے کہ کسی طرح غرق فرعون کا یہ واقعہ روحانی معجزہ سے نکل کر مادی اسباب و علل کے تحت میں آجائے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے لئے سرگرم عمل ہستی سید احمد خان (سر سید) (مرحوم) بھی علوم عربیہ اور علوم دینیہ سے ناواقفیت کے باوجود مسطورۂ بالا عقیدہ کی ترویج میں پیش پیش ہیں غالباً اس طرح وہ یورپ کی موجودہ زندگی کے ساتھ اسلام کو مطابق کرنا چاہتے تھے مگر مادیت کا یہ چولا چونکہ اس کے قد پر راست نہ آیا اسلئے انہوں نے چولے کی ترمیم کے بجائے اسلام کے نقشہ اور قد و قامت میں ترمیم شروع کر دی مگر اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

بے شبہ اسلام ایک ایسا روحانی مذہب ہے جو روحانیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی میں بھی انسان کے عروج اور فلاح و بہبود کا کفیل ہے اور اس لئے ہر زمانے کے علوم و فنون کی ترقی اس کی آغوش میں پلتی اور اس

میں جذب ہوتی رہی ہے اور علم و حکمت ہمیشہ اس کے سایۂ عاطفت میں نشو نما پاتے رہے لیکن مادی علوم کی حدود مادیات و مشاہدات اور محسوسات سے آگے کسی حال میں متجاوز نہیں ہو سکتیں اور آج سائنس اور کل کا فلسفہ دونوں اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ہماری حدود محسوسات سے پرے نہیں ہیں یعنی محسوسات و مادیات کی دیوار کے پیچھے کیا ہے؟ وہ اس سے لاعلمی تو ظاہر کرتے ہیں مگر ان کا انکار نہیں کرتے۔

اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ گذشتہ اور موجودہ زمانہ میں جب کبھی علوم "نظریوں" "تھیوریز" سے آگے بڑھ کر محسوس اور مشاہدہ کی حد تک پہنچے ہیں تو ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ وہ اسلام کے اصول سے ٹکراتا ہو یا اسلام میں اس کا انکار پایا جاتا ہو تب ایسی صورت میں جب تک علمی نظریوں تھیوریوں میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی اور علمی تحقیقات ایک جگہ چھوڑتی اور دوسری جگہ بناتی رہتی ہیں تو اسلام کو ان کے مطابق کرنے کی سعی عبث ہے کیوں کہ مشاہدہ کی حد پر پہنچنے کے بعد بے شبہ ان کا فیصلہ قرآن کے فیصلہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

البتہ اسلام یا مذہب حق چند ایسے امور کا بھی اقرار کرتا ہے جو ان مادیات کی دنیا سے پرے کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً آخرت، حشر و نشر، جنت، جہنم، ملائکہ، وحی، نبوت اور معجزہ، مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان میں سے کوئی امر بھی خلاف عقل یعنی عقل کی نگاہ میں ناممکن اور محال نہیں ہے تاہم عقل کے لئے اس کی کنہ و حقیقت کا ادراک صرف اسی قدر ہو سکتا ہے جس قدر کہ مذہب نے اپنے علم یقین (وحی الٰہی) کے ذریعہ اس کو بتادیا ہے اور ان باتوں کے سمجھنے کیلئے وحی کے سوائے عقل کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

بہر حال سید احمد خاں صاحب نے تفسیر احمدی میں اس مقام کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ غرق فرعون اور نجات بنی اسرائیل کا یہ واقعہ معجزہ نہ تھا بلکہ عام دنیوی سلسلہ اسباب و علل کے ماتحت بحر کے "مد و جزر" (جوار بھاٹا) سے تعلق رکھتا ہے یعنی صورت حال یہ پیش آئی کہ جس وقت بنی اسرائیل نے قلزم کو عبور کیا تھا اس وقت اس کا پانی سمٹا ہوا تھا اور پیچھے کو ہٹ کر اس نے جزر اختیار کر رکھا تھا فرعون نے جب بنی اسرائیل کو اس آسانی سے پار ہوتے دیکھا تو اس نے لشکر کو داخل ہونے کا حکم دیدیا مگر بنی اسرائیل پار ہو چکے تھے اور فرعونی لشکر ابھی دریا کی خشکی پر چل ہی رہا تھا کہ اس کے مد اور آگے بڑھنے کا وقت آپہنچا اور فرعون اور اس کے لشکر کو اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ وہ آگے بڑھ سکے یا پیچھے ہٹ سکے اور سب غرق ہو گئے۔

سید صاحب نے اپنے اس مزعومہ خیال کے مطابق بنی اسرائیل کے عبور کے متعلق ایک نقشہ بھی دیا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنی اسرائیل نے قلزم کے شمالی دہانہ پر جا کر اس کو عبور کیا ہے۔

مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قرآن عزیز کی تصریحات اس کی قطعی انکار کرتی ہیں اور سید صاحب کی بات کسی طرح بنائے نہیں بنتی۔

اس بات کا فیصلہ تو قطعی ناممکن ہے کہ خاص وہ مقام متعین کیا جا سکے کہ جس سے بنی اسرائیل گذرے اور دریا کو عبور کر گئے کیونکہ اس سلسلے میں گذشتہ تاریخ کا پرانا ذخیرہ تورات ہے مگر اس کے بیان کردہ مقام موجودہ نسل کیلئے نامعلوم اسماء کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

البتہ قرآن اور تورات کی مشترک تصریحات ونصوص سے یہ قطعی متعین کیا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل نے بحر قلزم کے کسی کنارے اور دہانہ سے عبور کیا یا درمیانی کسی حصہ سے۔"

اس کیلئے ایک مرتبہ نقشہ میں اس حصہ پر نظر ڈالئے جہاں بحر احمر (قلزم یا ریڈ سی) (Red Sea) واقع ہے۔ دراصل یہ بحر عرب کی ایک شاخ ہے جس کے مشرق میں سرزمین عرب واقع ہے اور مغرب میں مصر۔ شمال میں اس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں ایک شاخ (خلیج عقبہ) جزیرہ نمائے سینا کے مشرق میں اور دوسری (خلیج سویز) اس کے مغرب میں واقع ہے یہ دوسری شاخ پہلی سے بڑی ہے اور شمال میں بڑی دور تک چلی گئی ہے بنی اسرائیل اسی کے درمیان سے گذرے ہیں اس شاخ کے شمالی دہانہ کے سامنے ایک اور سمندر واقع ہے جس کا نام بحر روم (Mediterranean Sea) ہے۔

اور بحر روم اور بحر احمر کے اس شمالی دہانہ کے درمیان تھوڑا سا خشکی کا حصہ ہے یہی وہ راستہ تھا جہاں سے مصر سے فلسطین اور کنعان جانے والے کو بحر احمر عبور کرنا نہیں پڑتا تھا اور اس زمانہ میں یہ راہ قریب کی راہ سمجھی جاتی تھی اور بنی اسرائیل نے بحکم الٰہی یہ راہ اختیار نہیں کی تھی اب اسی خشک زمین کو کھود کر بحر احمر (ریڈ سی) کو بحر روم سے ملا دیا گیا ہے اور اس ٹکڑے کا نام نہر سویز ہے اور ریڈ سی کے شمالی دہانہ پر سویز کے نام سے ایک شہر آباد ہے جو مصر کی بندرگاہ شمار ہوتا ہے۔

اب اس کے بعد قرآن عزیز کی سورہ بقرہ اور سورہ شعرائے کی ان آیات پر پھر ایک مرتبہ غور کرنا چاہئے جو

اس سلسلہ کی تصریحات پیش کرتی ہیں ان آیت میں دو باتوں کا صاف صاف تذکرہ موجود ہے ایک فلق یا فرق بحر یعنی دریا کا پھٹنا یا اس کو پھاڑ دینا اور دوسرے دونوں جانب پانی پہاڑ کی طرح کھڑا ہو جانا اور درمیان میں راستہ پیدا ہو جانا۔ [illegible] ۔

عربی لغت میں فرق کے معنی دو ٹکڑے کر کے جدا کر دینے کے آتے ہیں خصوصاً "بحر" کی نسبت کے ساتھ چنانچہ کتب لغت میں ہے "فرق البحر ای فلقہ" سر کی مانگ کو بھی "فرق" اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ سر کے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے بیچ میں نکالی جاتی ہے اور "فلق" کے متعلق اس طرح مذکور ہے "فلق الشئ، شقہ والفلق، الشق، یعنی اس نے فلاں شے کو ٹکڑے کر دیا اور وہ ٹکڑے ہو گئی" اسی لئے "فالق" اس دارز کو کہتے ہیں جو پتھر کے درمیان ہو جاتی ہے اسی طرح "طود" کے معنی بڑے پہاڑ کے ہیں "الطود، الجبل العظیم"۔ پس ان لغوی تصریحات کے بعد ان ہر دو آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہوا کہ دریا کا پانی یقیناً دو ٹکڑے ہو گیا اور وہ دونوں جانب دو ٹکڑے ہوئے پہاڑ کی طرح بن گیا اور درمیان میں راستہ پیدا ہو گیا اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ بنی اسرائیل نے دریا کے ایسے حصہ سے عبور کیا ہو جو دہانہ اور کنارہ کے سامنے کا حصہ نہ ہو بلکہ پانی کا ایسا حصہ ہو جو درمیان سے پھٹ کر دو حصے بن سکتا ہو دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجئے کہ قرآن عزیز صاف صاف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ بنی اسرائیل خشکی کی راہ سے قلزم کے دہانہ یا کنارے سے نہیں گذرے تھے بلکہ دریا کے کسی درمیانی حصہ کو عبور کر کے میدان سینا میں پہنچے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ "مدوجزر" (جوار بھاٹا) طولانی حصہ میں دہانہ کی جانب ہوا کرتا ہے عرض میں اس طرح کبھی بھی نہیں ہوتا کہ پانی دونوں جانب سمٹ جائے اور بیچ میں خشکی کی راہ پیدا ہو جائے لہٰذا خدائے تعالیٰ کے اس عظیم الشان "نشان" (معجزہ) کا انکار کرتے ہوئے اس کو روزمرہ کے مادی اسباب کے نیچے لانے کی سعی کرنا قرآنی تصریحات کے بالکل خلاف اور اس کی تحریف کے مرادف ہے۔

نیز تورات نے بنی اسرائیل کے اس عبور کے واقعہ میں "بحر احمر" کے جن مشرقی اور مغربی کنارہ کے مقامات کا ذکر کیا ہے اور اس عبور کے متعلق جو تصریحات بیان کی ہیں ان سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ عبور دہانہ پر سے نہیں تھا بلکہ شمال مغرب کے درمیانی حصہ سے ہوا تھا جیسا کہ نقشہ سے واضح ہوتا ہے۔

بعض مغرب زدہ "ملحدوں" نے اس مقام پر جب کسی طرح انکار معجزہ کی بات بنتی نہ دیکھی تو تورات کے اس فقرہ کا سہارا لیا۔

اور خداوند نے رات بھر آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا۔

اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ خشک زمین دریا کے بیچ میں نکلتی تھی تو بھی یہ معجزہ نہ تھا بلکہ رات بھر خشک راستہ بن گیا تھا مگر جب فرعون کی باری آئی تو آفتاب کی تمازت نے بستہ برف کو پگھلایا اور پانی اصلی حالت پر آ گیا اور مصری غرق ہو گئے۔

تو اس کے متعلق نجار مصری نے خوب کہا ہے کہ اگر بالفرض ان کی اس باطل تاویل کو تسلیم بھی کر لیا

جائے تب بھی یہ ''معجزہ'' ہوا اسلئے کہ سمندروں کے وجود سے لے کر آج تک کسی جگہ یہ ثابت نہیں ہے کہ اس طرح ہوا چل کر ان کے درمیان میں خشک راہ بنا دیتی ہو، علم تاریخ اور طبیعات دونوں اس قسم کے واقعہ سے یکسر خالی ہیں۔

پس عام مادی علل واسباب سے جدا اگر ہوا کا یہ عمل صرف حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون اور اس کے لشکر کے غرق ہی کے لئے مخصوص تھا اور مخصوص رہا تو پھر یہ ''معجزہ'' نہیں تو اور کیا ہے؟

بہر حال قرآن عزیز صراحت کرتا ہے کہ بحر قلزم میں غرق فرعون اور نجات موسیٰ کا یہ واقعہ موسیٰ کی تائید میں ایک عظیم الشان معجزہ تھا اور اگر کائنات کی کوئی شہادت بھی اس واقعہ کے اعجاز میں موجود نہ ہوتی تب بھی ہمارے لئے ''وحی الہٰی'' کا یہ فیصلہ ایک ناطق فیصلہ ہے اور مومن کا ایمان دور از کار تاویلات سے جدا اصل حقیقت ہی کے ساتھ وابستہ ہے اور ہمارا یقین ہے کہ موسیٰ کی صداقت کیلئے یہ ایسا عظیم معجزہ تھا جس نے تمام مادی قہرمانیت اور سامان استبدادیت کو ایک لمحہ میں شکست دے کر مظلوم قوم کو ظالم قوم کے پنجہ سے رستگاری دلائی۔[1] واللہ علیٰ کل شیء قدیر۔

وَأَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ أَجْمَعِيْنَ ۝ ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۚ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ (سورۂ شعراء)

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے تمام ساتھیوں کو نجات دی پھر دوسروں کو (یعنی ان کے دشمنوں کو) غرق کر دیا بلاشبہ اس واقعہ میں (خدا کا زبردست) نشان (معجزہ) ہے اور اکثر ان کے ایمان نہیں لاتے اور اقرار نہیں کرتے اور بلاشبہ تیرا رب ہی (سب پر) غالب رحمت والا ہے۔

واقعہ کی ان تفصیلات کے بعد مسلکہ نقشہ کو سامنے رکھنے سے بیان کردہ حقائق بخوبی واضح ہو سکتے ہیں اور منکرین معجزہ نے اس واقعہ کے حقائق پر پردہ ڈالنے کیلئے جو باطل تاویلات کی ہیں انکی حقیقت اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے۔

---

[1] نجار کہتے ہیں کہ غرق فرعون اور عبور بنی اسرائیل کی جگہ آج متعین اور منضبط نہیں ہے کہ ٹھیک ٹھیک اس جگہ کو بتایا جا سکے، البتہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ یہ جگہ وہ ہے جو آج ''برکہ فرعون'' (فرعون کے پانی میں بیٹھ جانے کی جگہ) کے نام سے مشہور ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اسلئے کہ یہ بحر احمر کی بندرگاہ سوئیز سے بہت دور ہے۔ مثلاً اگر جہاز شام کے وقت سوئیز سے روانہ ہو تو آدھی رات کے بعد اس مقام پر پہنچے گا۔ لہٰذا یہ مقام وہ جگہ ہرگز نہیں ہے بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ اس زمانہ میں ''قلزم'' کی خلیج جو خلیج سوئیز کے نام سے مشہور ہے۔ بحر روم کے قریب تک پھیلتی چلی گئی تھی اور اس سے بہت نزدیک تھی۔ لہٰذا بنی اسرائیل کے عبور کی جگہ وہ ہو سکتی ہے جو آج ''عیون موسیٰ'' کے نام سے مشہور ہے اور جو شمال مشرق میں واقع ہے۔ اس وقت میرے پاس محمد رفعت کا اطلس (اٹلس) موجود ہے۔ اس میں عبور بنی اسرائیل کیلئے جو خط کھینچ کر دکھلائے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ یہ عبور سوئیز اور بحیرہ مرہ کے درمیان ہوا ہے اور عیون موسیٰ بھی یہیں شمال مشرق میں واقع ہے۔ (قصص الانبیاء ص ۳۴۲،۳۴۱)

فرعون، قوم فرعون اور عذاب قیامت

فرعون اور حضرت موسیٰ کا یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ حق و باطل کے معرکوں میں ایک عظیم الشان معرکہ ہے اور ایک جانب غرور نخوت، جبر و ظلم اور قہرمانیت وانانیت کی ذلت اور رسوائی ہے تو دوسری جانب مظلومیت خداپرستی اور صبر واستقامت کی فتح وکامرانی کا عجیب غریب مرقع اسلئے اللہ تعالیٰ نے فرعون اور قوم فرعون کی ہلاکت دنیوی کے بعد عبرت وبصیرت کیلئے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اس قسم کے لوگوں کیلئے آخرت اور سرمدی وابدی زندگی میں کس قدر سخت عذاب اور خدائی پھٹکار کے کیسے عبرتناک سامان مہیا ہیں تاکہ سلیم اور صالح طبائع اور نیک نہاد و نیک سرشت ہستیاں ان کا مطالعہ کریں اور ان اعمال زشت سے خود بھی بچائیں اور دوسروں کو بھی بچنے کی ترغیب دیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ ○ إِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا أَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَآ أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ○ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ○ وَأُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيَامَةِ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ○ (هود)

اور (یہ بھی ہو چکا ہے کہ) ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور واضح سند کے ساتھ بھیجا تھا فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف مگر وہ فرعون کی بات پر چلے، اور فرعون کی بات راست بازی کی بات نہ تھی قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا (جس طرح دنیا میں گمراہی کے لئے ہوا) اور انہیں دوزخ میں پہنچائے گا تو دیکھو) کیا ہی پہنچنے کی بری جگہ ہے جہاں وہ پہنچ کر رہے! اور اس دنیا میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگی کہ ان کا ذکر کبھی پسندیدگی کے ساتھ نہیں کیا جاتا اور قیامت میں بھی کہ عذاب آخرت کے مستحق ہوئے تو دیکھو کیا ہی براصلہ ہے جو ان کے حصہ میں آیا۔

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ إِلَى النَّارِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ○ وَأَتْبَعْنَاهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيَامَةِ هُمْ مِنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ○ (قصص)

اور کیا ہم نے ان کو پیشوا کہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور قیامت کے دن ان کو مدد نہ ملے گی اور پیچھے رکھ دی ہم نے ان پر اس دنیا میں پھٹکار اور قیامت کے دن ان پر اس دنیا میں پھٹکار اور قیامت کے دن ان پر برائی ہے۔

وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ○ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَّيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوْٓا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ○ (مومن)

اور الٹ پڑا فرعون والوں پر بری طرح کا عذاب وہ آگ ہے کہ دکھلا دیتے ہیں ان کو صبح اور شام اور جس دن قائم ہوگی قیامت حکم ہوگا داخل کرو فرعون والوں کو سخت سے سخت عذاب میں۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ○ طَعَامُ الْأَثِيْمِ ○ كَالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ○ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ○ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ إِلَىٰ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ○ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَأْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ○ ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ○ إِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ○ (دخان)

بلاشبہ سیہنڈ کا درخت خوراک ہے گنہگار کی جیسے کھولتا پانی، پکڑو اس کو اور ڈھکیل کر لیجاؤ دوزخ میں پھر ڈالو اس کے سر پر پانی کا عذاب، اس کو چکھ! تو ہی ہے بڑا عزت والا سردار، یہ وہی ہے جس کے متعلق تم دھوکے میں پڑے تھے۔

عبور قلزم کے بعد بنی اسرائیل کا پہلا مطالبہ

تورات میں ہے کہ جب بنی اسرائیل سلامتی کے ساتھ بحر قلزم کو پار کر گئے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے فرعون اور اس کی فوج کو غرق ہوتے اور پھر ان کی نعشوں کو ساحل پر تیرتے دیکھ لیا تو بتقاضائے فطرت بے حد مسرت اور خوشی کا اظہار کیا، اور عورتوں نے خصوصیت کے ساتھ دف پر خوشی کے گیت گائے اور شادمانی و خوش کامی کا ثبوت دیا جب یہ سب کچھ ہو چکا تو حضرت موسیٰ نے قوم کو جمع کر کے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنی قوم سے کہو کہ وہ میں ہوں جس نے تم کو اس زبردست فتنہ سے نجات دی سو میرا شکر ادا کرو اور میری ہی بندگی کرو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اب اپنی قوم کو ساتھ لے کر بیابان شور سے ہوتے ہوئے سین یا سینا کی راہ لی، سینا کے بت کدروں میں پرستاران صنم بتوں کی پوجا میں مشغول تھے بنی اسرائیل نے یہ منظر دیکھا تو کہنے لگے ''موسیٰ علیہ السلام! ہم کو بھی ایسے ہی معبود بنادے تاکہ ہم بھی اسی طرح ان کی پرستش کریں۔ حضرت موسیٰ نے قوم کی زبانی یہ مشرکانہ مطالبہ سنا تو بہت زیادہ ناراض ہوئے اور بنی اسرائیل کو ڈانٹا، عار دلائی اور ملامت کی کہ بد بختو! خدائے واحد کی پرستش چھوڑ کر بتوں کی پوجا پر مائل ہو اور خدا کی ان تمام نعمتوں کو فراموش کر بیٹھے جن کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر چکے ہو۔''

قومی پستی کا مظاہرہ

دنیا کی تاریخ میں ہمارے سامنے ایک قوم کا نقشہ حیات اس طرح نظر آتا ہے کہ وہ تقریباً ساڑھے چار سو برس سے مصر کے قاہر و جابر بادشاہوں اور مصری قوم کے ہاتھوں میں غلام اور مظلوم چلی آتی ہے اور غالب قوم کے سخت سے سخت مصائب و مظالم کا شکار بن رہی ہے کہ اچانک اسی مردہ قوم میں سے بجلی کی کڑک اور آفتاب کی چمک کی طرح ایک برگزیدہ ہستی سامنے آتی ہے اور اس کی صدائے حق اور اعلان ہدایت سے تمام قلمرو باطل لرزہ براندام ہو جاتی اور ایوان ظلم و کفر میں بھونچال آجاتا ہے وہ دنیا کی ایک زبردست متمدن طاقت کے مقابلہ میں یہ اعلان کرتی ہے کہ میں خدائے واحد کا رسول اور ایلچی ہوں اور تجھ کو ہدایت کی پیروی

اور مظلوم قوم کی آزادی کا پیغام سنانے آیا ہوں، فرعونی طاقت اپنے تمام مادی اسباب کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتی ہے مگر ہر مرتبہ شکست کا منہ دیکھتی ہے اور آخری بازی میں حق کی کامیابی اور باطل کی ہلاکت کا ایسا حیرت زا نقشہ سامنے آتا ہے کہ مادی طاقت قلزم میں غرق ہو جاتی اور غلام و مظلوم قوم اور دنیوی اسباب و وسائل سے محروم قوم آزادی کے گیت گاتی نظر آتی ہے۔

یہ ہے وہ عجیب و غریب فطرت اور حیران کن طبیعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی قوم "بنی اسرائیل" جو ان تمام معرکہ ہائے حق و باطل کو آنکھوں سے دیکھنے اور حق کی کامیابی کیساتھ اپنی نجات پاجانے کے شکریہ میں آج موسیٰ سے یہاں مطالبہ یہ کرتی ہے کہ ہم کو بھی ایسے ہی معبود (بت) بنادے جیسا کہ یہ پجاری بت خانہ میں بیٹھے پوجتے رہتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اگرچہ بنی اسرائیل نبیوں کی اولاد تھے اور ابھی تک ان میں وہ اثرات ایک حد تک باقی بھی تھے جو ان کو باپ دادا سے ورثہ میں ملے تھے تاہم صدیوں سے مصری بت پرستوں میں بود و ماند کرنے اور ان کے حاکمانہ اقتدار میں غلام رہنے کی وجہ سے ان میں صنم پرستی کا جذبہ کافی سرایت کر چکا تھا اور وہی جذبہ تھا جو آج پجاریوں کو دیکھ کر ان میں ابھر آیا اور وہ موسیٰ سے ایسا ناپاک مطالبہ کر بیٹھے۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى أَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُوْا يَامُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ إِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ قَالَ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْغِيْكُمْ إِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ ۝ (اعراف)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا پھر ان کا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں کے سامنے لگائے بیٹھی تھی تو کہنے لگے موسیٰ! جیسے ان کے معبود بت ہیں ایسے ہی ہمارے لئے بھی بنادے موسیٰ نے کہا افسوس تم پر بلاشبہ تم جاہل قوم ہو لاریب ان لوگوں کا طریقہ تو ہلاکت کا طریقہ ہے اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں باطل ہے (اور یہ بھی) کہا کہ باوجود اس کے کہ تم کو خدا نے تمام کائنات پر فضیلت دی ہے پھر بھی میں تمہارے لئے خدائے واحد کے سوا اور معبود تلاش کروں؟

بنی اسرائیل کے دیگر مطالبات اور آیات بینات کا ظہور

بنی اسرائیل نے بحر قلزم کو پار کر کے جس سرزمین پر قدم رکھا یہ عرب کی سرزمین تھی جو قلزم کے مشرق میں واقع ہے یہ لق ودق بے آب و گیاہ میدان سے شروع ہوتی ہے جو تورات کی زبان میں بیابان شور سین وادی سینا (تیہ) کے نام سے مشہور ہے اور طور تک اس کا دامن وسیع ہے، یہاں شدید گرمی پڑتی ہے دور دور تک سبزہ اور پانی کا پتہ نہیں، اس لئے بنی اسرائیل گھبرا اٹھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کرنے لگے کہ ہم پانی کہاں سے پئیں ہم تو پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے۔ یہاں تو پینے کے لئے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درگاہ الٰہی میں التجا کی اور وحی الٰہی نے ان کو حکم دیا کہ اپنا عصا زمین

پر مار دو۔ حضرت موسیٰ نے تعمیل ارشاد کی تو فوراً بارہ سوت ابل پڑے اور بنی اسرائیل کے بارہ اسباط (قبائل) کیلئے جدا جدا چشمے جاری ہو گئے بنی اسرائیل کو جب اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو اب کہنے لگے کہ پانی کا تو انتظام ہو گیا لیکن زندگی کیلئے صرف یہی تو کافی نہیں ہے۔ ہم کو بھوک لگی ہے اب کھائیں کہاں سے؟ یہاں تو کوئی صورت نظر نہیں آتی؟ حضرت موسیٰ نے پھر رب العلمین کی بارگاہ میں دعاء کی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ موسیٰ! تمہاری دعاء قبول ہوئی پریشان نہ ہو ہم غیب سے سب انتظام کئے دیتے ہیں اور پھر ایسا ہوا کہ جب رات بیت گئی اور صبح ہوئی تو بنی اسرائیل نے دیکھا کہ زمین اور درختوں پر جگہ جگہ سپید اولے کے دانے کی طرح شبنم کی صورت میں آسمان سے کوئی چیز برس کر گری ہوئی ہے کھایا تو نہایت شیریں حلوے کی مانند تھی یہ من تھا اور دن میں تیز ہوا چلی اور تھوڑی دیر میں بٹیروں کے غول کے غول آکر زمین پر اترے اور پھیل گئے بنی اسرائیل نے بآسانی ان کو ہاتھوں سے پکڑ لیا اور بھون کر کھانے لگے۔ یہ سلویٰ تھا اس طرح روزانہ بغیر زحمت و تکلیف کے ان کو یہ دونوں نعمتیں مہیا ہو جاتیں لیکن خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی معرفت بنی اسرائیل کو یہ تنبیہ کر دی تھی کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق من و سلویٰ کو کام میں لائیں، اور دوسرے دن کیلئے ذخیرہ نہ کریں ہم ان کو روزانہ یہ نعمت عطا کرتے رہیں گے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد اص ۹۵-۹۶)

کھانے اور پینے کی ضروریات کی فراہمی سے جب اطمینان ہو گیا تو اب بنی اسرائیل نے تیسرا مطالبہ یہ کیا گرمی کی شدت اور سایہ دار درختوں اور مکانوں کی راحت میسر نہ ہونے کی وجہ سے ہم بہت پریشان ہیں، ایسا نہ ہو کہ یہ تپش اور تمازت ہماری زندگی کا خاتمہ ہی نہ کر دے حضرت موسیٰ نے ان کو تشفی دی اور بارگاہ قدس میں عرض کیا کہ جب تو نے ان پر بڑے بڑے انعامات اور فضل و کرم کی بارش کی ہے تو اس تکلیف سے بھی ان کو نجات عطا فرما، حضرت موسیٰ کی دعا سنی گئی اور آسمان پر بادلوں کے پرے کے پرے بنی اسرائیل پر سایہ فگن ہو گئے اور بنی اسرائیل جہاں بھی سفر کرتے ہوئے جاتے بادلوں کا یہ سائبان اُن کے سروں پر سایہ فگن رہتا۔

سدی کی ایک روایت میں ان ہر سہ "آیات اللہ" کا تذکرہ یکجا اس طرح مذکور ہے جب بنی اسرائیل "تیہ" کے میدان میں پہنچے تو کہنے لگے "موسیٰ! اس لق و دق میدان میں ہمارا کیا حشر ہو گا کہاں سے کھائیں گے کہاں سے پئیں گے اور کہاں سے سایہ حاصل کریں گے؟ تب اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانے کے لیے من و سلویٰ اتارا پینے کیلئے بارہ چشمے جاری کر دیے اور سایہ کے لئے بادل سایہ فگن ہو گئے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد اص ۹۷)

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ (سورہ بقرہ)

اور پھر (وہ واقعہ بھی یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تھا اور ہم نے حکم دیا تھا اپنی لاٹھی سے پہاڑ کی چٹان پر ضرب لگاؤ، تم دیکھو گے کہ پانی تمہارے لئے موجود ہے، موسیٰ نے اس حکم

ن تقسیم کی) چنانچہ بارہ چشمے پھوٹ نکلے، اور تمام لوگوں نے اپنے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کرلی (اس وقت تم سے کہا گیا تھا اس بے آب و گیاہ بیابان میں تمہارے لئے زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا ہوگئی ہیں، پس) کھاؤ پیو، خدا کی بخشائش سے فائدہ اٹھاؤ اور ایسا نہ کرو کہ ملک میں فتنہ و فساد پھیلاؤ (یعنی ضروریات معیشت کیلئے لڑائی جھگڑا کردیا ہر طرف لوٹ مار مچاتے پھرو)

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (سورۂ بقرہ)

اور (پھر جب ایسا ہوا تھا کہ صحرا ءسینا کی بے آب و گیاہ سرزمین میں دھوپ کی شدت اور غذا کے نہ ملنے سے تم ہلاک ہو جانے والے تھے) تو ہم نے تمہارے سروں پر ابر کا سایہ پھیلا دیا، اور من اور سلویٰ کی غذا کے لئے جو اچھی چیزیں مہیا کردی ہیں انہیں بفراغت کھاؤ اور کسی طرح کی تنگی و قلت محسوس نہ کرو (لیکن اس پر بھی تم اپنی بد عملیوں سے باز نہ آئے، غور کرو) تم نے اپنی ناشکریوں سے ہمارا کیا بگاڑا؟ خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے!

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى أُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝ وَقَطَّعْنَاهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أُمَمًا ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلٰى مُوْسٰٓى إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهٗٓ أَنِ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۖ كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (اعراف)

اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک گروہ (ضرور) ایسا ہے جو لوگوں کو سچائی کی راہ چلاتا اور سچائی ہی کے ساتھ (ان کے معاملات میں انصاف بھی کرتا ہے اور ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ خاندانوں کے بارہ گروہوں میں منقسم کردیا اور جب لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام سے پینے کے ملئیے پانی مانگا تو ہم نے وحی کی کہ اپنی لاٹھی (ایک خاص) چٹان پر مارو چنانچہ بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنی اپنی جگہ پانی کی معلوم کرلی اور ہم نے بنی اسرائیل پر ابر کا سایہ کردیا تھا اور ان کی غذا کیلئے من اور سلویٰ اتارا تھا ہم نے کہا تھا "یہ پسندیدہ غذا کھاؤ جو ہم نے عطا کی ہے" (اور فتنہ اور فساد میں نہ پڑو) انہوں نے (نافرمانی کرکے) ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا خود اپنے ہاتھوں اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔

يٰبَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ قَدْ أَنْجَيْنَاكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنَاكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْأَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۝ كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝ وَإِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝ (سورۂ طٰہٰ)

اے بنی اسرائیل! میں نے تمہارے دشمن سے تمہیں نجات بخشی، تم سے (برکتوں اور کامرانیوں کا) وعدہ کیا جو کوہ طور کے داہنی جانب ظہور میں آیا تھا، تمہارے لئے (صحرائے سینا میں) من اور سلویٰ مہیا کر دیا، تمہیں کہا گیا یہ پاک غذا مہیا کر دی گئی ہے شوق سے کھاؤ (مگر اس بارہ میں سرکشی نہ کرو) کرو گے تو میرا غضب نازل ہو جائے گا اور جس پر میرا غضب نازل ہو تو بس وہ (ہلاکت میں گرا) اور میں نے کہا) جو کوئی توبہ کرے، ایمان لائے، نیک عمل ہو تو میں یقیناً اس کے لئے بڑا ہی بخشش والا ہوں۔

عبد الوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں لکھا ہے کہ پانی کے وہ چشمے جن کا ذکر بنی اسرائیل کے واقعات میں آیا ہے بحر احمر کے مشرقی بیابان میں سوئز سے زیادہ دور نہیں ہیں اور اب بھی عیون موسیٰ ﷺ (موسیٰ کے چشمے) کے نام سے مشہور ہیں، ان چشموں کا پانی اب بہت کچھ سوکھ گیا ہے اور بعض کے تو آثار بھی قریب قریب معدوم ہو گئے ہیں اور کہیں کہیں ان چشموں پر اب کھجور کے باغات نظر آتے ہیں۔

قرآن عزیز کے ذکر کردہ واقعات سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عصاء مار کر پانی کے حاصل کرنے کا واقعہ صرف ایک ہی مرتبہ پیش نہیں آیا بلکہ تیہ کے میدان میں "مختلف مقامات پر متعدد مرتبہ پیش آیا ہے۔ بہر حال حضرت موسیٰ ﷺ کے طفیل بنی اسرائیل پر خدائے تعالیٰ کے احسانات کی مسلسل بارش ہوتی رہی اور سیکڑوں برس کی غلامی نے ان کے عزائم کی پستی، اخلاقی کمزوری اور ہمت و شجاعت کے فقدان نے ان پر جو ایک مستقل مایوسی اور ناامیدی طاری کر دی تھی ان خدائی نشانات نے بڑی حد تک ان کی ڈھارس بندھائے رکھی مگر عجیب الفطرت قوم پر اس کا بھی کافی اثر نہ ہوا اور انہوں نے اپنی بوالعجبی کا ایک نیا مظاہرہ پیش کر دیا ایک دن سب جمع ہو کر کہنے لگے "موسیٰ! ﷺ ہم روز روز ایک غذا کھاتے رہنے سے گھبرا گئے ہیں۔ ہم کو اس من و سلویٰ کی ضرورت نہیں، اپنے خدا سے دعا کر کہ وہ ہمارے لئے زمین سے باقلا، کھیرا، ککڑی، مسور، لہسن، پیاز جیسی چیزیں اگائے تاکہ ہم خوب کھائیں"۔

حضرت موسیٰ ﷺ کو ان کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا، اور فرمانے لگے تم بھی کس قدر احمق ہو کہ ایک عمدہ اور بہترین غذا کو چھوڑ کر معمولی اور گھٹیا قسم کی چیزوں کے طلبگار بنے ہو اور اس طرح خدائی نعمتوں کی ناسپاسی اور اس کے احسانات کی ناشکری کر کے کفران نعمت کرتے ہو؟ پس اگر واقعی تم کو یہ نعمتیں نہیں بھاتیں اور جن چیزوں کا تم نام لے رہے ہو ان ہی کے لئے اصرار کرتے ہو تو درگاہ الٰہی سے ان کو نشانات کی طرح طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے جاؤ کسی بستی اور شہر میں چلے جاؤ وہاں ہر جگہ تم کو یہ چیزیں وافر مل جائیں گی۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَامُوسَىٰ لَنْ نَصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَا سَأَلْتُمْ (بقرہ)

اور جب تم نے کہا "موسیٰ!" ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے پس اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دعا کر کہ وہ زمین سے ہمارے لئے باقلا، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز جیسی چیزیں اگائے، موسیٰ ﷺ نے کہا۔ کیا تم بہتر اور

مدہ چیز کے بدلے میں گھٹیا چیز کے خواہش مند ہو کسی شہر میں جا قیام کرو، بلاشبہ وہاں یہ سب کچھ مل جائے گا جس کے تم طلب گار ہو۔

طور پر اعتکاف

حضرت موسیٰ سے خدا کا وعدہ تھا کہ جب بنی اسرائیل مصری حکومت کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے تو تم کو شریعت دی جائے گی۔ اب وہ وقت آ گیا کہ خدا کا وعدہ پورا ہو، اسلئے حضرت موسیٰ وحی الٰہی سے طور پر پہنچے اور وہاں عبادت الٰہی کیلئے اعتکاف کیا، اس اعتکاف کی مدت ایک مہینہ تھی مگر بعد میں دس دن اور بڑھا کر چلا پورا کر دیا۔

دیلمی نے حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کا ایک ماہ کا اعتکاف ختم ہو گیا تو انہوں نے خدائے تعالیٰ سے ہم کلامی کی تیاری شروع کی چونکہ مکمل ایک ماہ روزہ ہی میں بسر کئے تھے اس لئے منہ میں بو محسوس کرتے۔ لہٰذا انہوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ رب العلمین سے اس حالت میں ہم کلام ہوں اور انہوں نے ایک خوشبودار بوٹی کو چبایا اور کھالیا، فوراً ہی وحی الٰہی نے ٹوکا، موسیٰ! تم نے ہم کلامی سے پہلے روزہ کیوں افطار کر لیا؟ حضرت موسیٰ نے اس کی وجہ بیان کر دی، تب حکم ہوا کہ موسیٰ! اس مدت کو دس دن بڑھا کر چالیس دن کر دو کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے یہاں ایک روزہ دار کے منہ کی بو بھی مشک کی خوشبو سے زیادہ محبوب ہے اور اس طرح یہ "چلہ" پورا ہوا۔[1]

مگر قرآن کریم نے صرف اسی قدر ذکر کیا ہے کہ یہ مدت اول تیس دن تھی اور پھر بڑھا کر چالیس دن کر دی گئی وجہ بیان نہیں کی۔[2]

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (اعراف)

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا پھر دس راتیں بڑھا کر اسے پورا (چلہ) کر دیا، اس طرح پروردگار کے حضور آنے کی مقررہ میعاد چالیس راتوں کی پوری میعاد ہو گئی۔

حضرت موسیٰ جب طور پر چلہ کشی کیلئے تشریف لے گئے تو حضرت ہارون کو اپنا جانشین بنا گئے کہ وہ بنی اسرائیل کو راہ حق پر قائم رکھیں اور ہر معاملہ میں ان کی نگرانی کریں۔

وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (اعراف)

اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون نے سے کہا! تو میرے پیچھے میری قوم میں میرا نائب رہنا اور ان کی اصلاح کا خیال رکھنا اور مفسدوں کی راہ پر نہ چلنا۔

---

1. روح المعانی جلد ۹ ص ۳۸۔ لیکن دیلمی، محققین اسماء الرجال کی نظر میں قابل اعتماد نہیں ہے۔ (مؤلف)
2. روحانی ریاضیات کیلئے صوفیائے کرام کی "چلہ کشی" غالباً اسی واقعہ سے اخذ کی گئی ہے، تجربہ بتاتا ہے کہ کسی کام پر استقامت حاصل کرنے کیلئے عموماً یہ مدت مفید ثابت ہوتی ہے۔

تجلی ذات؟

جب "چلہ" پورا ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہم کلامی کا شرف بخشا تو حضرت موسیٰ نے غایت کیف و انبساط میں عرض کیا خدایا! جب تو نے مجھ کو لذت و کیف سماع سے نوازا ہے تو پھر لذت مشاہدہ و دیدار سے کیوں محروم رہوں؟ اس سے بھی سر فراز فرما" وہاں سے جواب ملا موسیٰ! تم مشاہدۂ ذات کی تاب نہ لا سکو گے اچھا دیکھو ہم اپنی ذات کی تجلی کا ظہور اس پہاڑ پر کریں گے، اگر یہ اس تجلی کو برداشت کر لے تو پھر تم یہ سوال کرنا۔" اس کے بعد طور پر حضرت حق کی تجلی نے ظہور کیا تو پہاڑ کا وہ حصہ ریزہ ریزہ ہو گیا، اور حضرت موسیٰ بھی اس نظارہ کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو گئے اور گر پڑے۔

جب حضرت موسیٰ کو ہوش آیا تو انہوں نے خدائے برتر کی حمد و ثنا کی اور اپنے سوال سے رجوع کیا اور کہا کہ میں اقرار کرتا ہوں اور ایمان لاتا ہوں کہ تیرے جمال کی تجلی و عرفان اور نمود حق میں کوئی کمی نہیں نقصان صرف میری اپنی ہستی کے عجز و بیچارگی کا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (اعراف)

اور جب موسیٰ آیا تا کہ ہمارے مقررہ وقت میں حاضری دے اور اسکے پروردگار نے اس سے کلام کیا تو پکار اٹھا پروردگار! مجھے اپنا جمال دکھا کہ تیری طرف نظر کر سکوں حکم ہوا تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا ہاں، اس پہاڑ کی طرف دیکھ! اگر یہ (تجلی حق کی تاب لے آیا اور) اپنی جگہ ٹکا رہا تو تو بھی مجھے دیکھ سکے گا پھر جب اسکے پروردگار نے تجلی کی تو اس تجلی نے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا جب موسیٰ ہوش میں آیا تو بولا "خدایا! تیرے لئے ہر طرح کی تقدیس ہو، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلے یقین کرنے والوں میں ہوں۔

نزول تورات

اس راز و نیاز کے بعد تورات عطا کی گئی، اور حضرت حق نے انکو حکم کیا کہ اس پر مضبوطی سے قائم رہو اور اپنی قوم سے کہنا کہ وہ بھی ان احکام پر اسطرح عمل کریں کہ جو عمل نیک جس قدر زیادہ قرب الٰہی کا سبب بنے اسکو دوسرے اعمال پر ترجیح دیں، میں نے اس کتاب میں تمہارے دینی و دنیوی فلاح کی تمام تفصیلات بیان کر دی ہے، اور حلال و حرام اور محاسن و معائب غرض تمام اوامر و نواہی کو کھول کر بیان کر دیا ہے اور یہی میری شریعت ہے۔

قَالَ يَامُوْسٰى اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَاتِيْ وَبِكَلَامِيْ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشَّاكِرِيْنَ ○ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفَاسِقِيْنَ ○ (سورۂ اعراف)

(اللہ تعالیٰ نے) کہا اے موسیٰ! بے شک میں نے لوگوں پر تجھ کو اپنی پیغمبری اور ہمکلامی سے برتری دی ہے اور چن لیا ہے پس جو میں نے تجھ کو (تورات) دیا ہے اس کو لے اور شکر گذار بن اور ہم نے اس کے لئے (تورات کی) تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور (احکام میں سے) ہر شے کی تفصیل لکھ دی ہے، پس اس کو قوت کے ساتھ پکڑ اور اپنی قوم کو حکم کر کہ وہ ان میں سے اچھی کو اختیار کریں، عنقریب میں تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا۔

اس مقام پر دو باتیں قابل توجہ ہیں (۱) علماء اسلام کہتے ہیں کہ طور کے اس واقعہ میں جن احکام کا نزول ہوا وہ تورات ہے اور علماء نصاریٰ کی موجودہ جماعت کہتی ہے کہ اس سے مراد وہ دس احکام ہیں جو مذہب موسوی میں "شریعت یا احکام عہد" کے نام سے موسوم ہیں یعنی خدا کے سوا کسی کو نہ پوجو، زنانہ کرو، چوری نہ کرو وغیرہ[1] اور بعض معاصر مفسرین نے بھی اس آیت کا مصداق احکام عہد ہی کو ٹھہرایا ہے لیکن یہ دوسرا قول قرآن عزیز اور تورات دونوں کی شہادت سے غلط ہے اور قول اول ہی صحیح اور درست ہے۔ اسلئے کہ قرآن عزیز نے سورہ بقرہ میں حضرت موسیٰ کے چلہ کا ذکر کرتے ہوئے جب نزول احکام کا تذکرہ کیا ہے تو اس کو کتاب اور فرقان کہا ہے اور یہ دونوں صفات قرآن عزیز میں تورات کیلئے بولی گئی ہیں نہ کہ احکام عہد کیلئے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظَالِمُوْنَ ○ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ (بقرہ)

اور جب عہد کیا ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا پھر بنالیا تم نے اس کے پیچھے گوسالہ اور تم اس بارہ میں ظالم تھے پھر ہم نے اس کے بعد تم کو معاف کر دیا تا کہ تم شکر گذار بنو اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق و باطل میں فرق کرنے والی (فرقان) چیز عطا کی تا کہ تم راہ پاؤ۔

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ○ (قصص)

اور بیشک ہم نے پہلی قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو کتاب دی جو لوگوں کو بصیرتیں مہیا

[1] خروج باب ۳۴، آیت ۲۸۔

کرنے والی اور ہدایت اور رحمت ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور اگرچہ تورات (موجودہ بائبل) کے سفر خروج، استثناء اور کتاب یسوع میں موسیٰ کے "چلہ" کے بعد "احکام عہد" یا "شریعت" کا لفظ پایا جاتا ہے لیکن مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی نور اللہ مرقدہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب اظہار الحق میں فارسی، عربی اور اردو قدیم تراجم کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ تورات کے ان نسخوں میں ان ہر دو الفاظ کی جگہ تورات لکھا ہوا پایا جاتا ہے چنانچہ مولانا عبدالحق رحمہ اللہ نے بھی تفسیر حقانی میں اردو فارسی بائبل مطبوعہ ۱۸۴۵ء و ۱۸۳۹ء سے حسب ذیل حوالے نقل کئے ہیں۔

۱ و بر آں سنگہا تمامی کلمات ایں تورات را بخط روشن بنویس۔ (استثناء باب ۲۷ آیت ۲۸)

۲ بنی اسرائیل نے بموجب حکم موسیٰ کے ایک مذبح بنایا اور اس کے پتھروں پر توریت کو لکھ دیا۔ (یسوع، باب ۸، آیت ۱۵، ۱۸۴۵ء)

ان حوالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جو الواح چلہ کے بعد دی گئیں وہ تورات کی تھیں! "احکام عہد" کی الواح نہیں تھیں، اور انگریزی نسخہ کے ترجمہ میں لا (Law) اور عربی و اردو نسخوں میں شریعت کو بھی صحیح مان لیا جائے تو یہ لفظ بھی اپنے معنی کی وسعت میں تورات پر صادق آتا ہے اور تورات، شریعت اور قانون سب کا مصداق ایک ہی چیز ہے اور قدیم عیسائی دنیا میں یہی معنی سمجھے جاتے رہے ہیں اور احکام عہد اسی کا ایک جز میں اور اس کو مستقل قرار دینا بہت بعد کی پیداوار ہے۔

۳ مسطورۂ بالا آیات میں مذکور ہے:

سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (الاعراف ۱۷)

عنقریب میں تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا۔

تو اس "دار" سے مراد کون سا مقام ہے؟ کہنے والوں نے قیاس اور تخمین سے مختلف جوابات دیے ہیں:

الف اس "دار" سے عاد و ثمود کے کھنڈر مراد ہیں۔

ب مصر سے مراد ہے کہ بنی اسرائیل دوبارہ اس میں داخل ہوں گے۔

ج قتادہؒ کہتے ہیں کہ اس سے شام کی مقدس سرزمین مراد ہے جہاں اس زمانہ میں عمالقہ کے جابر بادشاہوں کی حکومت تھی اور جہاں بنی اسرائیل کو داخل ہونا تھا۔[۱] نجار نے اسی کو ترجیح دی ہے اور میرے نزدیک یہی صحیح ہے رہا یہ امر کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے بوڑھے ان بستیوں میں داخل نہیں ہو سکے۔ اسلئے کہ حضرت موسیٰ کا انتقال ارض مقدس میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہو گیا تھا اور اسی طرح بنی اسرائیل کے بوڑھوں پر بھی آنے والی تفصیل کے مطابق اسکا داخلہ حرام کر دیا گیا تھا تو آیت کی یا تو یہ مراد ہے کہ بنی اسرائیل کے نوجوانوں کا داخلہ جن کی اکثریت تھی سب کا داخلہ ہے اور اس طرح کا استعمال شائع ذائع ہے اور یا یہ مراد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوشع بن نون اور کالب بن

---

۱ روح المعانی جلد ۵ ص ۵۳۔

یوشع اور چند بنی اسرائیل کے بہادروں کو ارض مقدس میں اس لئے بھیجا تھا کہ وہ وہاں کے مفصل حالات معلوم کر کے آئیں کہ ہم کس طرح دشمن کو شکست دے کر پاک سرزمین میں داخل ہو سکتے ہیں اور انہوں نے آکر تمام حالات بنی اسرائیل اور موسیٰ کے سامنے بیان کیئے تھے تو گویا ان معدودے چند افراد کا ارض مقدس میں داخل ہو کر اس کو دیکھ آنا اور پھر سب کو وہاں کے حالات سے آگاہ کرنا آیت میں اسی معاملہ کی جانب اشارہ ہے قتادہ کے قول کے مقابلہ میں پہلا قول اسلئے مرجوح ہے کہ اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل کبھی قومی اور جماعتی حیثیت سے مصر میں داخل نہیں ہوئے اور دوسرا قول اس لئے قابل اعتبار نہیں ہے کہ اگرچہ ثمود کے آثار وادی سینا کے قریب ضرور تھے، مگر عاد کے آثار و کھنڈرات تو عرب کے مغربی حصہ میں واقع تھے جو وادی سینا سے مہینوں کی راہ تھی تو ایسی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بنی اسرائیل کو صرف ان محو شدہ آثار و کھنڈرات کو دکھانے کیلئے بھیجا جاتا اور اس کیلئے خدا کا وعدہ اس شان کے ساتھ بیان ہوتا؟ مگر ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے جہنم مراد ہے اور کافروں کی تہدید کیلئے کہا گیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ سورۂ اعراف)

بہر حال حضرت موسیٰ کو تورات دی گئی اور ساتھ ہی یہ بھی بتادیا گیا کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جب کوئی قوم ہدایت پہنچنے اور اس کی صداقت پر دلائل اور روشن حجت آجانے کے باوجود بھی سمجھ سے کام نہیں لیتی اور گمراہی اور باپ دادا کی بری ریت رسم ہی پر قائم رہتی اور اس پر اصرار کرتی ہے تو پھر ہم بھی اس کو اس گمراہی میں چھوڑ دیتے ہیں اور ہمارے پیغام حق میں ان کے لئے کوئی حصہ باقی نہیں رہتا اس لئے کہ انہوں نے قبول حق کی استعداد اپنی متمردانہ سرکشی کی بدولت زائل کر دی قرآن عزیز نے اسی حقیقت کو اس انداز میں بیان کیا ہے۔

سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِنْ يَّرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَإِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَإِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِآيَاتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غَافِلِيْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (سورۂ اعراف)

جو لوگ ناحق خدا کی زمین میں سرکشی کرتے ہیں ہم اپنی نشانیوں سے ان کی نگاہیں پھرادیں گے وہ دنیا بھر کی نشانیاں دیکھ لیں پھر بھی ایمان نہ لائیں اگر وہ دیکھیں ہدایت کی سیدھی راہ سامنے ہے تو کبھی اس پر نہ چلیں، اگر دیکھیں گمراہی کی ٹیڑھی راہ سامنے ہے تو فوراً چل پڑیں، ان کی ایسی حالت اس لئے ہو جاتی ہے کہ ہماری نشانیں جھٹلاتے ہیں اور ان کی طرف سے غافل رہتے ہیں اور جن لوگوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائیں اور آخرت کے پیش آنے سے منکر ہوئے تو ان کے سارے کام اکارت ہو گئے وہ جو کچھ بدلہ پائیں گے وہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ان ہی کے کرتوتوں کا پھل ہوگا جو دنیا میں کرتے رہے۔

گوسالہ پرستی کا واقعہ

اس اثناء میں ایک اور عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس کو حیرت زا بھی کہہ سکتے ہیں اور افسوسناک بھی۔ اور جس سے بنی اسرائیل کی ذہنیت اور اخلاقی پستی بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے یعنی جبل طور یا حورب کے پہاڑ پر تو حضرت موسیٰ پروردگار عالم سے راز و نیاز میں مصروف اور بنی اسرائیل کے لئے آئین الٰہی (توراۃ) حاصل کرنے میں مشغول تھے اور نیچے وادی سینا میں بنی اسرائیل نے سامری کی قیادت میں خود ہی اپنا معبود (گوسالہ) منتخب کر کے اس کی سمادھ لگالی اور پرستش شروع کر دی۔

جمہور مفسرین کی تفسیر کے مطابق واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ جب طور پر تورات لینے کے لئے تشریف لے جانے لگے تو بنی اسرائیل سے یہ فرمایا کہ میرے اعتکاف کی مدت ایک ماہ ہے مدت پوری ہونے پر فوراً تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ہارون تمہارے پاس موجود ہیں یہ تمہارے احوال کے نگراں رہیں گے مگر طور پر جا کر وہ مدت تیس کی بجائے چالیس دن ہو گئی اس تاخیر سے ایک شخص سامری نے فائدہ اٹھایا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کی تاخیر سے مضطرب ہو رہے ہیں تو اس نے کہا کہ اگر تم اپنے وہ تمام زیورات میرے پاس لے آؤ جو تم نے مصریوں سے مستعار لئے تھے اور پھر واپس نہ کر سکے تو میں تمہارے فائدہ کی ایک بات کر دوں۔

سامری گو ظاہر میں مسلمان تھا مگر اس کے دل میں کفر شرک کی نجاست بھری ہوئی تھی، پس جب بنی اسرائیل نے تمام سونے زیورات لا کر اس کے حوالے کر دیئے تو اس نے ان کو بھٹی میں ڈال کر گلا دیا اور اس سے گوسالہ (بچھڑا) کا جسم تیار کیا اور پھر اپنے پاس سے ایک مشت خاک اس کے اندر ڈال دی، اس ترکیب سے گوسالہ میں آثار حیات پیدا ہو گئے اور وہ بچھڑے کی آواز "بھائیں بھائیں" بولنے لگا۔

اب سامری نے بنی اسرائیل سے کہا کہ موسیٰ سے غلطی اور بھول ہو گئی کہ وہ خدا کی تلاش میں طور پر گیا تمہارا معبود تو یہ موجود ہے۔

صفحات گذشتہ میں یہ اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ صدیوں تک مصر کی غلامی نے بنی اسرائیل میں مشرکانہ رسوم و عقائد کو پھیلا دیا تھا اور وہ اس رنگ میں کافی حد تک رنگے جا چکے تھے اور گوسالہ پرستی مصر کا قدیم عقیدہ تھا اور ان کے مذہب میں اس کو بہت اہمیت حاصل تھی اسی لئے ان کے ایک بڑے دیوتا (حورس) کا منہ گائے کی شکل کا تھا اور وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ کرۂ زمین گائے کے سر پر قائم ہے۔[1]

سامری نے جب بنی اسرائیل کو ترغیب دی کی وہ اس کے بنائے ہوئے گوسالہ کو اپنا معبود سمجھیں اور اس کی پوجا کریں تو انہوں نے بآسانی اس کو قبول کر لیا۔

حضرت ہارون نے یہ دیکھا تو بنی اسرائیل کو سمجھایا کہ ایسا نہ کرو یہ تو گمراہی کا راستہ ہے مگر انہوں نے ہارون کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے کہ جب تک موسیٰ نہ آ جائیں ہم اس سے باز آنے

[1] معلوم ہوتا ہے کہ تمام بت پرست اقوام میں گائے کی تقدیس اور گوسالہ پرستی مشترک عقیدہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیئے ہندوستان، عراق، ایران، چین اور جاپان کے بت پرستوں میں اس کی اہمیت یکساں نظر آتی ہے۔

والے نہیں۔

یہاں جب یہ نوبت پہنچی تو اللہ تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا ہوا کہ حضرت موسیٰ کو اس واقعہ سے مطلع کردے، اسلئے حضرت موسیٰ سے پوچھا "موسیٰ! تم نے قوم کو چھوڑ کر یہاں آنے میں اس قدر جلدی کیوں کی؟" حضرت موسیٰ نے عرض کیا خدایا! اسلئے کہ تیرے پاس جلد حاضر ہو کر قوم کیلئے ہدایت حاصل کروں اللہ تعالیٰ نے اس وقت ان کو بتایا کہ جسکی ہدایت کیلئے تم اس قدر مضطرب ہو وہ اس گمراہی میں مبتلا ہے حضرت موسیٰ نے یہ سنا تو ان کو سخت رنج ہوا اور غصہ و ندامت کے ساتھ قوم کی طرف واپس ہوئے اور قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا یہ تم نے کیا کیا؟ مجھ سے ایسی کون سی تاخیر ہو گئی تھی۔ جو تم نے یہ آفت برپا کی؟ یہ فرماتے جاتے تھے اور غیظ و غضب میں کانپ رہے تھے۔ حتیٰ کہ ہاتھ سے تورات کی الواح بھی گر گئیں۔

بنی اسرائیل نے کہا کہ ہمارا کوئی قصور نہیں مصریوں کے زیورات کے جو بوجھ ہم ساتھ لئے پھر رہے تھے وہ سامری نے ہم سے مانگ کر یہ سوانگ بنالیا اور ہم کو گمراہ کر دیا۔

"شرک" منصب نبوت کے لئے ایک ناقابل برداشت ہے اس لئے اور نیز اس لئے کہ حضرت موسیٰ بہت گرم مزاج تھے انہوں نے اپنے بھائی ہارون کی گردن پکڑ لی اور ڈاڑھی کی جانب ہاتھ بڑھایا تو حضرت ہارون نے فرمایا۔ "برادر! میری مطلق خطا نہیں ہے میں نے ان کو ہر چند سمجھایا مگر انہوں نے کسی طرح نہیں مانا اور کہنے لگے کہ جب تک موسیٰ نہ آجائے ہم تیری بات سننے والے نہیں بلکہ انہوں نے مجھ کو کمزور پاکر میرے قتل کا ارادہ کر لیا تھا جب میں نے یہ حالت دیکھی تو خیال کیا کہ اب اگر ان سے لڑائی کی جائے اور مومنین کا مین اور ان کے درمیان جنگ برپا ہو تو کہیں مجھ پر یہ الزام نہ لگایا جائے کہ میرے پیچھے قوم میں تفرقہ ڈال دیا اس لئے میں خاموشی کے ساتھ تیرا منتظر رہا پیارے بھائی! تو میرے سر کے بال نہ نوچ اور نہ ڈاڑھی پر ہاتھ چلا اس طرح دشمنوں کو ہنسنے کا موقعہ نہ دے"۔

ہارون کی یہ معقول دلیل سن کر حضرت موسیٰ کا غصہ ان کی جانب سے فرو ہو گیا اور اب سامری کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا۔

سامری! تو نے یہ کیا سوانگ بنایا ہے؟ سامری نے جواب دیا کہ میں نے ایسی بات دیکھی جو ان اسرائیلیوں میں سے کسی نے نہیں دیکھی تھی یعنی غرق فرعون کے وقت جبرئیل گھوڑے پر سوار اسرائیلیوں میں اور فرعونیوں کے درمیان حائل تھے، میں نے دیکھا کہ ان کے گھوڑے کے سُم کی خاک میں اثر حیات پیدا ہو جاتا ہے، اور خشک زمین پر سبزہ اگ آتا ہے تو میں نے جبرئیل کے گھوڑے کے قدموں کی خاک سے ایک مٹھی بھر لی اور اس خاک کو اس بچھڑے میں ڈال دیا اور اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے اور یہ "بھاں بھاں" کرنے لگا۔

حضرت موسیٰ نے فرمایا: اچھا اب تیرے لئے دنیا میں یہ سزا تجویز کی گئی کہ تو پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرے اور جب کوئی انسان تیرے قریب آئے تو اس سے بھاگتے ہوئے یہ کہنا مجھ کو ہاتھ نہ لگا، یہ تو دنیوی

عذاب ہے اور قیامت میں ایسے نافرمانوں اور گمراہوں کیلئے جو عذاب مقرر ہے وہ تیرے لئے وعدۂ الٰہی کی صورت میں پورا ہونے والا ہے۔

اے سامری! یہ بھی دیکھ کہ تو نے جس گوسالہ کو معبود بنایا تھا اور اس کی سادھ لگا کر بیٹھا تھا۔ ہم ابھی اس کو آگ میں ڈال کر خاک کئے دیتے ہیں اور اس خاک کو دریا میں پھینکے دیتے ہیں کہ تجھ کو اور تیرے ان بے وقوف مقتدیوں کو معلوم ہو جائے کہ تمہارے معبود کی قدر و قیمت اور طاقت و قوت کا یہ حال ہے کہ وہ دوسروں پر عنایت و کرم کیا کرتا خود اپنی ذات کو ہلاکت و تباہی سے نہ بچا سکا۔

بدبختو! یہ معمولی بات کبھی نہ سمجھ سکے کہ تمارا معبود صرف وہی ایک خدا ہے جس کا نہ کوئی ساجھی ہے نہ کوئی شریک اور وہ ہر شے کا عالم و دانا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (سورۃ البقرہ)

اور پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ موسیٰ سچائی کی روشن دلیلوں کے ساتھ تمہارے پاس آیا لیکن جب چالیس دن کے لئے تم سے الگ ہو گیا تو تم بچھڑے کے پیچھے پڑ گئے اور ایسا کرتے ہوئے یقیناً تم (شیوۂ ایمان میں ثابت قدم نہ تھے) ایمان سے منحرف ہو گئے تھے اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (دینِ الٰہی پر قائم رہنے کا) تم سے عہد لیا تھا اور کوہ طور کی چوٹیاں تم پر بلند کر دی تھیں (تو تم نے اس کے بعد کیا کیا؟ تمہیں حکم دیا گیا کہ) جو کتاب میں دی گئی ہے اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ اور اس کے حکموں پر کاربند رہو تم نے (زبان سے) کہا سنا اور دل سے کہا نہیں مانتے اور پھر ایسا ہوا کہ تمہارے کفر کی وجہ سے تمہارے دلوں میں گوسالہ پرستی رچ گئی اے پیغمبر! ان سے کہو (دعوت حق سے بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے) تم اپنے جس ایمان کا دعویٰ کرتے ہو، اگر وہ یہی ایمان ہے تو افسوس اس ایمان پر! کیا ہی بری راہ ہے جس پر تمہارا ایمان تمہیں لے جا رہا ہے!

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ فَلَا تُشْمِتْ

بِيَ الْأَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ ○ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِأَخِيْ وَأَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ ○ إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ○ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِهَا وَآمَنُوْا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ○ (سورۂ اعراف)

پھر ایسا ہوا کہ موسیٰ کی قوم نے اس کے (پہاڑ پر) چلے جانے کے بعد اپنے زیور کی چیزوں سے (یعنی زیور کی چیزیں گلا کر) ایک بچھڑے کا دھڑ بنایا جس سے گائے کی سی آواز نکلتی تھی اور اسے (پرستش کے لئے) اختیار کر لیا (افسوس ان کی عقلوں پر) کیا انہوں نے اتنی (موٹی سی) بات بھی نہ سمجھی کہ نہ تو وہ ان سے بات کرتا ہے نہ کسی طرح کی رہنمائی کر سکتا ہے؟ وہ اسے لے بیٹھے اور وہ (اپنے اوپر) ظلم کرنے والے تھے پھر جب ایسا ہوا کہ) افسوس و ندامت سے (ہاتھ ملنے لگے اور انہوں نے دیکھ لیا کہ (راہ حق سے) قطعاً بھٹک گئے ہیں تو کہنے لگے اگر ہمارے پروردگار نے ہم پر رحم نہیں کیا اور بخشا تو ہمارے لئے تباہی کے سوا کچھ نہیں ہے"! اور جب موسیٰ خشمناک اور افسوس کرتا ہوا اپنی قوم میں لوٹا تو اس نے کہا "افسوس تم پر! کس برے طریقہ پر تم نے میرے پیچھے میری جانشینی کی تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں ذرا بھی صبر نہ کر سکے" اس نے (جوش میں آکر تختیاں پھینک دیں اور ہارون کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا، ہارون نے کہا" اے میرے ماں جائے بھائی!) میں کیا کروں (لوگوں نے مجھے بے حقیقت سمجھا، اور قریب تھا کہ قتل کر ڈالیں، پس میرے ساتھ ایسا نہ کر کہ دشمن ہنسیں، اور نہ مجھے (ان) ظالموں کے ساتھ شمار کر، موسیٰ نے کہا" پروردگار! میرا قصور بخش دے (کہ جوش میں آ گیا) اور میرے بھائی کا بھی (کہ گمراہوں کو سختی کے ساتھ نہ روک سکا) اور ہمیں اپنی رحمت کے سایہ میں داخل کر! تجھ سے بڑھ کر کون ہے جو رحم کرنے والا ہو۔ خدا نے فرمایا" جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی، ان کے حصے میں ان کے پروردگار کا غضب آئے گا، اور دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی پائیں گے ہم افترا پردازوں کو (ان کی بد عملی کا) اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ہاں! جن لوگوں نے برائیوں کے ارتکاب کے بعد (متنبہ ہو کر) توبہ کر لی، اور ایمان لے آئے تو بلاشبہ تمہارا پروردگار توبہ کے بعد بخش دینے والا رحمت والا ہے!"

اور جب موسیٰ کی خشمناکی فرو ہوئی، تو اس نے تختیاں اٹھا لیں ان کی کتابت میں (یعنی ان حکموں میں جو ان پر لکھے ہوئے تھے ان لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے جو اپنے پروردگار کا ڈر رکھتے ہیں۔

وَمَآ أَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يَامُوْسٰى ○ قَالَ هُمْ أُولَآءِ عَلٰى أَثَرِيْ وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ○ قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ○ فَرَجَعَ مُوْسٰى إِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ أَسِفًا قَالَ يَاقَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا

حَسَنًا أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ أَمْ أَرَدْتُمْ أَنْ يَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُمْ مَوْعِدِيْ ۝ قَالُوْا مَآ أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ أَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنَاهَا فَكَذٰلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ ۝ فَأَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ إِلٰهُكُمْ وَإِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ ۝ أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۝ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُوْنُ مِنْ قَبْلُ يَاقَوْمِ إِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَأَطِيْعُوْٓا أَمْرِيْ ۝ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوْسٰى ۝ قَالَ يَاهَارُوْنُ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوْا ۝ أَلَّا تَتَّبِعَنِ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِيْ ۝ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَأْسِيْ إِنِّيْ خَشِيْتُ أَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ۝ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَاسَامِرِيُّ ۝ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ۝ قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ وَانْظُرْ إِلٰٓى إِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ۝ إِنَّمَآ إِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ)

اور جب موسیٰ طور پر حاضر ہوا تو ہم نے پوچھا) "اے موسیٰ! کس بات نے تجھے جلدی پر ابھارا اور تو قوم کو پیچھے چھوڑ کر چلا آیا؟ موسیٰ نے عرض کیا وہ مجھ سے دور نہیں میرے نقش قدم پر ہیں اور اے پروردگار! میں نے تیرے حضور آنے میں جلدی کی کہ تو خوش ہو، فرمایا مگر ہم نے تیرے پیچھے تیری قوم کی (استقامت کی) آزمائش کی اور سامری نے اسے گمراہ کر دیا پس موسیٰ خشمناک اور افسوس کرتا ہوا قوم کی طرف لوٹا اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! یہ تم نے کیا کیا؟) کیا تم سے تمہارے پروردگار نے ایک بڑی بھلائی کا وعدہ نہیں کیا تھا؟ پھر کیا ایسا ہوا کہ تم پر بڑی مدت گذر گئی (اور تم اسے یاد نہ رکھ سکے؟) یا یہ بات ہے کہ تم نے چاہا تمہارے پروردگار غضب تم پر نازل ہو اس لئے تم نے مجھ سے ٹھہرائی ہوئی بات توڑ ڈالی؟ انہوں نے کہا "ہم نے خود اپنی خواہش سے عہد شکنی نہیں کہ بلکہ (ایک دوسرا ہی معاملہ پیش آیا مصری) قوم کی زیب و زینت کی چیزوں کا ہم پر بوجھ پڑا تھا یعنی بھاری بھاری زیوروں کا جو مصر میں پہنے جاتے تھے ہم اس بوجھ کے رکھنے کے خواہش مند نہ تھے وہ ہم نے پھینک دیا (بس ہمارا اتنا ہی قصور ہے) چنانچہ اس طرح (جب سونا فراہم ہو گیا تو) سامری نے اسے آگ میں ڈالا اور ان کیلئے ایک

(سنہرا بچھڑا بنا کر) نکال لایا، محض ایک دھڑ جس سے گائے کی سی آواز نکلتی تھی، لوگ یہ دیکھ کر بول اٹھے یہ ہے ہمارا معبود اور موسیٰ ؑ کا بھی مگر وہ بھول میں پڑ گیا (افسوس ان کی سمجھ پر!) کیا انہیں یہ (موٰسی) بات بھی دکھائی نہ دی کہ بچھڑا (آواز تو نکالتا ہے مگر) ان کی بات کا جواب نہیں دے سکتا اور نہ انہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان؟ اور ہارون ؑ نے اس سے پہلے انہیں (صاف صاف) جتا دیا تھا "بھائیو! یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمہاری (استقامت کی) آزمائش ہو رہی ہے تمہارا پروردگار تو خدائے رحمٰن ہے، دیکھو! میری پیروی کرو اور میرے کہے سے باہر نہ ہو۔" مگر انہوں نے جواب دیا تھا جب تک موسیٰ ؑ ہمارے پاس واپس نہ آجائے ہم اس کی پرستش پر جمے ہی رہیں گے بہرحال موسیٰ ؑ نے (اب ہارون ؑ سے) کہا "اے ہارون! جب تو نے دیکھا یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں تو کیا بات ہوئی کہ انہیں روکا نہیں؟ کیا تو نے پسند کیا کہ میرے حکم سے باہر ہو جائے؟ ہارون ؑ بولا اے میرے عزیز بھائی! میری ڈاڑھی اور سر کے بال نہ نوچ (میں نے اگر سختی میں کمی کی، تو صرف اس خیال سے کہ) میں ڈرا، کہیں تم یہ نہ کہو، تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میرے حکم کی راہ نہ دیکھی" تب موسیٰ نے (سامری سے) کہا "سامری! یہ تیرا کیا حال ہوا؟" کہا میں نے وہ بات دیکھ لی تھی جو اوروں نے نہیں دیکھی تو میں نے فرشتہ کے نقش قدم (کی مٹی) سے ایک مٹھی بھر لی پھر اس کو (ڈھلے ہوئے بچھڑے میں) ڈال دیا، میرے جی نے ایسی ہی بات مجھے سجھائی" موسیٰ ؑ نے کہا "اگر ایسا ہے تو پھر جا، زندگی میں تیرے لئے یہ ہونا ہے کہ کہے میں اچھوت ہوں اور آخرت میں عذاب کا) ایک وعدہ ہے جو کبھی ٹلنے والا نہیں اور دیکھ تیرے (گڑھے ہوئے) معبود کا اب کیا حال ہوتا ہے جس کی پوجا پر جم کر بیٹھ رہا تھا ہم اسے جلا کر راکھ کر دیں گے اور راکھ سمندر میں اڑا کر بہا دیں گے، معبود تو تمہارا بس اللہ ہی ہے اس کے سوا کوئی نہیں وہی ہے جو چیز پر اپنے علم سے چھایا ہوا ہے۔

آیات مسطورۂ بالا میں حسب ذیل آیت کی تفسیر کے متعلق مفسرین کے درمیان کلام ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ○ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ○ (سورہ طٰہٰ)

موسیٰ ؑ نے کہا "پس اے سامری! تیرا یہ کیا معاملہ ہے" سامری نے کہا "میں نے اس چیز کو دیکھا جس چیز کو انہوں نے نہیں دیکھا پس میں نے "رسول" کے نشان سے ایک مٹھی بھر لی پھر اس کو ڈال دیا اور میرے جی نے یہی سجھا دیا۔

دراصل اس آیت میں چند باتیں زیر بحث ہیں اور ان ہی کے فیصلہ پر کل واقعہ کی تفسیر کا مدار ہے:

۱: سامری نے وہ کیا شے دیکھی جو دوسروں نے یعنی بنی اسرائیل نے نہیں دیکھی؟

۲: فَقَبَضْتُ قَبْضَةً سے کیا مراد ہے؟

۳: اَثَرِ الرَّسُوْلِ میں رسول سے مراد حضرت موسیٰ ہیں یا جبرئیل فرشتہ؟

۴: فَنَبَذْتُهَا سے کیا مراد ہے؟

واقعہ کی گذشتہ تفصیلات سے اگر جمہور کی رائے معلوم ہو چکی ہے تاہم مختصر طور پر اس کو حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کی زبانی پھر سن لیجئے۔

''جس وقت بنی اسرائیل پھٹے دریا میں پیٹھے (گھسے) پیچھے فرعون ساتھ فوج کے پیٹھا (داخل ہوا)''

جبرائیل بیچ میں ہوگئے کہ ان کو ان تک نہ پہنچنے دیں، سامری نے پہنچانا کہ یہ جبرائیل ہیں ان کے پاؤں کے نیچے سے مٹھی بھر مٹی اٹھالی وہی اب اس سونے کے بچھڑے میں ڈال دی، سونا تھا۔

کافروں کا مال لیا ہوا فریب سے اس میں مٹی پڑی برکت کی، حق و باطل مل کر ایک ''کرشمہ'' پیدا ہوا کہ رونق جاندار کی اور آواز اس میں ہوگئی ایسی چیزوں سے بچنا چاہیے اسی سے بت پرستی بڑھتی ہے۔

اس تفسیر کے متعلق صاحب روح المعانی ارشاد فرماتے ہیں۔

آیت کی یہ تفسیر وہ ہے جو صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور جلیل القدر مفسرین سے منقول ہے۔

(روح المعانی جلد ۱۶ ص ۲۲۹)

اس تفسیر کے خلاف دوسری تفسیر مشہور معتزلی ابو مسلم اصفہانی کی ہے: وہ کہتے ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ جواب دیا کہ مجھ کو بنی اسرائیل کے خلاف یہ بات سوجھی کہ آپ حق پر نہیں ہیں اور ساتھ ہی میں نے آپ کا کچھ اتباع کر لیا تھا اور پیروی اختیار کر لی تھی، مگر میرا دل اس پر نہ جما اور آخر کار میں نے اس اتباع اور پیروی کو بھی ترک کر دیا اور اسی طریق کار کو میرے نفس نے بہتر جانا، گویا ابو مسلم کے نزدیک آیت بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ کے معنی یہ ہے کہ سامری بنی اسرائیل کے عقیدے کے خلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق پر نہیں سمجھتا تھا اور فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ میں رسول سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور اَثَرِ الرَّسُوْلِ سے مراد پیروی اور اتباع ہے اور قَبْضَةً سے تھوڑی سے پیروی اور فَنَبَذْتُهَا سے ترک اتباع مراد ہے ابو مسلم نے اپنی اس تفسیر کے ثبوت میں لغت عرب سے کچھ استشہادات بھی پیش کئے ہیں اور جمہور کی تفصیل پر کچھ اشکالات بھی وارد کئے ہیں جس کا جواب سید محمود آلوسیؒ نے اپنی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ دیا ہے۔

بااین ہمہ ابو مسلم کی اس تفسیر کو امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں قوی، راجح اور صحیح تسلیم کیا ہے وہ فرماتے ہیں۔

''یہ واضح رہے کہ ابو مسلم نے جو تفسیر بیان کی ہے اس میں مفسرین کی مخالفت تو ضرور پائی جاتی ہے لیکن حسب ذیل چند وجوہ کے پیش نظر تحقیق سے قریب تر اسی کی تفسیر ہے۔'' (جلد ۶ ص ۷۰)

چنانچہ علماء عصر میں سے مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ترجمان القرآن میں اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔

زیر بحث آیت سے متعلق قرآن عزیز کے سیاق و سباق کے مطالعہ اور اس سلسلہ میں صحیح احادیث نبوی کی تفتیش و تحقیق کے بعد حق اور راجح بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی تصریح منقول نہیں ہے کہ جس کے بعد ایک جانب کو قطعیت حاصل ہو جائے اور دوسری جانب باطل قرار پائے ورنہ غالباً اسی وجہ سے

مشہور محدث و مفسر حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اس سلسلہ کی تمام روایات کو سامنے رکھنے کے بعد اگرچہ جمہور کی تائید کی ہے اور ابو مسلم کی تائید نہیں کی بلکہ اس کی تفسیر کو نقل بھی نہیں کیا تاہم جمہور کی تفسیر کو وہ حیثیت نہیں دی جو صاحب روح المعانی نے ذکر فرمائی ہے یعنی یہ کہ جمہور کی تفسیر نصوص حدیثی سے ثابت ہے اور اس لئے دوسرا احتمال بے شبہ الحادوزندقہ ہے چنانچہ انہوں نے آیت کی تفسیر کرنے کے بعد صرف یہ فرمایا:

هذا هو المشهور عند كثير من المفسرين او اكثرهم۔ (جلد۳ سورۂ طٰہٰ)

یہ وہ تفسیر ہے جو بہت سے مفسرین بلکہ اکثر مفسرین کی نسبت سے مشہور ہے۔

اور اسی طرح ان کے مشہور معاصر مفسر ابن حیان اندلسی نے البحر المحیط میں ابو مسلم کی تفسیر کو اگرچہ "قیل[1]" کہہ کر نقل کیا ہے مگر اس کے خلاف ایک جملہ بھی نہیں لکھا اور سکوت فرمایا۔

پس ان جلیل القدر مفسرین کے اس طرز تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ جمہور کی تفسیر ہی کو صحیح یا راجح سمجھتے ہیں مگر دوسرے احتمال کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ نصوص قطعیہ کے خلاف ہے اور ایسا احتمال ہے جس کی پشت پر الحادوزندقہ کی کارفرمائی ہے۔

البتہ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس آیت کا سیاق و سباق اور قبول و عدم قبول حق کے متعلق اس سلسلہ کی تمام آیات قرآن کا اسلوب بیان دونوں ہی ابو مسلم کی تفسیر کا قطعاً انکار کرتے اور اس کو تاویل محض ظاہر کرتے ہیں اس لئے کہ آیت زیر بحث کے جملہ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهٖ میں بصارت سے بصارت عینی کی جگہ بصیرت قلبی مراد لینا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہوتے ہوئے بھی "الرسول" کہہ کر ان کو غائب کے قائم مقام بنانا اور "قبضت قبضة" کے معنی مٹھی بھر لینا کی بجائے تھوڑا سا اتباع کر لینا" بیان کرنا اور جملہ نبذتہا سے ترک اتباع مراد لینا یہ سب علیحدہ علیحدہ جملہ کے اعتبار سے اگرچہ محاورات عرب میں قابل تسلیم ہیں لیکن پورے نظم کلام کے پیش نظر ابو مسلم کی تفسیر لچر تاویل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور سیاق و سباق شہادت دے رہے ہیں کہ اس جگہ وہی معنی راجح ہیں جو جمہور کا مختار ہیں۔

کیا یہاں یہ اصولی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اگر سامری کو صرف یہ بتانا تھا کہ میں دل سے آپ کا معتقد نہیں تھا مگر مصلحتاً کچھ دنوں کے لئے آپ کی پیروی کر رہا تھا اور اب اس کو بھی ترک کر دیا تو اس صاف اور سادہ بات کے لئے قرآن عزیز کو ایسے ذو معنی اور مبہم اظہار بیان کی کس لئے ضرورت پیش آئی کہ بقول مولانا آزاد مفسرین کو یہ موقع مل گیا کہ انہوں نے یہودیوں میں مشہور روایت کو ٹھیک ٹھیک آیت زیر بحث پر چسپاں کر دیا۔ پس جمہور کی تفسیر یہود کی روایت نہیں ہے بلکہ خود قرآن کا بولتا ہوا بیان ہے اور صاف اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال پر سامری کا جواب ضرور کسی ایسے واقعہ سے تعلق رکھتا ہے جو حیرت زا بھی تھا اور کج فطرت انسانوں کی گمراہی کے لئے اس کو آلۂ کار بھی بنایا جا سکتا تھا۔

رہا یہ سوال کہ یہ عجیب و غریب معاملہ ایک باطل پرست کے ہاتھ سے کس طرح ظہور پذیر ہوا تو اسکے متعلق سب سے بہتر جواب شاہ عبد القادرؒ کی وہ تعبیر ہے جو موضح القرآن سے گذشتہ سطور میں نقل کی گئی،

---

[1] کوئی قول کمزور سمجھا جاتا ہے تو اس کو قیل کہہ کر بیان کیا جاتا ہے۔

یعنی جب ایک باطل کو کسی دوسرے حق کیساتھ ملایا جائے تو اسکے امتزاج سے ایک کرشمہ پیدا ہو جاتا ہے جو اس ترکیب کا خاصہ اور اسکا حقیقی مزاج کہلاتا ہے، مثلاً آپ گلاب کے عطر کو چر کین کے کچھ اجزاء کیساتھ مخلوط کیجئے تو گلاب کی نفیس اور لطیف خوشبو چر کین کی قابل نفرت بدبو کیساتھ ملکر ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیگی، جس سے بے شبہ نفس چر کین کی بو سے بھی زیادہ دل و دماغ پر برا اثر پڑیگا اور یہ حالت ہو جائیگی کہ ایک سلیم المزاج انسان چر کین کے ایک ڈھیر پر کھڑا ہونا منظور کر سکتا ہے لیکن اس مخلوط بو کو ایک لمحہ کیلئے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اسلام نے حق و باطل کیلئے امتزاج کو حرام قرار دیا ہے کہ اس سے سخت گمراہی پھیلتی ہے بہر حال جمہور کی تفسیر ہی صحیح اور قرآن عزیز کے اسلوب بیان کے مطابق ہے۔

سامری کون تھا؟

سامری کے اس انوکھے فریب نے ایک محقق کے لئے یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ یہ شخص اسرائیلی تھا یا کون؟ اور یہی کہ سامری اس کا نام ہے یا لقب؟

نجار کہتے ہیں اس موقعہ پر جرائد میں عیسائیوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ سامری سامرہ کی جانب منسوب ہے اور سامرہ شہر اس وقت تک آباد نہیں ہوا تھا، لہٰذا قرآن کے اس واقعہ میں سامری کے ذکر کے کیا معنی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سامری سامرہ شہر کی جانب منسوب نہیں ہے اور نہ منسوب ہو سکتا ہے اس لئے یہ شہر موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں موجود نہ تھا بلکہ بہت زمانہ کے بعد عالم وجود میں آیا بلکہ یہ شامر کی جانب منسوب ہے اور یہ عبرانی لفظ ہے یہ جب عربی منتقل ہوا تو "ش" "س" کے ساتھ تبدیل ہو گیا خود عبرانی بولنے والی دو شاخیں سبط افرائیم اور سبط یہوذا میں سے افرائیمی "س" بولتے ہیں یہوذا "ش" چنانچہ یہ لفظ عبرانی میں شومیر بولا جاتا ہے اور شمر کے معنی حرس (حفاظت) کے ہیں لہٰذا شومیر یا شامر یا سامر کے معنی "حارس" (محافظ) کے ہیں اور اسی کی نسبت سے "سامری" بولا جاتا ہے۔

نجار نے عبرانی توراۃ سے (اس معنی کے استشہاد میں ایک حوالہ بھی دیا کہ جب خدا نے قابیل سے پوچھا کہ تیرا بھائی ہابیل کہاں ہے؟ تو اس نے جواب دیا مجھے نہیں معلوم کہاں ہے مسو میراحی انوخی[1] (کیا میں اپنے بھائی کا محافظ ہوں)۔ (قصص الانبیاء ص ۳۶۶)

اور علامہ آزاد فرماتے ہیں:

> سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سامری کون تھا؟ یہ اس کا نام تھا یا قومیت کا لقب؟ قیاس کہتا ہے کہ یہاں سامری سے مقصود سمیری قوم کا فرد ہے کیوں کہ جس قوم کو ہم نے سمیری کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے عربی میں اس کا نام قدیم سے سامری آرہا ہے اور اب بھی عراق میں ان کا بقایا اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہاں قرآن کا "سامری" کہہ کے اسے پکارنا صاف کہہ رہا ہے کہ یہ نام نہیں ہے اس کی قومیت کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ شخص اسرائیلی نہ تھا سامری تھا حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے تین ہزار برس پہلے دجلہ و فرات کے دوآبے میں دو

[1] تکوین اصحاح ۴ آیت ۹۔

مختلف قومیں آباد ہو رہی تھیں اور ایک ایک عظیم الشان تمدن کی بنیادیں اٹھا رہی تھیں، ان میں سے ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی عرب تھی دوسری جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ شمال سے اتری سمیری تھی اسی قوم کے نام سے تاریخ قدیم کا شہر سامرہ اور آباد ہوا تھا جس کا محل اب ''تل العبید'' میں دریافت ہوا ہے اور وہاں سے پانچ ہزار برس پیشتر کے بنے ہوئے زیور اور سنہری ظروف برآمد ہوئے ہیں۔

سمیری قوم کی اصل کیا تھی؟ اس بارہ میں اس وقت تک کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکتی ہے لیکن نینوا میں اسوری پال (متوفی ۶۶۲ قبل مسیح) کا جو کتب خانہ نکلا ہے اس میں تختیوں کا ایک مجموعہ لغت کی کتاب کا بھی ہے جس میں اکادی اور سمری زبان کے ہم معنی الفاظ جمع کئے گئے ہیں اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ سمری زبان کے اصوات سامی حروف کے اصوات سے چنداں مختلف نہیں تھے یہ بہت ممکن ہے کہ وہ بھی دراصل ان ہی قبائل کے مجموعہ سے کوئی بعیدی تعلق رکھتے ہوں جن کے لئے ہم نے تورات کی اصطلاح سامی اختیار کر لی ہے ...... بہر حال سمیری قبائل کا اصلی وطن عراق تھا، مگر یہ دور دور تک پھیل گئے تھے۔ مصر کے ان سے تعلقات کا سراغ ایک ہزار سال قبل مسیح تک روشنی میں آچکا ہے پس معلوم ہوتا ہے اسی قوم کا ایک فرد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی معتقد ہو گیا اور جب بنی اسرائیل نکلے تو یہ بھی ان کے ساتھ نکل آیا اسی کو قرآن نے ''السامری'' کے لفظ سے یاد کیا ہے گائے بیل اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال سمیریوں میں بھی تھا اور مصریوں میں بھی الخ۔ (ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۴۶۴-۴۶۵)

ان ہر دو بیانات کے مطالعہ کے بعد یہ بآسانی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا آزاد کی تشریح نجار کی تشریح کے مقابلہ میں زیادہ قرین صواب اور راجح ہے اور نجار کی تشریح ''تاویل بعید'' کی حیثیت رکھتی ہے سامر کے معنی اگر نگہبان کے آتے ہیں تو اس کا نام بھی سامری کیوں ہوا۔ اس کا جواب اس تاویل میں نہیں ملتا اور عیسائیوں کے سوال کا جواب جس تاریخی تحقیق کیساتھ آزاد صاحب کے مضمون میں ملتا ہے وہی صحیح ہے۔

الحاصل حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ان معاملات سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے خدائے تعالیٰ کی جناب میں رجوع کیا کہ اب انکے اس ارتداد اور بے دینی کی سزا تیرے نزدیک کیا ہے؟ وہاں سے جواب ملا کہ جن لوگوں نے یہ شرک کیا انکو اپنی جان سے ہاتھ دھولینا پڑیگا۔ نسائی میں روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تمہاری توبہ کی صرف ایک صورت مقرر کی گئی ہے وہ یہ کہ مجرموں کو اپنی جان کو اسطرح ختم کرانا چاہئے کہ جو شخص رشتہ میں جس سے زیادہ قریب ہے وہ اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے یعنی باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو اور بھائی بھائی کو، آخر بنی اسرائیل کو اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ تورات میں ہے کہ اسطرح تین ہزار بنی اسرائیل قتل ہوئے اور بعض اسلامی روایات میں اس سے بھی زیادہ تعداد مذکور ہے جب نوبت یہاں تک پہنچی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام درگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہوئے اور عرض کیا یا رالٰہا! اب ان پر رحم فرما اور انکی خطاؤں کو بخش دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے قاتل و

مقتول دونوں کو بخش دیا اور جو زندہ ہیں اور قصور دار ہیں انکی بھی خطا معاف کر دی تم ان کو سمجھا دو کہ آئندہ شرک کے قریب بھی نہ جائیں۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ○ (سورہ بقرہ)

اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اے قوم! بلاشبہ تم نے گوسالہ بنانے میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا ہے پس اپنے خالق کی طرف رجوع کرو اور اپنی جانوں کو قربان کرو تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے حق میں یہی بہتر ہے پھر وہ تم پر رجوع بہ رحمت ہوگا بلاشبہ وہ بڑا رجوع برحمت ہونے والا رحم کرنے والا ہے۔

اس واقعہ کے متعلق قرآن عزیز اور تورات میں بہت سخت اختلاف ہے تورات کا بیان ہے کہ گوسالہ ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا۔

> اور جب لوگوں نے دیکھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارون علیہ السلام کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لئے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا کیا ہو گیا ہارون نے ان سے کہا تمہاری بیویوں اور لڑکوں، لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیں ہیں ان کو اتار کر میرے پاس لے آؤ، چنانچہ سب لوگ ان کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار اتار کر ان کو ہارون علیہ السلام کے پاس لے آئے اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی تب وہ کہنے لگے اے اسرائیل! یہی وہ تیرا دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا، یہ دیکھ کر ہارون علیہ السلام نے اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور اس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لئے عید ہے۔
>
> (خروج باب ۳۲۔ آیت ۱۔۵)

تورات کی تحریف و مسخ کی شہادت اس سے زیادہ اور کیا ہو گی کہ جو کتاب اسی باب خروج میں ہارون علیہ السلام کو خدا کا پیغمبر اور حضرت موسیٰ کا وزیر ظاہر کرتی ہے وہی تورات اس جگہ ہارون علیہ السلام کو عیاذاً باللہ نہ صرف مشرک ایک بت پرست ثابت کر رہی ہے بلکہ شرک کا معلم اور بت پرستی کا راہنما بتا رہی ہے۔

تورات کے مطالعہ سے بآسانی آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اہل کتاب کی بوالعجبیوں اور کتاب اللہ میں تحریفات کی داستانوں میں سب سے زیادہ قابل نفرت داستان یہ ہے کہ وہ خدا کے جن برگزیدہ انسانوں کو نبی اور پیغمبر سمجھے جاتے ہیں۔ ان ہی پر شرک و کفر اور بداخلاقیوں کی تہمت لگانے میں بھی نہیں جھجکتے، چنانچہ اس مقام پر بھی سامری کے مشرکانہ عمل کو حضرت ہاورن علیہ السلام کے سر لگا دیا قرآن عزیز اس خرافات کی پر زور تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کا دامن اس قسم کی ناپاکی سے قطعاً پاک ہے گوسالہ بنانا اور گوسالہ پرستی کی

ترغیب دینا سامری کا کام تھا نہ کہ حضرت ہارون علیہ السلام جیسے برگزیدہ نبی کا انہوں نے سختی کے ساتھ بنی اسرائیل کو اس ناپاک حرکت سے باز رکھنے کی سعی کی مگر وہ بدبخت کسی طرح نہ مانے۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُوْنُ مِنْ قَبْلُ يَاقَوْمِ إِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَأَطِيْعُوْٓا أَمْرِيْ ○ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوْسٰى ○ (سورۂ طٰہٰ)

اور بیشک ہارون علیہ السلام نے پہلے ہی ان (بنی اسرائیل) سے کہا "اے قوم! بلاشبہ تم فتنہ میں ڈال دیئے گئے (اس بچھڑے کے بنانے سے) اور بے شک تمہارا پروردگار بڑا رحم والا ہے پس (اب بھی سمجھو اور) اور میری پیروی کرو اور میرے حکم کو مانو انہوں نے (بنی اسرائیل نے) کہا ہم اس کی سادھ ہرگز نہ چھوڑیں گے تا آنکہ موسیٰ علیہ السلام لوٹ کر ہمارے پاس نہ آجائے۔

ستر سرداروں کا انتخاب

جب بنی اسرائیل کا یہ جرم معاف کر دیا گیا تو اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ میرے پاس جو یہ "الواح" (تختیاں) ہیں، یہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت اور دینی دنیوی زندگی کی فلاح کے لئے مجھ کو عطا فرمائی ہے یہ تورات ہے اب تمہارا فرض ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام کی تعمیل کرو۔

بنی اسرائیل بہر حال بنی اسرائیل تھے کہنے لگے: موسیٰ! علیہ السلام ہم کیسے یقین کریں کہ یہ خدا کی کتاب ہے؟ صرف تیرے کہنے سے تو ہم نہیں مانیں گے ہم تو جب اس پر ایمان لائیں گے کہ خدا کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور وہ ہم سے یہ کہے کہ یہ تورات میری کتاب ہے تم اس پر ایمان لاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سمجھایا یہ بے وقوفی کا سوال ہے ان آنکھوں سے خدا کو کس نے دیکھا ہے جو تم دیکھو گے، یہ نہیں ہو سکتا، مگر بنی اسرائیل کا اصرار بدستور قائم رہا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا تو کچھ سوچ کر ارشاد فرمایا کہ یہ تو ناممکن ہے کہ تم لاکھوں کی تعداد میں میرے ساتھ حوریب (طور) پر اس کی تصدیق کے لئے جاؤ مناسب یہ ہے کہ تم میں سے چند سردار چن کر ساتھ لئے جاتا ہوں وہ اگر واپس آکر تصدیق کر دیں تو پھر تم بھی تسلیم کر لینا، اور چونکہ تم ابھی گوسالہ پرستی کر کے ایک بہت بڑا گناہ کر چکے ہو اس لئے اظہار ندامت اور خدا سے آئندہ نیکی کے عہد کیلئے بھی یہ موقع مناسب ہے۔ قوم اس پر راضی ہو گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تمام اسباط سے ستر سرداروں کو چن کر ساتھ لیا اور طور پر جا پہنچے، طور پر ایک سپید بادل کی طرح "نور" نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گھیر لیا اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی شروع ہو گئی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ تو بنی اسرائیل کے حالات کا دانا بینا ہے۔ میں ان کی ضد پر ستر آدمی انتخاب کر لایا ہوں، کیا اچھا ہو کہ وہ بھی اس "حجاب نور" سے میری اور تیری ہمکلامی کو سن لیں اور قوم کے پاس جا کر تصدیق کرنے کے قابل ہو جائیں؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء منظور فرمائی اور ان کو "حجاب نور" میں لے لیا گیا اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان سرداروں کے درمیان مواجہہ ہوا تو سرداروں نے وہی اپنا پہلا

اصرار قائم رکھا کہ جب تک بے حجاب خدا کو نہ دیکھ لیں ہم ایمان لانے والے نہیں اس احمقانہ اصرار اور ضد پر غیرت الٰہی نے ان کو یہ سزا دی کہ ایک ہیبت ناک چمک، کڑک، اور زلزلہ نے ان کو آلیا اور جلا کر خاک کر دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا تو درگاہ الٰہی میں عاجزی کے ساتھ دعا، مانگی الٰہی! یہ بے وقوف اگر بے وقوفی کر بیٹھے تو کیا تو ہم سب کو ہلاک کر دے گا اے خدا! اپنی رحمت سے تو ان کو معاف کر دے حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء کو سنا اور ان سب کو دوبارہ حیات تازہ بخشی اور پھر جب وہ زندگی کا لباس پہن رہے تھے تو ایک دوسرے کی تازہ زندگی کو آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ ○ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ قَالَ عَذَابِيْ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكَاةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيَاتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ○ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الاعراف)

اور اس غرض سے کہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے وقت میں حاضر ہوں موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چنے پھر جب لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آلیا تو موسیٰ علیہ السلام نے (ہماری جناب میں) عرض کیا "پروردگار! اگر تو چاہتا تو ان سب کو اب سے پہلے ہی ہلاک کر ڈالتا اور خود میری زندگی بھی ختم کر دیتا (مگر تو نے اپنے فضل و رحمت سے ہمیں مہلت دی) پھر کیا ایک ایسی بات کے لئے جو ہم میں سے چند بے وقوف آدمی کر بیٹھے ہیں تو ہم سب کو ہلاک کر دیگا؟ یہ اس کے سوا کیا ہے کہ تیری طرف سے ایک آزمائش ہے تو جسے چاہے اس میں بھٹکا دے جسے چاہے راہ دکھا دے، خدایا! تو ہمارا والی ہے، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر تجھ سے بہتر بخشنے والا کوئی نہیں! اور (خدایا) اس دنیا کی زندگی میں بھی ہمارے لئے اچھائی لکھ دے اور آخرت کی زندگی میں بھی ہمارے لئے اچھائی کر دے، اور آخرت کی زندگی میں بھی اچھائی کر، ہم تیری طرف لوٹ آئے! خدا نے فرمایا "میرے عذاب کا حال یہ ہے کہ جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں اور رحمت کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے پس میں ان کے لئے رحمت لکھ دوں گا جو برائیوں سے بچیں گے اور زکوۃ

ادا کریں گے اور ان کیلئے جو میری نشانیوں پر ایمان لائیں گے جو اس رسول کی پیروی کریں گے کہ نبی امی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا برائی سے روکے گا پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، گندی چیزیں حرام ٹھہرائیگا اس بوجھ سے نجات دلائیگا جس کے تلے دبے ہوں گے ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے تو جو لوگ اس پر ایمان لائے اس کے مخالفوں کیلئے روک ہوئے (راہ حق میں) اسکی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے ہو لئے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے سو وہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَامُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (سورۂ بقرہ)

اور جب تم نے کہا "اے موسیٰ! ہم تجھ پر اس وقت تک ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں پس آنکھوں دیکھتے تم کو بجلی کی کڑک نے آپکڑا، پھر ہم نے تم کو موت کے بعد زندہ کیا تاکہ تم شکر گذار رہو۔

حیات بعد الموت

قرآن عزیز نے حیات بعد الممات کا عام قانون تو یہ بتایا ہے کہ اس دنیوی موت کے بعد پھر عالم آخرت ہی کے لئے دوبارہ زندگی ملے گی لیکن قانون خاص یہ ہے کہ کبھی کبھی حکمت ومصلحت کے پیش نظر خدائے تعالیٰ اس دنیا ہی میں مردے کو زندگی بخش دیا کرتا ہے اور انبیاء کی معجزانہ زندگی میں خود قرآنی شہادت کے مطابق اس حقیقت کا متعدد مرتبہ ظہور ہو چکا ہے۔

قرآن کریم جب حیات بعد الممات کا ذکر کرتا ہے تو اس کا قرینہ یہ ہے کہ وہ اس زندگی کو "بعث" سے تعبیر کرتا ہے جس کو اردو میں جی اٹھنا کہتے ہیں۔

سورۂ بقرہ کی آیت میں بھی قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے نمائندوں کی موت وہلاکت اور اس کے بعد ان کے "بعث" جی اٹھنے کا ذکر کیا ہے اور لعلکم تشکرون کہہ کر اس واقعہ کی اصلی حقیقت کو اور زیادہ واضح کردیا ہے کہ بے شبہ صورت یہ پیش آئی کہ ان کے نامعقول اور گستاخانہ اصرار پر "رجفہ" کے عذاب نے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر حضرت موسیٰ کی عاجزانہ دعاء پر خدا کی وسعت رحمت نے ترس کھایا اور ان سوختہ جان انسانوں کو دوبارہ زندگی بخش دی تاکہ یہ شکر گذار ہوں اور آئندہ اس قسم کی بے جا ضد کو کام میں نہ لائیں اور خدا کے سچے فرمانبردار بن جائیں۔

اس تفصیل کے بعد یہ بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ جن معاصر مفسرین نے آیت کی تفسیر اس حیات بعد الممات سے بچنے کے لئے رکیک تاویلات کے ساتھ کی ہے وہ صحیح نہیں ہے اور انہوں نے بغیر کسی سند اور دلیل کے قرآن عزیز کے صاف اور صریح اسلوب بیان کو تفسیر بالرائے پر قربان کردیا ہے۔

رحمت عام کا اعلان

سورۂ اعراف کی یہ آیت قال عذابی اصیب بہ من اشاء ورحمتی وسعت کل شیء مہمات قرآنی میں سے ہے اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی جانب سے جو عذاب آتا ہے وہ خاص حالات کے ماتحت ہوتا ہے ورنہ عذاب خدائے تعالیٰ کی صفت نہیں ہے بلکہ ''رحمت'' اس کی ازلی وابدی صفت ہے اس لئے اس کی صفت رحمت ہر شے کیلئے عام ہے اور کائنات میں ایک شے بھی ایسی نہیں ہے جو اس کی صفت رحمت سے خالی ہو بلکہ یوں کہئے کہ جس کو تم عذاب کہہ رہے تو ہو تمہارے اعمال و کردار کی نسبت سے عذاب ہے ورنہ کارخانہ ہستی کے پورے نقشہ کے لحاظ سے اگر تم غور کرو گے تو اس کو بھی رحمت ہی پاؤ گے چنانچہ سورہ انعام میں اسی لئے فرمایا:

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ

اللہ نے رحمت کو اپنی ذات پر مقرر کر لیا ہے۔

اور اسی رحمت عام کا مظہر اتم اور پر تو اکمل وہ ذات گرامی ہے جس کا ذکر مبارک سورۂ اعراف کی اس آیت میں اس طرح کیا جا رہا ہے کہ اس کی آمد سے قبل ہی کتب سابقہ میں اسکی آمد کی بشارت دے دی گئی تھی اور اسکی صفات اور اسکے اخلاق کا بھی تذکرہ کر دیا گیا تھا اور اسی لئے دوسری جگہ اس کو رحمۃ للعالمین کے لقب سے پکارا گیا۔[1]

بنی اسرائیل اور جبل طور

بہر حال جب یہ ستر سردار دوبارہ زندگی پا کر قوم کی جانب واپس ہوئے تو انہوں نے قوم سے تمام قصہ کہہ سنایا اور بتایا کہ موسیٰ علیہ السلام جو کچھ کہتے ہیں وہ حق ہے اور بے شبہ وہ خدا کے فرستادہ ہیں۔

اب فطرت سلیم کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ سب خدائے تعالیٰ کا شکر بجا لاتے اور اس کے فضل و کرم کی فراوانی کے پیش نظر فرمانبرداری اور عبودیت کے ساتھ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے مگر ہوا یہ کہ انہوں نے اپنی کج روی کو باقی رکھا اور اپنے نمائندوں کی تصدیق کے باوجود تورات کو قبول کرنے میں معاندانہ پس و پیش شروع کر دی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ارشادات پر کان نہ دھرا۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو بارگاہ الٰہی میں رجوع کرتے ہوئے قوم کی بے راہ روی کا گلہ کیا۔ درگاہ الٰہی سے حکم ہوا کہ ان نافرمانوں کے لئے میں تجھ کو ایک حجت (معجزہ) اور عطا کرتا ہوں اور وہ یہ کہ جس پہاڑ (طور) پر تو مجھ سے ہمکلام ہوتا رہتا ہے اور جس پر تیری قوم کے منتخب سرداروں نے حق کا مشاہدہ کیا ہے اسی پہاڑ کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرے اور سائبان کی طرح بنی اسرائیل کے سروں پر چھا جائے اور زبان حال سے یہ اعلان کرے کہ موسیٰ علیہ السلام خدا کا سچا پیغمبر ہے تورات بے شبہ خدا کی سچی کتاب ہے اور اگر یہ دونوں حق و صداقت کا مظہر نہ ہوتے تو یہ عظیم الشان نشان تم نہ دیکھتے جس کا ظہور قدرت الٰہی کے سوا اور کسی طرح ناممکن ہے۔

---

[1] اس آیت کی مفصل تفسیر ذکر رسول ﷺ کے موقعہ پر کی جائے گی۔ (مؤلف)

چنانچہ جوں ہی خدائے تعالیٰ کا یہ تکوینی فیصلہ ہوا طور ان کے سروں پر مثل سائبان نظر آنے لگا، اور زبان حال سے کہنے لگا کہ اے بنی اسرائیل! اگر تم میں عقل و ہوش باقی ہے اور حق و باطل کی تمیز موجود ہے تو گوش حق نیوش سے سنو کہ میں خدا کا نشان بن کر تم کو یقین دلاتا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ موسیٰ نے بارہا میری پیٹھ پر خدائے تعالیٰ کے ساتھ ہمکلامی کا شرف حاصل کیا ہے اور تمہارے رشد و ہدایت کا قانون (تورات) بھی اس کو میری پیٹھ ہی پر عطا ہوا ہے اور اے سرمستان بادۂ غفلت و سرکشی! میری یہ ہیئت جو تمہارے لئے حیران کن بن رہی ہے اس امر کی شہادت ہے کہ جب انسان کے سینہ میں دل کی نرمی سختی سے بدل جاتی ہے تو پھر وہ پتھر کا ٹکڑا بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت بن جاتا ہے اور رشد و ہدایت اس میں کسی جانب سے بھی سرایت نہیں کرپاتی، دیکھو! میں پتھر کے ٹکڑوں کا مجموعہ "پہاڑ" ہوں لیکن خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کئے کس طرح عبودیت کا مظاہرہ کر رہا ہوں مگر تم ہو کہ انانیت اور خودی کے گھمنڈ میں کسی حالت میں بھی "نہیں" کو "ہاں" سے بدل دینے کیلئے تیار نہیں ہو۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً (سورہ بقرہ)

پھر تمہارے دل سخت ہوگئے جیسے پتھر یا ان سے بھی سخت۔

بنی اسرائیل نے جب یہ "نشان" دیکھا تو اب اسے وقتی خوف و دہشت کا ثمرہ سمجھئے یا علی رؤس الاشہاد خدا کے عظیم الشان "نشان" کے مشاہدہ کا نتیجہ یقین کیجئے کہ بنی اسرائیل تورات کی جانب متوجہ ہوئے اور حضرت موسیٰ کے سامنے اس کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا تب خدائے تعالیٰ کا فرمان ذی شان ہوا کہ اے بنی اسرائیل! ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی کیساتھ لو اور جو احکام اس (تورات) میں درج ہیں ان کی تعمیل کرو تاکہ تم پرہیزگار اور متقی بن سکو۔

مگر افسوس کہ بنی اسرائیل کا یہ عہد و میثاق ہنگامی ثابت ہوا اور زیادہ عرصہ تک وہ اس پر کاربند نہ رہ سکے اور حسب عادت پھر خلاف ورزی شروع کر دی قرآن عزیز نے ان واقعات کو نہایت مختصر مگر صاف اور واضح نظم الفاظ کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخَاسِرِيْنَ ○ (سورۃ الاعراف)

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے سر پر طور کو اونچا کیا (اور کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے اس کو قوت سے پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد کرو تاکہ تم پرہیزگار بنو پھر اس کے بعد تم نے (اس تورات سے) پیٹھ پھیر لی۔ پس اگر تم پر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بلاشبہ تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاتے۔

وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ خُذُوْا مَآ آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○

اور جب ہم نے ان کے (بنی اسرائیل کے) سروں پر پہاڑ بلند کر دیا گویا کہ وہ سائبان ہے اور انہوں نے یقین کر لیا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے (تو ہم نے کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے اس کو قوت سے لو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد کرو تاکہ تم پرہیزگار بنو۔

ان آیات میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل نے جب تورات کو قبول کرنے میں پس و پیش کیا بلکہ انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سروں پر طور کو بلند کر دیا اور اس طرح آیۃ اللہ کا مظاہرہ کر کے ان کو قبول تورات پر آمادہ کیا پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ آیات کے ظاہر کو تاویلات میں گھسیٹا جائے جیسا کہ بعض معاصر مفسرین نے کیا ہے۔

کسی پہاڑ کا جڑ سے اکھڑ کر فضاء میں معلق ہو جانا نہ عقلاً محال ہے اور نہ قانون قدرت کے منافی، البتہ انوکھا اور حیرت زا واقعہ ضرور ہے اور اس لئے آیۃ اللہ کہلانے کا مستحق مگر تاویل کرنے والے کہتے ہیں کہ رفع کے معنی صرف بلندی کے آتے ہیں نہ کہ سر پر بلند ہونے کے اور سی طرح نتق کے معنی جس طرح جڑ سے اکھڑنے کے آتے ہیں اسی طرح زلزلہ میں آنے اور "خوفناک حرکت کرنے" کے بھی آتے ہیں لہذا سورۂ اعراف کی آیت کے معنی یہ ہوئے۔

اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو زلزلہ میں ڈالا تھا، گویا ایک سائبان ہے جو ہل رہا ہے اور وہ (دہشت کی شدت میں) سمجھے تھے کہ بس ان کے سروں پر آگرا۔ (الخ) (ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۶۱)

مگر ان حضرات نے اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیا کہ "رفع" "نتق" کے اگر متعدد معانی آتے ہیں تو عربیت کے قاعدہ سے اس مقام پر جو قرینہ پایا جاتا ہو اسی کے مطابق معنی متعین ہوں گے خصوصاً جبکہ قرآن عزیز کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے تو بے شبہ کسی لفظ کے متعدد معانی میں سے صرف وہی معنی مراد ہوں گے جو دوسری آیت سے ذریعہ متعین ہوتے ہیں۔

پس بقرہ کی آیت (رفعنا فوقکم الطور) میں "رفع" اور "فوق" کو جب اعراف کی آیت (نتقنا الجبل) میں "نتق" کے ساتھ ملائیں گے تو قرآن عزیز کی ان آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہی بنے گا کہ طور کو اسکی جگہ سے اکھاڑ کر بنی اسرائیل کے سروں پر اسطرح کر دیا گیا گویا ایک سائبان ہے جو عنقریب ان پر گرنے والا ہے۔ نیز "فوق" کا رفع کے ساتھ لانا بھی اس تفسیر کی صحت کیلئے مؤثق شہادت ہے جو جمہور نے بیان فرمائی ہے۔ اسکے برعکس معاصر مفسرین سے نقل کردہ معنی صاف بول رہے ہیں کہ وہ منطوق قرآنی کے خلاف کھینچ تان کر بنائے گئے ہیں۔

اس مقام پر یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ ان ہر دو آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر "تورات" کے عمل کرانے میں جبر واکراہ سے کام لیا گیا ہے۔ حالانکہ دین میں جبر واکراہ درست نہیں ہے مگر قرآن عزیز کے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھ کر واقعہ کی صورت جس طرح ہم نے نقل کی ہے یہ اعتراض اس شکل میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ البتہ اگر جمہور مفسرین اور جدید مفسرین جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دراصل یہ جبر واکراہ کا معاملہ نہیں تھا۔ بلکہ آیۃ اللہ کا یہ آخری مظاہرہ تھا۔ جو ان کی رشد وہدایت کی تقویت و تائید میں کیا گیا اور اسلئے یہ واقعہ عہد و میثاق کے بعد پیش

آیا جیسا کہ سیاقِ کلام سے ظاہر ہے۔

کثرت معجزات

یہاں یہ بات بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ گذشتہ اوراق میں یہ بخوبی روشن ہو چکا ہے کہ صدیوں غلامی کی زندگی بسر کرنے اور پست خدمات میں مشغول رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل کے ملکاتِ فاضلہ کو گھن لگ گیا تھا اور مصریوں میں رہ کر مظاہر پرستی اور اصنام پرستی نے ان کے عقل و حواس کو اس درجہ معطل کر دیا تھا کہ وہ قدم قدم پر توحیدِ الٰہی اور احکامِ الٰہی میں کسی "کرشمہ" کے منتظر رہتے، اس کے بغیر ان کے دل میں یقین و اذعان کیلئے کوئی جگہ نہ بنتی تھی، پس ان کی ہدایت ورشد کیلئے دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں، ایک یہ کہ ان کو فقط افہام و تفہیم کے مختلف طریقوں ہی سے قبولِ حق پر آمادہ کیا جاتا اور انبیاءِ سابقین کی امتوں کی طرح صرف کسی خاص اور اہم موقعہ پر "آیۃ اللہ" (معجزہ) کا مظاہرہ پیش آتا اور دوسری صورت یہ تھی کہ ان کی صدیوں کی تباہ شدہ اس حالت کی اصلاح کیلئے روحانی طاقت کا جلد جلد مظاہرہ کیا جائے اور حق وصداقت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ خدائے تعالیٰ کے تکوینی نشانات "معجزات" ان کی استعداد قبل و تسلیم کو بار بار تقویت پہنچائیں، پس اس قوم کی پست ذہنیت اور تباہ حالی کے پیش نظر مصلحت خداوندی نے ان کی اصلاح و تربیت کیلئے یہی دوسری صورت اختیار فرمائی۔

وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ

اللہ تعالیٰ عالم و دانا حکمت والا ہے۔

بہر حال اس واقعہ کا ذکر تورات میں بھی موجود ہے اور اس میں طور کے متعلق وہی کہا گیا ہے جو ہمارے جدید مفسرین نے آیت کی تاویل کی صورت میں بیان کیا ہے:

> جب تیسرا دن آیا تو صبح ہوتے ہی بادل گرجنے اور بجلی چمکنے لگی اور پہاڑ پر کالی گھٹا چھا گئی اور قرنا کی آواز بہت بلند ہوئی اور سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے اور موسیٰ علیہ السلام لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے اور وہ پہاڑ سے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہِ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں کی طرح اوپر کو اٹھ رہا تھا اور سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا........ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نیچے اتر کر لوگوں کے پاس گیا اور یہ باتیں ان کو بتائیں۔ (خروج باب ۱۹۔ آیات ۱۶ تا ۱۵)

ارضِ مقدس کا وعدہ اور بنی اسرائیل

سینا کے جس میدان میں اس وقت بنی اسرائیل موجود تھے یہ سرزمین فلسطین سے قریب تھا، اور انکے باپ دادا حضرتِ ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب (علیہم السلام) سے خدا کا وعدہ تھا کہ تمہاری اولاد کو پھر اس سرزمین کا ملک بنائیں گے اور یہاں پھولے پھلے گی، لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت خدا کا حکم ہوا کہ اپنی قوم سے کہو کہ ارضِ مقدس میں داخل ہوں اور وہاں کے جابر و ظالم حکمرانوں کو نکال کر عدل و انصاف کی زندگی بسر کرو، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ فتح تمہاری ہوگی اور تمہارے ظالم دشمن ناکام ہوں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے "اس سے پہلے

کہ بنی اسرائیل کو ارض مقدس میں داخل ہونے کیلئے آمادہ کریں"۔ بارہ آدمیوں کو تفتیش حال کیلئے بھیجا، وہ فلسطین کے قریبی شہر اریحا میں داخل ہوئے اور تمام حالات کو بغور دیکھا، جب واپس آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ وہ بہت جسیم اور تن و توش کے زبردست ہیں اور بہت قوی ہیکل ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جس طرح تم نے مجھ سے ان کے متعلق کہا ہے قوم کے سامنے نہ کہنا اس لیئے کہ عرصۂ دراز کی غلامی نے ان کے حوصلے پست کر دیئے ہیں اور ان میں شجاعت، خودداری اور علو ہمت کی جگہ بزدلی، ذلت اور پستی ہمت نے لے لی ہے۔ مگر آخر یہ بھی اسی قوم کے افراد تھے، نہ مانے اور خاموشی کے ساتھ قوم کے سامنے دشمن کی طاقت کا خوب بڑھا چڑھا کر ذکر کیا۔ البتہ صرف دو شخص یوشع بن نون اور کالب بن یُفنہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی اور انہوں بنی اسرائیل سے ایسی کوئی بات نہ کہی کہ جس سے ان کی ہمت شکست ہو۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم اس بستی (اریحاء) میں داخل ہو اور دشمن کا مقابلہ کر کے اس پر قابض ہو جاؤ خدا تمہارے ساتھ ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يَاقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّآتَاكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِيْنَ ○ يَاقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خَاسِرِيْنَ ○ (مائدہ)

اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا "اے قوم! تم پر جو خدا کا احسان رہا ہے اس کو یاد کرو کہ اس نے تم میں نبی اور پیغمبر بنائے اور تم کو بادشاہ اور حکمران بنایا اور وہ کچھ دیا جو جہانوں میں کسی کو نہیں دیا۔ اے قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کر دیا ہے اور پشت پھیر کر نہ لوٹو (کہ نتیجہ یہ نکلے) کہ تم خسارہ اور نقصان اٹھانے والے بن کر لوٹو۔

بنی اسرائیل نے یہ سن کر جواب دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام! وہاں تو بڑے ظالم لوگ بستے ہیں، ہم تو اس وقت تک اس بستی میں داخل نہ ہوں گے۔ جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ افسوس بدبختوں نے یہ نہ سوچا کہ جب تک ہمت و شجاعت کے ساتھ تم ان کو یہاں سے نہ نکالو گے تو یہ ظالم خود کیسے نکل جائیں گے۔

یوشع اور کالب نے جب یہ دیکھا تو قوم کو ہمت دلائی اور کہا شہر کے پھاٹک سے گذر جانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ چلو اور ان کا مقابلہ کرو ہم کو پورا یقین ہے کہ تم غالب رہو گے۔

قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُوْنَ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (مائدہ)

ان ڈرنے والوں میں سے دو ایسے آدمیوں نے جن پر خدا نے اپنا فضل و انعام کیا یہ کہا "تم ان جابروں پر دروازہ

کی جانب سے داخل ہو جاؤ پس جس وقت تم داخل ہو جاؤ گے تم بلاشبہ غالب رہو گے اور (یہ بھی کہا) اللہ پر ہی بھروسہ رکھو اگر تم ایمان والے ہو۔

لیکن بنی اسرائیل پر اس بات کا بھی مطلق اثر نہ ہوا اور وہ بدستور اپنے انکار پر قائم رہے اور جب حضرت موسیٰ نے زیادہ زور دیا تو اپنے انکار پر اصرار کرتے ہوئے کہنے لگے:

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ (مائدہ)

انہوں نے کہا کہ "اے موسیٰ! ہم کبھی اس شہر میں اس وقت تک داخل نہیں ہوں گے جب تک وہ اس میں موجود ہیں، پس تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور ان سے لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں (یعنی تماشہ دیکھیں گے)

حضرت موسیٰ نے جب یہ ذلیل اور بے ہودہ جواب سنا تو بہت افسردہ خاطر ہوئے اور انتہائی رنج و ملال کے ساتھ درگاہِ الٰہی میں عرض کیا "بارالہا! میں اپنے اور ہارون کے سوا کسی پر قابو نہیں رکھتا سو ہم دونوں حاضر ہیں، اب تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان جدائی کر دے، یہ تو سخت نااہل ہیں"۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر وحی نازل فرمائی: "موسیٰ! تم غمگین نہ ہو! ان کی نافرمانی کا تم پر کوئی بار نہیں، اب ہم نے ان کیلئے یہ سزا مقرر کر دی ہے کہ یہ چالیس سال اسی میدان میں بھٹکتے پھریں گے اور ان کو ارضِ مقدس میں جانا نصیب نہ ہوگا، ہم نے ان پر ارضِ مقدس کو حرام کر دیا ہے:

قَالَ رَبِّ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِىْ وَاَخِىْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَّتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (مائدہ)

(موسیٰ نے) کہا! اے پروردگار! میں اپنے اور اپنے بھائی کے ماسوا کسی کا مالک نہیں ہوں، لہٰذا تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان تفریق کر دے (اللہ تعالیٰ) نے کہا "بلاشبہ ان پر ارضِ مقدس کا داخلہ چالیس سال تک حرام کر دیا گیا، اس مدت میں یہ اسی میدان میں بھٹکتے پھریں گے، پس تو نافرمان قوم پر غم نہ کھا اور افسوس نہ کر۔

وادی سینا کو "تیہ" اس لیے کہتے ہیں کہ قرآنِ عزیز نے بنی اسرائیل کیلئے کہا ہے: يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ (یہ اس زمین میں بھٹکتے پھریں گے) جب کوئی شخص راہ سے بھٹک جائے تو عربی میں کہتے ہیں "تَاهَ فُلَانٌ"۔

تورات میں اس واقعہ کی تفصیلات اگرچہ اس انداز میں مذکور نہیں ہیں تاہم "گنتی باب ۱۴" میں بنی اسرائیل کے ارضِ مقدس میں داخلہ سے انکار اس پر حضرت موسیٰ کی ناراضی اور پھر چالیس سال تک ان پر ارضِ مقدس کے داخلہ کا حرام ہو جانا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس مدت کے اندر اندر بنی اسرائیل کے وہ تمام افراد مر جائیں گے جنہوں نے خدا کے حکم کے خلاف ارضِ مقدس کے داخلہ سے انکار کیا ہے اور ان کے بعد نئی نسل کو داخلہ کی اجازت ہو گی جو کالب اور یوشع کی سرکردگی

میں دشمنوں کو پامال کر کے پاک زمین میں داخل ہوں گے نیز یہ کہ حضرتِ ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی اس وقت انتقال ہو چکا ہو گا۔

''پھر خداوند نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو خطاب کر کے فرمایا: میں کب تک اس خبیث گروہ کے مقابل جو میری شکایت کرتا ہے صبر کروں؟ بنی اسرائیل جو میرے بر خلاف شکایتیں کرتے ہیں۔ میں نے ان کی شکایتیں سنیں، ان سے کہہ، خداوند کہتا ہے، مجھے اپنی حیات کی قسم جیسا تم نے مجھے سنا کے کہا ہے میں تم سے ویسا ہی کروں گا، تمہاری لاشیں اور ان سب کی جو تم میں شمار کیئے گئے ان کے جمع کے مطابق بیں برس والے سے لے کر اوپر والے تک جنہوں نے میری شکایتیں کیں اس بیابان میں گریں گی، تم بے شک اس زمین تک نہ پہنچو گے۔ جس کی بابت میں نے قسم کھائی ہے کہ تمہیں وہاں بساؤں گا۔ سو الفینہ کے بیٹے کالب اونون کے بیٹے یشوع اور تمہارے لڑکوں کو جن کے حق میں تم کہتے ہو کہ وہ لٹ جائیں گے۔ میں ان کو داخل کروں گا۔ اس زمین کی قدر کو جسے تم نے ذلیل جانا وہ پہچانیں گے، پر تم جو ہو تمہاری لاشیں اس بیابان ہی میں گریں گی اور تمہارے لڑکے اس دشت میں چالیس برس تک بھٹکتے پھریں گے اور تمہاری برگشتگی کے اٹھالے والے ہوں گے جب تک کہ تمہاری لاشیں اس دشت میں نیست و نابود نہ ہوں، ان دنوں کے شمار کے مطابق جن میں تم اس زمین کی جاسوسی کرتے تھے۔ جو چالیس دن ہیں دن پیچھے ایک سال ہو گا سو تم چالیس برس تک اپنے گناہ کو اٹھائے رہو گے، تب تم میری عہد شکنی کو جان لو گے۔ (گنتی باب ۱۴۔ آیات ۲۶۔۳۵۔)

اس جگہ یہ شبہ پیدا نہ کرنا چاہیے کہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون (علیہما السلام) کو بھی اسی میدان میں رہنا پڑا اور وہ بھی ارضِ مقدس میں نہ داخل ہو سکے۔ اس لیئے کہ جب بنی اسرائیل کے اس پورے قافلہ پر ارض مقدس کو حرام کر دیا گیا تو اب ضروری تھا کہ ان کے رشد و ہدایت کیلئے خدا کا پیغمبر ان میں موجود رہے تاکہ کچھ یہ بوڑھے بھی راہِ حق پر قائم رہیں اور نئی نسل میں وہ استعداد پیدا ہو جس کے ذریعہ وہ ارضِ مقدس میں داخل ہو کر خدا کے حکم کو پورا کریں۔

ذبح بقرہ کا واقعہ

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک قتل ہو گیا مگر قاتل کا پتہ نہ لگا، آخر شبہ نے تہمت کی شکل اختیار کر لی اور اختلافِ باہمی کی خوفناک صورت پیدا ہو گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب یہ واقعہ پیش ہوا تو انہوں خدائے تعالیٰ کی جانب رجوع کیا اور عرض کیا کہ اس واقعہ نے قوم میں سخت اختلاف رونما کر دیا ہے، تو خود علیم و حکیم ہے میری مدد فرما۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ ان سے کہو کہ پہلے ایک گائے ذبح کریں اور اس کے بعد گائے کے ایک حصہ کو مقتول کے جسم سے مس کریں، پس اگر وہ ایسا کریں گے تو ہم اس کو زندگی بخش دیں گے اور

یہ معاملہ واضح ہو جائے گا۔

حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل سے جب "ذبح بقرہ" کے متعلق فرمایا تو انہوں نے اپنی کج بحثی اور حیلہ جوئی کی خصلت کے مطابق بحث شروع کر دی۔

موسیٰ ! کیا تو ہم سے مذاق کرتا ہے "یعنی مقتول کے واقعہ سے ذبح بقرہ کا کیا تعلق؟" اچھا اگر واقعی یہ خدا کا حکم ہے تو وہ گائے کیسی ہو؟ اس کا رنگ کیسا ہو؟ اس کی کچھ اور تفصیلی صفات معلوم ہونی چاہئیں، کیوں کہ ابھی تک اس کے تعین کے متعلق ہم مشتبہ حالت میں ہیں۔

حضرت موسیٰ نے جب وحی الٰہی کی معرفت سے انکے تمام سوالات کے جواب دے دیئے اور حیلہ جائی کرنے کیلئے کوئی موقعہ باقی نہیں رہا تب وہ تعمیل حکم پر آمادہ ہوئے اور وحی الٰہی کے مطابق معاملہ کو سرانجام کیا، خدا کے حکم سے وہ مقتول زندہ ہو گیا اور اس نے تمام واقعہ من وعن بیان کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب اس حیرت زا "خدائی نشان" نے حقیقت کو واشگاف کر دیا تو قاتل کو بھی اقرار کیئے بغیر کوئی چارۂ کار نہ رہا اور اس طرح نہ صرف قاتل ہی کا پتہ چل گیا بلکہ مختلف اسباط اور خاندانوں میں اختلاف پیدا ہو کر جو سخت خانہ جنگی اور خوں ریزی کی صورت رونما ہو چلی تھی اس کا بھی خوش اسلوبی کے ساتھ خاتمہ ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اس تاریخی واقعہ کو یاد دلا کر دو باتوں کی جانب توجہ دلائی ہے، ایک منکرین معاد کو یہ بتایا ہے کہ جس قوم کے اسلاف میں یہ واقعہ ہو گذرا ہے وہ آج تک اس تاریخی واقعے کی شاہد ہیں۔ لہٰذا جس طرح خدا نے اس وقت مردہ کو زندہ کر کے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا تھا تم سمجھ لو وہ قیامت کے دن بھی اسی طرح مردے کو زندگی عطا فرمائے گا۔

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ مردہ کو زندہ کر دیا کرتا ہے۔

دوسرے بنی اسرائیل کو یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (یعنی تمہارے اسلاف کو) اتنی کثرت کے ساتھ اپنے نشان (معجزات) دکھائے ہیں کہ اگر دوسری قوم کے سامنے یہ مظاہرے کیئے جاتے تو وہ ہمیشہ کیلئے خدائے تعالیٰ کی فرماں بردار بن جاتی اور اس کے دل میں ایک لمحہ کیلئے بھی نافرمانی کا خطرہ نہ گزرتا لیکن تم اور تمہارے اسلاف پر یا تو اثر ہی نہ ہوا اور اگر ہوا بھی تو ناپائیدار اور غیر مؤثر ثابت ہوا اور آج بھی اگر تم نبی اکرم ﷺ کا انکار اور ان کی مخالفت کر رہے ہو تو یہ تمہاری جبلت اور قدیم عصبیت و جہالت ہی کا اثر ہے۔

قرآن عزیز نے ہم کو اس واقعہ کے متعلق صرف اسی قدر بتایا ہے اور اس سے زیادہ کوئی تفصیل نہیں دی۔

وَإِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً قَالُوْٓا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهٗ يَقُوْلُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ

فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ إِنَّهٗ يَقُوْلُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّآ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝ قَالَ إِنَّهٗ يَقُوْلُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَأْتُمْ فِيْهَا وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (بقرہ)

اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا" بلاشبہ تم کو خدا یہ حکم دیتا ہے کہ تم گائے ذبح کرو" وہ کہنے لگے "کیا تو ہمارے ساتھ مذاق کرتا ہے؟" موسیٰ علیہ السلام نے کہا "میں اللہ سے پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ جاہلوں میں شمار ہوں" (یعنی یہ مذاق نہیں ہے) انہوں نے کہا "تو اپنے پروردگار سے یہ دریافت کر کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟" موسیٰ نے کہا: "اللہ تعالیٰ کہتا ہے "وہ ایسی گائے ہو کہ نہ تو بڑھیا ہو اور نہ بچھیا بلکہ درمیانی عمر کی جوان ہو، پس اب جو تم سے کہا گیا ہے اس کی تعمیل کرو" وہ کہنے لگے "اپنے خدا سے پوچھ کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟" موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ "وہ گہرے زرد رنگ کی ہو کہ دیکھنے والے کو خوش رنگ معلوم ہو" کہنے لگے "ہم پر (ابھی تک) گائے کی کیفیت مشتبہ ہے اگر خدا کو منظور ہے تو ہم کامیاب ہو جائیں گے۔" موسیٰ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے "وہ ایسی گائے ہو کہ نہ محنت ماری ہو کہ زمین میں ہل چلاتی ہو اور نہ کھیت کو سیراب کرتی ہو۔ وہ بے داغ ہو جس پر کسی قسم کا دھبہ نہ ہو" کہنے لگے "اب تو صحیح بات لایا" پس انہوں نے اس کو حاصل کر کے ذبح کیا، اور قریب تھا کہ نہ کرتے اور یہ "جب ہوا کہ تم نے ایک جان کو قتل کر دیا۔ پھر آپس میں اختلاف کرنے لگے، اور اللہ ظاہر کرنے والا ہے۔ اس بات کو جس کو تم چھپائے ہو، پس ہم نے کہا: "اس مقتول کو گائے کے بعض حصے کے ساتھ مس کرو (مارو) اللہ تعالیٰ اسی طرح مردوں کو زندہ کر دیتا ہے، اور تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔

صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرماتے ہی "ذبح بقرہ" کی تعمیل کر دیتے تو ان کیلئے گائے کے معاملہ میں کسی قسم کی مطلق قید و بند نہ ہوتی اور وہ کوئی سی گائے بھی ذبح کر دیتے تو تعمیل پوری ہو جاتی۔ مگر انہوں نے بے ہودہ سوالات کر کے اپنے اوپر پابندیاں لگوائیں، چنانچہ پیغمبر خدا کے ساتھ اس قسم کی بے ہودہ باتوں اور کج بحثیوں کی قرآن عزیز نے سخت مذمت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس کا آخر نتیجہ کفر اور ترکِ ایمان پر جا کر ختم ہوتا ہے، لہٰذا امت مسلمہ کو چاہیے کہ وہ اس قسم کی باتوں سے بچے۔

أَمْ تُرِيْدُوْنَ أَنْ تَسْأَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ

الْكُفْرَ بِالْإِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ○ (بقرہ)

کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر ﷺ سے اس قسم کے سوال کرو جس طرح پہلے زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوالات کیئے گئے تھے اور جو شخص ایمان کے عوض کفر اختیار کرتا ہے وہ بلا شبہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

اس موقعہ پر یہ سوال ضرور سامنے آجاتا ہے کہ آخر "ذبح بقرہ" اور مقتول کے زندہ کر دینے کے درمیان کیا مناسبت ہے جو احیاءِ مقتول کیلئے یہ خاص صورت اختیار کی گئی۔ سو خدا کی حکمتوں اور مصلحتوں تک پہنچنا تو انسانی مقدرت سے باہر ہے۔ تاہم عقل و شعور کی جو روشنی اس نے انسان کو بخشی ہے۔ وہ اس طرف راہنمائی کرتی ہے کہ اگر بنی اسرائیل کی اس تاریخ پر نظر کی جائے جو گذشتہ صفحات میں سپردِ قلم ہو چکی ہے تو یہ بات بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ مصر کے بود و ماند نے ان کے اندر بت پرستی خصوصاً گائے کی عظمت و تقدیس اور گوسالہ پرستی کا جذبہ بہت زیادہ پیدا کر دیا تھا۔ جو جگہ جگہ ابھر آتا اور ان پر اثر انداز ہونے لگتا تھا، چنانچہ گوسالہ پرستی کے واقعہ کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے تورات کی تعمیل کیلئے فرمایا تو اس وقت انہوں نے کافی حیلہ جوئی سے کام لیا تھا۔ اگر "رفع طور" کا نشان ان پر ظاہر نہ ہوتا تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب پر اتر آتے تو کچھ تعجب نہ تھا۔ خدائے تعالیٰ نے اس موقعہ پر ارشاد فرمایا ہے کہ اس تعنت اور حیلہ سازی کی خصلت کا باعث وہی گوسالہ پرستی ہے۔ ابھی تک ان کے دلوں سے بت پرستی اور گوسالہ کی تقدیس کا عقیدہ دور نہیں ہوا بلکہ ان کی حالت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تقدیس ان کے دلوں میں رچ گئی ہے:

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ إِيْمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (بقرہ)

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے سروں پر طور بلند کر دیا (اور کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے۔ اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اس پر کان دھرو۔ انہوں نے کہا: "ہم نے سنا (اور عمل سے بتایا کہ ہم نے نافرمانی کی) اور اصل بات یہ ہے کہ ان کے دلوں میں کفر کی وجہ سے گوسالہ رچ گیا ہے۔ (اے مخاطب) کہہ دے اگر تم اپنے قول کے مطابق مومن ہو تو تمہارے ایمان نے یہ فیصلہ ہی برا کیا ہے

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَأَنْتُمْ ظَالِمُوْنَ ○
(بقرہ)

اور بے شبہ موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس واضح دلائل لے کر آیا۔ پھر تم نے اس کے بعد گوسالہ بنالیا اور تم خود اپنے لیئے ظالم ہو۔

پس اس موقع پر خدا کی مصلحت نے یہ فیصلہ کیا کہ بنی اسرائیل کی اس گمراہی کو کسی ایسے عمل سے دور کرے جس کا مشاہدہ خود ان کی آنکھیں کر رہی ہوں۔ لہٰذا ان کو مشاہدہ کرایا کہ جس کی تقدیس تمہارے دل میں اس قدر

پیوست ہو گئی ہے کہ بار بار نمایاں ہوتی ہے، اس (گائے) کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کو فنا کے گھاٹ اتار دیا اور وہ تمہارا بال بھی بیکانہ کر سکی اور کہیں یہ خیال نہ کر بیٹھنا کہ یہ گائے کی تقدیس ہی کا اثر تھا کہ اس کے پارۂ گوشت کے مس کرنے سے مردہ زندہ ہو گیا اسلیئے کہ اگر موت و حیات کا یہ معاملہ گائے کی تقدیس سے متعلق تھا، تو جس پارۂ گوشت نے مردہ کو زندہ کر دیا وہ خود زندگی حاصل کر کے کیوں دوبارہ جیتی جاگتی گائے نہ بن گیا "کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ گائے جس کو تم نے ذبح کیا تھا اسی طرح بے جان پڑی ہے اور اس کے پارہائے جسم تمہارے درمیان زینت دستر خوان ہو چکے ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ موت و حیات کا یہ معاملہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور جس "گوسالہ" کی محبت تمہارے دلوں میں رچ گئی ہے۔ وہ تم سے بھی ادنیٰ ایک جان دار ہے جو صرف تمہاری خدمت اور ضرورت کیلئے بنایا گیا ہے نہ کہ تمہارے لیئے "دیوتا" اور "دیوی"...... خدائے تعالیٰ ہی کی ذاتِ واحد ہے کہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے حیات بخشے، چنانچہ تم نے ایک ہی واقعہ میں دونوں حقیقتوں کا مشاہدہ کر لیا کہ اسنے گائے کی زندگی کو فنا سے بدل دیا اور انسان کے مردہ جسم کو حیاتِ تازہ بخش دی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

قرآن عزیز نے غالباً اسی حکمت کے پیشِ نظر "ذبح بقرہ" کے واقعہ کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے، پہلے حصہ میں بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے واقعہ کی تائید میں بقرہ کا یہ واقعہ بیان کیا گیا کہ جب ایک خاص مقصد کیلئے بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کو کہا گیا تھا تو یہی گوسالہ پرستی کی محبت ان کے آڑے آئی تھی اور مصریوں کے عقیدۂ تقدیس بقرہ (گائے کی تقدیس) کے اتباع میں انہوں نے بیسیوں حیلے بہانے تراشے اور یہ کوشش کی کہ کسی طرح ان کو گائے ذبح نہ کرنی پڑے، لیکن جب سوالات کی پیچیدگی میں آکر پھنس گئے تو مجبوراً تعمیل کرنی پڑی۔

قرآن نے جب اس واقعہ کو سنایا تو قدرتی طور پر سامعین کو شوق پیدا ہونا چاہئے تھا کہ وہ یہ معلوم کریں کہ ذبح بقرہ کا وہ واقعہ کیوں اور کس طرح پیش آیا۔ جس کے بارے میں بنی اسرائیل اس قدر حیلے تراش رہے تھے تو دوسرے حصہ میں قرآن عزیز نے اس پیدا شدہ فطری سوال کا جواب اس طرح دیا کہ اس واقعہ کے نمایاں پہلو کو بیان کر دیا۔ جس کا بنی اسرائیل کی اس ردو کد کے ساتھ حقیقی تعلق تھا، اسلیئے اس حصہ بیان کو دوبارہ لفظ "اذ" سے شروع کیا۔

قرآنِ عزیز کی ان آیات کی یہ وہ تفسیر ہے جو قرآن کے جملوں کے اندر محدود ہو کر کی گئی ہے اور جس میں ذبح بقرہ کے واقعہ سے متعلق آیات میں تقدیم و تاخیر کی بحثوں میں جانے کی مطلق ضرورت پیش نہیں آتی اور نہ واقعہ کو اچنبھا سمجھ کر باطل اور رکیک تاویلات کی پناہ لینے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

بلاشبہ یہ واقعہ خدائے تعالیٰ کے ان مسلسل نشانوں میں سے ایک "نشان" تھا۔ جو یہود کی سخت اور تند جبلت اور متمردانہ خصلت کے مقابلہ میں تائید حق کیلئے حکمتِ الٰہی کے پیش نظر ظہور میں آیا جو نشان ہونے کے علاوہ اپنے اندر متعدد اہم مصالح رکھتا تھا اور اس حقیقتِ ثابتہ کیلئے خود قرآنِ عزیز کا سیاق و سباق تائید کرتا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کے متصل ہی ارشاد ہے کذلک یحی اللہ الموتیٰ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کر دے گا" اور اسی کے سیاق میں ارشاد فرمایا و یریکم ایتہ تاکہ دکھائے تم کو اپنی قدرت

کے نشان "۔

گویا "ذبح بقرہ" کا واقعہ نقل کرنے سے قبل بنی اسرائیل کو بار بار خدائی نشان مشاہدہ کرانے کا ذکر اور پھر قصہ کے متصل ہی آخرت میں "احیاءِ موتیٰ" کا اس واقعہ سے استشہاد اور ہر اس واقعہ کو بھی "آیات اللہ" میں سے ایک آیت (نشان بتانا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ کسی تاویل اور دور از کار باتوں کی پناہ لئے بغیر ان آیات کی صاف اور سادہ تفسیر وہی ہے جو سطور بالا میں بیان کی گئی۔

لہٰذا ان آیات کی وہ تفاسیر جو جدید معاصرین نے بیان کی ہیں اور جن میں تمام آیات متعلقہ کو کبھی دو جدا واقعات کہہ کر اور کبھی ایک واقعہ تسلیم کر کے مختلف رکیک اور لچر تاویلات سے کام لیا گیا ہے "ناقابل تسلیم ہیں اور قرآن عزیز کے منطوق کے خلاف"

مثلاً کہا جاتا ہے کہ ذبح بقرہ کا یہ طریقہ دراصل خود بنی اسرائیل کی قدیم رسوم میں سے تھا جس کا ذکر اب تک تورات میں موجود ہے یعنی جب کسی جگہ ایسا مقتول پایا جاتا کہ اس کے قاتل کا پتہ نہ ملتا تو باہمی جنگ و جدال سے بچانے کے لئے یہ طریقہ مروج تھا کہ وہ ایک ایسی گائے کو حاصل کرتے جو نہ کاشت کے کام میں آئی ہو اور نہ سیرابی کی خدمت کر چکی ہو اور اس کو ایسی وادی میں لے جاتے جہاں کاشت کبھی نہ ہوئی ہو اور پانی کا نالہ بہہ رہا ہو، اور جس پر قاتل ہونے کا شبہ ہوتا تو اس کے محلہ، خاندان یا بستی کے لوگوں کو جمع کیا جاتا اور پھر کاہن آگے بڑھتا اور بہتے ہوئے پانی پر گائے کو کھڑا کر کے اس کی گردن مارتا اور جب اس کا خون پانی میں مل جاتا تو فوراً مشتبہ گروہ کے لوگ اٹھ کر اس خون آلود پانی سے ہاتھ دھوتے جاتے اور پکار پکار کر یہ کہتے جاتے کہ "نہ ہمارے ہاتھوں نے اس کو قتل کیا ہے اور نہ ہمیں قاتل کا پتہ معلوم ہے" تو پھر ان پر کوئی شبہ باقی نہ رہتا اور خانہ جنگی نہ ہونے پاتی، اور اگر مشتبہ گروہ کا ایک سردار بھی ہاتھ دھونے اور اس رسم میں شریک ہونے سے انکار کر دیتا تو پھر مقتول کا خون بہا اس خاندان یا محلہ پر ڈال دیا جاتا تھا جس کا وہ سردار ہے۔ (استثناء، باب ۲۱، آیات ۹-۱)

اس تفسیر میں قرآن عزیز کے سیاق و سباق کے لحاظ سے جو نقائص ہیں وہ معمولی فہم و عقل سے بھی معلوم ہو سکتے ہیں لیکن ان کے علاوہ سب سے زیادہ قابل اعتراض یہ امر ہے کہ اگر بنی اسرائیل میں یہ دستور قدیم سے رائج تھا تو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی رسم کے مطابق خدائے تعالیٰ کا فیصلہ سنایا تو بنی اسرائیل نے اس کو اجنبی نگاہ سے کیوں دیکھا اور یہ کیوں کہا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا اے موسیٰ علیہ السلام! کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے کہ گائے ذبح کرنے کو کہتا ہے اور اگر ازرہِ تعنت ان کا سوال تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام یہی جواب دیتے کہ اس میں حیرت و تعجب کا کون سا موقعہ ہے جبکہ تم خود جانتے ہو کہ قضیہ کے فیصلہ کا یہ پرانا طریقہ ہے۔

اس سلسلہ میں گائے حاصل کرنے سے متعلق کتب تفاسیر میں عجیب و غریب قصے مذکور ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام قصص اسرائیلیات سے منقول ہیں یعنی یہ وہ قصے ہیں جو یہود کی نقل و روایت سے شہرت پا گئے اور تفسیروں میں بھی درج کر دیئے گئے ہیں مگر محققین نے ان کو چھان کر تفسیر قرآن سے بالکل جدا کر دیا ہے چنانچہ حافظ عماد الدین، ابن کثیرؒ جیسے جلیل القدر مفسر نے ان قصص کے متعلق یہ فیصلہ دیا ہے۔

اور یہ سلسلۂ بیانات جو عبیدہ، ابو العالیہ اور سدی اور دوسروں سے مروی ہے ان سب کے آپس

میں اختلاف ہے اور صاف بات یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی کتابوں سے ماخوذ ہیں اور اگرچہ ان کا نقل کرنا درجۂ جواز میں آسکتا ہے مگر ہم نہ ان کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ تکذیب اور اسی بناء پر ان روایات پر قطعاً کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا مگر وہ روایات جو ہمارے نزدیک قرآن وحدیث کی روشنی میں) حق ہوں۔ واللہ اعلم۔

اور خاص اس واقعہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

گائے کا وہ کون سا حصہ تھا جو مردہ جسم پر مس کیا گیا سو وہ کوئی بھی حصہ ہو واقعہ میں جس قدر مذکور ہے معجزہ ہونے کیلئے وہ بھی کافی ہے اور اگر اس حصہ کا تعین بھی ہمارے دینی یا دنیوی حالات کے اعتبار سے ضروری ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور واضح فرما دیتے۔ مگر اس نے اسکو مبہم ہی رکھا ہے اگرچہ اصل حقیقت کے لحاظ سے وہ بہر حال متعین ہے اور نبی معصوم ﷺ سے بھی اسکے تعین کے متعلق کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے لہٰذا ہمارے لئے بھی یہی مناسب ہے کہ ہم بھی اسکو اسی طرح مبہم رہنے دیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو مبہم رکھا۔ (البدایہ والنہایہ جلد اول صفحہ ۱۱۴)

علاوہ ازیں مسلم کی حدیث میں صرف اسی قدر مذکور ہے کہ "اگر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ردو کد نہ کرتے تو گائے کے معاملہ میں ان پر پابندیاں عائد نہ ہوتیں" پس اگر اس معاملہ سے متعلق اور تفاصیل بھی ہوتیں تو نبی معصوم ﷺ بھی ذکر ضرور فرماتے۔

غرض یہ واقعہ حق تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک "عظیم نشان" ہے، البتہ قرآن عزیز نے جو تفصیل بیان کی ہے صرف اسی قدر قابل تسلیم ہے باقی سب قصص و حکایات ہیں لاطائل داستانیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے متعلق ان مباحث کا خطاب ان ہی مفسرین کے ساتھ ہے جو اصولاً معجزات انبیاء کے تو قائل ہیں، مگر ان مقامات میں تاویل کی گنجائش سمجھ کر ایسی تاویلات کرتے ہیں جن کی بدولت یہ واقعات معجزہ کی حد سے باہر ہو جائیں باقی جو ملاحدہ اسلام کے مسلمہ عقیدہ معجزہ کے ہی قائل نہیں ہیں اور اس لئے قرآن عزیز کے ایسے تمام واقعات کو باطل تاویلات کی نذر کر دینا ہی ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے لئے سب سے پہلے نفس معجزہ کے امکان پر گفتگو ہونا چاہئے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ ان عظیم الشان "آیات اللہ" کے مشاہدہ اور ان پر خدائے تعالیٰ کے بے غایت فضل و کرم کے باوجود ان بد بختوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور یہ اسی طرح کج روی اور زیغ پر قائم رہے قبول حق کے لئے ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے، بلکہ پیہم تمرد و سرکشی نے ان کی نیک استعداد کو فنا کر کے پتھر سے بھی زیادہ سخت بنا دیا اس لئے کہ پتھر میں سخت ہوتے ہوئے بھی اس سے مخلوق خدا کو بہت سے فائدے ہیں مگر ان کی زندگی کا تو بجز خسارہ اور نقصان کے اور کچھ حاصل نہیں رہا۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ

مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۂ بقرہ)

اس (مشاہدہ) کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا (دل نہیں) پتھر ہیں یا (یوں سمجھو) کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت (یہ بات واضح ہے) کہ بعض پتھروں سے پانی نکل کر نہریں بہتی ہیں اور بعض چیخ کر پھٹتے ہیں تو ان سے سوت جاری ہو جاتے ہیں اور بعض خدا کے خوف سے (بھونچال وغیرہ حالتوں میں) نیچے لڑھک آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کرتوتوں سے غافل نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے قلوب کی سختی اور قبول حق میں بے اثری کا یہ عالم ہے کہ اگر محاورہ اور بول چال کے مطابق یوں کہہ دیا جائے کہ ان کا دل پتھر کا ٹکڑا بن گیا ہے تب بھی ان کی شدت وصلابت کی صحیح تصویر سامنے نہیں آسکتی، اس لئے کہ پتھر اگرچہ سخت ہے مگر ناکارہ نہیں ہے کیا تم نے پہاڑوں کا مشاہدہ نہیں کیا اور نہیں دیکھا کہ ان ہی سخت پتھروں سے ندیاں دریا بہہ رہے ہیں اور کہیں ان ہی سے شیریں اور خنک پانی کے سوت جاری ہیں اگر بھونچال آجائے یا خدا کی مشیت کا کوئی اور فیصلہ ہو جائے تو پہاڑوں کی یہی دیو پیکر چٹانیں روئی کے گالوں کی طرح ٹوٹ کر اور اڑ کر سرنگوں ہو جاتی اور خدائے تعالیٰ کے خوف وخشیت کا زبان حال سے اقرار کرتی ہیں مگر ان میں بنی اسرائیل پر نہ آیات اللہ کا اثر ہوتا ہے نہ پیغمبر کی شیریں اور دل نشیں پند ونصائح کا اور نہ نافرمانی کرتے وقت خدا کا خوف ان کے دلوں پر طاری ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قارون

بنی اسرائیل میں ایک بہت بڑا متمول شخص تھا قرآن عزیز نے اس کا نام قارون بتایا ہے اس کے خزانے زر وجواہر سے پر تھے اور قوی ہیکل مزدوروں کی جماعت بمشکل اس کے خزانوں کی کنجیاں اٹھا سکتی تھی اس تمول اور سرمایہ داری نے اس کو بے حد مغرور بنا دیا تھا اور وہ دولت کے نشہ میں اس قدر چور تھا کہ اپنے عزیزوں، قرابت داروں اور قوم کے افراد کو حقیر اور ذلیل سمجھتا اور ان سے حقارت کے ساتھ پیش آتا تھا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی تھا اور اس کا نسب اس طرح نقل فرماتے ہیں۔

قارون بن یصہر بن قاہت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب یہ ہے: موسیٰ علیہ السلام بن عمران بن قاہت۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی یہی منقول ہے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ قارون قیام مصر کے زمانہ میں فرعون کا درباری ملازم رہا تھا اور دولت کا یہ بے انتہا انبار اس نے وہیں جمع کیا تھا اور سامری منافق تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین میں اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔

(البدایہ والنہایہ جلد اص ۳۰۹)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم نے ایک مرتبہ اس کو نصیحت کی کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بے شمار دولت وثروت بخشی ہے اور عزت وحشمت عطا فرمائی ہے لہٰذا اس کا شکر ادا کر اور مالی حقوق "زکوٰۃ وصدقات" دے کر غرباء، فقراء اور مساکین کی مدد کر، خدا کو بھول جانا اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنا اخلاق وشرافت دونوں لحاظ سے سخت ناشکری اور سرکشی ہے اس کی دی ہوئی عزت کا صلہ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ تو کمزوروں اور ضعیفوں کو حقیر و

ذلیل سمجھنے لگے اور نخوت وپندار میں غریبوں اور عزیزوں کے ساتھ نفرت سے پیش آئے۔

قارون کے جذبۂ انانیت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ نصیحت پسند نہ آئی اور اس نے مغرورانہ انداز میں کہا: موسیٰ علیہ السلام! میری یہ دولت وثروت تیرے خدا کی عطا کردہ نہیں ہے، یہ تو میرے عقلی تجربوں علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے انما اوتیته علی علم عندی میں تیری نصیحت مان کر اپنی دولت کو اس طرح برباد نہیں کر سکتا۔

مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام برابر اپنے فرض تبلیغ کو انجام دیتے اور قارون کو راہ ہدایت دکھاتے رہے، قارون نے جب یہ دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتے تو ان کو زچ کرنے اور اپنی دولت و حشمت کے مظاہرہ سے مرعوب کرنے کے لئے ایک دن بڑے کروفر کے ساتھ نکلا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے مجمع میں پیغام الٰہی سنا رہے تھے کہ قارون ایک بڑی جماعت اور خاص شان وشوکت اور خزانوں کی نمائش کے ساتھ سامنے گذرا، اشارہ یہ تھا کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو میں بھی ایک کثیر جتھ رکھتا ہوں اور زرد جواہر کا بھی مالک ہوں لہٰذا ان دونوں ہتھیاروں کے ذریعہ موسیٰ علیہ السلام کو شکست دے کر رہوں گا۔

بنی اسرائیل نے جب قارون کی اس دنیوی ثروت وعظمت کو دیکھا تو ان میں سے کچھ آدمیوں کے دلوں میں انسانی کمزوری نے یہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ بے چین ہو کر یہ دعا کرنے لگے: "اے کاش یہ دولت وثروت اور عظمت وشوکت ہم کو بھی نصیب ہوتی" مگر بنی اسرائیل کے ارباب بصیرت نے فوراً مداخلت کی اور ان سے کہنے لگے۔ "خبردار! اس دنیوی زیب وزینت پر نہ جانا اور اس کے لالچ میں گرفتار نہ ہو بیٹھنا تم عنقریب دیکھو گے کہ اس دولت وثروت کا انجام بد کیا ہونے والا ہے؟"

آخر کار جب قارون نے کبر ونخوت کے خوب خوب مظاہرے کر لئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے مسلمانوں کی تحقیر وتذلیل میں کافی سے زیادہ زور صرف کر لیا تو اب غیرت حق حرکت میں آئی اور پاداش عمل کے فطری قانون نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور قارون اور اس کی دولت پر خدا کا یہ اٹل فیصلہ ناطق کر دیا۔ فخسفنا به وبداره الارض ہم نے قارون اور اس کے سرمایہ کدہ کو زمین کے اندر دھنسا دیا اور بنی اسرائیل کی آنکھوں دیکھتے نہ غرور باقی رہا اور نہ سامان غرور سب کو زمین نے نگل کر عبرت کا سامان مہیا کر دیا، قرآن عزیز نے متعدد مقامات پر اس واقعہ کو مفصل اور مجمل بیان کیا ہے:۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسٰى بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ ○ إِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سَاحِرٌ كَذَّابٌ ○ (سورہ مومن)

اور بے شبہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیاں اور ظاہر وزبردست حجت (توراۃ) دے کر فرعون، ہامان اور قارون کے پاس بھیجا تھا پس ان سب نے یہ کہا کہ یہ تو جادوگر ہے بڑا جھوٹا۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانُوْا سَابِقِيْنَ ○

فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُمْ مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ أَغْرَقْنَا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○ (سورہ عنکبوت)

اور بے شبہ ان کے پاس موسیٰ علیہ السلام کھلی نشانیاں لے کر آیا، پھر انہوں نے زمین میں کبر غرور اختیار کیا اور وہ ہم سے جیت جانے والے نہیں تھے پھر سب کو پکڑا ہم نے اپنے اپنے گناہ پر پھر کسی پر ہم نے ہوا سے پتھر اؤ کیا، اور کسی کو چیخ نے آدبایا اور کسی کو زمین میں دھنسادیا اور کسی کو ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود آپ اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے۔

قارون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق صحیح حالات صرف اسی قدر ہیں باقی روایات "اسرائیلیات" سے ماخوذ ہیں اس لئے ناقابل اعتماد ہیں، اسی لئے حافظ ابن کثیرؒ نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔

و قد ذکر ھھنا اسرائیلیات اضربنا عنھا صفحًا۔ (ابن کثیر سورہ القصص)

اور اس مقام پر بہت سی اسرائیلیات بیان کی گئی ہیں ہم نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ أُوتِيتُهُ عَلَى عِلْمٍ عِندِي میں علم سے مراد "علم کیمیا" ہے اور وہ قارون کی دولت کو اس کی کیمیادانی کا رہین منت بتاتے ہیں، محققین نے اس کی تردید فرمائی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اس کا مقصد علم سے اپنی عقل و دانش کے ذریعہ حصول مال ہے اور کیمیا کی باتیں سب دور از کار ہیں۔

علماء تفسیر اس میں متردد ہیں کہ قارون کا واقعہ کب پیش آیا۔ مصر میں قبل غرق فرعون، یا تیہ میں بعد غرق فرعون، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اگر قبل غرق کا ہے تو آیت میں "دار" اپنے حقیقی معنی میں ہے اور اگر میدان تیہ کا واقعہ ہے تو "دار" سے خیمہ و خرگاہ مراد ہے۔ ہمارے نزدیک یہ واقعہ میدان تیہ کا ہے اس لئے قرآن عزیز نے اس کو غرق فرعون سے متعلق واقعات کے بعد بیان کیا ہے۔

إِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ○ وَابْتَغِ فِيْمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَآ أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ○ قَالَ إِنَّمَآ أُوْتِيْتُهُ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّأَكْثَرُ جَمْعًا وَلَا يُسْأَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ○ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهِ فِيْ زِيْنَتِهِ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا يَالَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ أُوْتِيَ قَارُوْنُ إِنَّهُ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ○ وَقَالَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا

الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّلَا يُلَقَّاهَآ إِلَّا الصَّابِرُوْنَ ○ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ○ وَأَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْأَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَأَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَوْلَآ أَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَيْكَأَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُوْنَ ○ تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (قصص)

بے شک قارون، موسیٰ علیہ السلام کی قوم ہی میں سے تھا، پس اس نے ان پر سرکشی کی اور ہم نے اس کو اس قدر خزانے دیئے تھے کہ اس کی کنجیوں کے بوجھ سے طاقتور آدمی تھک جاتے تھے جب اس کی قوم نے کہا تو شیخی نہ مار اللہ شیخی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اور جو کچھ تجھ کو خدا نے دیا ہے اس میں آخرت کو تلاش کر، اس کو نہ بھول کہ دنیا میں اس نے تجھ کو کیا کچھ دے رکھا ہے اور جس طرح خدا نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے تو بھی اسی طرح بھلائی کر، اور فساد کے درپے نہ ہو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ قارون کہنے لگا یہ مال تو مجھ کو میرے ایک ہنر سے ملا ہے جو مجھ کو آتا ہے کیا وہ اس سے بے خبر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے اس سے کہیں زیادہ مالدار اور طاقتور قوموں کو ہلاک کر دیا اور نہ سوال کیا جائے مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارہ میں (یعنی ان کی عقلیں ماری گئی ہیں تب ہی تو گناہ میں مبتلا ہیں پھر سوال سے کیا فائدہ) پھر نکلا ایک دن قوم کے سامنے بن سنور کر خدم و حشم کے ساتھ تو جو لوگ دنیا کے طالب تھے انہوں نے اس کو دیکھ کر کہا "اے کاش ہمیں بھی یہ سب کچھ ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے بلاشبہ یہ بڑے نصیب والا ہے اور جن لوگوں کو اللہ نے بصیرت و علم عطا کیا تھا انہوں نے کہا تمہیں ہلاکی ہو جو اللہ پر ایمان لایا اور نیک عمل کئے اس کے لئے اللہ کا ثواب اس دولت سے بہتر ہے اور اس کو نہیں پاتے مگر صبر کرنے والے پھر ہم نے قارون اور اس کے محل کو زمین میں دھنسا دیا، پس اس کے لئے کوئی جماعت مددگار ثابت نہیں ہوئی جو خدا کے عذاب سے اس کو بچائے اور وہ بے یار و مددگار ہی رہ گیا اور جنھوں نے کل اس کی شان و شوکت دیکھ کر اس جیسا ہو جانے کی تمنا کی تھی وہ یہ دیکھ کر آج یہ کہنے لگے ارے خرابی یہ تو اللہ تعالیٰ کھول دیتا ہے روزی جس کو چاہے اپنے بندوں میں اور تنگ کر دیتا ہے اگر احسان نہ کرتا اللہ ہم پر تو ہم کو بھی دھنسا دیتا ارے خرابی یہ تو چھٹکارا نہیں پاتے منکر یہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لئے بنایا ہے جو (خدا کی زمین میں شیخی نہیں مارتے اور نہ فساد کے خواہش مند ہوتے ہیں اور انجام کی بھلائی متقیوں کیلئے ہے۔)

تورات نے بھی اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے[1] مگر اس کے بیان کہ قرآن عزیز کی تصریحات کو پڑھنے کے بعد ایک انصاف پسند انسان کو یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز جب کسی تاریخی واقعہ کو نقل

[1] تورات گنتی باب ۱۶۔ آیات ۴۔ ۳۔ ۲۰۔

کرتا ہے تو اس کے صرف ان ہی اجزاء کو بیان کرتا ہے۔ جو غرض اور مقصد تورات میں اکثر بے ضرورت تفاصیل بیان ہوتی ہیں اور بعض جگہ تو بے محل طوالت بلکہ تضاد بیان تک پایا جاتا ہے جن کو ہم حسب موقعہ بیان کرتے جاتے ہیں چنانچہ اس مقام پر بھی بعض غیر ضروری حصوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایذاء بنی اسرائیل

گذشتہ واقعات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کو قول اور عمل دونوں طریقوں سے سخت اذیتیں پہنچائیں حتیٰ کہ بہتان طرازی اور تہمت تراشی سے بھی باز نہیں رہے۔

بت پرستی کی فرمائش، گوسالہ پرستی میں انہماک، قبول تورات سے انکار، ارض مقدس میں داخلہ سے انکار، من وسلویٰ پر ناسپاسی، غرض ہر ادائے فرض میں ضد اور ہٹ اور ہر ایک معاملہ میں حضرت موسیٰ کے ساتھ جاہلانہ ردو کد کا ایک طویل سلسلہ ہے جو ان کی زندگی کا جز نظر آتا ہے اور حضرت موسیٰ ضبط وصبر کے ساتھ ایک اولوالعزم رسول کی طرح ان کو قرآن عزیز کی تصریحات کے علاوہ تاریخی حیثیت سے اگر بنی اسرائیل کی ان خصوصیات کا مطالعہ مقصود ہو تو تورات کے حسب ذیل ابواب قابل مراجعت ہیں۔

خروج باب ۱۲ آیات ۱۲۔ ۱۱ باب ۱۶ آیات ۳۔ ۲ گنتی باب ۱۴۔ آیات ۳۔ ۱ باب ۱۶ آیات ۱۴، ۱۳، باب ۷ آیات ۱۳۔ ۱۲۔ استثناء باب ۹ آیات ۲۴۔ ۲۳۔

لیکن قرآن عزیز نے ان واقعات کے علاوہ جن کا ذکر صفحات گذشتہ میں تفصیل سے آچکا ہے سورۂ احزاب اور سورۂ صف میں حضرت موسیٰ کے ساتھ بنی اسرائیل کی ایذاء رسانی پر مذمت کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے:

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ آذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّأَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ۝ (سورۂ احزاب)

اے ایمان والو! تم ان بنی اسرائیل کی طرح نہ ہو جنھوں نے موسیٰ کو ایذاء پہنچائی، پھر اللہ نے اس کو اس بات سے بری کر دیا جو وہ اس کے متعلق کہتے تھے اور موسیٰ اللہ کے نزدیک صاحب وجاہت ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَعْلَمُوْنَ أَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوْا أَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ ۝

(سورۂ صف)

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم! تو کس لئے مجھ کو ایذا پہنچاتی ہے جبکہ تجھ کو یہ معلوم ہے کہ میں تمہاری جانب خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں پھر جب وہ کجی پر اڑ بیٹھے تو اللہ نے بھی ان کے دلوں پر کجی کو مسلط کر دیا اور اللہ نافرمان قوم کو راہیاب نہیں کیا کرتا۔

اس لئے علماء تفسیر نے ان ہر دو مقام پر بحث کی ہے کہ یہاں جس ایذاء کا تذکرہ کیا گیا ہے کیا اس سے وہی حالات مراد ہیں جو بنی اسرائیل کی سرکشی اور تعنت کے سلسلہ میں بیان ہو چکے ہیں اور جن کا پورا سلسلہ یقینا

حضرت موسیٰ کی اذیت کا باعث تھا، یا ان کے علاوہ کسی اور خاص واقعہ کی جانب اشارہ ہے چنانچہ بعض مفسرین نے تو یہ فرمایا کہ اس سے وہی ایذاء مراد ہے جو حضرت موسیٰ کو بنی اسرائیل کے تعنت اور ضد کی وجہ سے پہنچتی رہی تھی اور بعض مفسرین نے ان ہر دو آیات کا مصداق گذشتہ واقعات سے جدا واقعہ کو بتایا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ بعض صحیح احادیث میں حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے درمیان ایسے واقعات کا تذکرہ پایا جاتا ہے جن کا تفصیلی ذکر قرآن عزیز میں موجود نہیں ہے لہٰذا ان کے واقعات میں سے کوئی ایک مخصوص واقعہ یا وہ سب واقعات ان آیات کے مصداق ہیں اور وہی ان کیلئے شان نزول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان واقعات میں سے ایک واقعہ بخاری اور مسلم میں مذکور ہے اور وہ یہ کہ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ پر شرم وحیا کا بہت غلبہ تھا حتیٰ کہ وہ اپنے برہنہ حصہ پر کبھی نگاہ نہیں پڑنے دیتے تھے، اس کے برعکس بنی اسرائیل مجمع عام میں برہنہ ہو کر غسل کرنے کے عادی تھے، اس لئے وہ حضرت موسیٰ کو تنگ کرتے اور ان کی مذاق اڑاتے تھے کبھی کہتے کہ ان کے خاص حصہ جسم پر برص کے داغ ہیں، کبھی کہتے کہ ان کو ادرۃ (فوطوں کا متورم ہو کر بڑھ جانا) کا مرض ہے یا کوئی اور اسی قسم کا خراب مرض ہے تب ہی تو چھپ کر علیحدہ نہاتے ہیں، حضرت موسیٰ سنتے اور خاموش رہتے آخر اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہوئی کہ ان کو اس تہمت سے پاک اور بری کرے چنانچہ ایک روز وہ علیحدہ آڑ میں نہانے کی تیاری کر رہے تھے کپڑے اتار کر پتھر پر رکھ دیئے پتھر خدا کے حکم سے اپنی جگہ سے سرکا اور جہاں مجمع میں بنی اسرائیل برہنہ نہا رہے تھے وہاں چل کر پہنچ گیا، حضرت موسیٰ گھبراہٹ اور غصہ میں اس کے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑے "ثوبی حجر" (اے پتھر! میرے کپڑے) پتھر جب مجمع کے سامنے ٹھہر گیا تو سب نے دیکھ لیا کہ موسیٰ بیان کردہ ہر قسم کے عیب سے پاک وصاف ہیں حضرت موسیٰ پر اس اچانک واقعہ کا ایسا اثر پڑا کہ غصہ میں جھنجھلا کر پتھر پر لاٹھی کے چند وار کر دیئے جس سے اس پر نشان پڑ گئے۔ (بخاری باب الغسل، مسلم باب الفضائل)

بخاری اور مسلم نے اس کو متعدد طریقوں سے روایت کیا ہے، ان میں سے ایک طریقہ میں اس واقعہ کو سورہ احزاب کی اس آیت کا شان نزول قرار دیا ہے جس میں بنی اسرائیل کی ایذاء اور خدائے تعالیٰ کی جانب سے موسیٰ کی برأت کا ذکر ہے۔

اور اسی آیت کے شان نزول میں ابن ابی حاتم نے حضرت علیؓ سے دوسری روایت نقل کی ہے حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون پہاڑ (ہور) پر گئے مگر حضرت ہارون کا وہیں انتقال ہو گیا اور حضرت موسیٰ تنہا واپس ہوئے بنی اسرائیل نے یہ دیکھا تو حضرت موسیٰ پر تہمت رکھی کہ اس نے ہارون کو قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ کو اس تہمت سے بہت دکھ پہنچا تب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ ہارون کی نعش کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کریں، فرشتوں نے فضاء میں حضرت ہارون کی نعش بنی اسرائیل کے مجمع میں پیش کی اور انہوں نے یہ دیکھ کر اطمینان حاصل کیا کہ واقعی ہارون پر قتل کا کوئی نشان نہیں ہے۔

تیسری روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور سدی سے کتب تفاسیر میں منقول ہے کہ جب قارون کو حضرت موسیٰ کی نصیحت بہت ناگوار گزرنے لگی تو ایک دن اس نے ایک پیشہ ور عورت کو کچھ روپے دے کر اس پر آمادہ کر لیا کہ جس وقت حضرت موسیٰ پند و نصیحت میں مصروف ہوں اس وقت تو ان پر الزام لگایا کہ یہ شخص مجھ سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ دوسرے دن جب حضرت موسیٰ وعظ فرمارہے تھے تو اس عورت نے حضرت موسیٰ الزام لگایا۔ حضرت موسیٰ یہ سن کر سجدہ میں گر پڑے اور پھر سر اٹھا کر عورت کی جانب مخاطب ہوئے کہ تو نے جو کچھ ابھی کہا تھا کیا خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتی ہے کہ یہ سچ ہے؟ یہ سن کر عورت پر رعشہ طاری ہو گیا اور اس نے کہا بخدا سچ بات یہ ہے کہ قارون نے مجھ کو روپیہ دے کر اس الزام پر آمادہ کیا تھا ورنہ تو آپ اس سے بری اور پاک ہیں تب حضرت موسیٰ نے قارون کے لئے بددعا کی اور خدا کے حکم سے معہ ساز و سامان زمین میں دھنسا دیا گیا۔

محاکمہ

اس بحث میں صحیح مسلک یہ ہے کہ جب قرآن عزیز نے حضرت موسیٰ سے متعلق ایذاء کے واقعہ کو مجمل بیان کیا ہے اور اس کی کوئی تعیین نہیں کی تو ہمارے لیئے بھی یہی مناسب ہے کہ اس کی تفصیل اور تعیین کئے بغیر نفس واقعہ پر ایمان لائیں اور کسی خاص واقعہ سے متعلق نہ کریں اور جس حکمت و مصلحت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کو مجمل رکھنا مناسب سمجھا۔ ہم بھی اسی پر اکتفا کریں اور اگر تفصیل اور تعیین کی جانب توجہ دینا ضروری ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ ان ہر دو آیات کا مصداق وہ تمام واقعات ہیں جو حضرت موسیٰ کی ایذاء رسانی سے متعلق قرآن عزیز اور صحیح احادیث میں منقول ہے اور اس امر کا لحاظ کرتے ہوئے کہ زیر بحث ایذاء کا معاملہ اس نوعیت کا ہے کہ جس سے حضرت موسیٰ کی جانب سے اس کا دفاع کر کے ان کے قولی ہفوات سے ان کو بری اور پاک ثابت کر دیا۔ تو ان ہر دو آیات کے مصداق کی تعیین میں وہ تینوں روایات قابل ترجیح ہیں جو کتب احادیث سے نقل کی جاچکی ہیں اور وہ سب ان آیات کا مصداق ہیں، رہا یہ امر کہ شان نزول کے لئے کسی ایک واقعہ کا مخصوص ہونا ضروری ہے تو بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ یہ درست نہیں ہے بلکہ شان نزول کی اصل حقیقت یہ ہے کہ زمانہ نبوت میں پیش آنے والے وہ تمام واقعات جو کسی آیت کا مصداق بن سکتے ہوں اس آیت کیلئے یکساں طور پر شان نزول کہے جا سکتے ہیں۔ اس مقام کی تفسیر میں نجار نے قصص الانبیاء میں ایک طویل بحث کی ہے اور ان کے درمیان اور مصر کی مجلس علماء کے درمیان جو بحث و تمحیص ہوئی ہے اس کو بھی نقل کیا ہے مگر ہم چونکہ دونوں خیالات کے پوری طرح ہم نوا نہیں ہیں اور مفسرین قدیم میں ابن کثیر اور ابن حیان کے رجحانات کے مؤید ہیں اس لئے اس بحث کو نظر انداز کرتے ہیں۔

حضرت ہارون کی وفات

گذشتہ واقعات میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے ارض مقدس میں داخل ہونے سے انکار کر دیا

تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ذریعہ ان کو یہ اطلاع کر دی تھی کہ چالیس سال تک اب تم کو اسی سر زمین میں بھٹکنا پڑیگا اور سر زمین مقدس میں ان افراد میں سے کوئی بھی داخل نہ ہو سکے گا جنھوں نے داخل ہونے سے اس وقت انکار کر دیا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان کو یہ بھی بتایا کہ موسیٰ اور ہارون بھی تمہارے پاس ہی رہیں گے کیونکہ انکی اور آنیوالی نسل کی رشد وہدایت کیلئے ان دونوں کا یہاں موجود رہنا ضروری ہے چنانچہ جب بنی اسرائیل "تیہ" کے میدان میں گھومتے اور پھرتے پھراتے پہاڑ کی اس چوٹی کے قریب پہنچے جو "ہور" کے نام سے مشہور تھی تو حضرت ہارون کو پیغام اجل آپہنچا، وہ اور حضرت موسیٰ خدا کے حکم سے "ہور" پر چڑھ گئے اور وہیں کچھ روز عبادت الٰہی میں مصروف رہے اور جب حضرت ہارون کا وہاں انتقال ہو گیا تب حضرت موسیٰ ان کی تجہیز و تکفین کے بعد نیچے اترے اور بنی اسرائیل کو ہارون کی وفات سے مطلع کیا۔

توراۃ میں اس واقعہ کو اس طرح ادا کیا ہے۔

> اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت قادس سے روانہ ہو کر کوہ ہور پہنچی اور خداوند نے کوہ ہور پر ادوم کی سرحد سے ملا ہوا تھا، موسیٰ اور ہارون سے کہا، ہارون اپنے لوگوں میں جا ملے گا کیونکہ وہ اس ملک میں جو میں نے بنی اسرائیل کو دیا ہے جانے نہیں پائے گا اس لئے کہ مریبہ کے چشمے پر تم نے میرے کلام کے خلاف عمل کیا۔ لہٰذا تو ہارون اور اس کے بیٹے الیعزر کو اپنے ساتھ لے کر کوہ ہور پر آ جا اور ہارون کے لباس کو اتار کر اس کے بیٹے الیعزر کو پہنادینا، کیونکہ ہارون وہیں وفات پاکر اپنے لوگوں میں جا ملے گا اور موسیٰ نے خداوند کے حکم کے مطابق عمل کیا اور ساری جماعت کی آنکھوں کے سامنے کوہ ہور پر چڑھ گئے اور موسیٰ نے ہارون کے لباس کو اتار کر اس کے بیٹے الیعزر کو پہنادیا اور ہارون نے وہیں پہاڑ کی چوٹی پر رحلت کی تب موسیٰ اور الیعزر پہاڑ سے اتر آئے جب جماعت نے دیکھا کہ ہارون نے وفات پائی تو اسرائیل کے سارے گھرانے کے لوگ ہارون پر تیس دن تک ماتم کرتے رہے۔ (گنتی باب ۲۰، آیات ۲۲، ۲۹)

حضرت موسیٰ اور خضر

حضرت موسیٰ کے واقعات زندگی میں ایک اہم واقعہ اس ملاقات کا ہے جو ان کے اور ایک صاحب باطن کے درمیان ہوئی اور حضرت موسیٰ نے ان سے عالم تکوینیات کے بعض رموز و اسرار معلوم کئے اس ملاقات کا ذکر تفصیل کے ساتھ سورہ کہف میں بیان کیا گیا ہے اور بخاری میں اس واقعے کے متعلق بعض مزید تفصیلات مذکور ہیں، بخاری میں سعید بن جبیرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے عرض کیا کہ موسیٰ صاحب خضر، موسیٰ صاحب بنی اسرائیل نہیں ہیں یہ ایک دوسرے موسیٰ ہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا "دشمن خدا جھوٹ بولتا ہے۔ مجھ سے ابی بن کعبؓ نے حدیث بیان کی ہے، انہوں نے رسول اکرم سے سنا ہے کہ۔ ارشاد فرماتے تھے کہ ایک روز حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو

خطاب فرما رہے تھے کہ کسی شخص نے دریافت کیا کہ سب سے بڑا عالم کون ہے حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ مجھے خدا نے سب سے زیادہ علم عطا فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ پسند نہ آئی اور ان پر عتاب ہوا کہ تمھارا منصب تو یہ تھا کہ اس کو علم الٰہی کے سپرد کرتے اور کہتے "واللہ اعلم" اور پھر وحی نازل فرمائی کہ جہاں دو سمندر ملتے ہیں (مجمع البحرین) وہاں ہمارا ایک بندہ ہے جو بعض امور میں تجھ سے زیادہ عالم و دانا ہے۔

حضرت موسیٰ نے عرض کیا کہ "پروردگار، تیرے اس بندے تک رسائی کیا طریقہ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مچھلی کو اپنے توشہ دان میں رکھ لو، پس جس مقام پر مچھلی گم ہو جاوے اسی جگہ وہ شخص ملے گا حضرت موسیٰ نے مچھلی کو توشہ دان میں رکھا اور اپنے خلیفہ یوشع بن نون کو ساتھ لے کر "مرد صالح" کی تلاش میں روانہ ہو گئے، جب چلتے چلتے ایک مقام پر پہنچے تو دونوں ایک پتھر پر سر رکھ کر سو گئے، مچھلی میں زندگی پیدا ہوئی اور وہ زنبیل سے نکل کر سمندر میں چلی گئی مچھلی پانی کی جس سطح پر بہتی ہوئی گئی اور جہاں تک گئی وہاں پانی برف کی طرح جم کر ایک چھوٹی سی پگڈنڈی کی طرح ہو گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر میں ایک لکیر یا خط کھینچا ہوا ہے، یہ واقعہ یوشع نے دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ حضرت موسیٰ سے پہلے بیدار ہو گئے تھے مگر جب موسیٰ بیدار ہوئے تو ان سے ذکر کرنا بھول گئے اور پھر دونوں نے اپنا سفر کرنا شروع کر دیا اور اس دن اور رات میں آگے ہی بڑھتے گئے جب دوسرا دن ہوا تو حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ اب تکان زیادہ محسوس ہونے لگا وہ مچھلی لاؤ تاکہ بھوک اس سے رفع کریں۔ "نبی اکرم نے فرمایا۔ حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی منزل مقصود تک پہنچنے میں کوئی تکان نہیں ہوا تھا۔ مگر منزل سے آگے غلطی سے نکل گئے تو اب تکان بھی محسوس ہونے لگا"۔ یوشع نے کہا: آپ کو معلوم رہے کہ جب ہم (صخرہ) پتھر کی چٹان پر تھے تو وہیں مچھلی کا یہ تعجب خیز واقعہ پیش آیا کہ اس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ مکتل (زنبیل) میں سے نکل کر سمندر میں چلی گئی اور اس کی رفتار پر سمندر میں راستہ بنتا چلا گیا۔ میں آپ سے یہ واقعہ کہنا بالکل بھول گیا۔ یہ بھی شیطان کا ایک چرکا تھا۔

"نبی اکرم نے فرمایا کہ سمندر کا وہ خط مچھلی کیلئے "سرب" (راستہ) تھا، اور موسیٰ و یوشع کیلئے "عجب" (تعجب خیز بات)"۔

حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ جس مقام کی ہم کو تلاش ہے وہ وہی مقام تھا اور یہ کہہ کر دونوں پھر ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہوئے اسی راہ پر لوٹے اور اس "صخرہ" (پتھر کی چٹان) تک جا پہنچے۔

وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اس جگہ عمدہ لباس پہنے ہوئے ایک شخص بیٹھا ہے، حضرت موسیٰ نے اس کو سلام کیا۔ اس شخص نے کہا کہ تمہاری اس سرزمین میں "سلام" کہاں؟ (یعنی اس سرزمین میں تو مسلمان نہیں رہتے) یہ خضر تھے، حضرت موسیٰ نے جواب دیا کہ میرا نام موسیٰ ہے۔

خضر نے کہا: موسیٰ بنی اسرائیل؟ حضرت موسیٰ نے کہا: ہاں! میں تم سے وہ علم حاصل کرنے آیا ہوں جو خدا نے تم ہی کو بخشا ہے۔ خضر نے کہا: "تم میرے ساتھ رہ کر ان معاملات پر صبر نہ کر سکو گے۔ موسیٰ! خدائے تعالیٰ نے مجھ کو تکوینی رموز و اسرار کا وہ علم عطا کیا ہے جو تم کو نہیں دیا گیا اور اس

نے تم کو (تشریعی علوم کا) وہ علم عطا فرمایا ہے جو مجھ کو عطا نہیں ہوا"۔ حضرت موسیٰ نے کہا "انشاء اللہ آپ مجھ کو صابر و ضابط پائیں گے اور میں آپ کے ارشاد کی قطعاً خلاف ورزی نہیں کروں گا"۔ حضرت خضر نے کہا: "تو پھر شرط یہ ہے کہ جب آپ میرے ساتھ رہیں تو کسی معاملہ کے متعلق بھی جسکو آپ کی نگاہیں دیکھ رہی ہوں مجھ سے کوئی سوال نہ کریں۔ میں خود آپ کو حقیقت بتادوں گا"۔ حضرت موسیٰ نے منظور کر لیا اور دونوں ایک جانب کو روانہ ہو گئے۔ جب سمندر کے کنارے پہنچے تو سامنے سے ایک کشتی نظر آئی۔ حضرت خضر نے ملاحوں سے کرایہ پوچھا، وہ خضر کو پہچانتے تھے۔ لہذا انہوں نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا اور اصرار کر کے دونوں کو کشتی پر سوار کر لیا اور کشتی روانہ ہو گئی، ابھی چلے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ حضرت خضر نے کشتی کے سامنے والے حصہ کا ایک تختہ اکھاڑ کر کشتی میں سوراخ کر دیا حضرت موسیٰ سے ضبط نہ ہو سکا خضر سے کہنے لگے کشتی والوں نے تو یہ احسان کیا کہ آپ کو اور مجھ کو مفت سوار کر لیا اور آپ نے اس کا یہ بدلہ دیا کہ کشتی میں سوراخ کر دیا کہ سب کشتی والے کشتی سمیت ڈوب جائیں یہ تو بہت نازیبا بات ہوئی؟

حضرت خضر نے کہا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میری باتوں پر صبر نہ کر سکیں گے؟ آخر وہی ہوا حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ مجھے وہ بات بالکل فراموش ہو گئی اس لئے آپ بھول چوک پر مواخذہ نہ کریں اور میرے معاملہ میں سخت گیری سے کام نہ لیں" نبی اکرم نے فرمایا ہے کہ "یہ پہلا سوال واقعی موسیٰ کی بھول کی وجہ سے تھا اسی اثناء میں ایک چڑیا کشتی کے کنارے آ کر بیٹھی اور پانی میں چونچ ڈال کر ایک قطرہ پانی پی لیا، حضرت خضر نے کہا کہ بلا شائبہ تشبیہ علم الٰہی کے مقابلہ میں میرا اور تمہارا علم ایسا ہی بے حقیقت ہے جیسا کہ سمندر کے سامنے یہ قطرہ۔

کشتی کنارے لگی اور دونوں اتر کر ایک جانب روانہ ہو گئے سمندر کے کنارے کنارے جا رہے تھے کہ ایک میدان میں کچھ بچے کھیل رہے تھے حضرت خضر آگے بڑھے اور ان میں ایک بچہ کو قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ کو پھر یارائے صبر نہ رہا۔ فرمانے لگے "ناحق ایک معصوم جان کو آپ نے مار ڈالا یہ تو بہت ہی برا کیا؟ حضرت خضر نے کہا: میں تو شروع ہی میں کہہ چکا تھا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر و ضبط سے کام نہ لے سکیں گے۔ نبی اکرم نے فرمایا چونکہ یہ بات پہلی بات سے بھی زیادہ سخت تھی اس لئے حضرت موسیٰ صبر و ضبط نہ کرنے میں معذور تھے، "حضرت موسیٰ نے فرمایا" خیر اس مرتبہ اور نظر انداز کر دیجئے، اس کے بعد بھی اگر مجھ سے صبر نہ ہو سکا تو پھر عذر کا کوئی موقع نہیں رہے گا اور اس کے بعد آپ مجھ سے علیحدہ ہو جائیے گا، غرض پھر دونوں روانہ ہو گئے اور چلتے چلتے ایک ایسی بستی میں پہنچے جہاں کے باشندے خوش عیش اور مہمان داری کے ہر طرح قابل تھے مگر دونوں کی مسافرانہ درخواست پر بھی ان کو مہمان بنانے سے انکار کر دیا تھا یہ ابھی بستی ہی میں سے گذر رہے تھے کہ خضر ایک ایسے مکان کی جانب بڑھے جسکی دیوار کچھ جھکی ہوئی تھی اور اسکے گر جانے کا اندیشہ تھا، حضرت خضر نے اسکو ہاتھ کا سہارا دیا اور دیوار کو سیدھا کر دیا حضرت موسیٰ نے پھر خضر کو ٹوکا اور فرمانے لگے کہ ہم اس بستی میں مسافرانہ وارد ہوئے، مگر اس کے بسنے والوں نے نہ مہمان داری کی اور نہ ٹکنے کو جگہ دی، آپ نے یہ کیا کیا کہ اس

کے ایک باشندے کی دیوار کو بغیر اجرت درست کر دیا، اگر کرنا ہی تھا تو بھوک پیاس کو دور کرنے کیلئے کچھ اجرت ہی طے کر لیتے" حضرت خضر نے فرمایا "اب میری اور تمہاری جدائی کا وقت آگیا ہے هذا فراق بيني و بينك اور پھر انہوں نے حضرت موسیٰ کو ان تینوں معاملات کے حقائق کو سمجھایا اور بتایا کہ یہ سب منجانب اللہ وہ باتیں تھیں جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "ہمارا جی تو یہ چاہتا تھا کہ موسیٰ تھوڑا صبر اور کرتے اور ہم کو اللہ تعالیٰ کے اسرار اور تکوینی علوم کی مزید معلومات ہو سکتیں، جب حضرت خضر کی مفارقت ہونے لگی تو خضر نے ان واقعات کی جو حقیقت بیان کی قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اس طرح ظاہر کیا ہے۔

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝ أَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُّ أَنْ أَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّأْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ۝ وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَا أَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۝ فَأَرَدْنَا أَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكَاةً وَّأَقْرَبَ رُحْمًا ۝ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوْهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَّبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِيْ ذٰلِكَ تَأْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝ (سورۂ کہف)

"بس اب مجھ میں اور تم میں جدائی کا وقت آگیا ہاں جن باتوں پر تم سے صبر نہ ہو سکا، ان کی حقیقت تمہیں بتلائے دیتا ہوں سب سے پہلے کشتی کا معاملہ لو وہ چند مسکینوں کی تھی جو سمندر میں محنت مزدوری کرتے ہیں وہ جس طرف بڑھ رہے تھے وہاں ایک بادشاہ ہے (ظالم) جس کسی کی (اچھی) کشتی پاتا ہے زبردستی لے لیتا ہے میں نے چاہا کشتی میں عیب نکال دوں تاکہ عیبی سمجھ کو اس کو (چھوڑ دے) رہا لڑکے کا معاملہ تو اس کے ماں باپ مومن ہیں میں یہ دیکھ کر ڈرا کہ یہ انہیں سرکشی اور کفر کر کے اذیت پہونچائے گا بس میں نے چاہا کہ ان کا پروردگار اس لڑکے سے بہتر انہیں لڑکا دے گا دینداری میں بھی اور محبت میں بھی اور وہ جو دیوار درست کر دی گئی تو وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی ہے جس کے نیچے ان کا خزانہ گڑا ہوا ہے ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا، پس تمہارے پروردگار نے چاہا دونوں لڑکے اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ محفوظ پا کر نکال لیں یہ ان لڑکوں کے حال پر پروردگار کی ایک مہربانی تھی جو اس طرح ظہور میں آئی یاد رکھو میں نے جو کچھ کیا اپنے اختیار سے نہیں کیا (اللہ کے حکم سے کیا) یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے۔"

قرآن عزیز نے اس واقعہ کو شروع میں خضر کے اس "علم" کے متعلق کہا ہے وعلمناه من لدنا علما (اور ہم نے اس کو اپنے پاس سے علم عطا کیا) اور قصہ کے آخر میں خضر کا یہ قول نقل کیا

وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ اَمْرِیْ (میں نے اس سلسلہ واقعات کو اپنی جانب سے نہیں کیا) تو ان دونوں جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خضر علیہ السلام کو بعض اشیاء کے حقائق کا وہ علم عطا فرمایا تھا جو تکوینی رموز واسرار اور باطنی حقائق سے متعلق ہے اور یہ ایک ایسا مظاہرہ تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے اہل حق پر یہ واضح کر دیا کہ اگر عالم ہست و بود کے تمام حقائق سے اسی طرح پردہ اٹھا دیا جائے جس طرح بعض حقائق کو خضر علیہ السلام کیلئے بے نقاب کر دیا گیا تھا تو عالم کے تمام احکام ہی بدل جائیں اور عمل کی آزمائشوں کا یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جائے مگر دنیا اعمال کی آزمائش گاہ ہے اسلئے تکوینی حقائق پر پردہ پڑا رہنا ضروری ہے تاکہ حق و باطل کی پہچان کیلئے جو تراز و قدرت الٰہی نے مقرر کر دیا ہے وہ برابر اپنا کام انجام دیتا رہے۔

سورۂ کہف کی ان آیات کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ اولوالعزم پیغمبر اور جلیل المرتبت رسول تھے اور تشریعہ علم واحکام کی تبلیغ ان کا منصب تھا اس لئے وہ ان تکوینی اسرار کے مظاہرے کو برداشت نہ کر سکے اور باوجود وعدۂ صبر کے تشریعی منکرات کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور حضرت خضر علیہ السلام کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مخاطب بناتے رہے اور آخر کار جدائی کی نوبت آگئی۔

بخاری کی مسطورۂ بالا حدیث میں سوۂ کہف کے ذکر کردہ واقعات سے چند باتیں زیادہ ہیں جو اصل کی تمہید یا مزید تشریح کے طور پر بیان ہوئی ہیں اور اس حدیث ہی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس عبد صالح کو خضر علیہ السلام کہتے ہیں۔

اس مقام پر چند باتیں قابل بحث ہیں

۱ خضر نام ہے یا لقب

۲ خضر فقط عبد صالح (ولی) ہیں یا نبی یا رسول؟

۳ ان کو حیات ابدی حاصل ہے یا وفات پا چکے؟

مفسرین کے یہاں تینوں سوالات کے جوابات میں بہت سے اقوال منقول ہیں چنانچہ پہلے سوال کے جواب میں بعض کہتے ہیں کہ خضر نام ہے اور اکثر کا قول ہے کہ یہ لقب ہے۔ اور پھر نام کے متعلق بھی مختلف اقوال ہیں مثلاً (۱) بلیا بن ملکان (۲) ایلیا بن ملکان (۳) خضرون، معمر، الیاس، الیسع وغیرہ۔

دوسرے سوال کے جواب میں بعض کا قول ہے کہ وہ فقط عبد صالح تھے اور بعض کہتے ہیں کہ رسول تھے، مگر جمہور کا قول یہ ہے کہ نہ وہ رسول تھے اور نہ فقط عبد صالح بلکہ نبی تھے۔

اور تیسرے سوال کے جواب میں بعض علماء کا خیال ہے کہ ان کو حیات ابدی حاصل ہے اور وہ اب تک زندہ ہیں اور اس سلسلہ میں کچھ حکایات وروایات بھی بیان کرتے ہیں۔ اور جلیل القدر محققین فرماتے ہیں کہ ان کیلئے حیات ابدی کا ثبوت قرآن سے ثابت ہے۔ اور نہ احادیث سے لہٰذا وہ بھی انسانی دنیا کی طرح اپنی طبعی موت سے وفات پا چکے۔

قول فیصل

ان ہر سہ مسائل میں قول فیصل یہ ہے کہ پہلی بات کے متعلق قرآن عزیز میں کوئی تذکرہ نہیں ہے نہ حضرت خضر کا نام مذکور ہے اور نہ لقب بلکہ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا کہہ کر ان کا واقعہ نقل کیا ہے البتہ بخاری ومسلم کی صحیح

احادیث میں خضر کہہ کر ان کا ذکر کیا گیا ہے پس اگر تاریخی روایات سے ہم ان کے نام اور لقب کا پتہ لگا سکتے تو آسانی یہ کہہ سکتے کہ فلاں نام ہے اور فلاں لقب مگر اس بارہ میں تاریخی اقوال اس درجہ مضطرب ہیں کہ ان سے کسی نتیجہ پر پہنچنا ناممکن ہے لہٰذا ہمارے سامنے ان کی شخصیت کا تعارف صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ ان کو خضر کہا جاتا ہے اور یہ کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاصر ہیں اس سے زیادہ ان کے نام یا لقب یا نسب کی تمام بحثیں بے دلیل محض تخمینی اقوال کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اور دوسری بات کے متعلق راجح قول یہ ہے کہ وہ نبی تھے اس لئے کہ قرآن عزیز نے جس انداز میں ان کے شرف کا ذکر کیا ہے وہ مقام نبوت ہی پر صادق آتا ہے اور مقام ولایت اس سے بہت فروتر ہے مثلاً جب حضرت خضر علیہ السلام نے لڑکے کے قتل کی وجہ بیان کی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا:

رحمۃ من ربك وما فعلته عن امری

یہ میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا تیرے رب کی رحمت کی بدولت ہوا۔

اور ظاہر ہے کہ کسی ولی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ الہام کے ذریعہ کسی شخص کو قتل کر ڈالے اس لئے کہ "الہام" میں مغالطہ کا امکان ہے اور اللہ کے بہت سے مکاشفات میں اسی کثرت سے تضاد پایا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر وہ شرعی حجت تسلیم نہیں کیا گیا۔

لہٰذا امور تکوینیہ میں ایک ایسا تکوینی امر جو ظاہر سطح میں نہایت قبیح اور بہت بڑا جرم ہے صرف وحی الٰہی کے ذریعے ہی انجام پایا جا سکتا تھا اس آیت کے علاوہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے درمیان گفتگو کے واقعے کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی اسکی تائید کرتا ہے کہ وہ نبی تھے تب ہی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر حضرت خضر کی معیت اور ان کے علم تکوینی کے مشاہدے کیلئے اصرار کرتے۔ اور تب ہی حضرت خضر علیہ السلام جرأت کے ساتھ اپنے علم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان موازنہ کرتے نظر آتے ہیں۔

تاہم مجموعہ کمالات نبوت رسالت کے اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام خضر علیہ السلام کے مقام سے بہت بلند ہے کیونکہ وہ خدا کے نبی ہیں اور جلیل القدر رسول بھی، صاحب شریعت بھی ہیں اور صاحب کتاب بھی اور رسولوں میں بھی اولوالعزم رسول ہیں پس حضرت خضر علیہ السلام کا وہ جزئی علم تکوین کے اسرار سے تعلق رکھتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جامع علم تشریعی پر فائق نہیں ہو سکتا۔

اور تیسری بات کے متعلق صحیح رائے محققین ہی کی ہے جو اس امر کے قائل ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کو حیات ابدی حاصل نہیں ہے اور وہ اپنی طبعی عمر کے بعد وفات پا چکے، اس لئے قرآن مجید میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی انسان کو ابدی عطا نہیں فرمائی، اور اس کیلئے اس دنیا میں "موت" ایک امر حق ہے، چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ

اور (اے محمد ﷺ) ہم نے تجھ سے پہلے بھی کسی بشر کو حیاتِ ابدی عطا نہیں کی،

نیز قرآنِ عزیز میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم نے ہر ایک نبی سے یہ عہد و میثاق لیا ہے کہ جب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہو گی تو تم میں سے جو بھی اُس وقت موجود ہو اُس کا فرض ہو گا کہ وہ اُس رسول پر ایمان بھی لائے اور اُس کی مدد بھی کرے، چنانچہ تمام انبیاء و رسل نے اُس کا اقرار کیا اور اُن کے اور خدا کے درمیان شہادت و میثاق محکم و مضبوط ہوا۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتَابٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشَّاهِدِينَ ○ (آل عمران)

اور جب اللہ نے نبیوں سے میثاق و عہد لیا کہ میں نے جو کچھ تم کو کتابیں اور علم دیا ہے پھر آوے تمہارے پاس رسول (محمد ﷺ) کہ سچا بتائے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اُس کی مدد کرو گے، فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟ بولے ہم نے اقرار کیا، فرمایا تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

پس اگر حضرتِ خضر علیہ السلام زندہ ہوتے تو اُن کا فرض تھا کہ وہ علی الاعلان حاضر خدمت ہو کر آپ پر ایمان لاتے اور تمام غزوات میں آپ ﷺ کی اعانت و امداد کرتے، مگر کسی صحیح روایت سے ان باتوں میں سے کسی ایک بات کا بھی ثبوت نہیں ملتا، حالانکہ غزوۂ بدر و حنین وغیرہ میں جبرئیل امین اور ملائکہ کی اعانت و امداد تک کی تصریحات موجود ہیں۔

قرآنِ عزیز کی ان آیات کے علاوہ صحیحین (بخاری و مسلم) کی حسب ذیل روایت بھی اس عقیدہ کی تردید کرتی ہے کہ حضر علیہ السلام اب تک زندہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شب نبی اکرم ﷺ عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ اس رات کو تم نے دیکھا؟ یہ واضح رہے کہ آج جو شخص بھی بقید حیات ہے، ایک صدی گذرتے پر اُن میں سے ایک بھی زمین پر زندہ باقی نہیں رہے گا۔ (بخاری، مسلم، کتاب الفضائل)

اس صحیح حدیث کی پیش گوئی کے مطابق بھی حضرت خضر علیہ السلام کی حیات ابدی کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکلتی، اور نہ اُن کا استثناء کسی روایت سے ثابت ہوتا ہے، حالانکہ یہ روایت صحیحین کے علاوہ مختلف طریقوں سے دوسری کتبِ حدیث میں بھی منقول ہے۔

اسی لئے مشہور محدث حافظ ابنِ قیمؒ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے ایک بھی صحیح روایت ایسی منقول نہیں ہے جس سے حضرتِ خضر علیہ السلام کے زندہ ہونے کا ثبوت ملتا ہو، بلکہ اس کے برعکس آیاتِ قرآنی اور صحیح روایات اُنکی موت کی تائید کرتی ہیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، ابن

کثیرؒ، ابن جوزیؒ، امام بخاریؒ، قاضی ابویعلی حنبلیؒ، ابوطاہر بن الغباری، علی بن موسیٰ الرضا، ابوالفضل مرسی، ابوطاہر بن العبادی، ابوالفضل بن ناصر، قاضی ابوبکر بن العربی، ابوبکر محمد بن الحسن جیسے جلیل القدر محدثین ومفسرین اُن کی موت ہی کے قائل ہیں۔

لہٰذا حیاتِ خضر علیہ السلام کے متعلق جن علماء نے اجماع نقل کیا ہے وہ قطعاً بے سند ہے بلکہ مشہور مفسر ابن حیّان اندلسی نے دعوائے اجماع کے خلاف یہ دعویٰ کیا ہے کہ جمہور کا مسلک یہی ہے کہ خضر علیہ السلام زندہ نہیں ہیں۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے کرائی جن کا نام خضر علیہ السلام تھا ان کو بعض اسرار تکوینیہ کا وہ علم عطا ہوا تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان حضرت خضر سے کہیں زیادہ ہے حضرت خضر علیہ السلام کا تذکرہ جس انداز سے قرآن مجید نے کیا ہے اس سے یہی راجح نظر آتا ہے کہ وہ نبی تھے، تاہم بہتر یہی معلوم ہوتا ہے اس معاملے کو قرآن عزیز نے جس طرح مجمل کررکھا ہے ہم صرف اسی پر یقین رکھیں اور اس سے آگے اپنی تحقیق کو دخل نہ دیں حضرت عباس کا یہی قول ہے اور چونکہ ان کی حیات ابدی کیلئے کوئی شرعی اور تاریخی دلیل موجود نہیں ہے اسلئے بے شبہ وہ بھی اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر واصل الی اللہ ہوئے۔

حضرت کے واقعے کے متعلق اور بھی بہت سی عجیب وغریب روایات تفسیر و تاریخ کی کتابوں میں منقول ہیں، محققین کی نگاہ میں وہ سب موضوع اور بے اصل ہیں، اور اسرائیلیات سے ماخوذ، اس لئے ناقابل اعتماد ہیں۔[1]

"مجمع البحرین" دو دریا کے سنگم کو کہتے ہیں یہاں کون سے دو دریا اور ان کا سنگم مراد ہے؟ اس کے متعلق مفسرین اور باب سیرت سے مختلف اقوال منقول ہیں مگر ان میں کوئی فعل بھی قول فیصل کی حیثیت نہیں رکھتا البتہ جن حضرات نے اس سے بحر روم اور بحر قلزم اور ان دونوں کا سنگم مراد لیا ہے وہ قرین قیاس ہے اور یہ ممکن ہے کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس وقت ان دونوں میں ایسا خط اتصال موجود ہو، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام پر واقعہ پیش آیا ہے اس لئے خروج مصر اور میدان تیہ کے قیام کے دوران ان میں بظاہر انہی ہر دو سمندروں سے یہ واقعہ متعلق ہو سکتا ہے، اور حضرت استاد علامہ سید محمد انور شاہ قدس سرہ فرماتے ہیں کہ یہ مقام وہ ہے جو آج کل عقبہ کے نام سے مشہور ہے۔ (فیض الباری جلد ۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان تمام صبر آزما حالات میں جن کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت میں مصروف اور ایک اولوالعزم پیغمبر کی طرح ہر قسم کی ایذاء رسانی و مخالفت کے باوجود صبر کے ساتھ ان کی اصلاح میں مشغول و منہمک تھے داعی اجل کو لبیک کہنے کا وقت آ پہنچا۔

بخاری مسلم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا واقعہ اس طرح مذکور ہے:۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں

۱: اس علمی بحث کیلئے البدایہ والنہایہ جلد ۱۔ البحر المحیط جلد ۶۔ روح المعانی جلد ۱۵ عینی شرح بخاری جلد ۷۔ فتح الباری جلد ۶۔ اور اصابہ جلد اول قابل مراجعت ہیں۔

کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو موت کا فرشتہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا اجب ربک اپنے پروردگار کی جانب سے پیغام اجل کو قبول فرمایئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے طمانچہ رسید کر دیا جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی، تب اس نے دربار الٰہی میں جا کر شکایت کی کہ تیرا بندہ موت نہیں چاہتا اور یہ کہ اس نے طمانچہ رسید کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی آنکھ پھر درست ہو گئی اور اس کو حکم ملا کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس دوبارہ جاؤ اور کہو کہ اللہ کا یہ ارشاد ہے کہ کسی بیل کی کمر پر تم اپنا ہاتھ رکھ دو جس قدر بال تمھاری مٹھی میں آجائیں گے ہم ہر ایک بال کے عوض تمہاری عمر میں ایک سال کا اضافہ کر دیں گے فرشتہ نے دوبارہ حاضر ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدائے تعالیٰ کا پیغام سنایا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا کہ بار الٰہا !اس کے بعد کیا انجام ہو گا؟ حضرت حق سے جواب ملا کہ آخر کار پھر "موت" ہے تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اگر طویل سے طویل زندگی کا نتیجہ موت ہے تو پھر وہ شے آج ہی کیوں نہ آجائے، اور دعا کی کہ الٰہ العٰلمین اس آخری وقت میں ارضِ مقدس قریب کر دے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں اس جگہ ہوتا تو تم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کا نشان دکھاتا کہ وہ سرخ ٹیلہ (کثیب احمر) کے قریب اس جگہ دفن ہیں۔

ضیاء کہتے ہیں کہ اریحاء میں سرخ ٹیلے کے قریب ایک قبر ہے جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر بتایا جاتا ہے، دوسرے تاریخی اقوال کے مقابلہ میں یہ قول صحیح ہے، اسلئے کہ میدانِ تیہ کے سب سے قریب وادی مقدس کا علاقہ اریحاء کی بستی ہے اور اسی جگہ وہ کثیبِ احمر (سرخ ٹیلہ) واقع ہے جسکا ذکر حدیث میں آیا ہے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۳)

بخاری و مسلم کی اس روایت میں فرشتہ کے ساتھ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا جو معاملہ منقول ہے ابن قتیبہ کے نزدیک وہ مادی حقیقت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے بلکہ تخئیلی و تمثیلی ہے۔ (ایضا)

ہمارے نزدیک اس واقعہ میں انسانی موت وحیات کے مسئلہ کو ایسے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ جس سے اس سلسلہ کی تمام ضروری اور اہم کڑیاں نمایاں ہو سکیں یعنی یہ ظاہر ہو جائے کہ انسان اگر نبوت اور رسالت جیسے عظیم الشان منصب پر بھی فائز ہو تب بھی بر بناءِ بشریت وہ "موت" کو غیر مرغوب شے سمجھتا ہے مگر جب خدا اس پر موت کی حقیقت کو منکشف کر دیتا ہے واضح ہو جائے کہ موت کسی کے نزدیک محبوب شے ہو یا نامرغوب مگر وہ انجام کار ایک نہ مٹنے والا حکم ہے جس سے کسی حالت میں بھی مفر نہیں، اس لئے تمنا یہ نہ ہونی چاہئے کہ زندگی میں اضافہ ہو بلکہ یہ آرزو رہنی چاہئے کہ زندگی کا جو لمحہ بھی میسّر آئے وہ پاکی اور بلندی اخلاق کے ساتھ پورا ہو' تاکہ خدائے تعالیٰ کی آغوش رحمت پا سکے اور "موت" حقیقی اور ابدی زندگی بن جائے۔

تو اب حدیث کے الفاظ کی تعبیر اس طرح کرنی چاہیئے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں جب موت کا فرشتہ حاضر ہوا تو بشری شکل وصورت میں تھا، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اس کی اس حالت میں اسی طرح نہ پہچان سکے جس طرح حضرتِ ابراہیم علیہ السلام اور حضرتِ لوط علیہ السلام عذاب کے فرشتوں کو ابتداءً نہ پہچان سکے، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو یہ ناگوار گذرا کہ ایک اجنبی شخص بغیر اجازت کیوں اُن کے خلوت کدہ میں گھس آیا اور اس کو موت کا پیغام دینے کا کیا حق ہے اور طیش میں آکر مُنہ پر طمانچہ مار دیا، فرشتہ بشکلِ انسان تھا لہٰذا

بشری اثرات نے کام کیا اور آنکھ مجروح ہو گئی، مگر جس طرح عذاب کے فرشتوں نے آہستہ آہستہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کو اپنی اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا، موت کے فرشتہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگاہ نہ کیا اور فوراً غائب ہو گیا اور درگاہِ الٰہی میں جا پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو پھر ملکوتی ہئیت پر واپس کر دیا، اور اس طرح وہ اُس عیب سے بری ہو گیا جو بشری شکل و صورت میں آنکھ مجروح ہو جانے سے پیدا ہو گیا تھا۔

فرشتۂ موت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیالات سے آشنا ہوئے بغیر خود ہی یہ سمجھ لیا کہ حضرت موسیٰ موت کے نام سے خفا ہو گئے اور وہ موت نہیں چاہتے اور دربارِ الٰہی میں جا کر یہ شکایت کر دی کہ تیرا بندہ موت نہیں چاہتا۔ خدائے تعالیٰ نے فرشتہ کی غلط فہمی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالت شان دونوں کے اظہار کیلئے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ دوبارہ جاؤ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جا کر ہمارا پیغام سناؤ، اُدھر فرشتہ پیغام حاصل کر رہا تھا اور ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اجنبی شخص کے غائب ہو جانے پر فوراً یہ محسوس کر لیا کہ درحقیقت یہ معاملہ انسانی معاملات سے جدا دوسرے عالم کا ہے، چنانچہ جب فرشتہ اجل نے دوبارہ حاضر ہو کر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو پیغامِ الٰہی سنایا تو اُن کا لہجہ اور طرزِ گفتگو بالکل دوسرا ہو گیا اور انجام کار وہ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے اور قربت موت کی جو چند گھڑیاں تھیں وہ موت سے قبل اس طرح سامانِ عبرت و موعظت بنیں۔

صحیحین کی حدیث کے مفہوم و مطلب سے متعلق یہ ایسی تعبیر ہے جس سے وہ تمام سوالات واشکالات حل ہو جاتے ہیں جو اس سلسلہ میں علماء کے درمیان زیر بحث آئے ہیں۔

تورات اور کتبِ تاریخ میں ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی عمر ۱۲۰ سال کی ہوئی اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی وفات اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے درمیان تقریباً ڈھائی سو سال کا عرصہ ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱)

تورات میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا ذکر متعدد مقامات پر کیا گیا ہے، اُن میں سے ایک جگہ مذکور ہے۔

> اور موسیٰ موآب کے میدانوں میں سے بنو کے پہاڑوں پر پسگہ کی چوٹی پر جو یریکو کے مقابل ہے چڑھ گیا اور خداوند نے ساری زمین جلعاد سے لے کے دان تک اس کو دکھلائی اور نفتال کا سارا ملک پچھلے سمندر تک اور جنوب کا ملک اور وادی اریکو (اریحا) جو خزانوں کا شہر ہے جس کی بابت میں نے ابراہام اور اضحاق اور یعقوب سے قسم کھا کر کہا تھا کہ اس میں تمہاری نسل کو دوں گا سو میں نے ایسا کیا کہ تو اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے، پھر تو اُس پار وہاں جانے نہ پائے گا، پس خداوند کے بندے موسیٰ علیہ السلام نے خداوند کے کہے کے موافق وہیں موآب کے ملک میں وفات پائی اور اُس میں اُسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغفور کے مقابل دفن کیا، پھر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں، اور موسیٰ علیہ السلام اپنی وفات کے وقت ایک سو بیس برس کا تھا، اور نہ تو اس کی آنکھ دھندلانے پائی اور نہ اس کی طبعی قوت کم ہوئی۔

(استثناء باب ۳۴ آیات ۷-۱)

بنی اسرائیل کا قومی مزاج اور خدا کی جانب سے تذکیر نعمت

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے تفصیلی واقعات کا مطالعہ کرنے سے جو بات سب سے پہلے نگاہ کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے اندر ایک عجیب طرح کا تلون پایا جاتا ہے، اور سرکشی، احسان فراموشی، فساد انگیزی اور بغض و حسد اُن کے قومی مزاج کا مائیہ خمیر معلوم ہوتا ہے، غالباً اُن کے قومی مزاج کا یہ فساد صدیوں کی غلامی کا نتیجہ تھا۔ کیوں کہ تمام عیوب میں غلامی ہی ایک ایسا عیب ہے جو اخلاق کی پستی، دناءت اور بغض و عناد جیسے ناپاک رذائل انسان کے اندر پیدا کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی قوم کو راہِ راست پر لانے یا صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کیلئے انبیاء ورسل کو سخت سے سخت نا مساعد حالات اور دشوار گذار مراحل پیش آئیں گے، چنانچہ پیش آتے رہے اور چونکہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں کہ جنکی پیغمبرانہ مساعی کے ذریعہ بنی اسرائیل نے غلامی سے نجات پائی اور آزادیِ حیات سے بہرہ مند ہونے کا موقع میسّر آیا تو سب سے زیادہ اُنہی کو بنی اسرائیل کے فاسد قومی مزاج سے دوچار ہونا اور اسکی اصلاح کیلئے سخت سے سخت مصائب کو برداشت کرنا پڑا۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی ایسی قوم کی اصلاح اور رشد وہدایت کیلئے نزول قانون (توراۃ) کے علاوہ بڑی کثرت سے آیات اللہ (معجزات و نشانات) کا مظاہرہ کیا گیا، تاکہ اس طرح اُن کے تلون اور آشفتہ مزاجی میں اعتدال پیدا ہو کر قبولِ حق اور استقامتِ حق کی استعداد وصلاحیت پیدا ہو سکے۔

یہی وہ آیات اللہ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ عزیز کے اندر سورۂ بقرہ، اعراف اور ابراہیم میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور بتایا ہے کہ معاصر قوموں میں ہمارے فضل و کرم اور عطا و احسان کا مرکز یہی قوم (بنی اسرائیل) رہی ہے مگر افسوس کہ ان تمام انعام واکرام اور عفوورحمت کی فراوانی کے باوجود ان کی سرکشی اور بغاوت اور تلون رہ رہ کر اُبھرتا، اور دب دب کر نمایاں ہوتا رہا اور آخر کار اُنھوں نے خدا کی "ابدی لعنت و غضب" کی سرمائیہ نازش بناکر، ہمیشہ کے لئے دنیاء و آخرت کی عزت سے محرومی کا داغ لگالیا۔

چنانچہ آیات

يَابَنِيٓ إِسْرَآئِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ

وَإِذْ آتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ

وَإِذْ قُلْتُمْ يَامُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ

وَإِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ

وَإِذْ أَنْجَيْنَاكُمْ

وَإِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

میں ان ہی واقعات کا تذکرہ ہے اور نگاہِ عبرت ہیں کے لئے سامانِ صد ہزار عبرت و موعظت ہے۔

البتہ بنی اسرائیل کی قومی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اور جس کی زبردست تائید خود تورات سے بھی ہوتی ہے اُس کو سامنے رکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ایسی قوم کو کس لئے ان نعمتوں اور فضیلتوں کے لئے منتخب کر لیا تھا، اور عالم الغیب والشہادہ نے کیوں نہ شروع ہی سے ایسی ضدی قوم کو نظر انداز کر دیا، اور کیوں نہ ان فضائل و انعامات کا رُخ کسی دوسری قوم کی جانب مبذول فرمایا، سو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ اُس زمانہ کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیں اور علم الاجتماع (Sociology) اور علم الاقوام والامم (ANTHOR POLOGY) کے اصول پر مطالعہ فرمائیں تو آپ دیکھیں گے کہ جب سے تاریخ انسانی کائنات میں وجود ہوا ہے اس وقت سے یہ بات صاف اور واضح ہے کہ اقوامِ عالم کے تمدن و معاشرت اور ان کی سیاست و مذہب پر سامی (Semetic) اقوام کا تسلّط اور غلبہ نظر آتا ہے چنانچہ تاریخی حقائق کی تہ تک پہنچنے کے بعد دنیا کی کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی جو سامی اقوام کے ان اثرات سے متاثر نہ ہوئی ہو[1]، تو جس دور کی حالت قرآنِ عزیز بیان کر رہا ہے اُس دور میں اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے دور و نزدیک جو سامی اقوام آباد تھیں تاریخ نے ان کو عمالیقی، قبطی، کنعانی، عناقی، سمیری وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے جن کا تمدن شام، فلسطین، شرقِ اردن، مصر اور عراق میں چمک رہا تھا۔ مگر ان تمام اقوام میں شرک و کفر، بغاوت و سرکشی اور ظلم و طغیان کا جو ہیبت ناک مظاہرہ بپا تھا اس کے سامنے بنی اسرائیل بسا غنیمت نظر آتے تھے اور ان کی استعداد و صلاحیت معاصر اقوام کے مقابلے میں قدرے قابلِ اطمینان تھی۔ قبطی قوم کا حال فرعونِ مصر اور مصریوں کے وقائع میں ابھی آپ مطالعہ کر چکے ہیں اور کنعانی اور عمالیقی قوم کے حالات عنقریب نظر سے گذریں گے اور سمیری قوم کا اندازہ اس کے ایک سردار ''سامری'' کے حالات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

یہ تھے وہ کوائف و حالات جن کی بناء پر رشد و ہدایت کیلئے بنی اسرائیل کو منتخب کیا گیا اور تاریخ اس کا ثبوت بہم پہونچاتی ہے کہ اس قوم کی عام بد بختی کے باوجود اسی کی ایک قلیل جماعت کے ذریعہ خدائی رشد و ہدایت کا پیغام عرصہ دراز تک کائناتِ انسانی تک پہنچتا رہا اور ہزاروں برس کے بعد اسرائیلیوں سے یہ نعمت سلب کر کے بنی اسمٰعیل کے حوالہ کی گئی۔

غرض ''بنی اسرائیل کا یہ انتخاب ان کے تقدس و طہارت کے پیشِ نظر نہ تھا بلکہ ان کو ان سے بھی زیادہ فساد و سرکشی پھیلانے والی طاقتوں کی سرکوبی کا ذریعہ بنانا تھا۔ لہٰذا ان کو احکامِ الٰہی کا مطیع بنانے اور ان کو راہِ راست پر لانے کیلئے یہ سب کچھ کیا گیا اور اس طرح ان کی نوجوان نسل سے خدا نے اپنی ہی خدمت لی۔

تورات نے بھی ایک جگہ اس حقیقت کو ان بہترین الفاظ کے ساتھ آشکارا کیا ہے:

''سن لے اے اسرائیل! آج تجھے پار اسلئے جانا ہے کہ تو ایسی قوموں پر جو تجھ سے بڑی اور زور آور ہیں اور ایسے بڑے شہروں پر جن کی فصیلیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں قبضہ کرے۔ وہاں عناقیم کی اولاد ہیں جو بڑے بڑے اور قد آور لوگ ہیں۔ تجھے ان کا حال معلوم ہے اور تو نے

[1] یہ تاریخی مسئلہ کافی تفصیل کا محتاج ہے، اس جگہ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔

ان کی بابت یہ کہے سنا ہے کہ بنی عناق کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ پس آج کے دن جان لے کہ خداوند تیرا خدا تیرے آگے آگے بھسم کرنے والی آگ کی طرح پار جا رہا ہے اور ان کو فنا کر دے گا اور وہ ان کو تیرے آگے پست کرے گا۔ ایسا کہ تو ان کو نکال کر جلد ہلاک کر دے گا۔ جیسا خداوند نے تجھ سے کہا ہے اور جب خداوند تیرا خدا ان کو تیرے آگے سے نکال چکے تو تو اپنے دل میں یہ نہ کہنا کہ میری "صداقت" کے سبب سے خداوند مجھے اس ملک پر قبضہ کرنے کو یہاں لایا کیوں کہ فی الواقع ان کی "شرارت" کے سبب سے خداوند ان قوموں کو تیرے آگے سے نکالتا ہے، تو اپنی صداقت یا اپنے دل کی راستی کے سبب سے اس ملک پر قبضہ کرنے کو نہیں جا رہا ہے بلکہ خداوند تیرا خدا ان قوموں کی شرارت کے باعث ان کو تیرے آگے سے خارج کرتا ہے تاکہ یوں وہ اس وعدہ کو جس کی قسم اس نے تیرے باپ دادا ابراہام اور اضحاق اور یعقوب سے کھائی پورا کرے، غرض تو سمجھ لے کہ خداوند تیرا خدا تیری صداقت سے سبب سے یہ اچھا ملک تجھے قبضہ کرنے کیلئے نہیں دے رہا ہے۔ کیوں کہ تو ایک "گردن کش قوم" ہے۔ اس بات کو یاد رکھ اور کبھی نہ بھول کہ تو نے خداوند اپنے خدا کو بیابان میں کس کس طرح غصہ دلایا بلکہ جب سے تم ملک مصر سے نکلے ہو تب سے اس جگہ پہنچنے تک تم برابر خداوند سے "بغاوت" ہی کرتے رہے"۔ (استثناء باب ۹ آیات ۱۔۷)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ثناء و منقبت قرآن میں

قرآنِ عزیز اور احادیث نبوی ﷺ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مناقب و فضائل اور بنی اسرائیل کے واقعات کے سلسلہ میں ان کی جلالت و عظمت کا جس طرح اظہار کیا گیا ہے اس سے یہ نمایاں ہوتا ہے کہ ختم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ اور مجد دانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اولعزم رسول اور پیغمبر ہیں اور انبیاء و رسل میں عظیم المرتبت اور بڑی قدر و منزلت کے مالک!

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیجئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بچپن کی زندگی سے وفات تک کے حالات ایسے عجیب و غریب طریقے سے گذرے ہیں کہ ان کے مطالعہ سے بیساختہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالتِ قدر کا اقرار و اعتراف کرنا اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فرعون، قوم فرعون اور بنی اسرائیل کے ہاتھوں جو تکالیف حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اٹھائیں اور ان کی اصلاحِ حال کیلئے جس قسم کی ایذائیں اور مصیبتیں برداشت کیں ان کی نظیر (باستثناء نبی اکرم ﷺ و حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور) کسی نبی و رسول کی زندگی مبارک میں نہیں ملتی۔

قرآنِ عزیز نے جگہ جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات سے اسی لیئے استشہاد کیا ہے کہ امتوں اور قوموں کی سہل انگاری، حق سے اغماض بلکہ تمرد و سرکشی، مخالفت و عناد، پیغمبر کی توہین و ایذا رسانی اور پیغمبر کا صبر و ضبط اور گمراہ امت و قوم کی اصلاح اور ان کے رشد و ہدایت کیلئے پیہم سعی اور جد و جہد کا اس قدر کثیر مواد موعظت و بصیرت کیلئے کہیں نہیں پایا جاتا۔ جس قدر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے واقعات میں فراہم ہے۔

پس اگرچہ قرآنِ عزیز کی اُن تمام آیات سے حضرتِ موسیٰ کی جلالتِ قدر اور اولوالعزم پیغمبر ہونے کا اظہار ہوتا ہے "جو اُن کے واقعات کو بیان کرتی ہیں" مگر حسبِ ذیل آیات میں خصوصیت کے ساتھ اُن کی ثناء و منقبت کا اعلان کیا گیا ہے اور اُن کے ضمن میں حضرتِ ہارون کا بھی، چنانچہ سورۂ مریم میں ارشاد ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوْسَىٰ إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ○ وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا ○ وَوَهَبْنَا لَهُ مِنْ رَّحْمَتِنَا أَخَاهُ هَارُوْنَ نَبِيًّا ○ (مریم)

اور یاد کر قرآن میں موسیٰ کو بے شبہ وہ تھے مخلص اور تھے رسول، نبی، اور ہم نے ان کو طور داہنی کی جانب سے پکارا اور ان کو قریب کر کے ان سے سرگوشیاں کیں اور ہم نے اپنی رحمت سے ان کے بھائی ہارون کو نبی بنایا۔

اور سورۂ اعراف میں ہے۔

قَالَ يَامُوْسَىٰ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَاتِي وَبِكَلَامِي (اعراف)

(اللہ تعالیٰ نے) کہا اے موسیٰ بے شبہ میں نے تم کو لوگوں پر بزرگی عطا کی اور تم کو چن لیا اپنی رسالت دے کر اور ہم کلامی کا شرف بخش کر۔

بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم نے ارشاد فرمایا، "مجھ کو موسیٰ پر فضیلت نہ دو اسلئے کہ قیامت کے دن لوگوں پر دہشت سے غشی طاری ہو جائے گی تو سب سے پہلا شخص جس کو ہوش آئے گا میں ہوں گا، تو میں یہ دیکھوں گا کہ موسیٰ عرش کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں، اب میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کو مجھ سے پہلے افاقہ ہو گیا یا وہ طور پر بیہوش کیے جانے کے صلہ میں آج کی مدہوشی سے بری کر دیئے گئے۔

ابن کثیر فرماتے ہیں کہ نبی اکرم کا یہ ارشاد "مجھ کو موسیٰ پر فضیلت نہ دو" ازرہِ تواضع اور انکسار ہے ورنہ تو دوسری جگہ آپ کا خود یہ ارشادِ مبارک ہے "انا سیّدُ وُلدِ ا دم ولا فخر" بغیر فخر و مباہات کے کہتا ہوں کہ میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں" اور آپ کا خاتم النّبیّین ہونا خود اس کی روشن دلیل ہے، رہا قیامت کا یہ واقعہ سو یہ ایک جزوئی فضیلت ہے اور منبع فضل و کمال کے مجمع کمالات کی برتری و تفوق پر اس سے اثر نہیں پڑتا، بہر حال اس روایت کی روح حضرتِ موسیٰ کی جلالتِ قدر اور عظمت کا اظہار ہے اور بس۔

اور سورۂ نساء میں ہے:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسَىٰ تَكْلِيْمًا ○

اور کچھ رسول ہیں کہ جن کا ذکر ہم نے تم سے پہلے کر دیا ہے اور کچھ رسول ہیں جن کا ذکر ہم نے تم کو نہیں سنایا اور اسی طرح اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام ہوتا ہے۔

اور سورۂ صافات میں ہے:

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهَارُوْنَ ۝ وَنَجَّيْنَاهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝ وَنَصَرْنَاهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغَالِبِيْنَ ۝ وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِيْنَ ۝ وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْآخِرِيْنَ ۝ سَلَامٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهَارُوْنَ ۝ إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ إِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام پر احسان کیا اور اُن دونوں کو اور ان کی قوم کو بڑی مصیبت سے نجات دی، اور ہم نے ان کی مدد کی کہ وہ (فرعون اور قوم فرعون) پر غالب رہے اور ہم نے ان دونوں کو روشن کتاب دی اور دونوں کو راہِ مستقیم کی ہدایت بخشی اور باقی رکھا ان کے متعلق پچھلے لوگوں میں کہ سلام ہو موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام پر، بے شک ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں نکوکاروں کو، بیشک وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے ہیں۔

اور سورۂ احزاب میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ آذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّأَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ۝

اے ایمان والو! تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہونا جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ایذاء پہنچائی، پس اللہ نے ان کو اس بات سے بری کر دیا، جس کو ان کی زبانیں کہہ رہی تھیں، اور موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نزدیک وجیہہ ہیں۔

نیز بخاری و مسلم میں اسراء اور معراج کی روایات میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم ﷺ کے جو مکالمات منقول ہیں اُن سے ان کی عظمت وشان کا نمایاں اظہار ہوتا ہے۔

بخاری و مسلم میں ایک اور روایت ہے کہ حضرتِ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے کچھ تقسیم فرمایا تو ایک شخص (منافق) کہنے لگا کہ اس تقسیم میں خدا کی خوشنودی کا لحاظ نہیں رکھا گیا، کسی مسلمان نے اس مقولہ کو نبی اکرم ﷺ کے سامنے نقل کر دیا تو آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک غضب وغصہ کی وجہ سے سُرخ ہو گیا اور ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے کہ اُن کو تو اس سے بھی کہیں زیادہ اذیت پہنچائی گئی ہے اور اُنھوں نے ان تمام اذیتوں کے مقابلہ میں صبر و ضبط ہی سے کام لیا۔ یعنی منافق کے اس ایذا رساں قول کے مقابلہ میں بھی اولوالعزم رسولوں کی طرح صبر و ضبط ہی سے کام لیتا ہوں۔

غرض یہ اور اسی قسم کے بے شمار فضائل ہیں جو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے اولوالعزم رسول ہونے پر دلالت

کرتے اور ہمارے لئے ذخیرۂ رشد و ہدایت مہیا کرتے ہیں۔

ایک لطیف تاریخی نکتہ

یہود (بنی اسرائیل) کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہے کہ عرصہ دراز قبل از مسیح (یہود) حجاز میں آکر بس گئے تھے، اور تیما، وادی قریٰ، فدک، خیبر اور مدینہ (یثرب) میں انہوں نے مکان، مذہبی صومعوں، جائدادوں، مذہبی درس گاہوں اور فوجی چھاؤنیوں اور قلعوں کے ذریعہ اپنا مستقل تمدن قائم کرلیا تھا اور بقولِ عرب مئور خین بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع اور بنی حارث بڑے بڑے یہود قبائل نے ان مقامات کو اپنا مستقل موطن بنالیا تھا اور وہ یہیں رہ پڑے تھے۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر دو اہم تاریخی سوال پیدا ہوتے ہیں جو حل طلب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کون سا ناگزیر واقعہ پیش آیا کہ جس کی وجہ سے یہود کو وہ سرزمین چھوڑنی پڑی جس کو فلسطین کہتے ہیں اور جس کے متعلق یہود کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ "ارض مقدس" ہے اور وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں؟ (۲) دوسرے یہ کہ اگر کسی ناگزیر حالت میں ان کو اپنی یہ محبوب سرزمین چھوڑنی ہی پڑی تھی تو پھر وہ کون سا سبب تھا جس نے ان کو مجبور کیا کہ وہ قریب کے سرسبز و شاداب اور پُر کیف علاقوں کو چھوڑ کر ایسے علاقوں میں آکر آباد ہوئے جہاں گھاس پات اور زندگی کے لئے سامانِ خورد و نوش بھی وسعت کے ساتھ مہیا نہیں تھے، حالانکہ مصر اُن کی سرزمین سے قریب تھا، عراق ان کا قدیم دارالہجرۃ اور نزدیک شاداب اور متمدن ساز و سامان کا مرکز تھے۔

پہلے سوال کا جواب تو تاریخ یہ دیتی ہے کہ فلسطین کی محبوب، مقدس اور پیاری سرزمین سے یہود کو ۷۰ء قبل عیسوی طیطس رومی (Titus) کے زمانہ میں جبراً نکلنا پڑا، اس بادشاہ نے فلسطین پر فوج کشی کرکے بلادِ فلسطین کو تہ و بالا کر ڈالا۔ بیت المقدس کو برباد کردیا، اس "ہیکل" کو جس پر یہود کا ناز تھا اور جس کی مضبوطی اور پُر شوکت تعمیر کی وہ مثالیں دیا کرتے تھے اور جس کے ساز و سامان اور مکلّل و مذہب ظروف پر وہ فخر کیا کرتے تھے "ظالم" نے اس کو کھود کر پھینک دیا تھا اور اس کے تمام بیش قیمت ساز و سامان کو لوٹ لیا تھا۔

اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ "یہود" توراۃ میں پڑھ چکے، اور اپنے پیغمبروں کی زبانی سُن چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ ایک زمانہ میں اپنے اس "عہد" کو "بنی اسرائیل" کے بھائیوں "بنی اسمٰعیل" میں پھر تازہ کرے گا، اور اُن کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ یثرب (مدینہ) میں آئے گا اور یہ اُس کا دارالہجرۃ بنے گا، اور اس کی دعوتِ الٰہی کا مرکز قرار پائے گا، اور یہ کہ "بُت پرستوں" کے مقابلہ میں اس کی مجاہدانہ زندگی کامیاب ہوگی، اور ابراہیم علیہ السلام، اسمٰعیل علیہ السلام، اسحٰق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام کے اعلانِ حق کو دوبارہ اُسی کے ہاتھوں سر بلندی نصیب ہوگی اسلئے جب وہ اس "بُت پرست بادشاہ" کے ہاتھوں عاجز و درماندہ ہوئے تو انہوں نے اپنی سر بلندی کی آخری پناہ "حجاز" کی اس سرزمین "یثرب" (مدینہ) ہی کو سمجھا اور اس راہ پر اپنا موطن بنالیا جو اُس نبی کے ظہور کے شہر اور فلسطین کے درمیان تھی اور اس طرح وہ نبیِ منتظر کے انتظار اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کی واپسی کیلئے زندگی بسر کرنے لگے۔

چنانچہ "یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں" صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ اس نبی کا ظہور سلع پہاڑ کے قریب ہوگا،

اور یہ ظاہر ہے کہ "مدینہ" کی آبادی ایسی جگہ واقع ہے، جس کے مشرق میں جبل احد ہے اور مغرب میں جبل سلع اور درمیان میں "وادیٔ مدینہ" ہے۔

اے سمندر پر گذرنے والو اور اس میں بسنے والو! اے جزیرہ اور ان کے باشندو! خداوند کیلئے نیا گیت گاؤ، زمین پر سر تا سر اسی کی ستائش کرو، بیابان اور اس کی بستیاں قیدار کے آباد گاؤں میں اپنی آواز بلند کریں، سلع کے بسنے والے گیت گائیں، پہاڑوں کی چوٹیوں سے للکاریں، وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں، اور جزیروں میں اس کی ثناخوانی کریں، خداوند بہادروں کی مانند نکلے گا، وہ جنگی مرد کی مانند اپنی غیرت دکھائے گا، وہ نعرہ مارے گا، ہاں وہ للکارے گا، وہ اپنے دشمنوں پر غالب آئے گا۔ میں بہت مدت سے چپ رہا، میں خاموش ہو رہا اور ضبط کرتا رہا ...... جو کھودی ہوئی مورتوں پر بھروسہ کرتے اور ڈھائے ہوئے بتوں سے کہتے ہیں، تم ہمارے معبود ہو وہ پیچھے ہٹیں گے اور وہ بہت شرمندہ ہوں گے۔ (یسعیاہ باب ۴۲۔ آیات ۱۰۔۱۷۔ ماخوذ از قصص الانبیاء النجار)

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نبی اکرم (ﷺ) کے ماسوا کوئی نبی اور پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے "بت پرستوں" سے جہاد کیا ہو اور انجام کار ان کو نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا ہو، پھر یہ بنی قیدار کون ہیں؟ سلع کس جگہ واقع ہے؟ جزیروں اور پہاڑوں کا بار بار تذکرہ کیوں ہے؟ یہ تمام باتیں پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یہ ایسی "شریعت" اور ایسے "نبی" کی بشارت کا ذکر ہے جو جزیرۂ عرب میں حجاز کے خطہ سے تعلق رکھتا ہے۔ تو کیا پھر یہی وہ بات نہیں ہے جس کو قرآنِ عزیز نے زندہ تاریخی شہادت کے طور پر یہود کو مخاطب کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا ہے:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ ۝ (سورۃ البقرۃ)

اور جب کہ ان کے پاس اللہ کی جانب سے کتاب (قرآن) آئی جو اس کتاب (توراۃ) کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس ہے اور یہ (یہود) محمد (ﷺ) کے نام سے کافروں کے مقابلہ میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے، پھر جب انکے پاس جانی پہچانی بات (محمد ﷺ) آ پہنچی تو اس کا انکار کرنے لگے، سو اللہ کی لعنت ہو انکار کرنیوالوں پر۔

یعنی جب ان اہل کتاب (یہود) کی یثرب کے بت پرستوں سے جنگ ہوا کرتی تھی اور اہل کتاب کو شکست ہو جاتی تو وہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ خدا نبی منتظر کو جلد بھیج کہ ہم اس کے ساتھ مل کر بت پرستی کا قلع قمع کریں اور تیرے وعدہ کے مطابق حق کو کامیابی حاصل ہو لیکن جب وہ پیغمبر برحق تشریف لے آئے اور مبعوث ہو گئے تو وہ اس حسد میں اس کا انکار کرنے لگے کہ یہ اسمٰعیلی کیوں ہے، اسرائیلی کیوں نہیں؟

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بعض علماءِ یہود اس وسوسہ میں گرفتار تھے کہ اگرچہ اس پیغمبر کی بعثت اور ظہور کا مقام کوہِ سلع کے قریب بتایا گیا ہے مگر اس کا ظہور بنی اسرائیل ہی میں سے ہونا چاہئے، اور اسی لیئے وہ یہاں آکر

بس گئے تھے کہ خدا کا وہ وعدہ ہم ہی میں سے پورا ہو، لیکن انہوں نے یہ فراموش کر دیا تھا کہ اسی توراۃ میں اس نبی منتظر کیلئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ "میں ان کیلئے ان ہی کے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا" ۔ اور یہ نہیں کہا کہ ان ہی (بنی اسرائیل) میں سے برپا کروں گا، لیکن ان کے جمہور علماء اور ان کے پیرو عوام اس حقیقت سے آشنا نہ تھے کہ یہ نعمت اب ان کے بھائیوں بنی اسمٰعیل میں منتقل ہو کر ہم کو مستفیض کرنے والی ہے۔ اسی جانب قرآن نے اشارہ کیا ہے:

يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَآءَهُمْ (بقرہ)

یہ محمد ﷺ کو اسی طرح (سچائی) جانتے ہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کے بیٹا ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔

الحاصل، یہ وجہ تھی کہ صدیوں پہلے بنی اسرائیل جب جبراً وقہراً فلسطین کی سرزمین سے نکالے گئے تو انہوں نے مصر، شام اور عراق کے سرسبز و شاداب اور متمدن ممالک کو چھوڑ کر حجاز کی سرزمین کو ترجیح دی اور یثرب (مدینہ) اور اطراف یثرب میں آ کر بس گئے اور اسی کو اپنا وطن و مسکن بنالیا۔ مگر افسوس کہ اس کے ظہور پر حسد و بغض نے ان کو دولت ایمان سے محروم رکھا۔

جدید تاریخی حقائق کے پیش نظر اس مقام پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ سوال و جواب کی مسطورۂ بالا پوری بحث اسلئے بیکار ہے کہ سرزمین حجاز (مدینہ) میں جو یہود آباد تھے وہ عربی نژاد تھے، یہودی النسل نہیں تھے اس لئے کہ یہود بنی اسرائیل کے خصوصی امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی جا کر بسے ہوں اپنے اسرائیلی ناموں کو نہیں چھوڑتے بخلاف یہود حجاز کے کہ ان کے اجداد کے نام قریظہ نضیر، قینقاع عربی نام ہیں اور اسرائیلی ناموں سے بالکل ممتاز ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس جدید نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ سرزمین میں حجاز آباد ہیں۔ یہود صرف عرب نژاد ہی تھے اور ان میں یہودی النسل قطعاً موجود نہ تھے تو یہ قطعاً غلط اور واقعات تاریخی کے خلاف ہے اس لئے کہ ان قبائل میں بعض وہ قبائل بھی ہیں، جن کا ارض فلسطین سے ہجرت کر کے حجاز آباد ہو جانا تاریخ کے اوراق میں آج تک محفوظ ہے اور اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ قبائل عرب کے ساتھ ساتھ یہودی النسل قبائل بھی یہاں آباد تھے اور ان ہی کی بدولت قبائل عرب میں یہودیت کا بیج بویا گیا تھا تو مسطورۂ بالا سوال پھر پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا جواب تاریخی حیثیت سے وہی دیا جا سکتا ہے جو گذشتہ سطور میں دیا جا چکا ہے۔

بصیرتیں اور عبرتیں

حضرت موسیٰ ؑ، بنی اسرائیل، فرعون اور قوم فرعون کی یہ طویل تاریخی داستان ایک قصہ اور حکایت نہیں ہے بلکہ حق و باطل کے معرکے، ظلم و عدل کی جنگ آزادی و غلامی کی کشمکش، مجبور و پست کی سربلندی اور جابر و سربلند کی پستی و ہلاکت، حق کی کامرانی اور باطل کی ذلت و رسوائی، صبر و ابتلا اور شکر و احسان کے مظاہر غرض ناسپاسی و ناشکری کے بدنتائج کی ایسی پر عظمت اور نتائج سے لبریز حقائق کی ایسی پر مغز داستان جس کی

۱: استثناء باب ۱۸۔ ۱۰۔ آیت ۱۷۔

آغوش میں بے شمار عبرتیں اور ان گنت بصیرتیں پنہاں ہیں اور ہر صاحب ذوق کو اس کے مبلغ علم اور دقت نظر کے مطابق دعوت نظر فکر دیتی ہیں، ان میں سے "مشتے نمونہ از خروارے" یہ چند بصائر خصوصیت کے ساتھ قابل غور اور لائق فکر ہیں۔

اگر انسان کو کوئی مصیبت اور ابتلاء پیش آجائے تو از بس ضروری ہے کہ "صبر ورضا" کے ساتھ اس کو انگیز کرے، اگر ایسا کرے گا تو بلاشبہ اس کو خیر عظیم حاصل ہوگی اور وہ یقیناً فائز المرام اور کامیاب ہوگا، حضرت موسیٰ اور فرعون کی پوری داستان اس کی زندہ شہادت ہے۔

جو شخص اپنے معاملات میں خدا پر بھروسہ اور اعتماد رکھتا اور اسی کو خلوص دل کیساتھ اپنا پشتیبان سمجھتا ہے تو خدائے تعالیٰ ضرور اس کی مشکلات کو آسان کر دیتا اور اس کے مصائب کو نجات اور کامرانی کے ساتھ بدل دیتا ہے حضرت موسیٰ کا قبطی کو قتل کر دینا مصری کا حضرت موسیٰ کو مصریوں کی سازش پر مطلع کرنا اور اس طرح ان کا مدین جانا، وحی الٰہی سے مشرف ہونا اور رسالت کے جلیل القدر منصب سے سرفراز ہونا اس کی روشن شہادتیں ہیں۔

جس کا معاملہ حق کے ساتھ عشق تک پہنچ جاتا ہے اسلئے باطل کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہیچ اور بے وجود ہو کر رہ جاتی ہے، غور کیجئے! حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان مادی طاقت کے پیش نظر کیا نسبت ہے ایک بیچارہ و مجبور اور دوسرا باصد ہزار قہرمانی کبر و غرور سے معمور، مگر جب فرعون نے برسر دربار حضرت موسیٰ کو کہا انی لا ظنك یموسی مسحورا (اے موسیٰ! بالیقیں میں تجھے جادو مارا سمجھتا ہوں) تو حضرت موسیٰ نے بھی بے دھڑک جواب دیا لقد علمت ما انزل هو لا ء الا رب السموت و لا رض بصائر و انی لا ظنك فرعون مثبورا ("تو بلا شبہ جانتا ہے کہ ان (آیات) کو آسمان اور زمینوں کے پروردگار نے صرف بصیرتیں بنا کر نازل کیا ہے اور اے فرعون! میں تجھ کو بلاشبہ ہلاک شدہ سمجھتا ہوں یعنی خدائے تعالیٰ کے ان کھلے نشانوں کے باوجود نافرمانی کا انجام ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔")

۴ اگر کوئی خدا کا بندہ حق کی نصرت و حمایت کے لئے سرفروشانہ کھڑا ہو جاتا ہے تو خدا دشمنوں اور باطل پرستوں ہی میں سے اس کے معین و مددگار پیدا کر دیتا ہے تمہارے سامنے حضرت موسیٰ ہی کی مثال موجود ہے کہ جب فرعون اور اس کے سرداروں نے ان کے قتل کا فیصلہ کر لیا تو ان ہی میں سے ایک مرد حق پیدا ہو گیا جس نے حضرت موسیٰ کی جانب سے پوری مدافعت کی اسی طرح قبطی کے قتل کے بعد جب ان کے قتل کا فیصلہ کیا گیا تو ایک باخدا قبطی نے حضرت موسیٰ کو اس کی اطلاع کی اور ان کو مصر سے نکل جانے کا نیک مشورہ دیا جو آئندہ چل کر حضرت موسیٰ کا عظیم الشان کامرانیوں کا باعث بنا۔

۵ اگر ایکبار بھی کوئی لذت ایمانی سے لطف اندوز ہو جائے اور صدق دلی کے ساتھ اس کو قبول کر لے تو یہ نشہ اس کو ایسا مست بنا دیتا ہے کہ اس کے ہر ریشۂ جان سے وہی صدائے حق نکلنے لگتی ہے، کیا یہ اعجاز نہیں ہے

کہ جو ساحر چند منٹ پہلے فرعون کی زبردست طاقت سے مرعوب اور اس کے حکم کی تعمیل کو حرزِ جان بنائے ہوئے تھے، اور جو اپنے کرشموں کی کامیابی پر انعام واکرام کا معاملہ طے کر رہے تھے وہی چند منٹ کے بعد جب حضرتِ موسیٰ کے دست مبارک پر دولت ایمان کے نشہ سے سرشار ہوگئے تو فرعون کی سخت سے سخت دھمکیوں اور اور جابرانہ عذاب و عقاب کو ایک کھیل سے زیادہ نہ سمجھتے ہوئے بے باکانہ انداز میں یہ کہتے نظر آتے ہیں:

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝

انہوں نے کہا ہم کبھی یہ نہیں کر سکتے کہ جو روشن دلیلیں ہمارے سامنے آ گئی ہیں اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اس سے منہ موڑ کر تیرا حکم مان لیں، تو جو فیصلہ کر چکا ہے اس کو کر گذر، تو زیادہ سے زیادہ جو کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ دنیا کی اس زندگی کا فیصلہ کر دے۔

صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے خواہ اس پھل کے حاصل ہونے میں کتنی ہی تلخیاں برداشت کرنی پڑیں، مگر جب بھی وہ پھل لگے گا میٹھا ہی ہوگا، بنی اسرائیل مصر میں کتنے عرصہ تک بیچارگی، غلامی اور پریشان حالی میں بسر کرتے اور نرینہ اولاد کے قتل اور لڑکیوں کی باندیاں بننے کی ذلت ورسوائی کو برداشت کرتے رہے مگر آخر وہ وقت آ ہی گیا جبکہ انکو صبر کا میٹھا پھل حاصل ہوا اور فرعون کی تباہی اور ان کی باعزت رستگاری نے ان کے لئے ہر قسم کی کامرانیوں کی راہیں کھول دیں:

(اور بنی اسرائیل پر تیرے رب کا کلمہ نیک پورا ہو کر رہا بسبب اس بات کے کہ انہوں نے صبر سے کام لیا)۔

غلامی اور محکومانہ زندگی کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہمت و عزم کی روح پست ہو کر رہ جاتی ہے اور انسان اس ناپاک زندگی کے ذلت آمیز امن و سکون کو نعمت سمجھنے اور حقیر راحتوں کو سب سے بڑی عظمت تصور کرنے لگتا ہے اور جد و جہد کی زندگی سے پریشان و حیران نظر آتا ہے، اس کی زندہ شہادت بھی ان بنی اسرائیل کی زندگی کا وہ نقشہ ہے جس میں حضرت موسیٰ کے آیات و بینات دکھانے، عزم و ہمت کی تلقین کرنے اور خدا کے وعدۂ کامرانی کو باور کرانے کے باوجود ان میں زندگی اور پامردی کے آثار نظر نہیں آتے اور وہ قدم قدم پر شکووں اور حیرانیوں کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔

ارضِ مقدس میں داخلہ اور وعدۂ نصرت کے باوجود بت پرست دشمنوں کے مقابلہ سے انکار کے وقت جو یہ تاریخی جملے انہوں نے کہے وہ اس حقیقت کیلئے شاہد عدل ہیں،

(اے موسیٰ! تو اور تیرا رب دونوں جا کر ان سے لڑو بلا شبہ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں یعنی تماشہ دیکھتے ہیں)۔

وراثتِ زمین یا وراثت ملک اسی قوم کا حصہ ہے جو بے سروسامانی سے بے خوف ہو کر اور عزم و ہمت کا ثبوت دے کر ہر قسم کی مشکلات اور موانع کا مقابلہ کرتی اور "صبر" اور خدا کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے

میدان جدو جہد میں ثابت قدم رہتی ہے۔

۹ باطل کی طاقت کتنی ہی زبردست اور پراز شوکت و صولت کیوں نہ ہو انجام کار اس کو نامرادی کا منہ دیکھنا پڑے گا اور آخری انجام میں کامرانی و کامیابی کا سہرا ان ہی کے لئے ہے جو نیکوکار اور باہمت ہیں والعاقبۃ للمتقین۔

۱۰ یہ ''عادۃ اللہ'' ہے کہ جابر و ظالم قومیں جن قوموں کو ذلیل اور حقیر سمجھتی ہیں ایک دن آتا ہے کہ وہی ضعیف اور کمزور قومیں خدا کی زمین کی وارث اور حکومت و اقتدار کی مالک ہو جاتی ہیں اور ظالم قوموں کا اقتدار خاک میں مل جاتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی مکمل داستان اس کیلئے روشن ثبوت ہے۔

وَنُرِيْدُ أَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝ (قصص)

اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ ملک میں کمزور کر دیئے گئے ہیں ان پر احسان کریں اور ان کو پیشوا بنائیں اور انہیں ملک کا وارث کریں اور ملک میں ان کو طاقت و قدرت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر کو وہ چیز دکھا دیں جس سے وہ ڈرتے تھے۔

۱۱ طاقت و حکومت اور دولت و ثروت میں سرشار جماعتوں کا ہمیشہ سے یہ شعار رہا ہے کہ سب سے پہلے وہی ''دعوت حق'' کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوتی ہیں مگر قوموں کی تاریخ یہ بھی بتلاتی ہے کہ ہمیشہ حق کے مقابلہ میں ان کو شکست ہوتی رہی ہے اور انجام کار ان کو ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا ہے اس کے لئے نہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تنہا شاہد ہے بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت حق اور مخالف طاقتوں کی مخالفت کا انجام تاریخی شہادت بن کر حقیقت بین انسانوں کے لئے درس عبرت دیتا رہا ہے۔

۱۲ جو ہستی یا جو جماعت دیدہ دانستہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی سرکشی کرے اور خدا کی دی ہوئی نشانیوں کی منکر و نافرمان بنے تو اس کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ ان سے قبول حق کی استعداد فنا کر دیتا ہے کیوں کہ یہ ان کی پیہم سرکشی کا قدرتی ثمرہ ہے سأصرف عن آیاتی الذین یتکبرون فی الارض بغیر الحق (عنقریب میں اپنی نشانیوں سے ان کی نگاہیں پھیر دوں گا جو ناحق خدا کی زمین میں سرکشی کرتے ہیں)۔

اس آیت کا اور اس قسم کی دوسری آیات کا یہی مطلب ہے جو سطور بالا میں ذکر کیا گیا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدائے تعالیٰ کسی کو بے عقلی اور گمراہی پر مجبور کرتا ہے۔

۱۳ یہ بہت بڑی گمراہی ہے کہ انسان کو جب حق کی بدولت کامرانی و کامیابی حاصل ہو جائے تو خدا کے شکر و سپاس اور عبدیت و نیاز کی جگہ مخالفین حق کی طرح غفلت و سرکشی میں مبتلا ہو جائے افسوس کہ بنی اسرائیل کی داستان کا وہ حصہ جو فرعون سے نجات پا کر قلزم عبور کرنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے اسی گمراہی سے

معمور ہے۔

۱۴ دین کے بارہ میں ایک بہت بڑی گمراہی کہ "انسان" صداقت و سچائی کے ساتھ اس پر عمل نہ کرتا ہو بلکہ نفس کی خواہش کے مطابق اس میں حیلہ سازی کر کے اس سے خود کو بچانے کی کوشش کرتا ہو، یہود نے سبت کی تعظیم کی خلاف ورزی میں یہی کیا، وہ سبت شروع ہونے سے پہلے، رات میں سمندر سے کنارے گڑھے کھود لیتے اور صبح کو سبت کے دن مچھلیاں پانی کے بہاؤ سے ان میں آجاتیں اور پھر شام کو ان کو نکال لاتے اور کہتے کہ ہم نے سبت کی کوئی توہین نہیں کی۔ مگر خدا کے عذاب نے ان کو بتادیا کہ دین میں حیلہ بازی کس قدر خوفناک جرم ہے۔

۱۵ کوئی حق کو قبول کرے یا نہ کرے حق کے داعی کا فرض ہے کہ وہ موعظت حق سے باز نہ رہے۔ چنانچہ سبت کی بے حرمتی پر ان ہی میں سے بعض اہل حق نے ان کو سمجھایا تو بعض اہل حق نے یہ کہا کہ یہ ماننے والے نہیں ہیں ان کا سمجھانا بے کار ہے۔ مگر پختہ کار داعیان حق نے جواب دیا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (قیامت میں خدا کے سامنے ہم معذرت تو کر سکیں گے کہ ہم حق تبلیغ برابر ادا کرتے رہے اور ہم کو غیب کا کیا علم، کیا عجب ہے کہ یہ پرہیزگار بن جائیں؟)

۱۶ کسی قوم پر جابر و ظالم حکمراں کا مسلط ہونا اس حکمران کی عنداللہ مقبولیت و سرفرازی کی دلیل نہیں ہے بلکہ وہ خدا کا ایک عذاب ہے جو محکوم قوم کی بدعملیوں کے پاداش عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ مگر محکوم قوم کی ذہنیت پر جابر طاقت کا اس قدر غلبہ چھا جاتا ہے کہ وہ اس کی قہرمانیت کو ظالم حکمراں پر خدا کی رحمت اور اسکے اعمال کا انعام سمجھنے لگتی ہے۔ چنانچہ فرعون اور بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ جس میں حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دلانے کیلئے ان کو ابھارا اور انہوں نے قدم قدم پر حضرت موسیٰ سے اپنی شکایتوں اور مصر میں غلامانہ خوشحال زندگی بسر کرنے کی دوبارہ تمناؤں کا اظہار کیا ہے"۔ اس کیلئے شاہد عدل ہے۔ قرآن عزیز نے اس حقیقت کو اس معجزانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ

اور جب ایسا ہوا کہ تیرے پروردگار نے اعلان کر دیا تھا (اگر بنی اسرائیل بدعملی اور سرکشی سے باز نہ آئے تو) وہ قیامت کے دن تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرے گا جو انہیں ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا رکھیں گے۔

۱۷ جب فرعون اور اس کی قوم کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی تو حضرت موسیٰ نے خدائے تعالیٰ سے دعا کی۔ خدایا! اب ان بدکرداروں کو ان کی سرکشی اور بدعملی کی سزا دے کہ یہ کسی طرح راہ راست پر نہیں آتے۔ مگر جب بھی حضرت موسیٰ کی دعاء کی استجابت کا وقت آتا اور خدا کے عذاب کی علامتیں شروع ہوتیں۔ تب فوراً فرعون اور اس کی قوم حضرت موسیٰ سے کہتی: اگر اس مرتبہ یہ عذاب ہم پر سے دفع ہو گیا تو ہم ضرور تیری بات مان لیں گے اور جب وہ دفع ہو جاتا تو پھر بدستور تمرد اور سرکشی کرنے لگتے۔ اس طرح ایک عرصہ تک ان کو مہلت ملتی رہی اور جب کسی طرح کجروی سے باز نہ آئے تو آخر کار عذاب الٰہی نے اچانک ان کو آلیا اور ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کر دیا۔ اسی طرح

سبت کی بے حرمتی کرنے والوں کو مہلت ملتی رہی۔ مگر جب وہ کسی طرح باز نہ آئے تو خدا کے عذاب نے ان کا خاتمہ کر دیا۔

یہ اور امم ماضیہ کے اسی قسم کے دوسرے واقعات اس امر کی دلیل ہیں کہ جب کوئی قوم یا کوئی جماعت بد کرداری اور سرکشی میں مبتلا ہوتی ہے تو خدا کا قانون یہ ہے کہ ان کو فوراً ہی گرفت میں نہیں لیا جاتا بلکہ بتدریج مہلت ملتی رہتی ہے کہ اب باز آجائے اب سمجھ جائے اور اصلاح حال کر لے، لیکن جب وہ آمادۂ اصلاح نہیں ہوتی اور ان کی سرکشی اور بدعملی ایک خاص حد تک پہنچ جاتی ہے تو پھر خدائی گرفت کا سخت پنجہ ان کو پکڑ لیتا ہے اور وہ سب یار و مددگار فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔

۱۹ کسی ہستی کیلئے بھی "وہ نبی یا رسول ہی کیوں نہ ہو" یہ مناسب نہیں کہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ مجھ سے بڑا عالم کائنات میں کوئی نہیں بلکہ اس کو خدا کے علم کے سپرد کر دینا بہتر ہے کیونکہ وفوق کل ذی علم علیم اس کا ارشاد عالی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جلیل القدر رسول و پیغمبر اور جامع صفات و کمالات نبوت ہوتے کے بعد جب یہ فرمایا کہ میں سب سے بڑا عالم ہوں تو خدا نے ان کو تنبیہ کی اور خضر سے ملاقات کرا کے یہ بتایا کہ ان صفاتِ کمال کے باجود علم الٰہی کے اسرار اس قدر بے غایت و بے نہایت ہیں کہ ان میں سے چند امور کو اس نے ایک بزرگ ہستی پر ظاہر کر دیا تو موسیٰ ان تکوینی اسرار کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

۲۰ پیروانِ ملت اسلامیہ کیلئے "غلامی" بہت بڑی لعنت اور خدا کا بہت بڑا غضب ہے اور اس پر قانع ہو جانا گویا عذابِ الٰہی اور لعنتِ خداوندی پر قناعت کر لینے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوتِ حق دیتے ہوئے پہلا مطالبہ یہ کیا کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر دے تاکہ وہ میرے ساتھ ہو کر آزادانہ توحید الٰہی کے پرستار رہ سکیں اور ان کی مذہبی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی جابرانہ اور کافرانہ اقتدار حائل نہ رہ سکے۔

وَقَالَ مُوْسٰی یٰفِرْعَوْنُ اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ حَقِیْقٌ عَلٰٓی اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ○ (اعراف)

اور موسیٰ نے کہا: اے فرعون! میں جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا ایلچی ہوں، میرے لیئے کسی طرح زیبا نہیں کہ اللہ پر حق اور سچ کے علاوہ کچھ اور کہوں، بلاشبہ میں .... تمہارے لیئے تمہارے پروردگار کے پاس سے دلیل اور اشارہ لایا ہوں۔ پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔

فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ○ (شعراء)

پھر وہ دونوں فرعون کے پاس آئے پس انہوں نے کہا ہم بلاشبہ جہانوں کے پروردگار کے پیغمبر اور ایلچی ہیں یہ پیغام لے کر آئے ہیں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور غلامی سے ان کو چھٹکارا دے۔

سورۂ شعراء کی یہ آیت تو اس مسئلہ کی اہمیت کو اس درجۂ رفیع ظاہر کر رہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبر کی بعثت کی غرض و غایت ہی یہ تھی کہ انبیاء علیہم السلام کے مشہور خانوادہ بنی اسرائیل کو فرعون کے جابرانہ اور کافرانہ اقتدار کی غلامی سے آزاد کرائیں اور نجات دلائیں۔

نیز سورۂ اعراف کی آیات کو اگر غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی یہی حقیقت نمایاں ہے۔ اسلئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں اول اپنی رسالت کا اعلان کرتے ہیں اور پھر خدا کی جانب سے رشد و ہدایت کی دعوت دیتے اور آیاتِ بینات کی جانب مبذول کراتے ہوئے اپنی بعثت کا مآل اور نتیجہ یہی بیان فرماتے ہیں فَاَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ پس بنی اسرائیل کو (اپنی غلامی سے نجات دے کر) میرے ساتھ کر دے۔

پھر یہ بات بھی توجہ کے لائق ہے کہ دعویٰ نبوت و رسالت کے بعد اگرچہ عرصۂ دراز تک موسیٰ علیہ السلام کا قیام مصر میں رہا تاہم بنی اسرائیل پر اس وقت تک قانون ہدایت (تورات) نہیں اترا جب تک ان کو فرعون کی غلامی سے نجات نہیں مل گئی اور وہ ظالمانہ اقتدار کے پنجۂ استبداد سے نجات پا کر ارض مقدس واپس نہیں آ گئے۔

فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ

تمت بحمد اللہ

قصص القرآن

حصہ دوم

قصص قرآنی اور انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات اور اُنکی دعوتِ حق کی مستند تاریخ و تفسیر جس میں حضرت یوشع علیہ السلام سے لیکر حضرت یحیٰ علیہ السلام کے حالات تک نہایت مفصل اور محققانہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

طبع اول

الحمد للّٰہ الذی خلق الانسان و علمہ البیان - ولہدایۃ الثقلین نزّل القرآن تبیان لکل شیئٍ و برھان - والصلوٰۃ والسلام علی سیّدنا عدنان الذی اسمہٗ احمد فی الانجیل والفرقان خاتم النبیین للانسان والجان وعلی آلہ و اصحابہ الکرام السابقین الاولین الی الھدایۃ والایمان والذین اتبعوھم بالخیر والاحسان-

امابعد! جب قصص القرآن جلد اول طبع ہو کر شائع ہوئی اس وقت یہ خیال بھی نہیں تھا کہ یہ کتاب اس درجہ مقبول ہو گی اور اس قدر پسند کی جائے گی جس کا مشاہدہ عام پڑھنے والوں کی قدر افزائی کے علاوہ معزز رسائل اور مؤقر جرائد کے ذریعہ اہل قلم کی آراء اور ان کے تبصروں کی شکل میں ہوا۔ فالحمد للّٰہ علی ذٰلک

یہ جلد حضرت یوشع کے واقعات سے شروع ہو کر حضرت یحییٰ کے حالات طیبہ پر ختم ہوئی ہے واقعات کی ترتیب میں جلد اول ہی کے اسلوب کو برقرار رکھا گیا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل کے سلسلہ ترتیب کے درمیان حضرت ایوب اور حضرت یونس کا بھی ذکر آگیا ہے حالانکہ ان ہر دو پیغمبروں کا سلسلہ نسب حضرت اسرائیل سے وابستہ نہیں ہے کیونکہ دونوں متقدم ہیں اور چونکہ حضرت زکریا و حضرت یحییٰ کا ذکر حضرت عیسیٰ کے ذکر پاک کے لئے توطیہ و تمہید ہے اس لئے حضرت ایوب اور حضرت یونس کا ذکر حضرت زکریا سے قبل آجانا ہی مناسب سمجھا گیا اصحاب ذوق کتاب کے مطالعہ کے وقت جلد اول کی طرح اس جلد میں بھی حسب ذیل خصوصیات پائیں گے:

1) کتاب میں تمام واقعات کی اساس قرآنِ عزیز کو بنایا گیا ہے اور صحیح احادیث اور مستند تاریخی واقعات سے ان کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔
2) کتب عہد قدیم اور قرآن عزیز کے "یقین محکم" کے درمیان جس جگہ تعارض نظر آتا ہے اس کو یا روشن دلائل کے ذریعہ تطبیق دے دی گئی ہے اور یا پھر قرآن عزیز کی صداقت کو واضح براہین کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔
3) اسرائیلی خرافات اور معاندین کے اعتراضات کے خرافات کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کر دیا گیا ہے

۴) تفسیری، حدیثی اور تاریخی مسائل اور ان سے متعلقہ اشکالات پر بحث و تمحیص کے بعد سلف صالحین کے مسلک قدیم کے مطابق ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔
۵) کسی پیغمبر کے حالات قرآن عزیز کی کن کن سورتوں میں بیان ہوئے ہیں ان کو نقشہ کی شکل میں ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔
۶) ان تمام خصوصیات کے ساتھ "نتائج و عبر" "مواعظ و بصائر" کے عنوانات سے واقعات و اخبار کے حقیقی مقصد اور اصل غرض و غایت یعنی "عبرت و بصیرت" کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔

مصنف کو ان خصوصیات کے متعلق کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی اس کا فیصلہ اصحاب ذوق اور اہل نظر کے ہاتھ میں ہے۔ وما توفیقی الا باللّٰہ، وھو حسبی و نعم الوکیل

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی سیوہاروی

شعبان ۱۳۶۱ھ

دیباچہ طبع دوم

الحمد للہ کہ قرآن عزیز کی یہ خدمت مقبول عام و خاص ہوئی پہلے حصہ کی طرح دوسرا حصہ بھی بہت جلد ختم ہو گیا اور تقریباً ڈیڑھ سال سے اس کی ایک جلد بھی دفتر میں برائے فروخت موجود نہیں تھی ارادہ تھا کہ طبع دوم میں کچھ حک و فک کیا جائے اور نقش ثانی کو نقش اول سے زیادہ بہتر اور مکمل کرنے کی سعی کی جائے لیکن وقت کی دوسری اور اہم مصروفیتوں اور تصنیف و تالیف کے دیگر ناگزیر مشاغل نے اس کا موقع نہ دیا اور پہلی جلد کی طرح یہ جلد بھی بعینہ شائع کر دینی پڑی۔ توفیق الٰہی شامل حال رہی تو طبع سوم میں اس کی تلافی کی جائے گی۔

محمد حفظ الرحمٰن

۲ مارچ ۴۷ء

دیباچہ طبع سوم

۴۷ء کے شروع میں قصص القرآن جلد اول کی طرح جلد دوم بھی کئی ہزار کی تعداد میں طبع کرائی گئی تھی اور سمجھ لیا گیا تھا کہ ان دونوں جلدوں کی طباعت سے اب چند سال کے لئے فراغت ہو گئی ہے لیکن قضاء و قدر کے فیصلے ہمارے اندازوں پر مسکرا رہے تھے۔

۸ ستمبر ۴۷ء کی صبح ندوۃ المصنفین کیلئے صبح قیامت ثابت ہوئی چند لمحوں کے اندر ادارے اور اس کے کارکنوں کے نظام حیات کا شیرازہ بکھر کے رہ گیا اور لاکھوں روپے کے ذخیرۂ کتب کے ساتھ اس کتاب کا بھی تمام ذخیرہ ضائع ہو گیا تباہی و بربادی کے اس فیصلہ کے باوجود قدرت کا دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ تلخیوں ناسازگاریوں کی موجودہ فضا میں یہ ادارہ پھر زندگی کے میدان میں قدم رکھے گا چنانچہ جیسے ہی دفتر کا قیام عمل میں آیا اس متبرک کتاب کی اشاعت کا کام شروع کر دیا

گیا۔ پہلے جلد سوم طبع کرائی گئی اور پچھلے مہینے میں جلد چہارم چھپی اب جلد دوم حاضر ہے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۱۲ جنوری ۵۰ء

دیباچہ طبع چہارم

کتاب کے ایڈیشن پر ایڈیشن نکل رہے ہیں لیکن نظر ثانی کی نوبت نہیں آتی، دیکھنا چاہیے کہ طبع پنجم کے وقت بھی نظر ثانی ہو سکے گی اطمینان کی بات یہ ہے کہ کتاب کا یہ حصہ اپنی ترتیب اور مضامین کے لحاظ سے نظر ثانی کا کچھ زیادہ محتاج نہیں ہے اور یوں انسانی جدوجہد کو ہر حیثیت سے مکمل کسی وقت بھی نہیں کہا جا سکتا۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۲۰ رجب المرجب ۷۴ھ مطابق ۱۶ مارچ ۱۹۵۵ء

دیباچہ طبع پنجم عکسی

قصص القرآن حصہ اول کی عکسی طباعت جو ہر اعتبار سے دلکش اور دیدہ زیب ہے، اپریل ۱۹۶۵ء میں وجود میں آئی تھی، اسی وقت سے ارادہ تھا کہ حصہ دوم بھی جلد سے جلد اعلیٰ طباعت کے زیور سے آراستہ ہو کر سامنے آئے لیکن اندازے کے خلاف کتابت کے کام میں تعویق ہوتی گئی، ہمارے نامور اور باکمال خطاط منشی محمد خلیق صاحب ٹونکی آنتوں کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور علالت کا تسلسل کئی سال تک قائم رہا۔ یہ طے کر لیا گیا تھا کہ حصہ دوم کی کتابت بھی حصہ اول ہی کا کاتب کریگا۔ ادھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خلیق صاحب کی جگہ کوئی دوسرا کاتب لے بھی نہیں سکتا تھا، اسلئے انتظار کے سوا چارہ نہ تھا شکر ہے کئی سال کے انتظار کے بعد طباعت کی نوبت آ ہی گئی۔

مصنف مرحوم اپنی رحلت سے قبل کتاب کے دونوں حصوں مکمل نظر ثانی کر چکے تھے اور مرحلہ صرف طباعت کا باقی رہ گیا تھا جیسا کہ معلوم ہے قصص القرآن کا شمار ہمارے ادارے کی اہم ترین اور مقبول ترین تصنیفات میں ہوتا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ کتاب کے شایان شان کتابت وطباعت بھی ہو الحمد اللہ یہ آرزو پوری ہو گئی۔

خیال ہے حصہ سوم اور حصہ چہارم بھی کتابت وطباعت کے اسی معیار کے مطابق شائع ہوں، یہ دونوں حصے پہلے ہی سے نظر ثانی کے کچھ زیادہ محتاج نہیں تھے لیکن مصنف مرحوم دنیا میں ہوتے تو ان حصوں کے بھی نوک پلک اور زیادہ درست کرتے۔

یقین ہے کتاب کے مطالعہ کے وقت قارئین مرحوم کے لیے ایصال ثواب کا خیال رکھیں گے کہ یہ ہم سب پر مرحوم کا حق ہے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۳ شعبان المعظم ۱۳۸۹ھ مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۹ء

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام

- نیابت حضرت موسیٰ علیہ السلام
- حضرت یوشع علیہ السلام کا ذکر قرآن میں
- ارض مقدس میں داخلہ
- حق ناسپاسی
- جزاء عمل

نیابت حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی مبارک کے واقعات میں حضرت ہارون علیہ السلام کے بعد تورات میں حضرت یوشع (یشوع) کا ذکر بہ کثرت آتا ہے۔ ہم نے بھی صفحات گذشتہ میں دو تین جگہ ان کا تذکرہ کیا ہے یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات میں ان کے خادم تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ اور جانشین نبوت بنے کنعان میں جابر اور مشرک قوموں کے حالات معلوم کرنے کے لئے جو وفد گیا تھا اس کے ایک رکن یہ بھی تھے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو ان قوموں سے جنگ کرنے کی دعوت و ترغیب دی اور انھوں نے انکار کیا تب یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے بنی اسرائیل کو جرأت و ہمت دلانے کی کوشش کی اور خدا کا وعدۂ نصرت یاد دلا کر جہاد پر اکسایا اور کہا کہ اگر تم جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ یقیناً فتح تمہاری ہے۔

توراۃ میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں حق تعالیٰ نے ان پر ظاہر کر دیا تھا کہ یوشع میرا خاص بندہ ہے اور بنی اسرائیل کے نوجوان اسی کی سرکردگی میں کنعان اور بیت المقدس کو جابر مشرکین سے پاک کریں گے۔

> "خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ نون کے بیٹے یشوع کو لے کر اس پر اپنا ہاتھ رکھ کیونکہ اس شخص میں "روح" ہے اور اسے الیعزر کاہن اور ساری جماعت کے آگے کھڑا کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے اسے وصیت کر اور اپنے رعب داب سے اسے بہرور کر دے تاکہ بنی اسرائیل کی ساری جماعت اس کی فرمانبرداری کرے[1] اور نون کا بیٹا یشوع (یوشع) دانائی کی روح سے معمور تھا کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ہاتھ اس پر رکھے تھے اور بنی اسرائیل ان کی بات مانتے رہے۔ (استثناء باب ۳۴، آیت ۹)

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان ہی کی قیادت میں چالیس برس کے بعد بنی اسرائیل کی نسل ارض مقدس میں داخل ہوئی اور انھوں نے کنعان، شام شرق اردن سے تمام جابر و ظالم طاقتوں کو پامال کر دیا۔

---

1. گنتی باب ۲۷، آیات ۱۹-۲۰

قرآن عزیز میں یوشع کا نام مذکور نہیں ہے البتہ سورۂ کہف میں دو جگہ حضرت موسیٰ کے ایک نوجوان رفیق سفر کا تذکرہ موجود ہے جبکہ وہ حضرت خضر سے ملاقات کیلئے تشریف لے گئے۔

"وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِفَتٰهُ" "فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰهُ"

ایک صحیح حدیث میں جو حضرت ابی بن کعب سے منقول ہے اس نوجوان رفیق کا نام یوشع بتایا گیا ہے اس طرح گویا ان کا ذکر بھی قرآن عزیز میں موجود ہے اہل کتاب کا ان کے نبی ہونے پر اتفاق ہے اور توراۃ (عہد قدیم) میں یشوع کی کتاب بھی مستقل صحیفہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

حضرت یوشع بنی اسرائیل کے اسباط (اولاد) میں سے حضرت یوسف کے سبط سے تعلق رکھتے ہیں چنانچہ مؤرخین نے ان کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے یوشع بن نون بن فرائیم بن یوسف بن یعقوب بن ابراہیم خدائے تعالیٰ کی کرشمہ سازیوں کا یہ عجب مظاہرہ ہے کہ جس یوسف کی بدولت کنعان کے ستر انسانوں پر مشتمل خاندان عزت و عظمت اور جاہ و جلال کے ساتھ کنعان سے ہجرت کر کے مصر میں آباد ہوا تھا آج اس کے پوتے یوشع کی قیادت میں لاکھوں کی مردم شماری کا یہ خاندان پھر اپنے آباء واجداد کے وطن کنعان میں اسی جاہ و جلال اور سطوت و جبروت کے ساتھ داخل ہو رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس سال گزر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع کو حکم دیا کہ تم بنی اسرائیل کے اس قافلہ کو لے کر موعودہ سرزمین کی طرف بڑھو اور وہاں عمالقہ اور دوسری جابر قوموں سے جنگ کر کے ان کو شکست دو میری مدد تمہارے ساتھ ہے توراۃ میں ہے:

> یشوع سے کہا۔ میرا بندہ موسیٰ مر گیا ہے سو اب تو اٹھ اور ان سب لوگوں کو ساتھ لے کر اس یردن کے پار اس ملک میں جا جسے میں ان کو یعنی بنی اسرائیل کو دیتا ہوں جس جس جگہ تمہارے پاؤں کا تلوا ٹکے اس کو جیسا میں نے موسیٰ کو کہا میں نے تم کو دیا ہے بیابان اور اس لبنان سے لے کر بڑے دریائے فرات تک حتیوں کا سارا ملک اور مغرب کی طرف بڑے سمندر تک تمہاری حد ہو گی، تیری زندگی بھر کوئی شخص تیرے سامنے کھڑا نہ رہ سکے گا جیسا میں موسیٰ کے ساتھ تھا ویسے ہی تیرے ساتھ رہوں گا میں نہ تجھ سے دست بردار ہوں گا اور نہ تجھے چھوڑوں گا۔ (یشوع کی کتاب، باب ۵-۱)

حضرت یوشع نے بنی اسرائیل کو خدا کا پیغام سنایا اور وہ سب دشت سینا سے نکل کر ارض کنعان کے سب سے پہلے شہر اریحا (یریحو) کی جانب بڑھے اور دشمنوں کو للکارا، دشمنوں نے بھی باہر نکل کر سخت مقابلہ کیا اور آخر کار شکست کھا کر وہیں کھیت رہے اور بنی اسرائیل کو زبردست فتح و نصرت نصیب ہوئی اور آہستہ آہستہ اسی

طرح یشوع اور بنی اسرائیل لڑتے لڑتے تمام ارض مقدس پر قابض ہو گئے اور جابر مشرکوں سے اس کو پاک کر کے ایک مرتبہ پھر اپنے آبائی وطن کے مالک کہلائے۔

توراۃ میں ہے کہ جب بنی اسرائیل جنگ کیلئے تیار ہوئے تو خدا کے حکم سے عہد کا صندوق (تابوت سکینہ) ان کے ساتھ تھا۔ اس میں عصاء موسیٰ، پیرہن ہارون، اور من کا مرتبان بھی تھا اور ان کے علاوہ دوسرے تبرکات بھی تھے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا کہ تم من کو محفوظ کر لو تاکہ تمہاری آئندہ نسلیں بھی مشاہدہ کر لیں کہ تم پر خدا کا انعام ہوا تھا۔

ابن اثیر فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی ہی میں ارض مقدس میں جابر طاقتوں سے مقابلہ کے لئے حضرت یوشع کو امیر جیش نامزد کر کے بنی اسرائیل کے اسباط کی تقسیم اور ان کے سپہ سالاروں کی نامزدگیاں کر دی تھیں اس لئے حضرت یوشع کا یہ معاملہ ٹھیک ٹھیک حضرت اسامہ کا سا معاملہ تھا کیوں کہ نبی اکرم کی وفات ہو گئی اور پھر خلافت صدیقی میں یہ ہوا کہ جیش اسامہ کو شام کی مہم پر روانہ کیا گیا اور آخر یہی مہم روم، ایران اور عراق کی فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

اسی طرح حضرت موسیٰ نے ارض مقدس میں جابر طاقتوں کے استیصال کے لئے بحکم الٰہی حضرت یوشع کو امیر جیش بنایا اور جنگ کے ابتدائی مراحل کو خود انجام دیا لیکن جیش کی روانگی سے قبل ہی حضرت موسیٰ کی وفات ہو گئی اور اب حضرت یوشع کو خدائے تعالیٰ نے نبوت سے بھی سرفراز فرما دیا اور ان ہی کے ہاتھوں آخر کار ارض مقدس مشرک اور جبار طاقتوں سے پاک ہوئی اور اریحا کی کامیابی تمام ارض مقدس کی فتح و نصرت کا پیش خیمہ بنی۔

حضرت یوشع نے سب سے پہلے کس شہر کو فتح کیا۔ قرآن عزیز نے اسکا نام نہیں بتایا بلکہ قریہ کہہ کر مبہم چھوڑ دیا ہے اسلئے کہ اس واقعہ کے بیان کرنے سے اسکا جو مقصد ہے۔ قریہ کی تعیین کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حافظ عماد الدین کہتے ہیں کہ راجح قول یہ ہے کہ یہ بیت المقدس (یروشلم) ہے اور اریحا اسلئے صحیح نہیں ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے اس راستہ میں نہیں پڑتا اور نہ خدا نے بنی اسرائیل سے اس کا وعدہ کیا تھا بلکہ بیت المقدس کا وعدہ تھا۔

مگر ہمارے نزدیک ان کا یہ فرمانا تو صحیح ہے کہ قریہ سے مراد بیت المقدس ہے لیکن انھوں نے اس سلسلہ میں جو دلائل پیش فرمائے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، اس لئے کہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اگر بنی اسرائیل بیابان سینا سے براہ راست بیت المقدس کا ہی ارادہ کرتے تب بھی خشکی کی راہ سے ارض کنعان پہلے پڑتی اور اریحا اس کا پہلا شہر تھا نقشہ سامنے رکھیے اور دیکھئے کہ خشکی کی راہ سے جب کوئی اس زمانہ میں بیابان سینا کو عبور کر کے یروشلم جانا چاہے تو اس کو کنعان سے ہی راہ ملے گی۔ نیز بنی اسرائیل سے خدا کا وعدہ یہ تھا کہ وہ ان کو ان کے باپ دادا کی سرزمین میں واپس کرے گا اور یہ ظاہر ہے کہ ان کے باپ دادا کی سرزمین صرف بیت المقدس ہی نہیں ہے بلکہ ارض کنعان بھی ہے جہاں سے ہجرت کر کے حضرت یوسف و یعقوب کے زمانہ میں

بنی اسرائیل مصر میں آکر بسے تھے لہٰذا ابن کثیر کے ہر دو دلائل کمزور بلکہ حقیقت کے خلاف ہیں۔ البتہ قریہ سے مراد بیت المقدس ہونا اس لیے صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے یوشع اور بنی اسرائیل میں اریحاء میں سب سے پہلے عمالقہ کو شکست دی اور اس کے بعد ارض کنعان کو فتح کرتے ہوئے ارض فلسطین جا پہنچے اور بیت المقدس کو بھی فتح کر لیا اور چونکہ یہ مقام ان کی فتوحات کا مرکز اور مقصد وحید تھا اس لیے جب وہ بھی فتح ہو گیا تو اب اللہ تعالیٰ نے اس عظیم الشان کامیابی پر وہ حکم دیا جس کا ذکر قرآن عزیز میں ہے۔

حق ناسپاسی

قرآن عزیز میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کامیاب کیا اور شہر کے اندر ان کا فاتحانہ داخلہ ہونے لگا تو اس نے حکم دیا کہ مغرور اور متکبر انسانوں کی طرح داخل نہ ہونا بلکہ خدا کا شکر ادا کرنے والوں کی طرح درگاہ الٰہی میں خشوع کے ساتھ جھکتے ہوئے اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے داخل ہونا، تاکہ خدا کے شکر گذار بندوں اور مغرور و سرکش انسانوں کے درمیان امتیاز رہے مگر فتح و نصرت کے بعد بنی اسرائیل کی سرشت غالب آئی اور خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مغرور اور متکبر انسانوں کی طرح بستی میں داخل ہوئے وہ اتراتے ہوئے سر کو بلند رکھتے ہوئے اور اکڑتے ہوئے جا رہے تھے اور استغفار و نیاز مندی کی بجائے سوقیانہ الفاظ کہتے ہوئے گویا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے ساتھ ٹھٹول کرتے ہوئے داخل ہو رہے تھے آخر غیرت حق کو جوش آیا اور جزاء اعمال کے قانون الٰہی نے عذاب کی صورت میں ان کو آ پکڑا۔

قرآن عزیز میں اس کو دو جگہ اختصار اور قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اور سورۂ اعراف میں:-

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ (۲:۵۸-۵۹)

اور جب ہم نے کہا! اس بستی میں داخل ہو اور اپنی مرضی کے مطابق جو چاہو کھاؤ اور شہر کے دروازے میں نیاز مندی کے ساتھ جھکتے ہوئے داخل ہونا اور یہ کہتے ہوئے جانا الٰہی ہماری خطاؤں کو معاف فرما ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دیں گے اور عنقریب نکوکاروں کو اور زیادہ دیں گے پس ظالموں نے اس قول کو جو ان سے کہا گیا تھا دوسرے قول میں بدل دیا پس ہم نے ظالموں پر ان کی نافرمانی کی وجہ سے آسمان سے سخت عذاب بھیجا۔

وَإِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْئَاتِكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ (۷:۱۶۱-۱۲۶)

اور پھر ان سے کہا گیا تم اس بستی میں رہو اور جس طرح تمہارا جی چاہے کھاؤ پیو، اور یہ کہتے ہوئے شہر میں جاؤ! اے خدا! ہماری خطاؤں کو محو کر دے اور شہر میں نیاز مندی کے ساتھ جھکتے ہوئے اور سجدہ ریز ہو کر داخل ہو تو ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دیں گے اور عنقریب نکوکاروں کو زیادہ دیں گے پس ظالموں نے اس قول کو جوان کو بتایا گیا تھا دوسرے قول سے بدل ڈالا، پس ہم نے ان پر آسمان سے عذاب نازل کر دیا ان کے ظالم ہونے کی وجہ سے۔

ان آیات میں لفظ آیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ اور بنی اسرائیل نے کیا تبدل قول کر لیا تھا؟ یہ دو سوال ہیں جو تشریح طلب ہیں حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں ای مغفرة استغفروا اور حضرت قتادہ فرماتے ہیں احطط عنا خطايا نا دونوں کا حاصل یہ ہے کہ یہ کہتے ہوئے داخل ہو "خدایا! ہم کو بخش دے اور ہماری خطاؤں کو محو کر دے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۹۸)

گویا اس طویل عبارت کا اسی طرح مختصر (شارٹ) ہے جس طرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا "بسملہ" اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ کا "حوقلہ" اور لا الہ الا اللہ کا "ہلہلہ" مختصر ہے اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل نے حِطَّةٌ کی جگہ حبة في شعرة کہنا شروع کر دیا۔ یعنی یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے ہم کو بالوں میں محفوظ دانوں کی ضرورت ہے گویا اس حکم خداوندی کے ساتھ ٹھٹول کرتے تھے اور سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کی بجائے سرینوں کے بل چل رہے تھے۔ "یز حفون علی استاھھم"

روایت بخاری کی اس عبارت کا عام طور پر یہ مطلب سمجھا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل سرینوں کے بل زمین پر گھسٹ کر چل رہے تھے مگر اس صورت میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ مغرورانہ اور متکبرانہ انداز میں چلنے کا یہ طریقہ تو کہیں بھی مروج و معقول نہیں ہے اور اس طرح تو خود کو مذاق اور مضحکہ بنانا ہے نہ کہ دوسروں کے ساتھ ٹھٹول کرنا۔ لہٰذا احادیث کے اس جملہ کی صحیح تفسیر وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل شہر میں داخل ہوتے وقت سر جھکائے ہوئے چلنے کے بجائے اکڑتے ہوئے، سر بلند کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ یعنی جس طرح ایک مغرور انسان اکڑتے ہوئے اور مٹکتے ہوئے سرینوں کو حرکت دے دے کر ایک عجب انداز سے چلتا ہے اسی طرح بنی اسرائیل بھی سرینوں کو ابھارے ان کے بل پر مٹکتے ہوئے داخل ہو رہے تھے۔

بہر حال خدائے تعالیٰ نے ان آیات میں اپنے سچے اور نیاز مند بندوں اور متکبر انسانوں کے درمیان ایک امتیاز کر دیا ہے کیونکہ اس کے متواضع اور فرمانبردار بندے کسی سے اپنی ذاتی غرض اور ذاتی سربلندی کے لئے نہیں لڑتے بلکہ خدا کے دشمنوں، مفسد اور شریر انسانوں کی شرارت اور ظالم و سرکش قوموں کے ظلم و طغیان کو مٹانے کے لئے صرف اس لئے جنگ کرتے ہیں کہ اس عدل نصفت غلبہ پاتے ہیں اور خدا کا حکم بلند ہوتا ہے اور وہ اس یقین کے ساتھ لڑتے ہیں کہ فتنہ و فساد و قتل سے بھی زیادہ سخت بری چیز ہے لہٰذا

جب ان کو کافروں پر کامیابی نصیب ہوتی ہے تو وہ اپنی مسرت کا اظہار غرور و تمکنت سے نہیں کرتے بلکہ خدائی جناب میں خشوع و خضوع کے ساتھ سجدہ ریز ہو کر کرتے ہیں اور جب مفتوحہ علاقوں میں داخل ہوتے ہیں تو شکر گذار اور متواضع انسان کی طرح داخل ہوتے ہیں چنانچہ نبی اکرم ﷺ جب مکہ معظمہ کو مشرکین سے پاک کر کے جانب اعلیٰ سے داخل ہونے لگے تو تواضع اور فروتنی کی یہ کیفیت تھی کہ ناقہ پر بیٹھے بیٹھے اس قدر جھکے جا رہے تھے کہ ریش مبارک کجاوے کے سرے سے مس کرتی جاتی تھی اور جب حرم میں داخل ہوئے ہیں تو فوراً درگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہوگئے اور آٹھ رکعات نماز شکر ادا کی۔

یہی حال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر جب بیت المقدس فتح ہوا اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ایران تو ان عظیم المرتبت فاتحین کا داخلہ متکبر بادشاہوں کی طرح نہیں تھا بلکہ خدا کے متواضع اور منکسر المزاج فرمانبردار بندوں کی طرح تھا اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ حریم قدس میں اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایوان کسریٰ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خدا کی جناب میں سجدہ ریز ہو کر نماز شکر ادا کی اور اپنی بندگی اور عاجزی کا عملی اعتراف کیا وہ لڑتے تھے تو شیر نیستاں کی طرح شجاعت اور بہادری کے ساتھ دشمن پر بھاری رہتے اور جب کامیاب ہو جاتے تو عجز و نیاز کے ساتھ خدا کا شکر بجالاتے اور مخلوق خدا کیلئے رحیم و کریم ثابت ہوتے۔

غرض بنی اسرائیل نے اپنے کیے کی سزا پائی اور عذاب الٰہی کے سزاوار بنے وہ عذاب کیا تھا؟ قرآن عزیز نے اسکی کوئی تفصیل بیان نہیں کی صرف رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ کہہ کر مبہم چھوڑ دیا ہے اور عبرت و بصیرت کیلئے اسی قدر کافی ہے۔

سورۂ اعراف کے اس جملہ سے فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ پس ان میں سے جنھوں نے ظلم کیا۔اس قول کو بدل دیا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناسپاسی اور نافرمانی کا یہ مذموم فعل بنی اسرائیل کی پوری جماعت سے سرزد نہیں ہوا تھا بلکہ ان میں سے ایک جماعت وہ تھی جو خدا کے حکم کی فرمانبردار رہی اور جس نے تعمیل ارشاد میں حضرت یوشع علیہ السلام کا ساتھ دیا۔

بصیرت و عبرت

۱ حضرت یوشع علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے ان واقعات میں سب سے زیادہ جو بات جاذب توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک انسان کا انسانی اور اخلاقی فرض ہے کہ جب اس کو کسی مصیبت یا امتحان سے نجات ملے اور وہ کامیاب اور جائز المرام ہو کر اپنی مراد کو پہنچے تو غرور و نخوت کے جال میں پھنس کر یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یہ میری ذاتی استعداد و قابلیت کا نتیجہ ہے بلکہ خدائے برتر کا شکر گزار بنے اور اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے سامنے سر نیاز جھکا دے تاکہ رحمت الٰہی اس کو اپنے دامن میں چھپا لے اور دنیا کی طرح آخرت میں بھی وہ بامراد اور شادکام ہو۔

۲ سخت سے سخت ناامیدی کی حالت میں بھی انسان کو خدا سے ناامید نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اگر وہ مظلوم ہے اور ستم رسیدہ تو خدا کا فضل اس کو بھی محروم نہیں چھوڑتا البتہ دقیق اور دوررس حکمتوں اور مصلحتوں کی وجہ

سے تاخیر ضرور ہو جاتی ہے۔

۳۔ جس قوم پر خدا کا فضل واحسان اور انعام واکرام کھلی ہوئی نشانیوں کے ذریعہ ہوتا ہے وہ اگر شکر واطاعت کی بجائے ناسپاسی اور نافرمانی پر اتر آتی ہے تو پھر جلد ہی خدا کی بطش شدید اور سخت گرفت کا شکار بھی ہو جاتی ہے کیونکہ اس کی سرکشی وبغاوت مشاہدہ اور تجربہ کے بعد ہے اور بے شبہ سخت سزا کی مستوجب ہے۔
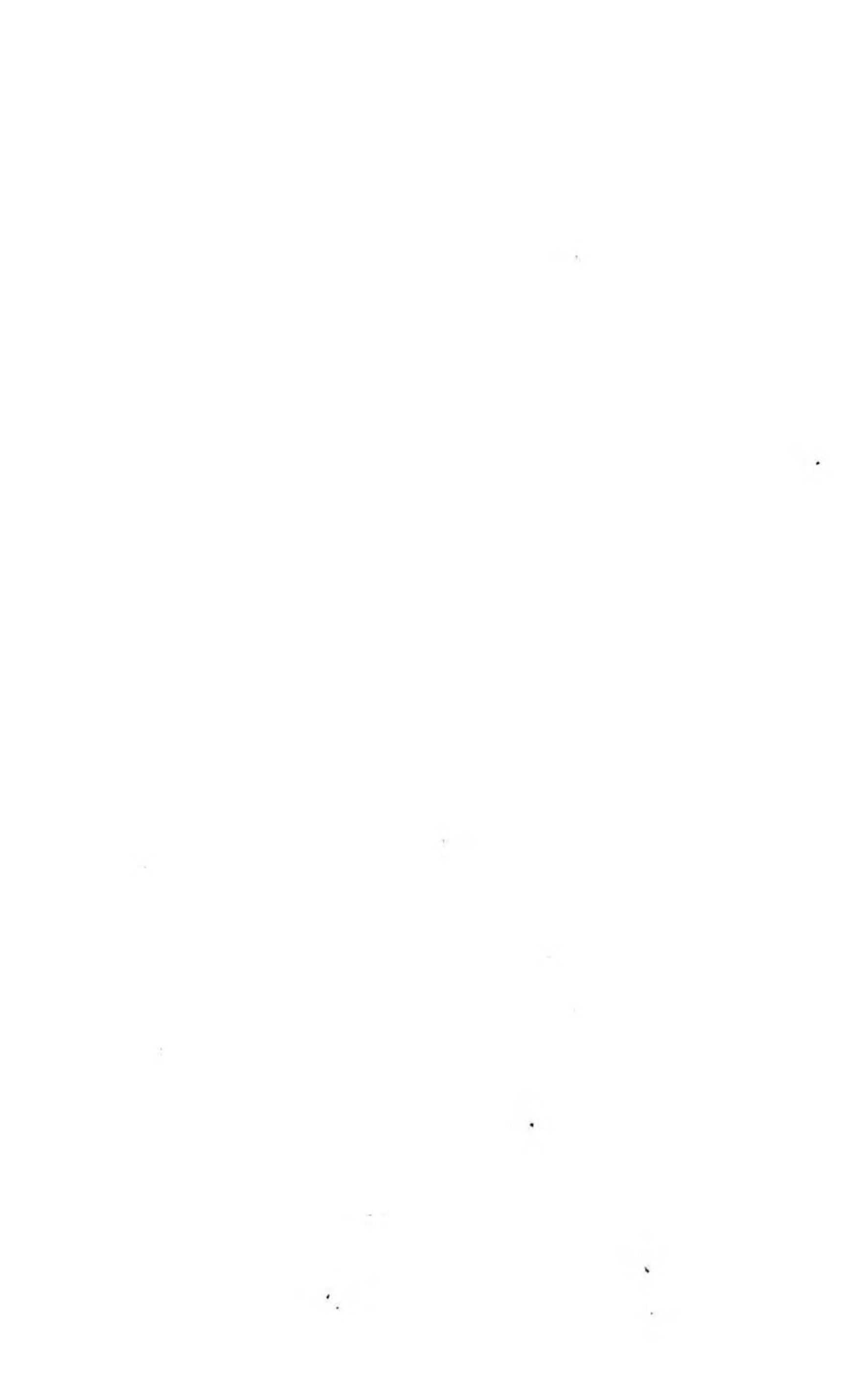
حضرت حزقیل

❀ تمہید ❀ نام ونسب اور بعثت
❀ قرآن عزیز اور حزقیل ❀ فرار از جہاد،
❀ آیت جہاد سے روایت کی تائید ❀ احیاء موتی
❀ بصائر

تمہید

حضرت موسیٰ کے بعد انبیاء بنی اسرائیل کا طویل سلسلہ ہے جو حضرت عیسیٰ تک پہنچتا ہے، صدیوں کے اس دور میں کس قدر انبیاء ورسل مبعوث ہوئے، ان کی صحیح تعداد رب العزت ہی جانتا ہے قرآن عزیز نے ان میں سے چند پیغمبروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض کا ذکر تو تفصیل سے آیا ہے اور بعض کا اجمال کے ساتھ اور بعض کا صرف نام ہی مذکور ہے تورات میں قرآن عزیز کی بیان کردہ فہرست پر چند اور پیغمبروں کا اضافہ ہے اور ان کے واقعات وحالات کا بھی۔

ان اسرائیلی پیغمبروں کے درمیان تاریخی ترتیب اختلافی مسئلہ ہے، ہم ابن جریر، طبری اور ابن کثیر کی ترتیب کو راجح سمجھتے ہیں اور اسلئے اسی کے مطابق ان پیغمبروں کے حالات زیر بحث لائیں گے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے بعد باتفاق تورات و تاریخ حضرت یوشع منصب نبوت پر فائز ہوئے اور ان کے بعد ان کی جانشینی کا حق حضرت موسیٰ کے دوسرے رفیق کالب بن یوحنانے ادا کیا یہ حضرت موسیٰ کی ہمشیرہ مریم بنت عمران کے شوہر تھے مگر نبی نہیں تھے۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲)

طبری کہتے ہیں کہ ان کے بعد سب سے پہلے جس ہستی نے بنی اسرائیل کی روحانی اور دنیوی قیادت و راہنمائی کا فرض انجام دیا وہ حزقیل ہیں۔

نام ونسب اور بعثت

تورات میں ہے کہ وہ بوذی کاہن کے بیٹے ہیں اور ان کا نام حزقی ایل ہے[1] عبرانی زبان میں ایل اسم جلالت ہے اور حزقی کے معنی قدرت اور قوت کے ہیں اس لئے عربی زبان میں اس مرکب نام کا ترجمہ قدرت اللہ ہے کہتے ہیں کہ حضرت حزقیل کے والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور جب ان کی بعثت کا زمانہ قریب آیا تو ان کی والدہ بہت ضعیف اور معمر ہو چکی تھیں اسلئے اسرائیلیوں میں یہ "ابن العجوز"[2] کے لقب سے مشہور تھے۔[3]

۱: حزقی ایل کی کتاب۔ بنی اسرائیل کے یہاں کاہن، متبحر عالم وشیخ کامل کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔
۲: بڑھیا کا بیٹا ۳: تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۳

حضرت حزقیل عرصہ دراز تک بنی اسرائیل میں تبلیغ حق کرتے اور ان میں دین و دنیا کی راہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے۔

قرآن اور حزقیل

قرآن عزیز میں حزقیل نبی کا نام مذکور نہیں ہے لیکن سورۂ بقرہ میں بیان کردہ ایک واقعہ کے متعلق سلف صالحین سے جو روایات منقول ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق حضرت حزقیل کے ساتھ ہی ہے۔

کتب تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض دوسرے صحابہ سے یہ روایت منقول ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک بہت بڑی جماعت سے جب ان کے بادشاہ یا ان کے پیغمبر حزقیل نے یہ کہا کہ فلاں دشمن سے جنگ کرنے کیلئے تیار ہو جاؤ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا فرض ادا کرو تو وہ اپنی جانوں کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور یہ یقین کر کے کہ اب جہاد سے بچ کر موت سے محفوظ ہو گئے ہیں دور ایک وادی میں قیام پذیر ہو گئے۔

اب یا تو پیغمبر نے ان کے اس فرار کو خدا کے حکم کی خلاف ورزی یا قضاء قدر کے فیصلہ سے روگردانی سمجھ کر اظہار ناراضی کرتے ہوئے ان کے لئے بددعاء کی اور یا خود اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ حرکت ناگوار ہوئی بہر حال اس کے غضب نے ان پر موت طاری کر دی اور وہ سب کے سب آغوش موت میں چلے گئے ایک ہفتہ کے بعد ان پر حضرت حزقیل کا گزر ہوا تو انھوں نے ان کی اس حالت پر اظہار افسوس کیا اور دعاء مانگی کہ الہ العلمین ان کو موت کے عذاب سے نجات دے تاکہ ان کی زندگی خود ان کے لئے اور دوسروں کے عبرت و بصیرت بن جائے۔ پیغمبر کی دعاء قبول ہوئی اور وہ زندہ ہو کر نمونۂ عبرت و بصیرت بنے۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۱۳۴ قدیم و روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۱۳۰ و تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۲۸۳)

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ یہ اسرائیلی جماعت داوردان کی باشندہ تھی جو شہر واسط سے چند کوس پر اس زمانہ کی مشہور آبادی تھی اور یہ فرار ہو کر اسی کی وادی میں چلے گئے تھے وہیں ان پر موت کا عذاب نازل ہوا۔

قرآن عزیز میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ○ (۲:۲۴۳)

(اے مخاطب) کیا تونے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے ہزاروں کی تعداد میں نکلے پھر اللہ نے فرمایا کہ مر جاؤ پھر ان کو زندہ کر دیا بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

فرار از جہاد

شریعت محمدیہ ﷺ میں بھی میدان جہاد سے فرار (شرک باللہ کے بعد) سب سے بڑا گناہ شمار ہوتا ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے بعد جبکہ انسان اپنی جان و مال کو اس کے سپرد کر دیتا ہے اور سپردگی ہی کا نام اسلام ہے تو پھر اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ حق نہیں رہتا کہ وہ اس کے حکم کے خلاف جان کو بچانے کی فکر کرے جبن اور نامردی اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہوتی، اور وہ راہ حق میں شجاعت ہی اسلام کا طغرائے امتیاز ہے۔

اسی طرح جب انسان کا اذعان و اعتقاد اس یقین کو حاصل کر لے کہ خیر و شر اور موت و حیات سب خالق کائنات کے قضاء و قدر کے ہاتھ ہے تو پھر آن واحد کے لئے بھی اس کو خیال نہیں آتا کہ وہ خدا کی مقررہ قدر کے متعلق یہ باور کرے کہ اس کا حیلہ خدا کے فیصلہ کو رد کر سکتا ہے اوایک مقام پر اگر اس کی تقدیر نافذ ہے تو دوسرے مقام پر وہ اس کے اثر سے آزاد رہ سکتا ہے۔

اسلام کی نگاہ میں تقدیر کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اپنے اندر یہ یقین پیدا کر لے کہ میرا فرض خدا کے احکام کی تعمیل ہے رہا یہ امر کہ اس اداء تعمیل میں جان کا خوف یا مال کی تباہی کا ڈر ہے تو یہ میرے اپنے اختیار میں نہیں ہے اگر قدرت کا ہاتھ جان و مال کی ہلاکت کا فوری فیصلہ کر چکا ہے تو دوسرے اسباب پیدا ہو کر عالم تکوین کے اس فیصلہ کو ضرور صادق کر دکھائیں گے یہی یقین انسان کو شجاع اور بہادر بناتا اور جبن و نامردی سے دور رکھتا ہے اس کی نظر صرف اداء فرض پر جم جاتی ہے اور وہ تکوینی فیصلوں کو اپنی دسترس سے بالاتر سمجھ کر اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اسلام نے تقدیر کے یہ معنی کبھی نہیں بتائے کہ ہاتھ پیر توڑ کر اور جد و جہد اور عمل کی زندگی کو چھوڑ کر غیبی مدد کے منتظر ہو بیٹھو اور اداء فرض کو یہ کہہ کر ترک کر دو کہ تکوینی فیصلہ کے مطابق جو کچھ ہونا ہوگا ہو رہے گا در اصل یہ خیال جبن اور نامردی کی پیداوار ہے جو اداء فرض سے روکتا اور تن آسانی کی دعوت دے کر ذلت کے حوالہ کر دیا کرتا ہے۔

آیت جہاد سے روایت کی تائید

ان آیات کے متعلق جو روایت نقل کی گئی ہے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان آیات کے بعد ہی دوسری آیت ''آیت جہاد'' ہے جس میں مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کیا گیا ہے وقاتلوا فی سبیل اللہ اور اس کی راہ میں جنگ کرو اور چونکہ فریضہ جہاد سخت جانبازی اور فداکاری کی دعوت دیتا اور موت کے ڈر کو دل سے نکالتا ہے اس لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ پہلے بنی اسرائیل کے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کر دیا جائے جس میں جہاد کے خوف سے بھاگ جانے والوں پر موت کا عذاب مسلط کیا گیا۔ تاکہ وہ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں اور ان کے قلوب میں شجاعت و بہادری کا جذبہ اور بزدلی و نامردی کے خلاف نفرت پیدا ہو۔

احیاء موتی

یہ تمام تصریحات و تفصیلات جمہور کے مسلک کے مطابق کی گئی ہیں۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ احیاء موتی کا یہ معاملہ ان لوگوں کی عبرت کے لئے تھا جو قیامت کے دن حشر اجساد کے منکر ہیں کیونکہ بنی اسرائیل میں بھی مشرکین کا ایک ایسا گروہ تھا جو حشر اجساد کا قائل نہ تھا۔

ہم اگر چہ اس مسئلہ پر گذشتہ صفحات میں بحث کر آئے ہیں لیکن اس مقام پر بھی اس قدر واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب کہ روحانیت (Spiritualism) کے ماہرین کے نزدیک یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ "روح" جسم سے الگ ایک مستقل مخلوق ہے، اور جسم کے گل سڑ جانے اور اس کی عصری ترکیب کے مٹ جانے کے باوجود روح زندہ رہتی ہے، نیز یہ بھی امر معقول ہے کہ جس ہستی نے کسی شے کو ترکیب دیا ہے وہ ترکیب کے بکھر جانے کے بعد دوبارہ اس کو ترکیب دے سکتی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ حیات روح اور بکھرے ہوئے اجزاء کی دوبارہ ترکیب کے معقول ہونے کے بعد احیاء موتی کا انکار کیا جائے جو بعض خاص حالات میں نبی اور رسول کی تصدیق اور تائید کے لئے اسی دنیا میں بصورت معجزہ عالم وجود میں آجاتا ہے۔

اور جن حضرات نے جلد اول میں معجزہ کی بحث کا مطالعہ فرمایا ہے وہ اس شبہ کا جواب بھی پاسکتے ہیں کہ عالم دنیا میں عام قانون کے مطابق اگر چہ دوبارہ زندگی نہیں ملتی اور قیامت ہی کے دن حشر اجساد کا واقعہ پیش آئے گا لیکن خاص قانون کے پیش نظر کسی حکمت و مصلحت کی بناء پر ایسا ہونا عقلاً نہ صرف ممکن ہے بلکہ واقع ہوتا رہا ہے۔

لیکن جمہور کے خلاف مشہور تابعی مفسر ابن جریج کہتے ہیں کہ ان آیات میں کو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک تمثیل ہے جو جہاد سے ڈر کر بھاگنے والوں کی عبرت و بصیرت کے لئے قرآن نے بیان کی ہے کسی واقعہ کا ذکر نہیں ہے جو بنی اسرائیل کی سابق تاریخ میں پیش آیا ہو۔

ہمارے نزدیک جمہور کا قول صحیح ہے اس لئے کہ قرآن عزیز کے نظم کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات سے پہلے زن و شوہر سے متعلق طلاق کے بعض احکام بیان کئے جارہے ہیں اور جہاد کا قطعاً کوئی تذکرہ نہیں ہے البتہ ان آیات کے بعد آیت جہاد مذکور ہے پس اگر یہ آیات جہاد کی ترغیب و ترہیب کے لئے بطور تمثیل پیش کی گئی ہیں تو بلاغت کے اعتبار سے پہلے جہاد کا حکم مذکور ہوتا اور پھر جہاد سے جی چرانے والوں کے لئے بطور تمثیل اس حقیقت کا اظہار کیا جاتا کہ جہاد سے بھاگنے والوں کا حشر خراب ہوتا ہے مگر یہاں اس کے برعکس ہے، یعنی پہلے تمثیل بیان ہوئی ہے پھر آیت جہاد ہے۔

اسلئے صحیح تفسیر یہ ہے کہ جب کلام کا رخ حکم جہاد کی جانب ہوا تو اس سے قبل بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان کیا گیا کہ اگلے وقتوں میں ایک قوم نے جہاد سے روگردانی کر کے خدا کا عذاب مول لیا تھا اور اس کے بعد مخاطبین قرآن کو حکم دیا گیا کہ جہاد کے لئے تیار ہو جاؤ، اس طریق بیان کا نفسیاتی اثر یہ ہوتا ہے کہ اس حکم کی رو

گردانی مشکل ہو جاتی اور وساوس و شبہات اور ہوا جس و خطرات کا جو ہجوم جان طلبی کے اس اہم موقعہ پر دل پر چھا جاتا ہے وہ مردِ سلیم الطبع سے فوراً کافور ہو جاتا ہے اور پھر وہ خود کو حق کی راہ میں جاں سپاری کیلئے ہر طرح آمادہ پاتا ہے۔

حضرت حزقیل اور بنی اسرائیل سے متعلق ان آیات میں جو بصیرتیں نمایاں طور پر ہم کو دعوتِ نظر دیتی ہیں وہ یہ ہیں:

اگر فطرت سلیم اور طبع مستقیم ہو تو انسان کی ہدایت اور بصیرت کیلئے ایک مرتبہ فکر و ذہن کو حقائق کی جانب متوجہ کر دینا کافی ہے پھر اس کی انسانیت خود بخود راہ مستقیم پر گامزن ہو جاتی اور منزلِ مقصود کا پتہ لگا لیتی ہے۔ لیکن اگر خارجی اسباب کی بناء پر فطرت میں کجی اور طبیعت میں زیغ پیدا ہو چکا ہو تو اس کو ہموار کرنے کیلئے اگرچہ بار بار خدا کی پکار اس کو بیدار کرتی ہے مگر ہر مرتبہ کے بعد اس کی صلاحیتیں اور استعدادی قوتیں خفتہ ہو جاتیں بلکہ اور زیادہ غفلت میں سرشار ہو کر رہ جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ قوت و استعداد باطل ہو جاتی ہے اور جب اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے جس کا ذکر قرآنِ عزیز نے اس طرح کیا ہے تو پھر اس پر خدا کا عذاب نازل ہو تا ہے اور وہ ہمیشہ کیلئے اس کے غضب اور اس کی پھٹکار کا نشانہ بن جاتا اور اس اعلان کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی پیہم سرکشی اور خدا کے فرامین کے مقابلہ میں مسلسل بغاوت نے ان کی کج روی کو اس دوسری راہ پر ڈال دیا تھا اور حضرت حزقیل کے دور میں بھی وہ اسی راہِ بد کی تکمیل میں مصروف تھے۔ مگر ان میں ایک چھوٹی سی جماعت پیغمبروں کی رشد و ہدایت کے سامنے ہمیشہ سر جھکاتی رہی اور لغزشوں اور خطاکاریوں کے باوجود اس نے راہِ مستقیم کو گرتے پڑتے حاصل کر ہی لیا۔

جہاد اگرچہ قوم کے بعض افراد کیلئے پیغامِ موت بن کر ان کو دنیوی لذائذ سے محروم کر دیتا ہے لیکن وہ امت اور قوم کیلئے اکسیرِ حیات ہے اور نظامِ قومی و ملی کیلئے بقاء دوام کا کفیل اور ساتھ ہی آغوشِ موت میں جانے والے افراد کیلئے فانی اور ناپائیدار حیات کے عوض حیاتِ سرمدی عطا کرنے والا ہے، یہی موت کا وہ فلسفہ ہے جس نے مسلمانوں کی زندگی کو دوسری قوموں سے اس طرح ممتاز کر دیا تھا کہ خدا کا کلمہ بلند کرتے والا انسان حیاتِ دنیوی سے اگر شاد کام رہا تو غازی اور مجاہد ہے اور اگر موت کا شربت حلق سے اتار لیا تو شہید ہے، اسی لیئے ارشاد ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ (بقرہ)

جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ان کو مردہ نہ کہو بلکہ حقیقی حیات تو ان ہی کو حاصل ہے لیکن تم اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہو۔

اور اسی لئے اس زندگی سے جان چرانے والے کیلئے یہ وعید ہے:

وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ (۸:۱۶ انفال)

اور جو کوئی اس روز (جہاد کے روز) ان (کافروں) کو اپنی پیٹھ دے گا۔ سوائے اس شخص کے جو لڑائی کی جانب واپس آنے والا ہو یا اپنی جماعت میں پناہ تلاش کرنے والا ہو وہ اللہ کے غضب کی طرف لوٹا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

۳ اسلام، شجاعت کو خلقِ حسن قرار دیتا اور بزدلی کو اخلاقِ ردیہ میں شمار کرتا ہے۔ ایک حدیث میں مختلف اعمالِ بد کو شمار کراتے ہوئے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی لغزش اور خطا کی راہ سے ان اعمال کا صدور ممکن ہے۔ لیکن اسلام کے ساتھ جُبن (بزدلی) کسی حال میں بھی جمع نہیں ہو سکتی۔ مگر یاد رہے کسی پر بے جا قوت آزمائی کا نام شجاعت نہیں ہے۔ بلکہ امرِ حق پر قائم ہو جانا اور باطل سے بے خوف بن جانا شجاعت ہے۔

حضرتِ الیاس علیہ السلام

- تمہید
- نام
- نسب
- قرآن اور حضرت الیاس علیہ السلام
- قوم الیاس اور بعل
- تفسیری نکتہ
- موعظت

تمہید

گزشتہ صفحات میں یہ واضح ہو چکا کہ حضرت موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کے بعد قرآنِ عزیز میں ان کے ابتدائی جانشینوں کے نام مذکور نہیں۔ حضرت یوشع علیہ السلام کا دو جگہ ذکر آیا۔ مگر ایک جگہ "فتیٰ" (جوان) یعنی صاحب موسیٰ علیہ السلام کہہ کر تذکرہ کیا اور دوسری جگہ یعنی مائدہ میں حضرت یوشع علیہ السلام اور کالب بن یوفنا کو "رجلان" دو اشخاص کہہ کر تذکرہ کیا ہے اور حضرت حزقیل علیہ السلام کا ذکر جمہور کی روایت کے مطابق صرف قصہ کے ضمن ہی میں آتا ہے ورنہ آیت میں کسی صفت کے ساتھ بھی ان کا تذکرہ موجود نہیں ہے۔ سب سے پہلے جس نبی اور پیغمبر کا ذکر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے بعد قرآنِ عزیز میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ وہ حضرت الیاس علیہ السلام ہیں۔ یہ حضرت حزقیل علیہ السلام کے جانشین اور بنی اسرائیل میں ایلیا کے نام سے مشہور ہیں۔

نام

قرآن عزیز نے ان کا نام الیاس بتایا ہے اور انجیل یوحنا میں ان کو ایلیاء نبی کہا گیا ہے۔ بعض آثار میں ہے کہ الیاس اور ادریس ایک نبی کے دو نام ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اول تو ان آثار کے متعلق محدثین کو کلام ہے اور وہ ان کو ناقابل حجت قرار دیتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ا ص ۲۳۷-۲۳۹)

دوسرے قرآن عزیز کا انداز بیان بھی ان آثار کی تردید کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے انعام اور وَالصّافات میں حضرت الیاس کے جو اوصاف و حالات قلم بند کئے ہیں ان میں کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں ملتا کہ ان کو ادریس بھی کہتے ہیں اور سورۂ انبیاء میں ادریس علیہ السلام کا جس آیت میں تذکرہ ہے اس میں بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا کہ جس سے ان دونوں پیغمبروں کے اوصاف و حالات کی مشابہت پر بھی استدلال کیا جا سکے چہ جائیکہ ان حالات کو صرف ایک ہی شخصیت سے متعلق سمجھ لیا جائے۔

علاوہ ازیں مؤرخین نے حضرت ادریس کا جو نسب نامہ بیان کیا ہے وہ اس نسب نامے سے قطعی جدا ہے جو حضرت الیاس سے متعلق ہے اور اس لحاظ سے دونوں کے درمیان صدیوں کا بعد ہو جاتا ہے پس اگر یہ دونوں نام ایک ہی پیغمبر کے ہوتے تو قرآن عزیز ضرور اس جانب اشارہ کرتا اور مؤرخین ضرور ہر دو نسب ناموں کی وحدت کسی دلیل سے بیان کر سکتے اس لیے صحیح یہ ہے کہ حضرت ادریس حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کے درمیانی دور کے پیغمبر ہیں اور حضرت الیاس اسرائیلی نبی ہیں اور حضرت موسیٰ کے بعد مبعوث ہوئے ہیں چنانچہ طبری کہتے ہیں کہ یہ حضرت الیسع کے چچازاد بھائی تھے اور یہ کہ ان کی بعثت حزقیل نبی کے بعد ہوئی ہے۔

بیشتر مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت الیاس، حضرت ہارون کی نسل سے ہیں اور ان کا نسب نامہ یہ ہے:

"الیاس بن یاسین بن فنحاص بن یعزار بن ہارون یا الیاس بن عازر بن یعزار بن ہارون"

قرآن عزیز میں حضرت الیاس کا ذکر دو جگہ آیا ہے، سورۂ انعام میں اور سورۂ والصافات میں۔ سورۂ انعام میں تو ان کو صرف انبیاء کی فہرست میں شمار کیا ہے اور والصافات میں بعثت اور قوم کی ہدایت سے متعلق حالات کو مختصر طور پر بیان کیا ہے۔

۱: سورۂ انعام: آیت ۸۵، شمارہ ۱

۲: سورۂ والصافات: آیت ۱۳۱، ۱۴۳، شمارہ ۱۰/۹

حضرت الیاس کی بعثت کے متعلق مفسرین اور مؤرخین کا اتفاق ہے کہ وہ شام کے باشندوں کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے اور بعلبک کا مشہور شہر ان کی رسالت و ہدایت کا مرکز تھا۔

حضرت الیاس کی قوم مشہور بت بعل کی پرستار اور توحید سے بیزار شرک میں مبتلاء تھی، خدا کے برگزیدہ پیغمبر نے ان کو سمجھایا اور راہ ہدایت دکھائی صنم پرستی اور کواکب پرستی خلاف وعظ و پند کرتے ہوئے توحید خالص کی جانب دعوت دی۔

یہ مشرق میں آباد سامی اقوام کا مشہور اور سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا یہ بت مذکر تھا اور زحل یا مشتری کا مثنیٰ سمجھا جاتا تھا۔

فنیقی، کنعانی، موآبی اور مدیانی قبائل خاص طور پر اس کی پرستش کرتے تھے اس لئے بعل کی پرستش عہد

قدیم سے چلی آتی تھی اور موآبی اور مدیانی اس کو حضرت موسیٰ کے عہد سے پوجتے چلے آتے تھے چنانچہ شام کا مشہور شہر بعلبک بھی اسی کے نام سے منسوب تھا اور حضرت شعیب کو مدین میں اسی کے پرستاروں سے واسطہ پڑا تھا بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ حجاز کا مشہور بت ہُبل بھی یہی بعل ہے۔

بعل دیوتا کی عظمت کا یہ حال تھا کہ وہ مختلف مربیانہ عطاء ونوال کی وجہ سے مختلف ناموں کے ساتھ موسوم تھا چنانچہ تورات میں سامی قوموں کی پرستش بعل کا ذکر کرتے ہوئے بعل کو بعل بزیث اور بعل فغور کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے اور عقرونیوں کے یہاں بعل زبوب کا اور اضافہ پایا جاتا ہے کلدانیوں کے یہاں بعل باء کے زیر کے ساتھ بولا جاتا ہے اور وہ اکثر بیلوس یا بعل اور بعلوس بھی کہتے ہیں۔

سامی اور عبرانی زبانوں میں بعل کے معنی مالک، سردار، حاکم اور ربّ کے آتے ہیں اسی لئے اہل عرب شوہر کو بھی "بعل" کہتے ہیں لیکن جب بعل پر الف لام لے آتے ہیں یا کسی شئے کی جانب اضافت کر کے بولتے ہیں تو اس وقت فقط دیوتا اور معبود مراد ہو رہتا ہے۔

یہود یا مشرقی اسرائیلیوں کے یہاں بعل کی پرستش کے لئے مختلف موسموں میں عظیم الشان مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں اور اس کے لئے بڑے بڑے ہیکل اور عظیم الشان قربانگاہیں بنائی جاتی تھیں اور کاہن اس کو بخورات کی دھونی دیتے اور اس پر طرح طرح کی خوشبو میں چڑھاتے تھے اور کبھی کبھی اس کو انسانوں کی بھینٹ بھی دی جاتی تھی۔ (دائرۃ المعارف، البستانی جلد ۵)

کتب تفسیر میں منقول ہے کہ بعل سونے کا تھا بیس گز کا قد تھا اور اس کے چار منہ تھے اور اس کی خدمت پر چار سو خادم مقرر تھے۔ (روح المعانی جلد ۲۳، ص ۶۲۷)

حضرت الیاس کے زمانہ میں بھی یمن وشام کا یہ بت ہی محبوب دیوتا تھا اور حضرت الیاس کی قوم دوسرے بتوں کے ساتھ خصوصیت سے اس بت کی پرستش کرتی تھی چنانچہ اسی تقریب سے قرآن عزیز میں اس کا ذکر آیا ہے۔

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَلَا تَتَّقُوْنَ ○ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ○ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ○ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ○ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ○ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ○ سَلَامٌ عَلٰۤى اِلْ يَاسِيْنَ ○ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۳۷:۱۳۲۔۱۲۳)

اور بے شبہ الیاس رسولوں میں سے ہیں اور وہ وقت ذکر کے قابل ہے جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور سب سے بہتر خدا کو چھوڑے ہوئے ہو اللہ ہی تمہارا اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا پروردگار ہے پس انھوں نے الیاس کو جھٹلایا تو بے شبہ وہ لائے جائیں گے پکڑے ہوئے بجز ان کے جو چن لئے گئے ہیں اور ہم نے بعد کے لوگوں میں الیاس کا ذکر باقی رکھا

الیاس پر سلام ہو بے شبہ ہم نکوکاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہے۔

سورۂ انعام میں حضرت الیاس کا جن آیات کے اندر ذکر آیا ہے وہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کی ذریت اور ان کی نسل کے انبیاء ورسل کی ایک مختصر فہرست ہے ارشاد ہے۔

كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهَارُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَإِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِيْنَ ○ وَإِسْمَاعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا (سورۃ انعام پارہ ۷)

ہم نے (ان میں سے) ہر ایک کو ہدایت عطا کی اور نوح کو ہدایت بخشی ان سے پہلے اور ابراہیم کی نسل میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی یہی راہ دکھائی اور ہم اس طرح نیک کرداروں کو نیکی کا بدلہ دیتے ہیں اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی یہ سب صالح انسانوں میں سے تھے اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی ان سب کو ہم نے دنیا والوں پر برتری دی تھی۔

قرآن عزیز نے اس فہرست انبیاء کو تین جدا جدا حلقوں میں بیان کیا ہے اس کی حکمت کیا ہے؟ اکثر مفسرین اس کے انکشاف پر متوجہ ہوئے ہیں ان تمام اقوال میں سب سے بہتر توجیہی قول صاحب المنار کا ہے جس کا حاصل یہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر انبیاء و رُسُل کو تین جدا جدا جماعتوں میں اس لئے بیان فرمایا ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل میں خصوصی امتیازات کے پیش نظر تین قسم کی جماعتیں تھیں، بعض انبیاء وہ تھے جو صاحب تخت و تاج اور صاحب حکومت تھے یا وزارت و سرداری کے مالک تھے اور بعض انبیاء کی زندگی اس کے برعکس زاہدانہ اور راہبانہ تھی اور دولت و ثروت سے یکسر نفور فقیرانہ معیشت کے حامل تھے اور بعض نہ تو اپنی قوم میں حاکم اور صاحب تاج و تخت تھے اور نہ خالص راہبانہ زندگی کے حامل بلکہ ایک طرف قوم کے ہادی و پیغمبر تھے اور دوسری جانب متوسط معیشت سے وابستہ لہٰذا جب قرآن عزیز نے ان انبیاء ورسل کا ذکر کیا تو ان کے زمانہائے بعثت اور بعض دوسری خصوصیات میں مشابہت سے الگ ہو کر اسی نقطہ نظر سے ان کو تین جماعتوں میں تقسیم کر دیا اور پھر ترتیب درجات کے لحاظ سے ترتیب ذکر کو بھی ضروری سمجھا یعنی پہلی فہرست میں اول حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کا ذکر کیا جو نبی و رسول ہونے کے علاوہ صاحب مملکت بھی تھے اور اس کے بعد حضرت ایوب اور یوسف کا تذکرہ کیا جو اگرچہ صاحب مملکت نہ تھے مگر اول الذکر چھوٹی سی ریاست کے مالک تھے ثانی الذکر حکومت مصر کے وزیر دار مختار کل تھے۔ اس کے

بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام وہارون علیہ السلام کا نام آیا جو نہ بڑی حکومت کے مالک اور نہ چھوٹی ریاست یا کسی حکومت کے مالک یا کسی حکومت کے وزیر اور مختار کل بلکہ اپنی قوم کے رسول اور پیغمبر بھی تھے ان کے سردار بھی!

اور دوسری فہرست میں ان انبیاء کرام کا تذکرہ ہے جنھوں نے ساری عمر زہادت میں گذاری انھوں نے نہ رہنے کو مکان بنایا اور نہ کھانے پینے کا سامان فراہم کیا۔ دن بھر تبلیغ حق میں مصروف رہتے اور شب کو یاد الٰہی کے بعد جہاں جگہ میسر آجاتی ہاتھ کا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سو رہتے حضرت یحیٰی، زکریا، عیسیٰ اور الیاس علیہم السلام اس سلسلہ میں بہت مشہور اور ممتاز ہیں۔

اور تیسری فہرست میں ان پیغمبروں کا ذکر ہے جنھوں نے نہ حکومت و سرداری کی اور نہ خالص زہادت اختیار کی بلکہ متوسط زندگی سے وابستہ رہ کر حق تبلیغ و ریاست ادا کیا چنانچہ حضرت اسمٰعیل، الیسع، یونس اور لوط علیہم السلام اسی درمیانی زندگی کے حامل تھے۔

موعظت

حضرت الیاس علیہ السلام اور ان کی قوم کا واقعہ اگرچہ قرآن میں بہت مختصر مذکور ہے تاہم اس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ یہود بنی اسرائیل کی ذہنیت اس درجہ مسخ تھی کہ دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں تھی جس کے کرنے پر یہ حریص نہ ہوں اور کوئی خوبی ایسی نہ تھی جس کے یہ دلدادہ ہوں، اور انبیاء ورسل کے ایک طویل اور پیہم سلسلہ کے باوجود بت پرستی عناصر پرستی کواکب پرستی، غرض غیر اللہ کی پرستش کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کے یہ پرستار نہ بنے ہوں۔

پس قرآن عزیز بنی اسرائیل سے متعلق ان واقعات میں جہاں ان کی بدبختی اور کج روی پر روشنی پڑتی ہے وہیں ہم کو یہ موعظت و عبرت بھی حاصل ہوتی ہے کہ اب جبکہ انبیاء ورسل کا سلسلہ منقطع ہو چکا اور خاتم النبیین کی بعثت اور قرآن عزیز کے آخری پیغام نے اس سلسلہ کو منقطع ہو چکا اور خاتم النبیین کی بعثت اور قرآن عزیز کے آخری پیغام نے اس سلسلہ کو ختم کر دیا ہے تو ہمارے لئے از بس ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کی مسخ فطرت تباہ ذہنیت کے خلاف خدائی احکام کو مضبوطی سے پکڑیں اور ان میں کجروی اور زیغ سے کام لے کر ان کی خلاف ورزی کی جرأت نہ کریں، گویا ہمارا شیوہ سپرد و تسلیم ہو، انکار و انحراف نہ ہو کہ "اسلام" کے یہی اور صرف یہی معنی ہیں۔

حضرت الیسع

نام ۔۔۔ نسب
بعثت ۔۔۔ قرآن اور حضرت الیسع

نام و نسب

وہب بن منبہؒ کی اسرائیلی روایات میں ہے کہ ان کا نام الیسع ہے اور یہ خطوب کے بیٹے ہیں، ابن اسحٰق نے اسی کو اختیار کیا ہے، کتب تواریخ میں یہ بھی منقول ہے کہ حضرت الیسع حضرت الیاس کے چچازاد بھائی ہیں اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں ان کے نسب کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ حضرت یوسف بن یعقوب کی اولاد میں سے ہیں اور نسب نامہ اس طرح ہے:

الیسع بن عدی بن شوتم بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم اور اگر تورات کے یسعیاہ نبی اور حضرت الیسع ایک ہی شخصیت ہیں تورات نے ان کو عموص کا بیٹا بتایا ہے۔

بعثت

حضرت الیسع حضرت الیاس کے نائب اور خلیفہ ہیں اور اوائل عمر میں ان ہی کی رفاقت میں رہتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ نبی اسرائیل کی رہنمائی کے لئے حضرت الیسع کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور انھوں نے حضرت الیاس کے طریقہ پر ہی بنی اسرائیل کی راہنمائی فرمائی یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ حضرت الیسع کی عمر مبارک کیا ہوئی اور بنی اسرائیل میں کتنے عرصہ تک انھوں نے حق تبلیغ ادا کیا۔

قرآن اور حضرت الیسع

قرآن عزیز نے ان کے حالات پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی اور سورۂ انعام اور سورۂ ص میں صرف ذکر پر اکتفا کیا ہے:

وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ (سورہ انعام پ۷ ع۱۳)

اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط اور ان سب کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطا فرمائی۔

وَاذْكُرْ إِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ الْأَخْيَارِ ۝

اور ذکر کرو اسمٰعیل اور الیسع اور ذوالکفل کا اور ان میں سے ہر ایک نیک انسانوں میں سے تھے۔

موعظت

بنی اسرائیل کے ان نبیوں اور پیغمبروں کے واقعات سے جو کہ جلیل القدر انبیاء کے شرف صحبت اور مخلصانہ اتباع میں خلافت کے بعد منصب نبوت سے سرفراز ہوئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحبت نیکاں حصول خیر کے لیئے اکسیر اعظم ہے۔

رومی نے سچ کہا ہے:

یک زمانہ صحبتے با اولیاء بہتر از صد سال طاعت بے ریا

اگر ریاضات و طاعات کا سلسلہ ہزاروں سال بھی رہے مگر کسی کامل کی صحبت سے محرومی ہو تو بے شبہ یہ ایک بہت بڑی خامی ہے جس کا مداوا صحبت کامل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

حضرت شمویل علیہ السلام

- بنی اسرائیل کی گزشتہ تاریخ پر طائرانہ نظر
- نام اور نسب
- قوم میں دعوت و تبلیغ
- قوم کا مطالبہ
- حضرت شمویل علیہ السلام کی تنقید
- بنی اسرائیل کا امیر حکومت
- قرآن عزیز اور بنی اسرائیل
- طالوت و جالوت
- بصائر و حکم

بنی اسرائیل کی گذشتہ تاریخ پر طائرانہ نظر

حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل جب سرزمین فلسطین میں داخل ہو گئے تو انہوں نے خدا کے حکم سے ان کے درمیان اس علاقہ کو تقسیم کر دیا تاکہ وہ امن و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں اور دین حق کیلئے سرگرم عمل رہیں تورات یشوع باب ۲۳ میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ منقول ہے۔

حضرت یوشع علیہ السلام آخر عمر تک ان کی نگرانی اور اصلاح حال میں مصروف رہے اور ان کے معاملات اور باہمی مناقشات کے فیصلوں کے لیے قاضیوں کو مقرر کیا تاکہ وہ آئندہ بھی اسی طرح اپنا نظام قائم رکھیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات سے تقریباً ساڑھے تین سو سال تک یہ نظام یوں ہی قائم رہا کہ خاندانوں اور قبیلوں میں سردار حکومت کرتے اور ان کے مناقشات و معاملات کے فیصلے ''قاضی'' انجام دیتے تھے اور ''نبی'' ان تمام امور کی نگرانی کے ساتھ ساتھ دین کی دعوت و تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت کی خدمت سرانجام دیتے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بفضل ایزدی ان ہی میں سے کسی قاضی کو منصب نبوت عطا ہو جاتا اور اس تمام عرصہ میں بنی اسرائیل کا نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ تمام قوم کا ایک حکمران اور اسی لئے ہمسایہ قومیں اکثر ان پر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں اور بنی اسرائیل ان کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔[1] کبھی عمالقہ چڑھ آتے اور کبھی فلسطینی، کبھی مدیانی حملہ آور ہوتے تو کبھی آرامی اور ان میں سے اگر حملہ آور کو ہزیمت بھی ہو جاتی تو بھی وہ آئے دن چھاپے مارتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا کہ کبھی یہ فتح پا جاتے اور کبھی وہ غالب آجاتے۔

چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں عیلی کاہن کے زمانہ میں اشدود حوالی غزہ کی فلسطینی قوم نے ان پر زبردست حملہ کیا اور شکست دے کر متبرک صندوق تابوت سکینہ بھی چھین کر لے گئے۔ اس متبرک صندوق

---

1. قضاۃ باب ۲ آیات ۷-۶ و قضاۃ باب ۲۱ آیات ۲۵

میں تورات کا اصل نسخہ، حضرت موسیٰ وہارون (علیہما السلام) کے عصاء اور پیر ہن اور من کا مرتبان محفوظ تھے فلسطینیوں نے اس کو اپنے مشہور مندر بیت دجون میں رکھ دیا۔ یہ مندر ان کے سب سے بڑے دیوتا ''دجون'' کے نام سے موسوم تھا۔ دجون کا جسم انسانی چہرہ اور مچھلی کے دھڑ سے مرکب بنایا گیا تھا اور اسی مندر میں نصب تھا۔ نجار مصری کہتے ہیں کہ فلسطین کے شہر رملہ کے قریب آج بھی ایک بستی بیت دجون کے نام سے پائی جاتی ہے غالب گمان یہ ہے کہ تورات میں دجون کے جس مندر کا ذکر ہے وہ یہیں واقع ہوگا اور اسی نسبت سے بستی کا نام بھی بیت دجون رکھا گیا۔ (قصص الانبیاء)

نام ونسب

عیلی کاہن کا زمانہ ختم ہو چکا تھا کہ قضاۃ میں سے ایک قاضی شمویل کو منجانب اللہ منصب نبوت عطا ہوا اور وہ بنی اسرائیل کی رشد وہدایت کے لئے مامور ہوئے۔

بعض آثار میں مذکور ہے کہ جب حضرت الیسع کی وفات ہوگئی تو مصر و فلسطین کے درمیان بحر و روم پر آباد عمالقہ میں سے جالوت نامی جابر و ظالم حکمراں نے بنی اسرائیل کو مغلوب کر کے ان کی آبادیوں پر قبضہ کر لیا اور ان کے بہت سے سرداروں اور قبیلہ کے معزز لوگوں کو گرفتار کر کے ساتھ لے گیا اور باقی کو مقہور و مغلوب کر کے ان پر خراج مقرر کر دیا اور تورات کو بھی فنا کر دیا۔ بنی اسرائیل کیلئے یہ ایسا نازک دور تھا کہ نہ کوئی نبی ورسول ان میں موجود تھا اور نہ سردار وامیر اور خاندان نبوت میں ایک حاملہ عورت کے علاوہ کوئی باقی نہ تھا مگر اس نکبت وادبار کی حالت میں خدائے تعالیٰ نے ان پر فضل و کرم فرمایا اور اس عورت کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا اس کا نام شمویل رکھا گیا اور اس کی تربیت کا بار بنی اسرائیل کے ایک بزرگ نے اپنے ذمہ لیا۔ شمویل نے ان سے تورات حفظ کی اور دینی تعلیم کے مدارج طے کئے اور جب سن رشد کو پہنچے تو تمام بنی اسرائیل میں ممتاز اور نمایاں نظر آنے لگے، آخر اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا اور بنی اسرائیل کی رشد وہدایت پر مامور کیا۔ (روح المعانی جلد ۲ ص ۱۶۲)

مؤرخین کہتے ہیں کہ شمویل حضرت ہارون کی نسل سے ہیں۔[1] اور ان کا نسب نامہ یہ ہے:

شمویل بن حنہ بن عاقر[2]۔ عاقر سے اوپر کی کڑیاں مذکور نہیں ہیں اور مقاتل کی روایت کے مطابق یہ اضافہ ہے شمویل بن بالی بن علقمہ بن یرخام بن یہو بن تہو بن صوف بن علقمہ بن ماحث بن عموص بن عزایا۔

(تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۵)

اشمویل عبرانی ہے اور عربی اس کا ترجمہ اسمٰعیل ہوتا ہے اور کثرت استعمال سے اشمویل، شمویل رہ گیا۔

بہر حال جب شمویل کے زمانہ میں بھی عمالقہ کی دست برد اور ظالمانہ شرارتیں اسی طرح جاری رہیں تو بنی اسرائیل نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہم پر ایک بادشاہ (حاکم) مقرر کر دیں جس کی قیادت میں ہم ظالموں کا مقابلہ کریں اور جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ دشمنوں کی لائی ہوئی مصیبت کا خاتمہ کر دیں۔ تورات میں

۱: خازن جلد ۲

۲: روح المعانی جلد ۲ ص ۱۶۲

بنی اسرائیل کے اس مطالبہ کی کہ ”ہم پر ایک سلطان مقرر کر دیجئے“ وجہ یہ بیان کی ہے:

> اور ایسا ہوا کہ جب سموئیل بوڑھا ہو گیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو مقرر کیا کہ اسرائیل کی عدالت کریں۔ اور اس کے پہلوٹے کا نام یوایل تھا اور اس کے دوسرے بیٹے کا نام ابیاہ۔ وہ دونوں بیر سبع میں قاضی تھے پر اس کے بیٹے اس کی راہ پر نہ چلے بلکہ نفع کی پیروی کرتے اور رشوت لیتے اور عدالت میں طرفداری کرتے تھے تب سارے اسرائیلی بزرگ جمع ہو کے راستہ میں سموئیل کے پاس آئے اور اسے کہا دیکھ تو بوڑھا ہوا اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے، اب کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر جو ہم پر حکومت کیا کرے جیسا کہ سب قوموں میں ہے۔
>
> (سموئیل باب ۸ آیات ۲۳-۶ و باب ۹)

اور آگے چل کر لکھا ہے کہ سموئیل کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور انھوں نے فرمایا کہ اگر تم پر بادشاہ مقرر ہو گیا تو وہ سب کو اپنا خادم اور غلام بنا لے گا۔ لیکن بنی اسرائیل کا اصرار بڑھتا ہی رہا اور آخر سموئیل نے خدا سے دعا مانگ کر بنیامین کی نسل میں سے ساؤل (طالوت) نامی ایک شخص کو بادشاہ مقرر کر دیا جو نہایت وجیہ و شکیل اور قوی ہیکل تھا۔

ثعلبی نے طالوت کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے: ساول بن قیش بن افیل بن صارد بن تحورت بن افیح بن انیس بن بنیامین بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۶)

لیکن قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے اس مطالبہ پر حضرت سموئیل کا جو جواب نقل کیا ہے وہ اس سے جدا اور بنی اسرائیل کی عادات و خصائل کے عین مطابق ہے۔

قرآن عزیز میں ہے کہ جب بنی اسرائیل نے حضرت سموئیل سے بادشاہ کے تقرر کا مطالبہ کیا تو انھوں نے ارشاد فرمایا:

> مجھے یہ خوف ہے کہ ایسا نہ ہو جب تم پر کوئی بادشاہ مقرر کر دیا جائے اور وہ تم کو دشمنوں کے مقابلہ کے لئے جہاد کا حکم دے تو تم بزدل ثابت ہو اور جہاد سے انکار کر جاؤ۔ بنی اسرائیل نے بڑی قوت کے ساتھ جواب دیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جہاد سے انکار کر دیں جبکہ ہم یہ خوب جانتے ہیں کہ ہم کو دشمنوں نے بہت زیادہ ذلیل کر دیا ہے انھوں نے ہم کو ہمارے گھروں سے نکالا اور ہماری اولاد کو قید کیا۔

جب حضرت سموئیل نے اتمام حجت کر لیا تو اب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کیا۔ حق تعالیٰ نے ان کو مطلع فرمایا کہ بنی اسرائیل کی درخواست منظور ہوئی اور ہم نے طالوت کو جو علمی اور جسمانی دونوں لحاظ سے تم میں نمایاں ہے تم پر بادشاہ مقرر کر دیا۔ بنی اسرائیل نے جب یہ سنا تو منہ بنانے لگے اور ناگواری سے کہنے لگے یہ شخص تو غریب ہے مالدار تک نہیں ہے یہ کس طرح ہمارا بادشاہ ہو سکتا ہے اور دراصل بادشاہت کے لائق تو ہم ہیں، ہم میں سے کسی کو مقرر کیجئے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک عرصہ سے نبوت کا سلسلہ سبط لادی میں اور حکومت و سرداری کا

سلسلہ سبط یہود میں چلا آتا تھا تو اب جبکہ سموئیل علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق یہ شرف بنیامین کی نسل میں منتقل ہونے لگا تو بنی اسرائیل کے ان سرداروں کو حسد پیدا ہوا اور وہ اس کو برداشت نہ کر سکے۔

شروع میں کسی بات کے اقرار کر لینے اور وقت پر انکار کر دینے کی یہ ادا بنی اسرائیل کی زندگی کا طغرائے امتیاز بن چکی تھی اس لیے یہاں بھی کارفرما ہی کیونکہ وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ سموئیل علیہ السلام کی نظر انتخاب بہر حال ہم ہی میں سے کسی پر پڑے گی۔ اس لئے جب انھوں نے خلاف توقع بنیامین کے گھرانے میں سے ایک غریب مگر قوی اور عالم انسان کو اس منصب پر مامور دیکھا تو حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور ردوکد شروع کر دی۔

حضرت سموئیل نے بنی اسرائیل کے معترضین اور نکتہ چیں سرداروں کی نکتہ چینی کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

> میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تمہاری پستی اور بزدلی تمہارے وقتی جوش اور ولولہ کو کبھی پائیدار اور مستقل نہیں رہنے دے گی اور وقت آنے پر تمہاری یہ گرم جوشی برف کی طرح سرد ہو کر رہ جائے گی چنانچہ تم نے اب اسی لئے حیلہ جوئی شروع کر دی، تم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حکمرانی کا جو معیار تم نے سمجھ لیا ہے یعنی وسعت مال اور کثرت دولت تو یہ قطعاً غلط اور سر تا سر باطل ہے۔

خدائے تعالیٰ کے نزدیک حکمراں کے ذاتی اوصاف میں قوت علم اور طاقت جسم ضروری ہیں۔ اس لئے کہ یہی ہر دو وصف حسن تدبیر صحت فکر اور جرات و شجاعت کے کفیل ہیں اور ان اوصاف میں طالوت (ساؤل) تم سب میں ممتاز اور نمایاں ہے۔

قرآن عزیز کی آیات ذیل اس تفصیل کی شاہد عدل ہیں:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِيٓ إِسْرَآئِيْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى إِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَآ أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَآئِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ○ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوْآ أَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○ (سورۃ البقرۃ ع ۳۲)

کیا تم کو بنی اسرائیل کی اس جماعت کا حال معلوم نہیں، جس نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد اپنے زمانے کے نبی سے درخواست کی تھی کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے ہمارے لیئے ایک حکمراں مقرر کر دیجئے نبی نے کہا! کچھ بعید نہیں ہے کہ اگر تم کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو تم لڑنے سے انکار کر دو اسرداروں نے کہا ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں جبکہ ہم اپنے گھروں سے جا چکے اور اپنی اولاد سے علیحدہ کئے جا چکے ہیں؟ پھر جب ان کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو تھوڑے سے آدمیوں کے سوا باقی سب نے پیٹھ دکھلا دی، اور اللہ بے انصافوں سے خوب واقف ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ ان کے نبی نے کہا: اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو مقرر کر دیا ہے جب انھوں نے یہ بات سنی تو (طاعت و فرمانبرداری کی بجائے) کہنے لگے وہ ہم پر کیسے حکمراں بن سکتا ہے جبکہ اس سے کہیں زیادہ ہم حکمراں بننے کے حق دار ہیں علاوہ بریں اس کو مال و دولت کی وسعت بھی حاصل نہیں ہے، نبی نے فرمایا (حکمراں کا جو معیار تم نے بنالیا ہے وہ غلط ہے) بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے حکمرانی کی قابلیت واستعداد میں تم پر اس کو برگزیدہ اور فائق کیا ہے اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت دونوں میں اس کو وسعت عطا فرمائی ہے (اور حکمرانی و قیادت تمہارے دینے سے نہیں ملتی بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے اس کا اہل سمجھ کر) اپنی زمین کی حکمرانی بخش دیتا ہے اور وہ (اپنے تصرف وقدرت میں) بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

ان آیات میں جس نبی کا ذکر ہے وہ یہی سموئیل علیہ السلام ہیں۔

تابوت سکینہ

بنی اسرائیل کی اس ردو کد نے یہاں تک طول کھینچا کہ انھوں نے سموئیل علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اگر طالوت کا تقرر منجانب اللہ ہے تو اس کے لئے خدا کا کوئی "نشان" دکھایئے۔ حضرت سموئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر تم کو خدا کے اس فیصلہ کی تصدیق مطلوب ہے تو اتمام حجت کے لئے وہ بھی تم کو عطا کی جارہی ہے اور وہ یہ کہ جو متبرک صندوق (تابوت سکینہ) تمہارے ہاتھوں سے چھن گیا ہے اور جس میں تورات اور حضرت موسیٰ وہارون (علیہما السلام) کے تبرکات محفوظ ہیں وہ طالوت کی بدولت تمہارے پاس واپس آجائے گا اور حکمت الٰہی سے ایسا ہوگا کہ تمہاری دیکھتی آنکھوں فرشتے اسے اٹھا لائیں گے اور وہ دوبارہ تمہارے قبضہ میں آجائے گا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسٰى وَآلُ هَارُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (سورۃ البقرۃ ع ۱۶)

اور ان کے نبی نے ان سے کہا" طالوت کی اہلیت حکومت کی نشانی یہ ہے کہ (جو مقدس) تابوت (تم کھو چکے ہو، اور دشمنوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے) تمہارے پاس واپس آجائے گا اور فرشتے اس کو اٹھا لائیں گے اس تابوت میں تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے لئے (فتح و نصرت) کی طمانیت ہے اور موسیٰ علیہ السلام وہارون علیہ السلام کے گھرانوں (کی مقدس یادگاروں) کا بقیہ ہے بے شبہ اس واقعہ میں تمہارے خدا کا بہت بڑا نشان ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

حضرت سموئیل کی یہ بشارت آخر بر روئے کار آئی اور بنی اسرائیل کے سامنے ملائکۃ اللہ نے تابوت سکینہ طالوت کو پیش کر دیا اور اس طرح ان پر یہ ظاہر ہو گیا کہ اگر وہ حضرت سموئیل کے اس الہامی فیصلہ کو قبول کر لیں تو کامیابی و کامرانی یقینی اور حتمی ہے۔

توراۃ میں تابوت سکینہ کی واپسی کی داستان جس پیرایہ میں بیان کی گئی ہے وہ بہت دل چسپ ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے:-

سفر صموئیل میں ہے کہ جب سے بیت دجون میں تابوت سکینہ لا کر رکھا گیا اس وقت سے فلسطینیوں نے روزانہ یہ منظر دیکھا کہ جب صبح کو وہ اپنے معبود دجون کی عبادت کے لئے جاتے ہیں تو اس کو منہ کے بل اوندھا پڑا پاتے ہیں اور صبح کو جب وہ اس کو دوبارہ اپنی جگہ پر قائم کر دیتے ہیں تو شب گزرنے پر پھر اسی طرح اوندھا گرا ہوا پاتے ہیں پھر ایک نئی بات یہ ہوئی کہ اس شہر میں اتنی کثرت سے چوہے پیدا ہو گئے کہ انھوں نے ان کے تمام حاصلات کو خراب اور تباہ کر دیا۔ اور ایک خاص قسم کی گلٹیوں کی وبا نے وہاں گھر کر لیا۔ جس سے سخت نقصان جان ہونے لگا۔ فلسطینیوں نے جب کسی طرح ان باتوں سے نجات نہ پائی تو غور و فکر کے بعد کہنے لگے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہم پر یہ تمام نحوست اس صندوق کی وجہ سے ہے لہٰذا اس کو یہاں سے نکالو۔

یہ سوچ کر فلسطینیوں نے اپنے کاہنوں اور نجومیوں کو جمع کیا اور ان سے تمام واقعات بیان کر کے علاج کا مطالبہ کیا۔ کاہنوں اور نجومیوں نے کہا کہ اس کا صرف یہی علاج ہے کہ جس طرح ممکن ہو جلد اس تابوت کو یہاں سے خارج کر دو اور اس کی صورت یہ ہے کہ سونے کے سات چوہے بنائے جائیں اور سات گلٹیاں اور ان کو ایک گاڑی میں تابوت کے ساتھ رکھ دیا جائے اور گاڑی میں دو ایسی گائیں جوڑی جائیں جو دودھ دے رہی ہوں اور ان کو بستی کے باہر لے جا کر سڑک پر چھوڑ دیا جائے کہ جس جانب ان کا رخ ہو اس صندوق کو لے جائیں۔

چنانچہ فلسطینیوں نے ایسا ہی کیا۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ وہ گائیں خود بخود ایسے رخ پر چل پڑیں کہ جو بنی اسرائیل کی بستیوں کی جانب تھا اور آخر چلتے چلتے ایک ایسے کھیت پر جا کھڑی ہوئیں جہاں اسرائیلی اپنا کھیت کاٹ رہے تھے اسرائیلیوں نے جب صندوق کو دیکھا تو مسرت و خوشی سے مدہوش ہو گئے اور دوڑے دوڑے شہر بیت شمس میں جا کر خبر کی اور اس کے بعد بیت یعریم کے یہودی آ کر اس کو بڑے احترام سے لے گئے اور ابیداب کے گھر میں جو ٹیلہ پر واقع تھا حفاظت کے ساتھ اس کو رکھا۔ (سموئیل باب ۶ و باب ۷ آیات ۱-۲)

عبدالوہاب نجار نے اس واقعہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ تابوت سکینہ کے متعلق قرآن عزیز میں جو یہ کہا گیا ہے کہ تحمله الملائكة اس کو فرشتے اٹھا لائیں گے اس سے یہ مراد ہے کہ ملائکۃ اللہ کی راہنمائی میں اس طرح یہ گائیں صندوق کی گاڑی کو بغیر کسی قائد و سائق کے منزل مقصود پر لے آئیں گی۔ لیکن قرآن اور بائبل کے مضامین کی تطبیق میں یہ تاویل اگرچہ بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے تاہم تاویل باطل ہے اور نظم قرآنی اس کا انکار کرتا ہے۔

اس لئے کہ قرآن عزیز کے بیان کا حاصل تو یہ ہے کہ تابوت سکینہ کی واپسی طالوت کی حکمرانی کے لئے خدا

کا ایک نشان ہے جو سموئیل علیہ السلام کے ہاتھوں پر اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ ملائکۃ اللہ نے بنی اسرائیل کی آنکھوں دیکھتے اس کو لاکر طالوت کے سامنے پیش کر دیا۔ مگر توراۃ کی عبادت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گاڑی میں جوتی گئی گائیں بیت شمس کی سڑک پر لے جاکر چھوڑی گئی تھیں۔ البتہ انھوں نے دائیں بائیں رخ نہ کیا۔ اور سیدھی چلتی رہیں حتیٰ کہ بیت شمس کے سامنے کھیتوں میں جا کھڑی ہوئیں جو فلستیوں کے حدود کے بعد پہلی سرحدی اسرائیلی بستی تھی اور اس میں یہ بھی تصریح ہے کہ فلستی اس گاڑی کے پیچھے پیچھے بیت شمس کی سرحد تک گئے اور جب گاڑی بیت شمس کے کھیتوں میں چلی گئی تب واپس ہوئے۔

> سو ان گایوں نے بیت شمس کی سڑک کی سیدھی راہ لی اور اس شاہراہ پر چلیں اور چلتے ہوئے ڈکار تی تھیں اور داہنے یا بائیں ہاتھ نہ مڑیں اور فلستی قطب ان کے پیچھے بیت شمس کے سوانے تک گئے اور بیت شمس کے لوگ وادی میں گیہوں کی فصل کاٹ رہے تھے انھوں نے جو آنکھیں اوپر کو کیں تو صندوق دیکھا۔ (سموئیل ا۔ باب ۲۔ آیت ۱۲)

اور ''تابوت'' کے حاصل ہونے کا یہ طریقہ بے شبہ معجزہ یا نشان کی حیثیت نہیں رکھتا خصوصاً جبکہ تورات میں یہ بھی تصریح ہے کہ بیت دجون کے کاہن اس کے پیچھے پیچھے اسرائیلی کھیتوں کے قریب تک آئے تیز قرآن عزیز ہرگز اس کے لئے یہ زوردار جملہ نہ کہتا:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ   بلاشبہ تمہارے لئے اس میں بہت بڑا نشان ہے

علاوہ ازیں قرآن عزیز کے طرز بیان اور اس کے نظم کلام سمجھنے کا جس کو معمولی سا بھی ذوق ہے وہ بہت آسانی کے ساتھ یہ جان سکتا ہے کہ اگر تابوت سکینہ بائبل کے بیان کردہ واقعہ کے مطابق حاصل ہوا تھا تو قرآن عزیز اس کو تحملہ الملائکۃ سے تعبیر نہ کرتا بلکہ تھدی بہ الملائکۃ یا اسی قسم کا کوئی ایسا جملہ کہتا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ تابوت سکینہ فرشتوں کی راہنمائی میں پہنچ جائے گا۔

اور اگر بالفرض توراۃ کی اس تفصیل کو صحیح مان لیا جائے تب بھی اس کا حاصل یہ نکلے گا کہ جبکہ بیت دجون میں صنم دجون تابوت سکینہ کی موجودگی میں روزانہ اوندھے منہ گر جاتا تھا، اور اس واقعہ کی بدولت تابوت کو سرزمین دجون سے نکالا گیا تو یہ بھی بہرحال اسی قسم کا معجزہ اور نشان ہے جو ظاہری اسباب کے بغیر دجون کے مندر میں ظاہر ہوتا رہا لہٰذا جو شخص اس واقعہ کی پوری تفصیل کو صحیح تسلیم کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے اس کو تحملہ الملائکۃ کے اس صاف اور سادہ معنی کے قبول کر لینے میں کیا اشکال ہو سکتا ہے کہ خدا کے فرشتے آنکھوں دیکھتے اس کو اٹھا کر لے آئیں گے۔

طالوت و جالوت کی جنگ اور بنی اسرائیل کا امتحان

اس تمام ردوکد کے بعد بنی اسرائیل کو انکار کرنے کے لئے کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا اور حضرت سموئیل علیہ السلام کے الہامی فیصلہ پر طالوت کو بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا دیا گیا۔

اب طالوت نے بنی اسرائیل کو نفیر عام دیا کہ وہ دشمنوں (فلسطینیوں) کے مقابلہ کے لئے نکلیں جب بنی اسرائیل طالوت کی سرکردگی میں روانہ ہوئے تو بنی اسرائیل کی آزمائش کا ایک اور مرحلہ پیش آیا وہ یہ کہ طالوت

نے یہ سوچا کہ جنگ کا معاملہ بیحد نازک ہے اور اس میں بعض مرتبہ ایک شخص کی بزدلی یا منافقانہ حرکت پورے لشکر کو تباہ کر دیا کرتی ہے اسلئے از بس ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کے اس گروہ کو جہاد سے پہلے آزمالیا جائے کہ کون شخص حکم، ضبط نفس اور صداقت واخلاص کا حامل ہے اور کس میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے اور وہ بزدل اور کمزور ہے تاکہ ادائے فرض سے پہلے ہی ایسے عناصر کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے کیوں کہ یہاں صبر و ثبات قدمی اور اطاعت وانقیاد اصل ہے لہٰذا جو شخص معمولی پیاس میں ضبط وصبر پر قدرت نہیں رکھتا وہ جہاد جیسے نازک معاملہ میں کس طرح ثابت قدم رہ سکتا ہے۔

چنانچہ جب یہ گروہ ایک ندی کے کنارے پہنچا تو طالوت نے اعلان کیا اللہ تعالیٰ اس نہر کے ذریعہ تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے وہ یہ کہ کوئی شخص اس سے جی بھر کر پانی نہ پیئے لہٰذا جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ خدا کی جماعت سے نکال دیا جائے گا۔ اور جو تعمیل ارشاد کرے گا وہ جماعت میں شامل رہے گا البتہ سخت پیاس کی حالت میں گھونٹ بھر پانی پی کر حلق تر کر لینے کی اجازت ہے:

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهٗ مِنِّيْٓ إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ فَشَرِبُوْا مِنْهُ إِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (سورۃ البقرۃ ع ۱۷)

جب طالوت لشکریوں کو لے کر روانہ ہوا تو اس نے کہا بلا شبہ اللہ تعالیٰ تم کو نہر کے پانی کے ذریعہ آزمائیگا پس جو شخص اس سے سیراب ہو کر پیئے گا وہ میری جماعت میں نہ رہے گا اور جو ایک چلو پانی کے سوا اس سے سیراب ہو کر نہیں پیئے گا وہ میری جماعت میں رہے گا پھر تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ سب نے اس نہر سے سیراب ہو کر پی لیا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ واقعہ نہر اردن پر پیش آیا۔[۱] بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ براء بن عازب ﷺ فرماتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول اللہ ﷺ آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے کہ اصحاب بدر کی تعداد اصحاب طالوت کے برابر ہے۔ (بخاری باب المغازی)

بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ جب لشکر ندی کے پار ہو گیا تو جن لوگوں نے خلاف ورزی کر کے پانی پی لیا تھا وہ کہنے لگے کہ ہم میں جالوت جیسے قوی ہیکل اور اس کی جماعت سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے لیکن جن لوگوں نے ضبط نفس اور اطاعت امیر کا ثبوت دیا تھا انھوں نے بے خوف ہو کر یہ کہا کہ ہم ضرور دشمن کا مقابلہ کریں گے اس لئے کہ خدا کی قدرت کا یہ مظاہرہ اکثر ہوتا رہتا ہے کہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں البتہ ایمان باللہ اور اخلاص وثبات شرط ہے:

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ أَنَّهُمْ مُّلَاقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۸

اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (البقرة رکوع ۱۷)

پھر جب طالوت اور اس کے ساتھ وہ لوگ جو (حکم الٰہی پر سچا) ایمان رکھتے تھے ندی کے پار اترے تو ان لوگوں نے (جنھوں نے طالوت کے حکم کی نافرمانی کی تھی) کہا ہم میں یہ طاقت نہیں کہ آج جالوت سے اور اس کی فوج سے مقابلہ کر سکیں لیکن وہ لوگ جو سمجھتے تھے انہیں ایک دن اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے پکار اٹھے (تم دشمنوں کی کثرت اور اپنی قلت سے ہراساں کیوں ہوئے جاتے ہو؟) کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر حکم الٰہی سے غالب آ گئیں اور اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔

مجاہدین کا لشکر اب آگے بڑھا اور دشمن کی فوج کے مقابل صف آرا ہوا، دشمن کی فوج کا سردار جالوت نامی دیو ہیکل شخص تھا اور اس کے لشکر کی تعداد بھی زیادہ تھی مجاہدین نے اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں اخلاص و تضرع کے ساتھ دعاء کی کہ دشمن کو شکست دے اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور اپنی فتح و نصرت سے شاد کام بنا۔

تورات اور کتب سیر میں ہے کہ جالوت کی غیر معمولی شجاعت و بہادری نے بنی اسرائیل کو متاثر کر رکھا تھا اور اس کی مبارز طلبی کے جواب میں جھجک محسوس کرتے تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی شجاعت

بنی اسرائیل کے اس لشکر میں ایک نوجوان بھی تھا جو بظاہر کوئی نمایاں شخصیت نہیں رکھتا تھا اور نہ شجاعت و بہادری میں کوئی خاص شہرت مالک تھا یہ داؤد علیہ السلام تھے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے والد کے سب سے چھوٹے لڑکے تھے، اور شرکت جنگ کے ارادہ سے بھی نہیں آئے تھے بلکہ باپ کی جانب سے بھائیوں اور دوسرے اسرائیلیوں کے حالات کی تحقیق کیلئے بھیجے گئے تھے مگر جب انھوں نے جالوت کی شجاعانہ مبارز طلبی اور اسرائیلیوں کی پس و پیش کو دیکھا تو ان سے نہ رہا گیا اور طالوت سے اجازت چاہی کہ جالوت کا جواب دینے کیلئے ان کو موقع دیا جائے۔ طالوت نے کہا تم ابھی ناتجربہ کار لڑکے ہو اس لئے اس سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے، مگر داؤد علیہ السلام کا اصرار بڑھتا ہی رہا اور آخر کار طالوت کو اجازت دینی پڑی۔

داؤد علیہ السلام آگے بڑھے اور جالوت کو للکارا، جالوت نے ایک نوجوان کو مقابل پایا تو حقیر سمجھ کر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی مگر جب دونوں کے درمیان نبرد آزمائی شروع ہو گئی تو اب جالوت کو داؤد علیہ السلام کی بے پناہ شجاعت کا اندازہ ہوا۔ داؤد علیہ السلام نے لڑتے لڑتے اپنی گوپھن سنبھالی اور تاک کر پے بہ پے تین پتھر اس کے سر پر مارے اور جالوت کا سر پاش پاش کر دیا اور پھر آگے بڑھ کر اس کی گردن کاٹ لی۔ جالوت کے قتل کے بعد جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور بنی اسرائیل کی جنگ مغلوبہ جارحانہ حملہ میں تبدیل ہو گئی اور طاغوتی طاقت کو شکست ہوئی اور بنی اسرائیل کامگار و کامراں واپس لوٹے۔ اس واقعہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی شجاعت کا دوست و دشمن دونوں کے قلوب پر سکہ بٹھا دیا اور وہ بے حد ہر دل عزیز ہو گئے اور ان کی شخصیت بہت نمایاں اور ممتاز نظر آنے لگی۔

اگرچہ قرآن عزیز نے ان تفصیلات کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے یا حقیقتاً یہ تفصیلات خود اپنی جگہ پر صحیح نہیں ہیں لیکن اس بات پر قرآن اور تورات دونوں کا اتفاق ہے کہ جالوت کے قاتل حضرت داؤد

ہیں اور جالوت کے قتل سے ہی اسرائیلیوں کو فتح اور دشمن کو شکست نصیب ہوئی۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ (البقرۃ ع ۳۳)

اور جب وہ (مجاہدین) جالوت اور اس کے لشکر کے مقابل ہوئے تو کہنے لگے اے پروردگار! ہم کو صبر دے اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور کافر قوم پر ہم کو فتح و نصرت عطا فرما۔ بس اللہ کے حکم سے انھوں نے ان (فلسطینیوں) کو شکست دے دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے داؤد کو حکومت اور حکمت عطا فرمائی اور جو مناسب جانا وہ سب کچھ سکھایا۔

بعض اسرائیلی روایات میں یہ بھی ہے کہ جالوت کی زبردست طاقت اور بنی اسرائیل کے اس کے مقابل ہونے میں جھجک کو دیکھ کر طالوت نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص جالوت کو قتل کرے گا میں اس سے اپنی بیٹی کی شادی کروں گا اور اس کو حکومت میں بھی حصہ دار بناؤں گا چنانچہ جب داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا تو طالوت نے وفاء عہد کے پیش نظر اس کے ساتھ اپنی لڑکی میکال کی شادی کر دی اور حکومت میں بھی حصہ دار بنالیا۔ (سموئیل کی کتاب – البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۸-۹)

ایک اسرائیلی روایت پر محاکمہ

تورات کے صحیفہ سموئیل میں طالوت اور داؤد کے متعلق ایک طویل داستان پائی جاتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ طالوت نے داؤد کے شجاعانہ کارناموں کی بناء پر حسب وعدہ ان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی مگر بنی اسرائیل کی ان کے ساتھ والہانہ عقیدت اور ان کی غیر معمولی شجاعت کو اس نے اچھی نظر سے نہ دیکھا اور اس کے دل میں ان کی جانب سے آتش بغض و حسد بھڑک اٹھی مگر اس نے اس کو پوشیدہ رکھا اور اندر ہی اندر ایسی ترکیبیں کرتا رہا کہ جس سے داؤد کا قصہ پاک ہو جائے۔

باپ کے خلاف طالوت کے لڑکے اور لڑکی داؤد کے رازدار اور ہمدرد رہے اور اس لیے ہر موقع پر طالوت کو ناکام ہونا پڑا۔ آخر زچ ہو کر اس نے علی الاعلان داؤد کی مخالفت شروع کر دی اور داؤد یہ دیکھ کر اپنی بیوی اور سالے کو ہمراہ لے کر فرار ہو گئے اور فلسطینیوں کے ایک قصبہ میں طالوت کے دشمن کے یہاں پناہ لی۔ اسرائیلیوں کی اس باہمی آویزش سے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا اور انھوں نے فوج کشی کر کے اسرائیلیوں کو سخت ہزیمت دی۔

اب اس جگہ سے سدی کی روایت اور تورات کی روایت میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے تورات کہتی ہے کہ طالوت اس جنگ میں مارا گیا اور سدی کہتا ہے کہ شکست کا یہ منظر دیکھ کر ساؤل (طالوت) اپنے کیے پر پچھتایا اور نادم ہوا اور وقت کے بزرگوں اور کاہنوں سے دریافت کیا کہ میری توبہ قبول ہونے کی بھی کوئی صورت نکل سکتی ہے سب نے انکار کیا مگر ایک عابدہ عورت ہاں کہہ کر اس کو الیسع نبی کی قبر پر لے گئی اور دعاء کی

حضرت الیسع قبر سے اٹھے اور اس سے کہا کہ تیری توبہ کی صرف یہ ایک صورت ہے کہ تو حکومت داؤد کے حوالے کر دے اور اپنے خاندان سمیت جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو کر شہید ہو جا چنانچہ اس نے یہی کیا اور اس طرح حکومت داؤد کے ہاتھوں میں بلا شرکت غیرے آ گئی اور ساؤل (طالوت) نے مع خاندان کے جام شہادت پی لیا۔

یہ پوری داستان سموئیل کے صحیفہ سے ماخوذ ہے مگر سدی کے حوالے سے اصحاب سیر نے بھی اس اسرائیلی داستان کو اسلامی روایات کی طرح بیان کیا ہے حتیٰ کہ حضرت داؤد کی جو منقبت سورۂ بقرہ کی آیت میں مذکور ہے اس داستان کو اس کی تفسیر میں بیان کر دیا گیا ہے معلوم نہیں کہ گزشتہ دور میں اسرائیلیات کی نقل کا اس قدر ذوق کیوں پیدا ہو گیا تھا کہ یہود نے جن داستانوں کو اپنی گمراہی اور غلط روی کی تائید کے لئے گڑھا تھا ان کو بھی اسلامیات میں شامل کرنے سے احتیاط نہیں برتی گئی اور تاریخ و سیرت تو کجا تفسیر قرآن جیسے اہم مقام کو بھی اس خرافات سے محفوظ نہ رہنے دیا گیا چنانچہ یہاں بھی یہی صورت حال پیش آئی ہے۔

قرآن عزیز کی زبانی آپ سن چکے ہیں کہ جب اسموئیل علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے مطالبہ پر طالوت (ساؤل) کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور انحراف کی راہ اختیار کی تھی مگر جب خدائی نشان نے ان کو لا جواب بنا دیا تب مجبور و مقہور ہو کر طالوت کو اپنا الوالامر تسلیم کر لیا۔ چنانچہ علمائے یہود اسبات کو محسوس کرتے رہے کہ ہماری مجرمانہ عادات و خصائل کے اعداد و شمار میں یہ ایک مزید اضافہ ہے کہ ہم نے خدا کے مامور انسان طالوت کو نااہل بنا کر شروع میں اس کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا لہٰذا ایسی صورت پیدا کرنی چاہیے کہ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ طالوت (ساؤل) کے بارہ میں نااہلیت امارت کا جو دعویٰ ہم نے کیا تھا وہ صحیح اور سچ ظاہر ہو جائے اور ہم کو دنیا کے سامنے یہ کہنے کا موقع ملے کہ یہ وہ امور تھے جن کو ہم نے اپنی فطانت و فراست سے پہلے ہی بھانپ لیا تھا اور آخر کار طالوت (ساؤل) کی نالائقی اور نااہلیت ثابت ہو کر رہی۔ جرم ہلکا کرنے اور اپنی مجرمانہ خصلت پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ وہ اقدام ہے جو اسموئیل کی کتاب میں طالوت (ساؤل) اور حضرت داؤد علیہ السلام کی باہمی آویزش سے متعلق داستان میں نظر آ رہا ہے مگر وائے افسوس کہ ہمارے بعض ارباب سیر و راویان تفسیر نے بھی اس حقیقت تک پہنچے بغیر اپنی سادگی سے کتب سیر و تفسیر میں اس کو نقل کر دیا اور یہ وجہ نہ فرمائی کہ جس ہستی (طالوت) کو قرآن عزیز مامور من اللہ قرار دے رہا ہے اور جس کی برکت سے تابوت سکینہ بنی اسرائیل کو دوبارہ عطا ہو رہا ہے اور جس کو زَادَہٗ بَسۡطَۃً فِی الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ کہہ کر اس کے علم و شجاعت کو پر شوکت الفاظ میں سراہ رہا ہے ہم بغیر کسی دلیل و برہان قویم کے کس طرح ایسے شخص کو قابل نفرت حرکات کا حامل قرار دے کر مورد لعن طعن بنا سکتے ہیں۔ قرآن عزیز سے یہ قطعاً بعید ہے کہ جس ہستی کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ معاصی میں گزر رہا ہو اور وہ جرائم کا مرتکب ہو رہا ہو اس کے مناقب و محامد کا تو ذکر کر دے اور اس کی زندگی کے دوسرے پہلو کو نمایاں نہ کرے پس جبکہ قرآن عزیز نے طالوت کے ثناء و منقبت کے علاوہ ایک لفظ بھی مذمت کا بیان نہیں کیا بلکہ اس کی جانب اشارہ تک موجود نہیں ہے تو ایک مسلمان کیلئے کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ وہ تورات کی اس خرافی داستان کو صحیح تسلیم کرے - حاشا و کلا!۔

یہی وجہ ہے کہ مشہور محقق ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد یہ فرما دیا:

"وفی بعض ھذا نظرٌ و نکارۃٌ" اور اس قصہ کے بعض حصے اوپری داستان اور قابل اعتراض ہیں۔

نیز یہ بھی فرمایا کہ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک عورت نے الیسع نبی کی قبر پر حاضر ہو کر ان کو موت سے جگایا یہ خود اس واقعہ کے غلط ہونے کا عمدہ ثبوت ہے اسلئے کہ اس قسم کے معجزات کا ظہور انبیاء ورسل سے کبھی کبھی ہوتا ہے نہ کہ ایک زاہدہ وعابدہ عورت سے۔ (البدایۃ والنہایۃ ص ۹)

چنانچہ اسی وجہ سے ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس واقعہ کی جانب مطلق توجہ نہیں فرمائی اور بلاشبہ یہ ہرگز توجہ کے قابل نہیں ہے۔ اسی دوران میں حضرت سموئیل کا انتقال ہو گیا۔

سموئیل طالوت اور داؤد کے ذکر کردہ واقعات میں جو بصیرتیں اور حکمتیں پنہاں ہیں وہ اگرچہ بہت ہیں تاہم مختصر طور پر یہ چند قابل غور ہیں:

۱: اللہ نے قوموں اور امتوں کے مزاج میں یہ خاصیت ودیعت فرمائی ہے کہ جب ان کی آزادی خطرہ میں پڑ جائے اور کوئی قوی ان کو غلام بنا لینے کے خیال سے ظلم پر اتر آئے تو وہ اپنے اس حق کی حفاظت اور ظالم کے دفاع کیلئے تشتت وافتراق کو چھوڑ کر وحدتِ مرکز کی جانب دوڑتی اور اپنے لئے ایک صالح اور قابل زعیم اور رہنما تلاش کرنے لگتی ہیں تاکہ وہ ان کی اس پستی کو بلندی سے بدل ڈالے۔ چنانچہ بنو اسرائیل کا حضرت سموئیل سے یہ مطالبہ کہ ان کیلئے ایک آمر و سلطان منتخب کریں اسی فطری تقاضے کے پیش نظر تھا۔

۲: آزادی اور حفاظت حقوق کا یہ شعور بدرجۂ کمال اقوام وامم کے خواص میں پہلے پیدا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ عوام تک پہنچتا ہے اور جس قوم اور جس امت میں ایسے خواص کثرت سے موجود ہوں گے اس قوم اور اس امت میں یہ اسی قدر تیزی کے ساتھ پایا جائے گا۔

۳: جب کسی قوم کے خواص میں اپنے استقلال اور دشمن کے مقابلہ میں حفاظت ودفاع کا شعور بہت زیادہ ترقی پا جاتا ہے تو وہ عوام اور خادم کار افرادِ ملت وقوم کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا، اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارا یہ شعور اور یہ جذبہ قومی عصبیت وحمیت میں خواص کے شعور سے کسی طرح کم نہیں ہے، مگر جب یہ فکر، شعور سے گزر کر عمل وظہور کی وادی میں آتا ہے تو اس وقت ان پر اپنا عجز اور خامکاری ظاہر ہو کر رہتی ہے اور صادقین کاملین کے علاوہ اس وادی پر خار کا کوئی دوسرا رہ نورد نظر نہیں آتا۔ چنانچہ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن عزیز نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ○

پھر جب ان (بنی اسرائیل) پر جہاد فرض کر دیا گیا تو ان میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا سب پیٹھ دکھا گئے اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے خبردار ہے۔ (البقرۃ)

۴: اقوام و امم کے مختلف جاہلی رسوم و اعتقادات میں سے ایک مہلک اعتقاد یہ بھی رہا ہے کہ قیادت و حکومت صرف اسی شخص کا حق ہے جو دولت و ثروت کا مالک اور سرمایہ داری میں نمایاں حیثیت رکھتا ہو اور حسب و نسب میں بھی بلند مرتبہ ہو، اقوام عالم کا یہ تخیل اس درجہ عام رہا ہے کہ جو قومیں تہذیب و تمدن اور عقل و دانش کی علمبردار رہی ہیں وہ بھی اس فاسد عقیدے میں جہاں کے دوش بدوش نظر آتی ہیں بلکہ اس کو عملی اور عقلی رنگ دے کر جاہلی دور سے بھی زیادہ اس کی پابند ہیں۔ بنی اسرائیل کے نقوش بھی اس فاسد عقیدہ سے خالی نہ تھے، اسی بناء پر انھوں نے بھی طالوت کی امارت پر اعتراض کرتے ہوئے یہ کہہ دیا:

وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ

اور اس کو وسعت دولت تو حاصل ہی نہیں اور ہم اس کے مقابلہ میں زیادہ مستحق حکومت ہیں۔

۵: مگر اسلام نے اس جاہلانہ عقیدہ کے خلاف یہ واضح کیا کہ خدا کے نزدیک حکومت و قیادت کا تعلق دولت و ثروت سے وابستہ نہیں ہے اور نہ حسب و نسب اس کیلئے مدار ہے بلکہ علم اور قوت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سلسلہ کی شرط قرار دیے جائیں اس لئے کہ حق و انصاف، حسن تدبیر و اصابت رائے جو حکومت و زعامت کے لئے شرط اولین ہیں وہ مال و دولت اور حسب و نسب سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ ان کا مبدء صفت "علم" قرار پاتی ہے۔ اسی طرح شجاعت و بسالت اور جرأت حق جو حکومت و قیادت کے لئے از بس ضروری ہیں بیشتر بسطة فی الجسم کی رہین منت ہیں اس لئے کہ سے یہ امر نہیں کہ عمدہ غذائیں کھا کر وہ خوب فربہ ہو گیا ہو بلکہ جسم کی وہ طاقت و قوت مراد ہے جو میدان جہاد میں دشمن کے مقابلہ میں ہیبت و سطوت کا باعث اور قوت مدافعت اور جرات کے ساتھ متصف ہو۔

اور قرآن عزیز نے یہ بھی بتایا کہ قیادت و حکومت کے استحقاق کا یہ مسئلہ دین حق کے امتیازی مسائل میں سے ہے اور ہمیشہ وقت کے جاہلی دور کے مقابلہ میں انبیاء و رسل کی معرفت اقوام و امم کے سامنے دہرایا جاتا رہا ہے تاکہ جب وہ اس سلسلہ کی گمراہی میں مبتلا ہوں تو فوراً کسی نبی یا رسول یا ان کے نائبین کے ذریعے ان کی گمراہی پر متنبہ کر کے ان کو ہدایت کی راہ دکھا دی جائے چنانچہ جب بنی اسرائیل نے حضرت سموئیل کے سامنے طالوت کے خلاف متذکرہ بالا غلط استدلال پیش کیا تو حضرت سموئیل نے فوراً ان کو یہ کہہ کر اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا:

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو فضیلت دی ہے اس کو علم اور جسمانی قوت کی وسعت عطا فرمائی ہے۔

۶: جب حق و باطل کا معرکہ پیش آتا ہے اور حق کی جانب سے مخلصین کاملین فداکارانہ جذبات کے ساتھ حمایت حق کیلئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان میں خود اعتمادی اور توکل علی اللہ کی روح سرایت کر جاتی ہے تو پھر کامرانی و کامیابی کا مدار قلت و کثرت پر نہیں رہتا بلکہ قلت، کثرت پر بھاری ہو جاتی اور کثرت، قلت سے مغلوب ہو کر شکست کھا جاتی ہے یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار قرآن عزیز نے اس

طرح کیا ہے

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ

اور بارہا چھوٹی سی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام

- نسب نامہ
- حلیہ مبارک
- قرآن عزیز میں ذکر مبارک
- نبوت ورسالت
- عظمت مملکت
- زبور
- خصائص داؤد علیہ السلام
- تسخیر و تسبیح طیور و جبال
- حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں لوہے کا نرم ہو جانا
- منطق الطیر
- تلاوتِ زبور
- حضرت داؤد علیہ السلام اور دواہم تفسیری مقام
- مقام اول
- مقام ثانی
- بہتان طرازی کی مثال
- تورات کا تضادِ بیان
- آیات کی باطل تفسیر
- آیات کی صحیح تفسیر
- عمر مبارک
- بصائر

نسب نامہ

گزشتہ واقعہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کا مختصر ذکر آچکا اور یہ واضح ہو چکا کہ قتل جالوت میں بے نظیر شجاعت کے اظہار نے بنی اسرائیل کے قلوب پر داؤد علیہ السلام کی محبت و عظمت کا سکہ بٹھا دیا تھا اور ان کی شخصیت ممتاز اور نمایاں ہو چکی تھی چنانچہ یہی داؤد آگے چل کر خدا کے برگزیدہ رسول اور پیغمبر بنے اور بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لئے رسول اور ان کے اجتماعی نظم وضبط کے لئے ''خلیفہ'' مقرر ہوئے۔

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں حضرت داؤد کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:

> داؤد بن ایشا (ایشی) بن عوبد بن عابر (یا عابز) بن سلمون بن نخشون بن عونیاذب (یا عمی ناذب) بن ارم (یارام) بن حصرون بن فارص بن یہوذا بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہ السلام خطوط کے اندر جو نام درج ہیں وہ ابن جریر سے منقول ہیں اور ثعلبی نے عرائس البیان میں بعض ناموں کی جگہ دوسرے نام بیان کئے ہیں۔ مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ داؤد علیہ السلام اسرائیلی اسباط میں یہودا کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۹)

توراۃ میں ہے کہ ایشا یا ایشی کے بہت سے لڑکے تھے اور داؤد ان سب میں صغیر سن تھے۔ (سموئیل کی کتاب)

حلیہ مبارک

محمد بن اسحٰق نے دہب بن منبہؒ کے واسطہ سے حضرت داؤد کا حلیہ مبارک اس طرح نقل کیا ہے: پستہ قد نیلگوں آنکھیں، جسم پر بال بہت کم تھے چہرہ اور بشرے سے طہارت قلب اور نفاست طبع جھلکتی تھی۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۱۰)

قرآن عزیز میں ذکر مبارک

قرآن عزیز میں حضرت داؤد کا ذکر سورۂ بقرہ، نساء، مائدہ، انعام، اسراء، انبیاء، نمل، سبا اور ص میں آیا ہے ان سورتوں میں سولہ جگہ نام مذکورہ ہے اور بعض سورتوں میں مختصر اور بعض میں تفصیلی طور پر ان کے حالات و واقعات کا ذکر اور ان کی رشد و ہدایت کا بیان ہے۔ ذیل کا نقشہ اس مطالعہ کیے لئے مفید ثابت ہوگا۔

سورہ	آیات	شمار
بقرہ	۱۰۲-۲۵۱	۲
نساء	۱۶۳	۱
مائدہ	۷۸	۱
انعام	۸۴ تا ۹۰	۷
اسراء	۵۵	۱
انبیاء	۷۸ تا ۸۲	۵
نمل	۱۵ تا ۴۴	۲۹
سباء	۱۰-۱۴	۲
ص	۱۷ تا ۳۹ ۳۰ تا ۴۰	۱۹
میزان =		۶۷

نبوت و رسالت

حضرت داؤد ﷺ کے ساتھ بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی محبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ طالوت کی موجودگی میں ہی یا اس کی موت کے بعد عنان حکومت حضرت داؤد ﷺ کے ہاتھ میں آگئی اور اس عرصہ میں ان پر خدا کا ایک اور زبردست انعام یہ ہوا کہ وہ منصب نبوت و رسالت سے بھی سرفراز کر دیے گئے۔

حضرت داؤد ﷺ سے قبل بنی اسرائیل میں یہ سلسلہ قائم تھا کہ حکومت ایک سبط (خاندان) سے وابستہ تھی اور نبوت و رسالت دوسرے سبط سے یہودا کے گھرانے میں نبوت چلی آتی تھی اور افراہیم کے خاندان میں حکومت و سلطنت[1] داؤد ﷺ پہلے شخص ہیں جن کے اندر خدائے تعالیٰ نے یہ دونوں نعمتیں یکجا جمع کر دی تھیں وہ خدا کے پیغمبر اور رسول بھی تھے اور صاحب تاج و تخت بھی، چنانچہ قرآن عزیز نے حضرت داؤد کے اس شرف کا اس طرح ذکر کیا ہے:

وَآتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَاءُ - (البقرہ پ ۲ ع ۱۷)

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۱۰

اللہ نے ان کو حکومت بھی عطا کی اور حکمت (نبوت) بھی اور اپنی مرضی سے جو چاہا سکھایا۔

يَادَاوُوْدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِي الْأَرْضِ

اے داوٗد! بے شک ہم نے تم کو زمین اپنا نائب بنایا ہے۔ (سورہ ص)

وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا

اور ہم نے ہر ایک (داوٗد و سلیمان) کو حکومت بخشی اور علم عطا کیا۔ (انبیاء)

انبیاء و رسل میں سے حضرت آدم علیہ السلام کے علاوہ صرف حضرت داوٗد ہی وہ پیغمبر ہیں جن کو قرآن عزیز نے "خلیفہ" کے لقب سے پکارا ہے۔

تحقیق و کاوش کے بعد حضرت داوٗد کی اس امتیازی خصوصیت کی دو حکمتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک صفحاتِ آئندہ میں اپنے موقع پر آئے گی اور دوسری حکمت یہ ہے کہ جبکہ بنی اسرائیل میں صدیوں سے قائم شدہ رسم کے خلاف حضرت داوٗد میں نبوت و رسالت کے ساتھ حکومت و سلطنت بھی جمع کر دی گئی تو ضروری تھا کہ ان کو ایک ایسے لقب سے پکارا جائے جو اللہ تعالیٰ کی صفات علم و قدرت کا مظہر اتم ہونے پر صراحت کرتا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے شریعت حقہ کی اصطلاح میں "خلیفہ" سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں ہو سکتا تھا۔

الحاصل حضرت داوٗد علیہ السلام بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کی خدمت بھی سر انجام دیتے اور ان کی اجتماعی حیات کی نگرانی کا فرض بھی ادا فرماتے رہے۔

عظمت مملکت

قرآن عزیز، تورات اور اسرائیلی تاریخ اسکے شاہد ہیں کہ حضرت داوٗد علیہ السلام شجاعت و بسالت، اصابت رائے اور قوت فکر و تدبیر جیسے اوصاف کے پیش نظر کامل و مکمل انسان تھے اور فتح و نصرت ان کے قدم چومتی تھی اور خدا کا فضل و کرم اس درجہ انکے شامل حال تھا کہ دشمن کے مقابلہ میں ان کی جماعت کتنی ہی مختصر ہوتی کامیابی ہمیشہ ان ہی کے ہاتھ رہتی اسلئے بہت تھوڑے عرصہ میں شام، عراق، فلسطین اور شرق اردن کے تمام علاقوں پر ان کا حکم نافذ اور ایلہ (خلیج عقبہ) سے لیکر فرات کے تمام علاقوں اور دمشق تک تمام ملک ان کے زیر نگین تھا، اور اگر حجاز کے بھی ان حصوں کو شامل کر لیا جائے جو اُنکے قلمرو حکومت کا حصہ بن چکے تھے تو یہ کہنا کسی طرح بیجا نہ ہوگا کہ حضرت داوٗد کی مملکت و حکومت بلا شرکت سامی اقوام کی واحد سلطنت تھی جو جدید فلسفۂ تاریخ اقوام کے مطابق وحدت عرب یا اس سے بھی زیادہ وسیع وحدت اقوام سامیہ کی حکومت کہی جا سکتی ہے اور پھر کثرت لشکر اور وسعت حدود رقبۂ مملکت کے ساتھ ساتھ وحی الٰہی کے شرف نے انکی عظمت و شوکت اور صولت و ہیبت کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا تھا اور رعایا کو یہ یقین حاصل تھا کہ اگر حضرت داوٗد علیہ السلام کے سامنے کوئی ایسا معاملہ رکھ دیا جائے یا ایسی کوئی مہم پیش کر دی جائے جو انتہائی پیچیدہ ہو یا کذب و افتراء نے اس پر زیادہ سے زیادہ ملمع کر دیا ہو، تب بھی وحی الٰہی کے ذریعہ ان پر

حقیقت حال منکشف ہو جاتی ہے اسلئے جن وانس کسی کو بھی یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان کے احکام کی خلاف ورزی کریں چنانچہ ابن جریر نے اپنی تاریخ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمی ایک بیل کا مناقشہ لیکر داؤد علیہ السلام کی خدمت میں پیش ہوئے ہر ایک یہ کہتا تھا کہ یہ میری ملک ہے اور دوسرا غاصب ہے حضرت داؤد نے قضیہ کا فیصلہ دوسرے دن پر مؤخر کر دیا۔ دوسرے دن انھوں نے مدعی سے فرمایا کہ رات میں خدا نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تجھ کو قتل کر دیا جائے لہٰذا تو صحیح بات بیان کر؟ مدعی نے کہا: خدا کے سچے نبی! اس مقدمہ میں تو میرا بیان قطعاً حق اور سچ ہے لیکن اس واقعہ سے قبل میں نے اس (مدعی علیہ) کے باپ کو دھوکا دے کر مار ڈالا تھا، یہ سن کر حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کو قصاص میں قتل کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۱۲)

اسی قسم کے واقعات ہوتے تھے جن کی وجہ سے حضرت داؤد کے حکم اور ان کی عظمت و شوکت کے سامنے سب پست اور فرمانبردار تھے۔ قرآن عزیز کی آیت ذیل میں حضرت داؤد علیہ السلام کی اسی عظمت مملکت اور موہبت حکمت و نبوت کا اظہار کیا گیا ہے۔

وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ۝ (ص)

اور ہم نے اس کی حکومت کو مضبوط کیا اور اس کو حکمت (نبوت) عطا کی اور صحیح فیصلہ کی قوت بخشی۔

اس آیت اور گزشتہ آیات میں "حکمت" سے کیا مراد ہے؟ یہ سوال ہے جو مفسرین کے یہاں زیر بحث ہے۔ ہمارے نزدیک اقوال سلف کا خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ حکمت سے دو باتیں مراد ہیں۔ ایک نبوت اور دوسری عقل و دانش کا وہ مقام جس پر فائز ہو کر کوئی شخص راہِ راست کی بجائے کبھی کج روی اختیار نہیں کر سکتا۔ بعض علماء نے حکمت سے زبور مراد لی ہے۔ اسی طرح "فصل خطاب" سے بھی دو امور کی جانب اشارہ ہے:-

۱ وہ تقریر و خطابت کے فن میں کمال رکھتے تھے اور اس طرح بولتے تھے کہ لفظ لفظ اور فقرہ فقرہ جدا جدا فہم و ادراک میں آتا تھا اور اس سے کلام میں فصاحت و لطافت و شوکت بیان پیدا ہو جاتی تھی۔
۲ ان کا حکم اور فیصلہ حق و باطل کے درمیان قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا تھا۔

زبور

بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کیلئے "اصل او ر اساس" توراۃ تھی لیکن حالات و واقعات اور زمانہ کے تغیرات کے پیش نظر حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی خدا کی جانب سے زبور عطا ہوئی جو توراۃ کے قوانین و اصول کے اندر رہ کر اسرائیلی گروہ کی رشد و ہدایت کیلئے بھیجی گئی تھی۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام نے شریعت موسوی کو از سر نو زندہ کیا۔ اسرائیلیوں کو راہِ ہدایت دکھائی اور نورِ وحی سے مستفیض ہو کر تشنہ کامانِ معرفت الٰہی کو سیراب فرمایا۔

زبور خدا کی حمد کے نغموں سے معمور تھی اور حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسا لہجہ اور سحر آگیں لحن

عطا فرمایا تھا کہ جب زبور کی تلاوت فرماتے تو جن وانس حتیٰ کہ وحوش وطیور تک وجد میں جاتے۔ اسلئے آج تک ”لحن داؤدی“ ضرب المثل ہے۔

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب ابو موسیٰ اشعری کے حسنِ صوت کو سنتے تو ارشاد فرماتے: ”ابو موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے لحن داؤد عطا فرمایا ہے“۔ (البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۱۱)

لغت میں زبور کے معنی پارے اور ٹکڑے کے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب دراصل توراۃ کی تکمیل کیلئے نازل ہوئی تھی۔ اسی لیے گویا اسی کا ایک حصہ اور ٹکڑا ہے۔

زبور ایسے قصائد اور مسجع کلمات کا مجموعہ تھا۔ جس میں خدا کی حمد و ثنا اور انسانی عبدیت و عجز کے اعتراف اور پند و نصائح اور بصائر و حکم کے مضامین تھے۔ مسند احمد میں ایک روایت کے منقول ہے کہ زبور کا نزول رمضان میں ہوا اور وہ مواعظ و حکم کا مجموعہ تھی۔[1] نیز بعض بشارات اور پیشین گوئیاں بھی منقول تھیں۔ چنانچہ بعض مفسرین نے یہ تصریح کی ہے کہ آیت مسطورہ ذیل میں زبور کے جس واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ دراصل نبی اکرم ﷺ اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی بشارت سے متعلق ہے اور وہی اس کا مصداق ہیں۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ ۝ (انبیاء)

اور بے شک ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ کہہ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔

قرآن عزیز نے جگہ جگہ توراۃ، انجیل اور زبور کو خدا کی وحی فرمایا ہے اور منزل من اللہ بتایا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے دیدہ و دانستہ خدا کی ان کتابوں کو بدل ڈالا اور جگہ جگہ اپنی مرضی کے مطابق ان میں تحریف کر دی حتیٰ کہ اب ان کے حقائق پر اس قدر پردہ پڑ گیا ہے کہ اصل اور جعل کے درمیان فرق کرنا سخت مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (بقرہ)

بعض یہود وہ ہیں جو توراۃ وانجیل وزبور کے کلمات کو ان کی اصل حقیقت سے بدلتے اور پھیرتے ہیں۔

چنانچہ توراۃ وانجیل کے علاوہ خود زبور اس کی زندہ شہادت موجود ہے۔ موجودہ زبور میں ان مختلف حصوں کی تعداد جن کو اہلِ کتاب کی اصطلاح میں مزبور کہا جاتا ہے۔ ایک سو پچاس ہے۔ ان حصوں پر جو نام درج ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ سب حصے حضرت داؤد علیہ السلام کے ”مزبور“ نہیں ہیں۔ کیونکہ بعض پر اگر حضرت داؤد علیہ السلام کا نام ثبت ہے تو بعض پر مغنیوں کے استاذ قورح کا اور بعض پر شوشینم کے سروں پر آصف کا اور بعض پر کسی کا نام نہیں ہے۔ علاوہ ازیں بعض ایسے زبور بھی ہیں۔ جو حضرت داؤد علیہ السلام سے صدیوں بعد تصنیف کیئے گئے ہیں۔ مثلاً یہ مزبور:

اے خدا قومیں تیری میراث میں گھس آئی ہیں۔ انہوں نے تیری مقدس ہیکل کو ناپاک کیا ہے۔ انہوں نے

۱: البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۱۲۔

یروشلم کو کھنڈر بنادیا ہے۔ (مزبور ۷۹ تا ۸۴)

اس مزبور میں اس ہولناک واقعہ کا تذکرہ ہے جو بنوکدرزر (بخت نصر) کے ہاتھوں بنی اسرائیل کو پیش آیا اور ظاہر ہے کہ یہ واقعہ داؤد علیہ السلام کے صدیوں بعد پیش آیا ہے۔

بہر حال خدائے تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر زبور نازل فرمائی اور ان کے ذریعہ بنی اسرائیل کو رشد و ہدایت کا پیغام سنایا:

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّيْنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّآتَيْنَا دَاوُوْدَ زَبُوْرًا ۝ (اسراء)

اور بیشک ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور بخشی۔

وَآتَيْنَا دَاوُوْدَ زَبُوْرًا ۝ (نساء)

اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی

بخاری کتاب الانبیاء میں ایک روایت منقول ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام پوری زبور کو اتنے مختصر وقت میں تلاوت کر لیا کرتے کہ جب وہ گھوڑے پر زین کسنا شروع کرتے تو تلاوت بھی شروع کرتے اور کس کر فارغ ہوتے تو پوری زبور ختم کر چکے ہوتے۔

حضرت داؤد علیہ السلام اور قرآن و تورات

اس مقام پر قرآن عزیز اور تورات کے درمیان سخت اختلاف ہے۔ قرآن عزیز تو حضرت داؤد علیہ السلام کو اگر صاحبِ شوکت و صولت بادشاہ مانتا ہے تو جلیل القدر پیغمبر اور رسول بھی تسلیم کرتا ہے۔ لیکن تورات ان کو صرف "کنگ داؤد" (شاہ داؤد) ہی تسلیم کرتی ہے اور ان کی نبوت و رسالت کا اقرار نہیں کرتی۔ ظاہر ہے کہ تورات کا انکار تحکم اور بے سروپا بات ہے اور اسی قسم کے کذب و افترا پر مبنی ہے جس کا ثبوت بارہا ان ہی صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔

خصائص داؤد

اللہ تعالیٰ نے یوں تو سب ہی پیغمبروں کو خصوصی شرف و امتیاز بخشا ہے اور اپنے نبیوں اور رسولوں کو بے شمار انعام و اکرام سے نوازا ہے تاہم شرف و خصوصیت کے درجات کے اعتبار سے ان کے درمیان بھی فرقِ مراتب رکھا ہے اور یہ امتیازی درجات و مراتب ان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (بقرہ)

یہ رسول! ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق بھی قرآنِ عزیز نے چند خصائص و امتیازات کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس رسول کو کس درجہ بزرگی اور عظمت عطا فرمائی ہے لیکن یہ واضح رہے کہ قرآنِ

عزیز کی بیان کردہ خصائص انبیاء ورسل میں خاصہ کے وہ منطقی معنی مراد نہیں ہیں کہ کسی دوسرے شخص میں قطعاً اس کا وجود نہ پایا جائے اور وہ وصف صرف اسی کے اندر محدود ہو بلکہ اس مقام پر خاصہ سے وہ وصف مراد ہے جو اس ذات میں تمام و کمال درجہ پر پایا جاتا ہو اور اس کے ذکر سے ذہن فوراً اس شخصیت کی جانب متوجہ ہو جاتا ہو اگرچہ بعض حالات میں اس وصف خاص کا وجود دوسرے نبیوں میں بھی جلوہ گر نظر آتا ہو۔

۱۔ تسخیر و تسبیح جبال و طیور

حضرت داؤد خدائے تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس میں بہت زیادہ مصروف رہتے تھے اور اس قدر خوش الحان تھے کہ جب زبور پڑھتے یا خدا کی تسبیح و تہلیل میں مشغول ہوتے تو ان کے وجد آفریں نغموں سے نہ صرف انسان بلکہ وحوش و طیور وجد میں آجاتے اور آپ کے ارد گرد جمع ہو کر حکم خدا کے ترانے گاتے وار سریلی پر کیف آوازوں سے تقدیس و تسبیح میں حضرت داؤد کی ہمنوائی کرتے اور صرف یہ نہیں بلکہ پہاڑ بھی خدا کی حمد میں گونج اٹھتے۔ چنانچہ داؤد کی اس فضیلت کا قرآن عزیز نے سورۂ انبیاء، سبا اور ص میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے:

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُوْدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فَاعِلِيْنَ ○ (انبیاء)

اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو تابع کر دیا ہے کہ وہ داؤد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ہم ہی میں ایسا کرنے کی قدرت ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُوْدَ مِنَّا فَضْلًا يَاجِبَالُ أَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ (سبا)

اور بے شک ہم نے داؤد کو اپنی جانب سے فضیلت بخشی ہے (وہ یہ کہ ہم نے حکم دیا) اے پہاڑوں اور پرندوں تم داؤد کے ساتھ مل کر تسبیح اور پاکی بیان کرو۔

إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ ○ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً كُلٌّ لَّهٗ أَوَّابٌ ○ (صٓ)

بے شک ہم نے داؤد کیلئے پہاڑوں کو مسخر کر دیا کہ اسکے ساتھ شام اور صبح تسبیح کرتے ہیں اور پرندوں کے پرے کے پرے جمع ہوتے اور سب مل کر حمد خدا کرتے ہیں۔

بعض مفسرین نے ان آیات کی تفسیر میں کہا ہے کہ چرند و پرند اور پہاڑوں کی تسبیح زبانِ حال سے تھی گویا کائنات کی ہر شے کا وجود اور اس کی ترکیب بلکہ اس کی حقیقت کا ذرہ ذرہ خدا کی خالقیت کا شاہد ہے اور یہ اس کی تسبیح و تحمید ہے۔

سیب اگرچہ زبانِ قال نہیں رکھتا اور نطق سے محروم ہے لیکن اس کی خوشبو اور اس کی لطافت، اس کا حسن اور اس کی نزاکت جدا جدا پکار کر کہہ رہے ہیں فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

امام رازی نے یہی مسلک اختیار کیا ہے مگر بایں جلالت قدر اس مسلک کے ثبوت میں ایسی فلسفیانہ دلیل

پیش کی ہے جو عقل و نقل دونوں اعتبار سے رکیک ہے بلکہ اس کو دلیل کہنا بھی غلط ہے۔[1]

ہم کو یہ حقیقت کبھی بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ قرآن عزیز کا طرزِ استدلال ان فلسفیانہ موشگافیوں کے تابع نہیں ہے جو محض ظن اور تخمین کی بنیادوں پر قائم ہیں۔ خصوصاً یونانی فلسفہ کے مزعومہ اصول پر ایک بات کہی جائے اور پھر قرآن عزیز کے صاف اور سادہ مطلب کو اس کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے تو قرآن عزیز اسکو برداشت نہیں کرتا۔

اس خیال کے برعکس محققین کی یہ رائے ہے کہ حیوانات، نباتات اور جمادات حقیقۃً تسبیح کرتے ہیں اور ان کی تسبیح کے صرف یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کا وجود زبانِ حال سے صانع حکیم پر دلالت کرتا ہے اور یہ ان کی تسبیح ہے، اسلئے کہ قرآن عزیز نے سورۂ بنی اسرائیل میں بصراحت یہ اعلان کیا ہے:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (بنی اسرائیل)

آسمان اور زمین خدا کی تسبیح کرتے ہیں اور کائنات کی ہر شے خدا کی تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کا فہم و ادراک نہیں رکھتے۔

اس جگہ دو باتیں صاف صاف نظر آتی ہیں:

۱: کائنات کی ہر شے تسبیح کرتی ہے۔

۲: جن و انس ان کی تسبیح سمجھنے کا ادراک و فہم نہیں رکھتے۔ تو اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین اور کائنات کی ہر شے حیوانات، نباتات اور جمادات کی جانب تسبیح کی نسبت فرمائی ہے تو یہ ضرور ہے کہ ان اشیاء میں تسبیح کا حقیقی وجود موجود ہو اور پھر دوسرے جملہ کا اس پر اطلاق کیا جائے کہ جن و انس ان کی تسبیح کے فہم و ادراک سے قاصر ہیں۔ اگر اس جگہ تسبیح کے حقیقی معنی نہ لئے جائیں۔ بلکہ "زبانِ حال سے تسبیح کرنا" اس معنی کو اختیار کیا جائے تو پھر قرآنِ عزیز کا یہ ارشاد کیسے صحیح ہوگا وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے اسلیئے کہ اگر ایک دہری اس کو نہیں سمجھتا کہ کائنات کا ہر ذرہ خدائے واحد کی ہستی کا پتہ دے رہا ہے تو تمام اہلِ مذاہب خصوصاً ہر مسلمان تو بے شبہ اس کو سمجھتا ہے اور وہ جب کبھی وجودِ باری پر کچھ سوچتا ہے تو اس کا یقین کر کے سوچتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی ہستی کا اقرار کر رہا ہے اور ہر شے کا وجود ہی خود خالق کائنات کا پتہ دے رہا ہے۔ ابن حزم نے "الفصل" میں اس جگہ یہ شبہ پیش کیا ہے کہ اگر حیوانات، نباتات اور جمادات کی تسبیح کو حقیقتاً تسبیح پر محمول کیا جائے تو یہ اشکال لازم آئے گا۔ کہ ایک دہری انسان بھی "شے" ہے مگر وہ خدا کی تسبیح کسی لمحہ بھی نہیں کرتا۔ لہٰذا آیت کا عموم کیسے صحیح باقی رہے گا۔

ابن حزم کا یہ اشکال بہت ہی سطحی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کے بیان کرتے وقت ان کی نظر قرآنِ عزیز کے اس مطلب و مراد سے غافل ہو گئی جو اس مقام پر اس کے پیشِ نظر ہے اور انہوں نے آیت زیرِ بحث

۱: اس بحث کے مطالعہ کیلئے ملاحظہ کیجئے تفسیر کبیر جلد ۵ سورۂ بنی اسرائیل۔

کے سیاق و سباق پر غور نہیں فرمایا۔

قرآن عزیز اس آیت سے قبل مشرکین کا تذکرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو بتارہا ہے کہ مشرکین اپنی ناسمجھی اور کج فہمی سے خدا کے ساتھ معبودانِ باطل کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ لیکن قرآن جب اس مسئلہ کے بطلان کو ان پر واضح کرتا اور طرح طرح سے سمجھاتا ہے تو ان پر نصیحت کا الٹا اثر پڑتا ہے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور برتر ہے ان تمام باطل نسبتوں سے جو مشرکین اس کی جانب منسوب کرتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ یہ انسان ہی ہے جو اس قسم کی مشرکانہ گمراہی میں مبتلا ہو رہا ہے ورنہ ساتوں آسمان و زمین اور کائنات کی ہر شے خدا کی پاکی بیان کرتی اور شرک سے بیزاری کا اظہار کرتی ہے۔ مگر انسان ان کی اس تسبیح کے فہم و ادراک سے قاصر ہے۔ بے شک اللہ بردبار ہے بخشنے والا۔

اس کے بعد مشرکین کے باطل عقیدہ کا ثمرہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب محمد ﷺ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم ان کے اور مشرکین کے درمیان ایک "حجاب" قائم کر دیتے ہیں۔ یعنی وہ جب قرآن کو خدا کا کلام نہیں مانتے تو وہ آپ کو رسول بھی تسلیم نہیں کرتے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ آپ کی نصیحت سے منہ موڑ کر آخرت کے انجام سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا وَمَا يَزِيْدُهُمْ إِلَّا نُفُوْرًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ إِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝ وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل)

اور ہم نے اس قرآن میں طرح طرح کی باتیں بیان کی ہیں تاکہ لوگ نصیحت پکڑیں مگر وہ اس سے اور بدک جاتے ہیں۔ کہہ دو کہ اگر خدا کے ساتھ اور معبود ہوتے جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو وہ ضرور (خدائے) مالکِ عرش کی طرف (لڑنے بھڑنے کیلئے) رستہ نکالتے وہ پاک ہے اور جو کچھ یہ بکواس کرتے ہیں اس سے (اس کا رتبہ) بہت عالی ہے۔ ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں اس کی تسبیح کرتے ہیں اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ بیشک وہ بردبار اور غفار ہے۔

قرآن عزیز کی تفصیلات اور سیاق و سباق کی تصریحات کے بعد ابن حزم کے شبہ کے لئے کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، وہ تو صاف صاف یہ کہہ رہا ہے کہ خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی ناپاک جرأت "انسان" کو ہی ہوئی اس لئے کہ وہ متضاد اوصاف کا مجموعہ ہے، لیکن اس کے علاوہ کائنات کی ہر شے خدا کے سامنے حقیقت

کے سوااور کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتی اور اسی لئے وہ صرف پاکی ہی بیان کرتی ہے اور "تسبیح و تحمید" اس کا شیوہ ہے۔

شیخ بدر الدین عینی نے محققین کے اس مسلک کو اس حدیث کے تحت میں مختصر مگر مدلل بیان کیا ہے جس میں دو قبروں میں مردوں پر عذاب ہونے اور نبی اکرم ﷺ کے درخت کی ایک سبز شاخ کو چیر دونوں قبروں پر لگاتے ہوئے یہ ارشاد فرمانے کا ذکر کہ جب تک یہ شاخیں خشک نہ ہوں گی۔ یہ دونوں عذاب سے محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

> اہل علم آیۃ وان من شیء الا یسبح بحمدہ کے معنی بیان کرتے ہیں کہ ہر زندہ شے خدا کی حمد کرتی ہے اور ہر شے کو اس کے درجہ کے مناسب زندگی حاصل ہے اور لکڑی (نباتات) میں زندگی اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ سبز رہے اور خشک ہو جانا اس کی موت کا اعلان ہے اور پتھر (جمادات) کی زندگی اس کے سالم رہنے سے وابستہ ہے اور اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا اس کی موت کا پیغام ہے اور محققین کا یہی مسلک ہے کہ آیت (بغیر کسی تاویل کے) اپنے عموم پر ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ اشیاء کیا حقیقتاً تسبیح کرتی ہیں یا اپنے حال سے صانع اور خالق پر دلالت کرنا ہی ان کی تسبیح ہے۔
>
> تو اہلِ تحقیق کا مذہب یہ ہے کہ یہ اشیاء حقیقتاً تسبیح کرتی ہیں اور جبکہ "عقل" بھی اس کو محال نہیں سمجھتی اور "نص" بھی بصراحت اس کا اظہار کرتی ہے تو ضروری ہے کہ اس کا مطلب وہی لیا جائے جو اہلِ تحقیق فرماتے ہیں۔ (عینی شرح بخاری ج ا ص ۸۷۴)

نص قرآنی کی صراحت تو آپ کے سامنے ہے لیکن عقل کیوں اس کو محال نہیں سمجھتی تو اس کا فتویٰ عقل ہی سے لیجئے:-

عقلاءِ دہر کا اس پر اتفاق ہے کہ گفتگو اور قول کیلئے "نطق" شرط نہیں ہے اور اگر کسی شے میں "حیات" اور "صوت" موجود ہیں تو اس کی جانب قول کی نسبت بے تردد صحیح ہے۔ چنانچہ فلاسفۂ یونان حیوانات کے اندر حیات کے ساتھ جزئیات کا حس بھی تسلیم کرتے رہے ہیں اور جدید سائنس کے دور میں تو یہ مشاہدہ ہو رہا ہے کہ نباتات کے اندر بھی "حیات" اور "احساس" دونوں چیزیں موجود ہیں حتیٰ کہ جزئیات کا تمیز بھی تجربہ میں آچکا ہے۔ چھوئی موئی کا درخت ہاتھ لگانے سے مرجھا جاتا ہے اور ہاتھ الگ ہونے سے پھر شاداب ہو جاتا ہے۔ "مردم خور درخت" انسان یا حیوان کے قریب ہونے پر اس کا احساس کرتا اور فوراً اپنی شاخیں دراز کر کے اس کو دبوچ کر اپنی گرفت میں کر لیتا ہے۔ یہ اب رات دن کے مشاہدے ہیں۔ کلکتہ میں مشہور ماہرِ علم النباتات سائنس داں کا ایک باغیچہ آج بھی موجود ہے۔ جس میں مسٹر بوس خدا کی قدرت کے عجائبات دکھاتا ہے کہ درخت مریض بھی ہوتے ہیں اور صحتیاب بھی اور بعض درختوں کا بعض سے نفرت کرنا مشاہد ہوتا ہے اور بعض کا بعض کی جانب مائل ہونا بھی۔ حتیٰ کہ بعض سائنس دانوں کا اب یہ دعویٰ ہے کہ ایک نہایت ہی ضعیف اور غیر محسوس قسم کی حیات جمادات کے اندر بھی پائی جاتی ہے اور وہی

اس کے نمو کی کفیل ہے۔

غرض نقل اور عقل دونوں اعتبار سے قرآن عزیز کا یہ ارشاد کہ "کائنات کی ہر شے خدا کی حمد و ثناء کرتی ہے"۔ اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے ہے اور "دلالتِ حال" کے ساتھ اس کی تاویل کرنا فضول ہے۔ البتہ ان کی یہ تسبیح و تحمید انسانوں کے عام فہم و ادراک سے بالاتر رکھی گئی ہے اور خدا کی مرضی اور مشیت کے ماتحت کبھی کبھی انبیاء و رسل کو اس کا فہم و ادراک عطا ہو جاتا ہے۔ جو ان کیلئے بطور نشان (معجزہ) کے ہوتا ہے چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خصوصیات میں سے ایک خصوصی شرف و امتیاز یہ تھا کہ جب وہ صبح و شام خدا کی حمد و ثناء کرتے اور اس کی پاکی اور تقدیس میں مشغول ہوتے تو وحوش و طیور اور پہاڑ بھی ان کے ساتھ بلند آواز سے خدا کی تسبیح و تحمید میں ان کی ہم نوائی کرتے اور حضرت داؤد علیہ السلام اور وہ سب ایک دوسرے کی تسبیح و تحمید کو سنتے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کا قرآن عزیز نے سورۂ انبیاء، سبا اور ص میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

یہ واضح رہے کہ علماءِ حق میں سے جن علماء نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں جن و انس کے علاوہ اشیاء کی تسبیح کو "حال" پر محمول کیا ہے۔ انہوں نے بھی بلا خوف یہ تسلیم کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا معاملہ اس عام حالت سے جدا معجزات سے تعلق رکھتا ہے اور ان مقامات میں حیوانات و جمادات کی تسبیح و تحمید حقیقی معنی ہی کے لحاظ سے ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کے ان معجزات میں حقیقت ہی مراد ہے جن میں کنکریوں کا کلمہ پڑھنا۔ استن حنانہ کا گریہ کرنا اور حیوانات کا آپ سے ہم کلام ہونا ثابت ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں لوہے کا نرم ہو جانا

شاہی اور شاہنشاہی کے باوجود حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت و مملکت کے مال سے ایک حبہ نہیں لیتے اور اپنا اہل و عیال کی معاش کا بار بیت المال پر نہیں ڈالتے تھے بلکہ اپنی محنت اور ہاتھ کی کمائی سے حلال روزی حاصل کرتے اور اسی کو ذریعۂ معاش بناتے تھے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے اس وصف کو حدیث صحیح میں ان الفاظ کے ساتھ سراہا گیا ہے:

قال رسول اللّٰہ ﷺ ما اکل احد طعاماً قط خیرا من ان یاکل من عمل یدہ و ان نبی اللّٰہ داوٗد علیہ السلام کان یاکل من عمل یدہ ۔ (بخاری، کتاب التجارۃ)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ کسی انسان کا بہترین رزق اس کے اپنے ہاتھ کی محنت سے کمایا ہوا رزق ہے اور بے شبہ اللہ کے پیغمبر داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے محنت سے روزی کماتے تھے۔

شیخ بدر الدین عینی فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام دعا مانگا کرتے تھے کہ خدایا ایسی صورت پیدا کر دے کہ میرے ہاتھ کی کمائی آسان ہو جائے کیونکہ میں بیت المال پر اپنی معاش کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ دراصل حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ پاک جذبہ اسی پیغمبرانہ امتیازات میں سے تھا۔ جن کا ذکر قرآنِ عزیز نے تمام اولوا العزم پیغمبروں کی رشد و ہدایت کے سلسلہ میں کیا ہے ہر نبی اپنی امت کو جب پیغام الٰہی سناتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا ہے: (عینی جلد ۷ ص ۴۲۰)

وَ مَآ اَسۡئَلُکُمۡ عَلَیۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ

اور میں تم سے اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں چاہتا میرا معاوضہ تو اللہ کے ذمہ ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ حدیث بخاری کا مقصد یہ ہے کہ خلیفہ اسلام کو اگرچہ بیت المال سے بقدر کفاف وظیفہ لینا درست ہے لیکن افضل یہ ہے کہ اس پر بار نہ ڈالے چنانچہ حضرت صدیق اکبر نے وفات کے وقت اس تمام رقم کو واپس کر دیا تھا جو انہوں نے زمانہ خلافت میں بیت المال سے وظیفہ کی شکل میں لی تھی اسی طرح دوسری خدمات اسلامی پر معاوضہ لینے کا معاملہ الگ ہے۔[1] چنانچہ حضرت داؤد کی اس خواہش کو اللہ تعالیٰ نے اس فضیلت کے ساتھ قبول فرمایا کہ ان کے ہاتھ میں لوہے اور فولاد کو موم کی طرح نرم کر دیا کہ جب وہ زرہ بناتے تو سخت مشقت اور آلات خدادی کے بغیر فولاد کو جس طرح چاہتے کام میں لاتے اور ان کے ہاتھ میں موم کی طرح بآسانی ہر قسم کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کو سورۂ انبیاء اور سورۂ سبا میں اس طرح بیان کیا ہے:

وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝ أَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا إِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (سبا)

اور ہم نے اس (داؤد) کیلئے لوہا نرم کر دیا کہ بنا زرہیں کشادہ اور اندازہ سے جوڑ کڑیاں ار تم جو کچھ کرتے ہو۔ میں اس کو دیکھتا ہوں۔

وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَأْسِكُمْ فَهَلْ أَنْتُمْ شَاكِرُوْنَ ۝ (انبیاء)

اور ہم نے اس (داؤد) کو سکھایا ایک قسم کا لباس بنانا تاکہ تم کو لڑائی کے موقعہ پر اس سے بچاؤ حاصل ہو۔ پس کیا تم شکر گزار بنتے ہو۔

توراۃ اور "لوہے کے استعمال کے زمانہ کی تاریخ" سے پتہ چلتا ہے کہ داؤد سے پہلے لوہے کی صنعت نے اس حد تک ترقی کر لی تھی کہ فولاد کو پگھلا کر اس سے سپاٹ ٹکڑے بناتے اور ان کو جوڑ کر زرہ بنایا کرتے تھے۔ لیکن یہ زرہ بہت بھاری ہوتی تھی اور چند قوی ہیکل انسانوں کے علاوہ عام طریقہ سے ان کا استعمال مشکل اور دشوار سمجھا جاتا تھا اور میدان جنگ میں سبک خرامی دشوار ہو جاتی تھی۔

حضرت داؤد پہلے شخص ہیں جن کو خدائے تعالیٰ نے یہ فضیلت بخشی کہ انہوں نے تعلیم وحی کے ذریعہ ایسی زرہیں ایجاد کیں جو باریک اور نازک زنجیروں کے حلقوں سے بنائی جاتی تھیں اور ہلکی اور نرم ہونے کی وجہ سے میدان جنگ کا سپاہی اس کو پہن کر بآسانی نقل و حرکت بھی کر سکتا تھا اور دشمن سے محفوظ رہنے کیلئے بھی بہت عمدہ ثابت ہوتی تھیں۔

سید محمود آلوسی نے روح المعانی میں حضرت قتادہ سے بھی اسی قسم کی روایت نقل کی ہے۔
(روح المعانی جلد ۷ اص ۱۷۱)

---

۱ فتح الباری جلد ۴ ص ۲۴۳۔

منطق الطیر

حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان علیہ السلام کو خدائے تعالیٰ کی جانب سے ایک شرف یہ عطا ہوا تھا کہ دونوں بزرگوں کو پرندوں کی بولیاں سمجھنے کا علم دیا گیا تھا اور جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کی گفتگو سمجھتا ہے۔ اسی طرح وہ پرندوں کی گفتگو سمجھتے تھے۔

نطق طیر کی حقیقت کیا ہے اور حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) نطقِ طیر کے متعلق کس قسم کا علم تھا۔ اس کی مفصل بحث حضرت سلیمان کے واقعات میں آئے گی لیکن یہ یقینی بات ہے کہ ان کا یہ علم اس طریقہ کا نہ تھا جو علم الحیوانات کے ماہرین نے تخمینی اور ظنی طور پر ایجاد کیا ہے اور جو علمی اصطلاح میں زولوجی (ZOOLOGY) کی ایک شاخ شمار ہوتا ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک موہبت اور بخشش تھی۔ جس سے ان دونوں پیغمبروں کو نوازا گیا تھا۔

تلاوتِ زبور

گزشتہ سطور میں ذکر آچکا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب گھوڑے پر زین کسنا شروع کرتے تو اس سے فارغ ہونے تک مکمل زبور کی تلاوت کرلیا کرتے تھے تو حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ معجزہ "حرکتِ زبان" سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا خدائے تعالیٰ حضرت داؤد علیہ السلام کیلئے زمانہ کو اس مدت میں ایسا سمیٹ دیتا تھا کہ عام حالت میں وہ گھنٹوں کی مقدار بن سکتا ہے یا حضرت داؤد علیہ السلام کو سرعتِ اداء الفاظ کی اس درجہ قوت عطا کردی گئی تھی کہ دوسرا شخص جس کلام کو گھنٹوں میں ادا کرے۔ داؤد علیہ السلام اسکو بخاری کی نقل کردہ روایت کے مطابق مختصر وقت میں ادا کرنے پر قدرت رکھتے تھے اور یہ تو آج بھی مسلم ہے کہ سرعتِ حرکت کیلئے کوئی حد معین نہیں کی جاسکتی۔

حضرت داؤد علیہ السلام: ردو اہم تفسیری مقام

حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں دو اہم مقام ایسے ہیں جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی اور مفسرین کے تفسیری مباحث کے لحاظ سے بھی اہم شمار ہوتے ہیں اور پہلا مقام اگرچہ اختلافی نہیں ہے۔ مگر دوسرا مقام معرکۃ الآراء بن گیا ہے اور اہل علم کی موشگافیوں نے اس کو کچھ سے کچھ بنادیا ہے۔ اسلیئے ضرورت ہے کہ اس حقیقت کو آشکارا کیا جائے اور باطل اوہام و مزعومات کو ادلہ و براہین کی روشنی میں رد کیا جائے۔

مقام اول

وَدَاوُوْدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِيْنَ ○ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا (انبیاء)

اور داؤد اور سلیمان (کا واقعہ) جب وہ ایک کھیتی کے معاملہ کا فیصلہ کر رہے تھے۔ جس کو ایک فریق کی بکریوں کے ریوڑ نے خراب کرڈالا تھا اور ہم ان کے فیصلہ کے وقت (اپنے علم محیط کے اعتبار سے) موجود تھے پھر ہم

نے اسکے (بہترین) فیصلہ کی سمجھ سلیمان کو عطا کی اور داؤد و سلیمان کو ہم نے علم و حکمت عطا کیئے۔

اس آیت کی تفسیر میں جمہور مفسرین نے بروایت حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ و حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں دو شخص ایک مقدمہ لے کر حاضر ہوئے۔ مدعی نے دعوے کی روئداد یہ سنائی کہ مدعی علیہ کی بکریوں کے گلے نے اس کی تمام کھیتی تباہ و برباد کر ڈالی اور اس کو چر چک کر روند ڈالا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے علم و حکمت کے پیش نظر یہ فیصلہ دیا کہ مدعی کی کھیتی کا نقصان چونکہ مدعی علیہ کے گلہ کی قیمت کے قریب قریب متوازن ہے۔ لہٰذا یہ پورا گلہ مدعی کو تاوان میں دے دیا جائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر ابھی گیارہ سال کی تھی۔ وہ والد ماجد کے نزدیک ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے کہ اگرچہ آپ کا یہ فیصلہ صحیح ہے مگر اس سے بھی زیادہ مناسب شکل یہ ہے کہ مدعی علیہ کا تمام ریوڑ مدعی کے سپرد کر دیا جائے کہ وہ اس کے دودھ اور اس کی اون سے فائدہ اٹھائے اور مدعی علیہ سے کہا جائے کہ وہ اس درمیان میں مدعی کے کھیت کی خدمت انجام دے اور جب کھیت کی پیداوار اپنی اصلی حالت پر واپس آ جائے تو کھیت مدعی کے سپرد کر دے اور اپنا ریوڑ واپس لے لے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو بیٹے کا یہ فیصلہ بہت پسند آیا۔

قرآن عزیز نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اس معاملہ میں سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ زیادہ مناسب رہا اور اس واقعۂ خاص میں فہم داؤد پر فہم سلیمان گویا سبقت لے گیا۔[1] فقہی اصطلاح میں حضرت داؤد کے فیصلہ کو قیاسی کہیں گے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کو "استحسانی" مگر اس قسم کی جزئی فضیلت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بحیثیت مجموعی فضائل حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام پر فضیلت رکھتے تھے۔ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجموعۂ فضائل کے اعتبار سے حضرت داؤد کی جو منقبت فرمائی ہے۔ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حصہ میں نہیں آئی۔

مقام ثانی

توراۃ اور "اسرائیلی روایات" کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی ذات قدسی صفات کی جانب ایسی مضحکہ خیز اور بے ہودہ حکایات و قصص منسوب کرتی ہیں کہ جن کو پڑھ کر ان مقدس ہستیوں کے متعلق نبی یا رسول ہونے کا تو کیا یقین ہو سکتا ہے۔ یہ بھی باور نہیں ہوتا کہ وہ بااخلاق بزرگ ہستیاں ہیں۔

بہتان طرازی کی مثال

چنانچہ ان قصص و حکایات میں سے ایک خرافی روایت حضرت داؤد علیہ السلام سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ تورات کے صحیفہ سموئیل میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ایک طویل داستان بیان کی گئی ہے جو مختصر الفاظ میں اسی کی زبانی سننے کے قابل ہے:

[1] ابن کثیر سورۂ انبیاء۔

اور شام کے وقت داؤد اپنے پلنگ پر سے اٹھ کر بادشاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگا اور چھت پر سے ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی اور وہ عورت نہایت خوبصورت تھی۔ تب داؤد نے لوگ بھیج کر اس عورت کا حال دریافت کیا اور کسی نے کہا۔ کیا وہ العام کی بیٹی بنت سبع نہیں جو حتی اوریاہ کی بیوی ہے؟ اور داؤد نے لوگ بھیج کر اسے بلایا وہ اس کے پاس آئی اور اس نے اس سے صحبت کی (کیونکہ وہ اپنی ناپاکی سے پاک ہو چکی تھی) پھر اپنے گھر کو چلی گئی اور وہ عورت حاملہ ہو گئی۔ سو اس نے داؤد کے پاس خبر بھیجی کہ میں حاملہ ہوں...... صبح کو داؤد نے یوآب کیلئے ایک خط لکھا اور اسے اوریاہ کے ہاتھ بھیجا۔ اور اسنے خط میں یہ لکھا کہ اوریاہ کو گھمسان میں سب سے آگے رکھنا اور تم اس کے پاس سے ہٹ جانا تاکہ وہ مارا جائے...... اور اس شہر کے لوگ نکلے اور یوآب سے لڑے اور وہاں داؤد کے خادموں میں سے تھوڑے سے لوگ کام آئے اور حتی اوریاہ بھی مر گیا۔ تب یوآب نے آدمی بھیج کر جنگ کا سب حال داؤد کو بتایا...... جب اوریاہ کی بیوی نے سنا کہ اسکا شوہر اوریاہ مر گیا تو وہ اپنے شوہر کیلئے ماتم کرنے لگی اور جب سوگ کے دن گزر گئے تو داؤد نے اسے بلوا کر اس کو اپنے محل میں رکھ لیا اور وہ اس کی بیوی ہو گئی اور اس سے اس کے ایک لڑکا ہوا۔ پر اس کام سے جسے داؤد نے کیا تھا خداوند ناراض ہوا۔ (سموئیل (۲) باب ۱۱۔ آیات ۲۔۲۷)

اس داستان میں حضرت داؤد علیہ السلام کا جو اخلاقی نقشہ پیش کیا گیا ہے اس کے مطالعہ کے بعد ان کو نبی اور پیغمبر تو کجا ایک صحیح اخلاق کا انسان بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ دوسرے کی بیوی پر نظر بد ڈالنا۔ اس سے ناجائز طور پر ملوث ہونا اور پھر سازش کر کے اس کے شوہر کو ناحق قتل کروا دینا انسانی زندگی کے وہ ناپاک اعمال ہیں جن کیلئے علم اخلاق کی زبان میں "بدکاری" سے کم کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۔

تورات کا تضادِ بیان

لیکن اس سے قبل کہ ہم حضرت داؤد علیہ السلام کی معصوم ہستی پر لگائے ہوئے اس بہتان کی مدلل تردید کریں خود توراہ ہی کی زبانی یہ سنانا چاہتے ہیں کہ دوسرے مقامات پر اس نے حضرت داؤد علیہ السلام کی نسبت کیا کہا ہے اور ان کی پاکدامنی اور خدارسی کا کس انداز میں ذکر کیا ہے؟

توراۃ کے صحیفۂ سموئیل میں ہے:

"تب ناتن (نبی) بادشاہ (داؤد) سے کہا: جا جو کچھ تیرے دل میں ہے کر کیونکہ خداوند تیرے ساتھ ہے۔

اور اسی رات کو ایسا ہوا کہ خداوند کا کلام ناتن کو پہنچا۔ جا اور میرے بندہ داؤد سے کہہ خداوند یوں فرماتا ہے......

سو اب تو میرے بندے داؤد سے کہہ کہ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ میں نے تجھے بھیڑ سالہ سے جہاں تو بھیڑ بکریوں کے پیچھے پیچھے پھرتا تھا۔ لیا تاکہ تو میری قوم اسرائیل کا پیشوا ہو۔

(سموئیل (۲) باب۔ آیات ۳۔۸)

اس نے میرے زور آور دشمن اور میرے عداوت رکھنے والوں سے مجھے چھڑالیا کیونکہ وہ میرے لئے نہایت زبردست تھے۔ وہ میری مصیبت کے دن مجھ پر آ پڑے پر خداوند میرا سہارا تھا۔ وہ مجھے کشادہ جگہ میں نکال لایا۔ اس نے مجھے چھڑایا اس لئے کہ وہ مجھ سے خوش تھا۔ خداوند نے میری راستی کے موافق مجھے جزادی اور میرے ہاتھوں کی پاکیزگی کے مطابق مجھے بدلہ دیا۔ کیونکہ میں خداوند کی راہوں پر چلتا رہا اور شرارت سے اپنے خداوند سے الگ نہ ہوا۔ کیونکہ اس کے سارے فیصلے میرے سامنے تھے اور میں اس کے آئین سے برگشتہ نہ ہوا۔ میں اس کے حضور کامل بھی رہا اور اپنی بدکاری سے باز رہا۔ اسلیئے خداوند نے مجھے میری راستی کے موافق بلکہ میری اس پاکیزگی کے مطابق جو اس کی نظر کے سامنے تھی بدلہ دیا۔ (سموئیل باب ۲۲ آیات ۱۸۔۲۵)

داؤد بن یسی کہتا ہے۔ یعنی یہ اس شخص کا کلام ہے جو سرفراز کیا گیا اور یعقوب کے خدا کا ممسوح اور اسرائیل کا شیریں نغمہ ساز ہے۔ خداوند کی روح نے میری معرفت کلام کیا اور اس کا سخن میری زبان پر تھا۔ (ایضاً باب ۲۳ آیات ۱۔۳)

سلیمان نے کہا تو نے اپنے خادم میرے باپ داؤد پر بڑا احسان کیا اسلیئے کہ وہ تیرے حضور راستی اور صداقت اور تیرے ساتھ سیدھے دل سے چلتا رہا۔ (سلاطین (۱) باب ۳ آیت)

سو اس (سلیمان) نے کہا خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے اپنے منہ سے میرے باپ دادا سے کلام کیا .... اور داؤد کو چنا تا کہ وہ میری قوم اسرائیل پر حاکم ہو۔ (تاریخ (۲) باب ۶ آیات ۴۔۶)

اب اے خداوند اسرائیل کے خدا اپنے بندے میرے باپ داؤد کے ساتھ اس قول کو بھی پورا کر جو تو نے اس سے کیا تھا کہ تیرے پاس میرے حضور اسرائیل کے تخت پر بیٹھنے کیلئے آدمی کی کمی نہ ہوگی۔ بشرطیکہ تیری اولاد جیسے تو میرے حضور چلتا ہے ویسے ہی میری شریعت پر عمل کرنے کیلئے اپنی راہ کی احتیاط رکھے .... (ایضاً باب ۶ آیت ۱۶)

پھر بھی میں ساری سلطنت کو نہیں چھینوں گا بلکہ اپنے بندے داؤد کی خاطر اور یروشلم کی خاطر جسے میں نے چن لیا ہے ایک قبیلہ تیرے بیٹے کو دوں گا ...... (سلاطین (۱) باب ۱۱ آیت ۱۳)

اور ایسا ہوگا کہ اگر تو ان سب باتوں کو جن کا میں تجھے حکم دوں سنے اور میری راہوں پر چلے اور جو کام میری نظر میں بھلا ہے اسکو کرے اور میرے آئین واحکام کو مانے جیسا میرے بندۂ داؤد نے کیا تو میں تیرے ساتھ رہوں گا اور تیرے لئے ایک پائیدار گھر بناؤں گا۔ جیسا میں نے داؤد کیلئے بنایا اور اسرائیل کو تجھے دوں گا۔ (ایضاً باب ۱۱، ۳۸)

یہ تمام عبارات بھی توراۃ ہی کی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد خدا کے مختار اور پسندیدہ بندے تھے۔ بلا واسطہ اس سے ہم کلام ہونے کا شرف رکھتے تھے۔ خدا کی شریعت کے کامل مطیع و فرماں بردار تھے۔ راست باز، پاکدامن اور باعفت بزرگ تھے اور خدا کے دیئے ہوئے ملک میں بنی اسرائیل کے امیر اور خلیفۃ اللہ تھے۔ ہر وقت خدا کی حفاظت و صیانت ان کی کفیل تھی۔ گویا برگزیدہ "پیغمبر" اور صاحبِ اقتدار "حکمراں" تھے۔ پس نہیں کہا جا سکتا کہ اہل کتاب توراۃ کے ان متضاد بیانات میں کس طرح تطبیق دیتے ہیں اور حضرت داؤد علیہ السلام کی

شخصیت ان کی نگاہ میں کیا وقعت رکھتی ہے؟ اگر داؤد "نبی" یا اخلاق حسنہ سے متصف "کنگ داؤد" ہیں تو حتی اور یاہ کی عورت سے متعلق داستان کا ان کے پاس کیا جواب ہے اور اگر اوریاہ کی بیوی کا واقعہ صحیح ہے تو اس مسطورہ بالا منقبت و مدحت کا استحقاق کس داؤد کو حاصل ہے؟

اس کے برعکس قرآنِ عزیز نے حضرت داؤد (علیہ السلام) کے متعلق تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے برگزیدہ رسول اور معصوم پیغمبر ہیں۔ خلیفۃ اللہ اور بنی اسرائیل کے امیر و حکمران ہیں۔ وہ کہتا ہے:

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَى بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ۝ (اسراء)

اور بلاشبہ ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوُودَ سُلَيْمَانَ نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۝

اور ہم نے داؤد کو سلیمان بخشا، داؤد اچھا بندہ ہے بلاشبہ وہ خدا کی رحمت کی جانب رجوع ہونے والا ہے

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ مِنَّا فَضْلًا (سبا)

اور بلاشبہ ہم نے داؤد کو اپنی جانب سے فضیلت بخشی۔

وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ۝ (ص)

اور ہم نے اس (داؤد) کو مضبوط ملک عطا کیا اور حکمت سے نواز اور حق و باطل کے فیصلہ کی قوت عطا فرمائی۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ (نمل)

اور بلاشبہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو "علم" سے بہرہ ور کیا اور ان دونوں نے کہا: "اس اللہ کیلئے ہر طرح کی حمد جس نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہم کو فضیلت اور برتری عطا فرمائی۔

ان تمام آیات میں حسب عادت قرآن عزیز نے کتب سابقہ کے ان خیالات کی تردید اور اصلاح فرمائی ہے جو ان کے پیرووں کی تحریف و تبدیل کی بدولت ان میں بطور معتقدات داخل ہو گئے ہیں۔ اس نے تاریخ کے اس تاریک پردہ کو چاک کر کے بتایا کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان بنی اسرائیل میں مقدس ہستیاں گزری ہیں۔ وہ خدا کے سچے نبی اور پیغمبر ہیں اور ہر قسم کے گناہ اور نافرمانیوں سے مقدس اور پاک ہیں۔

مگر افسوس اور صد ہزار افسوس کہ قرآن عزیز کے اس مقدس اعلان کے باوجود حتی اوریاہ کی بیوی کی اس خرافی داستان کو توراۃ اور اسرائیلیات سے لے کر بعض مفسرین نے قرآن عزیز کی تفسیر میں نقل کر دیا اور اسرائیلی ہفوات کو بلا دلیل و سند اسلامی روایات کی حیثیت دے دی۔

ان سادہ لوح بزرگوں نے یہ مطلق خیال نہیں فرمایا کہ جن خرافی داستانوں کو آج وہ اسرائیلی روایت کی حیثیت سے قرآن عزیز کی تفسیر میں نقل کر رہے ہیں کل وہ آیاتِ قرآنی کی تفسیر و تشریح سمجھی جا کر امت

مرحومہ کیلئے فتنہ سامانی کا باعث بنیں گی اور ان کی گمراہی کا سبب ثابت ہوں گی اور حیرت و صد حیرت ہے بعض ان جدید و قدیم متکلمین پر جنہوں نے اس قسم کی ہزلیات کو سختی کے ساتھ رد کر دینے کی بجائے ان روایات کے نیک محمل تلاش کر کے ان کو قابل قبول بنانے کی سعی نامشکور فرمائی ہے اور بے محل حسن ظن سے کام لے کر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ یہ تاویلات جو اس خرافی روایت کے بارہ میں کی جا رہی ہیں۔ ریت کی دیوار اور تارِ عنکبوت ہیں اور کسی نہ کسی اسلوب کے ساتھ اس کو تسلیم کرنے سے ''عصمت انبیاء'' جیسے اہم اور بنیادی اسلامی عقیدہ پر ضرب کاری لگتی ہے اور یہ کہ انبیاء و رسل کی جانب اس قسم کے انتساب سے جبکہ قرآن عزیز کا دامن پاک اور بے لوث ہے اور وہ اس قسم کی روایات کو بہتانِ عظیم سمجھتا ہے تو پھر کسی شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کی تفسیر میں اس قسم کی خرافات کا تذکرہ کرے۔

بہر حال ان مفسرین نے جن آیات کی تفسیر میں اس زہر ہلاہل کو ملایا ہے وہ سورۂ ص میں حضرت داؤد علیہ السلام کے اس واقعہ سے متعلق ہے۔

وَهَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ○ إِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوُوْدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ خَصْمَانِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلٰى سَوَاءِ الصِّرَاطِ ○ إِنَّ هٰذَا أَخِيْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ○ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلٰى نِعَاجِهٖ وَإِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ وَظَنَّ دَاوُوْدُ أَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّأَنَابَ ○ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَإِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَآبٍ ○ يٰدَاوُوْدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ إِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ○ (ص)

اور کیا تجھ کو ان دعوے والوں کی خبر پہنچی ہے۔ جب وہ دیوار کود کر عبادت خانہ میں گھس آئے اور داؤد کے پاس تو داؤد ان سے گھبرایا وہ بولے گھبراؤ نہیں ہم دو جھگڑ رہے ہیں۔ زیادتی کی ہے ایک نے دوسرے پر سو ہمارے درمیان انصاف کے مطابق فیصلہ کر دے اور ٹالنے والی بات نہ کرنا اور ہم کو سیدھی راہ بتا۔ یہ میرا بھائی ہے۔ اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے یہاں ایک دنبی ہے، پس یہ کہتا ہے کہ وہ ایک بھی میرے حوالہ کر دے اور مجھ سے گفتگو میں بھی تیز ہے۔ داؤد نے کہا وہ اپنی دنبیوں میں تیری ایک دنبی کو ملانے کیلئے جو سوال کرتا ہے ظلم کرتا ہے اور اکثر شریک ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں الا یہ کہ جو ایمان لائے اور عمل کیئے انہوں نے نیک اور ایسے بہت کم ہیں اور داؤد کے خیال میں گزرا کہ ہم نے اس کا امتحان لیا پس مغفرت چاہنے لگا

وہ اپنے رب سے اور گر پڑا جھک کر اور رجوع ہوا (خدا کے سامنے) پھر ہم نے اس کو وہ کام معاف کر دیا اور اس کیلئے ہمارے پاس (عزت کا) مرتبہ ہے اور اچھا ٹھکانا۔ اے داؤد ہم نے تجھ کو ملک میں (اپنا) نائب مقرر کیا ہے سو تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ حکومت کر اور نفس کی خواہش پر نہ چل کہ وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بچلتے جو لوگ اللہ کی راہ سے بچتے ہیں ان کیلئے سخت عذاب ہے۔

آیات کی باطل تفسیر

اس جگہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک امتحان کا ذکر ہے جو خدائے تعالیٰ کی جانب سے ان کو پیش آیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اول اس کو نہیں سمجھا مگر یکایک دل میں یہ خیال آیا کہ یہ منجانب اللہ ایک آزمائش ہے۔ لہٰذا فوراً ہی خدا کے برگزیدہ پیغمبروں کی طرح حق تعالیٰ کی جانب رجوع کیا۔ استغفار کیا اور درگاہِ الٰہی میں ان کا استغفار قبول ہو کر ان کی عظمت شان اور تقرب الی اللہ کا باعث بنا۔

معاملہ صرف اسی قدر تھا لیکن بعض مفسرین نے جب یہ دیکھا کہ قرآن عزیز نے اس آزمائش کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی اور توراۃ اور ''اسرائیلی روایات'' میں اوریاہ کی بیوی کی ایک داستان موجود ہے۔ جس میں حضرت داؤد سے خدا کی ناراضی کا بھی ذکر ہے تو بلا تامل اس خرافات کو اس آیت کی تفسیر بنا کر آزمائش، استغفار اور قبولِ استغفار کو اس کے ساتھ چسپاں کر دیا۔

یہ دیکھ کر جلیل القدر مفسرین اور محققین سے ضبط نہ ہو سکا اور نہوں نے روشن دلائل و براہین کے ساتھ یہ واضح کیا کہ اس خرافی روایت کا سورۂ صٓ کی ان آیات کی تفسیر سے دور کا بھی کوئی علاقہ نہیں ہے اور نہ صرف یہ بلکہ یہ پوری داستان از اول تا آخر یہودیوں کی من گھڑت اور پر از بہتان روایتیں ہیں جن کیلئے اسلامیات میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

چنانچہ حافظ عمادالدین بن کثیر اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

قد ذکر المفسرون ھٰھنا قصة اکثرھا ماخوذ من الاسرائیلیات ولم یثبت فیھا عن المعصوم حدیث یجب اتباعه۔ (تفسیر ابن کثیر سورۂ صٓ)

اس جگہ مفسروں نے ایک ایسا قصہ بیان کیا ہے بلا شبہ جس کا اکثر حصہ اسرائیلیات سے لیا گیا ہے اور اس بارے میں رسولِ اکرم ﷺ سے ایک حدیث بھی موجود نہیں ہے کہ جس کی پیروی ضروری ہو جائے۔

اور اپنی تاریخ البدایۃ والنہایۃ میں اس سے بھی زیادہ زور کے ساتھ فرماتے ہیں۔

و قد ذکر کثیر من المفسرین من السلف والخلف ھٰھنا قصصاً و اخباراً اکثرھا اسرائیلیات و منھا ما ھو مکذوب لا محالة ترکنا ایرادھا فی کتابنا قصداً اکتفاء و اقتصاراً علی مجرد تلاوۃ القصة من القراٰن العظیم وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ (جلد ۲ صفحہ ۱۳)

اور بہت سے اگلے اور پچھلے مفسرین نے اس مقام پر چند قصے اور حکایتیں نقل کی ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر

یہودیوں کی من گھڑت روایتیں ہیں اور بعض ان میں سے یقینی طور پر جھوٹی اور باطل ہیں۔ ہم نے اسلیئے ان کو قصداً بیان نہیں کیا، اور قرآن عظیم نے جس قدر واقعہ بیان کیا ہے۔ صرف اسی قدر بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے راہِ مستقیم پر چلاتا ہے۔

اور کتاب الفصل میں حافظ ابو محمد بن حزم ان آیات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

و ھذا قول صادق صحیح لا یدل علی شیء مما قالہ المستھزؤن الکاذبون المتعلقون بخرافاتٍ ولدھا الیھود۔ (الفصل فی الملل والنحل جلد ٤ صفحہ ١٤)

اور قرآن کا یہ قول سچا اور صحیح ہے اور یہ کسی طرح بھی اس روایت پر دلالت نہیں کرتا جس کو ان مسخروں کاذبوں نے بیان کیا ہے جو ایسی خرافات سے لپٹے رہتے ہیں جن کو یہود نے ایجاد کیا ہے۔

اسی طرح نسیم الریاض خفاجی نے شفاء میں قاضی عیاض نے بحر المحیط میں ابو حیان اندلسی نے تفسیر کبیر میں امام رازی نے اور دیگر محققین نے اس تمام خرافات کو مردود قرار دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ اس سلسلہ میں نبی معصوم علیہ السلام سے کوئی تفصیل منقول نہیں ہے۔

آیات کی صحیح تفاسیر

پھر ان تمام خرافات سے الگ ہو کر ان محققین نے آیات کی جو تفسیریں کی ہیں۔ وہ یا صحیح آثارِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہیں اور یا قرآن عزیز کے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھ کر ذوقِ سلیم کے ذریعہ کی گئی ہیں۔ اسلیئے یہ صحیح اور قابلِ توجہ ہیں۔

۱ علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ دو شخص اچانک محراب داؤد میں داخل ہو گئے جہاں حضرت داؤد علیہ السلام عبادتِ الٰہی میں مشغول تھے اور چونکہ ان دونوں کا معاملہ حقیقی اور واقعی تھا اور ان کو اس کے طے کرانے میں عجلت تھی۔ اسلیئے وہ دیوار پھاند کر چلے آئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعی کا بیان سن کا تذکیر و وعظ کے پیشِ نظر اول زمانے کے فساد، حال کا ذکر کیا اور فرمایا کہ زیر دستوں پر اربابِ قوت کے مظالم کا ہمیشہ یہ حال رہا ہے کہ وہ ان کی زندگی کو صرف اپنی راحت کا ایک آلہ سمجھتے رہے ہیں اور یہ بہت ہی بڑی بات ہے۔ البتہ خدا کے مومن بندے جو نیکوکار بھی ہیں۔ ایسے مظالم سے بچتے اور خدا کا خوف کرتے ہیں۔ مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام نے انصاف پر مبنی فیصلہ کر کے قضیہ کو ختم کر دیا۔ جب فریقین چلے گئے۔ تو حضرت داؤد علیہ السلام کے بلند احساسات نے ان کے قلب و دماغ کو ادھر متوجہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم الشان حکومت اور بے نظیر سطوت جو ان کو بخشی ہے در حقیقت یہ ان کیلیئے بہت بڑی آزمائش ہے اور امتحان ہے۔ اس امر کا کہ ذاتِ واحد نے اپنی اس کثیر مخلوق پر مجھ کو جو عزت و بلندی عطا فرمائی ہے۔ اس سے متعلق عائد شدہ فریضہ کو میں کہاں تک صحیح طور پر انجام دیتا اور خدا کی اس نعمت کا اپنی عملی زندگی سے کس طرح شکر ادا کرتا ہوں؟

چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام پر اس وجدانی کیفیت کا اس قدر اثر پڑا کہ وہ فوراً درگاہِ الٰہی میں سر بسجود ہو گئے اور

طلب مغفرت کرتے ہوئے اعتراف کرنے لگے کہ خدایا! اس عظیم المرتبت ذمہ داری سے سبکدوش ہونا بھی میری اپنی طاقت سے باہر ہے جب تک کہ تیری اعانت شامل حال نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ عمل پسند آیا اور اس کی مغفرت نے ان کو اپنی آغوش میں ڈھانپ لیا۔

ابن حزم اس تفسیر کے بعد فرماتے ہیں کہ "استغفار" خدا کی درگاہ میں ایسا محبوب عمل ہے کہ اس کیلئے ہرگز یہ ضروری نہیں کہ اسے پہلے گناہ اور معصیت وجود میں آئے اور پھر اسکے رد عمل کے طور پر طلب مغفرت کی جائے۔ یہ وجہ ہے کہ "استغفار" ملائکۃ اللہ سے بھی ثابت ہے۔ حالانکہ قرآن عزیز نے تصریح کی ہے کہ ملائکۃ اللہ کی شان یہ ہے لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (وہ خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے) چنانچہ قرآن عزیز نے فرشتوں کے استغفار کا اس طرح ذکر کیا ہے:

وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ

اور وہ فرشتے استغفار کرتے ہیں مومنوں کیلئے (اور کہتے ہیں) ہمارے پروردگار تو ہر شے پر اپنی رحمت اور اپنے علم سے چھایا ہوا ہے تو بخش دے ان کو جو تیری جانب رجوع ہوتے ہیں اور تیری راہ کی پیروی کرتے ہیں۔

ابن حزم کی اس تفسیر کی تائید میں ہم اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زیر بحث واقعہ مین قرآن عزیز نے ان کے عصیان اور گناہ کے مطلق کوئی تذکرہ نہیں کیا بلکہ فَتَنّٰهُ کہہ کر صرف یہ بتایا ہے کہ ان کو کسی آزمائش میں ڈال دیا گیا اور آزمائش کیلئے ہرگز یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی گناہ اور خطا سے ہی متعلق ہو جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ امتحان کا معاملہ پیش آیا۔ لہٰذا حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ معاملہ بھی کسی معصیت یا گناہ سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ پیغمبرانہ شان کے مطابق احساسِ فرض اور خدا کے حضور میں اپنی عبودیت و بے چارگی کا بہترین مظاہرہ تھا۔

قرآن عزیز کی زیر بحث آیات کے معانی و مطالب اگرچہ اس تفسیر کے متحمل ہیں اور اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کی پیغمبرانہ جلالت شان اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے تاہم یہ تفسیر اجتہادی ہے اس لئے کہ اس میں آزمائش کی جو صورت بیان کی گئی ہے۔ وہ آیت یا کسی حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ صرف اجتہاد سے تعلق رکھتی ہے۔

۴ ابو مسلم نے ان آیات کی تفسیر میں کہا ہے کہ داؤد علیہ السلام کے سامنے جب دو شخصوں نے بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ کے اپنا قضیہ پیش کیا تو حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعا علیہ کو جواب دہی کو موقعہ دیئے بغیر فقط مدعی کا بیان سن کر اپنی نصیحت میں اس قسم کی باتیں فرمائیں کہ جن سے فی الجملہ مدعی کی تائید ہوتی تھی اور چونکہ یہ طریق عام حالات میں انصاف کے خلاف تھا۔ اس لئے حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ ارشاد اگرچہ صرف ناصحانہ انداز میں تھا اور ابھی قضیہ کے انفصال کی نوبت نہیں آئی تھی۔ تاہم ان جیسے جلیل القدر پیغمبر کے شایانِ شان نہیں تھا۔ لہٰذا یہ تھا وہ "فتنہ" جس میں حضرت داؤد علیہ السلام پڑ گئے۔

مگر جب کہ اس قسم کی لغزشوں پر خدائے تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو فوراً متنبہ کر دیتا ہے تو حضرت داؤد

علیہ السلام کو بھی معاً تنبہ ہوا کہ ان سے قضیہ زیر بحث میں لغزش ہو گئی اور ان کیلئے یہ ابتلا اور آزمائش ہے اسلئے وہ خدا کی درگاہ میں طالب مغفرت ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو شرف قبولیت سے نوازا بلکہ ان کے اس پسندیدہ عمل کی وجہ سے ان کی رفعت شان کو اور زیادہ بلند کر دیا۔[1]

ہم اس توجیہ پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو نصیحت فرمائی کہ داؤد! تم دنیا کے عام حاکموں اور بادشاہوں کی طرح نہیں ہو جو اکثر و بیشتر حق و انصاف سے بے پرواہ ہو کر خدا کی مخلوق پر محض ہواءِ نفس اور ذاتی غرض کی تکمیل کیلئے حکومت کرتے ہیں۔ تم خدا کی زمین میں اس کی جانب سے نائب "خلیفہ" ہو اور خدمتِ خلق تمہاری حیاتِ طیبہ کا طغرائے امتیاز، اسلیئے تمہارا فرض ہے کہ ہر لمحہ حق و انصاف کو پیش نظر رکھو اور اس معاملہ میں کسی قسم کی بھی لغزش نہ ہونے دو اور صراطِ مستقیم ہی کو اپنی شاہراہ سمجھو، لہٰذا قرآن عزیز نے اسی حقیقت کے اظہار کیلئے آیاتِ زیر بحث کے بعد اس آیت کو بیان کیا یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ (الآیۃ)

ان ہر دو توجیہات میں دونوں مفسروں نے تصریح کی ہے کہ یہ قضیہ فرضی نہ تھا بلکہ حقیقت پر مبنی تھا اور فریقین ملائکۃ اللہ نہ تھے بلکہ انسان تھے کیونکہ قرآن عزیز کا تبادر یہی ظاہر کرتا ہے۔

آیات زیر بحث کی یہ توجیہ بھی اگرچہ استنباط و اجتہادِ نظر سے تعلق رکھتی ہے تاہم آیات کے نظم و ربط کے ساتھ بہت زیادہ مطابق ہے اور اسلئے مفسرین کی نگاہ میں بہت زیادہ مقبول ہے۔

لیکن گزشتہ ہر دو توجیہات میں جدا جدا ایک خلش ہے جو قابل غور ہے، پہلی توجیہ میں ربطِ آیات کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آیات کی بیان کردہ اس توجیہ کو تسلیم کر لیا جائے جو ابن حزم نے بیان کی ہے تو پھر اگلی آیت یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ (الآیۃ) کا آیاتِ زیر بحث کے ساتھ کوئی تعلق اور ربطِ نظر نہیں آتا کہ اس موقع پر حضرت داؤد علیہ السلام کی ایک ایسی اہم فضیلت کے ذکر کے کیا معنی ہیں جو قرآن عزیز میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد انبیاء و رسل میں سے صرف ان ہی کیلئے بیان کی گئی۔

اور ابو مسلم کی توجیہ میں یہ خلش پیدا ہوتی ہے کہ جبکہ فصلِ مقدمات میں دنیوی حکام اور بادشاہوں کے یہاں بھی یہ مسلّم ہے کہ ہمیشہ فیصلہ فریقین کے بیانات سننے کے بعد ہونا چاہئے بلکہ یوں کہئے کہ یہ طریق کار جبکہ ایک طے شدہ فطری مسئلہ ہے تو حضرت داؤد علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کے متعلق یہ کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مدعیٰ علیہ کا بیان سنے بغیر ہی مدعی کے حق میں فیصلہ دے دیا یا اپنے رجحانِ طبع کا اظہار کر دیا۔ یہ کوئی ایسی باریک اور دقیق بات نہیں ہے کہ جو حسب اتفاق حضرت داؤد علیہ السلام کے فہم و ادراک میں نہ آئی اور اس بارہ میں ان سے لغزش ہو گئی۔

لہٰذا ان ہر دو توجیہات سے جدا ہمارے نزدیک آیات کی بہتر توجیہ و تفسیر وہ ہے جو نظمِ کلام، ربطِ آیات اور سیاق سباق میں مطابقت کے لحاظ سے بھی صحیح ہے اور جس کی بنیاد حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے ایک "اثر" پر قائم ہے۔

---

[1] روح المعانی جلد ۲۳ صفحہ ۱۶۸۔

۳) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے تقسیم کار کے پیش نظر اپنے معمولات کو چار دنوں پر اس طرح تقسیم کر دیا تھا۔ ایک دن خالص عبادتِ الٰہی کیلئے۔ ایک دن فصلِ مقدمات کیلئے، ایک خالص ذات کیلئے اور یک بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کیلئے عام تھا۔

(روح المعانی جلد ۲۳ صفحہ ۱۶۴)

لیکن تقسیم ایام کی اس تفصیل میں اس حصہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی جو عبادتِ الٰہی کیلئے مخصوص تھا۔ اسلئے کہ یوں تو حضرت داؤد علیہ السلام کا کوئی دن بھی عبادتِ الٰہی سے خالی نہ تھا۔ مگر ایک دن کو انہوں نے صرف اسی کیلئے مخصوص کر لیا تھا اور اس میں دوسرا کوئی کام انجام نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ قرآن عزیز ان کے اس وصف کو اِنَّهٗ اَوَّابٌ کہہ کر نمایاں کرتا ہے۔

نیز قرآن عزیز اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام حجرہ بند کر کے عبادت اور تسبیح و تحمید کیا کرتے تھے تاکہ کوئی خلل انداز نہ ہو سکے۔ گویا تقسیم ایام میں صرف یہی ایک دن ایسا تھا جس میں حضرت داؤد علیہ السلام تک کسی کا پہنچنا سخت دشوار تھا اور بنی اسرائیل سے ان کا تعلق منقطع ہو جاتا تھا اور باقی ایام میں اگر کوئی خاص ہنگامی صورت پیش آ جائے تو حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ واسطہ باقی رہتا تھا اور وہ اپنے معاملات کو ان کی جانب رجوع کر سکتے تھے۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عبادتِ الٰہی اور خدا کی تسبیح و تہلیل ایک مسلمان کا مقصدِ حیات ہے تاہم خدائے تعالیٰ نے جن ہستیوں کو اپنی مخلوق کی رشد و ہدایت اور خدمت خلق کیلئے چن لیا ہے ان کیلئے ''کثرت عبادت'' کے مقابلہ میں ''ادائیگی فرض میں انہماک'' عند اللہ زیادہ محبوب اور پسندیدہ عمل ہے۔ بے شبہ ایک صوفی اور مرتاض عابد و زاہد جس قدر بھی گوشہ گیر اور خلوت پذیر ہو کر عبادات میں مشغول رہتا ہے ''منصب ولایت'' کے درجات کو اسی قدر زیادہ حاصل کرتا رہتا ہے۔ بخلاف ''منصبِ نبوت'' و ''منصبِ خلافت کے کہ خدائے تعالیٰ کی جانب سے اس کی موہبت و عطا کی غرض و غایت مخلوق کی رشد و ہدایت اور ان کی خدمت و صیانت ہے۔ اسلئے اس کا کمال مخلوق کے ساتھ رشتہ و تعلق قائم کر کے احکامِ الٰہی کو سربلند کرنا ہے نہ کہ خلوت گزیں ہو کر ''صوفی'' بننا۔

لہٰذا حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ تقسیم ایام اگرچہ زندگی کے نظم اور تقسیم عمل کے لحاظ سے ہر طرح قابل ستائش تھی، لیکن اس میں ایک دن کو عبادتِ الٰہی کیلئے اس طرح خاص کر لینا کہ ان کا تعلق مخلوقِ خدا سے منقطع ہو جائے ''منصبِ نبوت'' اور ''منصبِ خلافت کے منافی تھا اور'' حضرت داؤد علیہ السلام جیسے اولوا العزم پیغمبر اور خلیفۃ اللہ کیلئے کسی طرح موزوں نہ تھا۔ اس لئے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک گوشہ نشین عابد و زاہد اور مرتاض کی حیثیت سے نہیں نوازا تھا۔ بلکہ ان کو نبوت اور خلافت بخش کر مخلوق کی دینی و دنیوی ہر قسم کی خدمت و ہدایت کیلئے مبعوث فرمایا تھا اور اس طرح ان کی حیات طیبہ کا شاہکار ''ہدایتِ خلق'' اور ''خدمتِ خلق'' تھا نہ کہ ''کثرت عبادت''۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اس روش کو ختم کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح آزمائش (فتنہ) میں مبتلا کر دیا کہ دو شخص جن کے درمیان ایک خاص مناقشہ تھا۔ عبادت کے مخصوص دن میں حجرہ کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اچانک خلاف عادت اس طرح دو

انسانوں کو موجود پایا تو بہ تقاضائے بشری گھبرائے گئے۔ دونوں نے صورتِ حال کا اندازہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ آپ خوف نہ کریں۔ ہمارے اچانک اس طرح داخل ہونے کی وجہ یہ قضیہ ہے اور ہم اس کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ تب حضرت داؤد علیہ السلام نے واقعات کو سنا اور مسطورۂ بالا نصیحت فرمائی۔

قرآن عزیز نے اس مقام پر قضیہ کے عام پہلوؤں کو نظرانداز کر دیا کیونکہ وہ ہر فہم رسا میں خود بخود آجاتے ہیں کہ داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بلاشبہ حق کے مطابق ہی رہا ہوگا اور اس نے صرف اسی پہلو کو نمایاں کیا جس کا تعلق "رشد و ہدایت" سے تھا۔ یعنی زبردستوں کا زیردستوں کے ساتھ ظلم کرنا۔

غرض فریقین کا فیصلہ کرنے کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کو فوراً تنبہ ہوا کہ مجھ کو خدائے تعالیٰ نے اس آزمائش میں کس لئے ڈالا ہے اور وہ حقیقتِ حال کو سمجھ کر خدا کی درگاہ میں سربسجدہ ہوئے اور استغفار کیا اور اللہ تعالیٰ نے استغفار کو شرفِ قبولیت عطا فرما کر ان کی عظمت کو اور دوبالا کر دیا اور پھر یہ نصیحت فرمائی کہ "اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں اپنا "خلیفہ" بنا کر بھیجا ہے اسلئے تمہارا فرض ہے کہ خدا کی اس نیابت کا پورا پورا حق ادا کرو اور یہ خیال رکھو کہ اس راہ میں عدل و انصاف بنیادی کار رہے اور صراطِ مستقیم سے ہٹ کر کبھی بھی افراط و تفریط کی راہ کو اختیار نہ کرو۔

۴) قیاس واجتہاد یا آثار صحابہ سے استنباط پر مبنی گزشتہ توجیہات سے جدا مشہور محدث حاکم نے مستدرک میں خود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ان آیات کی تفسیر نقل کی ہے اور محدثین نے اس روایت کو صحیح اور حسن تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا بلاشبہ اس کو مسطورۂ بالا توجیہات پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ایک مرتبہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں ازراہِ فخر عرض کیا: یا رالٰہا! دن اور رات میں ایک ساعت بھی ایسی نہیں گزرتی کہ داؤد یا آل داؤد میں سے کوئی شخص ایک لمحہ کیلئے بھی تیری تسبیح و تہلیل میں مشغول نہ رہتا ہو۔
>
> اللہ تعالیٰ کو اپنے مقرب پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ فخریہ انداز پسند نہ آیا۔ وحی آئی داؤد! یہ جو کچھ بھی ہے صرف ہماری اعانت اور ہمارے فضل و کرم کی وجہ سے ہے ورنہ تجھ میں تیری اولاد میں یہ قدرت کہاں کہ وہ اس نظم پر قائم رہ سکیں وراب جبکہ تم نے یہ دعویٰ کیا ہے تو میں تم کو آزمائش میں ڈالوں گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا: خدایا جب ایسا ہو تو پہلے سے مجھ اطلاع دی دے جائے لیکن آزمائش کے معاملہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کی استدعا قبول نہیں ہوئی اور حضرت داؤد علیہ السلام کو اس طرح فتنہ میں ڈال دیا گیا جو قرآن عزیز میں مذکور ہے۔
>
> (مستدرک جلد ۲ صفحہ ۴۳۳)

یعنی حضرت داؤد علیہ السلام اس قضیہ کے فیصلہ دینے میں تسبیح و تحمید سے محروم ہو گئے اور حسب اتفاق آلِ داؤد میں سے بھی اس وقت کوئی عبادتِ الٰہی میں مصروف نہ تھا۔

اس تفسیر کا بھی حاصل یہ نکلتا ہے کہ بمصداق "حسنات الابرار سیئات المقربین" نہ یہ کوئی گناہ کا معاملہ تھا اور نہ معصیت کا بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کے شایانِ شان نہیں تھا۔ اسلئے ان کو اللہ تعالیٰ کی

جانب سے متنبہ کر دیا گیا۔

غرض قرآن عزیز کی ان آیات کی تفاسیر میں علماء محققین نے جو کچھ کہا ہے یا وہ قابل تسلیم ہے اور یا ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباس کی تفسیر حقیقی تفسیر ہے۔ مگر یہودیوں کی خرافات اور ہفوات کا ان آیات سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

عمر مبارک

مشہور محدث حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں ایک روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے:

> حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عالم بالا میں جب حضرت آدم کی صلب سے ان کی ذریت کو نکال کر ان کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے ایک خوبصورت چمکتی پیشانی والے شخص کو دیکھ کر دریافت کیا۔ پروردگار یہ کون شخص ہے؟ جواب ملا تمہاری ذریت میں سے بہت بعد میں آنے ولی ہستی داؤد ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا اس کی عمر کیا مقرر کی گئی ہے؟ ارشاد ہوا کہ ساٹھ سال۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا۔ الٰہی میں اپنی عمر کے چالیس سال اس نوجوان کو بخشتا ہوں۔ مگر جب حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کا وقت آ پہنچا تو آدم علیہ السلام نے ملک الموت سے کہا کہ ابھی تو میری عمر کے چالیس سال باقی ہیں۔ فرشتۂ موت نے کہا آپ بھول گئے، آپ نے اس قدر حصۂ عمر اپنے ایک بیٹے داؤد کو بخش دیا ہے۔ الخ (مستدرک جلد ۲ کتاب التاریخ)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد کی عمر سو سال کی ہوئی اور تورات کے باب سلاطین اور تواریخ میں ہے کہ حضرت داؤد نے کہن سالی میں انتقال فرمایا اور اسرائیلوں پر چالیس سال حکومت کی۔

> "اور داؤد بن ایشی نے سارے اسرائیلیوں پر سلطنت کی اور وہ عرصہ جس میں اس نے اسرائیل پر سلطنت کی چالیس برس کا تھا۔ اس نے حبرون میں سات برس اور یروشلم میں پینتیس برس سلطنت کی اور اس نے بڑھاپے میں خوب عمر رسیدہ ہو کر اور دولت و عزت سے آسودہ کر وفات پائی۔ (تواریخ اباب ۲۹۔ آیات ۲۶۔۲۸)

اور جعفر بن محمد کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ستر سال حکومت کی[1] اور حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا انتقال اچانک سبت کے دن ہوا۔ وہ سبت کے روز مقررہ عبادت میں مشغول تھے اور پرندوں کی ٹکڑیاں پرے باندھے ہوئے ان پر سایہ فگن تھیں کہ اچانک اسی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (فیض الباری جلد ۲ کتاب الانبیاء)

مدفن

تورات میں مذکور ہے:

[1] مستدرک جلد ۲۔ کتب التاریخ۔

''اور داؤد اپنے باپ دادا کے ساتھ سو گیا اور ''داؤد کے شہر ''صیہون میں دفن ہوا''۔
(سلاطین (۱) باب ۲ آیت ۱۱)

بصائر

حضرت داؤد علیہ السلام کی مقدس زندگی کے حالات وواقعات نے ہمارے لئے جن بصیرتوں اور عبرتوں و پیش کیا ہے وہ اگرچہ بہت وسیع دائرہ رکھتی ہیں تاہم چند اہم حقائق اور بیش بہا نتائج خصوصیت کے ساتھ جاذب توجہ ہیں۔

۱) جب خدائے تعالیٰ کسی ہستی کو اولوالعزم بناتا اور اس کی شخصیت کو خاص فضائل سے سرفراز کرنا چاہتا ہے تو اس کے فطری جوہروں کو شروع ہی سے چمکا دیتا ہے اور اس کی ناصیہ قسمت ایک چمکتے ہوئے ستارے کی طرح روشن نظر آنے لگتی ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کو جبکہ پیغمبر اور اولوالعزم رسول بنانا تھا تو زندگی کے ابتدائی دور ہی میں جالوت جیسے جابر و قاہر بادشاہ کو ان کے ہاتھ سے قتل کرا کر ان کی ہمت و شجاعت اور کے عزم راسخ اور ثبات قدمی کے جوہر اس طرح نمایاں کر دیئے کہ تمام بنی اسرائیل انکو اپنا محبوب قائد اور مقبول رہنما تسلیم کرنے لگے۔

۲) بسا اوقات ہم ایک چیز کو معمولی سمجھ لیتے ہیں لیکن حالات و واقعات بعد میں ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ''بے بہا شے'' ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بچپن کے حالات میں اور مجاہدانہ حمایت حق، اعتصام باللہ کے ساتھ دعوت حق اور سرفرازی نبوت کے حالات کے درمیان جو فرق ہے وہ خود اس دعوے کی شہادت ہے۔

۳) ہمیشہ ''خلیفۃ اللہ'' اور ''طاغوتی بادشاہ'' کے درمیان یہ فرق نظر آئے گا کہ اول الذکر میں ہمہ قسم کی سطوت و شوکت کے باوجود فروتنی، تواضع اور خدمتِ خلق نمایاں خدوخال کے ساتھ پائے جائیں گے اور ثانی الذکر میں کبر، انانیت، جبر اور قہرمانیت کا غلبہ ہوگا اور وہ مخلوقِ خدا کو اپنی راحت اور عیش کا آلۂ کار سمجھے گا۔

۴) قانونِ الٰہی ہے کہ جو ہستی عزت اور عروج پر پہنچنے کے بعد جس قدر خدا کا شکر اور اس کے فضل و کرم کا اعتراف کرتی ہے اسی قدر اس کو بیش از بیش انعام واکرام سے اور زیادہ نوازا جاتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی پوری زندگی اس کی شاہد عدل ہے۔

۵) مذہب اور دین اگرچہ روحانیت سے زیادہ تعلق رکھتا ہے لیکن مادی طاقت (خلافت) اسکی بڑی پشت پناہ ہے۔ یعنی دین و ملت دینی و دنیوی اصلاحِ حال کا کفیل ہے اور خلافت و طاقت اس کے بتائے ہوئے نظام عدل کی محافظ، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ قول بہت مشہور ہے:

ان اللّٰہ لیزع بالسلطان مالا یزع بالقران۔ (البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ صفحہ ۱۰)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ صاحبِ طاقت (خلیفہ) کے ذریعہ مدافعت کا وہ کام لیتا ہے جو قرآن کریم کے ذریعہ انجام نہیں پاتا۔

۶) اللہ تعالیٰ نے عطاءِ ملک و حکومت کیلئے قرآن عزیز کی مختلف آیات میں جو ارشاد فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان کو یہ یقین پیدا کرنا چاہئے کہ ملک اور حکومت کی عطا اور اس کا سلب صرف خدائے تعالیٰ کے ید قدرت میں ہے۔ چنانچہ دنیا کے بڑے بڑے شاہنشاہوں اور با جبروت سلاطین کی تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے کہ:

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○
(آل عمران)

خدایا! شاہی اور جہانداری کے مالک! تو جسے چاہے ملک بخش دے جس سے چاہے ملک لے لے، جسے چاہے عزت دے دے، جسے چاہے ذلیل کر دے، تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے، بے شبہ تو ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

لیکن اس نے اس بخشش و عطاء اور سلب و نزع کا ایک قانون مقرر کر دیا ہے جس کو سنۃ اللہ سے تعبیر کرنا مناسب ہے۔

قانون یہ ہے کہ اقوام و امم کو حکومت و سلطنت دو طرح حاصل ہوتی ہے۔ ایک "وراثت الٰہی" کی معرفت اور دوسری "دنیوی اسباب و وسائل" کی معرفت، پہلی صورت میں کسی قوم کو جب حکومت عطاء ہوتی ہے کہ اس کے عقائد و اعمال میں پوری طرح وراثت الٰہی کار فرما ہو یعنی خدائے تعالیٰ کے ساتھ اس کا رشتہ عقیدت بھی صحیح اور استوار ہو اور وہ انفرادی و اجتماعی اعمال میں بھی صلاح و خیر کے اس درجہ پر فائز ہو کہ قرآن عزیز کی اصطلاح میں اس کو "صالحین" میں شمار کیا جا سکے۔

یہ قوم بے شبہ اس کی مستحق ہے کہ وہ خدا کے اس انعام سے بہرہ ور ہو جس کا عنوان "خلافت الٰہیہ" ہے، اور جو درحقیقت دنیا میں خدائے تعالیٰ کی نیابت کا مظہر اور انبیاء و رسل کی پاک وراثت ہے۔ خدا کا وعدہ ہے کہ جو قوم بھی عقائد و اعمال میں انبیاء و رسل کی وراثت سے فیض یاب ہے اوہ وراثت ارضی کی بھی مالک ہو گی اور اگر دنیوی اسباب و وسائل کے پہاڑ بھی اس حصول کے درمیان حائل ہوں گے تو ان سب کو ریزہ ریزہ کر کے خدائے تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ ○

اور ہم نے بے شبہ زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا کہ خدا کی زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔

اور آیت:

إِنَّ الْأَرْضَ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ

بے شک زمین اللہ کی ہی ملکیت ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اسے وارث بنا دیتا ہے۔

میں اس کی مشیت کا یہ فیصلہ ہے کہ زمین کی وراثت ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو اسکے "صالح بندے" ہیں

اور اگر کسی قوم یا امت میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے تو خواہ وہ مدعی اسلام ہی کیوں نہ ہو تو اس کو وراثت ارض نصیب نہیں ہو سکتی اور "خلافت الہیہ" اس کا حق نہیں بن سکتی ہے اور نہ اس قوم کی عظمت و عزت کیلئے خدا کے پاس کوئی وعدہ ہے۔ البتہ خدا کی مشیت اپنی حکمت و مصلحت کے پیش نظر کائنات کے نظم و انصرام کی خاطر جس کو چاہتی ہے حکومت عطا کر دیتی ہے اور جس سے چاہتی ہے سلب کر لیتی ہے اور اس عطا و سلب میں اس کا قانون قدرت اسی طرح کار فرما رہتا ہے جس طرح اسباب کو مسببات کے ساتھ پیوند لگانے میں کار فرما ہے اور اس عطاء و نزع کیلئے اس قدر مختلف اور بے شمار مصالح ہوتے ہیں کہ انسان ان کی حقیقت تک رسائی سے عاجز ہے اور اس سلسلہ کی سب سے بھیانک اور بد بخت صورت یہ ہے کہ مسلمان "غلام و محکوم" ہوں اور کافر و مشرک کی حکومت ان پر "ہیئت حاکمہ اور صاحب اقتدار" ہو۔ گویا یہ خدا کا ایسا عقاب و عتاب ہے جو مسلمانوں کیلئے بد اعمالیوں اور صلاح و خیر کی استعداد کے فقدان کی وجہ سے منصۂ شہود پر آتا ہے اور اس حالت میں مقام عبرت یہ ہوتا ہے کہ صاحب تاج و تخت کو اسلئے حکومت نہیں دی جاتی کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہے بلکہ اسلئے عطا کی جاتی ہے کہ زمین کی ملکیت کے حقیقی وارثوں نے اپنی بد کرداریوں کی وجہ سے استحقاق وراثت کو ہاتھ سے کھو دیا اور اب کائنات کے مصالح عامہ کے پیش نظر حکومت کیلئے نہ مسلم کی شرط ہے نہ کافر و مشرک کی۔

وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ

اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنا ملک بخش دیتا ہے

اور اگر مسلمان چشم عبرت وا کریں اور اپنی فاسد زندگی میں انقلاب برپا کر کے "صالحین" کا طغرائے امتیاز حاصل کر لیں تو خدا کا وعدہ بھی ان کو بشارت دینے کیلئے آگے بڑھتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا

وعدہ کر لیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان والے ہیں اور کیئے ہیں انہوں نے نیک کام البتہ بعد کو حاکم کر دے گا ان کو ملک میں، جیسا حاکم کیا تھا ان کے اگلوں کو اور جما دے گا۔ ان کیلئے دین جو پسند کر لیا ان کے واسطے اور دے گا ان کو ان کے خوف کے بدلے امن۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

- نسب
- بچپن
- نبوت
- منطق الطیر
- تسخیر جن وحیوانات
- تانبے کے چشمے
- لشکر سلیمان اور وادی نملہ
- چند قابل تحقیق مسائل
- ملکۂ سبا کا نام
- ملکۂ سبا کا تخت
- توراۃ میں ملکۂ سبا کا ذکر
- ملکۂ سبا کے ساتھ حضرت سلیمان کا نکاح
- حضرت سلیمان کے مکتوب کا اعجاز
- حضرت سلیمان کی وفات
- قرآن عزیز اور ذکرِ سلیمان
- وراثت داؤد
- خصائص سلیمان
- تسخیر ریاح
- بیت المقدس کی تعمیر
- حضرت سلیمان اور جہاد کے گھوڑوں کا واقعہ (محاکمہ)
- حضرت سلیمان اور ملکۂ سبا
- سبا کی تحقیق
- ہدہد
- عِندَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ کی شخصیت
- ملکۂ سبا کا قبولِ اسلام
- اسرائیلیات
- حضرت سلیمان کے ساتھ بنی اسرائیل کا معاملہ
- بصائر

نسب

حضرت سلیمان ، حضرت داؤد کے صاحبزادے ہیں۔ اسلئے ان کا نسب بھی یہودا کے واسطہ سے حضرت یعقوب (اسرائیل) تک پہنچتا ہے۔

ان کی والدہ ماجدہ کا نام معلوم نہیں ہو سکا، تورات نے بنتِ سبع نام بتایا ہے لیکن اس طرح کہ وہ اول اوریاہ کی بیوی تھی اور پھر داؤد کی بیوی بنی اور حضرت سلیمان اس سے پیدا ہوئے۔ مگر اس قصہ کی لغویت گزشتہ صفحات میں واضح ہو چکی ہے۔ اسلئے ہی نام بھی تاریخی حیثیت سے صحیح نہیں ہے۔

ابن ماجہ کی ایک حدیث میں صرف اس قدر منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ سلیمان بن داؤد کی والدہ نے ایک دفعہ سلیمان کو یہ نصیحت فرمائی: بیٹا رات بھر نہ سوتے رہا کرو اسلئے کہ رات کے اکثر حصہ کو نیند میں گذارنا انسان کو قیامت کے دن اعمالِ خیر سے محتاج بنا دیتا ہے۔

قرآنِ عزیز نے بھی صرف اس قدر بتایا ہے کہ وہ حضرت یعقوب ؑ کے واسطے سے حضرت ابراہیم ؑ کی نسل سے ہیں۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوْبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمَانَ (الانعام)

اور ہم نے اس (ابراہیم) کو بخشے اسحٰق و یعقوب، ہم نے ہر ایک کو ہدایت دی اور نوح کو ہدایت دی اس (ابراہیم) سے پہلے اور اس ابراہیم کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان کو ہدایت دی۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمَانَ (ص)

اور ہم نے داؤد کو سلیمان دیا۔

قرآن عزیز اور ذکر سلیمان

قرآن عزیز میں حضرت سلیمان ؑ کا ذکر سولہ جگہ آیا ہے ان میں سے چند جگہ کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اور اکثر جگہ مختصر طور پر ان انعامات اور فضل و کرم کا تذکرہ ہے جو خدا کی جانب سے ان پر اور انکے والد حضرت داؤد ؑ پر نازل ہوتے رہے۔

ذیل کا نقشہ اس سلسلہ کے مطالعہ کیلئے مفید ہے:

سورۃ	آیۃ	شمار	سورۃ	آیۃ	شمار
بقرہ	۱۰۲	۱	نمل	۱۵،۱۶،۱۷،۱۸،۲۰،۳۶،۴۴	۷
نساء	۱۶۳	۱	سبا	۱۲	۱
انعام	۸۵	۱	صٓ	۳۰۔۳۴	۲
انبیاء	۷۸۔۷۹۔۸۱	۳			۱۶

بچپن

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان ؑ میں ذکاوت اور فصلِ مقدمات میں اصابتِ رائے کا کمال فطرت ہی سے ودیعت کر دیا تھا چنانچہ ان کے بچپن کا وہ واقعہ اس کیلئے روشن برہان ہے جو حضرت داؤد ؑ کے واقعات کے ضمن میں قرآنِ عزیز سے نقل کیا جا چکا ہے۔[1]

حضرت داؤد نے ان کے اس جوہر کو پہچان لیا تھا اسلئے بچپن ہی سے انکو امورِ مملکت میں شریک کار رکھتے تھے۔ خصوصاً فصلِ مقدمات میں ان سے ضرور مشورہ فرمالیا کرتے تھے۔

[1] آیت "وداود و سلیمن اذ یحکمان فی الحرث اذ نفشت فیه غنم القوم" (الآیۃ) کی جانب اشارہ ہے۔

وراثت داؤد علیہ السلام

مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سن رشد کو پہنچ چکے تھے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا انتقال ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت اور حکومت دونوں میں داؤد علیہ السلام کا جانشین بنا دیا اور اس طرح فیضان نبوت کے ساتھ ساتھ اسرائیلی حکومت بھی ان کے قبضہ میں آ گئی۔ قرآن عزیز نے اسی جانشینی کو وراثت داؤد سے تعبیر کیا ہے:

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُوْدَ (نمل)

اور سلیمان داؤد کا وارث ہوا۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہاں وراثت سے نبوت و سلطنت کی وراثت مراد ہے۔ مالی وراثت مراد نہیں ہے ورنہ حضرت داؤد کی اور بھی بہت سی اولاد تھی وہ کیوں محروم رہتی نیز صحاح ستہ میں متعدد جلیل القدر صحابہ سے یہ روایت منقول ہے:

ان رسول اللہ ﷺ قال نحن معشر الانبیاء لا نورث ما ترکنا فھو صدقۃ۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہم جماعت انبیاء کی وراثت مالی کا سلسلہ نہیں چلتا اور ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہو جاتا ہے۔

یہ روایت صراحت کرتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی وفات کے بعد ان کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا بلکہ وہ مساکین اور فقراء کا حق ہے اور خدا کے نام پر صدقہ ہے۔

دراصل نبی کی فطرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ مال جیسی حقیر شے پر ان کی وراثت کا انتساب ہو۔ اسلئے کہ جن ہستیوں کا مقصدِ حیات تبلیغ و ارشاد اور راہِ خدا کی دعوت ہو وہ کب یہ گوارا کر سکتی ہیں کہ علوم و فیوض نبوت کے علاوہ ایک ادنیٰ شے ان کی وراثت قرار پائے۔ اسلیے بر بناء بشریت بقاءِ حیات کیلئے وہ جو کچھ مال کی صورت میں رکھتے تھے پس مردن صرف خدا کی ملکیت ہو جانا چاہئے جو فقراء اور مساکین ہی کا حصہ ہو سکتا ہے نہ کہ اس اولوا العزم ہستی کے نسل و خاندان کا۔

نبوت

جن انبیاء و رسل کی صحیح تاریخ منضبط ہے اس سے قرآن عزیز کی بعض آیات کی صراحت[1] سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس ہستی کو شرفِ نبوت سے سرفراز کرتا ہے اس کو یہ منصبِ جلیل سن رشد کے بعد عطا فرماتا ہے تاکہ وہ دنیوی اسباب کے لحاظ سے بھی عمرِ طبعی کا وہ حصہ طے کر لے جس میں عقل و تجربہ پختگی اختیار کر لیتے ہیں اور اس حد پر پہنچ کر استعداد کے مطابق انسانوں کے قوائے فکری و عملی میں استواری اور استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ سنت اللہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حق میں بھی کارفرما رہی اور سنِ رشد کے بعد ان کو حکومت و خلافت کے ساتھ ساتھ "منصبِ نبوت" بھی منجانب اللہ عطا ہوا۔

[1] آیت وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰھِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ (الانبیاء) کی طرف اشارہ کیا ہے۔

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوْحٍ وَّالنَّبِيِّيْنَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَوْحَيْنَا إِلَى إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْمَاعِيْلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيْسَى وَأَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهَارُوْنَ وَسُلَيْمَانَ (نساء)

بیشک ہم نے (اے محمد ﷺ) تیری طرف وحی بھیجی جس طرح ہم نے نوح کی جانب وحی بھیجی اور اس کے بعد دوسرے پیغمبروں کی طرف وحی بھیجی اور ابراہیم کی جانب اسمٰعیل کی یعقوب کی اور اس کی اولاد کی جانب اور عیسیٰ کی اور ایوب کی اور یونس کی اور ہارون کی اور سلیمان کی جانب وحی بھیجی۔

وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا (الانبیاء)

اور (داؤد و سلیمان) ہر ایک کو ہم نے حکومت دی اور علم (نبوت) دیا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُوْدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا (ص)

اور بیشک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم (نبوت کا علم) دیا۔

خصائص سلیمان علیہ السلام

پھر حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی بعض خصوصیات اور امتیازات سے نوازا اور اپنی نعمتوں میں سے بعض ایسی نعمتیں عطا فرمائیں جو ان کی زندگی مبارک کا طغرائے امتیاز ہیں۔

۱۔ منطق الطیر

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام دونوں کو یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ وہ چرند و پرند کی بولیاں سمجھ لیتے تھے اور دونوں بزرگوں کیلئے ان کی آوازیں ایک ناطق انسان کی گفتگو کی طرح تھیں۔

قرآن عزیز نے سلیمان علیہ السلام اس شرف کا اس طرح ذکر کیا ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُوْدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلَى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُوْدَ وَقَالَ يَاأَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَأُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝ (نمل)

اور بیشک ہم نے داؤد اور سلیمان کو "علم" دیا اور ان دونوں نے کہا: حمد اللہ کیلئے ہی زیبا ہے جس نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہم کو فضیلت عطا فرمائی اور سلیمان داؤد کا وارث ہوا اور اس نے کہا: اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولیوں کا علم دیا گیا ہے اور ہم کو ہر چیز بخشی گئی ہے، بے شک یہ (خدا کا) کھلا ہوا فضل ہے۔

اس مقام پر "منطق طیر" کا جس اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اسکو پیش نظر رکھ کر یہ بات تو صاف ہو

جاتی ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ "وہ اپنے قیاس و تخمین کے ذریعہ ان کی مختلف قسم کی آوازوں سے صرف ان کے مقصد اور مراد کو سمجھ لیتے تھے اور اس سے زیادہ کچھ نہ تھا" اسلئے کہ قیاس و تخمین کا یہ درجہ تو بکثرت لوگوں کو حاصل ہے اور وہ پالتو جانوروں کی بھوک پیاس کے وقت کی آواز، خوشی اور مسرت کی آواز، مالک کو قریب دیکھ کر اظہارِ وفاداری کی آواز اور دشمن کو دیکھ کر خاص طرح سے پکارنے کی آواز کے درمیان بخوبی فرق سمجھتے اور ان کے ان مقاصد کو بآسانی ادراک کر لیتے ہیں۔ نیز "منطق طیر" سے وہ علم بھی مراد نہیں ہو سکتا۔ جو جدید علمی دور میں ظن و تخمین کی راہ سے بعض جانوروں کی گفتگو کے سلسلہ میں ایجاد ہوا ہے اور جو زولوجی (ZOOLOGY) کا ایک شعبہ شمار کیا جاتا ہے اسلئے کہ یہ محض اٹکل کا تیر ہے۔ جو مسطورۂ بالا تجربہ کے بعد کمانِ علم سے نکلا ہے اور اس کو علم بمرتبۂ یقین کہنا خود واضعین علم الحیوانات کے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک اکتسابی فن ہے۔ جو ہر شخص کو تھوڑی سی محنت کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت داؤد و سلیمان کے اس علم کیلئے قرآن عزیز کو اس قدر اہم پیرایۂ بیان کی ضرورت نہیں تھی۔

قرآن عزیز نے جس انداز میں اس کا ذکر کیا اور حضرت سلیمان کے شکریہ کے اندازِ بیان کو نقل کیا ہے اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کیلئے یہ ایسی عظیم الشان نعمت تھی جس کو نشان (معجزہ) کہا جاتا ہے اور وہ بے شبہ پرندوں کی بولیاں انسانِ ناطق کی گفتگو کی طرح سمجھتے تھے اور یقیناً ان کا یہ علم اسبابِ دنیوی سے بالاتر خاص قوانینِ قدرت کے فیضان کا نتیجہ تھا۔

لہذا عقل اس بارہ میں صرف یہیں تک جا سکتی ہے کہ اس کے نزدیک یہ محال بات نہیں ہے کیونکہ لغت اور عقل دونوں کے لحاظ سے "نطق" کیلئے صرف صوت کا ہونا کافی ہے اور اس کیلئے انسانوں کی طرح کی گویائی ضروری نہیں ہے اور چرند و پرند کی بولیوں میں صوت اور صوت کا نشیب و فراز دونوں موجود ہیں۔ پس منطق الطیر ایسی بخشش اور موہبت تھی جسکو خدا کا نشان کہنا چاہئے اور جو ان ہی جیسی پاک ہستیوں کیلئے مخصوص ہے، بیضاوی کے اور ہمارے درمیان "منطق الطیر" کی تفسیر سے متعلق اس پر تو اتفاق ہے کہ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد حیوانات کی بولیاں جس طریقے سے یقینی طور پر سمجھ لیا کرتے تھے وہ عام علمی تدوین سے جدا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو بطورِ نشان کے عطا ہوا تھا۔ البتہ اس کی تفصیل میں یہ فرق ہے کہ قاضی بیضاوی کے نزدیک حیوانات کی بولیاں مختلف کیفیات کی صورت میں تخیل کی مدد سے سمجھی جاتی ہیں اور اس کا یقینی درجہ کسب کے ذریعہ سے نہیں بلکہ موہبتِ الٰہی سے حاصل ہوتا ہے جو حضرت داؤد و سلیمان کو حاصل تھا اور اور ہمارے نزدیک دونوں اولوالعزم پیغمبر ان کی بولیاں اس طرح سنتے تھے۔ جس طرح انسان کی گفتگو خواہ اسلئے کہ یہ صرف معجزہ تھا۔ جو ان کے ہاتھ پر دکھلایا گیا اور عام طور پر ان کی بولیاں محض کیفیاتِ صوت سے پہچانی جاتی ہیں اور خواہ یہ ہو کہ حقیقتاً ان کی صوت بھی ایسا درجہ رکھتی ہے جس سے وہ صاف صاف ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھاتے اور سمجھتے ہیں لیکن وہ انسانی نطق سے بہت کمزور درجہ کا ہے۔ حضرت سلیمان اور

ا: علماء علم الحیوانات کہتے ہیں کہ ٹیلی گراف کی صوتی حرکات کی طرح جانوروں کی بولیاں بھی باہم بولی اور سمجھی جاتی ہیں اور ان میں آواز کے زیر و بم کو بھی دخل ہے اور مکرر سہ کرر ادا، کو بھی۔ بلکہ کہنا یوں چاہئے کہ تار کے گٹ، گر کے ایجاد کا تخیل حیوانوں کی آواز سے ہی ماخوذ ہے۔

ہدہد کے مکالمہ کو جس انداز میں قرآن نے بیان کیا ہے وہ میری توجیہ کی تائید کرتا ہے۔

۲۔ تسخیر ریاح

حضرت سلیمان علیہ السلام کے نبوت حقہ کے خصوصی امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ''ہوا'' کو ان کے حق میں مسخر کر دیا تھا اور وہ ان کے زیر فرمان کر دی گئی تھی۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام جب چاہتے تو صبح کو ایک مہینہ کی مسافت اور شام کو ایک مہینہ کی مسافت کی مقدار سفر کر لیتے تھے۔

قرآن عزیز نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس شرف کے متعلق تین باتیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ ''ہوا'' کو سلیمان علیہ السلام کے حق میں مسخر کر دیا گیا۔ دوسری یہ کہ ''ہوا'' ان کے حکم کے اس طرح تابع تھی کہ شدید اور تیز و تند ہونے کے باوجود ان کے حکم سے ''نرم'' اور آہستہ روی کے باعث ''راحت رساں'' ہو جاتی تھی۔ تیسری بات یہ کہ نرم رفتاری کے باوجود اس کی تیز روی کا یہ عالم تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا صبح و شام کا جدا جدا سفر ایک شہسوار کی مسلسل ایک ماہ کی رفتار مسافت کے مساوی ہوتا تھا۔ گویا تخت سلیمان علیہ السلام انجن اور مشین جیسے اسباب ظاہر سے بالاتر صرف خدائے تعالیٰ کے حکم سے ایک بہت تیز رفتار ہوائی جہاز سے بھی زیادہ تیز مگر سبک روی کے ساتھ ہوا کے کاندھے پر اڑا چلا جاتا تھا۔

ایک فطرت پرست انسان کی نگاہ میں یہ بات بہت کھٹکتی ہے۔ مگر ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جبکہ عقل و فکر کے نزدیک یہ مسلمات میں سے ہے کہ انسان کے قوائے فکری و عملی کے درمیان اس درجہ تفاوت ہے کہ ایک شخص جس شے کو اپنی عقل سے کرتا اور اس کا کرنا آسان سمجھتا ہے۔ دوسرا شخص اسی شے کو ناممکن اور محال یقین کرتا ہے تو اسی اصول پر ان کو یہ تسلیم کرنے میں کیوں انکار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عام قوانین قدرت کے پیش نظر کائنات کی اشیاء کو اسباب کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ اسی طرح اس کے کچھ خاص قوانین قدرت اور نوامیس فطرت بھی ہیں جو ایسے امور کیلئے مخصوص ہیں جیسا کہ امر زیر بحث ہے اور نفوس قدسیہ (انبیاء علیہم السلام) کو ان کا اسی طرح یقینی علم حاصل ہوتا ہے جس طرح اسباب کے ذریعہ مسببات کے وجود کا علم عام عقلاء کو حاصل ہے اور موجودہ دنیوی علوم کی دسترس اس علم تک نہیں ہے لہٰذا جب ایسے امور کے وقوع کی اطلاع علم الیقین (وحی الٰہی) کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے تو محض ظن و تخمین عقل کے استبعاد کی وجہ سے ایک حقیقت ثابتہ کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے اور اگر ہم کو ایک شے کا علم نہیں ہے تو یہ کیسے لازم آ جاتا ہے کہ وہ شے حقیقتاً بھی موجود نہیں ہے؟

لہٰذا جادۂ مستقیم یہ ہے کہ واقعہ تسخیر ریاح اور مسافت رفتار کو بغیر کسی تاویل کے صحیح تسلیم کیا جائے البتہ اس مقام پر تخت سلیمان اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے صبح و شام سفر کے متعلق جو تفصیلات سیرت کی کتابوں اور تفسیروں میں منقول ہیں وہ سب اسرائیلیات کا ذخیرہ ہیں اور لاطائل تفصیلات ہیں اور تعجب ہے کہ ابن کثیر جیسے محقق کہ اس جگہ وہ بھی ان روایات کو اس طرح نقل فرما رہے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک وہ مسلمات میں سے ہیں۔ حالانکہ تاریخی اعتبار سے ان پر بہت سے صحیح اشکالات وارد ہوتے ہیں۔ قرآن عزیز نے تو اس کے متعلق صرف اس قدر بیان کیا ہے:

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عَالِمِينَ ۝ (انبیاء)

اور مسخر کر دیا سلیمان کیلئے تیز و تند ہوا کو کہ اس کے حکم سے زمین پر چلتی تھی جس کو ہم نے برکت دی تھی اور ہم ہر شے کے جاننے والے ہیں۔

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ (سباء)

اور سلیمان کیلئے مسخر کر دیا ہوا کو کہ صبح کو ایک مہینہ کی مسافت (طے کراتی) اور شام کو ایک مہینہ کی مسافت۔

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ۝ (ص)

اور مسخر کر دیا ہم نے اس (سلیمان) کیلئے ہوا کو کہ چلتی ہے وہ اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ جہاں وہ پہنچنا چاہے۔

تسخیرِ جن و حیوانات

حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا ایک بڑا امتیاز جو کائنات میں کسی کو نصیب نہیں ہوا یہ تھا کہ ان کے زیرِ نگیں صرف انسان ہی نہیں تھے بلکہ جن اور حیوانات بھی تابع فرمان تھے اور یہ سب حضرت سلیمان علیہ السلام کے حاکمانہ اقتدار کے تابع اور زیرِ حکم تھے۔

بعض ملاحدہ نے ''انکارِ معجزہ'' اور ''انکارِ جن'' کے شوق میں ان جیسے دیگر مقامات کی طرح یہاں بھی عجیب مضحکہ خیز باتیں کہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ جن سے مراد ایک ایسی قوم ہے جو اس زمانہ میں بہت قوی ہیکل اور دیو پیکر تھی اور سلیمان کے علاوہ کسی کے قابو میں نہ آتی تھی اور تسخیر حیوانات کے متعلق کہتے ہیں کہ قرآن میں اس سلسلہ کا ذکر صرف ہدہد سے متعلق ہے اور یہاں ہدہد پرند مراد نہیں ہے۔ بلکہ ایک شخص کا نام ہدہد تھا جو پانی کی تفتیش پر مقرر تھا اور زمانۂ طویل سے لوگوں میں رسم چلی آتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے نام ان حیوانات کے نام پر رکھتے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ چنانچہ آج اس کو ایک مستقل علم کی حیثیت دیدی گئی ہے جو ٹوٹیزم (Tootism) کے نام سے موسوم ہے۔

اس قسم کی رکیک تاویل کرنے والے یا تو جذبۂ الحاد میں قصداً تحریف کیلئے جرأتِ بیجا کے مرتکب ہوتے ہیں اور یا قرآنِ عزیز کی تعلیم سے ناآشنا ہونے کے باوجود دعویٰ بے دلیل پر اصرار کرتے ہیں۔

قرآنِ عزیز نے 'جن'' کے متعلق جگہ جگہ بصراحت یہ اعلان کیا ہے کہ وہ بھی انسانوں سے جدا خدا کی ایک مخلوق ہے۔ چنانچہ ہم تفصیل کے ساتھ قصص القرآن جلد اول میں اس پر بحث کر آئے ہیں اور یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کرتے ہیں جو اس بارہ میں قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝

اور ہم نے جن اور انسان کو صرف اسلئے پیدا کیا ہے کہ وہ خدا کے طاعت گذار ثابت ہوں۔

اس آیت میں جن کو انسان سے جدا مخلوق ظاہر کر کے دونوں کی تخلیق کی حکمت بیان کی گئی ہے۔ لہٰذا اس آیت کو پیش نظر رکھنے کے بعد یہ کہنا کہ "جن" انسانوں ہی میں سے ایک قوی ہیکل قوم کا نام ہے جہالت بے علم نہیں ہے۔

اسی طرح جبکہ ہدہد کے واقعہ میں قرآن عزیز نے صاف صاف اس کو پرند کہا ہے تو کسی کو کیا حق ہے کہ اس کے خلاف لچر تاویل کی پناہ لے۔ قرآن عزیز میں ہے۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ ۝ (نمل)

اور سلیمان نے پرندوں کا جائزہ لیا تو کہا: یہ کیا بات ہے کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا کیا وہ غائب ہے۔

غرض سلیمان کو اللہ تعالیٰ نے یہ بے مثل شرف عطا فرمایا کہ ان کی حکومت انسانوں کے علاوہ جن، حیوانات اور ہوا پر بھی تھی اور یہ سب بحکم خدا ان کے حکم کے تابع اور مطیع تھے اور یہ سب کچھ اسلئے ہوا کہ حضرت سلیمان ﷺ نے ایک مرتبہ درگاہِ الٰہی میں یہ دعاء کی:

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِيْ لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِيْ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ (ص)

اے پروردگار مجھ کو بخش دے اور میرے لئے ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کیلئے بھی میسر نہ ہو۔ بے شک تو بہت دینے والا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا اور ایک ایسی عجیب و غریب حکومت عطا فرمائی کہ نہ ان سے پہلے کسی کو نصیب ہوئی اور نہ ان کے بعد کسی کو میسر آئے گی۔

حضرت ابوہریرہ ﷺ سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک دن ارشاد فرمایا: گزشتہ شب ایک سرکش جن نے اچانک یہ کوشش کی کہ میری نماز میں خلل ڈالے مگر خدائے تعالیٰ نے مجھ کو اس پر قابو دے دیا اور میں نے اس کو پکڑ لیا۔ اسکے بعد میں نے ارادہ کیا کہ اس کو مسجد کے ستون سے باندھ دوں تاکہ تم سب دن میں اس کو دیکھ سکو مگر اس وقت مجھ کو اپنے بھائی سلیمان ﷺ کی دعاء یاد آ گئی کہ انہوں نے خدائے تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا: رب هب لي ملكا لا ينبغي لاحد من بعدي یہ یاد آتے ہی میں نے اس کو ذلیل کر کے چھوڑ دیا۔[1] نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد: "فذکرت دعوۃ اخی سلیمٰن" کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ خدائے تعالیٰ نے مجھ میں کل انبیاء و رسل کے خصائص و امتیازات جمع کر دیئے ہیں اور اسلئے تسخیر قوم جن پر بھی مجھ کو قدرت حاصل ہے لیکن جبکہ حضرت سلیمان ﷺ نے اس اختصاص کو اپنا طغرائے امتیاز قرار دیا ہے تو میں نے اس سلسلہ کا مظاہرہ مناسب نہیں سمجھا۔

---

[1] بخاری کتاب الانبیاء و فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۶۔

بیت المقدس کی تعمیر

حق تعالیٰ نے "جن" کو ایسی مخلوق بنایا ہے جو مشکل سے مشکل اور سخت سے سخت کام انجام دے سکتی ہے۔ اسلئے حضرت سلیمانؑ نے یہ ارادہ فرمایا کہ مسجد (ہیکل) کے چہار جانب ایک عظیم الشان شہر آباد کیا جائے اور مسجد کی تعمیر بھی از سر نو کی جائے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ مسجد اور شہر کو بیش قیمت پتھروں سے بنوائیں اور اس کیلئے بعید سے بعید اطراف سے حسین اور بڑے بڑے پتھر منگوائیں۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے رسل و رسائل کے محدود اور مختصر وسائل سلیمانؑ کی خواہش کی تکمیل کیلئے کافی نہیں تھے اور یہ کام صرف "جن" ہی انجام دے سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے "جن" ہی سے یہ خدمت لی۔ چنانچہ وہ دور دور سے خوبصورت اور بڑے بڑے پتھر جمع کر کے لاتے اور بیت المقدس کی تعمیر کا کام انجام دیتے تھے۔

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ مسجد اقصیٰ بیت المقدس کی تعمیر حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ہوئی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اسلئے کہ بخاری اور مسلم کی صحیح مرفوع حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے نبی اکرمﷺ سے دریافت کیا: یا رسول اللہﷺ دنیا کی سب سے پہلی مسجد کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا: مسجد حرام، ابوذرؓ نے پھر دریافت کیا: اس کے بعد کون سی مسجد عالم وجود میں آئی آپ نے فرمایا مسجد اقصیٰ۔ ابوذرؓ نے تیسری مرتبہ سوال کیا کہ ان دونوں کی درمیانی مدت کس قدر ہے تو نبی اکرمﷺ نے ارشاد فرمایا دونوں کے درمیان چالیس سال کی مدت ہے۔[1] حالانکہ حضرت سلیمانؑ اور حضرت ابرہیمؑ بانی مسجد حرام کے درمیان ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت کا فاصلہ ہے۔ اسلئے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے مسجد حرام کی بنیاد رکھی اور وہ مکہ کی آبادی کا باعث بنی۔ اسی طرح حضرت یعقوب (اسرائیل)ؑ نے مسجد بیت المقدس کی بنیاد ڈالی اور اس کی وجہ سے بیت المقدس کی آبادی وجود میں آئی پھر عرصہ دراز کے بعد حضرت سلیمانؑ کے حکم سے مسجد اور شہر کی تعمیر کی تجدید کی گئی اور جنوں کی تسخیر کی وجہ سے بے نظیر اور شاندار تعمیر عالم وجود میں آئی جو آج تک لوگوں کیلئے باعث حیرت ہے کہ ایسے دیو پیکر پتھر کہاں سے لائے گئے۔ کس طرح لائے گئے اور جر ثقیل کے وہ کون سے آلات تھے۔ جن کے ذریعہ ان کو ایسی بلندیوں پر پہنچا کر باہم اتصال پیدا کیا گیا۔

قوم جن نے حضرت سلیمانؑ کیلئے بیت المقدس کے علاوہ اور بھی تعمیرات کیں اور بعض ایسی چیزیں بنائیں جو اس زمانہ کے لحاظ سے عجیب و غریب سمجھی جاتی تھیں۔ چنانچہ قرآن عزیز میں ہے:

وَمِنَ الشَّيَاطِيْنِ مَنْ يَغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَكُنَّا لَهُمْ حَافِظِيْنَ ۝ (انبیاء)

اور شیطانوں (سرکش جنوں) (میں سے ہم نے مسخر کر دیئے وہ جو اس (سلیمان) کیلئے سمندروں میں غوطے مارتے (یعنی) بیش قیت بحری اشیاء نکالتے اور اس کے علاوہ اور بہت سے کام انجام دیتے اور ہم ان کیلئے

[1] بخاری کتاب الانبیاء

نگراں اور نگہبان تھے۔

وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهٖ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ○ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ○ (سبا)

اور جنوں میں سے وہ تھے جو اس کے سامنے خدمت انجام دیتے تھے اس کے پروردگار کے حکم سے اور جو کوئی ان میں سے ہمارے حکم کے خلاف کجروی کرے ہم اس کو دوزخ کا عذاب چکھائیں گے۔ وہ اس کیلئے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا تھا۔ قلعوں کی تعمیر، ہتھیار اور تصاویر اور بڑے بڑے لگن جو حوضوں کی مانند تھے اور بڑی بڑی دیگیں جو اپنی بڑائی کی وجہ ایک جگہ جمی رہیں اے آل داؤد! شکر گزاری کے کام کرو اور میرے بندوں میں سے بہت کم شکر گزار ہیں۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○ (نمل)

اور اکٹھے کئے گئے سلیمان کیلئے اس کے لشکر جنوں میں سے انسانوں میں سے جانوروں میں سے اور وہ درجہ بدرجہ کھڑے کئے جاتے ہیں۔

وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ○ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ○ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (ص)

اور مسخر کر دیئے سلیمان کیلئے شیطان (سرکش جن) ہر قسم کے کام کرنے والے۔ عمارت بنانے والے، دریا میں غوطہ لگانے والے اور وہ (سرکش سے سرکش) جو جکڑے ہوئے ہیں زنجیروں میں۔ یہ ہماری بخشش و عطا ہے، چاہے اس کو بخش دو یا روکے رکھو تم سے اس کا کوئی مواخذہ نہیں۔

حضرت شاہ عبدالقادر (نوراللہ مرقدہ) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر ایسے عظیم الشان احسانات کئے اور پھر یہاں تک فرمایا کہ اس بے انتہا دولت و ثروت کے صرف و خرچ داد و دہش اور روک کر رکھنے میں تم سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہے مگر ان تمام باتوں کے باوجود حضرت سلیمان علیہ السلام اس دولت و حکومت کو مخلوق، خدا کی خدمت کیلئے ''امانت الٰہی'' سمجھ کر ایک حبہ اپنی ذات پر صرف نہیں فرماتے بلکہ اپنی روزی ٹوکریاں بنا کر حاصل کرتے تھے۔

بیضاوی نے اس مقام پر یہ اسرائیلی روایت نقل کی ہے کہ قوم جن نے تخت سلیمان علیہ السلام کو اس کاریگری سے بنایا تھا کہ تخت کے نیچے دو زبردست اور خونخوار شیر کھڑے تھے اور دو گدھ (نسر) معلق تھے اور جب حضرت سلیمان علیہ السلام تخت حکومت پر جلوہ افروز ہونے کیلئے تخت کے قریب تشریف لے جاتے تو دونوں شیر اپنے بازو پھیلا کر بیٹھ جاتے اور تخت نیچا ہو جاتا اور وہ بیٹھ جاتے تو شیر پھر کھڑے ہو جاتے اور فوراً بیت ناک گدھ اپنے

پروں کو پھیلا کر سرِ مبارک پر سایہ فگن ہو جاتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے پتھر سے بڑی اور بھاری دیگیں بنائی تھیں جو پولبوں پر قائم تھیں اور اپنی ضخامت کی وجہ سے حرکت میں نہیں آتی تھیں اور بڑے بڑے حوض پتھر تراش کر بنائے تھے اور شہر بیت المقدس اور ہیکل (مسجد اقصیٰ) اور ان سب اشیاء کی تعمیر اور کاریگری میں صرف سات سال لگے تھے۔ (بیضاوی سورۂ سبا)

تورات میں متعدد جگہ ان تعمیری خدمات کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔

"اور یہی باعث ہے جس سے سلیمان بادشاہ نے لوگوں کی بیگار لی کہ خداوند کا گھر (مسجد اور شہر یروشلم) اور اپنا قصر (قصر سلیمان) اور (شہر) ملو اور یروشلم کی شہر پناہ اور شہر (حاصور اور مجدو اور جازر بھی بنائے .... سو سلیمان نے جازر اور بیت حوران اسفل کو پھر تعمیر کیا اور بعلات اور دشت تدمر کو مملکت کے درمیان ..... اور خزانے کے سارے شہر جو سلیمان کے تھے اور اس کی گاڑی کے شہر اور اس کے سرداروں کے شہر بنائے اور جو کچھ سلیمان کی تمنا تھی سو یروشلم میں اور لبنان میں اور اپنی مملکت کی ساری زمین میں بنائے۔ (سلاطین ا۔ باب ۹ آیات ۲۲۰-۱۵)

اسی طرح توراۃ میں پتھر کے عظیم الشان حوض، بڑی اور بھاری دیگیں اور تصویروں اور ان کے بنانے کیلئے بیش قیمت پتھروں کے متعلق طویل فہرست دی گئی ہے۔ (سلاطین ا۔ باب ۰۸-)

۴۔ تانبے کے چشمے

حضرت سلیمان علیہ السلام چونکہ عظیم الشان عمارات، پر شوکت و پر ہیبت قلعوں کی تعمیر کے بہت شائق تھے اور ایسی تعمیرات کے استحکام میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ اسلئے ضرورت تھی کہ گارے اور چونے کی بجائے پگھلی ہوئی دھات گارے کی طرح استعمال کی جائے لیکن اس قدر کثیر مقدار میں یہ کیسے میسر آئے۔ یہ سوال تھا جس کا حل حضرت سلیمان علیہ السلام چاہتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس مشکل کو اس طرح حل کر دیا کہ ان کو پگھلے ہوئے تانبے کے چشمے مرحمت فرما دیئے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حسبِ ضرورت سلیمان کیلئے تانبے کو پگھلا دیتا تھا اور یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے ایک "نشان" تھا اور اس سے قبل کوئی شخص دھات کا پگھلانا نہیں جانتا تھا۔

اور نجار کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ انعام کیا کہ زمین کے جن حصوں میں ناری مادہ کی وجہ سے تانبا پانی کی طرح پگھل کر بہہ رہا تھا۔ ان چشموں کو حضرت سلیمان علیہ السلام پر آشکارا کر دیا اور ان سے قبل کوئی شخص "زمین کے اندر دھات کے چشموں سے آگاہ نہ تھا۔" (قصص الانبیاء عربی۔ ص ۳۹۳)

چنانچہ ابن کثیر بروایتِ قتادہؒ ناقل ہیں کہ پگھلے ہوئے تانبے کے یہ چشمے یمن میں تھے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر ظاہر کر دیا تھا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۲۸)

قرآن عزیز نے اس حقیقت کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی اور مسطورۂ بالا دونوں توجیہات آیتِ زیرِ بحث کا مصداق بن سکتی ہیں۔ اسلئے ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب صاحبِ مطالعہ کے اپنے ذوق پر ہے۔

تورات میں حضرت سلیمان ؑ کے اس خصوصی امتیاز کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

حضرت سلیمان ؑ اور جہاد کے گھوڑوں کا واقعہ

قرآن عزیز نے حضرت سلیمان ؑ کے متعلق ایک مختصر واقعہ کا اس طرح تذکرہ کیا ہے:

وَوَهَبْنَا لِدَاوُودَ سُلَيْمَانَ نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ ○ إِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصَّافِنَاتُ الْجِيَادُ ○ فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّي حَتَّى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ○ رُدُّوهَا عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ ○ ص

اور ہم نے داؤد کو سلیمان (فرزند) عطا کیا وہ اچھا بندہ تھا، بیشک وہ خدا کی جانب بہت رجوع ہونے والا تھا (اس کا واقعہ قابل ذکر ہے) جب اس کے سامنے شام کے وقت اصیل اور سبک رو گھوڑے پیش کئے گئے تو وہ کہنے لگا۔ بیشک میری محبت مال (جہاد کے گھوڑوں کی محبت) پروردگار کے ذکر ہی میں سے ہے۔ یہاں تک کہ وہ گھوڑے نظر سے او جھل ہو گئے (حضرت سلیمان نے فرمایا) ان کو واپس لاؤ پھر وہ ان کی پنڈلیاں اور گردنیں چھونے اور تھپتھپانے لگا۔

ان آیات کی تفسیر میں صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے تین قول منقول ہیں ایک حضرت علی ابن ابی طالب ؓ سے دو حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے ان میں سے ایک حسن بصریؒ کی سند سے مذکور ہے اور دوسرا علی ابن ابی طلحہ کی سند سے۔

حضرت علی ؓ کی تفسیر کے مطابق واقعہ کی حقیقت اسطرح ہے کہ حضرت سلیمان ؑ کو ایک مرتبہ جہاد کی مہم پیش آئی اور انہوں نے حکم دیا کہ اصطبل سے گھوڑوں کو لایا جائے۔ گھوڑے پیش ہوئے تو ان کی دیکھ بھال میں عصر کی نماز کا وقت جاتا رہا اور سورج غروب ہو گیا۔ حضرت سلیمان ؑ کو جب تنبہ ہوا تو فرمایا: مجھے یہ اعتراف ہے کہ مال کی محبت یاد خدا پر غالب آ گئی اور اس غم و غصہ میں گھوڑوں کو واپس منگایا اور یادِ خدا کی محبت کے جوش میں ان سب کو ذبح کر ڈالا کہ وہی اس غفلت کا باعث بنے تھے۔

اس تفسیر کے مطابق آیت أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّي کے معنی یہ ہوئے کہ بیشک میں پروردگار کے ذکر سے غافل ہو کر مال کی محبت میں لگ گیا اور آیت حتی توارت بالحجاب میں توارت کی ضمیر آفتاب کی جانب راجع ہے جو عبارت میں محذوف ہے یعنی "توارت الشمس بالحجاب" اور آیت فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ قرآن عزیز میں مسح کے معنی "ضرب" کے ہیں یعنی ان کی کونچیں اور گردنیں کاٹ ڈالیں۔

ابن کثیر نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ اکثر سلف کی بھی یہ رائے ہے اور حضرت سلیمان ؑ کا یہ عمل قصداً نہیں تھا بلکہ اسی قسم کا معاملہ تھا جیسا کہ غزوۂ خندق کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ کو پیش آیا کہ عصر

کی نماز فوت ہو گئی اور آپ نے مع صحابہ رضی اللہ عنہم غروب آفتاب کے بعد اس کی قضا کی۔[1] اور جب کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خدا کے ذکر کی محبت میں اپنے بہترین گھوڑوں کو ذبح کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ عظیم الشان انعام فرمایا کہ "ہوا" کو ان کیلئے مسخر کر دیا۔ (ایضاً)

۲ حضرت عبداللہ بن عباس کی اس روایت کے مطابق جو حسن بصری کی سند سے منقول ہے حقیقت واقعہ یہ ہے کہ جہاد کی مہم کے سلسلہ میں جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے گھوڑوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا اور وہ پیش کئے گئے اور پھر وہ تمام صورت پیش آئی جو پہلی تفسیر میں ذکر ہو چکی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے واپس منگا کر گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہلکے ہلکے مارا اور فرمایا کہ آئندہ تم ذکر اللہ سے غفلت کا باعث نہ بننا۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۶۔ ۳)

گویا اس روایت کے پیشِ نظر "مسح" کے معنی آہستہ آہستہ مارنے کے ہوئے اور مطلب یہ ہوا کہ اگرچہ جہاد کی مصروفیت ہی کی بناء پر غفلت کا یہ معاملہ پیش آیا تاہم حضرت سلیمان علیہ السلام نے بظاہر اسباب گھوڑوں کو اس کا باعث سمجھ کر ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جس سے فی الجملہ رنج کا اظہار بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حیوان سمجھ کر ان کو اپنے غیظ و غضب کا شکار نہیں بنانا چاہتے بلکہ فی الجملہ اظہارِ رنج کرنا چاہتے ہیں۔

۳ مسطورۂ بالا ہر دو تفاسیر سے جدا حضرت عبداللہ بن عباس سے بہ طریق علی بن ابی طلحہ جو تفسیر منقول ہے اس میں نہ نماز فوت ہونے کا ذکر ہے اور نہ سورج غروب ہونے کا مسئلہ ہے اور نہ گھوڑوں کے ذبح کر دینے کا واقعہ زیرِ بحث آیا ہے۔ بلکہ واقعہ کی صورت اس طرح ذکر کی گئی ہے کہ جہاد کی ایک مہم کے موقعہ پر ایک شام کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے جہاد کے گھوڑوں کو اصطبل سے لانے کا حکم دیا۔ جب وہ پیش کئے گئے تو آپ کو چونکہ گھوڑوں کی نسلوں اور ان کے ذاتی اوصاف کے علم کا کمال حاصل تھا۔ اسلئے آپ نے جب ان سب کو اصیل، سبک رو، خوش رو اور پھر بہت بڑی تعداد میں پایا تو آپ پر مسرت و انبساط کی کیفیت طاری ہو گئی اور فرمانے لگے۔ ان گھوڑوں سے میری یہ محبت ایسی مالی محبت میں شامل ہے جو پروردگار کے ذکر ہی کا ایک شعبہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس غور و فکر کے درمیان گھوڑے اصطبل کو روانہ ہو گئے۔ چنانچہ جب انہوں نے نظر اوپر اٹھائی تو وہ نگاہ سے اوجھل ہو چکے تھے۔ آپ نے حکم دیا ان کو واپس لاؤ جب وہ واپس لائے گئے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے محبت اور آلاتِ جہاد کی حیثیت سے عزت و توقیر کی خاطر ان کی پنڈلیوں اور گردن پر ہاتھ پھیرنا اور تھپتھپانا شروع کر دیا اور ایک ماہرِ فن کی طرح ان کو مانوس کرنے لگے۔

گویا اس تفسیر کے مطابق آیت اِنِّیٓ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَیۡرِ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّیۡ[2] کا ترجمہ یہ ہوا "بے شبہ میری محبتِ مال (جہاد کے گھوڑوں کی محبت) ذکرِ خدا ہی میں سے ہے اور تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ میں توارت کی ضمیر

۱: تفسیر ابن کثیر جلد ۴ سورۂ ص و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۵۔

۲: فاحببت معناه اردت المحبه (البحر المحیط۔ ج۔ ۷۔ ص ۳۹۶۔

صافنات الجیاد ہی کی طرف ہے۔ یعنی جب گھوڑے آنکھ سے اوجھل ہو گئے اور اس طرح "شمس" کے محذوف ماننے کی ضرورت نہیں رہتی اور طفق مسحا بالسوق والاعناق میں مسح کے "چھونے اور ہاتھ پھیرنے کے" وہی عام معنی ہیں جو لغت میں بہت مشہور ہیں۔[1]

ابن جریر طبری اور امام رازی اسی تفسیر کو راجح اور قرین صواب سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب گھوڑوں کی تعداد ہزاروں تھی اور وہ جہاد کیلئے تیار کئے گئے تھے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر حضرت سلیمان علیہ السلام کی نماز فوت ہو گئی تھی تو اس میں ان حیوانوں کا کوئی قصور نہ تھا۔ جو ان کو عذاب دیا جائے پس ان امور کے پیش نظر آیات کی وہ تفسیر صحیح نہیں ہو سکتی جس کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب کی جاتی ہے۔

محاکمہ

روایات اور اقوالِ مفسرین کے مطالعہ کے بعد ہمارے نزدیک ابن جریر اور امام رازی کا پسندیدہ قول ہی قابل ترجیح اور قرین صواب ہے۔ اسلئے کہ نہ اس میں محذوف ماننے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف ایسے عمل کی نسبت ہوتی ہے جو عقلاً نامناسب معلوم ہوتا ہے اور ابن کثیر نے ابن جریر کے اعتراض کا جو جواب اس سلسلہ میں دیا ہے وہ بھی تاویل بعید سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ ایک اولوالعزم پیغمبر کے اس واقعہ میں کوئی ایسی وجہ وجیہ نہیں ہے کہ جس کے پیش نظر دس یا بیس ہزار[2] گھوڑوں کو اس طرح ذبح کر دیا جائے اور یہ کہہ دینا کہ شاید ان کی ملت میں اس قسم کا عمل راجح اور پسندیدہ سمجھا جاتا ہو۔ بے دلیل بات ہے۔ اسی طرح ابن کثیر کا یہ قول کہ "حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب اپنی غفلت کی مکافات میں ہزاروں بہترین گھوڑوں کو ذبح کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس عوض میں ہوا کو مسخر کر دیا۔ اگرچہ دلچسپ ضرور ہے لیکن قرآن عزیز کے بیان سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ واقعہ زیر بحث ایک جدا واقعہ ہے۔ جس کے ذیل میں قرآن عزیز نے معمولی سا بھی ایسا اشارہ نہیں کیا۔ جس سے تسخیر ہوا کے معاملہ کا اس سے تعلق ظاہر ہوتا ہو۔ حالانکہ قرآن عزیز کے عام طرز بیان کے مطابق آیاتِ زیر بحث میں ہی یہ ذکر آنا چاہئے تھا کہ چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہماری خوشنودی میں ایسا کیا اسلئے ہم نے اس کے عوض میں اتنا بڑا انعام دیا کہ ہوا کو مسخر کر دیا۔ مگر اس کے برعکس تسخیر ہوا کے مسئلہ کو ایک دوسرے واقعہ کے ساتھ متعلق کیا ہے۔ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کی تو ساتھ ہی یہ دعا بھی مانگی کہ ان کو ایسی حکومت عطا ہو جو ان کے علاوہ پھر کسی کو نصیب نہ ہو اور یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اس طرح قبول فرمائی کہ جن، حیوانات اور ہوا کو ان کیلئے مسخر کر دیا۔ (سورۃ ص)

غرض صافنات الجیاد کے واقعہ کے بعد نہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا گھوڑوں کی سواری کو ترک کر دینا اور میدانِ جہاد میں ان سے کام نہ لینا ثابت ہے اور نہ تسخیر جن و ہوا کا اس معاملہ سے کوئی تعلق ہے اور نہ آیت میں "شمس" کا کوئی تذکرہ ہے اور نہ اتنی کثیر تعداد میں عمدہ گھوڑوں کا بیک وقت ذبح کر ڈالنا کوئی خاص محبوب عمل

1: فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۶ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۵۔

2: ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں دس ہزار اور بیس ہزار کی تعداد روایت کی ہے۔

ہے۔ اسلئے ان وجوہ کی بناء پر حضرت عبداللہ بن عباس ہی کا یہ قول راجح اور قرینِ صواب ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کا واقعہ

سورۂ صٓ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش اور خدائے تعالیٰ کی جانب سے ابتلاء کا ایک مجمل واقعہ اس طرح مذکور ہے:

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَأَلْقَيْنَا عَلَىٰ كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ ۝ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ۝ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ۝ (ص پ ۲۳ رکوع ۳)

اور بیشک ہم نے سلیمان کو آزمایا اور ڈال دیا ہم نے اس کی کرسی پر ایک جسم، پھر وہ اللہ کی جانب رجوع ہوا۔ کہا اے پروردگار! مجھ کو بخش دے اور مجھ کو ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کو میسر نہ آئے۔ بے شبہ تو ہی بخشنے والا ہے۔ تب ہم نے اس کیلئے ہوا کو مسخر کر دیا کہ وہ اس کے حکم سے نرم رفتار سے چلتی تھی جہاں وہ پہنچنا چاہتا۔

ان آیات میں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب آزمائش پیش آئی تو وہ کیا تھی صرف اس قدر اشارہ ہے کہ ان کی کرسی پر ایک جسد ڈالا گیا نیز احادیث میں بھی اس سے متعلق کوئی تفصیل مذکور نہیں ہے۔ لہٰذا ان آیات کی تفسیر میں مفسرین نے دو راہیں اختیار کی ہیں:

ایک یہ کہ ہم کو قیاس اور ظن و تخمین سے کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہئے اور صرف اسی قدر یقین رکھنا چاہئے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس نے کسی آزمائش میں مبتلا کیا۔ جس کا تعلق تختِ سلیمان اور جسد کا تختِ سلیمان پر ڈالا جانا ان دو باتوں سے ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت نا معلوم ہے اور یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اولوالعزم پیغمبروں کی طرح خدا کی درگاہ میں رجوع کیا۔ اول مغفرت طلب کی اور اس کے بعد ایسی حکومت کیلئے دعا مانگی جو بے نظیر اور بے مثال ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کی مقبولیت اور عظمتِ شان کو سراہا۔ وَإِنَّ لَهُ عِندَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَآبٍ اور بے شبہ اس کیلئے ہمارے پاس تقرب ہے اور عمدہ مقام۔

آیاتِ زیرِ بحث کی تفسیر میں یہ راہ حافظ عماد الدین بن کثیرؒ اور ابن حزمؒ اور بعض دوسرے جلیل القدر محدثین و مفسرین نے اختیار کی ہے۔

دوسری راہ یہ ہے کہ اس واقعہ کی تفصیل اور آیات کی تشریح کیلئے کوئی صورت پیدا کی جائے اور اس کے اجمال و ابہام کو حل کیا جائے۔

اس سلسلہ میں مفسرین نے جو تفسیریں کی ہیں۔ ان میں سے صرف دو قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک امام رازیؒ کی جانب منسوب ہے اور دوسری بعض محدثین کی جانب۔

---

(۱) اور ہمدانی کے قول کے مطابق اگر احببت کے معنی اردت المحبۃ لئے جائیں تو پھر عن بمعنی من استعمال ہو سکتا ہے۔

امام رازی کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان ایک مرتبہ سخت علیل ہو گئے اور ان کی حالت اس درجہ نازک ہو گئی کہ جب تخت پر لا کر بٹھائے گئے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم بے روح۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت عطا فرمائی۔ جب وہ تندرست ہو گئے تو خدائے تعالیٰ کا شکر بجا لاتے ہوئے اول انہوں نے پیغمبرانہ شان کے مطابق مغفرت طلب کی اور اپنی بیماری کا اظہار کیا اور پھر دعا مانگی کہ خدایا مجھ کو لاثانی حکومت عطا فرما۔ (تفسیر کبیر)

رازی (رحمۃ اللہ) کی اس تفسیر[1] کے مطابق آیۃ میں "فتنہ" سے مراد "مرض شدید" ہے اور میں "القاء جسد" سے حضرت سلیمان کا شدت مرض میں جسم بے روح کی طرح تخت پر پڑ جانا مقصود ہے اور سے صحت کی جانب رجوع ہو جانا اور تندرست ہو جانا مراد ہے۔ گویا آزمائش کا مقصد یہ تھا کہ حضرت سلیمان عین الیقین کے درجہ میں سمجھ لیں کہ اس حاکمانہ شان کے باوجود ان کا نہ صرف اقتدار بلکہ جان تک اپنے قبضہ میں نہیں ہے۔ تاکہ ایک اولوالعزم رسول کی طرح خدا کے سامنے جھک جائیں اور اظہارِ خشوع و خضوع اور طلب مغفرت کے ذریعہ درگاہِ الٰہی سے درجۂ رفیع اور مزید سربلندی حاصل کریں۔

بعض محدثین نے ان آیات کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان نے یہ سوچا کہ میں اس شب میں اپنے حرم کے ساتھ ازدواجی فریضہ ادا کروں تو میری ہر ایک بیوی سے لڑکا پیدا ہو گا اور وہ میدان جہاد کا مجاہد بنے گا۔ مگر اس خیال کے ساتھ "ان شاء اللہ" کہنا بھول گئے۔ خدائے تعالیٰ کو ایک اولوالعزم پیغمبر کا یہ طرز ناپسند ہوا۔ اور اس نے حضرت سلیمان کے اس دعوے کو اس طرح غلط ثابت کر دیا کہ تمام ازواجِ مطہرات میں سے صرف ایک بیوی کے مردہ بچہ پیدا ہوا۔ جس کو کسی خادم نے ان کے سامنے اس وقت پیش کیا جبکہ وہ تخت پر متمکن تھے۔ حضرت سلیمان کو تنبہ ہوا کہ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ خدا کے سپرد کئے اور ان شاء اللہ کہے بغیر میں نے اپنی بات کو زور دار بنایا۔ چنانچہ فوراً ہی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع کیا۔ مغفرت طلب کی اور وہ دعا مانگی جس کا ذکر قرآن عزیز میں بصراحت موجود ہے۔

محدثین اپنی اس تفسیر کی دلیل میں بخاری و مسلم کی وہ حدیث پیش کرتے ہیں۔ جو ذیل میں درج ہے اور اسی کو اپنی تفسیر کی سند بناتے ہیں۔ مفسر ابو السعودؒ اور سید محمود آلوسی نے بھی یہ توجیہ اختیار کی ہے۔ (روح المعانی جلد ۲۶)

عن ابی هريرة عن النبی قال قال سليمان بن داؤد لا طوفن الليلة على سبعين امرأة تحمل كل امرة فارسا يجاهد فی سبيل الله فقال له صاحبه ان شاء الله فلم يقل ولم تحمل شيئاً الا واحدا ساقطا احدیٰ شقيه فقال النبی لوقا لها لجاهدوا فی سبيل الله۔ (بخاری کتاب الانبیاء)

حضرت ابو ہریرہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ ایک مرتبہ سلیمان بن داؤد (علیہما

[1] تفسیر کبیر سورۂ ص۔

السلام) نے فرمایا۔ آج کی رات میں اپنی ستر بیویوں کے پاس جاؤں گا تاکہ ان میں سے ہر ایک بیوی ایک شہ زور لڑکا جنے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر نے ان سے کہا "ان شاء اللہ" مگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس جملہ کو ادا نہ کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی بیوی بھی حاملہ نہ ہوئی البتہ ایک بیوی کے ناقص بچہ پیدا ہوا جس کا ایک پہلو ندارد تھا۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ اگر حضرت سلیمان علیہ السلام "ان شاء اللہ" کہہ دیتے تو ہر ایک حرم کے بطن سے مجاہد پیدا ہوتا۔

محاکمہ

مگر یہ دونوں تفسیریں محل نظر ہیں۔ پہلی توجیہ جس کو امام رازی نے پسند فرمایا ہے صرف قیاسی توجیہ ہے اور آیت کے جملوں کی ایسی تاویل ہے جو تاویل بعید کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تسلیم کہ مقربین بارگاہ الٰہی کیلئے کبھی مرض بھی آزمائش بن جاتا ہے۔ لیکن کرسی سلیمان پر "القاءِ جسد" سے بحالت نقاہت حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت پر بیٹھنا مراد لینا متبادر معنی کے خلاف ہے۔ آیت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تخت سلیمان پر کوئی شے ڈالی گئی جس کا سلیمان کی آزمائش سے تعلق تھا نیز "اناب" (رجوع ہوا) کے معنی بھی قرآن عزیز میں جگہ جگہ طلب مغفرت اور اظہار عبودیت کیلئے رجوع ہونے کے آئے ہیں۔ لہٰذا یہاں "صحت کی جانب ہونے" کے معنی لینا دل لگتی بات نہیں ہے۔

اسی طرح بعض محدثین نے جو تفسیر بیان فرمائی ہے اور جس کو ابوالسعود اور سید محمود آلوسی نے اختیار کیا ہے وہ بھی آیاتِ زیر بحث کی تفسیر نہیں ہے۔ اسلئے کہ بخاری یا دوسری کتب حدیث میں جہاں جہاں یہ حدیث منقول ہے۔ اس کے کسی ایک طریقہ میں بھی ایسا کوئی لفظ یا جملہ نہیں پایا جاتا جس میں نبی اکرم ﷺ یا حضرت ابو ہریرہ نے اس واقعہ کو آیت زیر بحث کی تفسیر فرمایا ہو یا اسکی جانب اشارہ تک بھی کیا ہو بلکہ یہ حدیث حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات میں سے ایک مستقل واقعہ کا اسی طرح ذکر کرتی ہے۔ جس طرح بخاری نے اسی باب میں بعض دوسرے واقعات کو بیان کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں دو عورتیں ساتھ سفر کر رہی تھیں اور دونوں کے ساتھ ان کے شیر خوار بچے بھی تھے۔ راہ میں ایک عورت کے بچہ کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا اور جو بچہ باقی رہا دونوں اس کیلئے آپس میں جھگڑا کرنے لگیں۔ دونوں کا دعویٰ تھا کہ یہ بچہ میرا ہے اور دوسری کا بچہ بھیڑیا لے گیا۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس یہ معاملہ پہنچا تو انہوں نے "فصل قضایا" کے اصول پر مقدمہ کی روئیداد سن کر بڑی کے حق میں فیصلہ دیا اسلئے کہ بظاہر بچہ بڑی کے قبضہ میں تھا اور چھوٹی اس کے قبضہ کے خلاف گواہ نہ پیش کر سکی۔ جب عورتیں واپس ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس سے گزریں تو انہوں نے ان کے قضیہ کی تفصیل دریافت فرمائی اور سن کر حکم دیا ایک چھری لائی جائے اور اس بچہ کے دو ٹکڑے کر کے ایک بڑی کو اور ایک چھوٹی کو دے دیا جائے۔ بڑی خاموش رہی مگر چھوٹی یہ فیصلہ سن کر شور و غوغا کرنے لگی کہ خدارا اس بچہ کے دو ٹکڑے نہ کیجئے۔ میں بڑی کے حق میں دستبردار ہوتی ہوں۔ تب سب کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ بچہ چھوٹی کا ہے اور بڑی جھوٹا دعویٰ کرتی ہے۔ لہٰذا بچہ چھوٹی کے حوالہ کر دیا گیا۔ (بخاری کتاب الانبیاء)

نبی اکرم ﷺ نے جس طرح یہ واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دانش و عقل کی برتری کے سلسلہ میں

ارشاد فرمایا۔ اسی طرح حضرت سلیمان اور ان کی ازواج مطہرات کا واقعہ اسلئے سنایا کہ امت کو یہ موعظت حاصل ہو کہ اپنے کاموں میں اگر خیر و برکت چاہتے ہیں تو ارادہ عزم کے اظہار کے وقت "ان شاء اللہ" کہنا چاہئے۔ نیز شاید یہ بھی مقصود ہو کہ وہ وہب بن منبہ جب یہ قصہ سنایا کرتے تھے تو حضرت سلیمان کی ازواج مطہرات اور باندیوں کی تعداد ایک ہزار بتایا کرتے تھے۔ اسلئے پیغمبر نے واقعہ کی حقیقت کو ظاہر کرنے کیلئے اس تعداد کو ساٹھ یا بعض روایات کے پیش نظر سو تک بتایا جن میں بعض ازواج مطہرات تھیں اور باقی جاریات (باندیاں) تھیں۔[1]

غرض روایت زیر بحث موعظت و عبرت کے سلسلہ میں مستقل حیثیت سے بیان ہوئی ہے۔ آیت زیر بحث کی تفسیر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور خلاصۂ بحث یہ ہے کہ امام رازی اور بعض محدثین کی اختیار کردہ تفسیریں حضرت سلیمان کی آزمائش اور کرسی سلیمان پر "القاءِ جسد" کے واقعات کو حل نہیں کرتیں اور آیات میں اگرچہ ان دونوں باتوں کا مجمل ذکر ہے۔ تاہم اس واقعہ سے متعلق موعظت اور عبرت کے پہلو کو بہت صاف اور نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے اور قرآن کا واقعات کے تذکرے سے یہی مقصد ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم کو بھی اس کے موعظت کے پہلو کو سامانِ عبرت و نصیحت بناتے ہوئے واقعہ کے اجمال پر ہی ایمان رکھنا چاہئے اور اگر کوئی شخص واقعہ کے اس اجمال پر قلب کو مطمئن نہیں پاتا تو پھر امام رازی کی بیان کردہ تفسیر کو اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے۔

ان آیات کی تفسیر میں بیان کردہ تفاسیر کے علاوہ بہت سی ایسی روایات کتب تفاسیر میں درج ہیں۔ جن کا اسلامی روایات سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور بلاشبہ وہ تمام تر یہودی قصص اور اسرائیلی خرافات کا مجموعہ ہیں۔ اسلئے ان کو روایات کہنا بھی روایت کی توہین کرنا ہے۔

ان روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ کیلئے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کے تخت پر شیطان کو قابض کر دیا تھا اور اس کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان کی ایک بیوی جس کا نام امینہ تھا بت پرست تھی اور اپنے باپ کا مجسمہ بنا کر اسکی پرستش کیا کرتی تھی۔ لہٰذا خدا نے تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو یہ سزا دی کہ جس مدت تک امینہ ان گھر میں بت پرستی کی تھی اس مدت تک کیلئے وہ تخت سلطنت سے محروم کر دیئے گئے اور ان کی انگشتری جس میں اسم اعظم کندہ تھا وہ ان کی باندی جرادہ کے ذریعہ شیطان کے ہاتھ پڑ گئی اور وہ بصورتِ سلیمان ان کے تخت پر بیٹھ کر حکومت کرنے لگا اور پھر مدت ختم ہونے کے بعد انگشتری شیطان کے ہاتھ سے دریا میں گر گئی اور مچھلی اس کو نگل گئی اور وہ مچھلی حضرت سلیمان کے پاس شکار ہو کر آئی اور اس طرح اس کے پیٹ میں سے انگشتری نکال کر انہوں نے اپنا ملک واپس لے لیا۔

توراۃ سلاطین ا باب ۱۱ میں بھی اس روایت سے ملتا جلتا ایک قصہ مذکور ہے اور اس میں بیویوں کی خاطر حضرت سلیمان کا بت پرستی کرنا تک موجود ہے۔ (العیاذ باللہ)

---

1 نجار نے اس مقام کی تفسیر میں ایک تیسری راہ اختیار کی ہے۔ مگر وہ ہمارے نزدیک اٹکل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اس کیلئے قصص الانبیاء۔ ص ۳۹۲ قابل مراجعت ہے۔

اس روایت میں ایک اولوالعزم پیغمبر کی جانب جس قدر خرافات اور ذلیل واقعات کی نسبت کی گئی ہے۔ ایک عامی بھی بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسی روایات کا اسلام کی تعلیم سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ اسی لئے محدث ابن کثیرؒ نے ان راوایات کے متعلق یہ فیصلہ دیا ہے:

ذکر ابن جریر و ابن ابی حاتم و غیرهما من المفسرین ههنا اثارا کثیرة عن جماعة من السلف واکثرها او کلها متلقاة من الاسرائیلیات و فی کثیر منها نکارة شدیدة و قد نبهنا علی ذلك فی کتابنا التفسیر واقتصرنا ههنا علی مجرد التلاوة۔ (بدایه و نهایه جلد ۲ ص ۲۶)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور ان دونوں کے علاوہ دوسرے مفسرین نے اس مقام پر جماعت سلف سے بہت سے آثار کا ذکر کیا ہے اور ان میں سے اکثر یا سب کے سب اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔ اور ان میں سے اکثر آثار میں سخت ناروا باتیں مذکور ہیں اور ہم نے اپنی تفسیر میں اس پر تنبیہ کر دی ہے اور اس جگہ صرف قرآن میں بیان کردہ واقعہ کو تلاوت کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

ولکن الظاهر انه انما تلقاه ابن عباس رضی الله عنهما ان صح عنه من اهل الکتاب و فیهم طائفة لا یعتقدون نبوة سلیمان علیه الصلوٰة والسلام فالظاهر انهم یکذبون علیه و هذا کان فی هذا السیاق منکرات۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ٤ ص ٣٦)

لیکن ظاہر یہ ہے کہ اگر اس روایت کی نسبت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی جانب صحیح بھی ثابت ہو جائے تب بھی یہ اہل کتاب سے انہوں نے لی ہے اور ان میں ایک گروہ حضرت سلیمان کو نبی نہیں مانتا تو یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ حضرت سلیمان پر جھوٹ تراشتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس روایت کے بیان میں ناروا باتیں پائی جاتی ہیں۔

وقد رویت هذه القصة مطولة عن جماعة من السف رضی الله عنهم کسعید بن المسیب و زید بن اسلم و جماعة آخرین و کلها متلقاة من قصص اهل الکتاب۔ (ایضاً ج ٤ ص ٣٦)

اور یہ طویل طویل قصہ سلف کی ایک جماعت کی نسبت کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ مثلاً سعید بن مسیب اور زید بن اسلم رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ ایک جماعت سے منقول ہے اور یہ پورا قصہ از اول تا آخر اہل کتاب کی کہانیوں سے لیا گیا ہے۔

ابن کثیر کے علاوہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں، ابن حزم نے الفصل میں، قاضی عیاضؒ نے شفا میں، شیخ بدر الدین عینی نے شرح بخاری میں ابن حبانؒ نے اپنی تفسیر میں اور دوسرے جلیل القدر محققین، محدثین اور مفسرین نے اس قصہ سے متعلق روایات کو خرافات اور اہل کتاب کی ہزلیات ظاہر کر کے اسلامی روایات کے دامن کو اس نجاست سے پاک کیا ہے۔

لشکر سلیمان اور وادی نمل

گزشتہ صفحات میں "منطق الطیر" کی بحث میں یہ مسئلہ واضح ہو چکا ہے کہ حضرت سلیمان ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حیوانات کی بولیاں سمجھنے کا علم عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ اسی سلسلہ کا ایک واقعہ قرآن عزیز میں وادیٔ نمل (چیونٹیوں کی بستی) سے متعلق اس طرح مذکور ہے۔

ایک مرتبہ حضرت سلیمان ﷺ جن وانس اور حیوانات کے عظیم الشان لشکر کے جلو میں کسی جگہ تشریف لے جا رہے تھے۔ لشکر کی کثرت کے باوجود کسی طبقہ کے افراد کی بھی یہ مجال نہ تھی کہ وہ اپنے درجہ اور رتبہ کے خلاف آگے پیچھے ہونے کی بے ترتیبی کا مرتکب ہو سکے۔ سب فرمانبردار لشکروں کی طرح حضرت سلیمان ﷺ کی ہیبت سے اپنے اپنے قرینہ سے فوج در فوج چل رہے تھے کہ لشکر چلتے چلتے ایک ایسی وادی میں پہنچا جہاں چیونٹیاں بے شمار تھیں اور پوری وادی ان کا مسکن بنی ہوئی تھی۔ چیونٹیوں کے بادشاہ نے لشکر کے اس کثیر انبوہ کو دیکھ کر اپنی امت سے کہا کہ تم فوراً اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ سلیمان اور سلیمان کے لشکر کو کیا معلوم کہ تم اس کثرت کے ساتھ وادی کی زمین پر رینگ رہی ہو۔ نہ معلوم ان کے گھوڑوں اور پیادوں کے نیچے تم میں سے کتنی تعداد بے خبری میں روندی جائے۔

حضرت سلیمان ﷺ نے چیونٹیوں کے بادشاہ کی یہ باتیں سنیں تو ان کو ہنسی آگئی اور اس کے عاقلانہ حکم کی داد دینے لگے۔ اب اس واقعہ کو خود قرآن عزیز سے سنیے:

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُوْدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُوْدَ وَقَالَ يَآأَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَأُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ○ وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○ حَتّٰى إِذَا أَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يَآأَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيْٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصَّالِحِيْنَ ○ (آیات ۱۵ تا ۱۹، سورۃ ۲۷)

اور بیشک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم (علم نبوت) بخشا اور ان دونوں نے کہا، تعریف ہے اللہ کے لئے جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا۔ اس نے کہا: اے لوگو! ہم کو پرندوں (حیوانات) کی بولیوں کا علم دیا گیا ہے اور ہمارے لئے ہر شے مہیا کر دی گئی ہے۔ بے شک یہ (خدا کا) کھلا ہوا فضل ہے اور جمع ہوا لشکر سلیمان کیلئے جن، انسان اور پرندوں (حیوانات) سے اور وہ درجہ بدرجہ قرینہ کے ساتھ آگے پیچھے چل رہے تھے، حتیٰ کہ وہ وادیٔ نمل پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! اپنے گھروں

میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں سلیمان اور اس کا لشکر تم کو پیس ڈالے۔ چیونٹی کی یہ بات سن کر سلیمان ہنس پڑا اور کہنے لگا: اے پروردگار! مجھ کو یہ توفیق دے کہ میں تیرا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر انعام کیا ہے اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جو تجھ کو پسند آئے اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔

ہم نے حکم دینے والی چیونٹی کو چیونٹیوں کا پادشاہ کہا ہے اور یہ صرف اسلئے کہ قدیم و جدید عقلاء زمانہ کا اس پر اتفاق ہے کہ حیوانات میں شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں کا اس قدر بہترین نظام ہے کہ اس کو ''نظام حکومت'' کہنا مبالغہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ بعض عقلاء دہر نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ انسان نے بھی اپنا نظام ان ہی دو نظاموں کو دیکھ کر مرتب کیا ہے۔ یہ دعویٰ اپنی جگہ کتنا ہی محل نظر کیوں نہ ہو۔ مگر اس سے ان دونوں کے نظام کی خوبی بہر حال مسلم ہو جاتی ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکم دینے والا نملہ وادی نملہ کا پادشاہ یا سردار ہی ہوگا۔

وادی نملہ کس جگہ واقع ہے؟ اس سوال کے جواب میں اگر چہ بہت سے مقامات کا نام لیا گیا ہے۔ مگر مؤرخین کی زیادہ رائے اس طرف ہے کہ عسقلان کے قریب ہے جیسا کہ ابن بطوطہ نے بیان کیا ہے یا بیت جرون و عسقلان کے درمیان جیسا کہ یاقوت سے منقول ہے۔ عام مفسرین شام میں بتلاتے ہیں۔

اس سوال کے علاوہ اس مقام پر اور بھی چند سوالات پیدا کئے گئے ہیں۔ مثلاً حکم دینے والی چیونٹی کا نام کیا تھا؟ وہ چیونٹیوں کے قبائل میں سے کس قبیلہ سے تھی؟ ان کی جسامت کس قدر تھی؟ وغیرہ وغیرہ اور پھر اسرائیلی داستانوں اور یہودی خرافات سے ان کے جوابات دینے کی سعی کی گئی ہے۔ مگر یہ سب بحثیں دراز کار، بے سند بلکہ لاطائل ہیں اور قرآنِ عزیز اور احادیث رسول ﷺ اس قسم کی لغویات سے مبرا ہیں۔

مثلاً نوف بکالی کہتا ہے کہ ان چیونٹیوں کا قد بھیڑیے کے برابر تھا۔[1] حالانکہ قرآنِ عزیز نے واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ وہ اس قدر حقیر جسم رکھتی تھیں کہ نملہ کو یہ کہنا پڑا: ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کا لشکر تم کو پیس ڈالے اور ان کو خبر بھی نہ ہو۔ کیونکہ یہ بات جب ہی صحیح ہو سکتی ہے کہ وہ چیونٹیاں اپنی ہم جنسوں کی طرح حقیر جسم رکھتی ہوں کہ پیر سے روندنے والے کو ان کا علم بھی نہ ہو سکے۔

اس واقعہ کے ذکر سے قرآن عزیز کا مقصد یہ ہے کہ جب آیت بالا سے قبل اس نے یہ بیان کیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ''علم منطق الطیر'' عطا فرمایا اور یہ انکی عظمت شان کا ایک نشان ہے تو اس نے مناسب سمجھا کہ ایک دو واقعات اس سلسلہ کے ایسے بیان کر دیئے جائیں کہ جس سے مخاطب کو اس مسئلہ میں کسی قسم کا تردد اور شک باقی نہ رہے اور اس کو علم الیقین حاصل ہو جائے کہ قرآن عزیز نے جس حیثیت سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اسکے پیشِ نظر یہ علم عام دنیوی علوم کی طرح کا نہیں تھا۔ بلکہ خدائے تعالیٰ کی جانب سے ان دونوں عظیم المرتبت پیغمبروں کیلئے خاص موہبت (عطاء و بخشش) اور نشان (معجزہ) تھا۔ چنانچہ اس ہی کے متصل پہلا واقعہ وادی نملہ کا بیان کیا کہ کس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک حقیر جسم کے حیوان کی باتوں کو اس طرح سن لیا جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کی گفتگو بے تکلف سن لیتا ہے اور

---

[1] تاریخ ابن کثیر۔ ج ۲ ص ۲۱۔

ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا کہ جب اس حیرت زا علم کے متعلق حضرت سلیمان کو "عین الیقین اور حق الیقین" کا درجہ حاصل ہو گیا تو انہوں نے ایک اولوالعزم پیغمبر کی شان کے مناسب خدا کے اس عطا کردہ نشان پر اظہار تشکر وامتنان کیا۔

اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس سورۃ میں اس کا ذکر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ہی "سورۂ نمل" رکھا ہے۔

احمد زکی پاشا مصری نے اپنے ایک مقالہ میں آیت زیر بحث کے متعلق یہ کہا ہے کہ اس جگہ نملہ سے انسانوں کا انبوہ کثیر مراد ہے یعنی وہ وادی میں چیونٹیوں کی طرح بے شمار تھے اور خوف تھا کہ کہیں حضرت سلیمان کا لشکر ان کو نہ روند ڈالے، مگر زکی پاشا کی یہ تفسیر آیت کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس کی مراد کی تحریف ہے۔ اسلئے کہ آیت میں جبکہ حضرت سلیمان اور ان کے لشکر کے متعلق یہ مقولہ منقول ہے یعنی ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو پیس ڈالیں اور ان کو یہ خبر بھی نہ ہو کہ تمہاری جانوں پر کیا حادثہ گزر گیا، تو نملہ سے کس طرح انسانوں کا کثیر گروہ مراد لیا جا سکتا ہے۔ نیز قرآن عزیز کا سیاق و سباق اس تاویل کو مردود قرار دیتا ہے کیونکہ اس صورت میں آیت کا تعلق نہ اس "علم" سے رہتا ہے۔ جس کا پہلی آیت میں بڑی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور نہ انسانوں کے اس تحفظ خود اختیاری کے مقولہ میں کوئی ایسی بات نظر آتی ہے جو حضرت سلیمان کی متعجبانہ ہنسی کا سبب بن سکے اور نہ یہ کوئی ایسا اہم واقعہ تھا۔ جس کے متعلق حضرت سلیمان کے اس احساس شکر گذاری کی اہمیت کو واضح کیا جاتا جس کو بعد کی آیت میں واضح کیا گیا ہے اور پھر ان تمام باتوں کے علاوہ اگر یہ معاملہ انسانوں کے انبوہ کثیر سے متعلق ہوتا تو قرآن عزیز کو ایسے صاف اور سادہ معاملہ کو ایسے پیچیدہ کنایہ اور اشارہ میں بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ جس کی مراد سمجھنے میں خوامخواہ مغالطہ پیدا ہو اسلئے کہ اگر کہیں بے شمار انسانوں اور حیوانوں کا مثلاً اجتماع ہو تو مختلف زبانوں کے محاورہ میں یہ تو بے شک کہا جاتا ہے کہ چیونٹیوں کی طرح بیشمار تھے۔ مگر جس مقام نہ کسی انسانی جماعت کا پہلے کوئی ذکر ہو رہا ہو اور نہ اس کی کثرت و قلت کی کوئی بحث ہو رہی ہو۔ اس جگہ کلام کی ابتداء اگر یوں کی جائے کہ "جب لشکر وادیٔ نملہ پر پہنچا تو نملہ نے کہا" تو کسی زبان کے محاورہ میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے انسانوں کا انبوہِ کثیر مراد ہے۔

آج کے علمی دور میں جبکہ "ماہرین علم السنۂ حیوانات" کی تحقیق اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ید قدرت نے حیوانات میں بھی نفس ناطقہ اور اس کیلئے لغاتِ مخصوصہ ودیعت کئے اگرچہ وہ "نفوس" انسان کے نفس ناطقہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ضعیف اور کم زور ہیں اور جبکہ حیوانات کی فہم و فراست پر فلسفیانہ مباحث مہیا کئے جا رہے ہیں اور ان کی بولیوں اور زبانوں کی اقسام اور ان کی جداجدا ابجد کو حقائق ثابتہ کی طرح نمایاں کیا جا رہا ہے۔

(دائرۃ المعارف لبستانی جلد ۷ ص ۴۸-۴۸۸)

ایسے دور میں اگر "وحی الٰہی" کے ذریعہ یہ یقین دلایا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک خاص بندے (پیغمبر) کو دنیوی اسباب سے بالاتر ہو کر حیوانات کی بول چال کا علم عطا فرمایا تو سخت حیرت ہے کہ اس کو کیوں عقلاً محال سمجھا جاتا اور اس میں رکیک تاویل بلکہ تحریف کی سعی کی جاتی ہے۔

بعض روایات میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بارش نہیں ہوئی۔ قحط کی حالت دیکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی امت کے ساتھ استسقاء کیلئے میدان میں نکلے۔ راہ میں دیکھا کہ ایک چیونٹی اگلے قدم اٹھائے آسمان کی جانب نظر کئے یہ دعاء مانگ رہی ہے۔ "خدایا ہم بھی تیری مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں اور تیرے فضل کے محتاج ہم کو بارش سے محروم نہ کر"۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے قوم سے فرمایا: واپس چلو ایک حیوان کی دعاء نے ہمارا کام کر دیا۔ اب تمہاری طلب کے بغیر ہی بارش ہوگی۔

یہ روایت موقوف اور مرفوع دونوں طریقوں سے ابن عساکر اور ابن ابی حاتم نے روایت کی ہے۔[1] لیکن محدثین کے نزدیک اس روایت کو نبی اکرم ﷺ کی جانب نسبت کرنا محل نظر ہے۔ البتہ چیونٹی کے بارہ میں صحیح مسلم میں ایک مرفوع حدیث یہ ضرور موجود ہے۔ "نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ کسی "نبی" کو ایک چیونٹی نے کاٹ کھایا۔ پیغمبر نے غصہ میں اس سوراخ کو جلا دینے کا حکم دے دیا۔ جس میں سے اس چیونٹی نے نکل کر ان کو کاٹا تھا۔ فوراً ان پر خدا کی وحی نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک چیونٹی کے کاٹنے پر گھر کو جلا دینے کا حکم تم نے کیوں دیا۔ تم کو کیا معلوم کہ اسمیں کس قدر بے خطا چیونٹیاں موجود تھیں۔ صرف اس ایک چیونٹی ہی کو ہلاک کر دینے پر کیوں اکتفا نہیں کیا۔ (مسلم کتاب الانبیاء)

آیت زیر بحث میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ مقولہ مذکور ہے "واوتینا من کل شیء" (ہم کو سب کچھ دیا گیا ہے) اسکے معنی صاف اور متبادر یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہم کو ایسا نوازا ہے کہ اپنی نعمتوں کی ہم پر بارش کر دی ہے اور یہ کہ گویا کائنات کی ہر چیز ہم کو میسر ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکۂ سبا

قرآن عزیز نے سورۂ نمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکۂ سبا کا ایک واقعہ قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جو اپنے تفصیلی اور جزئی واقعات کے لحاظ سے بہت دلچسپ اور پیدا شدہ نتائج و بصائر کے پیش نظر بہت اہم تاریخی واقعہ ہے۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عظیم الشان اور بے مثال دربار میں انسانوں کے علاوہ جن اور حیوانات بھی درباری خدمات کیلئے فوج در فوج حاضر رہتے تھے اور اپنے اپنے مراتب اور مفوضہ خدمات پر بغیر چون چرا تابع فرمان۔ ایک مرتبہ دربار سلیمانی اپنے پورے جاہ و حشم کے ساتھ منعقد تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جائزہ لیا تو ہدہد کو اپنی جگہ پر غیر حاضر پایا۔ ارشاد فرمایا، میں ہدہد کو موجود نہیں پاتا۔ اگر واقعی وہ غیر حاضر ہے تو اس کی بے وجہ غیر حاضری سخت قابل سزا ہے، اسلئے میں اس کو یا تو سخت عذاب دوں گا۔ یا ذبح کر ڈالوں گا، ورنہ یا پھر وہ اپنی غیر حاضری کی معقول وجہ بتائے۔ ابھی زیادہ وقفہ نہیں ہوا تھا کہ ہدہد حاضر ہو گیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی باز پرس پر کہنے لگا کہ میں ایک ایسی یقینی اطلاع لایا ہوں۔ جس کی خبر آپ کو پہلے سے نہیں ہے۔ وہ یہ کہ یمن کے علاقہ میں سبا کی ایک ملکہ رہتی ہے اور خدا نے اس کو سب کچھ دے رکھا ہے اور اس کا تخت سلطنت اپنی خاص خوبیوں کے اعتبار سے عظیم الشان ہے۔

---

1. تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۔ و تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۳۵۹

ملکہ اور اسکی قوم آفتاب پرست ہے اور شیطان نے ان کو گمراہ کر رکھا ہے اور وہ مالک کائنات، پروردگار عالم، حدہٗ لاشریک لہٗ کی پرستش نہیں کرتے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: اچھے تیرے جھوٹ کا امتحان ابھی ہو جائے گا تو اگر سچا ہے تو میرا یہ خط لے جا اور اس کو ان تک پہنچا دے اور انتظار کر کہ وہ اس کے متعلق کیا گفتگو کرتے ہیں۔

ملکہ کی گود میں جب خط گرا تو اس نے اس کو پڑھا اور پھر اپنے درباریوں سے کہنے لگی: ابھی میرے پاس ایک معزز مکتوب آیا ہے جس میں یہ درج ہے۔

"یہ خط سلیمان کی جانب سے اور اللہ کے نام سے شروع ہے جو بڑا مہربان، رحم والا ہے، تم کو ہم پر سرکشی اور سر بلندی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے اور تم میرے پاس خدا کے فرمانبردار (مسلم) ہو کر آؤ"۔

ملکہ سبا نے خط کی عبارت پڑھ کر کہا: اے میرے ارکانِ دولت: تم جانتے ہو کہ میں اہم معاملات میں تمہارے مشورے کے بغیر کبھی کوئی اقدام نہیں کرتی۔ اسلیے اب تم مشورہ دو کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیئے؟ ارکان دولت نے کہا کہ جہاں تک مرعوب ہونے کا تعلق ہے تو اس کی قطعاً ضرورت نہیں کیونکہ ہم زبردست طاقت اور جنگی قوت کے مالک ہیں، رہا مشورہ کا معاملہ تو فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے جو مناسب ہو اس کیلئے حکم کیجئے۔

ملکہ نے کہا بے شک ہم طاقتور اور صاحب شوکت ضرور ہیں، لیکن سلیمان علیہ السلام کے معاملہ میں ہم کو عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ پہلے ہم کو اس کی قوت و طاقت کا اندازہ کرنا ضروری ہے کیونکہ جس عجیب طریقہ سے ہم تک یہ پیغام پہنچا ہے۔ وہ اس کا سبق دیتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے معاملہ میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا مناسب ہے۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ چند قاصد روانہ کروں اور وہ سلیمان علیہ السلام کیلئے عمدہ اور بیش بہا تحائف لے جائیں، اس بہانہ سے وہ اس کی شوکت و عظمت کا اندازہ لگا سکیں گے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے۔ اگر واقعی وہ زبردست قوت و شوکت کا مالک اور شاہنشاہ ہے تو پھر اس سے ہمارا لڑنا فضول ہے۔ اسلئے کہ صاحب طاقت و شوکت بادشاہوں کا یہ دستور ہے کہ جب وہ کسی بستی میں فاتحانہ غلبہ کے ساتھ داخل ہوتے ہیں تو اس شہر کو برباد اور باعزت شہریوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں اسلئے بے وجہ بربادی مول لینی کیا ضرور۔

جب ملکہ سبا کے قاصد تحائف لے کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا: تم نے اور تمہاری ملکہ نے میرے پیغام کا مقصد غلط سمجھا۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ان ہدایا کے ذریعہ "جن کو تم بیش بہا سمجھ کر بہت مسرور ہو" مجھ کو پھسلاؤ، حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ خدائے تعالیٰ نے مجھ کو جو کچھ مرحمت فرمایا ہے۔ اس کے مقابلہ میں تمہاری یہ بیش بہا دولت قطعاً ہیچ ہے۔ لہٰذا تم اپنے ہدایا واپس لے جاؤ اور اپنی ملکہ سے کہو کہ اگر اس نے میرے پیغام کی تعمیل نہیں کی تو میں ایسے عظیم الشان لشکر کے ساتھ سبا والوں کو پہنچوں گا کہ تم اس کی مدافعت اور مقابلہ سے عاجز رہو گے اور پھر میں تم کو ذلیل و رسوا کر کے شہر بدر

کردوں گا۔

قاصدوں نے واپس جا کر ملکۂ سبا کے سامنے تمام روئیداد سنائی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی شوکت و عظمت کا جو کچھ مشاہدہ کیا تھا۔ حرف بحرف کہہ سنایا اور بتایا کہ اس کی حکومت صرف انسانوں ہی پر نہیں ہے بلکہ جن اور حیوانات بھی ان کے تابع فرمان اور مسخر ہیں۔

ملکۂ سبا نے جب یہ سنا تو طے کر لیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے لڑنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس کی دعوت پر لبیک کہا جائے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکتوب گرامی میں یہ جملہ بھی تھا وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ چونکہ ملکۂ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام کے دین و مذہب سے ناواقف تھی۔ اسلئے اس نے لفظ مسلم کو لغوی معنی پر محمول کرتے ہوئے یہ سمجھا کہ قاہر بادشاہوں کی طرح سلیمان علیہ السلام کا مقصد بھی یہ ہے کہ میں اس کی فرمانبرداری اور شان حکومت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے ماتحت ہو جانا قبول کر لوں۔ لہٰذا اس نے یہ طے کر کے سفر شروع کر دیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں روانہ ہو گئی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو "وحی" کے ذریعہ معلوم ہو گیا کہ ملکۂ سبا حاضر خدمت ہو رہی ہے، تب آپ نے اپنے درباریوں کو مخاطب کر کے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ ملکۂ سبا کے یہاں پہنچنے سے پہلے اس کا تخت شاہی اٹھا کر یہاں لے آیا جائے۔ تم میں سے کون اس خدمت کو انجام دے سکتا ہے؟ یہ سن کر ایک دیو پیکر جن نے کہا کہ آپ کے دربار برخاست کرنے سے پہلے میں تخت کو لا سکتا ہوں، مجھ کو یہ طاقت حاصل ہے اور یہ کہ میں اس کے بیش بہا سامان کیلئے امین ہوں، ہرگز خیانت نہیں کروں گا۔

دیو پیکر جن کا یہ دعویٰ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر نے کہا کہ میں آنکھ جھپکتے اس کو آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے رخ پھیر کر دیکھا تو ملکۂ سبا کا تخت موجود پایا۔ فرمانے لگے؛ یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے۔ وہ مجھ کو آزماتا ہے کہ میں اس کا شکر گزار بنتا ہوں یا نافرمان اور حقیقت تو یہ ہے کہ جو شخص اس کا شکر گزار ہوتا ہے۔ وہ دراصل اپنی ذات ہی کو نفع پہنچاتا ہے اور جو نافرمانی کرتا ہے تو خدا اس کی نافرمانی سے بے پروا اور بزرگ تر ہے اور اس کا وبال خود نافرمانی کرنے والے ہی پر پڑتا ہے۔

خدائے تعالیٰ کے اداء شکر کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس تخت کی ہیئت میں کچھ تبدیلی کر دی جائے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ملکۂ سبا یہ دیکھ کر حقیقت کی طرف راہیاب ہوتی ہے یا نہیں۔

کچھ عرصے کے بعد ملکۂ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گئی اور جب دربار میں حاضر ہوئی تو اس سے دریافت کیا گیا: کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ عقلمند ملکہ نے جواب دیا: "ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہی ہے" یعنی تخت کی ساخت اور مجموعی حیثیت تو یہ بتا رہی ہے کہ یہ میرا ہی تخت ہے اور قدرے ہیئت کی تبدیلی اس یقین میں تردد پیدا کر رہی ہے۔ اسلئے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ یقیناً میرا ہی تخت ہے۔

ملکۂ سبا نے ساتھ ہی یہ بھی کہا: مجھ کو آپ کی بے نظیر اور عدیم المثال قوت و طاقت کا پہلے سے علم ہو چکا

ہے۔ اسی لئے میں مطیع اور فرمانبردار بن کر حاضر خدمت ہوئی ہوں اور اب تخت کا یہ محیر العقول معاملہ تو آپ کی لاثانی طاقت کا تازہ مظاہرہ ہے اور ہماری اطاعت و انقیاد کیلئے مزید تازیانہ۔ اسلئے ہم پھر ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں اظہار وفاداری و فرمانبرداری کرتے ہیں۔

ملکہ نے یقین کر لیا کہ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ (ہم فرمانبردار ہیں) کہہ کر ہم نے سلیمان علیہ السلام کے پیغام کی تعمیل کر دی اور اس کے مقصد کو پورا کر دیا اور ملکہ کی مشرکانہ زندگی اور آفتاب پرستی مانع آئی کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پیغام کی حقیقت سمجھ سکے اور ہدایت کی جانب راہ یاب ہو سکے۔ اس لئے اب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اظہار مقصد کیلئے دوسرا لطیف طریقہ اختیار فرمایا اور اس کی ذکاوت و فطانت کو مہمیز کیا وہ یہ کہ انہوں نے جنوں کی مدد سے ایک عالیشان شیش محل تیار کرایا تھا۔ جو آگینہ کی چمک، قصر کی رفعت اور عجیب و غریب صنعت کاری کے لحاظ سے بے نظیر تھا اور اس میں داخل ہونے کیلئے سامنے جو صحن پڑتا تھا۔ اسمیں بہت بڑا حوض کھدوا کر پانی سے لبریز کر دیا تھا اور پھر شفاف آبگینوں اور بلور کے ٹکڑوں سے ایسا نفیس فرش بنایا گیا تھا کہ دیکھنے والے کی نگاہ دھوکا کھا کر یہ یقین کر لیتی تھی کہ صحن میں صاف و شفاف پانی بہہ رہا ہے۔

ملکہ سبا سے کہا گیا کہ قصر شاہی میں قیام کرے، ملکہ محل کے سامنے پہنچی تو شفاف پانی بہتا ہوا پایا، یہ دیکھ کر ملکہ نے پانی میں اترنے کیلئے کپڑوں کو ساق سے اوپر چڑھایا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا۔ اس کی ضرورت نہیں یہ پانی نہیں ہے سارا سارا محل اور اس کا خوبصورت صحن چمکتے ہوئے آبگینہ کا ہے۔

ملکہ کی ذکاوت و فطانت پر یہ سخت چوٹ تھی جس نے حقیقت حال سمجھنے کیلئے اس کے قوائے عقل کو بیدار کر دیا اور اس نے اب سمجھا کہ اس وقت تک یہ جو کچھ ہوتا رہا ہے۔ ایک زبردست بادشاہ کی قاہرانہ طاقتوں کا مظاہرہ نہیں ہے۔ بلکہ مجھ پر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ سلیمان علیہ السلام کو یہ بے نظیر طاقت اور یہ معجزانہ قدرت کسی ایسی ہستی کی عطا کردہ ہے جو شمس و قمر بلکہ کل کائنات کا تنہا مالک ہے اور اس لئے سلیمان علیہ السلام مجھ سے اپنی تابعداری اور فرمانبرداری کا طالب نہیں بلکہ اسی "یکتا ذات" کی اطاعت و انقیاد کی دعوت دینا اس کا مقصد ہے۔

ملکہ کے دماغ میں یہ خیال آنا تھا کہ اس نے فوراً حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے ایک شرمسار اور نادم انسان کی طرح درگاہِ الٰہی میں یہ اقرار کیا "پروردگار! آج تک ماسوی اللہ کی پرستش کر کے میں نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا۔ مگر اب میں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ ہو کر صرف ایک خدا ہی پر ایمان لاتی ہوں جو تمام کائنات کا پروردگار ہے" اور اس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے پیغام وَأْتُونِي مُسْلِمِيْنَ کی حقیقی مراد تک پہنچ کر اس نے دین اسلام اختیار کر لیا۔

قرآن عزیز نے ملکہ سبا کے اس واقعہ کو ایسے معجزانہ اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ واقعہ کے بیان کرنے سے جو حقیقی مقصد ہے یعنی "تذکیر" وہ بھی نمایاں رہے اور واقعہ کے اہم اور ضروری حصے بھی ذکر میں آ جائیں اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو علم منطق الطیر عطا ہونے کا جو پہلی آیات میں ذکر ہے اس کی شہادت کیلئے یہ دوسرا واقعہ ہے جو ہدہد (پرند) اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکالمے سے

شروع ہوتا ہے:

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِيْنَ ○ لَأُعَذِّبَنَّهُ
عَذَابًا شَدِيْدًا أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّيْ بِسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ ○ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ
أَحَطتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَّقِيْنٍ ○ إِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَأَةً
تَمْلِكُهُمْ وَأُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ○ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا
يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ
السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ○ أَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ○ اَللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ
الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ○ قَالَ سَنَنْظُرُ أَصَدَقْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ ○ اِذْهَبْ
بِكِتَابِيْ هٰذَا فَأَلْقِهْ إِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ○ قَالَتْ يَآأَيُّهَا
الْمَلَأُ إِنِّيْ أُلْقِيَ إِلَيَّ كِتَابٌ كَرِيْمٌ ○ إِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهٗ بِاسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ
الرَّحِيْمِ ○ أَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَأْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ○ قَالَتْ يَآأَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُوْنِيْ فِيْ
أَمْرِيْ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً أَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ○ قَالُوْا نَحْنُ أُولُوْا قُوَّةٍ وَّأُولُوْا
بَأْسٍ شَدِيْدٍ وَّالْأَمْرُ إِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَأْمُرِيْنَ ○ قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوْكَ إِذَا
دَخَلُوْا قَرْيَةً أَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا أَعِزَّةَ أَهْلِهَآ أَذِلَّةً وَّكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ○ وَإِنِّيْ
مُرْسِلَةٌ إِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنَاظِرَةٌ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ○ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمَانَ قَالَ
أَتُمِدُّوْنَنِيْ بِمَالٍ فَمَا آتَانِيَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ آتَاكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ○
اِرْجِعْ إِلَيْهِمْ فَلَنَأْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِنْهَا أَذِلَّةً وَّهُمْ
صَاغِرُوْنَ ○ قَالَ يَآأَيُّهَا الْمَلَأُ أَيُّكُمْ يَأْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَنْ يَّأْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ○
قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ أَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ وَإِنِّيْ عَلَيْهِ
لَقَوِيٌّ أَمِيْنٌ ○ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ أَنْ يَّرْتَدَّ
إِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْ أَأَشْكُرُ

أَمْ أَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ ○ قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ ○ فَلَمَّا جَاءَتْ قِيلَ أَهَكَذَا عَرْشُكِ قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ ○ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَعْبُدُ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كَافِرِينَ ○ قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُمَرَّدٌ مِنْ قَوَارِيرَ قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ (سورۂ نمل)

اور پرندوں کا جائزہ لیا تو کہنے لگا: کیا وجہ میں ہدہد کو نہیں پاتا۔ کیا واقعی وہ غائب ہے؟ ایسا ہے تو ضرور میں اس کو سخت عذاب میں ڈالوں گا یا ضرور اس کو ذبح کروں گا اور یا میرے پاس غیر حاضری کی معقول وجہ بیان کرے۔ بہت دیر نہیں لگی کہ (ہدہد نے حاضر ہو کر) کہا: میں ایسی خبر لایا ہوں جس کا آپ کو پہلے سے علم نہیں تھا۔ میں سبا کی ایک یقینی خبر لے کر آپ کے پاس حاضر آیا ہوں۔ میں نے ایک عورت کو ملکہ دیکھا جو اہل سبا پر حکومت کرتی ہے اور اس کے پاس سب کچھ مہیا ہے اور اس کا ایک عظیم الشان تخت ہے۔ میں نے اس کو اس حال میں پایا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے سوا آفتاب کی پرستش کرتی اور اس کے سامنے سر بسجدہ ہوتی ہے اور شیطان نے ان کے ان کاموں کو بھلا اور اچھا دکھا رکھا اور راہ مستقیم سے ہٹا رکھا ہے۔ لہٰذا وہ راہ یاب نہیں ہوتے (تعجب ہے) کہ وہ کیوں اس اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جو نکالتا ہے آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں اور جو تم ظاہر کر کے کرتے اور جو چھپا کر کرتے ہو، ان سب کا جاننے والا ہے۔ اللہ ہے اس کے ماسوا کوئی خدا نہیں وہ پروردگار ہے عرش عظیم کا۔ سلیمان نے کہا: ہم اب دیکھتے ہیں کہ تو اپنے قول میں سچا ہے یا جھوٹا ہے، لے یہ میرا خط لے جا اور ان کی طرف ڈال دے پھر ان کے پاس سے ہٹ کر دیکھ وہ کیا جواب دیتے ہیں (ملکہ) کہنے لگی: اے درباریو! میرے پاس ایک معزز خط ڈالا گیا ہے (اس میں تحریر ہے) "یہ خط ہے سلیمان کی طرف سے اور وہ یہ ہے کہ اس اللہ کے نام سے شروع جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے، تم کو چاہیے کہ مجھ پر برتری کا اظہار نہ کرو اور میرے مقابلہ میں قوت کا مظاہرہ نہ کرو اور چلے آؤ میرے پاس مسلمان ہو کر" کہنے لگی اے میری جماعت! مجھ کو میرے معاملہ میں مشورہ دو (کیونکہ) میں تمہارے بغیر مشورہ کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔ انہوں نے جواب دیا: ہم بہت قوت والے اور سخت جنگجو ہیں، آگے تیرے اختیار میں ہے تو غور کر لے کہ تیرا کیا حکم ہے (ملکہ نے) کہا: "بادشاہ جب (فاتحانہ) کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو خراب کرتے اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں" اور یہ واقعہ ہے کہ سلاطین ایسا ہی کرتے ہیں" اور میں ان کی جانب کچھ ہدایات بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لے کر واپس آتے ہیں۔ قاصد جب سلیمان کے پاس پہنچا تو سلیمان نے کہا کیا تم میری مالی اعانت کرنا چاہتے ہو (جو یہ بیش بہا ہدیا لے کر آئے ہو) مجھے نہیں چاہئیں "تم ہی اپنے ان تحفوں سے خوش رہو۔ تو واپس جا (اگر میرے پیغام کا یہی جواب ہے) تو ہم ان پر آپہنچتے ہیں۔ ایسا لشکر لے کر جن کا مقابلہ

ان سے نہ ہو سکے اور ہم ان کو ذلیل کر کے ان بستیوں سے نکال دیں گے (قاصد نے جواب سنایا تو ملکہ نے فوراً ارادہ کر لیا کہ سلیمان تک پہنچے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ معلوم ہوا تو) سلیمان نے کہا اے دربار یو! تم میں کوئی ایسا ہے جو اس کا تخت لے آئے قبل اس کے وہ فرمانبردار ہو کر آپہنچے۔ ان میں سے ایک دیو ہیکل جن نے کہا: میں اس کو آپ کی مجلس برخاست ہونے سے پہلے لا سکتا ہوں اور مجھ کو یہ قدرت حاصل ہے اور میں اس کے بارے میں امین ہوں اور جس کے پاس کتاب (الٰہی) کا علم تھا۔ اسنے کہا: میں تیری پلک جھپکتے اس کو حاضر کر سکتا ہوں۔ پھر جب سلیمان نے (پلک جھپکتے ہی) اس کو اپنے پاس موجود پایا تو کہا: یہ میرے پروردگار کا فضل ہے میری آزمائش کیلئے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری اور جو شکر کرتا ہے۔ وہ اپنے نفس کیلئے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو میرا پروردگار بے پرواہ ہے کرم والا ہے۔ سلیمان نے کہا اس تخت کی ہیئت بدل کر اس کو عورت کیسامنے پیش کرو ہم دیکھیں گے کہ وہ سمجھ پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے ان کو سمجھ نہیں، جب وہ آپہنچی تو اس سے کہا گیا: کیا ایسا ہی ہے تیرا تخت؟ اس نے کہا: گویا یہ وہی ہے اور ہم کو (سلیمان کی بے نظیر طاقت کا) پہلے سے علم ہو چکا ہے اور ہم اس کے فرمانبردار ہیں اور اس کو (ایمان لانے سے) روکے رکھا اس چیز نے جس کو وہ خدا کے ماسوا پوجتی تھی۔ بے شبہ وہ قوم کافرین میں سے تھی (اب) اسے کہا گیا۔ محل میں چلو، اس نے محل (کی ساخت) کو دیکھا تو سمجھی کہ گہرا پانی بہہ رہا ہے اور سوچ کر پار ہونے کیلئے اپنی پنڈلیاں کھولیں (کسی نے کہا) یہ تو ایک محل ہے۔ جس میں جڑے گئے ہیں آبگینے کہنے لگی: اے پروردگار! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور میں اب سلیمان کے ساتھ ایمان لاتی ہوں۔ اللہ پر جو پروردگار ہے جہاں کا۔

چند قابلِ تحقیق مسائل

حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کے واقعہ سے متعلق چند مسائل قابل تحقیق ہیں جن کا حل ہونا ازبس ضروری ہے اور وہ ترتیب وار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

سبا کی تحقیق

سبا کے متعلق مفصل تحقیق تو "سیل عرم" کی بحث میں آئے گی۔ یہاں صرف اسقدر معلوم ہو جانا کافی ہے کہ قحطانی نسل کی ایک مشہور شاخ سبا ہے۔ یہ اپنے قبیلہ کا جداعلیٰ تھا اور اس کا نام عمر یا عبد شمس تھا اور سبا اس کا لقب تھا، یہ معرب مؤرخین اور جدید، مؤرخین کی تحقیق ہے اور توراۃ کا بیان ہے کہ اس کا نام ہی سبا تھا۔ یہ شخص بہت جری اور صاحبِ ہمت تھا اور اس نے زبردست فتوحات کے ذریعہ حکومتِ سبا کی بنیاد ڈالی۔ سبا کا زمانہ عروج محققین کے نزدیک تقریباً ۱۱۰۰ ق م سمجھا جاتا ہے اسلئے کہ تقریباً ۱۰۰۰ ق م اس کی حکومت وطاقت اور عروج کا ذکر داؤد علیہ السلام کی زبور میں موجود ہے ...... وہ فرماتے ہیں:

> "اے خدا بادشاہ کو اپنی عدالتیں عطا کر اور بادشاہ کے بیٹے کو اپنی صداقت دے۔ وہ تیرے لوگوں میں صداقت سے حکم کرے گا .... ترسیس اور جزیروں کے سلاطین نذریں دیں گے اور سبا اور سبا کے بادشاہ ہدیے گزرانیں گے .... وہ جیتا رہے گا سبا کا سونا اسے دیا جائے گا اس کے

حق میں سدا دعا ہو گی۔ (زبور ۷۲ (سلیمان کا زبور))

چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ دعا قبول ہوئی اور تقریباً ۹۵۰ ق م میں ملکۂ سبا نے حاضر ہو کر سبا کا سونا اور جواہرات تذر گزرانے بلکہ مسلمان ہو کر حکومتِ سبا کو ہی حضرت سلیمان علیہ السلام کے زیر فرمان کر دیا۔

سبا کی حکومت کا اصل مرکز عرب کے جنوبی حصہ یمن کے مشرقی علاقہ میں تھا اور دارالحکومت کا نام مآرب تھا۔ اس کو شہر سبا بھی کہتے تھے اور آہستہ آہستہ اس کا دائرہ وسیع ہو کر مغرب میں حضر موت تک وسیع ہو گیا تھا اور دوسری جانب افریقہ تک بھی اس کا اثر پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ حبشہ میں اذینہ کا علاقہ سبا کے ماتحت تھا۔ جس پر محی فرا ایک سبائی گورنر حکومت کرتا تھا۔ یہ دو زمانہ تھا کہ معین کی حکومت زوال پذیر تھی اور سبا نے یمن اور اطرافِ یمن میں اپنے مشہور قلعے تعمیر کر لئے تھے اور معین کے قلعے کھنڈر کی صورت میں بدلتے جا رہے تھے۔ سبا کی مختلف شاخیں تھیں اور عرصۂ دراز کے بعد ان میں سے متعدد شاخوں نے یمن کو مرکز حکومت بنا کر عظیم الشان تمدن اور حکومت کی بنیادیں قائم کر لی تھیں ان میں سے حمیر اور تبابعہ مشہور حکمران شاخیں ہیں اور اس ان سے قبل کے سبا کے حکمران ملوک سبا کے لقب سے مشہور ہیں ار ملوک سبا کا آخری دور حکومت ۵۵۰ ق م بتایا جاتا ہے۔ (معجم البلدان، دائرۃ المعارف ذکر سبا)

ملکۂ سبا کا نام

قرآن عزیز نے حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکۂ سبا کے واقعہ میں نہ یہ بتایا کہ اس ملکہ کا نام کیا تھا اور نہ یہ تعیین کی کہ وہ سبا کے دائرۂ حکومت کے تین مرکز یمن، حبشہ، شمالی عرب میں سے کس حصہ سے آئی تھی۔ کیونکہ اس کے مقصد کیلئے یہ دونوں باتیں غیر ضروری ہیں۔ مگر عرب یہود کی اسرائیلی داستانوں میں اس کا نام بلقیس مذکور ہے اور اہلِ حبشہ "جن کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ ملکۂ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسل سے ہیں" اپنی زبان یمن ملکہ کا نام ماکدہ بیان کرتے ہیں۔

جہت کے متعلق ترگوم[1] میں ہے کہ اس کا ملک فلسطین سے مشرق میں ہے اور انجیل[1] میں ہے کہ فلسطین کے جنوب میں ہے۔ یوسیفوس[3] کی تاریخ میں ہے کہ وہ مصر و حبشہ کی ملکہ تھی اور اہل حبش اس کو حبشی نژاد سمجھتے اور شاہانِ حبش آج تک فخر یہ یہ کہتے ہیں کہ وہ ملکۂ سبا (بلقیس) کی نسل سے ہیں۔

ان روایات میں اہل تحقیق یوسیفوس کی روایت کو غلط کہتے ہیں اور باقی دونوں روایتوں کا حاصل ایک ہی ظاہر کرتے ہیں۔ اسلئے کہ یہ دونوں حصے یمن ہی کی حکومت کے حصے تھے اور انجیل کے بیان کو زیادہ صحیح مانتے ہیں۔ ماہرین اثریات (Archaedagists) کہتے ہیں کہ خاص یمن کے علاقہ میں کتبات اور دیگر حفریات سے کسی عورت کا حکمران کا ہونا ثابت نہیں ہوتا، البتہ شمالی عرب متصل عراق میں چار قدیم حکمران عورتوں کے نام ضرور ملتے ہیں۔ لہٰذا زیادہ امکان یہ ہے کہ ملکۂ سبا اسی حصہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں

۱۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا "سبا"۔
۲۔ متی باب ۱۲، آیت ۴۲۔ لوقا باب ۱۱ آیت ۳۱۔
۳۔ ارض القرآن۔ ماخوذ از تاریخ یوسیفوس۔ ج ا۔ ذکر سلیمان۔

پہنچی ہے۔

ہد ہد

قرآن عزیز نے بہت صاف اور واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا قاصد ہد ہد پرندہ تھا۔ لیکن قانون قدرت اور نیچر کا نام لے کر آج کل کے بعض اہل علم اس قسم کے اعجاز نما واقعات سے بھڑ کتے اور ان کے خلافِ عقل کہہ کر آیات قرآنی کے انکار پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اگر مذہب پر بہت احسان فرماتے ہیں تو آیات کی معنوی تحریف کر کے رکیک تاویلات اور قرآن کی مراد کے خلاف خود ساختہ توجیہات بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر بھی یہی پیش آیا کہ اول پرندہ کا بات چیت کرنا خلافِ عقل قرار دیا گیا اور پھر واقعۂ زیر بحث سے متعلق آیت کے معنی بیان کئے گئے اور کہا گیا کہ پہلے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ مشرکین اکثر اپنی اولاد کے نام دیوتاؤں اور دیویں کے نام پر رکھ لیا کرتے تھے۔ جن میں حیوانات کے نام بھی ہوتے تھے۔ لہٰذا اس جگہ بھی ہد ہد سے پرندہ مراد نہیں ہے بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا قاصد ''انسان'' مراد ہے۔ جس کا نام غالباً ہد ہد ہوگا۔ لیکن جب ان پر یہ اعتراض وارد ہوا کہ قرآنِ عزیز نے جبکہ صاف الفاظ میں یہ کہا ہے: تَفَقَّدَ الطَّيْرَ (اور پرندوں کا جائزہ لیا تو ہد ہد کو انسان کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ تب مولوی چراغ علی نے اس کی یہ توجیہ بیان کی کہ اس جگہ طیر کے معنی ''فوج'' کے ہیں۔ یعنی جب سلیمان علیہ السلام نے فوج کا جائزہ لیا۔ مگر افسوس کہ ان کے یہ معنی بے سند اور عربی لغت کے پیشِ نظر باطل ہیں اور یہ مسلم ہے کہ لغت میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے بلکہ وہ اہل زبان کے استعمال کے تابع ہے اور اہل عرب حقیقی اور مجازی کسی معنی کے اعتبار سے بھی ''طیر'' بمعنی 'فوج' نہیں استعمال کرتے بلکہ ''الطیر'' اور ''طیر'' متعلقات و اضافات سے مجرد ہونے کی صورت میں صرف ''پرندہ'' کے معنی ہی میں بولا جاتا ہے۔

قرآنِ عزیز اس زندہ زبان میں نازل کیا گیا ہے۔ جس کو لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ کہا گیا ہے۔ یہ کسی مردہ زبان میں نہیں اتارا گیا کہ ہر شخص اپنی مرضی کے ماتحت جس لفظ کے جو چاہے معنی بیان کر دے۔ ایک شخص ''اصحابِ فیل'' کے اصل واقعہ کا انکار کرنا چاہے تو طَيْرًا اَبَابِيْلَ میں طیر کے معنی بد شگونی کے اختیار کر لے اور دوسرا شخص اگر ہد ہد سلیمان کو پرندہ تسلیم کرنے سے منکر ہو تو وہ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ میں ''طیر'' کے معنی ''فوج'' کے بیان کر دے خواہ دونوں معنی اپنے اپنے مقام پر لغتِ عربی کے لحاظ سے قطعاً غلط اور محاورۂ عرب کے اعتبار سے باطل ہی کیوں نہ ہوں۔ سخت تعجب ہے مولانا سید سلیمان ندوی سے کہ اس مقام پر مولوی چراغ علی کی تاویلِ باطل کارد کرنے کے باوجود اس مسئلہ کو عقلی بنانے کے خیال میں یہ تحریر فرما رہے ہیں:

> ''اور اگر پرندوں کا بولنا اب بھی کھٹکتا ہے تو فرض کر لو کہ نامہ بر کبوتروں کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر ہد ہد ہوگا اور اس کے بولنے سے مقصود اس مضمون کا خط اس کے پاس ہونا سمجھ لو جیسا کہ خود اس موقع پر قرآن مجید میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط دے کر اس کو ملکۂ سبا کے پاس بھیجا۔ اسی طرح پہلے بھی خط لے کر آیا ہوگا''۔ (ارض القرآن جلد ۱، ۲۶۸)

تعجب اس لیے ہے کہ جبکہ قرآن عزیز "منطق الطیر" اور "نملہ" اور ہدہد کے واقعات کو حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے عظیم الشان نعمت اور بے غایت احسان ظاہر کر رہا ہے اور قرآن عزیز ان کو یقینی اور حقیقی واقعات کے ایسے انداز میں ہونا بیان کرتا ہے۔ جس سے ہدہد کا پرندہ ہونا اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے باتیں کرنا صاف اور صریح معلوم ہوتا ہے تو چند فطرت پرستوں کے بے دلیل انکار اور حقائق ثابتہ کو اپنے ناقص علم میں محدود مان کر وحی کے دیئے ہوئے علم کے انکار پر اصرار کی خاطر سید صاحب نے کیوں ایسی تاویل بیان کی جو قرآن عزیز کے بیان کردہ مقصد کے خلاف ہے۔ نیز کسی واقعہ کا توراۃ یا اسرائیلی روایات میں منقول ہونا اس کے باطل اور لغو ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ جب قرآن عزیز یا احادیث صحیحہ بدلائل اس کے باطل ہونے کو واضح کریں یا قرآن وحدیث کے روشن اصول و مسلمات کے خلاف وہ کوئی بات بیان کریں یا ایسی تفصیلات نقل کریں کہ جو قرآن وحدیث میں مذکور نہیں ہیں اور عقل و درایت کی نگاہ میں لغو و فضول ہیں تو بے شبہ اس قسم کی تمام اسرائیلی روایات قابلِ رد ہیں لیکن ایک واقعہ بصراحت قرآن یا حدیث میں موجود ہے اور توراۃ یا اسرائیلی ادبیات بھی اسی طرح کا واقعہ نقل کرتی ہیں تو محض اسلئے کہ یہ واقعہ اسرائیلی روایات میں بھی مذکور ہے اس کو غلط قرار دے کر قرآن کے صاف اور صریح مطالب میں بھی تحریف یا رکیک تاویلات کا باب کھول دینا ہرگز جائز نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے برعکس اسرائیلی ادبیات میں منقول شدہ واقعہ کو قرآن اور حدیث کے مصرحہ واقعہ کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ ہدہد (پرندہ) حضرت سلیمان علیہ السلام کا پانی کیلئے مہندس تھا۔ زمین کے اندر جس جگہ بھی پانی ہوتا اور لشکر کو ضرور پیش آتی تو ہدہد بتا دیتا کہ اس جگہ اس قدر گہرائی پر پانی ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام جنوں سے کھدائی کرا کر پانی کو کام میں لاتے۔

(تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۱)

ملکہ سبا کا تخت

ملکہ سبا کے تخت کی تعریف ہدہد کی زبانی ہم سن چکے ہیں اور اس سلسلہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ بھی قرآن میں مذکور ہے کہ ان کے حکم سے نگاہ پلٹتے ہی وہ تخت سبا کے ملک سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں پیش کر دیا گیا۔ اس کے متعلق قرآن عزیز کی چند تصریحات کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

۱ ملکہ نے اپنے قاصدوں کے ہاتھ جو ہدایا بھیجے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اَتُمِدُّوْنَنِیْ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰنِیَ اللّٰهُ خَیْرٌ مِّمَّآ اٰتٰكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِیَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ۔ اِرْجِعْ اِلَیْهِمْ الآیۃ

۲) جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ ملکہ سبا (حضرت سلیمان علیہ السلام کے ملک کی جانب) روانہ ہو گئی تو درباریوں سے کہا کہ اس کے یہاں آنے سے قبل کون اس کے تخت کو میرے پاس لا سکتا ہے۔

قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ۔

۳) اول ایک دیو پیکر جن نے کہا کہ میں آپ کے دربار برخاست ہونے سے پہلے اس کو حاضر کر سکتا ہوں اور اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ کہا کہ میں بہت قوی ہوں اور اس تخت کے بیش قیمت سامان کیلئے امین بھی ہوں۔

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ وَ اِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ۔

۴) حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر نے کہا کہ میں آپ کی نگاہ پلٹتے ہی اس کو پیش کر سکتا ہوں

اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ

۵) جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے رخ پھیر کر دیکھا تو تخت کو اپنے نزدیک موجود پایا یہ دیکھ کر انہوں نے خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا فضل میری اس آزمائش کیلئے ہے کہ میں اس کا شکر گزار بندہ ہوں یا نافرمان۔

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ

۶) حضرت سلیمان علیہ السلام نے اب حکم دیا کہ اس کی ہیئت تبدیل کر دو۔

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ

۷) جب ملکہ سبا سفر کر کے دربار سلیمان میں پہنچ گئی تو اب اس سے یہ دریافت کیا گیا کہ یہ تخت ایسا ہی ہے جیسا کہ تیرا؟ اور اس نے عاقلانہ جواب دیا۔ گویا یہ وہی ہے فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ تخت سے متعلق اس تفصیل اور پھر اس کی ترتیب کو پیش نظر رکھیے تو معلوم ہو گا کہ قرآن ایک ایسے تخت کا ذکر کر رہا ہے۔ جس کی خبر ہدہد نے سلسلۂ پیغام سے پہلے دی تھی۔ وہ سلیمان علیہ السلام کیلئے بنایا نہیں گیا تھا۔ اسلئے کہ قاصدوں کی معرفت جو ہدایا بھیجے گئے۔ ان میں تخت کا کوئی ذکر نہیں ہے اور وہ واپس بھی گئے، مگر ملکہ کے آنے کی خبر سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام اس کا شاہی تخت اس کے پہنچنے سے قبل اپنے دربار میں منگانا چاہتے ہیں اور اس کا لانا ایسا عجیب و غریب ہے کہ جنوں میں سے بھی ایک بہت بڑا دیو پیکر جن یہ وعدہ کرتا ہے کہ دربار برخاست سے پہلے اٹھا کر لا سکتا ہوں۔ مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کا معتمد کہتا ہے کہ میں پلک جھپکتے حاضر کر دوں گا اور حاضر کر دیتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام خدا کے عطا کردہ اس اعجاز کو دیکھ کر اس کو خدا کا عظیم الشان فضل قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد تخت کی ہیئت تبدیل کرنے کا حکم فرماتے ہیں اور ان تمام مراحل کے بعد اب ملکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں پہنچتی ہے اور تخت سے متعلق سوال و جواب ہوتے ہیں اور اس جگہ بھی قرآن ملکۂ سبا کے کسی تحفہ کا ذکر نہیں کرتا۔

اس پوری تفصیل میں نہ اپنی جانب سے کوئی تاویل اور توجیہ ہے اور نہ توڑ مروڑ کر اس کو اپنی خواہش کے

مطابق کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس تخت کا معاملہ بیشک و شبہ اعجاز ار حضرت سلیمان کی نبوت و رسالت کا "نشان" ہے اور جن حضرات نے اس کے علاوہ دوسرے معانی یا تفاسیر بیان کی ہیں وہ سب باطل ہیں۔ اسلئے کہ وہ یا تو قرآن کے صاف اور سادہ بعض حصوں کو نظر انداز کر کے بیان کی گئی ہیں۔ جیسا کہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے کیا ہے یا اس کے بعض الفاظ سے غلط فائدہ اٹھا کر باقی پورے واقعہ کی حقیقت کو مسخ کر دیا گیا ہے۔

علامہ ندوی نے جو تاویل ان آیات کی فرمائی ہے۔ اسکو مطالعہ کرنے کے بعد ارباب نظر خود انصاف فرما سکتے ہیں کہ قرآن عزیز کے زیر بحث واقعہ کا مضمون ان کی تاویل کے ساتھ کس درجہ مطابقت رکھتا ہے؟ فرماتے ہیں:

"ہماری رائے یہ ہے کہ ملکۂ سبا نے تحفہ کے طور پر حضرت سلیمان کیلئے اپنے ملک کی صنعت کاری کی ایک چیز تیار کرائی تھی اور چونکہ یہ تحفہ تھا۔ ضرور ہے کہ ملکہ اپنے ساتھ شام لائی ہو گی۔ تحفہ کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ قرآن نے سبا کی پہلی سفارت میں تحفہ کا ذکر کیا اور تعلیم میں بھی سبا کے تحائف کا ذکر ہے۔

قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت سلیمان کے ایک درباری نے جو کتاب سے واقف تھا عرض کی کہ میں نظر پلٹنے سے پہلے ملکہ کا تخت اٹھا لاتا ہوں۔ نگاہ پلٹنے سے پہلے تخت اٹھا لانے سے مقصود جیسا کہ ہماری زبان میں سرعت اور جلدی سمجھا جا سکتا ہے اسی طرح عربی زبان میں قبل ان یرتد الیک طرفک سے یہی سمجھنا چاہیے۔ بعض تابعین اور مفسرین کبار نے بھی اس لفظ کے یہی معنی لئے ہیں اور یہ کہنا تو درحقیقت محاورات زبان سے نادانی کا ثبوت ہے کہ واقعتاً اس سے نگاہ پلٹنے کے ساتھ کام کا ہو جانا مقصود ہے"۔ (ارض القرآن جلد اص ۲۶۹۔۲۷۰)

کاش کہ سید صاحب ان تابعین اور مفسرین کبار کا نام بھی ظاہر فرما دیتے جنہوں نے سید صاحب کی تاویل کے مطابق معنی بیان کئے ہیں ورنہ اس جملہ قبل ان یرتد الیک طرفک سے سرعت کو محاورہ کی حدود میں محدود رکھنا چاہتے ہیں اور قرآن اس مقام پر ان حدود سے بالاتر ہو کر حضرت سلیمان کا "نشان" ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے اس کو قبل ان تقوم من مقامک کہنے والے کے مقابلہ میں ترجیح دی گئی ورنہ یہ تقابل فضول ہو جاتا ہے کیونکہ جب حضرت سلیمان کا مقصد یہ ٹھہرا کہ وہ توشہ خانے سے دربار میں ملکہ کی آمد سے قبل آ جائے تو قبل ان تقوم کی پیش کش اس کیلئے کافی تھی اور نہ یہ کوئی ایسا اہم معاملہ رہ جاتا جس پر مذاکرہ ہوتا اور قرآن اسکی تفصیل کو اتنی اہمیت دیتا۔

نجار نے اس موقع پر بہت عمدہ بات تحریر فرمائی ہے:

"حضرت سلیمان نے ملکۂ سبا کا تخت اس شخص کے ذریعہ جس کے پاس کتاب کا علم تھا۔ جس خاص طریقہ سے منگایا وہ ایسا طریقہ ہے جس کو موجودہ علوم ابھی تک نہیں پا سکے اور تخت کا یہ واقعہ صریح نص سے ثابت ہے جو یقینی الثبوت والدلالت ہے اور ان مفسرین کی تاویل انتہائی رکیک اور قابلِ افسوس ہے جنہوں نے علم من الکتٰب کے یہ معنی بیان کئے۔

اسکے پاس مملکتِ سلیمان کا خریطہ رہتا تھا۔ لہٰذا اسے معلوم تھا کہ یہ "تختِ سلیمان" کے کس توشہ خانہ میں رکھا ہے اور خارقِ عادات معجزات کا جب ثبوت موجود ہو تو انکار اور بے دلیل انکار سے کیا فائدہ اسلئے کہ قوانینِ قدرت کا جو خالق ہے۔ اس کو یہ بھی اختیار ہے وہ قدرت کے کسی عمل کو توڑ پھوڑ دے اور یہ کیوں نہ تسلیم کیا جائے کہ اس قسم کے معجزانہ اعمال کیلئے عام قوانین قدرت کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے خاص قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کار فرما ہیں جن کو ابھی تک "علم" معلوم نہیں کر سکا اور جن پر صرف وہی پاک نفوس مطلع ہوتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں پر وہ نوامیس کے ذریعہ معجزات کا ظہور کراتا ہے "واللہ تعالیٰ یخلق ما یشاء و یختار"۔ (قصص الانبیاء ص ۳۹۶)

عندہٗ علم من الکتاب کی شخصیت

مفسرین کہتے ہیں کہ جس شخص کے متعلق قرآن عزیز نے یہ کہا ہے۔ اسکے پاس کتاب "علم" تھا اس کا نام آصف بن برخیا تھا[1] اور یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا معتمد خاص اور کاتب (وزیر) تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے یہ منقول ہے اور بعض مفسرین نے کچھ اور نام بھی ذکر کئے ہیں[2]۔ مگر زیادہ پہلے قول ہی کو راجح تسلیم کرتے ہیں۔

مفسرین نے اس مسئلہ پر بھی بحث کی ہے کہ یہ شخص انسانوں میں سے تھا یا قومِ جن سے۔ ضحاک، قتادہؒ اور مجاہدؒ کہتے ہیں کہ وہ انسانوں میں ہی سے تھا۔ (ایضاً)

اس شخص کے متعلق تیسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیت کے جملہ عندہٗ علم من الکتاب میں علم کتاب سے کیا مراد ہے؟ وہب بن منبہ، مجاہد، محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسم اعظم سے واقف تھا اور بعض جدید اہلِ قلم کہتے ہیں کہ اس سے حضرت سلیمان علیہ السلام کا درباری رجسٹر اور سرکاری دفتر مراد ہے۔ یعنی اس کو ہدایا کے رجسٹر کے امین ہونے کی وجہ سے یہ علم تھا کہ وہ "تخت" توشہ خانہ کے کس حصہ میں محفوظ ہے اور سید سلیمان فرماتے ہیں:

> عربی محاورہ میں کتاب اکثر "خط" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خود اسی جگہ قرآن میں دو جگہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسلئے آیت کا مقصود یہ ہے کہ درباریوں میں سے ملکۂ سبا کے مضمون خط کا جس کو علم تھا وہ بطورِ تحفہ اپنے ساتھ ایک تخت لائی ہے۔ اس نے کہا "میں ابھی لاتا ہوں"۔ (ارض القرآن جلد ۱ ص ۲۷۰)

ہمارے نزدیک آخر کے دونوں قول غلط اور قرآن کی تصریحات کے خلاف ہیں۔ اسلئے کہ زیرِ بحث کا یہ معاملہ ملکۂ سبا کے دربار سلیمان علیہ السلام میں پہنچنے سے قبل کا ہے تعجب ہے کہ فطرت پرستوں کی مرعوبیت میں اس صاف اور واضح بات کو کیوں نظرانداز کر دیا گیا اسی طرح رجسٹر اور دفتر سے بھی اس معاملہ کا کوئی تعلق نہیں

۱: تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۳۶۴ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۳۔

۲: ایضاً۔

سے [illegible] تھی تو ملکہ [illegible] سے [illegible] ہدیہ [illegible] دربار سلیمانی میں پہنچے ہی نہیں اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملکہ کے آنے کی خبر وحی کے ذریعہ نہیں بلکہ ہدہد یا ملکہ سبا کے کسی قاصد کے ذریعہ ہوئی جو ملکہ کا خط لے کر ملکہ کے آگے روانہ ہوا تب بھی کسی جگہ نہ قرآن میں اور نہ اسرائیلیات میں یہ مذکور ہے کہ ملکہ سے پہلے اس کے تحفہ کا تخت حضرت سلیمان کے دربار میں پہنچ چکا تھا، اس لیے کہ انکل کے یہ تیر ٹھیک ٹھکانے پر نہیں بیٹھتے اور صحیح اور راجح قول یہ ہے کہ یہ شخص آصف ہو یا کسی اور نام سے موسوم، در حقیقت حضرت سلیمان علیہ السلام کا صحابی اور ان کا بہت مقرب تھا اور جس طرح صدیق اکبر کی شخصیت نبی کریم ﷺ کی رفاقت میں نمایاں تھیں اسی طرح یہ حضرت سلیمان کا رفیق تھا اور ان کے شرف صحبت سے اس کو تورات اور زبور اور اسماء و صفات الٰہی سے متعلق اسرار حقائق کا زبردست علم حاصل تھا اس لئے کہ جب جنوں میں سے ایک "عفریت" نے تخت سبا کو حاضر کرنے کا دعویٰ کیا تو اگرچہ مقصد کے حاصل ہونے کے لئے یہ مدت بھی کافی تھی مگر سلیمان علیہ السلام کا گوشہ خاطر یہ رہا کہ یہ عمل عفریت من الجن کے ذریعہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ خدا کے کسی خاص بندے کے ہاتھ پر ہونا چاہیئے تاکہ ان کی پیغمبرانہ توجہ سے وہ "معجزہ" اور نشان بن کر ملکہ سبا کے سامنے پیش ہو آصف نے حضرت سلیمان کے اس گوشہ التفات کو سمجھ کر فوراً خود کو پیش کیا اور عفریت کی بیان کردہ مدت سے بھی قلیل مدت میں حاضر کرنے کا وعدہ کر لیا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی مبارک توجہ اس اعجاز کو پورا کر دکھائے گی، اور چونکہ معجزہ خدا تعالیٰ کا اپنا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر کیا جاتا ہے (جیسا کہ قصص القرآن جلد اول میں گزر چکا ہے) تو حضرت سلیمان نے اپنی صداقت و نبوت اور عظمت رسالت کے اس نشان کو دیکھ کر ان الفاظ میں خدائے تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ یعنی جو کچھ بھی ہوا، اس میں آصف کی یا میری سعی اور قوت کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ محض خدا کا فضل ہے جس نے یہ کام کر دکھایا ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ

ملکہ سبا کا قبول اسلام

حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کا واقعہ اس حد پر جا کے ختم ہو جاتا ہے کہ ملکہ نے پیغمبرانہ جاہ و جلال کو دیکھ کر اسلام قبول کر لیا وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور اس مکمل واقعے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہی ایک غرض تھی جس کا اظہار انھوں نے اپنے پہلے مکتوب ہی میں کر دیا تھا مگر ملکہ اس غرض کو نہ پا سکی تھی۔

عام مفسرین کی نگاہوں میں یہ سوال حل طلب رہا ہے کہ اس مقصد کیلئے حضرت سلیمان علیہ السلام کا ملکہ کو اپنے دربار میں بلانا تو بے شک اپنی جگہ رکھتا ہے لیکن تخت کو اس طرح منگوانا اور آبگینہ کے محل کے سامنے ملکہ کے ساتھ پیش آمد و معاملہ ہونا، اس مقصد سے کیا تعلق رکھتا ہے؟ اور پھر خود ہی یہ جواب دیا ہے کہ اس سے ملکہ سبا پر یہ اثر ڈالنا مقصود تھا کہ وہ یہ یقین کر لے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بلانے کی غرض دنیوی لالچ اور دولت و حکومت میں اضافہ نہیں ہے بلکہ اس سے بلند و بالا دوسرا مقصد ہے۔ نیز وہ یہ سمجھ جائے کہ یہ دونوں واقعات شاہانہ اقتدار اور قاہرانہ قوت و طاقت سے بالاتر اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی پیغمبرانہ صداقت کا نشان

ہیں۔ اسی لئے مفسرین نے ملکہ سبا کے قول كُنَّا مُسْلِمِيْنَ میں اسلام بمعنی ایمان مراد لیا ہے۔ یعنی ملکہ نے حقیقی معنی میں اسلام قبول کر لیا۔

لیکن مفسرین کی حکمت و مصلحت کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے ان کی اس دلیل پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے کہ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ کہہ کر ملکہ نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ تو اس کے بعد کی آیات کے ان دو جملوں کے کیا معنی ہوں گے وَ صَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ اور اس کو ایمان لانے سے ماسوی اللہ (آفتاب) کی عبادت نے باز رکھا۔ کیونکہ بے شبہ وہ قوم کافرین میں سے تھی قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی آبگینہ کے محل کے واقعہ سے متاثر ہو کر ملکہ نے یہ کہا کہ "اب تک میں نے شرک کر کے نفس پر ظلم کیا اور اب میں رب العلمین پر ایمان لائی ہوں"۔

ان دونوں جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ کہتے وقت وہ مسلمان نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد دوسرے واقعہ سے متاثر ہو کر پھر دین اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ حالانکہ دونوں باتوں کا مظاہرہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار ہی میں ہو رہا تھا۔ چنانچہ مجاہدؒ، سعیدؒ اور ابن جریرؒ نے اس اعتراض کو تسلیم کرتے ہوئے زیر بحث آیات کی یہ تفسیر کی ہے کہ جملہ وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ سے مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ تک سب حضرت سلیمان علیہ السلام کا مقولہ ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ ہم کو ملکۂ سبا کی آمد سے قبل ہی یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ملکہ کافروں میں سے ہے اور ہم بہر حال مسلمان ہیں اور ملکہ کو آفتاب پرستی نے ماسوی اللہ کی پرستش کا عادی بنا کر خدائے واحد کی عبادت سے روگرداں کر دیا ہے۔

اور ابن کثیرؒ نے مجاہد کی اس تفسیر کو نقل کر کے کہا ہے کہ یہ قول راجح ہے اسلئے کہ ملکۂ سبا ابھی تک مسلمان نہیں ہوئی تھیں بلکہ بصراحت قرآن وہ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ کے واقعہ کے بعد ایمان لائی ہے لہٰذا كُنَّا مُسْلِمِيْنَ اس کا مقولہ نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس تفسیر میں یہ سقم ہے کہ ضمائر کے مرجع میں بے ترتیبی اور خلل واقع ہوتا ہے یعنی جبکہ جملہ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ میں قالت کی قائل ملکۂ سبا ہے اور اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کا کوئی ذکر نہیں ہے تو بعد کے جملہ وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ کو جو پہلے جملہ کے متصل ہے۔ کس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کا مقولہ کہا جا سکتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان دونوں جملوں کے درمیان قَالَ سُلَيْمٰنُ یا فقط "قال" مقدر ہے تو یہ دعوی بے دلیل ہے اور جبکہ مرجع کے اختلال کے بغیر ہی آیات کی صحیح تفسیر ہو سکتی ہو تو بے وجہ مقدر ماننے کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے۔ چنانچہ آیات زیر بحث کی ایسی تفسیر جس میں یہ دونوں سقم بھی باقی نہ رہیں اور ہر دو واقعات کی حکمت و مصلحت بھی روشن اور نمایاں ہو جائے۔ شیخ الہند[1] سے بواسطہ علامہ سید حسین احمد مدنی منقول ہے، فرماتے ہیں:

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کی معرفت جو پیغام بھیجا تھا اس میں یہ لکھ کر وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ملکۂ سبا

[1] حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نور اللہ مرقدہ۔

کو صریح الفاظ میں دعوتِ اسلام دی تھی مگر ملکۂ سبا چونکہ حقیقتِ توحید اور دینِ اسلام سے ناآشنا تھی۔ اسلئے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے مطلب کو نہ سمجھ سکی اور مکتوبِ گرامی میں الا تعلوا علی کے بعد اس نے جب واتونی مسلمین کو پڑھا تو وہ شاہوں کی خط و کتابت کے پیشِ نظر یہ سمجھی کہ سلیمان علیہ السلام اپنے قاہرانہ اقتدار کے زور میں مجھ کو اور میری حکومت کو اپنا تابع فرمان اور زیرِ نگیں بنانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے اسنے اپنے درباریوں سے مشورہ کے بعد دریافتِ حال کیلئے وہ طریقہ اختیار کیا جس کا ذکر قرآن کر رہا ہے اور جب اس کو یہ یقین ہو گیا کہ درحقیقت سلیمان علیہ السلام کی شاہانہ عظمت اور قاہرانہ سطوت شاہنشاہوں سے بھی زیادہ بلند ہے تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ سلیمان علیہ السلام سے جنگ مناسب نہیں اور ان کی اطاعت و انقیاد ہی میں نجات ہے۔ اسلئے ملکہ شام کی جانب روانہ ہو گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب یہ اطلاع ملی کہ ملکۂ سباان کی خدمت میں حاضری کیلئے روانہ ہو چکی ہے تو سوچا کہ ایسا کوئی لطیف طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس سے ملکۂ سبا خود یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائے کہ آفتاب پرستی یقیناً گمراہی ہے اور سیدھی اور سچی راہ یہ ہے کہ صرف خدائے واحد کی پرستش کی جائے۔

قومِ سبا کا مذہب آفتاب پرستی تھا اور وہ اس فلسفہ کی قائل تھی کہ کائنات میں خیر و شر کی قدرت و طاقت کواکب کے ہاتھ میں ہے اور چونکہ آفتاب ان میں سب سے بڑا اور کائنات پر اثر انداز ہے اسلئے وہی اس قابل ہے کہ اس کی پرستش کی جائے۔ اسلئے حضرت سلیمان علیہ السلام ملکہ کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ کائنات کی ان چھوٹی اور بڑی تمام اشیاء پر صرف ایک "حقیقت" کا تسلط ہے اور وہ خدائے کائنات ہے اور آفتاب و ماہتاب، کواکب و سیارگان یہ سب اس کی مخلوق اور اس کی قدرت کے مظاہر ہیں۔ لہٰذا انسان کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ وہ حقیقت کو چھوڑ کر مظاہر کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے سامنے مشاہد اور محسوس ہیں۔ حالانکہ مظاہر صرف "حقیقت" کے وجود اور اس کی ہستی کیلئے دلیل ہیں نہ کہ بجائے خود "حقیقت" اسی لئے تغیر و تبدل، وجود و فنا، طلوع و غروب، ناپائیداری و بے ثباتی مظاہر کے رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے ہے اور حقیقت (ذاتِ واحد) ان تمام تغیرات سے پاک اور بالاتر ہے یہ سوچ کر انہوں نے ملکہ کے شاہی تخت کو یمن سے اٹھا منگایا تاکہ اس کے نزدیک سے ایک مثال دے کر اس کو بتائیں اور اس پر یہ واضح اور ثابت کریں کہ دیکھ میرے اس دعوے کی دلیل خود تیرا یہ تختِ شاہی ہے۔ غور کر کہ یہ تیری حکومت و سطوت کا مظہر ہے اور اسی لئے "تختِ شاہی" کہلاتا ہے۔ مگر جوں ہی تو اپنے ملک سے غائب ہوئی یہ "مظہر" بے حقیقت ہو کر رہ گیا اور کل جو تیری سطوت کا مظہر تھا۔ آج وہ میرے دربار کی زینت بنا ہوا ہے اور یہاں بھی تبدیلِ ہیئت و صورت کے ہاتھ تجھ کو اپنی بے ثباتی اور ناپائیداری کا درس دے رہا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس ارادہ کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ جب انہوں نے ملکہ کا تخت اپنے دربار میں منگا لیا تو اس میں تغیر کا حکم دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا ننظر اتھتدی ام تکون من الذین لا یھتدون ہم یہ اسلئے کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھیں کہ وہ اس واقعہ سے متاثر ہو کر ہدایت قبول کرتی ہے یا گمراہ ہی رہتی ہے۔ اس اعتبار سے یہاں "ہدایت" سے خاص اسلام کی ہدایت مراد ہے نہ کہ محض "راہیاب" ہونا جو کہ ہر معاملہ کی حقیقت پر آگاہ ہو جانے کیلئے عام ہے۔

اس اسلوبِ بیان سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا پر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ان کا جلال وجبروت صرف شاہانہ اقتدار اور حاکمانہ قوت وسطوت کی وجہ سے ہی نہیں ہے۔ بلکہ اسکی پشت پر خدائے تعالیٰ کی وہ طاقت کار فرما ہے۔ جو شاہنشاہوں کی قاہرانہ جبروت کی دسترس سے بھی بالاتر پیغمبرانہ جاہ وجلال کے ساتھ "نشان الٰہی" کے نام سے وابستہ رہتی ہے اور ساتھ ہی تبلیغ ودعوت کے مسطورہ بالا طریقۂ خصوصی کے ذریعہ یہ بھی واضح کر دیا کہ سبا کی آفتاب پرستی حقیقت کو چھوڑ کر مظہر کی، باقی سے منہ موڑ کر فانی کی، قدیم سے روگرداں ہو کر حادث کی، صمد سے رخ بدل کر محتاج کی اور خالق سے نگاہ پھیر کر مخلوق کی پرستش ہے اور یہ سخت گمراہی اور ضلالت کی راہ ہے اور صراطِ مستقیم یہ ہے کہ صرف "حقیقت" (خدائے واحد) ہی کو نفع وضرر اور خیر وشر کا مالک سمجھا جائے اور فقط اس کی ہی عبادت کی جائے۔

لیکن قومِ سبا چونکہ صدیوں سے غیر اللہ کی پرستش میں اعتقاد رکھتی تھی۔ اسلئے ملکہ اس لطیف دلیل کے سمجھنے سے قاصر رہی اور اس کی عقل وخرد حقیقت کی معرفت تک نہ پہنچ سکی اور "تخت" کے اس پورے واقعہ سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ سلیمان علیہ السلام اس محیر العقول طریقہ سے اپنی بے مثال شان وشوکت کا مظاہرہ کر کے مجھ کو اپنی اطاعت وفرماں برداری کیلئے متاثر کر رہے ہیں، چنانچہ ملکہ نے یہی سوچ کر یہ جواب دیا "آپ اگر یہ زبردست مظاہرہ نہ بھی کرتے تب بھی ہم کو پہلے سے آپ کے جلال وجبروت کا حال معلوم ہو چکا ہے اور ہم آپ کے تابع اور حکم بردار ہو چکے ہیں اور ملکہ کے اس جواب کو نقل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے درمیان میں اس کی صدیوں کی گمراہی اور معاملہ کی اصل حقیقت کے متعلق قصورِ فہم کی وجہ بھی یہ بیان فرمادی کہ آفتاب پرستی کی مداومت نے اب بھی اس کو قبولِ اسلام سے باز رکھا اور وہ کافر ہی رہی۔

یہی دو باتیں ہیں جو آیت ذیل میں بغیر کسی تاویل کے صاف اور واضح طور پر بیان کی گئی ہیں قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ ۔ وَصَدَّهَا مَا كَانَت تَّعْبُدُ مِن دُونِ اللَّهِ إِنَّهَا كَانَتْ مِن قَوْمٍ كَافِرِينَ ۔

اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے دوسرا مظاہرہ کیا جو اس بارہ میں پہلے سے زیادہ واضح اور روشن تھا اور یہ آبگینہ کے محل کا واقعہ تھا۔ ملکہ نے جب یہ سمجھ کر صاف شفاف پانی بہہ رہا ہے اپنے کپڑے سمیٹے اور پانی میں اترنے کا ارادہ کیا تو اس کو بتایا گیا کہ جس کو تو پانی سمجھ رہی ہے وہ آبگینہ کا عکس ہے پانی نہیں ہے۔ ملکہ پر جب اس حقیقت کا انکشاف ہوا تو اب اس کا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ان مظاہروں سے کیا مقصد ہے؟ اور اب اس کی عقل ودانش کی اس حقیقت تک رسائی ہوئی کہ جس طرح میں نے یہ غلطی کی ہے کہ ایک شے کے پرتو عکس اور مظہر کو "حقیقت" جان کر اس کے ساتھ حقیقت کا سا معاملہ کرنا چاہا تو اسی طرح بے شبہ میں اور میری قوم اس گمراہی میں مبتلا ہیں کہ آفتاب کی پرستش کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ حقیقت (خدائے واحد) کی قدرت کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے اور اس سے بڑھ کر اور کون سا ظلم ہو سکتا ہے کہ حقیقت کو چھوڑ کر مظہر کی پرستش کی جائے اور اب وہ یہ سمجھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکتوبِ گرامی میں جملہ وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ کا کیا مطلب تھا، چنانچہ ملکہ کے قلب میں یہ خیال آنا تھا کہ وہ فوراً پکار اٹھی رَبِّ إِنِّي

ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

شیخ الہند (نور اللہ مرقدہٗ) کی اس تفسیر سے آیات کے انسجام اور ان کے مرجعوں کی ترتیب میں بھی کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اور حذف و تقدیر کلام کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی اور ہر دو واقعات سے متعلق حکمت و مصلحت اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی پیغمبرانہ دعوت و ارشاد اور جاہ و جلال کی عظمت کا اظہار بھی حسن و خوبی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

ملکۂ سبا کے پہلے مقولہ وَ کُنَّا مُسْلِمِیْنَ میں "اسلام" بمعنی انقیاد و اطاعت کی نظیر سورۂ حجرات کی وہ آیت ہے جو اعراب مدینہ کے دعوئ ایمان پر نازل ہوئی قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا اعرابی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ کہہ دیجئے تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم تابع دار اور منقاد ہو گئے ہیں اور اس جملہ کُنَّا مُسْلِمِیْنَ میں "اسلام" بمعنی انقیاد و اطاعت اور جملہ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں "اسلام" بمعنی دین اسلام کا فرق اور دونوں معانی کا تفاوت خود قرآن عزیز کی ان آیات سے ہی ظاہر کہ پہلے جملہ میں ملکۂ سبا نے کوئی ایسی تفصیل نہیں بیان کی جس میں شرک سے بیزاری اور توحید کے قبول کا ذکر ہو اور اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے جملہ کے بعد بھی ہی ظاہر فرمایا کہ آفتاب پرستی اس کو اسلام سے باز رکھے ہوئے ہے اور وہ کافروں میں سے ہے لیکن آخری جملہ میں ملکہ نے صراحت کے ساتھ یہ اقرار کیا کہ اب اس کا اسلام لغوی نہیں بلکہ دین اسلام کا اصطلاحی اسلام ہے اور جو سلیمان علیہ السلام کیلئے نہیں بلکہ سلیمان علیہ السلام کی رفاقت میں "رب العلمین" کیلئے ہے اور غالباً اسی تفاوت کے پیشِ نظر پہلے جملہ میں ملکہ نے اپنے ساتھ ارکانِ سلطنت اور رعایا کو شامل کر کے جمع کی تعبیر اختیار کی کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے شاہانہ اقتدار کی اطاعت کا مسئلہ ملکہ اور ملکہ کے ارکین دولت کے درمیان مشورہ کے بعد باتفاق طے شدہ تھا اور دینِ اسلام کے قبول کا مسئلہ اس کے اپنے ذاتی یقین پر مبنی تھا۔ اس لئے اس کے اظہار میں اس سے انفرادیت اختیار کی اگرچہ اس زمانہ کے عام دستور کے مطابق بادشاہ کا مذہب خود بخود رعایا کا مقبول مذہب ہو جاتا تھا اور غالباً اس کی قوم نے بھی دینِ اسلام قبول کر لیا ہو گا۔ غرض یہ تفسیر بہت لطیف اور ہر حیثیت سے راجح اور قابلِ قبول ہے۔

توراۃ میں ملکۂ سبا کا ذکر

توارت میں بھی ملکۂ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملاقات کا ذکر موجود ہے، چنانچہ سلاطین[1] میں ہے:

"اور جب کہ خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سبا کی ملکہ تک پہنچی تو وہ مشکل سوالوں سے اسے آزمانے آئی اور بڑے جلو کے ساتھ اونٹوں کے ساتھ جن پر خوشبوئیں لدی ہوئی تھیں اور بہت سونا اور انمول جواہرات ساتھ لے کے یروشلم میں آئی اور اس نے سلیمان کے پاس آ کے جو کچھ اس کے دل میں تھا سب کی بابت اس سے گفتگو کی۔ سلیمان نے اس کے سب سوالوں کا جواب دیا۔ بادشاہ سے کوئی بات پوشیدہ نہ تھی۔ جو اس کے کسی سوال کا جواب نہ دیتا

---

1 باب ۱۰ آیت ۱۔ ۱۰

اور جبکہ سبائی ملکہ نے سلیمان کی ساری دانشمندی کا حال اور اس گھر کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دستر خوان کی نعمتوں کو اور اس کے ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی خاطر باشی اور انکی پوشاک اور اس کے ساقیوں اور اس سیڑھی کو کہ جس سے وہ خداوند کے مسکن کو جاتا تھا دیکھا تو اس کے حواس نہ رہے اس نے بادشاہ سے کہا یہ تحقیق خبر تھی جو میں نے تیری کرامتوں اور تیری دانش کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی ... وہ خبر جو میں نے سنی تھی کہیں زیادہ ہے۔ نیک بخت ہیں تیرے لوگ اور نیک بخت ہیں۔ تیرے خواص جو تیرے حضور کھڑے رہتے ہیں اور تیری حکمت سنتے ہیں خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے راضی ہے اور تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا اسلئے کہ خداوند نے اسرائیلیوں کو سدا پیار کیا۔ (باب ۱۰۔ آیات ۱۰-۱)

تورات کے بیان میں اگرچہ ملکہ کے مسلمان ہونے کا ذکر نہیں ہے لیکن آخر کے جملے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اسرائیلی خدا پر ایمان لے آئی تھی تب ہی تو اس کا ذکر اس عقیدتمندی سے کرتی ہے۔

مگر قرآن اور تورات کے بیان میں یہ فرق نمایاں ہے کہ قرآنِ عزیز کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بایں جاہ و جلال ملکۂ سبا کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ ایک اولوالعزم پیغمبر کی طرح کا تھا اور قرآن کے بیان سے بات بات میں تبلیغ و دعوت اور پیغمبرانہ شان نظر آتی ہے۔ لیکن تورات کے بیان میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی دانشمندی اور شاہانہ اقتدار کے ماسوا اور کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ بنی اسرائیل کے اس غلط عقیدہ کا نتیجہ ہے۔ جو انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق اختراع کر لیا تھا کہ وہ پیغمبر نہیں ہیں صرف بادشاہ ہیں۔

اور قرآنِ عزیز جبکہ اصلاحِ عقائد و اعمال کے ساتھ ساتھ اممِ سابقہ اور ان کے انبیاء و رسل سے متعلق واقعات میں بنی اسرائیل کی تحریف و تبدیل اور ان کے غلط فضول اختراعات کی اصلاح کا بھی مدعی ہے۔ اسلئے اس نے اس مقام پر بھی واقعہ سے متعلق صحیح حقائق کو بیان اور ان غلطیوں کو واضح کر دیا جو کتبِ سابقہ میں پائی جاتی ہیں۔

ملکۂ سبا کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ نکاح

کتبِ تفاسیر میں منقول ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا (بلقیس) سے نکاح کر لیا اور اسکو اپنے ملک میں جانے کی اجازت دی اور حضرت سلیمان علیہ السلام گاہے گاہے اس سے ملاقات فرماتے رہتے تھے۔[1] لیکن قرآنِ عزیز اور احادیثِ صحیحہ میں نفی یا اثبات دونوں حیثیتوں میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اسرائیلیات

بلقیس، ملکۂ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس واقعہ سے متعلق بیان کردہ تفصیلات کے علاوہ اور بھی

---

[1] باب ۲۰۔ آیات ۱۰-۱

عجیب و غریب اور دور از کار باتیں کتب سیر میں مذکور ہیں جو اول سے آخر تک اسرائیلیات اور یہودی روایات سے ماخوذ ہیں۔ چنانچہ ان کے متعلق ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے:

"اس سلسلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک عجیب روایت منقول ہے جس کو ابن السائب کی سند سے ابو بکر بن ابی شیبہ نے اس روایت کے متعلق کہا ہے کہ یہ کیسا دل خوش کن واقعہ ہے مگر میں کہتا ہوں کہ ابن ابی شیبہ کو یہ نہیں کہنا چاہئے بلکہ یہ روایت قابل انکار ہے اور بے شبہ اس کے بیان کرنے میں عطا بن سائب کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ وہ اس روایت کو ابن عباس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ قرین قیاس یہ ہے کہ اس قسم کا طرز روایت دراصل اہل کتاب کے صحیفوں سے ماخوذ ہے اور واقعہ کی یہ تفصیلات اسی طرح کی ہیں۔ جیسا کہ کعب احبار اور وہب بن منبہ بنی اسرائیل کے قصے ان کی کتابوں سے نقل کر کے اس امت کو سنایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ درگزر کا معاملہ کرے، کہ وہ ان قصوں میں عجیب و غیب اور قابل انکار باتیں اور واقعی و غیر واقعی اور تحریف شدہ و مسخ شدہ ہر قسم کے واقعات نقل کر دیا کرتے تھے۔ حالانکہ اللہ سبحانہٗ نے ہم کو ان فضول اور لغو باتوں سے قطعی غنی اور بے پروا کر دیا ہے اور ہم کو ایسا علم (قرآن) عطا کیا ہے جو واقعات کی صحت، نیک مقصد کی افادیت، مطالب کی وضاحت اور کلام کی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بہت برتر اور بلند ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۳۶۲، ۳۶۲)

قصص القرآن میں واقعات کی تحقیق کے سلسلہ میں بار بار یہ کہا جاتا رہا ہے کہ فلاں روایت صحیح ہے اور فلاں اسرائیلی روایت ہے تو اسرائیلیات سے کیا مراد ہے یہ بات قابل وضاحت ہے۔

بنی اسرائیل کی روایات کا مدار بیشتر تورات پر ہے، عبرانی زبان میں تورات کے معنی "شریعت" کے ہیں۔ اسلئے اس کا عمومی اطلاق سفر تکوین (پیدائش) سفر خروج سفر احبار، سفر عدد، سفر استثناء پر ہوتا ہے۔ توراۃ کے علاوہ دوسرا سلسلہ نبیئیم ہے۔ یہ عبرانی قاعدہ لغت کے اعتبار سے "نبی" کی جمع ہے۔ عبرانی میں "ی" اور "م" اضافہ کر کے جمع بناتے ہیں۔ یہ بنی اسرائیل کے انبیاء کے مواعظ، مراثی اور بنی اسرائیل کے کلام اور مختصر تاریخ کا ذخیرہ ہے۔ جن میں سفر یوشع، سفر القضاۃ، سفر سموئیل، سفر ایام، سفر ملوک خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ آج کل نبیئیم بھی توراۃ کا ہی حصہ شمار ہوتا ہے۔ تیسرا حصہ ترگوم ہے۔ عربی زبان میں "ترجمہ" کو کہتے ہیں۔ یہودی علماء نے توراۃ اور نبیئیم کی آرامی زبان میں تفسیر کی ہے۔ جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے یہ تفسیر انبیاء علیہم السلام سے سنی ہے۔ چوتھا حصہ مدراش ہے۔ اس کی حیثیت یہود کے یہاں وہ ہے جو اسلام میں حدیث کا درجہ ہے، پانچواں حصہ تالمود ہے۔ یہ بنی اسرائیل کا فقہ ہے اور ان سب کے علاوہ بعض وہ قصص و حکایات ہیں۔ جن کو یہود سینہ بہ سینہ اپنی یادداشت سے مذہبی نقول کی طرح نقل اور بیان کرتے چلے آتے ہیں۔

یہود کے سلسلۂ روایات کی یہ تمام اقسام وہ ہیں جو اسرائیلیات کہلاتی ہیں اور ان میں سے بعض روایات ان علماء یہود کے ذریعہ جو مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ مسلمانوں میں بھی نقل ہو کر مشہور ہو گئیں اور اسلئے ہمیشہ علماء محققین کا مقدس گروہ ان پر تنبیہ کرتا اور ان سے اسلامی روایات کو پاک کرتا چلا آتا ہے اور صرف انہی روایات

کے ذکر سے چشم پوشی کرتا ہے۔ جو قرآن عزیز صحیح احادیث کے مضامین کی تائید کرتی ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکتوب کا اعجاز

ماہرین ادبیات کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو جو خط دعوت اسلام میں بھیجا وہ دنیا کے ان خطوط میں جو آج تک تحریر کئے گئے ہیں۔ یکتا اور بے مثال ہے اور یہ دعویٰ حسن عقیدت کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ دعوے کی بنیاد اس دلیل پر قائم ہے کہ اس قدر اہم اور نازک مسئلہ پر نہایت مختصر مگر مقصد کے لحاظ سے بہت واضح، فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے نہایت رفیع، ادائے بیان اور طرز ادا کے پیش نظر بے حد لطیف و شیریں، پر شوکت و دلنشیں غرض مجموعہ صفات سے متصف کوئی خط کسی بڑے انسان کا تب تاریخ میں اس کے علاوہ ایسا موجود نہیں ہے جو اس کا مقابلہ کر سکے۔

مضمون خط میں خلل انداز نہ ہونے والے انتہائی اختصار کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی ربوبیت، خالقیت و مالکیت، عام کا اظہار، پیغمبرانہ پیغام حق کا اعلان، حاکمانہ و قاہرانہ اقتدار کا مظاہرہ اور اپنا ذاتی تعارف، جیسے اہم امور کو جس خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔ اس پر یہ مثال صادق آتی ہے "گویا دریا کوزہ میں بند ہے"۔

خط کی عبارت کو مطالعہ کیجئے اور پھر مسطورۂ بالا خصوصیات و امتیازات کا اندازہ کیجئے اور بتایئے کہ مجموعۂ الفاظ و معنی کے لحاظ سے یہ خط "اعجاز" نہیں تو اور کیا ہے:

إِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهٗ بِاسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ أَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَأْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ○ (سورۂ نمل)

یہ خط ہے سلیمان کی جانب سے اور یہ شروع ہے اللہ کے نام سے جو رحمٰن ہے اور جو بڑا مہربان۔ مجھ پر اپنی دھاک نہ بٹھاؤ اور نہ برتری کا مظاہرہ کرو اور خدا کے فرمانبردار بن کر میرے پاس حاضر ہو۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا بہتان

گزشتہ صفحات میں تاریخی نقول سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنی الہامی کتابوں میں تحریف کر دی تھی اور اپنی اغراض دنیوی کی خاطر ان میں ہر قسم کا ردوبدل کر دیا تھا۔ چنانچہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے معاملہ میں تو اس درجہ جسارت اختیار کی کہ ان کی نبوت و رسالت سے بھی انکار کر کے ان پر طرح طرح کے الزام اور بے ہودہ بہتان لگائے۔ منجملہ دوسرے الزامات کے ایک الزام حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ بھی لگایا کہ وہ جادو کے حامل اور اس ہی کے زور پر "کنگ سلیمان" تھے اور جن وانس اور وحوش وطیور کو مسخر کئے ہوئے تھے۔

قرآن عزیز نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے بنی اسرائیل کے لگائے ہوئے اس بہتان کی مدلل تردید کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی پیغمبرانہ عظمت کو نمایاں اور روشن کیا۔ اس نے بتایا کہ سلیمان علیہ السلام کا دامن جادو کی نجاست سے پاک ہے اور اصل حقیقت یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے کیلئے

شیاطین (انس و جن) نے سحر کو سکھایا اور اس کو مدون کیا اور بنی اسرائیل نے کتاب اللہ (تورات و زبور) کو پس پشت ڈال کر اس کو الہامی قانون سمجھا اور جادو سیکھنے سکھانے لگے اور جب بنی اسرائیل میں سے مخصوص اہل حق نے ان کو سمجھایا اور بتایا کہ یہ سخت گمراہی اور کفر ہے تم اس سے باز آ جاؤ تو شیطانوں کے بہکانے پر انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ سلیمان علیہ السلام کا سکھایا ہوا علم ہے اور سلیمان علیہ السلام اسی کے ذریعہ سے اتنی بڑی حکومت کے مالک تھے اور یہ کہہ کر اپنی گمراہی پر قائم رہے۔ مگر وہ اس قول میں جھوٹ بولتے اور حضرت سلیمان علیہ السلام پر بہتان طرازی کرتے ہیں۔

سدی کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کی زندگی میں بنی اسرائیل میں یہ گمراہی شروع ہو گئی تھی اور ان میں بھی مشہور ہو گیا تھا کہ ''جن ''علم غیب جانتے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے شیاطین کے ان تمام نوشتوں کو حاصل کر کے اپنے تخت کے نیچے دفن کر دیا تاکہ جن وانس کسی کو وہاں تک پہنچنے کی جرأت نہ ہو سکے اور ساتھ ہی یہ فرمان جاری کر دیا کہ جو شخص سحر کرے گا یا جنوں کے متعلق علم غیب کا عقیدہ رکھے گا تو اس کو قتل کی سزا دی جائے گی۔ لیکن جب سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہو گیا تو شیاطین نے اس مدفون ذخیرہ کو نکال لیا اور بنی اسرائیل میں یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ جادو کا یہ علم حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم ہے اور وہ اسی وقت سے جن وانس، وحوش وطیور اور ہوا پر حکومت کرتے تھے اور اس طرح جادو کو پھر بنی اسرائیل میں رائج کر دیا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد اص ۱۳۴)

قرآنِ عزیز نے اس تاریخی حقیقت کو اس ضمن میں بیان کیا ہے کہ بنی اسرائیل باوجود اس یقین رکھنے کے کہ نبی اکرم ﷺ خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور ان کی نبوت کی بشارات کثرت سے کتب عہد قدیم میں موجود ہیں۔ پھر بھی ضد اور ہٹ کی راہ سے رسولِ خدا ﷺ کی نبوت و رسالت کا انکار کرتے ہیں اور کتب الہیہ کو پس پشت ڈال کر اسی طرح شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔ جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں جادو کے متعلق کر چکے ہیں اور آج تک بیجا جسارت کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب کفر (جادو) کی نسبت کرتے چلے آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن عزیز کا سیاق سباق اس حقیقت کو بخوبی واضح کر رہا ہے:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۱) وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَآ أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ

اشْتَرَاهُ مَا لَهٗ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۂ بقرہ)

اور جب ان (بنی اسرائیل) کے پاس اللہ کی جانب سے رسول آیا جو تصدیق کر رہا ہے۔ ان الہامی کتابوں کی جو ان کے پاس ہیں تو جو لوگ (بنی اسرائیل) کتاب (توراۃ) دیئے گئے تھے۔ انہوں نے اللہ کی کتاب (توراۃ کو پس پشت ڈال دیا اور آپ کی صداقت کی بشارت) کے متعلق ایسے ہو گئے گویا وہ جانتے ہی نہیں اور (یہ تو وہ لوگ ہیں کہ) انہوں نے سلیمان کے زمانہ میں اس چیز کی پیروی اختیار کر لی تھی جو شیاطین پڑھتے تھے اور سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا۔ لیکن شیاطین نے کفر کیا تھا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور وہ (علم) جو بابل میں ہاروت، ماروت دو فرشتوں پر نازل کیا گیا اور جس کو کہ وہ دونوں جب کسی کو سکھاتے تھے تو یہ کہہ کر سکھاتے تھے کہ ہم (تمہارے لیے) سخت آزمائش ہیں۔ لہٰذا تم (اب) کفر نہ کرنا مگر وہ (بنی اسرائیل) ان دونوں سے بھی ایسی بات سیکھتے کہ جس کے ذریعہ سے زن و شو کے درمیان تفریق پیدا ہو جائے حالانکہ وہ اس کے ذریعہ سے خدا کی مرضی کے بغیر کسی کو بھی نقصان پہنچا نہیں سکتے (البتہ) وہ ایسی شے سیکھتے ہیں جو (انجام کار) ان کو نقصان پہنچانے والی ہے اور ان کو ہرگز نفع نہیں دے گی اور بے شبہ وہ جانتے ہیں کہ جس شخص نے اس شے (جادو) کو خریدا۔ اس کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور ضرور وہ شے بہت بری ہے جس کے عوض میں انہوں نے اپنی جان فروخت کر ڈالی کاش کہ وہ سمجھتے (یعنی سمجھنے کے بعد اس سے بچتے) اور وہ کام نہ کرتے جس کا نتیجہ برا ہے۔

مسطورۂ بالا آیات میں جن حقائق کو واضح کیا گیا ہے۔ ان کی تفسیر میں مفسرین مختلف ذوق رکھتے ہیں۔ اسلیئے کہ ان تین باتوں کے علاوہ جن کا گزشتہ سطور میں ذکر آ چکا ہے واقعے کی باقی تفصیلات کے بارے میں قرآن عزیز خاموش ہے، کیونکہ وہ تفصیلات اس کے مقصد کے لئے ضروری نہیں ہیں چنانچہ اس سلسلے کی تفاسیر میں سے ہم نے ترجمے میں عام تفسیر سے جدا راہ اختیار کی ہے جو آیۃ من آیات اللہ محقق عصر علامہ محمد انور شاہ (نور اللہ مرقدہ) کی تحقیق سے ماخوذ ہے حضرت استاد کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

''جب بنی اسرائیل کو شیاطین نے سحر سکھا کر گمراہ کر دیا اور شیاطین کو غیب داں یقین کرنے لگے اور یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات ہو چکی تھی اور اس وقت ان کے درمیان خدا کا کوئی نبی موجود نہ تھا اور بنی اسرائیل کو راہ ہدایت دکھانے اور سنبھالنے کے لئے اس معجزانہ طریقے کے مطابق جو صدیوں سے ان کے لئے حق تعالیٰ کی جانب سے سنت متوارثہ بنا ہوا تھا۔ ہاروت ماروت دو فرشتے آسمان سے نازل کیے گئے اور انھوں نے بنی اسرائیل کو تورات سے ماخوذ اسماء و صفات الٰہی کے اسرار کا ایسا علم سکھایا جو ''سحر'' کے مقابلے میں ممتاز، اور سحر کے ناپاک اثرات سے پاک تھا اور اس کی وجہ سے اسرائیلی بآسانی یہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ ''سحر'' ہے اور یہ ''علوی علم الاسرار'' ہے اور جب فرشتے بنی اسرائیل کو یہ علم سکھاتے تو پھر ان کو نصیحت کرتے کہ اب جب کہ تم پر اصل حقیقت منکشف ہو گئی اور تم نے حق و باطل کے درمیان چشم دید مشاہدہ کر لیا تو اب کتاب اللہ کے علم کو پس پشت ڈال کر پھر بھی سحر کی طرف رجوع کرو گے تو تم بے شبہ کافر ہو جاؤ گے کیونکہ خدا کی حجت تم پر تمام ہو گئی اور اب تمہارے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہا، گویا ہمارا وجود تمہارے لئے ایک آزمائش ہے

کہ تم ہماری تعلیم کے بعد شیاطین کے تابع ہو کر ''سحر'' ہی کے تابع رہتے ہو یا اس سے زیادہ زبردست اور رام حق کتاب اللہ کے علم کی پیروی کرتے ہو؟ لیکن بنی اسرائیل کی کج فطرت نے اس موقع پر بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور انہوں نے اس پاک علوی کو بھی ناجائز اور حرام خواہشات کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا مثلاً زن و شو کے درمیان ناحق تفریق وغیرہ، اور اس طرح حق کو باطل کے ساتھ غلط ملط کر کے بھی اس کو بھی ایک کرشمہ بنا دیا۔ اور حق کو باطل کے ساتھ خلط کرنے یا کسی پاک جملہ کے خواص واثرات کو ناجائز اور حرام کاموں میں استعمال کرنے کے متعلق علماء حق کی تصریحات موجود ہیں کہ یہ بھی ساحرانہ اعمال کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اسی لئے حرام اور کفر ہے۔[1]

حضرت شاہ صاحبؒ کی اس تفسیر کے مطابق آیت وما انزل علی الملکین میں ما نافیہ نہیں ہے بلکہ بمعنی الذی ہے۔ اسلئے کہ آیت میں سحر اور ما انزل کے درمیان معطوف اور معطوف علیہ کی نسبت ہے اور عربیت کے قاعدہ سے عطف، مغائرت کلام کیلئے ہوتا ہے۔ لہذا آیات زیر بحث میں ''سحر'' الگ شے ہے جو شیاطین کے ذریعہ سے وجود پذیر ہوتا ہے اور فرشتوں کا لایا ہوا علم دوسری شے ہے۔ جو پاک مقصد کیلئے تعلیم کیا گیا۔ لہذا فرشتوں کی جانب سحر کی نسبت صحیح نہیں ہو سکتی۔ یہ تفسیر، معانی کی ترتیب، سیاق و سباق کی مطابقت اور حقائق وواقع کی وضاحت کے لحاظ سے بہت وقیع ہے اور اس لئے ہم اسی کو راجح سمجھتے ہیں۔

اس تفسیر کے علاوہ دوسری تفسیر مشہور نحوی فراء سے منقول ہے۔ وہ ما انزل میں ما کو نافیہ تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سحر کی تعلیم شیاطین کے ذریعہ پھیلی اور ان کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ یہ سلیمان علیہ السلام کا علم ہے اور یہ بھی غلط کہ بابل میں ہاروت، ماروت دو فرشتے نازل ہوئے اور وہ بنی اسرائیل کو جادو سکھاتے اور سکھاتے وقت یہ تنبیہ کرتے کہ ہم آزمائش بنا کر تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں۔ تم اگر سیکھو گے تو ہم ضرور سکھا دیں گے، مگر تم کافر ہو جاؤ گے، اسلئے تم کو نصیحت کرتے ہیں کہ کفر اختیار نہ کرو اور جب بنی اسرائیل اصرار کرتے تو وہ زن و شو کے درمیان تفریق کا جادو سکھا دیتے۔ یہ سارا قصہ جو ان کے درمیان مشہور ہے سب غلط ہے اور ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

تیسری تفسیر امام قرطبیؒ کی جانب منسوب ہے اور ابن جریر بھی اسی کو راجح تسلیم کرتے ہیں اور وہ یہ کہ آیت ما انزل الآیہ میں ''ما'' نافیہ ہے اور ہاروت وماروت ''شیاطین'' سے بدل ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ غلط ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کیلئے آسمان کے فرشتے ''''سحر کا علم لے کر آئے تھے بلکہ شیاطین سحر سکھاتے تھے۔ جن میں سے بابل میں دو مشہور شخصیتیں ہاروت وماروت کی تھیں اور وہ جادو سکھاتے تو بنی اسرائیل کی مذہبی زندگی پر طعن کرتے ہوئے یہ کہتے جاتے کہ دیکھو اگر تم نے ہم سے یہ ''سحر'' سیکھا تو تم کافر ہو جاؤ گے مگر بنی اسرائیل کی گمراہی کا یہ عالم تھا کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی ان سے زن و شو کے درمیان تفریق کا جادو

1: موضح الفرقان از شاہ عبد القادر نور اللہ مرقدہ زیر آیت فقبضت قبضۃ من اثر الرسول و کتاب النبوات از شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیۃؒ۔

2: تفسیر ابن کثیر جلد ا۔

سیکھتے اور کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیتے تھے۔

ہمارے خیال میں یہ دونوں تفسیریں بھی عام تفسیر سے زیادہ بہتر ہیں کیونکہ عام تفسیر کے مطابق ما کو بمعنی اَلَّذِیْ تسلیم کر کے یہ مطلب لینا کہ بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتے بنی اسرائیل کی آزمائش کیلئے خدائے تعالیٰ کی جانب سے نازل ہو کر سحر سکھاتے اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کرتے جاتے تھے کہ ہم سے یہ علم نہ سیکھو ورنہ کافر ہو جاؤ گے۔ بے وجہ متعدد اشکالات کو دعوت دینا اور "سحر" اور "ماانزل" کو بے دلیل ایک ہی شے تسلیم کرنا ہے۔

ان تفاسیر کے علاوہ آیاتِ زیر بحث کے سلسلہ میں بعض عجیب و غریب آثارِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) اور ایک مرفوع روایت کتب تفسیر میں منقول ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقتاً نہ آثارِ صحابہ ہیں اور نہ مرفوع حدیث، بلکہ کعب احبار اور دوسرے علماء یہود کے وہ بیان کردہ قصے ہیں جو بنی اسرائیل کا ذخیرۂ خرافات کہے جانے کے مستحق ہیں۔ ان قصوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ہاروت و ماروت فرشتوں نے ایک مرتبہ خدائے تعالیٰ کے حضور میں انسانوں کی معصیتوں کا مذاق اڑایا کہ یہ کیسی ذلیل مخلوق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہمہ قسم کے انعامات کے باوجود اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتی رہتی ہے۔ یہ طنز اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا اور ان سے فرمایا کہ اگر تم دنیا کے ماحول میں محصور ہوتے تو تم یہی کرتے۔ فرشتوں نے اپنی عصمت اور پاکدامنی پر اعتماد کا اظہار کیا۔ تب بطورِ آزمائش ان دونوں کو زمین پر اتار دیا گیا۔ یہاں رہتے رہتے ایک مرتبہ ان کی نگاہ ایک بے حد حسین عورت زہرہ پڑی اور دونوں اس کے عشق میں گرفتار ہو گئے اور زہرہ سے قربت کے طلبگار ہوئے۔ اس نے کہا جب تک تم شراب نہ پیو گے، قتل نہیں کرو گے اور بت کو سجدہ نہیں کرو گے۔ مجھے حاصل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ زہرہ کے عشق میں انہوں نے یہ تینوں کام کیے۔ زہرہ نے بحالتِ مقاربت ان سے دریافت کیا کہ وہ آسمان پر کس طرح جاتے ہیں۔ فرشتوں نے اس کو اسم اعظم سکھا دیا اور زہرہ اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی اور یہ دونوں فرشتے خدا کے غضب میں مبتلا ہو گئے اور بابل کے کنویں میں قید کر دیئے گئے۔ اب جو شخص ان کو آواز دے کر ان سے جادو سیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اول تو اس کو منع کرتے اور کافر ہو جانے کا خوف دلاتے ہیں لیکن جب وہ اصرار کرتا ہے تو اس کو جادو سکھا دیتے ہیں اور اس سے دریافت کرتے ہیں کہ تجھ کو کچھ نظر آیا۔ وہ شخص کہتا ہے کہ ایک نورانی شکل کا انسان گھوڑے پر جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ فرشتے کہتے ہیں کہ یہ تیرا ایمان تھا جو تجھ سے جدا ہو گیا اور اب تو جادوگر بن گیا۔ یہ فرشتے قیامت تک خدا کے عذاب کی وجہ سے اسی طرح کنویں میں الٹے لٹکے رہیں گے۔

اس روایت کا لغو ہونا خود بخود واضح ہے۔ اسلئے محققین نے اس کی لغویت اور خرافت پر متنبہ کر کے اسلامی روایات کے دامن کو اس سے پاک اور محفوظ کر ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ ابن کثیر نے اول مرفوع روایت پر بحث کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا ہے:

واقرب ما یکون فی ھذا انہ من روایۃ عبد اللہ بن عمر عن کعب الاحبار لا عن النبی ﷺ۔

اور اس سلسلہ میں قریب تر بات یہ ہے کہ "عبداللہ بن عمر سے جو روایت مسند احمد میں نبی اکرم ﷺ کی نسبت سے منقول ہے" وہ در اصل عبداللہ بن عمر نے کعب احبار سے اسرائیلی قصہ نقل کیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی جانب اس کی نسبت ہرگز صحیح نہیں ہے۔

فدار الحدیث ورجع الی نقل کعب الاحبار عن کتب بنی اسرائیل۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۱)

(بیان کردہ تصریحات کے بعد) نتیجہ یہ نکلا کہ جس حدیث کو مرفوع کہا جاتا تھا۔ وہ آخر کار کعب احبار کی روایت ثابت ہوئی جو انہوں نے بنی اسرائیل کی کتابوں سے نقل کر کے بیان کی ہے۔

اور اس فیصلہ کے بعد ان تمام آثار پر تنقید کرتے ہوئے جو اس سلسلہ میں صحابہ (رضی اللہ عنہم) اور تابعین (رحمہم اللہ) کی جانب منسوب کیے جاتے ہیں۔ جو محاکمہ کیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے:

ہاروت و ماروت کا یہ قصہ (زہرہ اور چاہِ بابل کا قصہ) تابعین کی ایک اچھی خاصی جماعت نے نقل کیا ہے۔ مثلاً مجاہد، سدی، حسن بصری، قتادہ، ابوالعالیہ، زہری، ربیع بن انس، مقاتل، ابن حبان وغیرہ اور پھر ان سے نقل کر کے متقدمین اور متاخرین نے کثرت سے بیان کیا ہے۔ مگر ان تمام نقول کا حال یہ ہے کہ ان میں جس قدر تفصیلات بھی منقول ہیں وہ سب بنی اسرائیل کے قصوں سے لی گئی ہیں۔ اسلئے کہ صادق مصدوق پیغمبر ﷺ سے (کہ جن کی شان مبارک یہ ہے کہ وہ اپنے ہوائے نفس سے کچھ بھی نہیں کہتے جو کچھ فرماتے ہیں وحی الٰہی سے فرماتے ہیں) اس بارہ میں کوئی صحیح روایت ذخیرۂ حدیث میں موجود نہیں ہے اور قرآن کا ظاہر سیاق واقعہ کو مجمل رکھتا ہے اور کوئی تفصیل اور تشریح نہیں کرتا اسلئے ہمارا ایمان یہ ہے کہ قرآن عزیز نے جس قدر اس سلسلہ میں بیان کیا ہے۔ وہ حق ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی تفصیل و تشریح کیا ہے۔ وہ اس ہی کے سپرد ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ (ترجمہ از تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۱۴۱)

یعنی قرآن عزیز نے اس واقعہ کو جس غرض سے بیان کیا ہے وہ تو صرف اس قدر ہے کہ بنی اسرائیل کا حضرت سلیمان ﷺ کی جانب جادو (کفر) کی نسبت کرنا بہتان اور افتراء ہے، یہ کام شیاطین کا تھا۔ حضرت سلیمان ﷺ کا دامن اس سے پاک ہے اور یہ کہ بنی اسرائیل نے شیاطین کی پیروی اختیار کی اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور باقی تفصیلات کو اس نے نظر انداز کر کے صرف اجمال پر اکتفا کیا ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے اس کے اجمال پر ایمان لے آنا ہی کافی ہے اور اس کی شرح وبسط کو خدا کے حوالہ کرنا ہی اسلم طریقہ ہے۔ کیونکہ ان تفصیلات سے دین و ملت کا کوئی مسئلہ وابستہ نہیں ہے۔

ابن کثیرؒ کے اس مسلک کی تائید بعض دوسرے محققین نے بھی کی ہے۔ جس میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابوحیان اندلسی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

۱: البحر المحیط جلد ۱۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات

قرآن عزیز نے سورۂ سبا میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا جو واقعہ بیان کیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے جنوں کی ایک بہت بڑی جماعت عظیم الشان عمارات بنانے میں مصروف تھی کہ سلیمان علیہ السلام کو پیغام اجل آ پہنچا۔ مگر جنوں کو ان کی موت کی خبر نہ ہوئی اور وہ اپنی مفوضہ خدمات میں مصروف رہے اور عرصہ کے بعد جب دیمک نے ان کی لاٹھی کو چاٹ کر اس توازن کو خراب کر دیا۔ جس کی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام لاٹھی سے ٹیک لگائے کھڑے نظر آتے تھے اور وہ گر گئے تب جنوں کو علم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا تھا۔ مگر افسوس کہ ہم نہ معلوم کر سکے کاش کہ ہم علم غیب رکھتے تو عرصہ تک اس مشقت و محنت میں نہ پڑے رہتے جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے خوف سے مبتلا رہے۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ (سبا ۱۴)

اور جب ہم نے اس (سلیمان) کی موت کا فیصلہ کر دیا تو ان (جنوں) کو اس کی موت کی کسی نے اطلاع نہیں دی مگر دیمک نے جو کہ سلیمان کی لاٹھی چاٹ رہی تھی اور جب سلیمان (لاٹھی کے توازن خراب ہو جانے سے) گر پڑا تو جنوں پر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ غیب کا علم رکھتے ہوتے تو اس سخت مصیبت میں مبتلا نہ رہتے۔

کہتے ہیں کہ جنوں پر جب یہ راز جب کھلا کہ تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔ اسلئے جنوں کو افسوس رہا کہ اگر وہ غیب داں ہوتے تو اس سے بہت پہلے آزاد ہو گئے ہوتے۔

اس مقام پر قرآن عزیز کا مقصد جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے واقعہ کا اظہار ہے۔ اسی طرح بنی اسرائیل کو ان کی حماقت پر متنبہ کرنا بھی اس کا مقصد ہے کہ ان کے عقیدہ کے مطابق اگر جن غیب داں ہوتے تو وہ عرصہ تک حضرت سلیمان علیہ السلام کے خوف سے تعمیر بیت المقدس یا کسی دوسرے شہر کی تعمیر کی صعوبتوں میں مبتلا نہ رہتے۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا جس صورت سے ان کو علم ہوا اسکے بعد خود شیاطین (جنوں) کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ہمارا دعویٰ غیب دانی قطعاً غلط ثابت ہوا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے متعلق قرآن عزیز نے اسی قدر بتایا۔ اس سے زیادہ تفصیل نہیں بیان کی اور نہ اس کے مقصد تبلیغ کے پیش نظر اسکی کوئی ضرورت تھی۔ لہٰذا ہم کو بھی ان تفصیلات میں کنج و کاؤ کی حاجت نہیں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کتنی مدت لاٹھی کے سہارے کھڑے رہے؟ کس حالت میں کھڑے رہے؟ انس و جن دونوں ہی کو اس کا علم نہیں تھا یا فقط ان جنوں کو ہی علم نہیں ہوا۔ جو بیت المقدس سے بہت فاصلہ پر کسی شہر کی تعمیر میں مشغول تھے وغیرہ وغیرہ۔

البتہ اسرائیلی روایات سے ماخوذ ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں فرشتہ

اجل نے حاضر ہو کر یہ پیغام سنایا کہ ان کی موت میں چند ساعتیں باقی ہیں تو انہوں نے یہ سوچ کر کہ کہیں "جن" تعمیر کو ناقص نہ چھوڑ دیں۔ فوراً جنوں سے آبگینہ کا ایک حجرہ بنوایا اور اس میں دروازہ نہیں رکھا اور خود اسکے اندر بند اور لاٹھی کے سہارے کھڑے ہو کر مشغولِ عبادت ہو گئے اور اسی حالت میں موت کے فرشتے نے اپنا کام پورا کر لیا۔ تقریباً ایک سال تک حضرت سلیمان اسی طرح کھڑے رہے اور "جن" مشغول تعمیر رہے۔ لیکن جب وہ تعمیر کو مکمل کر کے فارغ ہو گئے تو اب حضرت سلیمان کی لاٹھی میں دیمک پیدا ہو گئی اور اس نے لاٹھی کو چاٹ کر بے جان کر دیا اور وہ حضرت سلیمان کا بوجھ برداشت نہ کر سکی اور حضرت سلیمان زمین پر گر گئے۔ تب جن سمجھے کہ حضرت سلیمان کا عرصہ ہوا کہ انتقال ہو گیا اور اپنی نادانی پر افسوس کرنے لگے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۵۲۹۔ ۵۳۰)

غرض یہ اور اسی قسم کی روایات ہیں۔ جو اسرائیلیات سے نقل ہو کر اس سلسلہ میں کتب تفاسیر میں بیان کی گئی ہیں اور نقل کرنے کے بعد محققین نے واضح کر دیا ہے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ تورات میں حضرت سلیمان کی وفات کا واقعہ اس طرح ہے:

> "غرض ساری مدت کہ سلیمان نے یروشلم میں سارے اسرائیل پر سلطنت کی۔ چالیس برس کی تھی اور سلیمان اپنے باپ دادوں کے ساتھ سو رہا اور اپنے باپ دادوں کے شہر صیہون میں گاڑ دیا گیا اور اس کا بیٹا رحبعام اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔" (سلاطین اباب ۱۱۔ آیات ۴۲۔ ۴۳)

اور قاضی بیضاویؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان کی عمر ابھی تیرہ سال ہی کی تھی کہ حضرت داؤد کا انتقال ہو گیا اور وہ سریر آرائے سلطنت ہوئے اور ترپن سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔[۱] بیضاوی کا یہ قول غالباً توراۃ ہی سے ماخوذ ہے۔

بصائر

حضرت سلیمان کے واقعات کو جس ترتیب اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ صاحبِ بصیرت کو خود دعوتِ بصیرت دیتے۔ پیغام عبرت سناتے اور ایک حقیقت ہیں۔ نگاہ کے سامنے اہم حقائق کے پردے چاک کرتے ہیں۔ تاہم ان میں سے یہ چند امور خصوصیت کے ساتھ قابلِ مطالعہ ہیں:

امم سابقہ نے خدا کے سچے دین میں اپنی خواہشاتِ نفس کے زیر اثر جہاں اور بہت سی تحریفات کی ہیں۔ ان میں سے ایک شرمناک تحریف خدا کے سچے پیغمبروں اور اولوالعزم رسولوں پر بہتان طرازی اور ان کی جانب بے ہودہ اور فحش انتسابات کیلئے بے جا اقدام بھی ہے۔

اور اس معاملہ میں بنی اسرائیل کا قدم سب سے آگے ہے۔ وہ ایک جانب خدا کی ایک برگزیدہ ہستی کو نبی اور رسول بھی تسلیم کرتے ہیں اور دوسری جانب بغیر کسی جھجک کے شرمناک اور غیر اخلاقی امور کا انتساب بھی ان کے ساتھ وابستہ رکھتے ہیں۔ مثلاً حضرت لوط اور ان کی بیٹیوں کا معاملہ[۲] نیز بعض انبیاء و رسل اور خدا

۱: تفسیر سورۂ سبا۔
۲: تورات پیدائش باب ۱۹ آیات ۳۰۔ ۳۸۔

کے جلیل القدر پیغمبروں کی رسالت و نبوت سے انکار کر کے ان پر مختلف قسم کے بہتان اور جھوٹے الزامات لگانا قابل فخریات سمجھتے ہیں۔ مثلاً حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کا معاملہ۔

قرآن عزیز نے دین کے بارے میں سچائی اور اعلان حق کا جو بیڑا اٹھایا اور اصلاحِ ادیان کے ساتھ دین حق (اسلام) کی جو حقیقی روشنی عطا کی، اس کے ان احسانات میں سے ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ جن انبیاء و رسل کا اس نے ذکر کیا ہے۔ ان سے متعلق بنی اسرائیل کی خرافات و ہزلیات کو مدلل رد کیا اور ان کے مقدس دامن کو عائد کردہ آلودگیوں سے پاک ظاہر کیا اور اس طرح اصل حقیقت کو آشکارا کر کے کور باطنوں کی خباثت نفس کا پردہ چاک کر دیا۔

صد ہزار قابل عبرت یہ بات ہے کہ جس گمراہی کو بنی اسرائیل نے اختیار کیا اور قرآن عزیز نے جس کو روشن اور واضح دلائل کے ساتھ مردود قرار دیا تھا۔ اس آلودگی سے ہمارا دشمن بھی محفوظ نہ رہ سکا اور قرآن عزیز کی صاف اور روشن راہ کو چھوڑ کر ہم نے تحریف شدہ روایات بنی اسرائیل کو اسلامی روایات میں جگہ دینی شروع کر دی۔

نبی اکرم نے ایک جگہ صرف یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اہل کتاب کی جو روایات قرآن اور تعلیم اسلام کے منافی نہ ہوں ان کو نقل کرنا درست ہے لیکن ہم نے اس ارشاد مبارک کی بنیادی شرط ''کہ وہ قرآن اور تعلیم اسلام کے خلاف نہ ہو'' کو نظر انداز کر کے ہمہ قسم کی اسرائیلی روایات کو نہ صرف نقل کیا بلکہ قرآن عزیز کی تفسیر و توجیہ کیلئے ان کو دلیل بنالیا اور جگہ جگہ تاویلات و تفسیر قرآن میں ان کو پیش کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف تو غیر مسلموں نے ان روایات کو اسلامی روایات ظاہر کیا اور ان میں آب و رنگ پیدا کر کے اسلام کی بے لوث اور پاک تعلیم پر حملے شروع کر دیئے اور ان کو اپنے ناپاک مقاصد کیلئے بہانہ اور حیلہ بنالیا اور دوسری جانب خود مسلمانوں میں الحاد و زندقہ کے علم برداروں نے ان روایات کی آڑ لے کر قرآن عزیز اور صحیح احادیث سے ثابت اور علم یقین (وحی الٰہی) سے حال حقائق (معجزات) حشر و نشر کے واقعات، جنت و جہنم کی تفصیلات سے انکار کیلئے راہ بنالی اور ہر ایسے مقام پر بے سند یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو ہمارے مفسرین نے عادت کے مطابق اسرائیلی اعتقادات سے اخذ کر لیا ہے۔ حالانکہ اس واقعہ کیلئے خود قرآن عزیز یا حدیثِ رسول کی نص قطعی (یقینی صراحت) موجود ہوتی ہے۔

چنانچہ سر سید، مولوی محمد حسن امروہوی، مولوی چراغ علی، غلام احمد قادیانی، محمد علی لاہوری کی تفاسیر قرآن اور تفسیری مضامین کی اساس اسی الحاد پر قائم ہے۔

غرض یہ دونوں راہیں غلط ہیں۔ اسلام کی تعلیم کے خلاف اسرائیلی روایات کو اسلامیات خصوصاً تفسیرِ قرآن میں جگہ دینا بھی غلط راہ اور سخت مہلک قدم ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ اٹھایا گیا ہو اور اسی طرح الحاد کی دعوت کیلئے اس نقل روایات کی آڑ لے کر نصوص قرآن و حدیث سے انکار یا تفسیر کے نام سے معنوی تحریف کا اقدام بھی اسلامی تعلیم کو برباد کرنا اور اس کے خدوخال کو مسخ کر دینا ہے۔

صحیح اور صاف راہ (راہِ مستقیم) صرف وہ ہے جو علمائے محققین نے اختیار کی ہے کہ وہ ایک طرف نصوص

قرآن وحدیث کو اپنا ایمان یقین کرتے اور ان میں ملحدانہ تاویلات کو تحریف سمجھتے ہیں اور دوسری جانب قرآن وحدیث کے دامن کو اسرائیلیات سے پاک ثابت کر کے حقیقت کی روشنی کو سامنے لاتے ہیں۔

۳ صاحب حکومت انبیاء ورسل اور دنیوی بادشاہوں اور حکمرانوں کی زندگی میں ہمیشہ بین اور واضح امتیاز رہا اور رہتا ہے۔ اول الذکر حضرات کی زندگی کے ہر ایک پہلو اور ہر ایک گوشہ میں خدا کا خوف، اس کی خشیت، عدل وانصاف، دعوت وارشاد، خدمت خلق نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ کسی جائز موقع پر حاکمانہ اقتدار کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں تو اس میں نخوت وتکبر کی جگہ بغض فی اللہ نظر آتا ہے۔ یعنی ان کا غصہ اپنے لئے نہیں، اپنے ذاتی مفاد کیلئے نہیں بلکہ خدائے برتر کے کلمہ کی بلندی کیلئے ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی حیات طیبہ کا پورا دور اس کا شاہد عدل ہے اور موخر الذکر کی زندگی اور حیات کے ہر شعبہ میں ذاتی وقار شخصی یا جماعتی (پارٹی) تفوق و برتری کا مظاہرہ، زیر دستوں پر ظلم، اساس وبنیاد کی طرح کارفرما نظر آتے ہیں۔

مثال کے طور آپ اول فرعون کے اس اعلان پر غور فرمائیے انا ربکم الاعلی ''میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں دوسرا کوئی نہیں''۔ اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس خطاب پر نظر کیجئے الا تعلوا علی واتونی مسلمین ''مجھ پر بلندی ظاہر نہ کر اور مسلمان ہو کر میرے پاس حاضر ہو'' دونوں جملوں میں حاکمانہ اقتدار کا مظاہرہ موجود ہے۔ مگر فرعون کے اعلان میں خدا کے ساتھ سرکشی، مخلوق خدا پر ظالمانہ قہر مانیت اور دعوائے خدائے کیلئے انانیت جیسے امور صاف نظر آرہے ہیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے خطاب میں مخاطب کے مقابلہ میں سر بلندی کا اظہار ذاتی وقار اور شخصی سر بلندی کیلئے نہیں بلکہ خدائے واحد کے ارشاد و تبلیغ، اعلاء کلمۃ اللہ اور شرک سے بیزاری کے ساتھ دعوت توحید کیلئے کیا جارہا ہے اور یہ فرق ہے جو انبیاء علیہم السلام کی وراثت کے ذریعہ ہمیشہ خلافت حقہ اور ملک عضوض (دنیوی حکومت) کے درمیان نمایاں رہنا چاہئے۔

۴ جس شخص کی زندگی خالص اللہ کیلئے ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنی کل کائنات کو اس کیلئے تابع اور مسخر کر دیتے ہیں اور اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ اس کا کوئی قدم بھی خدا کی مرضی کے خلاف نہیں اٹھتا۔ اب اگر ایسا شخص بعض ایسے امور کر دکھاتا ہے جو عام دنیوی اسباب ووسائل سے بالاتر ہو کر عمل میں آئے ہیں۔ تو کوتاہ بین اور مشکوک نگاہیں دیکھنے اور سمجھنے کی تو زحمت گوارہ نہیں کرتیں کہ جس ہستی سے یہ اعمال صادر ہوئے ہیں۔ وہ خدا کی مرضی میں خود کو فنا کر چکی ہے۔ اسلئے خدا کی بے قید قدرت کا ہاتھ اس کے سر پر ہے اور اس لئے ان اعمال (معجزات) کو بھی عام قوانین قدرت کی ترازو میں تول کر انکے انکار پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ یہ راہ بے شبہ غلط اور گمراہی کی راہ ہے اور صاف اور روشن ''راہ مستقیم'' وہ ہے جس کو ہمیشہ سے مفکرین اسلام قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ یعنی:

عام قوانین قدرت کے خلاف امور ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کا انکار بداہت کا انکار ہے اس لئے کہ قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے خالق کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بے قید

قدرت سے کسی قانون کو توڑدے بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ غالباً معجزات جیسے امور کیلئے اس کے یہاں شروع ہی سے ایسے جلد انوامیس فطرت اور قوانین قدرت کام کر رہے ہیں جو عام قوانین فطرت سے خاص ہیں اور چونکہ دنیوی علوم نے ان حدود تک رسائی نہیں کی اور وہ ابھی تک ان کے انکشافات سے عاجز ہیں۔ اسلئے ہم اپنی کوتاہ عقل کے پیش نظر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ امور خارق عادت اور قوانین قدرت کو توڑنے والے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ ان اعمال کا تعلق بھی انوامیس فطرت ہی سے وابستہ ہوتا ہے۔ فرق صرف عام او خاص کا ہے نہ کہ عام قوانین کے توڑنے کا اور انوامیس فطرت کی اس تقسیم کا علم خدائے تعالیٰ کی جانب سے ان نفوس قدسیہ کو مشاہدہ کے درجہ میں حاصل ہو جاتا ہے۔ جن کے ذریعہ سے ایسے امور کو ظاہر کیا جاتا ہے جو خاص نوامیس فطرت کے تحت بر روئے کار آتے ہیں۔ (مثلاً معجزات وکرامات)

شیطانی اثرات میں سب سے بدترین اثر یا شیطانی وسوسہ یہ ہے کہ زن و شو کے خوش گوار تعلقات میں نفرت وعدات کا ایسا زہر ملا دیا جائے۔ جو ان کے مابین تفرقہ کا باعث ہو۔ یہ اسلئے بدترین ہے کہ عموماً اسکے نتائج کذب و بہتان، بدکلامی و بداخلاقی، بدکاری و فحش حتیٰ کہ قتل تک دوررس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ عمل شیطان کو بہت محبوب ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں آتا ہے:

"نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابلیس علی الصبح اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے اور پھر اپنی فوج کو انسانوں کی گمراہی کیلئے اطراف زمین میں منتشر کرتا ہے اور جو ان میں سے زیادہ فتنہ پرداز ہوتا ہے وہ اس کے یہاں زیادہ تقرب پاتا ہے۔ چنانچہ واپس آکر ہر ایک شیطان اپنی اپنی کارگزاری بیان کرتا ہے کہ مثلاً میں فلاں شخص کو چمٹا رہا حتیٰ کہ یہ کلمات (بے ہودہ کلمات) کہلا کر چھوڑا۔ مگر ابلیس اس قسم کی کارگزاریوں کی داد نہیں دیتا اور ان کے فتنہ کو معمولی قرار دیتا ہے۔ اسی درمیان میں ایک شیطان آکر کہتا ہے کہ میں نے زن و شو کے درمیان آج تفرقہ ڈال دیا اور ان کے خوش گوار تعلقات کو مکدر بنا دیا۔ ابلیس یہ سن کر فوراً اس کو اپنے گلے لگا لیتا اور شاباش دیتا ہے کہ بیشک تو نے بہت بڑا کارنمایاں کیا ہے۔" (صحیح مسلم)

شیاطین جن وانس کا یہ سحر عموماً ایسے وساوس اور اسباب کے ذریعہ عمل میں آتا ہے۔ جو دونوں کے درمیان بدگمانی، بدکلامی اور شکررنجی پیدا کرتے ہوں اور یہ حالت آہستہ آہستہ نفرت وعداوت اور تفریق بین الزوجین پر منتج ہوتی ہے۔ اعاذنا اللہ من ذلک۔

حضرت ایوب علیہ السلام

- حضرت ایوب علیہ السلام اور قرآن عزیز
- حضرت ایوب کی شخصیت
- یوباب اور ایوب
- عہد ایوب علیہ السلام
- حضرت ایوب علیہ السلام اور علماء یہود و نصاریٰ
- غلط فہمی کا ازالہ
- قرآن عزیز اور واقعۂ ایوب علیہ السلام
- چند تفسیری حقائق
- سفر ایوب
- وفات
- بصائر

حضرت ایوب علیہ السلام اور قرآن عزیز

قرآن عزیز میں حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر چار سورتوں میں آیا ہے۔ سورۂ نساء، انعام، انبیاء اور صؔ، نساء اور انعام میں تو انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں فقط نام مذکور ہے:

وَعِیْسٰی وَأَیُّوْبَ وَیُوْنُسَ وَھَارُوْنَ وَسُلَیْمَانَ (نساء)

اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان۔

وَمِنْ ذُرِّیَّتِہٖ دَاوُوْدَ وَسُلَیْمَانَ وَأَیُّوْبَ وَیُوْسُفَ وَمُوْسٰی وَھَارُوْنَ (انعام)

اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون۔

اور سورۂ انبیاء اور ''ص'' میں مجمل تذکرہ ہے اور صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ان پر آزمائش و امتحان کا ایک سخت وقت آیا اور مصیبتوں اور بلاؤں نے چہار جانب سے ان کو گھیر لیا۔ مگر وہ صبر و شکر کے ماسوا حرفِ شکایت تک زبان پر نہیں لائے اور آخرکار ان کو خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیا اور مصائب کے بادل دور کر کے ان کو فضل و عطا سے مالا مال کر دیا۔ اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عزیز کے بیان کردہ واقعات سے قبل حضرت ایوب علیہ السلام کی شخصیت پر تاریخ کی روشنی میں بحث کر لی جائے۔ تاکہ ہم اس ہستی کا صحیح تعارف کر سکیں جس کے صبر و شکر کی قرآن عزیز نے مدحت کی ہے اور جس کی زندگی کو مبارک اور اخلاقی بلندی میں ضرب المثل ٹھہرایا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی شخصیت

حضرت ایوب علیہ السلام کی شخصیت سے متعلق تحقیق کیلئے صرف دو ماخذ ہو سکتے ہیں ایک تورات اور

دوسرے جو وہ اقتباسات جو تاریخ قدیم سے اخذ کر کے مؤرخین عرب اور مؤرخین اسلام نے نقل کیے ہیں اور اگر ان کے ساتھ چند خارجی قرائن کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق سب سے قدیم شہادت سفر ایوب کی ہے۔ یعنی وہ صحیفہ جو مجموعہ تورات میں ایوب علیہ السلام کے متعلق دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سرزمین عوض کے باشندہ تھے۔

عوض کی سرزمین میں ایوب نامی ایک شخص تھا اور وہ شخص کامل اور صادق تھا اور خدا سے ڈرتا اور بدی سے دور رہتا تھا۔ (باب آیت ۱)

دوسری بات یہ کہ ان کے مویشی چوپایوں پر سبا اور کسدیوں (بابلیوں) نے حملہ کر کے لوٹ لیا تھا۔ اسے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں قوموں کے زمانہ عروج کے معاصر تھے۔

یوباب اور ایوب

سفر ایوب کے ان دو حوالوں کی وضاحت کے علاوہ ایک اور تاریخی مسئلہ بھی ہے۔ جس سے حضرت ایوب علیہ السلام کے زیر تحقیق مسئلہ میں مدد مل سکتی ہے وہ یہ کہ تورات اور کتب تاریخ میں ایک نام یوباب آتا ہے اور محققین کا خیال اس کے متعلق یہ ہے کہ ایوب اور یوباب ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ دراصل عبرانی میں یوباب کو اوب کہا گیا ہے اور یہی اوب عربی میں ایوب ہو گیا۔ لیکن اس تحقیق کے باوجود کہ ایوب، یوباب اور اوب مختلف زبانوں میں ایک ہی شخصیت کے نام ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی شخصیت سے متعلق مسئلہ پھر بھی حل طلب رہتا اور کچھ تفصیل چاہتا ہے۔

توراۃ کے بیان کے مطابق یوباب دو جدا جدا شخصیتوں کا نام ہے۔ ایک بنی یقطان میں سے ہے اور دوسرا بنی ادوم میں سے۔ جو یوباب یقطان کی نسل سے ہے۔ اس کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی مقدم ہے۔ کیونکہ اس کا سلسلہ نسب پانچ واسطوں سے حضرت نوح علیہ السلام تک پہنچا ہے۔ یعنی یوباب بن یقطان بن عیبر بن سلح بن ارفکسد بن سام بن نوح علیہ السلام[1] اور جو بنی ادوم میں سے ہے وہ بھی اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہے لیکن یوباب اول کے زمانہ سے اس کا عہد متاخر ہے۔ اسلیئے حضرت اسحٰق علیہ السلام کے تذکرہ میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ ادوم، اسحٰق علیہ السلام کے صاحبزادہ عیسو (عیص یا عیصو) کا لقب ہے اور یہ کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے بڑے تھے اور کنعان سے ترک وطن کر کے اپنے چچا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے پاس حجاز میں آ گئے تھے اور ان کی صاحبزادی محلات[2] یا بشامہ (باسمہ) سے شادی کر کے عرب کے اس حصہ سرزمین میں آباد ہو گئے تھے۔ جو شام و فلسطین کے جنوب مغرب میں عرب کی آخری حد ہے اور جس جگہ کوہ ساعیر کا سلسلہ طول میں شمال سے جنوب تک چلا گیا ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ وہ مقام جو عمان سے حضر موت تک وسیع ہے۔ (دائرۃ المعارف للبستانی جلد ۲)

ان عیسو (ادوم) کی نسل میں صدیوں تک حکومت سطوت کا دور رہا ہے اور مؤرخین کے نزدیک ان کے

۱: پیدائش باب ۱۰۔ آیت ۲۲۔ ۲۴۔
۲: تورات پیدائش با ۲۸ آیت ۹۔

ور حکومت کی ابتداء تقریباً [illegible] ق م بتائی جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جب بنی سرائیل مصر سے واپس آئے ہیں تو اس وقت بھی بنی ادوم شعیر (ساعیر) پر حکمراں تھے، تورات میں ہے

(گنتی باب ۲۰ آیت ۱۴)

> تب موسیٰ نے قادس سے ادوم کے بادشاہ کو ایلچی کے ہاتھ یوں کہلا بھیجا کہ تیرے بھائی اسرائیل نے کہا ہے کہ وہ سب تکلیفیں جو ہم پر آن پڑی ہیں تو جانتا ہے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت قدس سے روانہ ہو کر کوہ ہور پر آئی اور خداوند نے کوہ ہور پر جو ادوم کی سرحد سے ملا ہوا تھا موسیٰ اور ہارون کو کہا۔ (گنتی باب ۲۰۔ آیات ۲۲۔۲۳)

بنی ادوم[1] کے ان حکمرانوں کی جو فہرست تورات میں مذکور ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر ساؤل (طالوت) کی وسیع حکومت سے پہلے کہ جس کی وسعت خطہ ادوم تک پہنچی اور جو [illegible] ق م میں قائم ہوئی تھی آٹھ حکمراں برسر حکومت رہ چکے تھے اور ان میں سے دوسرے حکمراں کا نام یوباب بن زارح تھا۔

اس حد پر پہنچ کر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت ایوب علیہ السلام اور یوباب دونوں نام ایک ہی شخصیت کے ہیں تو ان دونوں میں سے کس یوباب کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں مؤرخین کی دو رائیں ہیں۔ ..... مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ یہ بنی یقطان کی نسل سے اور عرب عاربہ میں سے ہے اور اسلئے حضرت ایوب علیہ السلام یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاصر ہیں اور یا کم از کم حضرت اسحٰق علیہ السلام و حضرت یعقوب علیہ السلام کے معاصر فرماتے ہیں:

> اولاً محققین تورات میں سے اکثر اس طرف گئے ہیں کہ حضرت ایوب ب تھے۔ عرب میں ظاہر ہوئے تھے اور سفر ایوب اصلاً قدیم عربی میں لکھی گئی تھی۔ حضرت موسیٰ نے اسے قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا۔ سفر ایوب میں ہے کہ وہ عوض کے ملک میں رہے تھے اور آگے چل کر تصریح کی ہے کہ ان کے مویشی پر شیبا (سبا) کے لوگوں نے حملہ کیا تھا (۵۱۱)۔
> ان دونوں تصریحوں سے بھی اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کیونکہ کتاب پیدائش اور تواریخ اول میں عوض کو آرام بن سام بن نوح کا بیٹا کہا ہے اور آرامی بالاتفاق عرب عاربہ کی ابتدائی جماعتوں میں سے ہیں۔ (ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۴۸۶)

عرب مؤرخ ابن عساکر کا رجحان بھی اسی جانب معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت ایوب علیہ السلام کو قریب بعہد براہیمی مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام کے معاصر اور دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے۔
(فتح الباری جلد ۶ ص ۳۲۶)

اور نجار مصری اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السلام کا زمانہ حضرت براہیم سے ایک سو سال پہلے تھا۔ (قصص الانبیاء ص ۳۱۵)

ان دونوں کے برعکس مولانا سید سلیمان فرماتے ہیں کہ ایوب علیہ السلام بنی ادوم میں سے ہیں اور ان کا زمانہ [illegible] ق م اور [illegible] ق م کے درمیان ہے۔ چنانچہ ارض القرآن میں ہے:

---

[1] پیدائش باب ۳۶۔ آیات ۳۲۔۳۹۔

"یہ مسئلہ کہ حضرت ایوب ﷺ ایک ادومی عرب تھے۔ خود سفر ایوب سے ثابت ہے: عوض کی سرزمین میں ایک مرد صالح، راست گو، خدا سے ڈرنے والا اور بدی سے دور تھا"۔ (۱۰۱)

(ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۳)

عوض توراۃ میں دو آدمیوں کا نام ہے۔ ایک تو نہایت قدیم عوض بن ارم بن سام بن نوح (تکوین ۳۶-۲۹) باتفاق اہل کتاب اس سے عوض ثانی مراد ہے۔ عوض کے بنی ادومی عرب ہونے پر ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ سفر ایوب میں رفقائے ایوب کے جو مسکن بتائے ہیں وہ تیمن، نعمتان اور شوحان ہیں (۲-۱۱) اول کے متعلق تو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ مملکت ادوم کا ایک مشہور شہر تھا۔ (تکوین ۳۶-۳۵) الخ

زمانہ کے متعلق بھی فیصلہ اسلئے آسان ہے کہ "کلدان" (ایوب ۱-۱۷) اور سبا (ایوب ۱۰-۱۵) کا اس پر ذکر معاصرت ہے۔ سبا کا عروج ۱۰۰۰ق م سے ۷۰۰ ق م تک ہے۔ اسلئے ان دونوں زمانوں کے حدود میں کہیں حضرت ایوب ﷺ کا عہد قرار دینا چاہئے۔ (ایضاً ص ۳۶)

یہ عجیب بات ہے کہ زمانہ کے تعین میں دونوں حضرات سبا اور کلدانیوں (بابلیوں) کی معاصرت کی سند پیش فرماتے ہیں۔۔ مگر نتیجہ جدا جدا نکالتے اور ایک دوسرے کے متضاد فیصلہ دیتے ہیں۔

سید سلیمان صاحب کی تائید مشہور مؤرخ یعقوبی کے قول سے ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے:

یو باب ھو ایوب بن زارح الصدیق

یوباب ہی ایوب صدیق بن زارح ہیں۔

ان تفصیلات کے بعد ہمارا خیال یہ ہے کہ بے شبہ یہ صحیح ہے کہ یوباب ہی ایوب ﷺ ہیں اور راجح یہ ہے کہ بنی یقطان میں سے نہیں بلکہ بنی ادوم میں سے ہے۔

عہد ایوب ﷺ

البتہ زمانہ کے متعلق سید صاحب کی تحقیق صحیح نہیں ہے اور ان کا یہ فرمانا کہ ایوب ﷺ کا عہد ۱۰۰۰ق م سے ۷۰۰ ق م کے درمیان ہے۔ غیر تحقیقی ہے بلکہ صحیح اور تحقیقی بات یہ ہے کہ ایوب ﷺ کا زمانہ حضرت موسیٰ ﷺ اور حضرت اسحٰق و یعقوب (علیہما السلام) کے زمانہ کے درمیان ہے اور تقریباً ۱۵۰۰ق م اور ۱۳۰۰ ق م کے حدود میں تلاش کرنا چاہئے۔

ہماری یہ تحقیق چند اہم قرائن پر مبنی ہے اور جو اس درجہ واضح ہیں کہ اگر ان کو دلائل بھی کہہ دیا جائے تو بے جا نہیں ہے۔

۱) پہلا قرینہ یہ ہے کہ بالاتفاق محققین توراۃ کے نزدیک صحیفۂ ایوب ﷺ حضرت موسیٰ ﷺ کے قبل زمانہ کا ہے اور حضرت موسیٰ ﷺ نے اس کو قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا ہے اور یہ کہ مجموعۂ تورات میں سب سے قدیم صحیفہ سفر ایوب ہے۔

۲) جن مؤرخین نے ایوب ﷺ کو بنی ادوم میں سے بتایا ہے وہ بھی ادوم (عیسو یا عیص) اور انکے درمیان دو

واسطوں سے زیادہ بیان نہیں کرتے یعنی ایوب بن زراح (زارح) بن موص (عوض) بن عیصو (عیسو)
(فتح الباری جلد ۶ ص ۳۲۶)

۳) یہی مورخین حضرت ایوب کا سلسلۂ نسب بیان کرتے ہوئے جب مادری سلسلہ پر آتے ہیں تو لوط کی صاحبزادی سے لے کر صاحبزادگان تک حضرت یوسف کی صاحبزادیوں کے ذکر کے نیچے نہیں اترتے مثلاً ابن عساکر کہتے ہیں کہ وہ بنت لوط کے صاحبزادے ہیں اور قاضی بیضاوی نقل کرتے ہیں کہ وہ لیا بنت یعقوب یا ماخیر بنت میشا بن یوسف یا رحمت بنت افرائیم بن یوسف کے صاحبزادے ہیں۔ (ایضاً سورہ ص)

۴) سید صاحب نے عوض کا جو نسب نامہ نقل کیا ہے اس کے پیش نظر بھی حضرت ایوب کا نسب نامہ اس طرح بغیر کسی جرح و تنقید کے صحیح ہو سکتا ہے یعنی یوباب (ایوب) بن زارح بن عوض بن دیسان بن عیسو بن اسحٰق اور اس سلسلہ میں اگرچہ عام مؤرخین کے بیان کردہ نسب نامہ سے صرف ایک نام دیسان کا اضافہ ہوتا ہے۔ تاہم اس سے یہ فرق نہیں پڑتا کہ ان کا زمانہ پیچھے ہٹ کر حضرت موسیٰ کے زمانہ سے بھی بعد ہو جائے اور ۱۰۰۰ ق م اور ۱۲۰۰ ق م کے درمیان پہنچ جائے۔

مسطورۂ بالا قرائن یا دلائل میں سے پہلا قرینہ بہت مضبوط اور تاریخی حیثیت رکھتا ہے اسلئے کہ محققین توراۃ نے تاریخی روشنی ہی میں یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ سفر ایوب حضرت موسیٰ کے عہد سے قبل زمانہ کا ہے اور اسلئے یہ قرینہ نہیں بلکہ زبردست دلیل ہے اور دوسرا اور تیسرا قرینہ اگرچہ ناموں کے تعین کے لحاظ سے قابل بحث ہو سکتا ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ تورات اور تاریخی نقول کا سلسلۂ نسب کے متعلق یہ بیان کہ حضرت یوسف کے نواسہ یا حضرت لوط کے نواسہ ہیں۔ محض اتفاقی نہیں ہے بلکہ کسی حقیقت پر مبنی ہے اور چوتھا قرینہ بھی یہ واضح کرتا ہے کہ حضرت ایوب کا زمانہ حضرت موسیٰ سے قبل ہونا چاہئے اور وہ ۱۵۰۰ ق م اور ۱۳۰۰ ق م کے درمیان ہو سکتا ہے۔ امام بخاری کی بھی غالباً یہی تحقیق ہے۔ اسی لیئے انہوں نے کتاب الانبیاء میں انبیاء علیہم السلام کے متعلق جو ترتیب قائم کی ہے۔ اس میں حضرت ایوب کا ذکر حضرت یوسف کے بعد اور حضرت موسیٰ سے قبل کیا ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ

ایوب کے سلسلۂ نسب میں تورات کے ناموں اور مؤرخین عرب کے ناموں میں کچھ اختلاف ہے لیکن بہ نظر تحقیق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ ناموں کے متعلق اس قسم کا اختلاف ہے جو عموماً مختلف زبانوں میں منتقل ہونے کی وجہ سے کتابت کی تصحیف و تبدیل کی شکل میں پیش آتا رہتا ہے۔ یعنی توارت کا عوض اور عرب مؤرخین کا موص، اور اسی طرح تورات کا زارح اور مؤرخین کا زراح دونوں ایک ہی ہیں۔ البتہ جن بعض مؤرخین نے موص یا اموص کو ایوب اور زراح (زارح) کے درمیان بیان کر دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ بعض حضرات نے ایوب کا نسب بیان کرتے ہوئے

۱: بیضاوی سورۂ انبیاء۔

روم بن عیص کہہ کر ان کو بنی روم سے بتایا ہے، یہ قطعاً بے اصل ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور علماءِ یہود و نصاریٰ

حضرت ایوب علیہ السلام کے بارہ میں صحیح تحقیق کے بعد یہ حقیقت بھی واضح رہنا چاہئے کہ ایوب علیہ السلام کے متعلق علماءِ یہود و نصاریٰ کے درمیان سخت اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ یہ فرضی نام ہے اور ایوب کسی شخصیت کا نام نہیں ہے مثلاً ربی رحمانی دیز، میکانلس، سملر، استیان اسی کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اس شخصیت سے متعلق جس قدر واقعات منسوب ہیں۔ سب باطل اور فرضی ہیں۔ گویا ان کے نزدیک سفرِ ایوب اگرچہ تاریخی اعتبار سے قدیم صحیفہ ہے۔ مگر فرضی ہے اور کانٹ اور انٹل وغیرہ کہتے ہیں کہ ایوب علیہ السلام ایک حقیقی شخصیات کا نام ہے اور اس سے منسوب "صحیفہ" کو فرضی اور باطل کہنا خود باطل ہے۔ (قصص الانبیاء النجار، ص ۴۱۵۔۴۱۶)

مگر شخصیت تسلیم کرنے کے باوجود پھر تعین زمانہ کے متعلق ان کے درمیان سخت اختلاف ہے اور مؤرخین عرب کے درمیان بھی اختلاف ہے۔ جو نقشۂ ذیل سے معلوم ہو سکتا ہے:

شمار	نام	قول مختار
۱)	بستانی	سنہ ۱۰۰ قبل از عہد ابراہیم علیہ السلام
۲)	ابن عساکر	قریب بعہد ابراہیمی
۳)	کانٹ	معاصر یعقوب علیہ السلام
۴)	انٹل	معاصر موسیٰ علیہ السلام
۵)	طبری	بعد زمانہ شعیب علیہ السلام
۶)	×	معاصر سلیمان علیہ السلام
۷)	ابن خثیمہ	بعد سلیمان علیہ السلام
۸)	ابن اسحق	اسرائیلی مگر زمانہ نامعلوم
۹)	×	معاصر بخت نصر (بنی کدرزر)
۱۰)	×	معاصر زمانہ قضاۃ بنی اسرائیل
۱۱)	×	معاصر اردشیر شاہ ایران

غرض حضرت ایوب علیہ السلام کی شخصیت کو جب تاریخ کی روشنی میں زیر بحث لایا جاتا ہے تو یقینی طور پر حسب ذیل نتائج ظاہر ہوتے ہیں:

۱) حضرت ایوب علیہ السلام عرب ہیں اور تمام مختلف اقوال میں بھی ان کے عرب ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔

۲) مجموعہ تورات میں سے صحیفۂ ایوب قدیم صحیفہ ہے اور عبرانی میں عربی سے نقل ہو کر آیا ہے۔
۳) حضرت ایوب علیہ السلام بنی ادوم میں سے ہیں۔
۴) ان کا عہد حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا درمیانی عہد ہے۔

قرآن عزیز اور واقعۂ ایوب علیہ السلام

حضرت ایوب علیہ السلام سے متعلق مسطورۂ بالا حقائق روشن ہو جانے کے بعد اب اس مختصر اور مجمل واقعہ کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ جو سورۂ انبیاء اور سورہ ص میں مذکور ہے۔

وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِن ضُرٍّ وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَذِكْرَىٰ لِلْعَابِدِينَ ۝ (انبیاء)

اور ایوب (کا معاملہ بھی یاد کرو) جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا "میں دکھ میں پڑ گیا ہوں، اور خدایا! تجھ سے بڑھ کر رحم کرنے والا کوئی نہیں، پس ہم نے اس کی دعاء قبول کر لی اور اس کا دکھ دور کر دیا اور اس کو اس کا کنبہ اس کی مثل اور اس کے ساتھ اپنی رحمت سے اور اپنے عبادت گزار بندوں کی نصیحت کیلئے عطا کر دیا۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ ۝ ارْكُضْ بِرِجْلِكَ هَٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِّعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۝ (ص)

اور یاد کر ہمارے بندہ ایوب (کے معاملہ) کو جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا کہ مجھ کو شیطان نے ایذا اور تکلیف کے ساتھ ہاتھ لگایا ہے (تب ہم نے اس سے کہا) اپنے پاؤں سے ٹھوکر مار (اس نے ایسا ہی کیا اور چشمہ زمین سے ابل پڑا تو ہم نے کہا) یہ ہے نہانے کی جگہ ٹھنڈی اور پینے کی اور ہم نے اس کو اس کے اہل (وعیال) عطا کیئے اور ان کی مانند اور زیادہ اپنی مہربانی سے اور یادگار بننے کیلئے عقلمندوں کیلئے اور اپنے ہاتھ میں سینکوں کا مٹھا لے اور اس سے مار اور اپنی قسم میں جھوٹا نہ ہو، بے شک ہم نے اس کو صبر کرنے والا پایا (اور وہ اچھا بندہ ہے) بے شبہ وہ (خدا کی جانب) بہت رجوع ہونے والا ہے۔

ان آیات میں حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ کو اگرچہ بہت مختصر اور سادہ طرز میں بیان کیا گیا لیکن بلاغت و معانی کے لحاظ سے واقعات کے جس قدر بھی صحیح اور اہم اجزاء تھے ان کو ایسے اعجاز کے ساتھ ادا کیا گیا ہے کہ سفر ایوب کے ضخیم اور طویل صحیفہ میں بھی وہ بات نظر نہیں آتی۔

ایک پاک اور مقدس انسان ہے جو خدائے تعالیٰ کے یہاں انبیاء ورسل کی جماعت میں شامل ہے اور اس کا نام ایوب ہے وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ وہ دولت وثروت اور کثرت اہل وعیال کے لحاظ سے بھی بہت خوش بخت اور

فیروز مند تھا۔ مگر یکا یک امتحان و آزمائش میں آگیا اور متاع و مال، اہل و عیال اور جسم و جان سب کو مصیبت نے آ گھیرا۔ مال و منال برباد ہوا۔ اہل و عیال ہلاک ہوئے اور جسم و جان کو سخت روگ لگ گیا۔ تب بھی اس نے نہ شکوہ کیا اور نہ شکایت بلکہ صبر و شکر کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی جناب میں صرف عرضِ حال کر دیا:

پاس ادب کا یہ عالم ہے کہ یہ نہیں کہا: "تو نے مصیبت میں ڈال دیا" کیونکہ اس کو علم ہے کہ تکلیف و عذاب گو خدا ہی کی مخلوق ہیں مگر شیطانی اسباب پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اسلئے یہی کہا "شیطان نے مجھ کو تکلیف و عذاب کے ساتھ چھو دیا" اور پھر عرضِ حال کیلئے نہایت عجیب و لطیف اور بلیغ پیرایہ بیان اختیار کیا کہ خدایا مجھ کو مصیبت نے آ گھیرا ہے اور تو مہربانوں میں سب سے بڑا مہربان ہے۔ اور جب اس نے پکارا تو خدا نے سنا اور قبول کیا۔ جو مال و متاع برباد ہوا اور جو اہل و عیال ہلاک ہوئے۔ خدا نے اس سے چند در چند اور زیادہ اس کو بخش دیئے اور صحت و تندرستی کیلئے چشمہ جاری کر دیا کہ غسل کر کے چنگا ہو جائے ○

اور یہ سب کچھ اسلئے ہوا کہ "رحمت" اس کا ذاتی وصف ہے اور تا کہ اہل بصیرت اور فرمانبردار بندے اس سے نصیحت و عبرت حاصل کریں

اور پھر حضرت ایوب کے صبر و عبودیت کی تعریف کرتے ہوئے اس نے یہ کہہ کر ان کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے: اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم نے ایوب کو بڑا ہی صابر پایا، وہ بہت ہی اچھا بندہ اور ہماری جانب رجوع ہونے والا ہے۔

ان چار پانچ آیات میں حضرت ایوب کے جس واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کے اعجاز کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان ہی واقعات کو بیان کرنے میں سفر ایوب کے طویل بیالیس ابواب اور کئی سو آیات نے جگہ لی ہے۔

چند تفسیری حقائق

اس مقام پر چند تفسیری حقائق کا بیان کر دینا بھی ضروری ہے۔ جو ایوب کے واقعہ سے خاص تعلق رکھتے ہیں:

اسرائیلی روایات میں حضرت ایوب کے مرض کے متعلق مبالغہ آمیز روایات درج ہیں اور ان میں ایسے امراض کا انتساب کیا گیا ہے جو باعثِ نفرت سمجھے جاتے اور جن کی وجہ سے مریض انسان سے بچنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً جذام یا پھوڑے پھنسیوں کا اس حد تک پہنچ جانا کہ بدن گل سڑ جائے اور بدبو سے نفرت پیدا ہونے لگے۔ ان روایات کو نقل کرتے کے بعد بعض مفسرین نے یہ اشکال پیدا کیا کہ "نبی" کو ایسا مرض لاحق نہیں ہوتا جو انسانوں کی نگاہوں میں باعثِ نفرت ہو اور اس کی وجہ سے وہ مریض سے دور بھاگتے ہوں اسلئے کہ یہ نبوت کے مقصدِ تبلیغ و ارشاد کے منافی ہے اور رشد و ہدایت

کیلئے رکاوٹ کا باعث اور پھر اس کے دو جواب دیئے۔ ایک یہ کہ شاید حضرت ایوب علیہ السلام کو یہ مرض نبوت سے پہلے لاحق ہوا ہو اور مصیبت و آزمائش پر صبر و شکر کے بعد جب ان کو شفا عطا ہوئی تب منصب نبوت سے سرفراز کیا گیا ہو اور دوسرا جواب یہ کہ اسرائیلی روایات غیر مستند اور مبالغہ آمیز ہیں اور قرآن عزیز اور احادیث رسول میں اسکے متعلق کوئی تفصیل موجود نہیں ہے۔ لہٰذا نہ اشکال پیدا ہوتا ہے اور نہ اس کے جواب کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

محققین کی رائے یہی ہے اور یہی صحیح اور درست ہے اور جبکہ قرآن عزیز نے مرض کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی اور تمام ذخیرۂ حدیث اس کے ذکر سے خالی ہے تو اسرائیلی روایات پر بحث قائم کرنا فضول اور لغو ہے۔

۲ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ سے کیا مراد ہے؟ اسرائیلی روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کے آزمانے کیلئے ان کے مال و منال، اہل و عیال حتیٰ کہ ان کے جسم پر بھی شیطان کو قابو دے دیا تھا۔

اور محققین کہتے ہیں کہ ایوب علیہ السلام نے یہ بات پاس ادب کے طور پر فرمائی اسلیئے کہ یہ حقیقت ہے کہ خدا کی جانب سے تو 'خیر ہی خیر' ہے اور جس شے کو ہم 'شر' کہتے ہیں۔ وہ ہماری نسبت سے 'شر' ہے، ورنہ کائنات کے مجموعی مصالح کے لحاظ سے غور کرو گے۔ تو اس کو بھی خیر ہی ماننا پڑے گا۔ ہماری زندگی اور ہمارے اعمال کی نسبتیں بعض چیزوں کو 'شر' بنا دیتی ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ بھی 'خیر' ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اسی حقیقت کے اظہار کیلئے متقین کا یہ طریقہ ہے کہ جب ان کو بھلائی پہنچتی ہے۔ تو وہ اس کی نسبت خدائے تعالیٰ کی جانب کرتے ہیں اور جب ان پر کوئی برائی حملہ کرتی ہے تو اس کو اپنے نفس کی جانب منسوب کر لیتے ہیں۔ چناچہ قرآن عزیز میں ایک جگہ اس مضمون کو اس طرح ادا کیا گیا ہے:

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ

یہی حضرات کرام دوسری توجیہ یہ کرتے ہیں کہ سورۂ انبیاء میں حضرت ایوب علیہ السلام کا جو مقولہ بیان کیا گیا ہے رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ تو اس سے وہ مرض مراد ہے۔ جو ایوب علیہ السلام کو لاحق تھا اور سورہ ص کی اس آیت میں شیطان کی ایذاء (نصب) اور عذاب سے وہ وساوس و ہموم مراد ہیں۔ جو اس کی جانب سے ان پر ہجوم کرتے اور آئی ہوئی مصیبت کی وجہ سے خدائے تعالیٰ کی ناشکر گزاری اور جزع و فزع پر آمادہ کرنے کیلئے حملہ آور ہوتے رہتے تھے اور حضرت ایوب علیہ السلام کے صبر و استقامت اور انابۃ الی اللہ کے پاک جذبات کو ٹھیس لگا کر ان کی روحانی اذیت و تکالیف کا باعث ہوتے اور حضرت ایوب علیہ السلام کے جسمانی مرض کے مقابلہ میں بہت زیادہ پریشان کن بنتے رہتے تھے۔

۳) آیت وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ میں اہل و عیال کی عطاء کا جو ذکر آیا ہے، کیا اس سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کی صحت کے بعد ان کے ہلاک شدہ اہل و عیال کی جگہ پہلے سے زیادہ ان کے اہل و عیال میں اضافہ کر دیا اور جو اہل خاندان منتشر ہو گئے تھے۔ ان کو دوبارہ ان کے پاس

جمع کردیا۔ یا یہ مقصد ہے کہ ہلاک شدگان کو بھی حیات تازہ بخش دی اور مزید عطا کردیئے۔ ابن کثیرؒ نے حسنؒ اور قتادہؒ سے یہ دوسرے معنی نقل کیے ہیں اور شاہ عبد القادر صاحب (نور اللہ مرقدہ) کی بھی یہی رائے ہے [۲] اور امام رازی وابن حیانؒ کا رجحان پہلے معنی کی جانب ہے اور آیت میں دونوں معنی کی گنجائش ہے۔

۴) سورۂ ص میں ہے اور اپنے ہاتھ میں سینکوں کا مٹھا لے پھر اس سے مار اور قسم میں جھوٹا نہ ہو۔ تو یہ کس واقعہ کی جانب اشارہ ہے؟ قرآن عزیز اور احادیث صحیح میں تو اس کی کوئی تفصیل مذکور نہیں۔ البتہ مفسرین یہ کہتے ہیں کہ ایوب کی ہر قسم کی بربادی کے بعد جب ان کی بیوی کے علاوہ کوئی ان کا غمگسار باقی نہ رہا تو وہ نیک بی بی ہر وقت ایوب کی تیمارداری میں مشغول اور دکھ درد کی شریک رہتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے حضرت ایوب کی انتہائی تکلیف سے بے چین ہو کر کچھ ایسے کلمات کہہ دیئے جو صبر ایوبی کو ٹھیس پہنچانے والے اور خدائے تعالیٰ کی جناب میں شکوہ کا پہلو لیئے ہوئے تھے۔ ایوب اس کو برداشت نہ کرسکے اور قسم کھا کر فرمایا کہ میں تجھ کو سو کوڑے لگاؤں گا۔ جب حضرت ایوب کی مدت امتحان ختم ہو گئی اور وہ صحت یاب ہوئے تو قسم پوری کرنے کا سوال سامنے آیا۔ ایک جانب رفیقۂ حیات کی انتہائی وفاداری، غمخواری اور حسنِ خدمت کا معاملہ اور دوسری جانب قسم کو پورا کرنے کا سوال، ایوب سخت تردد میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے نیک بی بی کی نیکی اور شوہر کے ساتھ وفاداری کا یہ صلہ دیا کہ ایوب کو حکم ہوا کہ وہ سو تنکوں کا ایک مٹھا بنائیں اور اس سے اپنی رفیقۂ حیات کو ماریں اس طرح آپ کی قسم پوری ہو جائے گی۔

۵) سورۂ ص میں ہے ابن کثیرؒ نے اس کی تفسیر میں جو کچھ فرمایا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے:

> اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایوب اپنی جگہ سے اٹھو اور زمین پر ٹھوکر مارو۔ ایوب نے ارشاد باری کی تعمیل کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے ایک چشمہ جاری کردیا۔ جس میں انہوں نے غسل کیا اور جسم کا ظاہری روگ سب جاتا رہا۔ اسکے بعد انہوں نے پھر ٹھوکر ماری اور دوسرا چشمہ ابل پڑا اور انہوں نے اس کا پانی پیا اور اس سے جسم کے باطنی حصہ میں مرض کا جو اثر تھا۔ اس کا بھی قلع قمع ہو گیا اور اس طرح وہ چنگے ہو کر شکر خدا بجالائے۔ (تفسیر سورۂ ص)
>
> حافظ ابن حجر نے بہ واسطہ ابن جریر، قتادہ سے بھی اسی قسم کا قول نقل کیا ہے۔

(فتح الباری جلد ۶ ص ۳۲۶)

چشمہ ایک تھا یا دو اس بحث سے قطع نظر، اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب کیلئے صحت کا جو طریقہ اختیار فرمایا وہ فطری طریقہ ہے۔ آج بھی ایسے معدنی چشمے اس نے کائنات انسانی کے فائدے کی خاطر ظاہر کر رکھے

۱: ابن کثیر۔ سورۂ ص

۲: موضح القرآن سورۂ ص۔

ہیں۔ جن میں غسل کرتے اور ان کا پانی پینے سے بہت سے امراض کم ہو جاتے یا دور ہو جاتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ایسے چشمے کا ظہور ایوب کیلئے اعجاز کی صورت میں ہوا اور عام حالات میں اسباب کے ما تحت ہوا کرتا ہے۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم نے ارشاد فرمایا۔ حضرت ایوب غسل فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے سونے کی چند ٹڈیاں ان پر برسائیں ایوب نے ان کو دیکھا تو مٹھی بھر کر کپڑے میں رکھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ایوب کو پکارا: ایوب! کیا ہم نے تم کو یہ سب کچھ دھن دولت دے کر غنی نہیں بنا دیا پھر یہ کیا؟ ایوب نے عرض کیا: پروردگار! یہ صحیح اور درست مگر تیری نعمتوں اور برکتوں سے کب کوئی بے پرواہ ہو سکتا ہے۔ ولکن لا غنی عن برکتك (بخاری کتاب الانبیاء)

اس روایت کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں کہ امام بخاری کی اپنی شرط کے مطابق حضرت ایوب کے واقعہ سے متعلق کوئی خبر ثابت نہیں ہو سکی۔ اسلئے صرف مسطورۂ بالا روایت ہی پر انہوں نے اکتفا کیا۔ اسلئے کہ وہ ان کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔ اسکے بعد حافظ ابن حجر اپنی جانب سے فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں اگر کوئی روایت صحت کو پہنچ سکی ہے تو وہ حضرت انس کا ایک اثر ہے۔ جس کو ابن ابی حاتم اور ابن جریج نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے اور وہ روایت اس طرح ہے:

حضرت انس سے روایت کہ ایوب تیرہ سال تک مصائب کے امتحان میں مبتلا رہے۔ حتیٰ کہ ان کے تمام عزیز و اقارب اور قریب و بعید کے متعارف سب ہی نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ البتہ اعزہ میں سے ان کے دو عزیز ضرور صبح و شام ان کے پاس آتے رہے۔ ایک مرتبہ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ایوب نے کوئی بہت ہی بڑا گناہ کیا ہے۔ تب ہی تو وہ اس کی پاداش میں ایسی سخت مصیبت کے اندر مبتلا ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو خدا ان پر مہربان نہ ہو جاتا اور ان کو شفا نہ ہو جاتی؟ یہ بات دوسرے نے حضرت ایوب سے کہہ سنائی۔ ایوب یہ سن کر بہت بے چین اور مضطرب ہو گئے اور خدائے تعالیٰ کی درگاہ میں سر بسجود ہو کر دعا گو ہوئے۔ اس کے فوراً بعد ہی ایوب رفع حاجت کیلئے جگہ سے اٹھے اور ان کی بیوی ان کا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں۔ جب فارغ ہو گئے اور وہاں سے علیحدہ ہوئے تو خدا کی وحی نازل ہوئی کہ زمین پر پاؤں سے ٹھوکر مارو، اور جب انہوں نے ٹھوکر ماری تو پانی کا چشمہ ابل پڑا اور انہوں نے غسل صحت کیا اور پہلے سے زیادہ صحیح و تندرست نظر آنے لگے۔ یہاں بیوی انتظار کر رہی تھیں کہ ایوب تازگی اور شگفتگی کے ساتھ سامنے نظر آئے وہ قطعاً نہ پہچان سکیں اور ایوب کے متعلق ان ہی سے دریافت کرنے لگیں۔ تب آپ نے فرمایا۔ میں ہی ایوب ہوں اور خدا کے فضل و کرم کا واقعہ سنایا۔ روزمرہ کے کھانے کیلئے ایوب کے پاس ایک کٹھری گیہوں کی اور ایک جو کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دولت میں اضافہ کرنے کیلئے گیہوں کو سونے اور جو کو چاندی سے بدل دیا۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۳۲۵)

قریب قریب اسی قسم کا واقعہ ابن ابی حاتم نے حضرت عبد اللہ بن عباس سے بھی روایت کیا ہے اور مدت مصیبت کے متعلق وہب بن منبہ تین سال بیان کرتے ہیں اور حسن سے سات سال منقول ہیں۔
[illegible]

سفر ایوب

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کی روایات کا ماخذ سفر ایوب سے منقول اسرائیلی روایت ہیں۔ اسلیئے کہ اس صحیفہ میں ہی ایوب کے متعلق یہ دو باتیں خصوصیت سے درج ہیں جن کا ذکر قرآن عزیز میں موجود نہیں ہے۔ ایک یہ کہ حضرت ایوب کے چند دوستوں نے ان سے کہا تھا کہ تو نے کوئی سخت گناہ کیا ہے۔ تب ہی اس مصیبت میں مبتلا ہوا۔ دوسری یہ کہ حضرت ایوب نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور ان سے مناظرہ کیا۔ یہ مناظرہ بہت طویل ہے اور صحیفہ کے آٹھ ابواب اسی سے متعلق ہیں اور جب دونوں دوستوں نے کسی طرح یقین نہ کیا تب بے چین و مضطرب ہو کر ایوب نے خدا کی درگاہ میں دعا کی کہ ان کی صداقت ظاہر کر اور شفایاب کر دے۔ چنانچہ سفر ایوب میں ہے۔

> تب تیمنی الیفز نے جواب دیا اور کہا: اگر ہم تجھ سے ایک بات کہیں تو کیا تو ناراض ہو گا۔ یاد کیجیو، کیا کوئی بے گناہ ہوتے ہوئے بھی کبھی ہلاک ہوا اور کہاں صادق مارے گئے۔
>
> (باب ۴ آیت ۱-۷)
>
> تب ضوفر نعماتی نے جواب دیا اور کہا: کیا طول کلام کا جواب نہ دیا جائے اور کیا کوئی شخص اپنی زیادہ گوئی سے بے گناہ ٹھہرے؟......... جان رکھ کہ خدا نے تیری بدکاری کا بہت ہی کم بدلہ لیا ہے۔ کیا تو اپنی تلاش سے خدا کا بھید پا سکتا ہے۔ (باب ۱۱ آیات ۔)

حضرت ایوب نے اپنے ان دوستوں کے اس الزام کو تسلیم نہیں کیا اور مناظرہ میں ان کو بتایا کہ میں بے گناہ ہوں اور یہ مصیبت خدا کی جانب سے ایک امتحان ہے اور ہم اس کی حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ نے ایوب کے کلام کی تصدیق کی اور ان کے دوستوں کو قصوروار ٹھہرایا۔

> اور ایسا ہوا کہ جب خداوند ایوب سے یہ باتیں کہہ چکا تو خداوند نے الیفز تیمنی سے کہا کہ میرا غضب تجھ پر اور تیرے دونوں دوستوں پر بھڑکا ہے۔ کیونکہ تم نے میری بابت حق باتیں نہیں کہیں۔ جیسی میرے بندے ایوب نے کہی ہیں۔ (باب ۴۲ آیات ۔)

سفر ایوب نے حضرت ایوب کے ان دوستوں کے نام یہ بتائے ہیں: تیمنی، الیفز سوخی، بلدو، نعماتی ضوفر اور محققین تورات کا یہ دعویٰ ہے کہ سفر ایوب قدیم عربی زبان کی غیر غنائی شاعری کا بے نظیر شاہکار ہے اور یہ کہ دنیا کی قدیم ترین نظم سفر ایوب ہے اور تاریخی اعتبار سے صرف رگ وید اس کا معارضہ کر سکتا ہے۔۔ جبکہ اس کی تصنیف کے زمانہ سے متعلق وہ مذہب تسلیم کر لیا جائے جو رگ وید کو ۱۵۰۰ ق م یا اس سے بھی پیچھے لے

۱۔ ایضاً ص ۷ ۳۲۔

جانا چاہتا ہے۔ (تفسیر ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۸۸)

وفات

سفر ایوب میں ہے کہ ابتلاء سے نجات پانے کے بعد ایوب علیہ السلام ایک سو چالیس سال زندہ رہ کر انتقال کر گئے:

بعد اس کے ایوب ایک سو چالیس برس جیا اور اپنے بیٹے اور اپنے بیٹیوں کے بیٹے چار پشت تک دیکھے اور ایوب بوڑھا اور دراز عمر ہو کے مر گیا۔ (باب ۴۲ آیات ۱۶۔۱۷)

بصائر

حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں صبر و ضبط، استقلال و استقامت اور مصائب و بلایا میں شکر و سپاس گزاری کے جو اسرار اور حکمتیں موجود ہیں۔ وہ اہل بصیرت کیلئے درس عبرت ہیں۔ ان میں سے چند مسطورۂ ذیل ہیں۔

۱ بندگانِ خدا میں سے جس کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ جس قدر تقرب حاصل ہوتا ہے۔ اسی نسبت سے وہ بلایا و مصائب کی بھٹی میں زیادہ تپایا جاتا ہے اور جب وہ ان کے پیش آنے پر صبر واستقامت سے کام لیتا ہے تو وہی مصائب اس کے درجات تقرب کی رفعت و بلندی کے سبب بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کو نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

قال النبی ﷺ اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الصالحون ثم الامثل فالامثل۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۸۸ منقول از صحاح)

مصائب میں سب سے زیادہ سخت امتحان انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے۔ اسکے بعد صلحاء کا نمبر ہے اور پھر حسب مراتب ودرجات۔

قال النبی ﷺ یبتلی الرجل علیٰ قدر دینه فان کان فی دینه صلابة زید فی بلائه (ایضا)

انسان اپنے دین کے درجات کے مناسب آزمایا جاتا ہے پس اگر اس کے دین میں پختگی اور مضبوطی ہے تو وہ مصیبت کی آزمائش میں بھی دوسروں سے زیادہ ہوگا۔

۲ وجاہت و عزت، دولت و ثروت اور خوشحالی و رفاہیت کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزری اور احسان شناسی کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے اور اگر رعونت و انانیت کار فرما نہیں ہے تو بہت آسان ہے لیکن مصیبت و بلاء، رنج و محن اور عسرت و تنگ حالی میں رضا بقضاء رہ کر حرفِ شکایت تک زبان پر نہ لانا اور صبر واستقامت کا ثبوت دینا بہت مشکل اور کٹھن ہے۔ اسلئے جب کوئی خدا کا نیک بندہ اس زبوں حالت میں ضبط و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور صبر و شکر کا مسلسل مظاہرہ کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی صفت "رحمت" بھی جوش میں آجاتی ہے اور ایسے شخص پر اس کے فضل و کرم کی بارش ہونے لگتی ہے اور غیر متوقع طور پر بے غایت افضال و اکرام سے نوازا جاتا اور دین و دنیا دونوں کی کامرانی کا حقدار بن جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ایوب

ؑ کی مثال اس کیلئے روشن شہادت ہے:

إِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ أَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ○ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّآتَيْنَاهُ أَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ○ (الانبیاء)

۳۔ انسان کو چاہئے کہ کسی حالت بھی خدائے تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ اسلئے کہ قنوطیت کفر کا شیوہ ہے اور یہ نہ سمجھے کہ مصیبت وبلا محض گناہوں کی پاداش ہی میں وجود پذیر ہوتی ہیں۔ بلکہ بسا اوقات آزمائش اور امتحان بن کر آتی اور صابر وشاکر کیلئے اللہ تعالیٰ کی آغوش رحمت وا کرتی ہیں۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتا ہے:

انا عند ظن عبدی بی۔ (الحدیث)

میں اپنے بندہ کے گمان سے قریب ہوں۔

یعنی بندہ میرے متعلق جس قسم کا گمان اپنے قلب میں رکھتا ہے۔ میں اس کے گمان کو پورا کر دیتا ہوں۔

۴۔ زن و شو کے تعلقات میں وفاداری اور استقامت سب سے زیادہ محبوب شے ہے اور اسی لیئے ایک حدیث میں شیطانی وساوس میں سے سب سے زیادہ قبیح وسوسہ جو شیطان کو بہت ہی پیارا ہے زن و شو کے درمیان بدگمانی اور بغض وعداوت کا بیج بو دینا ہے۔ اسی لئے صحیح احادیث میں اس عورت کو جنت کی بشارت دی گئی ہے جو اپنے شوہر کے حق میں نیکوکار اور وفادار ثابت ہو اور اس وفا اور محبت کی قدر و قیمت اس وقت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ جب شوہر مصائب و آلام میں گرفتار ہو اور اس کے اعزہ و اقربا تک اس سے کنارہ کش ہو چکے ہوں۔ چنانچہ ایوب ؑ کی "زوجہ مطہرہ" نے ایوب ؑ کے زمانۂ مصیبت میں جس حسن وفا، اطاعت، ہمدردی اور غم خواری کا ثبوت دیا، اللہ تعالیٰ نے اس کے احترام میں ایوب ؑ کی قسم کو ان کے حق میں پورا کرنے کیلئے عام احکام قسم سے جدا ایک ایسا حکم دیا۔ جس سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس نیک بی بی کی قدر و منزلت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

۵۔ عیش و راحت میں تواضع و شکر اور رنج و مصیبت میں ضبط و صبر دو ایسی بیش بہا نعمتیں ہیں کہ جس شخص کو یہ نصیب ہو جائیں۔ وہ دین و دنیا میں کبھی ناکام نہیں رہ سکتا اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہر حالت میں اس کی رفیق رہتی ہے:

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ (ابراھیم)

اور (یاد کرو) جب: تمہارے رب نے تم کو آگاہ کیا اگر شکر بجالاؤ گے تو میں تمہیں (اپنی نعمتیں) اور زیادہ دوں گا۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ○ الَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ○ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ○ (بقرہ)

اور خوشنودی کی بشارت سنادو ان لوگوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی مہربانی اور رحمت ہے اور یہ سیدھے راستہ پر ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام

- حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں
- حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ
- نسب
- زمانہ کا تعین
- مقام دعوت
- چند تفسیری مباحث
- متنبی کاذب کی تلبیس
- وفات
- موعظت

حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں

قرآن عزیز میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر چھ سورتوں میں کیا گیا ہے: سورۂ نساء، انعام، یونس، الصافات، انبیاء، القلم۔ ان میں سے چار پہلی سورتوں میں نام مذکور ہے اور دو آخر کی سورتوں میں "ذوالنون" اور "صاحب الحوت" مچھلی والا کہہ کر صفت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ذیل کا نقشہ اس حقیقت کیلئے کاشف ہے:

شمار	سورۃ	آیت	عدد	شمار	سورۃ	آیت	عدد
۱	نساء	۱۶۳	۱	۴	انبیاء	۸۷، ۸۸	۲
۲	انعام	۸۷	۱	۵	الصافات	۱۳۹۔۱۴۸	۱۰
۳	یونس	۹۸	۱	۶	القلم	۴۸۔۵۰	۳
							۱۸

یہ بھی واضح رہے کہ سورۂ نساء اور انعام میں انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں فقط نام مذکور ہے اور باقی سورتوں میں واقعات پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے اور حضرت یونس علیہ السلام کی حیات طیبہ کے صرف اسی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ جو ان کی پیغمبرانہ زندگی سے وابستہ ہے اور جس میں رشد و ہدایت کے مختلف گوشے دعوت بصیرت دیتے ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ

قرآن عزیز کی روشنی میں یونس علیہ السلام کا واقعہ اگرچہ مختصر اور اظہارِ واقعہ کے لحاظ سے صاف اور واضح ہے۔ مگر بعض تفسیری مباحث نے اس کی جزئیات کو معرکۃ الآراء بنا دیا ہے۔ اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اول

آیت قرآنی کی روشنی میں واقعہ کو مفصل بیان کر دیا جائے اور اس کے بعد تفسیری مباحث پر کلام کیا جائے تاکہ واقعہ کی حقیقت سمجھنے میں مدد ملے۔ (روح المعانی سورۂ یونس و صافات)

حضرت یونس کی عمر مبارک اٹھائیس سال کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت پر سرفراز فرمایا اور اہل نینوی کی رشد و ہدایت کیلئے مامور کیا۔ یونس ایک عرصہ تک ان کو تبلیغ فرماتے اور توحید کی دعوت دیتے رہے۔ مگر انہوں نے اعلان حق پر کان نہ دھرا اور تمرد و سرکشی کے ساتھ شرک و کفر پر اصرار کرتے رہے اور گزشتہ نافرمان قوموں کی طرح خدا کے سچے پیغمبر کی دعوت حق کا ٹھٹھا کرتے اور مذاق اڑاتے رہے۔ تب مسلسل اور پیہم دشمنی اور مخالفت سے متاثر ہو کر یونس قوم سے خفا ہو گئے اور ان کو عذاب الٰہی کی بددعا کر کے ان کے درمیان سے غضبناک روانہ ہو گئے۔

فرات[1] کے کنارے پہنچے تو ایک کشتی کو مسافروں سے بھرا ہوا تیار پایا۔ حضرت یونس کشتی میں سوار ہوئے اور کشتی نے لنگر اٹھا دیا۔ راہ میں طوفانی ہواؤں نے کشتی کو آگھیرا، جب کشتی ڈگمگانے لگی اور اہل کشتی کو غرق ہونے کا یقین ہونے لگا تو اپنے عقیدہ کے مطابق کہنے لگے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشتی میں کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے۔ جب تک اس کو کشتی سے جدا نہ کیا جائے گا نجات مشکل ہے"۔ یونس نے سنا تو ان کو تنبہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو میرا نینوی سے وحی کا انتظار کئے بغیر اس طرح چلا آنا پسند نہیں آیا اور یہ میری آزمائش کے آثار ہیں۔ یہ سوچ کر انہوں نے اہل کشتی سے فرمایا: وہ غلام میں ہوں جو اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے۔ مجھ کو کشتی سے باہر پھینک دو، مگر ملاح اور اہل کشتی ان کی پاکبازی سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور آپس میں یہ طے کیا کہ قرعہ اندازی کی جائے۔ چنانچہ تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی اور ہر مرتبہ یونس کے نام پر قرعہ نکلا۔ تب مجبور ہو کر انہوں نے یونس کو دریا میں ڈال دیا یا وہ خود دریا میں کود گئے۔ اسی وقت خدائے تعالیٰ کے حکم سے ان کو مچھلی نے نگل لیا۔ مچھلی کو حکم تھا کہ صرف نگل لینے کی اجازت ہے۔ یونس تیری غذا نہیں ہے۔ اسلئے اس کے جسم کو مطلق گزند نہ پہنچے۔ یونس نے جب مچھلی کے پیٹ میں خود کو زندہ پایا تو درگاہ الٰہی میں اپنی اس ندامت کا اظہار کیا کہ کیوں وہ وحی الٰہی کا انتظار کئے اور اللہ تعالیٰ سے اجازت لیے بغیر امت دعوت سے ناراض ہو کر نینوی سے نکل آئے اور عفو تقصیر کیلئے اس طرح دعاگو ہوئے

الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ہی یکتا ہے۔ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں بے شبہ میں اپنے نفس پر خود ہی ظلم کرنے والا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے یونس کی درد بھری آواز کو سنا اور قبول فرمایا، مچھلی کو حکم ہوا کہ یونس کو "جو تیرے پاس ہماری امانت ہے" اگل دے۔ چنانچہ مچھلی نے ساحل پر یونس کو اگل دیا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے ان کا جسم ایسا ہو گیا تھا۔ جیسا کسی پرندہ کا

۱۔ روح المعانی۔
۲۔ فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۱۔

پیدا شدہ بچہ کہ جس کا جسم بے حد نرم ہوتا ہے[1] اور جسم پر بال تک نہیں ہوتے، غرض یونس علیہ السلام بہت نحیف و ناتواں حالت میں خشکی پر ڈال دیئے گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے ایک بیلدار درخت اگا دیا۔[2] جس کے سایہ میں وہ ایک جھونپڑی بنا کر رہنے لگے چند دن کے بعد ایسا ہوا کہ حکم خدا سے اس بیل کی جڑ کو کیڑا لگ گیا اور اس نے جڑ کو کاٹ ڈالا۔ جب بیل سوکھنے لگی تو یونس علیہ السلام کو بہت غم ہوا۔ تب اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ ان کو مخاطب کیا اور فرمایا: یونس! تم کو اس بیل کے سوکھنے کا بہت رنج ہوا جو ایک حقیر سی چیز ہے مگر تم نے یہ نہ سوچا کہ نینویٰ کی ایک لاکھ سے زیادہ آبادی جس میں انسان بس رہے ہیں۔ اور ان کے علاوہ جاندار بھی آباد ہیں اسکو برباد اور ہلاک کر دینے میں ہم کو کوئی ناگواری نہیں ہوتی اور کیا ہم ان کیلئے تم سے زیادہ شفیق و مہربان نہیں ہیں جتنا کہ تجھ کو اس بیل کے ساتھ انس ہے جو تم وحی کا انتظار کئے بغیر قوم کو بد دعا کر کے ان کے درمیان سے نکل آئے۔ ایک نبی کی شان کے یہ نامناسب ہے کہ وہ قوم کے حق میں عذاب کی بد دعا کرے اور نفرت کے ساتھ ان سے جدا ہونے میں ایسی جلد بازی اختیار کرے کہ وحی کا بھی انتظار باقی نہ رہے۔"

ہوا یہ کہ ادھر یونس علیہ السلام بد دعا کر کے اہل نینویٰ سے جدا ہوئے اور ادھر انہوں نے بد عا کے کچھ آثار محسوس کیے۔ نیز یونس علیہ السلام کے بستی چھوڑ دینے پر ان کو یقین ہو گیا کہ وہ ضرور خدا کے سچے پیغمبر تھے اور اب ہلاکت یقینی ہے۔ تب ہی تو یونس ہم سے جدا ہو گئے۔ یہ سوچ کر فوراً بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب کے دل خوف و دہشت سے کانپ اٹھے اور یونس علیہ السلام کو تلاش کرنے لگے کہ ان کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کریں اور ساتھ ہی سب خدائے عالی کی درگاہ میں توبہ و استغفار کرنے لگے اور ہر قسم کے گناہوں سے کنارہ کش ہو کر آبادی سے باہر میدان میں نکل آئے۔ حتیٰ کہ چوپاؤں کو بھی ساتھ لے آئے اور بچوں کو ماؤں سے جدا کر دیا اور اس طرح دنیوی علائق سے کٹ کر درگاہ الٰہی میں گریہ وزاری کرتے اور متفقہ آواز سے یہ اقرار کرتے رہے:

(پروردگار! یونس علیہ السلام تیرا جو پیغام ہمارے پاس لے کر آئے تھے ہم اس کی تصدیق کرتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں) آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ[3] قبول فرمائی۔ ان کو دولت ایمان سے نوازا اور ان کو عذاب سے محفوظ کر دیا۔

بہر حال حضرت یونس علیہ السلام کو اب دوبارہ حکم ہوا[4] کہ وہ نینویٰ جائیں اور قوم میں رہ کر ان کی رہنمائی فرمائیں۔ تاکہ خدا کی اس قدر کثیر مخلوق ان کے فیض سے محروم نہ رہے۔ چنانچہ یونس علیہ السلام نے اس حکم کا امتثال کیا اور نینویٰ میں واپس تشریف لے آئے قوم نے جب ان کو دیکھا تو بے حد مسرت و خوشی کا اظہار کیا اور ان کی راہنمائی میں دین و دنیا کی کامرانی حاصل کرتی رہی۔

یہ ہے واقعہ کی وہ ترتیب جو آیت قرآنی کی تفسیر میں تاویلات سے پاک اور صحیح مفہوم کی ترجمان ہے اور بے غل و غش مختلف سورتوں کی تمام آیات کے معانی کو کسی تکلف کے بغیر صاف صاف ادا کر دیتی ہے۔ لیکن یہ

ا: تفسیر ابن کثیر الصافات۔
۲: کہتے ہیں کہ یہ کدو کی بیل تھی۔
۳: تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۲۲۔

حقیقت اچھی طرح اس وقت ظاہر ہو گی۔ جبکہ واقعہ سے متعلق اختلافی مباحث کو زیر بحث لایا جائے اور پھر اس تفصیلی ترتیب کا موازنہ کیا جائے۔ مگر اس سے قبل آیاتِ قرآنی کا مطالعہ ضروری ہے:

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ○ (یونس)

پھر کیوں ایسا ہوا کہ قوم یونس کی بستی کے سوا اور کوئی بستی نہ نکلی کہ (نزول عذاب سے پہلے) یقین کر لیتی اور ایمان کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتی جو یونس کی قوم جب ایمان لے آئی، تو ہم نے رسوائی کا وہ عذاب ان پر سے ٹال دیا جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والا تھا اور ایک خاص مدت تک سرو سامان زندگی سے بہرہ مند ہونے کی مہلت دے دی۔

وَذَا النُّونِ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ○ (انبیاء)

اور ذوالنون (یونس کا معاملہ یاد کرو) جب ایسا ہوا تھا کہ وہ (راہِ حق میں) خشمناک ہو کر چلا گیا۔ پھر اس نے خیال کیا کہ ہم اس کو تنگی (آزمائش) میں نہیں ڈالیں گے پھر (جب اس کو آزمائش کی تنگی نے آگھیرا تو) اس نے (مچھلی کے پیٹ میں اور دریا کہ گہرائی کی) تاریکیوں میں پکارا "خدایا تیرے سوا کوئی معبود نہیں! تیرے لئے ہر طرح کی پاکی ہو! حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنے اوپر بڑا ہی ظلم کیا

تب ہم نے اسکی دعا قبول کی اور اسے غمگینی سے نجات دی اور ہم اسی طرح ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں۔

وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ○ إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ○ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ ○ فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَهُوَ مُلِيمٌ ○ فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ ○ لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ○ فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيمٌ ○ وَأَنْبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِنْ يَقْطِينٍ ○ وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ ○ فَآمَنُوا فَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ○ (الصافات)

اور بے شک یونس پیغمبروں میں سے تھا (اور وہ واقعہ یاد کرو) جبکہ وہ بھری ہوئی کشتی کی جانب بھاگا۔ (اور جب کشتی والوں نے غرق ہونے کے خوف سے) قرعہ ڈالا تو (دریا میں) ڈالے جانے کیلئے اس کا نام نکلا، پھر نگل گئی اس کو مچھلی اور وہ (اللہ کے نزدیک قوم کے پاس سے بھاگ آنے پر) قابل ملامت تھا۔ پس اگر یہ بات نہ ہوتی کہ وہ خدا کی پاکی بیان کرنیوالوں میں سے تھا تو مچھلی کے پیٹ میں قیامت تک رہتا۔ پھر ڈال دیا۔ ہم نے اس کو (مچھلی کے پیٹ سے نکال کر) چٹیل زمین میں اور وہ ناتواں اور بے حال تھا اور ہم نے اس پر (سایہ کیلئے) ایک بیل والا درخت اگا دیا اور ہم نے اس کو ایک لاکھ سے زیادہ انسانوں کی جانب پیغمبر بنا کر بھیجا۔ پس وہ ایمان لے آئے

پھر ہم نے ان کو ایک مدت (پیغامِ موت) تک سامانِ زندگی سے نفع اٹھانے کا موقع دیا۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ إِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۝ لَوْلَآ أَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۝ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (القلم)

پس اپنے پروردگار کے حکم کی وجہ سے صبر کو کام میں لاؤ اور مچھلی والے (یونس) کی طرح (بے صبر) نہ ہو جاؤ جبکہ اس نے (خدا کو) پکارا اور وہ بہت مغموم تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اس کے پروردگار کے فضل نے اس کو (آغوش میں) لے لیا تھا تو ہو ضرور چٹیل میدان میں ملامت شدہ ہو کر پھینک دیا جاتا۔ پس اس کے پروردگار نے اس کو برگزیدہ کیا اور اس کو نیکو کاروں میں رکھا۔

نسب

مؤرخین اسلام اور اہل کتاب اس پر متفق ہیں کہ یونس علیہ السلام کے نسب سے متعلق اس سے زیادہ اور کوئی بات ثابت نہیں کہ ان کے والد کا نام متی[1] ہے اور بعض لوگوں نے کہا کہ متی حضرت یونس علیہ السلام کی والدہ کا نام ہے مگر یہ فاحش غلطی ہے۔ اسلئے کہ بخاری کی ایک روایت میں حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے بصراحت مذکور ہے کہ متی والد کا نام[2] ہے اور اہل کتاب یونس علیہ السلام کا نام یوناہ اور ان کے والد کا نام امتی بتاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یونس بن متی اور یوناہ بن امتی میں کوئی نمایاں اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ عربی اور عبری زبانوں کی لفظی تعبیر کا فرق ہے۔

زمانہ کا تعین

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یونس علیہ السلام کے زمانہ کا تعین تاریخی روشنی میں مشکل ہے۔ البتہ بعض مورخین نے یہ کہا ہے کہ جب ایران (فارس) میں طوائف الملوکی کا دور تھا۔ اس وقت نینوی میں حضرت یونس علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۰)

محققین جدید نے فارس کی حکومت کو تین عہدوں پر تقسیم کیا ہے۔ ایک حملۂ سکندر سے قبل، دوسرا پارتھوی حکومت، یعنی طوائف الملوکی، تیسرا ساسانی عہد۔

پہلا عہد، عروج و ارتقاء کا عہد شمار ہوتا ہے اور اس کی ابتداء تقریباً ۵۵۹ ق م سے سمجھی گئی ہے جو تقریباً ۲۷۳ ق م یعنی دو صدی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا عہد تقریباً ۲۷۳ ق م سے شروع ہو کر ۱۵۰ء تک پہنچتا ہے اور یہ طوائف الملوکی کا دور کہا جاتا ہے۔[3] اور اس کے بعد ساسانی دورِ حکومت شروع ہو جاتا ہے۔

۱: فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۱۔

۲: بخاری کتاب الانبیاء۔

۳: البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۱۸۳۔ یہ دور اردشیر بن بابکان پر ختم ہو جاتا ہے اور اردشیر پہلا ساسانی بادشاہ ہے۔

اس تحقیق کے پیش نظر حافظ ابن حجرؒ کی نقل کے مطابق یونس ﷺ کا عہد ۲۷۵۳ ق م سے لے کر حضرت عیسیٰ ﷺ کی ولادت کے درمیان ہونا چاہئے۔ مگر یہ قول تاریخی نقطۂ نظر سے غلط ہے۔ اسلئے کہ مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ بابلیوں کے ہاتھوں آشوریوں کا یہ مشہور شہر (نینوی) ۶۱۲ ق م میں تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں اہل کتاب کی روایات ہی شہادت دیتی ہیں کہ حضرت یونس ﷺ کے عہد کے بعد ۶۹۰ ق م میں جب اہل نینوی نے دوبارہ کفر و شرک اور ظلم و ستم شروع کر دیا اور ان کی سرکشی بہت بڑھ گئی۔ تب ایک اسرائیلی نبی ناحوم نے دوبارہ ان کو سمجھایا اور ہدایت و رشد کی دعوت دی اور جب انہوں نے کوئی پروا نہیں کی تو نینوی کی تباہی کی پیشین گوئی فرمائی اور اس سے ستر برس بعد ۶۱۲ ق م میں نینوی تباہ و برباد ہو گیا۔ لہذا حضرت یونس ﷺ کا عہد ۶۹۰ ق م سے بھی قدیم ہونا چاہئے۔ غالباً شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) کا یہ قول صحیح ہے کہ یونس ﷺ حزقیل ﷺ کے معاصر ہیں۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

> حزقیل کے یاروں میں تھے یونس ﷺ بڑے شوق میں عبادت کی اور دنیا سے الگ حکم ہوا کہ ان کو بھیجو شہر نینوا میں مشرکوں کو منع کریں بت پوجنے سے۔ (موضح القرآن سورہ یونس)

لیکن اس جگہ حزقیل کے نام میں عرب مورخین کو عام طور پر یہ مغالطہ ہوا ہے کہ وہ اس سے حزقیل "بادشاہ" سمجھے ہیں حالانکہ بنی اسرائیل میں اس نام کا کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔ اسلئے دراصل اس سے مراد مشہور پیغمبر حزقیل ﷺ ہیں۔

اس تحقیق سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ یونس ﷺ اسرائیلی پیغمبر ہیں۔

امام بخاری نے کتاب الانبیاء میں انبیاء علیہم السلام کے ذکر میں اپنی تحقیق کے مطابق جو ترتیب قائم کی ہے۔ اس میں یونس ﷺ کا ذکر حضرت موسیٰ و حضرت شعیب (علیہما السلام) اور حضرت داؤد ﷺ کے درمیان کیا ہے۔

مقام دعوت

عراق کے مشہور و معروف مقام نینوی کے باشندوں کی ہدایت کیلئے ان کا ظہور ہوا تھا۔ نینوی آشوری حکومت کا پایۂ تخت اور موصل کے علاقہ کا مرکزی شہر تھا۔

جس زمانہ میں یونس ﷺ نینوی کے باشندوں کی ہدایت کیلئے مبعوث ہوئے وہ زمانہ آشوری حکومت کے عروج کا زمانہ تھا۔ مگر ان کا طرزِ حکومت قبائلی تھا اور ہر ایک قبیلہ کا جدا جدا حکمران یا بادشاہ ہوتا تھا اور نینوی ان قبائلی حکومتوں کے پایۂ تختوں میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اسلئے اپنے عروج و اقبال میں مشہور تھا۔

قرآن عزیز میں اس شہر کی مردم شماری ایک لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے۔ ترمذی نے بسندِ غریب ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے۔ اسمیں یہ تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی گئی ہے اور مجموعۂ تورات میں جو صحیفۂ یونس ﷺ کے نام سے موسوم ہے اس میں بھی یہی تعداد مذکور ہے۔ مگر ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سعید

بن جبیر اور مکحول وغیرہ سے اَوْ يَزِيْدُوْنَ کی تفسیر میں دس ہزار سے لے کر ستر ہزار تک منقول ہے۔ ہمارے نزدیک پہلا قول راجح ہے۔

چند تفسیری مباحث

سورۂ انبیاء میں ہے: وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض مفسرین یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ یونس علیہ السلام اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے اور وحی کا انتظار اور خدا کی مرضی معلوم کیے بغیر چلے گئے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ہم ان کی اس جلد بازی پر ان کو آزمائش اور تنگی میں نہ ڈالیں گے"۔ اس تفسیر کے مطابق مُغَاضِبًا کا تعلق قوم سے ہے اور لَنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ کے معنی لَنْ نُّضَيِّقَ عَلَيْهِ کے ہیں اور قدر بمعنی ضیق (تنگی) بکثرت مستعمل ہے۔ جمہور کا یہ قول ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ، ضحاک رحمہ اللہ، قتادہ رحمہ اللہ، حسن رحمہ اللہ سے یہ منقول ہے اور ابن کثیرؒ اور ابن جریرؒ کا یہ مختار قول ہے۔

اور بعض مفسرین مُغَاضِبًا کی پہلی تفسیر کے ساتھ اتفاق رکھتے ہوئے "لَنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ" میں "قدر" بمعنی "تقدیر و قدرت" لیتے ہیں اور یہ معنی کرتے ہیں "یونس علیہ السلام نے سمجھا کہ ہم اس کو نہ پکڑ سکیں گے" یہ عطیہ عوفی کا قول ہے۔ مگر اس تفسیر پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایسا عقیدہ تو کفر ہے۔ لہٰذا یہ بات جبکہ ایک مسلمان بھی نہیں سمجھ سکتا تو نبی کیسے ایسا گمان کر سکتے ہیں۔ اس اشکال کا جواب مفسرین یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ انبیاء و مرسلین کے ساتھ عوام و خواص سے بالکل جدا ہے اور جو بات خواص اور صالحین کے حق میں معمولی اور قابل نظر انداز سمجھی جاتی ہے۔ وہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں سخت گرفت کا باعث ہو جاتی ہے اور اس بناء پر ان سے اگر معمولی سی لغزش بھی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے سخت سے سخت تعبیر اور اس کو بہت جرم ظاہر کرتا ہے۔ تاکہ وہ یہ محسوس کریں اور ان کی شان اس قدر رفیع اور خدا کے یہاں اس درجہ بلند ہے کہ معمولی سے معمولی لغزش بھی ان کی شان کے نامناسب ہے۔ مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ ان کے اس الزامی واقعہ میں ان کے تعلق ایسی بات بھی کہہ دیتا ہے جس سے یہ واضح ہو جائے کہ اگرچہ خدا کے نزدیک ان کا یہ معاملہ حد درجہ قابل گرفت و مواخذہ ہے۔ مگر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسکی بارگاہ میں ان کی مقبولیت و برگزیدگی میں مطلق فرق نہیں آیا۔ اور چونکہ وہ فوراً ہی خطا پر متنبہ کر دیئے جاتے اور وہ اظہارِ ندامت کے ساتھ عذر خواہی کر کے شرفِ قبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اسلئے ان کا تقرب الی اللہ اسی طرح قائم ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام، نوح علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے واقعات مذکورۂ قرآن اس کے شاہد ہیں۔

یہاں بھی یہی صورت ہے کہ یونس علیہ السلام نے حقیقتاً یہ گمان نہیں کیا تھا اور نہ کر سکتے تھے لیکن چونکہ وہ نبی تھے اور وحی الٰہی کے مخاطب رہتے تھے۔ اسلئے ان کے چلے جانے کی یہ صورت حال ان کی شان کے نامناسب تھی۔ لہٰذا خدائے تعالیٰ نے ان کی اس حالت کو ایسی سخت تعبیر کے ساتھ ظاہر فرمایا۔ مگر ساتھ ہی ان کے واقعات میں یہ ظاہر کر کے " وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ "اور" فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ "ان کی عظمت وشان

اور رفعت مرتبہ کو محفوظ رکھا۔ تاکہ کسی کو مغالطہ نہ ہونے پائے اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس خاص معاملہ سے کسی کج فہم کو کجروی کا موقع ہاتھ نہ آئے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ مُغاضِبًا کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ یعنی جب یونس علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ عذاب کی مدت پر عذاب نہیں آیا تو اس بات پر خفا ہو کر چلے گئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو قوم کے سامنے جھوٹا بنا دیا۔ لیکن یہ معنی ہرگز صحیح نہیں۔ اسلئے کہ جب یہ بات سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ یونس علیہ السلام اپنی قوم سے ناراض ہو کر اور عذاب کی پیشن گوئی کر کے نینویٰ سے چلے گئے تھے تو پھر اس صاف معنی کو چھوڑ کر ایک بے سند قصہ اس میں اور اس طرح اضافہ کرنا کہ وہ نینویٰ کی بستی سے نکل کر چھ دن جنگل میں مقیم رہے تاکہ قوم کی ہلاکت کا حال معلوم کریں اور جب شیطان نے پیر ضعیف کی شکل میں آ کر عذاب ٹل جانے کی اطلاع دی تو اللہ تعالیٰ سے خفا ہو کر چل دیئے اور پھر کشتی کا واقعہ پیش آیا۔ قطعاً دوراز کار اور بے محل ہے۔

حضرت شاہ عبد القادر (رحمۃ اللہ) نے اس موقع پر موضح القرآن میں جو تحریر فرمایا ہے وہ ان سب تفسیروں سے جدا روش پر مبنی ہے۔ ان کے نزدیک مُغاضِبًا کا تعلق قوم اور اللہ تعالیٰ دونوں سے ہے اور یونس علیہ السلام کی خفگی کا معاملہ تین مرتبہ پیش آیا۔ ایک جب کہ ان کو نینویٰ جانے کا حکم ہوا کہ اہل شہر نے شرک و کفر اور ظلم و ستم میں طوفان برپا کر رکھا ہے اور دوسرا جب کہ وہ قوم میں رہ کر سمجھاتے رہے اور انہوں نے کسی طرح مان کر نہ دیا تو عذاب کی پیشین گوئی کر کے اور خفا ہو کر چلے گئے اور تیسرا جب کہ ان کو یہ اطلاع ملی کہ عذاب نہیں آیا اور مجھ کو جھوٹا سمجھا جائے گا۔

مگر مجھ کو اس آخری حصہ کے متعلق سخت حیرت یہ ہے کہ یونس علیہ السلام کو یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ قوم پر عذاب نہیں آیا۔ مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ قوم پر اسلئے عذاب نہیں آیا کہ وہ ایمان سے بہرہ یاب ہو چکی اور آپ کیلئے چشم براہ ہے۔ رہا شیطان کے اطلاع دینے کا معاملہ سو اس کیلئے شرعی حجت کی ضرورت ہے جس کا اس جگہ قطعاً ثبوت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ آخری قول تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

حضرت شاہ صاحب نے جملہ ' اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ ' کی تفسیر میں بھی عجیب پہلو اختیار فرمایا ہے جو راجح و مرجوح اور صحیح و غیر صحیح سے قطع نظر ان کی ذکاوتِ طبع پر دلالت کرتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

''یہ جو فرمایا: سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے یعنی مہربانی کے معاملہ میں اس کو راضی نہ کر سکیں گے وہ ایسا خفا ہوا اور حکومت کے معاملہ میں ہر چیز آسان ہے۔''

یعنی یونس علیہ السلام نے خدا کے ساتھ ناز و ادا کا ایسا پہلو اختیار کیا کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ سے ایسے خفا ہوئے ہیں کہ اب راضی نہ ہوں گے۔ مگر ان کو یہ حقیقت فراموش ہو گئی کہ جب وہ آزمائش کے شکنجہ میں کسے جا کر پھر خدائے تعالیٰ کی مہربانیوں میں ڈھانپ لئے جائیں گے۔ اور پھر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جہاں حکومت و طاقت ہوتی ہے۔ وہاں مشکل آسان ہو جاتی ہے اور ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔

لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ○

۳) سورۂ والصافات میں اہل نینویٰ کے ایمان لے آنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ پس وہ ایمان لے آئے پھر ہم نے ان کو ایک مدت تک کیلئے فائدہ اٹھانے دیا اور سورۂ یونس میں ہے لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان پر سے وہ رسوا کن عذاب ٹال دیا جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والا تھا اور ایک خاص مدت تک فائدہ اٹھانے کی مہلت دے دی۔ ان ہر دو قرآنی آیات میں جملہ وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ نے مفسرین کیلئے بحث کا دروازہ کھول دیا اور جس قدر بھی احتمالات عقلی ہو سکتے تھے سب ہی بیان کر دیئے۔ کسی نے کہا: اس سے یہ مراد ہے کہ سنت اللہ یہ جاری رہی ہے کہ جب کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو پھر ٹلتا نہیں اور اس وقت کا ایمان معتبر نہیں کیونکہ وہ ''ایمان بالغیب'' نہیں ہوتا بلکہ مشاہدہ کا ایمان ہوتا ہے جیسا کہ فرعون نے غرق ہوتے وقت عذاب کے فرشتوں کو دیکھ کر کہا تھا اٰمَنَّا بِرَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ مگر یونس علیہ السلام کی قوم اس قانون سے مستثنیٰ کر دی گئی اور عذاب دیکھ کر جب انہوں نے توبہ اور انابۃ الی اللہ کا مظاہرہ کیا تو ان پر سے عذاب ٹال دیا گیا۔ چنانچہ اس جملہ سے قبل اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ پھر کیوں ایسا ہوا کہ قوم یونس کی بستی کے سوا اور کوئی بستی نہ نکلی کہ ایمان لے آتی اور اس کا ایمان اس کیلئے نفع بخش ہوتا۔

یہ تفسیر جمہور کے نزدیک ساقط الاعتبار ہے۔ اسلئے کہ زیر بحث آیت میں کسی جملہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قوم یونس پر عذاب آچکا تھا اور جب وہ عذاب میں گھر گئے تو عذاب کے مشاہدہ کے بعد خوف نے ان کو ایمان پر آمادہ کر دیا اور پھر سنت اللہ کے خلاف صرف یونس علیہ السلام کی قوم کے ساتھ معاملہ کیا گیا کہ ان کے ایمان بالمشاہدہ کو قبول کر کے ان پر سے عذاب ہٹالیا گیا بلکہ آیت میں تو صاف یہ کہا گیا ہے کہ جس طرح یونس علیہ السلام کی قوم ایمان لے آئی اسی طرح اور بستیوں نے بھی کیوں ایمان قبول نہیں کر لیا تاکہ جس طرح قوم یونس علیہ السلام عذاب سے محفوظ رہی اسی طرح وہ سب بھی عذاب سے محفوظ رہتیں۔ اس مقام پر تو اللہ تعالیٰ اس پر ناراضی کا اظہار فرما رہے ہیں کہ ایمان لا کر دوسری بستی کے لوگوں نے بھی قوم یونس علیہ السلام کی طرح کیوں خود کو عذاب سے نہ بچا لیا لیکن جمہور کے خلاف تفسیر بالا یہ ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہی ہے کہ قوم یونس علیہ السلام کے سوا جس قوم نے بھی عذاب کا مشاہدہ کر کے ایمان قبول کیا ہم نے اس کے ایمان کو رد کر دیا۔ مگر قوم یونس پر یہ مہربانی کی کہ انکے ایمان بالمشاہدہ کو منظور کر لیا۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا!

اور اگر کوئی شخص اس موقع پر یہ سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ کو قوم یونس ہی کے ساتھ ایسی کیا خصوصیت تھی اور دوسری قوموں کے ساتھ کیا عداوت کہ جس قسم کا ایمان قوم یونس علیہ السلام کا قبول ہوا۔ اس قسم کا

دوسری قوموں کا کیوں نہ ہوا تو نہ معلوم اس تفسیر کے قائلین اسکا کیا جواب دیں گے؟ اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ چونکہ قوم یونس نے عذاب کا مشاہدہ کر کے ایمان قبول کیا تھا۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے صرف دنیا میں اس کو مقبول قرار دیا اور ان پر سے عذاب ہٹا کر دنیا کی زندگی میں مہلت دے دی مگر آخرت کا عذاب بحالہ ان پر قائم رہا۔

یہ قول بھی پہلے قول کی طرح غلط اور قرآن عزیز کے سیاق و سباق کے قطعاً خلاف ہے۔ اسلئے کہ سورۂ والصافات اور سورۂ یونس میں کا یہ مطلب کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ ان کا ایمان صرف دنیوی زندگی تک مفید تھا اور آخرت میں وہ کافر اور مشرک ہی شمار ہوں گے جبکہ سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ قوم یونس کی منقبت اور گزشتہ اقوام کے ایمان نہ لانے کی مذمت ہی میں اس واقعہ کو بیان کر رہا اور شاہد بنا رہا ہے اور اس جگہ سیاق کلام ہی یہ ہے کہ دوسری اقوام کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ جیسا کہ یونس کی قوم نے کیا اور جبکہ والصافات میں ان کے ایمان کو کسی بھی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا؟ اسکے علاوہ یہ بات بھی خاص توجہ کے لائق ہے کہ قرآن عزیز جب کبھی امنوا کہتا ہے تو اس سے وہی ایمان مراد لیتا ہے۔ جو دنیا و آخرت دونوں میں اس کے نزدیک مقبول ہے۔ وہ اسلمنا کو تو لغوی معنی میں استعمال کرتا ہے۔ جیسا کہ اعراب مدینہ کے واقعہ میں مذکور ہے لیکن امنوا، امنا کو کبھی "ایمان معتبر" کے سوا دوسرے معنی میں استعمال نہیں کرتا البتہ اس مقام پر یا تو اس معنی میں ہے جو ہم ترجمہ میں ابن کثیر سے نقل کر چکے ہیں اور یا پھر یہ مراد ہے کہ گزشتہ اقوام کی تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ جن قوموں نے اپنے نبی اور پیغمبر کی ہدایت کو تسلیم نہیں کیا اور ان کے ساتھ ٹھٹھا کر کے ظلم و طغیان کو اسوہ بنا لیا، وہ قومیں ان کے نبی کی بددعا سے ہلاک ہو گئیں اور ان کی بستیاں آنے والی قوموں کیلئے سرمایۂ عبرت بنیں۔ اسلئے قرآن عزیز جب عاد، ثمود، قوم صالح قوم لوط وغیرہ کا ذکر کرتا ہے تو چشم عبرت سے دیکھنے والے انکھ اٹھا کر ان بستیوں کا انجام دیکھ لیتے اور قرآن کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن یونس کی وم کا معاملہ ایک شبہ پیدا کرتا تھا اور وہ یہ کہ اگر باشندگان نینوی نے ایمان قبول کر لیا تھا۔ تو پھر خدا کے ان مقبول بندوں کی نسلیں آج بھی پھلتی پھولتی نظر آنی چاہئے تھیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ وہ قوم اور ان کا تمدن دنیا سے اسی طرح فنا ہو گیا۔ جس طرح عذاب الٰہی سے ہلاک شدہ قوموں کا، حتیٰ کہ نینوی جیسا عظیم الشان اور تاریخی شہر جو آشوری تمدن کا مرکز تھا۔ اس طرح دنیا سے مٹ گیا کہ **۲۰۰** ق م تک دنیائے تاریخ میں اس کا صحیح جائے وقوع تک بھی بے نشان اور نامعلوم ہو گیا تھا۔ (تفسیر ترجمان القرآن جلد ۲ ماخوذ از یونانی مورخ)

لہٰذا قرآن عزیز نے اس شبہ کا جواب پہلے ہی دے دیا تاکہ شبہ کرنے والے کی نگاہ فوراً ہی تاریخ کے دوسرے ورق پر پڑ جائے۔ وہ یہ کہ یہ درست ہے کہ قوم یونس حضرت یونس کے زمانہ میں مومن، عادل اور پاکباز ہو گئی تھی۔ لیکن ان کی حیات طیبہ کا یہ دور عرصہ تک قائم نہیں رہا اور عرصہ کے بعد انمیں کفر و شرک اور ظلم و سرکشی کا وہ تمام مواد پھر جمع ہو گیا۔ جس کیلئے یونس مبعوث ہوئے تھے اور اس زمانہ کے اسرائیلی نبی ناحوم نے اگرچہ ان کو بہت سمجھایا اور ہدایت و رشد کی راہ دکھائی۔ مگر اس مرتبہ گزشتہ قوموں کی طرح انہوں نے بھی سرکشی اور بغاوت کو زندگی کا نصب العین بنائے رکھا۔ تب وحی الٰہی کی روشنی میں

ناحوم نے نینویٰ کی تباہی کی خبر دی اور ان کی پیشین گوئی سے ستر برس کے اندر آشوری قوم کا تمدن اور ان کا مرکزی شہر سب بابلیوں کے ہاتھوں اس طرح فنا ہوگئے کہ نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔

پس قرآن عزیز نے ایک جانب قوم یونس کے ایمان لے آنے پر ان کی مدحت کی اور ان کو سراہا تو دوسری جانب یہ بھی اشارہ کر دیا کہ جن افراد نے یہ نیکوکاری اختیار کی ان کو ہم نے بھی سر و سامانِ زندگی سے نفع اٹھانے کا موقع دیا، یعنی عذاب سے بچا لیا لیکن قوم یونس کی یہی حالت ہمیشہ نہ رہی اور ایک زمانہ وہ آیا کہ انہوں نے پھر ظلم و ستم اور کفر و شرک کو اپنا لیا اور گزشتہ سرکش قوموں کی طرح سمجھانے کے باوجود بھی نہ سمجھی۔ تب خدائے تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ وہی کیا جو "سنت اللہ" کے مطابق ایسی قوموں کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔

بہر حال جمہور علماء اسلام کی تفسیر کے مطابق صحیح بات یہ ہے کہ قوم یونس پر عذاب نہیں آیا بلکہ بعض ابتدائی آثار نمودار ہوئے تھے۔ جن میں سب سے بڑا اثر حضرت یونس کا عذاب کی بد دعا کر کے بستی کو چھوڑ دینا تھا۔ جس کو قوم نے فوراً محسوس کیا دوسرے آثار و قرائن کو دیکھ کر یقین کر لیا کہ یونس بے شک خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور ایمان لے آئے اور کا مطلب یہ ہے کہ جب قوموں کی سرکشی اور ستم کشی پر عذاب آتا ہے تو عذابِ آخرت سے قبل ان کو دنیا ہی میں اس ذلت و رسوائی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور جب قوم یونس مسلمان ہوگئی اور ایمان لے آئی تو وہ دنیا کی اس ذلت و خواری سے بھی بچ گئے جو ظلم و شرک کی وجہ سے ان کو پیش آنے والی تھی یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دنیا کے عذاب سے تو بچ گئی۔ مگر آخرت کا عذاب بحالہ قائم رہا۔

حافظ ابن حجر اور ابن کثیر نے حضرت عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عباس، مجاہدؒ، سعید بن جبیرؒ سے یہی نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ سلف صالحین یہی تفسیر کرتے تھے۔ چنانچہ جملہ فلولا کانت قریۃ امنت فنفعھا ایمانھا الا قوم یونس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> والغرض انه لم يوجد قرية امنت بكمالها بنبيهم ممن سلف من القرىٰ الا قوم يونس وهم اهل نينوىٰ وما كان ايمانهم الا خوفا من وصول العذاب الذى انذرهم به رسولهم بعد ما عاينوا اسبابه وخرج رسولهم من بين اظهرهم فعند هاجاروا الى الله واستعانوا به......الخ (تفسیر ابن کثیر، سورۂ یونس)

اور غرض یہ ہے کہ گزشتہ بستیوں میں سے کوئی بستی ایسی نہ نکلی کہ اس کے باشندے اپنے نبیوں پر اس طرح ایمان کامل لے آتے جس طرح یونس کی قوم یونس پر ایمان لے آئی اور یہ باشندگان نینوئی تھے اور ان کے ایمان لانے کا واقعہ یہ ہے کہ ان کو اس عذاب کے آجانے کا ڈر پیدا ہو گیا تھا، جس سے ان کے پیغمبر نے ان کو ڈرایا تھا۔ جب کہ انہوں نے عذاب کے آثار محسوس کیے اور انہوں نے دیکھا کہ ان کا پیغمبر ان کے درمیان سے نکل گیا۔ اس وقت وہ اللہ کی طرف پناہ چاہنے لگے اور انہوں نے خدا کی پناہ ڈھونڈھنی شروع کر دی۔

اور جملہ ومتعنٰھم الی حین کی تفسیر میں کہتے ہیں:

ای الی وقت اجالهم ۔ (ایضاً)

یعنی اپنی زندگی میں عذاب سے محفوظ ہو گئے، رہا موت کا معاملہ تو وہ سب کیلئے ہے۔

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

فامنوا فمتعنهم الی حین واختلف المفسرون هل کشف عنهم العذاب الاخروی مع الدنیوی او انما کشف عنهم فی الدنیا فقط؟ علی قولین والایمان منقذ من العذاب الاخروی وهذا هو الظاهر............الخ (سورۂ والصافات و فتح الباری جلد ٦ ص ٣٥١)

اور آیت فمتعناهم الی حین میں مفسرین کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اخروی اور دنیوی دونوں عذاب ٹل گئے تھے اور دوسرا یہ کہ صرف دنیوی ٹل گیا تھا اور اخروی بحالہ قائم رہا۔ اور حقیقت حال یہ ہے کہ "ایمان" نہ صرف دنیا کے عذاب سے چھٹکارا دلاتا ہے بلکہ آخرت کے عذاب سے بھی نجات دلانے والا ہے۔

اور حضرت شاہ صاحبؒ نے اس مقام پر بھی اپنے رنگ کی جدا تفسیر کی ہے۔ مگر اس کا مآل جمہور کی تائید ہی نکلتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

یعنی دنیا میں عذب دیکھ کر ایمان لانا کسی کو کام نہیں آیا۔ مگر قوم یونس کو اس واسطے کہ ان پر (خدا کی جانب سے) حکم عذاب نہ پہنچا تھا۔ حضرت یونسؑ کی شتابی سے صورت عذاب کی نمودار ہوئی تھی وہ ایمان لائے اور پھر بچ گئے۔ اسی طرح مکہ کے لوگ فتح مکہ میں ان پر فوج اسلام پہنچی قتل و غارت کو، لیکن ان کا ایمان قبول ہو گیا اور امان ملی۔ (سورۂ یونس)

متنبی کاذب کی تلبیس

حضرت یونس کے واقعہ سے متنبی پنجاب (مرزا غلام احمد قادیانی) نے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ کہ جب قادیانی نے اپنے بعض مخالفوں کو یہ چیلنج کیا کہ اگر وہ اسی طرح مخالفت کرتے رہے تو خدا کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ فلاں وقت تک ان پر عذاب الٰہی آجائے گا لیکن مخالفوں کی جانب سے اس کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہ ملا کہ ان کی مخالفانہ جدو جہد اور تیز ہو گئی۔ مگر اسکے باجود ان پر عذاب نہیں آیا تب ناکامی کی ذلت سے بچنے کیلئے قادیانی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ چونکہ مخالف دل میں ڈر گئے ہیں۔ اسلئے ان پر سے عذاب ٹل گیا۔ جس طرح یونس کی قوم پر سے ٹل گیا تھا۔

لیکن قرآن عزیز کی روشن شہادت قادیانی کے اس حیلہ کو مردود قرار دیتی ہے۔ اس لئے کہ یونس کی قوم نے تو عذاب آنے سے قبل ہی علی الاعلان ایمان قبول کر لیا۔ یونس کو پیغمبر صادق مان کر ان کی جستجو شروع کر دی اور ان کے واپس آنے پر ان کی پیروی کو دین و ایمان بنالیا۔ مگر قادیانی حریفوں نے نہ صرف مخالفت باقی رکھی بلکہ قادیانی مشن کے خلاف جدو جہد کو اور تیز کر دیا۔ لہٰذا قادیانی کا اپنے جھوٹے دعوے کیلئے یونس کے واقعہ سے دلیل لانا اور اس کی آڑ لے کر کذب بیانی کو چھپانا بے سود کوشش اور قیاس مع الفارق ہے اور اگر بفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قادیانی کے مخالف دل میں ڈر گئے تھے تو کیا جو شخص دل میں کسی کی

صداقت کا یقین رکھتا ہو۔ مگر اپنے قول و عمل سے اس کا انکار کرتا رہے مومن کہلایا جا سکتا ہے؟ اگر ایسا ہو سکتا تو جن یہود کے متعلق قرآن نے اعلان کیا یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم "وہ (یہود) رسول اللہ کو یعنی ان کو پیغمبر ہونے کو اسی طرح پہچانتے ہیں۔ جس طرح اپنی اولاد کے اولاد ہونے کا یقین رکھتے ہیں"۔ وہ مومن کیوں نہ کہلائے؟

کیا یونس علیہ السلام کی صداقت اور مرزا قادیانی کی کذب بیانی کے درمیان یہ نمایاں فرق کافی نہیں ہے کہ یونس علیہ السلام جب قوم کی جانب واپس آتے ہیں تو جس قوم کو خدا کا دشمن رسول کا دشمن اور متمرد و سرکش چھوڑ گئے تھے۔ اسکو مومن صادق، مطیع و فرمانبردار اپنی آمد پر انکو انتہائی مسرور پایا۔ مگر قادیانی نے یہ دیکھا کہ اس کے چیلنج کے بعد مخالف تحریر و تقریر اور عملی زندگی میں پہلے زیادہ مخالف ہو گئے ہیں اور مزید بر آں یہ کہ ان میں سے بعض آج تک بصد عزت و احترام زندہ ہیں اور خود مرزا قادیانی ایسے مرض میں مبتلا ہو کر جو بعض قوموں کیلئے عذاب کی شکل میں نمودار ہو چکا ہے عرصہ ہوا دنیا کو خیر باد کہہ چکے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجا ست تا بکجا!

۴) سورۂ والصافات میں ہے وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ○ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ○ اور اس سے قبل یہ آیت ہے فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ چنانچہ آیات کی اس ترتیب کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوا کہ یونس علیہ السلام کی بعثت مچھلی کے حادثہ سے قبل ہو چکی تھی یا اسکے بعد ہوئی؟ ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے نقل کیا ہے کہ یونس علیہ السلام کی بعثت "مچھلی کے حادثہ کے بعد ہوئی ہے" اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے قبل نبوت عطا ہو چکی تھی اور وہ نینویٰ میں تبلیغ کیلئے جا چکے تھے اور بغوی کہتے ہیں کہ یونس علیہ السلام مچھلی کے حادثہ سے قبل تو نینویٰ کے باشندوں کیلئے مبعوث ہوئے تھے اور مچھلی کے حادثہ کے بعد ایک دوسری امت کی جانب بھیجے گئے اور قرآن عزیز میں ایک لاکھ سے زائد اسی دوسری امت کی تعداد بیان کی گئی ہے۔ یہ باشندگانِ نینویٰ کی مردم شماری کا ذکر نہیں ہے۔

بغوی کی یہ رائے بے سند ہے اسلئے کہ قرآن عزیز میں اشارہ تک نہیں پایا جاتا کہ یونس علیہ السلام دو جدا جدا قوموں کی جانب مبعوث ہوئے تھے۔ رہا ترتیبِ آیات کا معاملہ تو وہ فصاحت و بلاغت کے اصول کے عین مطابق ہے۔ اسلئے کہ زیر بحث آیات میں اول یونس علیہ السلام کی رسالت و بعثت کا ذکر ہے اور پھر قوم سے ناراض ہو کر چلے جانے، کشتی میں بیٹھنے، بھنور میں آجانے کی وجہ سے قرعہ اندازی ہونے، قرعہ یونس علیہ السلام کے نام پر نکلنے، دریا میں کودنے کے بعد مچھلی کے پیٹ میں رہنے، بعد میں صحیح سلامت مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکل آنے اور خدا کی مہربانیوں کے آغوش میں آکر شاد کام واپس لوٹنے کا تذکرہ ہے اور اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ جس قوم کی جانب ان کو بھیجا گیا تھا وہ چند افراد نہیں تھے بلکہ بہت بڑی تعداد تھی جن کا انجام یہ نکلا کہ وہ ایمان لے آئے اور آنے والے عذاب سے محفوظ ہو کر اپنی زندگی سے بہرہ مند ہوئے۔

لہٰذا آیات میں نہ تقدیم و تاخیر ہے اور نہ اس ترتیب سے یہ لازم آتا ہے کہ بقول بغوی وہ ایک دوسری امت تھی جس کا ذکر مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ میں کیا گیا ہے۔

اسی طرح مچھلی کے حادثہ سے قبل اور بعد بعثت کا مسئلہ بھی صاف ہے اور اس میں دورائے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ابن کثیر نے ہر دو اقوال کی تطبیق میں جو کچھ کہا ہے وہی حقیقت ہے۔ یعنی یونس مچھلی کے واقعہ سے قبل اہل نینوی کی جانب نبی بنا کر بھیجے گئے اور جب وہ خفا ہو کر چلے آئے تو مچھلی کا حادثہ پیش آیا۔ اس حادثہ سے متنبہ ہو کر جب انہوں نے خدائے تعالیٰ کی طرف اظہار ندامت کے ساتھ رجوع کیا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے شرف قبولیت عطا ہوا اور ان کو حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم کی جانب واپس جائیں کیونکہ وہ ایمان لے آئی ہے اور واپس جا کر اس کی رہنمائی کریں۔

صحیفہ یوناہ

صحیفہ یوناہ (یونس) میں ان اقوال سے الگ یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یونس کو اہل نینوی کی ہدایت کیلئے مامور کیا۔ مگر وہ ترسیس کو بھاگ گئے اور اسی سفر میں مچھلی کا واقعہ پیش آیا تب وہ متنبہ ہوئے اور پھر انکو حکم ہوا کہ نینوی جاؤ اور اپنا فرض انجام دو۔ یونس نے وہاں جا کر تبلیغ کی اور قوم کے نہ ماننے پر ان کو چالیس دن مقرر کر کے عذاب الٰہی سے ڈرایا اور خود دور جنگل میں چلے آئے مگر قوم فوراً ایمان لے آئی اور بادشاہ سے لے کر رعایا تک نے ٹاٹ کے کپڑے پہن لئے اور انسانوں جانوروں کے بچوں کو ماؤں سے علیحدہ کر دیا اور میدان میں نکل کر توبہ و استغفار اور آہ و زاری کرنے اور یونس کی تلاش میں دوڑنے لگے۔ ادھر یونس کو یہ معلوم ہوا کہ چالیس دن گزر گئے اور عذاب نہیں آیا تو اللہ تعالیٰ سے رنجیدہ ہو کر دور نکل گئے اور خدا کی درگاہ میں عرض کیا میں اسی خیال سے ترسیس بھاگ گیا اور نینوی نہیں آیا تھا کہ میں جانتا تھا کہ تو بہت مہربان اور عذاب میں بہت دھیما ہے اور تو رحیم و کریم ہے۔ اب میں جھوٹا بنا اور اب مجھ کو موت دے دے کہ میرا مرنا میرے جینے سے بہتر ہے اور چھپر ڈال کر وہیں رہنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے سایہ کیلئے ریندی کا بیل وار درخت اگا دیا۔ جس کو دیکھ کر یونس بہت خوش ہوئے۔ دوپہر دن کے بعد کیڑے نے اس کی جڑ کو کاٹ دیا اور وہ سوکھ گیا۔ یونس کو بے حد رنج ہوا۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یونس تم ایک معمولی ریندی کے درخت کے خشک ہونے پر اس قدر رنجیدہ ہو اور کیا میں اتنے بڑے شہر پر کہ جس کی مردم شماری ایک لاکھ بیس ہزار ہے شفقت و مہربانی نہ کرتا۔

توراۃ میں یہ صحیفہ "یوناہ نبی کی کتاب" کے نام سے موسوم ہے اور چھوٹے چھوٹے چار ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں یہی واقعہ مذکور ہے۔ اس صحیفہ کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے:

> اور خداوند کا کلام یوناہ بن امتی کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اٹھ اس بڑے شہر نینوہ کو جا اور اس کی مخالفت میں منادی کر، کیونکہ ان کی شرارت میرے سامنے اوپر آئی۔

اور صحیفہ کا مضمون اس عبارت پر آ کر ختم ہوتا ہے:

> "اور خدا نے یوناہ (یونس) کو کہا کیا تو اس ریندی کے درخت کے سبب شدت سے رنجیدہ ہے؟
> اس نے کہا کہ میں یہاں تک رنجیدہ ہوں کہ مرنا چاہتا ہوں۔ تب خداوند نے فرمایا کہ تجھے اس ریندی کے درخت پر رحم آیا جس کیلئے تو نے کچھ محنت نہ کی اور نہ تو نے اسے اگایا جو ایک ہی

رات میں اگا اور ایک ہی رات میں سوکھ گیا اور کیا مجھے لازم نہ تھا کہ میں اتنے بڑے شہر نینوہ پر جس میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں سے زیادہ ہیں جو اپنے دائیں بائیں ہاتھ کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتے اور مواشی بھی بہت ہیں شفقت نہ کروں۔''

قرآن عزیز اور اس صحیفہ کے واقعات میں بہت کچھ تطابق ہے لیکن تفصیلات میں جس جس جگہ اختلاف ہے۔ اس میں قرآن عزیز کا قول ہی درست ہے کیونکہ قرآن کی اطلاع علم الیقین (وحی الٰہی) پر مبنی ہے اور صحیفۂ محرف مجموعہ کا ایک جزء ہے اور یونس کا صحیفۂ ہدایت نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے کا مضمون ہے۔ جس میں یونس کے واقعہ کو معرضِ تحریر میں لایا گیا ہے۔

۵) یونس نے اہل نینوی کو جس عذاب سے ڈرایا تھا اس کی تعیین مدت میں مختلف اقوال ہیں یعنی تین سات اور چالیس ابن کثیر تین کو ترجیح دیتے ہیں اور شاہ عبدالقادر چالیس کو صحیفہ یوناہ میں بھی چالیس دن مذکور ہیں۔

۶) شروع میں کہا جا چکا ہے کہ قرآن عزیز میں یونس کا ذکر جن سورتوں میں مذکور ہیں ان میں سے سورہ انبیاء القلم میں نام کی بجائے صفت کے ذریعے ان کا تعارف کرایا گیا سورہ انبیاء میں ذوالنون کہا گیا ہے اس لئے کہ قدیم عربی میں نون مچھلی کو کہتے ہیں اور القلم میں صاحب الحوت کو یاد کیا گیا اور حوت بھی مچھلی کو کہتے ہیں کیونکہ ان پر مچھلی کا حادثہ گزرا تھا اس لئے ''مچھلی والا'' ان کا لقب ہو گیا۔

وفات

شاہ عبدالقادر نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ یونس کی وفات اسی شہر میں ہوئی جس کی جانب وہ مبعوث ہوئے یعنی نینویٰ میں اور وہیں ان کی قبر تھی۔

اور عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ فلسطین کے علاقہ میں جو مشہور شہر خلیل ہے۔ اسکے قریب ایک بستی حلحول کے نام سے معروف ہے۔ اس میں ایک قبر ہے جس کو یونس کی قبر بتایا جاتا ہے اور اسی قبر کے قریب دوسری قبر ہے۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ہے یہ ان یونس کے والد متی کی قبر ہے۔

ہمارے خیال میں شاہ صاحب کا قول صحیح ہے۔ اسلئے کہ حضرت یونس کے متعلق جس قدر واقعات بھی بہم پہنچ سکے ہیں۔ وہ سب متفق ہیں کہ یونس دوبارہ نینوی واپس تشریف لے گئے اور انہوں نے اپنی قوم کے اندر ہی زندگی گزار دی۔ لہٰذا قرینِ صواب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال نینوی ہی میں ہوا اور وہیں انکی قبر ہو گی جو نینوی کی تباہی کے بعد نامعلوم ہو گئی اور بعد میں خوش اعتقادی کے نقطۂ نظر سے حلحول کی غیر معروف دو قبروں کو یونس اور ان کے والد متی کی قبر بنا دیا گیا، آج بھی بعض مشاہیر اولیاء اللہ کے نام سے ایک بزرگ کی متعدد مقامات پر قبریں موجود ہیں اور ایسا تو کثرت سے ہے کہ غیر معروف بزرگوں کے نام سے بہت سی قبروں کو غلط منسوب کر کے اپنے دنیوی اغراض کو پورا کیا جاتا ہے۔

فضیلت یونس علیہ السلام

احادیث صحیحہ میں نبی اکرم ﷺ نے یونس علیہ السلام کا ذکر خیر کرتے ہوئے ان کی عظمت و فضیلت کا خصوصی اظہار فرمایا ہے، چنانچہ بخاری میں منقول ہے:

عن عبد اللّٰہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: لا یقولن احدکم انی خیر من یونس بن متی۔ (کتاب الانبیاء)

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص ہرگز یہ نہ کہے کہ میں (یعنی نبی اکرم ﷺ) بہتر ہوں یونس بن متی سے۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی سامان فروخت کر رہا تھا۔ کسی شخص نے کچھ خرید کر جو قیمت دینی چاہی وہ اس کی مرضی کے خلاف تھی، وہ کہنے لگا قسم بخدا جس نے موسیٰ علیہ السلام کو افضل بشر بنایا میں اس قیمت اپنی چیز کو فروخت نہیں کروں گا۔ ایک انصاری نے یہ سنا تو غصہ میں یہودی کے ایک طمانچہ رسید کر دیا اور کہا تو ایسی بات کہتا ہے درآنحالیکہ ہمارے درمیان نبی اکرم ﷺ موجود ہیں۔ یہودی فوراً دربار رسالت میں حاضر ہوا اور فریاد کرنے لگا: ابوالقاسم! جبکہ میں آپ کے عہد اور ذمہ میں ہوں تو اس انصاری نے میرے منہ پر طمانچہ کس لئے مارا؟ نبی اکرم ﷺ نے انصاری سے وجہ دریافت فرمائی اور جب انصاری نے واقعہ سنایا تو چہرۂ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا اور فرمایا: انبیاء علیہم السلام کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو اسلئے کہ جب اول صور پھونکا جائے گا تو زمین و آسمان کے درمیان جو بھی جاندار ہیں وہ سب بے ہوش ہو جائیں گے۔ مگر جن کو خدا مستثنیٰ کر دے۔ اس کے بعد دوسرا صور پھونکا جائیگا تو سب سے پہلے جو شخص ہوش میں آئے گا وہ میں ہوں گا۔ مگر میں جب غشی سے بیدار ہوں گا تو دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کے سہارے کھڑے ہیں۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا ان کی غشی کا معاملہ طور کے واقعہ میں محسوب ہو گیا کہ وہ غشی سے محفوظ رہے یا وہ مجھ سے بھی پہلے ہوش میں آ گئے اور میں نہیں کہتا کہ کوئی نبی بھی یونس بن متی سے افضل ہے۔ (بخاری کتاب الانبیاء)

ان روایات میں خصوصیت کے ساتھ حضرت یونس علیہ السلام کا جو ذکر آیا ہے تو اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہ صرف اسلئے تاکہ جو شخص بھی حضرت یونس علیہ السلام کے واقعات کا مطالعہ کرے اس کے دل میں ذات اقدس کے متعلق تنقیص کا کوئی پہلو بھی نہ آنے پائے پس ضروری ہوا کہ ان کی عظمت شان کو نمایاں کر کے تنقیص کے اس خدشہ کا سدباب کر دیا جائے۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۱)

فضائل انبیاء علیہم السلام

مگر اس مقام پر یہ مسئلہ ضرور حل طلب پیش آ جاتا ہے کہ دوسری حدیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت سے متعلق آپ نے جو تفصیل ارشاد فرمائی اور لا تفضلو ابین الانبیاء فرما کر انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت کی نفی فرمادی تو اس مسئلہ کی حقیقت کیا ہے؟

مسئلہ زیر بحث کو زیادہ نمایاں کرنے کیلئے یوں سمجھنا چاہئے کہ ایک جانب قرآن عزیز میں ارشاد ہے تلک الرسل فضلنا بعضهم علی بعض یعنی اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل میں باہم افضل و مفضول کی نسبت قائم کی ہے اور باہم یک دگر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ نیز نبی اکرم نے فرمایا ہے انا سید ولد آدم و لا فخر یعنی بغیر کسی فخر و مباہات ہے کے کہتا ہوں کہ میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں۔ اور دوسری جانب آپ یہ ارشاد فرمارہے ہیں کہ لا تفضلوا بین الانبیاء اور لا یقولن احدکم انی خیر من یونس بن متّٰی یعنی نہ انبیاء کے درمیان افضل و مفضول کے درجات قائم کرو اور نہ ایک کو دوسرے پر فضیلت دو اور نہ مجھ کو یونس بن متی اور موسیٰ (علیہما السلام) پر فضیلت دو۔ تو ان نصوص قرآنی اور حدیثی کے درمیان کس طرح مطابقت ہو سکتی ہے۔

اس مسئلہ کے حل میں محدثین اور شارحینِ حدیث سے متعدد اقوال منقول ہیں۔ مثلاً ان دونوں مضامین کے درمیان تطبیق کی شکل یہ ہے کہ نبی اکرم کا وہ ارشادِ گرامی جس میں انبیاء کے ہم یک دگر فضیلت یا ذات اقدس کو کسی نبی پر فضیلت کی ممانعت مذکور ہے۔ اس زمانہ کے ارشادات ہیں جبکہ سورۂ بقرہ کی اس آیت کا نزول نہیں ہوا تھا اور نہ آپ کو فضائلِ انبیاء خصوصاً تمام انبیاء علیہم السلام پر اپنی فضیلت کا ہنوز علم ہوا تھا۔

لیکن یہ جواب یا مسئلہ کا حل بہت کمزور بلکہ ساقط الاعتبار ہے۔ اسلئے کہ یہودی کا یہ واقعہ یا یونس کی فضیلت سے متعلق روایات کا سلسلہ اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جو مدنی زندگی کے آخری سال کہلاتے ہیں اور ان سے قبل انبیاء علیہم السلام کے مابین فضائل کے بہت سے واقعات خود ذاتِ اقدس سے منقول ہو چکے ہیں۔

دوسرا حل یہ پیش کیا گیا کہ اگرچہ ان روایات میں سے بعض طریقہائے سند میں فضیلتِ انبیاء سے متعلق عام الفاظ منقول ہیں۔ یعنی لا تفضلوا بین الانبیاء مگر درحقیقت اس ارشادِ گرامی کا مقصد صرف ذات اقدس ہے۔ جیسا کہ یہودی کے واقعہ اور یونس کے متعلق روایت سے ظاہر ہوتا ہے اور گرچہ آپ جانتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے آپ کو تمام اولادِ آدم پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ تاہم آپ نے تواضع اور انکسار کے طور پر یہ ارشاد فرمایا ہے۔

مگر یہ جواب بھی قوی نہیں ہے۔ اسلئے کہ آپ نے جب مسطورۂ بالا جملہ میں مسئلہ کو عام ذکر فرمایا ہے تو بے دلیل اس کو فقط ذاتِ اقدس کے ساتھ مخصوص کر دینے کے کوئی معنی نہیں۔

تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جن روایات میں انبیاء علیہم السلام کے باہم ایک دوسرے پر فضیلت کا انکار کیا گیا ہے۔ اس سے نفسِ نبوت کی فضیلت مراد ہے۔ خصائص و صفات کے لحاظ سے افضل و مفضول ہونے کا انکار نہیں ہے۔ جیسا کہ خود سورۂ بقرہ ہی میں مومن کی شان یہ بیان کی گئی ہے۔ [illegible] یعنی ہم کسی بھی نبی اور رسول کے درمیان کوئی فرق جائز نہیں سمجھتے اور یہ نہیں کرتے کہ خدا کے سچے نبیوں میں سے ایک کو مانیں اور دوسرے کا انکار کریں۔

مگر یہ جواب اس وقت دلچسپ ہو سکتا تھا جب آپ کا ارشادِ گرامی ایسے واقعہ سے متعلق ہوتا جس میں کسی سچے پیغمبر کے نبی ماننے نہ ماننے پر قضیہ پیش آتا۔ لیکن یہودی کے واقعہ میں تو نفس نبوت کی بحث نہیں تھی بلکہ نبی اکرم ۔۔۔ اور حضرت موسیٰ ۔۔۔ کے افضل و مفضول ہونے کی بحث تھی۔

لہٰذا اس مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ بے شبہ انبیاء و رسل (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے درمیان درجات فضائل موجود ہیں اور ان کے مابین افضل و مفضول کی نسبت قائم ہے اور یقیناً نبی اکرم ۔۔۔ تمام انبیاء و رسل (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے درمیان فضیلت دینے کی ممانعت مذکور ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نبی کو دوسرے نبی پر اس طرح کی فضیلت دینا سخت ممنوع ہے کہ جس سے مفضول نبی کی تنقیص لازم آتی ہو۔ یعنی یہ نہیں ہونا چاہئے کہ کسی پیغمبر کی محبت کے جوش میں دوسرے انبیاء کا مقابلہ کرتے ہوئے ایسی مدحت و منقبت کی جائے کہ جس سے دوسرے پیغمبر کی شانِ رفیع کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہو۔ نیز ایسے موقع پر فضیلت کی بحث کی ممانعت کی گئی ہے۔ جبکہ یہ مسئلہ مجادلہ اور مناظرہ کی شکل اختیار کرلے کیونکہ ایسی صورت میں احتیاط کے باوجود انسان بے قابو ہو کر دوسرے پیغمبر کے متعلق ایسی باتیں کہہ جائے گا۔ جو ان کی توہین یا تنقیص کا باعث ہوتی ہوں اور نتیجہ میں ایمان کی جگہ کفر لازم کرتی ہوں۔ چنانچہ جس واقعہ میں آپ نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔ وہ اسی قسم کے مجادلہ کے موقع تھا۔ باقی انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے درمیان اللہ تعالیٰ نے بعض خصائص کے اعتبار سے جو فرق مراتب قائم کیا ہے اور جس کے متعلق خود یہ فرمایا ہے ۔۔۔ تو یہ امر محبوب ہے نہ کہ ممنوع۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر کہ اس مسئلہ سے متعلق حافظ ابن حجر نے جو بحث نقل فرمائی ہے وہ بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

> قال العلماء فی نهیه ۔۔۔ عن التفضیل بین الانبیاء انما نهی عن ذلك من یقوله برأیه لا من یقوله بدلیل اومن یقوله بحیث یودی الی تنقیص المفضول اویودی الیٰ خصومة والتنازع اوالمراد لا تفضلوا بجمیع انواع الفضائل بحیث لا یترك للمفضول فضیلة فالامام مثلاً اذا قلنا انه افضل من مؤذن لا یستلزم نقص فضیلة المؤذن بالنسبة الی الاذان وقیل النهی عن التفضیل انما هو فی حق النبوة نفسها کقوله تعالیٰ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ و لم ینه عن تفضیل بعض الذوات علی بعض لقوله تعالیٰ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔

نبی اکرم ۔۔۔ نے جو انبیاء کے درمیان فضیلت دینے کی ممانعت فرمائی ہے تو علماء اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ ایسی فضیلت ممنوع ہے جو اپنی رائے سے اختراع کی جائے۔ وہ فضیلت منع نہیں ہے جو دلیل شرعی پر قائم ہو یا وہ منع ہے جو اس طرح ادا کی جائے کہ جس نبی پر فضیلت دی جا رہی ہے اس کی شان میں نقص پیدا کرتی ہو یا خصومت اور جھگڑے کا باعث بنتی ہو یا ایسی فضیلت دینے کی ممانعت ہے جو ایک نبی کے اندر اس طرح تمام فضائل کو جمع کرتی ہو کہ اس سے یہ لازم آجائے کہ دوسرے نبی کو کوئی فضیلت حاصل ہی نہیں

ہے۔ مگر ایسی فضیلت کہ مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ "امام کو مؤذن پر فضیلت ہے تو اس سے مؤذن کی شان کا نقص لازم نہیں آتا" جائز ہے۔ ایک قول ضعیف یہ بھی ہے کہ اس ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ نفس نبوت میں ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لیکن بعض ذواتِ گرامی کو بعض پر ان کی ذاتی خصوصیات کے لحاظ سے فضیلت دینا ممنوع نہیں ہے۔ جیسا اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ثابت ہے "............"

وقال الحليمي الاخبار الواردة فى النهى عن التخيير انما هى فى مجادلة اهل الكتاب وتفضيل بعض الانبياء على بعض بالمخايرة لان المخايرة اذاوقعت بين اهل دينين لايؤمن ان يخرج احد هماالى الا زدراء بالا خر فيفضى الى الكفر فامااذاكان التخيير مستنداًالىٰ مقابلة الفضائل لتحصيل الرجحان فلايدخل فى النهى۔

اور حلیمی کہتے ہیں! جو احادیث انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت دینے کی ممانعت کرتی ہیں وہ ایسے مواقع کے متعلق ہیں جبکہ اہل کتاب سے انبیاء کے متعلق مجادلہ اور جھگڑا ہو رہا ہو یا مسلمان اور عیسائی مثلاً اپنے نبی کو دوسرے پر ترجیح دے رہے ہوں، کیونکہ ایسی صورت میں جب دو مذہبوں کے درمیان بحث آجاتی ہے تو یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ ایسی بات زبان سے نہ نکلے جو دوسرے کے مذہب کے نبی کی شان میں توہین کا باعث ہو اور کفر کا سبب بنے (اسلئے کہ مسلمان کیلئے تو واجب ہے کہ مذاہب کے تمام سچے نبیوں کو اپنا نبی سمجھے) لیکن اگر مقصد یہ ہو کہ انبیاء کے باہم فضائل کی بحث سے ایک دوسرے کی حقیقی ترجیح کو ثابت کرے تو یہ منع نہیں ہے۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۳۴۵)

حضرت یونس کے واقعہ کا اگر بہ نظر بصیرت و موعظت مطالعہ کیا جائے تو حسب ذیل حقائق واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں:

۱) قوموں کی رشد و ہدایت کے متعلق یہ "سنت اللہ" ہے کہ جب وہ نبی کی دعوت سے منہ موڑ کر انکار و جحود پر اصرار کرنے لگتیں اور ظلم کیشی و ستم شعاری کو اسوہ بنا لیتی ہیں اور نبی مایوس ہو کر ان کو عذاب کی اطلاع دے دیتا ہے تو پھر امت کیلئے صرف دو راہیں باقی رہ جاتی ہیں یا عذاب آنے سے قبل ایمان لے آئے اور عذاب سے محفوظ ہو جائے یا عذابِ الٰہی کا شکار ہو جائے اور یہ ناممکن ہے کہ نبی کی اطلاع عذاب کے بعد وہ عذاب سے قبل ایمان بھی نہ لائیں اور عذاب سے محفوظ ہو جائیں۔ قومِ نوح، قومِ صالح، قومِ لوط (علیہم السلام) عاد، ثمود وغیرہ ان سب امم ماضیہ اور اقوامِ سالفہ کا عظیم الشان تمدن، بلند و وقیع تہذیب، قہرمانہ طاقت و قوت اور پھر عذابِ الٰہی سے ان کا یک بیک فنا ہو کر بے نام و نشان ہو جانے کی تاریخ اس حقیقت کو آشکارا کرتی ہے۔

۲) گزشتہ اقوام میں سے قومِ یونس کی ایک مثال ایسی ہے جس نے عذاب آنے سے قبل ایمان کو

قبول کر لیا اور وہ خدا کی سچی مطیع و فرمانبردار ہو کر عذاب الٰہی سے محفوظ ہو گئی۔ کاش کہ بعد میں آنے والی نسلیں اور قومیں قومِ یونس ؑ کے قدم پر چل کر اس طرح عذاب الٰہی سے محفوظ رہ سکتیں مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

۳) انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ عوام و خواص دونوں سے جدا رہتا ہے اور رہنا بھی چاہئے اس لئے کہ وہ براہِ راست خدا کے ساتھ شرف مخاطبت و مکالمت رکھتے ہیں۔ لہٰذا احکامِ الٰہی کے امتثال کی وہ ذمہ داری جو ان سے وابستہ ہوتی ہے وہ دوسروں کے ساتھ نہیں ہوتی۔ پس ان کا فرض ہے کہ جو کام بھی انجام دیں وحی الٰہی کی روشنی میں ہونا چاہئے۔ خصوصاً تبلیغ دین اور پیغامِ حق سے متعلق تمام معاملات میں وحی الٰہی کے علم الیقین ہی پر ان کا معاملہ معلق رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی کام میں عجلت کر گزرتے ہیں یا انتظارِ وحی کے بغیر کسی قول و عمل پر اقدام کر جاتے ہیں تو خواہ وہ بات کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ ان سے اللہ تعالیٰ بہت سخت مواخذہ کرتا اور ان کی اس صورتِ حال کیلئے ایسی سخت تعبیر روا رکھتا ہے کہ سننے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ حقیقتاً انہوں نے کوئی عظیم الشان جرم کیا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کی اعانت بھی ان کے شاملِ حال رہتی ہے اور وہ فوراً متنبہ ہو کر اعترافِ ندامت کے ساتھ عفو تقصیر کیلئے دست بہ دعا ہو جاتے ہیں اور انابت و توبہ کو وسیلہ کار بنا لیتے ہیں جو بہت جلد خدائے تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو جاتی اور ان کی عزت و احترام کے ازدیاد کا باعث بن جاتی ہے۔

قرآن عزیز کے اسلوب بیان میں یہ حقیقت بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور جو اس حقیقت سے ناآشنا ہوتا ہے۔ اس کیلئے اس قسم کے مواقع سخت خلجان کا موجب ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایک طرف وہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہستی کو نبی اور رسول کہہ کر اس کی مدحت کر رہا ہے اور دوسری جانب یہ نظر آتا ہے کہ گویا وہ بہت ہی بڑے جرم کا مرتکب ہے تو وہ حیران و مضطرب ہو کر یا کجروی میں پڑ جاتا ہے یا وساوس کے تاریک میدان میں گھر جاتا ہے۔ اسلئے ازبس ضروری ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے وقائع و اخبار میں ہمیشہ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا جائے تاکہ صراطِ مستقیم سے پاؤں نہ ڈگمگا جائیں۔

۴) اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے سچے نبی اسلام کے اپنے نبی ہیں۔ خواہ وہ کسی دین سے تعلق رکھتے ہوں اور ان پر اسی طرح ایمان لانا ضروری ہے۔ جس طرح نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانا۔ لہٰذا اس کا یقین رکھتے ہوئے کہ نبی اکرم ﷺ تمام انبیاء و رسل کے سردار اور افضل البشر ہیں۔ کسی نبی کے مقابلہ میں آپ کی ایسی مدحت منقبت سخت ممنوع ہے۔ جس سے کسی نبی کی بھی تنقیص ہوتی ہو۔ جیسا کہ عام طور پر میلاد کی مروجہ مجالس میں اس اہم حقیقت سے ناآشنا میلاد خوانوں کے اشعار میں یہ ممنوع طریقہ شائع ذائع ہے۔

حضرت ذوالکفل علیہ السلام

- قرآن عزیز اور ذوالکفل
- نسب
- آثار و روایات
- تنقید
- ایک غلط فہمی کا ازالہ
- موعظت

قرآن عزیز اور ذوالکفل

قرآن عزیز میں ذوالکفل علیہ السلام کا ذکر دو سورتوں "انبیاء" اور "صٓ" میں کیا گیا ہے اور دونوں میں صرف نام مذکور ہے اور مجمل و مفصل کسی قسم کے حالات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

وَإِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ ○ وَأَدْخَلْنَاهُمْ فِي رَحْمَتِنَا إِنَّهُم مِّنَ الصَّالِحِينَ ○ (ص)

اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل سب (راہِ حق میں) صبر کرنے والے تھے۔ ہم نے انہیں اپنی رحمت کے سایہ میں لے لیا۔ یقیناً وہ نیک بندوں میں سے تھے۔

وَاذْكُرْ إِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ الْأَخْيَارِ ○

اور یاد کرو اسمٰعیل، الیسع اور ذوالکفل (کے واقعات) اور یہ سب نیکوکاروں میں سے تھے۔

نسب

ابھی کہا جا چکا ہے کہ ذوالکفل علیہ السلام کے متعلق قرآن عزیز نے نام کے سوا کچھ نہیں بیان کیا۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ سے بھی کچھ منقول نہیں ہے۔ لہٰذا قرآن و حدیث کی روشنی میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ذوالکفل علیہ السلام خدا کے برگزیدہ نبی اور پیغمبر تھے اور کسی قوم کی ہدایت کیلئے مبعوث ہوئے تھے۔ اس سے زائد سے سکوت ہے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ سیر و تواریخ کا ہے لیکن کافی تفتیش و جستجو کے بعد بھی ہم کو اس سلسلہ میں ایسی معلومات بہم نہیں پہنچ سکیں کہ جن کے ذریعہ سے ذوالکفل علیہ السلام کے حالت و واقعات پر مزید روشنی پڑ سکے۔ چنانچہ تورات بھی خاموش ہے اور اسلامی تاریخ بھی۔

آثار و روایات

البتہ ابن جریر نے مشہور مفسر تابعی مجاہدؒ سے ان کے متعلق ایک قصہ نقل کیا ہے، اور اسی کے قریب

قریب ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابو موسیٰ اشعری سے بھی بعض آثار نقل کیئے ہیں۔ جن کی سند منقطع[1] ہے۔ مجاہدؒ کی روایت یہ ہے:

جب اسرائیلی نبی حضرت الیسع بہت بوڑھے ہو گئے تو ایک دن ارشاد فرمایا کاش میری زندگی ہی میں کوئی شخص ایسا ہوتا جو میرا قائم مقام ہو سکتا اور مجھ کو یہ اطمینان ہو جاتا کہ وہ میری صحیح نیابت کرنے کا اہل ہے۔ اسکے بعد انہوں نے بنی اسرائیل کا اجتماع کیا اور فرمایا: میں تم میں سے ایک شخص کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں بشرطیکہ وہ مجھ سے تین باتوں کا عہد کرے۔

۱) دن بھر روزہ رکھے

۲) شب کو یادِ خدا میں مشغول رہے

۳) اور کبھی غصہ نہ لائے۔

یہ سن کر ایک ایسا شخص کھڑا ہوا جو لوگوں کی نگاہ میں بے وقعت نظر آتا تھا اور کہنے لگا۔ "اس خدمت کیلئے حاضر ہوں"۔ حضرت الیسع نے اپنی تینوں شرطیں دوبارہ بیان کیں اور دریافت کیا ان کی پابندی کرو گے؟ اس شخص نے جواب دیا "بے شک"۔ دوسرا دن ہوا تو حضرت الیسع نے پھر اجتماع کیا اور کل کی بات کو دہرایا۔ بس خاموش رہے اور وہی شخص پھر آگے بڑھا اور اس نے خود کو اس خدمت کیلئے پیش کرتے ہوئے تینوں شرطیں پوری کرنے کا عہد کیا۔ تب الیسع نے اس کو اپنا خلیفہ بنادیا۔ ابلیس نے دیکھا تو اس سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے اپنی ذریت کو جمع کر کے کہا کہ ایسی صورتیں اختیار کرو کہ جن سے یہ شخص بہک جائے اور اپنی شرطوں پر قائم نہ رہ سکے۔ شیاطین نے بہت کوشش کی مگر سب ناکام رہے۔ تب ابلیس نے کہا کہ میں ہی اس کام کو انجام دے سکوں گا تم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

الیسع کے خلیفہ کا یہ دستور تھا کہ وہ دن رات میں صرف دوپہر کو تھوڑی دیر قیلولہ کیا کرتا اور کچھ سو کر تکان رفع کر لیتا تھا۔ چنانچہ ایک دن ابلیس پراگندہ حال بوڑھے کی شکل میں اسی وقت اس کے دروازہ پر پہنچا اور دروازہ پر ہاتھ مارا۔ وہ شخص آرام چھوڑ کر آیا اور دریافت کیا کون ہے؟ ابلیس نے جواب دیا: ایک مظلوم و ناتوان بوڑھا ہے"۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور حال دریافت کیا۔ ابلیس نے کہا کہ میرے اور میری قوم کے درمیان خصومت ہے۔ انہوں نے مجھ پر ظلم کر رکھا ہے اور داستانِ ظلم کو اتنا طول دیا کہ قیلولہ کا وقت ختم ہو گیا۔ بنی اسرائیل کے اس "امیر" نے فرمایا اب تم جاؤ شام کو جو مجلس منعقد ہو گی۔ تب تم آنا میں تمہاری دادرسی کروں گا۔ وہ چلا گیا۔ شام کر جب مجلس منعقد ہوئی تو خلیفہ نے دیکھا کہ وہ شخص موجود نہیں ہے اور مجلس برخاست بھی ہو گئی۔ مگر وہ نہیں آیا۔ صبح کو جب پھر مجلس میں بیٹھا تو چہار جانب غور سے دیکھا کہ شاید اب آیا ہو۔ مگر اس کو نہ پایا۔ مجلس برخاست ہونے پر جب اس نے قیلولہ کیلئے تنہائی اختیار کی تو پھر کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اسی بوڑھے کو موجود پایا اور اس نے کل کی طرح پھر

۱: یعنی ان دونوں بزرگوں کے اور ان سے روایت کرنے والے راوی کے درمیان ایک یا چند نام مذکور نہیں کہ جن سے سلسلۂ روایت متصل اور مسلسل ہو جاتا۔ ایسی سند کو اصطلاح میں منقطع کہا جاتا ہے۔

گفت و شنید کی۔ تب خلیفہ نے کہا: میں نے تم سے کہا تھا کہ شام کو مجلس میں آنا، مگر تم نہ آئے؟ ابلیس نے جواب دیا۔ میری قوم بہت ہی خبیث ہے۔ جب آپ کو مجلس میں پاتی ہے تو آہستہ سے مجھ سے اقرار کر لیتی ہے کہ مرافعہ نہ کرو ہم تمہارا حق ضرور دے دیں گے۔ لیکن آپ کے مجلس برخاست کر دینے کے بعد پھر منکر ہو جاتی ہے۔ خلیفہ نے کہا: آج شام کو ضرور آ جانا میں اپنی موجودگی میں حق رسی کروں گا۔ اس گفت و شنید میں قیلولہ کا وقت پھر جاتا رہا اور خلیفہ کو نیند کی تکلیف نے بہت ستایا۔ مگر شام کی مجلس حسب وعدہ منعقد کی اور دادرسی کیلئے بیٹھا۔ چاروں طرف نگاہ پھرائی۔ مگر اس بوڑھے کو نہ پایا اور نہ صبح کی مجلس میں وہ حاضر ہوا۔ تب تیسرے دن جب نیند کے غلبہ نے عاجز کر دیا تو خلیفہ نے اہل خانہ کو حکم دیا کہ آج دروازہ پر خواہ کوئی شخص بھی آئے قیلولہ کے وقت دروازہ ہرگز نہ کھولیں۔ خلیفہ ابھی لیٹا ہی تھا کہ فوراً ابلیس بوڑھے کی شکل میں آ موجود ہوا اور دروازہ پر دستک شروع کر دی۔ اندر سے جواب ملا کہ آج خلیفہ کا یہ حکم ہے کہ کسی کیلئے دروازہ نہیں کھولا جائے گا۔ ابلیس نے کہا: میں دو روز سے اپنے ایک اہم معاملہ میں حاضر ہو رہا ہوں اور خلیفہ نے مجھ کو اس وقت بلایا تھا۔ اسلئے دروازہ کھول دو۔ مگر دروازہ نہ کھلا لیکن اہل خانہ نے دیکھا کہ باہر کا دروازہ بند ہونے کے باوجود وہ شخص اندر موجود ہے اور خلیفہ کے کمرہ کے دروازہ پر دستک دے رہا ہے۔ خلیفہ نے دروازہ کھولا اور گھر والوں سے کہا: میں نے تم کو منع کر دیا تھا کہ آج دروازہ نہ کھولنا پھر یہ شخص کیسے داخل ہو گیا۔ ساتھ ہی دروازہ پر نظر کی تو اس کو بند پایا اور بوڑھے کو اپنے قریب دیکھا تب خلیفہ حقیقتِ حال کو سمجھا اور اس نے ابلیس کو مخاطب کر کے کہا: خدا کے دشمن کیا تو ابلیس ہے؟ ابلیس نے کہا: ہاں میں ابلیس ہوں تو نے مجھ کو جب ہر طرح تھکا دیا اور میری ذریت کسی طرح تجھ پر قابو نہ پا سکی تب میں نے آخری صورت یہ اختیار کی تھی تاکہ تجھ کو غضبناک کروں اور ایفاء شروط میں ناکام بنا دوں، مگر افسوس میں خود ہی ناکام رہا۔ چنانچہ اس واقعہ کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے اس کو ذوالکفل کے نام سے مشہور کر دیا۔ اسلئے کہ اس نے جن شرائط کا حضرت الیسع ؑ سے تکفل کیا تھا اس کو پورا کر دکھایا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۱۹۰۔۱۹۱)

تنقید

مجاہد کی یہ روایت اپنی سند کے اعتبار سے بھی محل نظر ہے اور روایت کے لحاظ سے بھی ناقابل حجت ہے اور جو اثر ابن عباس ؓ اور ابو موسیٰ اشعری ؓ سے منقول ہے۔ وہ منقطع بھی ہے اور سند کے پیشِ نظر محل نظر بھی۔ اس لئے ان کی حیثیت ایک قصہ سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ درایت کے اعتبار سے ہم نے ان کو ناقابلِ حجت اسلئے کہا کہ قرآن عزیز نے اگرچہ ذوالکفل ؑ کے واقعات و حالات بیان نہیں کیئے لیکن ان کو انبیاء و مرسلین کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ اسلئے حضرت عبداللہ بن عباس ؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ جیسے جلیل القدر صحابہ اور مجاہد جیسے تابعی سے یہ مستبعد ہے کہ وہ ان کے متعلق یہ فرمائیں کہ وہ نبی نہیں تھے بلکہ ایک مردِ نیک تھے۔ جیسا کہ ابن کثیر نے ان تینوں بزرگوں سے اسی قصہ میں نقل کیا ہے اور شاہ عبدالقادر (رحمۃ اللہ) ارشاد فرماتے ہیں کہ ذوالکفل ؑ ایوب ؑ کے بیٹے تھے اور انہوں نے حسبۃً للہ کسی شخص کی ضمانت کر لی تھی جس کی پاداش میں ان کو کئی برس قید کی تکالیف برداشت

کرنی پڑیں۔

کہتے ہیں ذوالکفل تھے ایوب کے بیٹے۔ ایک شخص کے ضامن ہو کر کئی برس قید رہے اور للہ یہ محنت کھی۔ (موضح القرآن سورۂ انبیاء)

اور بعض معاصرین کا یہ خیال ہے کہ ذوالکفل حزقیل کا لقب ہے اور ایک دوسرے معاصر کی عجیب رائے یہ ہے کہ ذوالکفل ''گوتم بدھ'' کا لقب ہے۔ اسلئے کہ اس کے دارالسلطنت کا نام ''کپل'' تھا جس کا معرب ''کفل'' ہے اور عربی میں ''ذو'' صاحب اور مالک کیلئے آتا ہے۔ چنانچہ صاحب مال کیلئے ''ذومال'' اور مالک شہر کیلئے ''ذویلد'' بہ کثرت استعمال ہے۔ اس لیئے یہاں بھی کپل کے مالک اور بادشاہ کو ''ذوالکفل'' کہا گیا۔ معاصر موصوف نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ گوتم بدھ کی اصل تعلیم توحید اور حقیقی اسلام کی ہی تعلیم تھی اور موجودہ شکل وصورت دوسرے ادیان وملل کی طرح مسخ اور محرف شدہ ہے۔ مگر یہ اقوال تخمینی آراء سے زیادہ تاریخی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔

ہم اس تعصب کے قائل نہیں ہیں کہ اگر صحیح تاریخ سے یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن نے جن انبیاء کے صرف نام ذکر کیئے ہیں۔ ان کا مصداق فلاں برگزیدہ ہستی ہے تو صرف اسلئے انکار کر دیا جائے کہ اس سے قبل ایسی بات چونکہ کسی نے نہیں کی اسلئے قابل رد ہے۔ بلاشبہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخی حقائق کی جستجو کا باب بند نہیں ہوا اور ہر دن نئی نئی تحقیقات سامنے آتی اور جدید اکتشافات کو منکشف کرتی جاتی ہیں۔ بلکہ ان کے ذریعہ قرآن عزیز اور احادیث رسول کے بیان کردہ ان واقعات کی تصدیق ہوتی چلی جارہی ہے۔ جن کا انکار ملاحدہ اسلئے کرتے رہے تھے کہ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ ان کا ساتھ نہیں دیتے۔ پس اگر قرآن عزیز کی بیان کردہ کسی ہستی کے متعلق مزید اکتشافات روشنی میں آئیں تو ہمارے لیئے باعثِ انکار نہیں بلکہ مخالفین ومعاندین پر مزید حجت ودلیل ہیں لیکن اس اقرار حقیقت کے باجود اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ کسی واقعہ کے متعلق اگر ایک شخص محض اپنے مزعومہ قیاس وتخمین سے بے دلیل کوئی دعویٰ کر دے تو ضرور اس کو مان لیا جائے۔ چنانچہ ذوالکفل کو ''گوتم بدھ'' قرار دینا ابھی تک اس سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

ہمارے لیئے دنیا کے مختلف گوشوں میں خدا کے فرستادہ نبیوں پر ایمان لانے کیلئے قرآن کی وہ تینوں دفعات کافی ہیں جو دینِ حق (اسلام) کا طغرائے امتیاز ہیں یعنی:

۱) وان من امة الا خلا فيها نذير۔ اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں خدا کی جانب سے کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

۲) منهم من قصصنا عليك ومنهم من لم نقصص عليك بعض نبیوں کا ہم نے تم کو (نام لے کر) ذکر سنادیا اور بعض کے واقعات تم کو نہیں سنائے۔

۳) لا نفرق بين احد من رسله اسلئے ایک مومن کا یہ عقیدہ ہونا چاہئے کہ) ہم خدا کے نبیوں میں سے کسی نبی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے یعنی سب نبیوں پر ایمان لاتے ہیں۔

اس صاف اور واضح عقیدہ کے بعد اگر ہمارے سامنے کسی ملک اور کسی خطہ کے انبیاء ورسل کے واقعات نہیں بھی آئے تو اس کے وجوہ واسباب دوسرے ہیں لیکن جہاں تک ان پر ایمان لانے کا تعلق ہے وہ اجمال کے ساتھ بھی کافی ہے اور ان کی تفصیلات ہمارے مقاصد ہدایت ورشد یعنی ایمان باللہ اور عمل صالح کیلئے موقوف علیہ نہیں ہیں۔ خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ نبی اکرم "خاتم النبیین" ہیں اور تمام سچے ادیان وملل کی صحیح اور حقیقی تعلیم کی تصدیق کر کے ان کو ارتقائی درجات کے درجہ کمال تک پہنچانے والے ہیں۔ "الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (5:3)"

الحاصل ہم کو یہ تسلیم ہے کہ ہندوستان میں بھی خدا کے سچے نبی اور پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں بلکہ سیر کی روایات کے مطابق ابوالبشر آدم علیہ السلام اسی ہندوستان جنت نشان کے کسی گوشہ میں اتارے گئے، لیکن جب تک قرآن وحدیث کی صراحت اور یا پھر تاریخ کے صحیح دلائل وبراہین سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ذوالکفل "گوتم بدھ" کا لقب ہے۔ محض ظن وتخمین سے اس کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ جس طرح کسی نبی کو نبی نہ ماننا کفر کی راہ ہے۔ اسی طرح کسی غیر نبی کو بھی نبی تسلیم کرنا بھی باطل ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: بنی اسرائیل میں ایک شخص کفل تھا، انتہا درجہ کا فاسق وفاجر ایک مرتبہ اس کے پاس ایک حسین وجمیل عورت آئی۔ کفل نے اسکو ساٹھ دینار دے کر زنا پر راضی کر لیا۔ لیکن جب اس نے عورت کے ساتھ مباشرت کا ارادہ کیا تو وہ کانپنے اور زار زار رونے لگی۔ کفل نے دریافت کیا کیوں روتی ہے کیا تو مجھ سے نفرت کرتی ہے؟ عورت نے جواب دیا: یہ بات تو نہیں ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں نے ساری عمر اس بد عمل کو نہیں کیا۔ مگر آج ضرورت اور پیٹ کی خاطر اپنی عصمت کو برباد کر رہی ہوں۔ یہ نشتر ہے جو مجھ کو آہ وزاری کیلئے مجبور کر رہا ہے۔ کفل نے یہ سنا تو فوراً اس سے الگ ہو گیا اور کہنے لگا: جو کارِ بد تو نے کبھی نہیں کیا، آج وہ محض فقر وفاقہ کی خاطر کرے یہ کبھی نہ ہو گا۔ جا عصمت وعفت کے ساتھ اپنے گھر واپس جا اور یہ دینار بھی تیری ملک ہیں۔ ان کو اپنے کام میں لا اور پھر کہنے لگا: قسم بخدا! آج کی گھڑی سے کفل اب کبھی خدا کی نافرمانی نہیں کرے گا۔ حسن اتفاق کہ اسی شب میں کفل کا انتقال ہو گیا اور صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ غیب کے ہاتھ نے اس کے دروازہ پر یہ بشارت لکھ دی ہے "کفل کو بے شبہ خدا نے بخش دیا"۔

اس روایت میں ذوالکفل نہیں بلکہ فقط کفل مذکور ہے اور یہ حضرت ذوالکفل کے سوا دوسرا کوئی شخص ہے۔ اسلئے یہ مغالطہ نہ ہونا چاہئے کہ یہ حضرت ذوالکفل علیہ السلام کا واقعہ ہے۔

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اپنی "دعوت حق کی" بنیاد اس اصل پر قائم کی ہے کہ ملک و قوم اور نسل و خاندان کے تفرقوں بالاتر ہو کر یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ پیغام حق اپنی اساس و بنیاد میں کسی حد بندی اور گروہ بندی کا محتاج نہیں ہے اور نہ وہ کسی فرقہ کی اجارہ داری قبول کرتا ہے۔ اسلئے کہ ذات حق (جل مجدہ) جبکہ یکتا اور بے ہمتا ہے تو بلاشبہ اس کا پیغام حق بھی ایک ہی ہونا چاہئے اور وہ ایک ہی ہے اور اس کی صدائے حق نیوش ازل سے اب تک کالے اور گورے، عجمی اور عربی، ایشیائی اور یورپی، امریکی اور افریقی، سب بندھنوں سے بے قید یکساں طور پر تغیر و تبدل سے آزاد سب ہی پر حاوی اور سب ہی میں جاری و ساری ہے۔

البتہ ہر ایک زمانہ کے حالات و کیفیات اور وقتی تقاضوں نیز اقوام و امم کے نشوو ارتقاء اور ان کی فکری و عملی صلاحیتوں کے پیش نظر اس میں یہ لچک ضرور ہی ہے اور رہنی چاہئے تھی کہ اساس و بنیاد متاثر ہوئے بغیر اس پیغام حق کی تفصیلات و احکامات جدا جدا ہوں یہاں تک کہ روحانی نشوو ارتقاء اپنے حد کمال کو پہنچ جائے اور انسانی فکر و نظر کا شعور کمال عروج حاصل کر لے۔

پس دینی اور روحانی اصطلاح میں پیغام حق کی اس نہ بدلنے والی حقیقت کو "دین" کہتے ہیں اور حق تعالیٰ نے اسی کو "اسلام" کے ساتھ معنون کیا ہے:

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران)

بلاشبہ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ

اور جو شخص بھی اسلام کے سوا دین کے نام سے کسی شے کا متلاشی ہے اس کی یہ خواہش خدا کے حضور میں ناقابل قبول ہے۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (حج)

اسی (خدا) نے تمہارا (انسانوں) کا نام قرآن کے نزول سے پہلے بھی اسلام رکھا اور اس قرآن میں بھی یہی نام دیا۔

اور اس حقیقت کی بدلتی ہوئی کیفیات اور وقتی حوادث کے زیر اثر احکامات و تفصیلات کا نام "منہاج و شریعت" رکھا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (مائدہ)

تم میں سے ہر ایک کیلئے ہم نے جدا جدا راستے (شریعتیں) اور طریقے مقرر کر دیئے ہیں۔

اور روحانی و دینی نشوو نما اور عروج و ارتقاء کے حد کمال کو "اکمال دین" اور "اتمام نعمت" فرمایا ہے:

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ)

مسلمانو! آج ہم نے تمہارے دین کو کامل واکمل کر دیا تو تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارے لیئے اسلام کو دین کے اعتبار سے پسند کر لیا۔

تو اب حاصل یہ نکلا کہ آدم سے شروع ہو کر محمد کے دور تک تمام نبیوں اور رسولوں کا دین اور خدا کا دیا ہوا پیغام حق ہمیشہ ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ جس کا نام اسلام ہے۔ البتہ انبیاء و مرسلین کے اپنے اپنے زمانوں میں بلاشبہ حق تعالیٰ کی جانب سے احکامات و تفصیلات جدا جدا رہی ہیں جس کو ''شریعت'' اور ''منہاج'' کہا جاتا ہے اور جب روحانی ارتقاء اور دینی فکر و شعور بلوغ و کمال کی حد پر پہنچ گیا تو رسول پاک کی معرفت ان تمام شریعتوں کو آخری شریعت محمدی میں جذب کر دیا گیا اور ہمیشہ کیلئے اس کا دائرہ جغرافیائی حدود سے بالاتر تمام عالم و کائنات پر حاوی کر دیا گیا:

وَمَآ أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا)

اور ہم نے آپ کو تمام کائنات انسانی کیلئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

اور اس لئے اسکی تعلیم کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ دنیا کے ہر گوشے اور ہر قوم کے اندر خدا کے سچے بشیر و نذیر یہی پیغام صداقت لے کر آئے ہیں اور اسلئے ایک مسلم و مومن کا یہ فرض ہے کہ وہ اس عقیدہ کا اعلان کرے کہ ہم خدا کے کسی بھی نبی کے درمیان فرق کرنا جائز نہیں رکھتے اور جس طرح محمد پر ایمان رکھتے ہیں اسی طرح خدا کے ہر نبی پر ایمان لاتے ہیں خواہ ہم اس کے نام و مقام اور اس کے حالات و واقعات سے آگاہ ہوں یا نہ ہوں۔

۲ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذوالکفل انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں اور بنی اسرائیل کے ان حالات و واقعات کے سوا جن کی تفصیلات قرآن عزیز میں مختلف انبیاء بنی اسرائیل کے ذکر میں آتی رہی ہیں۔ ان کے زمانہ میں کوئی خاص واقعہ ایسا پیش نہیں آیا۔ جو عام تبلیغ و ہدایت سے زائد اپنے اندر عبرت و بصیرت اور موعظت کا پہلو رکھتا ہو۔ اسلئے قرآن عزیز نے ان کے نام ہی پر اکتفا کیا اور حالات و واقعات سے تعرض نہیں کیا۔ کیونکہ قصص القرآن میں یہ بحث چند جگہ روشنی میں آچکی ہے کہ امم و اقوام ماضیہ کے وقائع اور اخبار بیان کرنے سے قرآن عزیز کا مقصد صرف رشد و ہدایت کے سلسلہ میں بصیرت و موعظت کی جانب توجہ دلانا ہے۔ ورنہ ''تاریخ'' نہ اس کا موضوع ہے اور نہ اس کا مقصد، چنانچہ قرآن عزیز میں ارشاد ہے:

كَذَٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ وَقَدْ آتَيْنَاكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا (۲۰:۹۹)

(اے پیغمبر) اسی طرح ہم گزری ہوئی سرگزشتوں میں سے (خاص واقعات کی) خبریں تجھے سناتے ہیں اور بلاشبہ ہم نے اپنے پاس سے تجھے ایک سرمایہ نصیحت عطا فرما دیا ہے (یعنی قرآن)

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (یوسف)

بلاشبہ ان (نبیوں) کے واقعات میں اہل عقل و دانش کیلئے سامان عبرت ہے۔

أَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۲:۱۰۹)

کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر سیر نہیں کی تاکہ وہ دیکھتے کہ ان سے اگلوں کا انجام کیا ہوا اور بلاشبہ مقام آخرت ان لوگوں کے حق میں بہتر ہے۔ جو پرہیزگار ہیں۔ پس کیا وہ سمجھتے نہیں؟

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۱:۱۲۰)

اور (اے پیغمبر) رسولوں کی سرگزشتوں میں سے جو جو قصے ہم تجھ کو سناتے ہیں تو ان سب میں یہی بات ہے کہ تیرے دل کو تسکین دے دیں اور پھر ان کے اندر تجھے امر حق مل گیا اور نصیحت مل گئی اور یاد دہانی مومنوں کیلئے۔

حضرت عُزیر

- قرآن عزیز اور حضرت عُزیر
- واقعہ سے متعلق تاریخی بحث
- واقعہ کی غلط تفسیر
- حضرت عُزیر اور عقیدۂ ابنیت
- ایک شبہ کا جواب
- حضرت عُزیر کی زندگی
- حضرت عُزیر اور منصبِ نبوت
- نسب
- وفات
- بصائر

قرآن عزیز اور حضرت عزیر

قرآن عزیز میں حضرت عزیر کا نام صرف ایک جگہ سورۂ توبہ میں مذکور ہے اور اس میں بھی صرف یہ کہا گیا ہے کہ یہودِ عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ جس طرح نصاریٰ عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ اس ایک جگہ کے سوا قرآن میں اور کسی مقام پر ان کا نام لے کر ان کے حالات و واقعات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ (۹:۳۰)

اور یہودیوں نے کہا: عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا: مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ ان کی باتیں ہیں محض ان کی زبانوں سے نکالی ہوئی۔ ان لوگوں نے بھی ان ہی کی سی بات کہی جو اس سے پہلے کفر کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔ ان پر اللہ کی لعنت، یہ کدھر بھٹکے جا رہے ہیں۔

البتہ سورۂ بقرہ میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک برگزیدہ ہستی کا اپنے گدھے پر سوار ایک ایسی بستی سے گزر ہوا جو بالکل تباہ و برباد اور کھنڈر ہو چکی تھی اور وہاں نہ کوئی مکین باقی رہا تھا اور نہ کوئی مکان، مٹے ہوئے چند نقوش باقی تھے۔ جو اس کی بربادی اور تباہی کے مرثیہ خواں تھے۔ ان بزرگ نے یہ دیکھا تو تو تعجب اور حیرت سے کہا کہ ایسا کھنڈر اور تباہ حال ویرانہ پھر کیسے آباد ہوگا اور یہ مردہ بستی کس طرح دوبارہ زندگی اختیار کرے گی۔ یہاں تو کوئی بھی ایسا سبب نظر نہیں آتا؟ یہ ابھی اسی فکر میں غرق تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی جگہ ان کی روح قبض کر لی اور سو برس تک اسی حال میں رکھا۔ یہ مدت گزر جانے کے بعد اب ان کو دوبارہ زندگی بخشی اور تب ان سے کہا: بتاؤ کتنے عرصہ اس حالت میں رہے ہو؟ وہ جب تعجب کرنے پر موت کی آغوش میں

سوئے تھے تو دن چڑھے کا وقت تھا۔ اسلئے انہوں نے جواب دیا: ایک دن یا اس سے بھی کم۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسا نہیں ہے بلکہ تم سو برس تک اسی حالت میں رہے ہو اور اب تمہارے تعجب اور حیرت کا یہ جواب ہے کہ تم ایک طرف اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ اس میں مطلق کوئی تغیر نہیں آیا اور دوسری جانب اپنے گدھے کو دیکھو کہ اس کا جسم گل سڑ کر صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا اور پھر ہماری قدرت کا اندازہ کرو کہ جس چیز کو چاہا محفوظ رہے تو سو برس کے اس طویل عرصہ میں کسی بھی موسمی تغیرات نے اثر نہ کیا اور محفوظ و سالم رہی اور جس چیز کے متعلق ارادہ کر لیا کہ اس کا جسم گل سڑ جائے اور اب تمہاری آنکھوں دیکھتے ہی ہم اس کو دوبارہ زندگی بخشے دیتے ہیں اور یہ سب کچھ اسلئے کیا تاکہ ہم تم کو اور تمہارے واقعہ کو لوگوں کیلئے ''نشان'' بنادیں اور تاکہ تم یقین کے ساتھ مشاہدہ کر لو کہ خدائے تعالیٰ اس طرح مردہ کو زندگی بخش دیتا اور تباہ شدہ شے کو دوبارہ آباد کر دیتا ہے۔ چنانچہ جب اس برگزیدہ ہستی نے قدرت الٰہی کے یہ ''نشانات'' دیکھنے کے بعد شہر کی جانب نظر کی تو اس کو پہلے سے زیادہ آباد اور بارونق پایا۔ تب انہوں نے اظہار عبودیت کے بعد یہ اقرار کیا کہ بلاشبہ تیری قدرت کاملہ کیلئے یہ سب کچھ آسان ہے اور مجھ کو علم الیقین کے بعد عین الیقین کا درجہ حاصل ہو گیا:

أَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا قَالَ أَنّٰى يُحْيِيْ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ إِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○
(۲:۲۵۹)

اور کیا تم نے اس شخص کا حال نہ دیکھا، جس کا ایک بستی پر گزر ہوا جو اپنی چھتوں سمیت زمین پر ڈھیر تھا تو وہ کہنا لگا۔ اس بستی کی موت (تباہی) کے بعد اللہ تعالیٰ کس طرح اسکو زندگی دے گا (آباد کرے گا) بس اللہ نے اس شخص پر (اسی جگہ) سو برس تک موت طاری کر دی اور پھر زندہ کر دیا۔ اللہ نے دریافت کیا: تم یہاں کتنی مدت پڑے رہے۔ اسنے جواب دیا: ایک دن یا دن کا بعض حصہ۔ اللہ نے کہا: ایسا نہیں ہے۔ بلکہ تم سو برس تک اس حالت میں رہے پس تم اپنے کھانے پینے (کی چیزوں) کو دیکھو کہ وہ بگڑی تک نہیں اور پھر اپنے گدھے کو دیکھو (کہ وہ گل سڑ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے) اور (یہ سب کچھ اسلئے ہوا) تاکہ ہم تم کو لوگوں کیلئے ''نشان'' بنائیں اور اب تم دیکھو کہ کس طرح ہم ہڈیوں کو ایک دوسرے پر چڑھاتے اور آپس میں جوڑتے ہیں اور پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس کو ہماری قدرت کا مشاہدہ ہو گیا تو اس نے کہا: میں یقین کرتا ہوں کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

ان آیات کی تفسیر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص کون تھا۔ جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تو اس کے

جواب میں مشہور قول یہ ہے کہ یہ حضرت عزیر تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم فرمایا تھا کہ تم یروشلم جاؤ، ہم اس کو دوبارہ آباد کریں گے، جب یہ وہاں پہنچے اور شہر کو تباہ اور کھنڈر پایا تو بربناء بشریت یہ کہہ اٹھے کہ اس مردہ بستی کو دوبارہ کیسے زندگی ملے گی؟ اور ان کا یہ قول بہ شکل انکار نہیں تھا بلکہ تعجب اور حیرت کے ساتھ ان اسباب کے متلاشی تھے۔ جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے برگزیدہ بندے اور نبی کی یہ بات بھی پسند نہیں آئی کیونکہ ان کیلئے یہ کافی تھا کہ خدا نے دوبارہ اس بستی کی زندگی کا وعدہ فرمالیا ہے۔ چنانچہ ان کے ساتھ وہ معاملہ پیش آیا جس کا ذکر مسطورۂ بالا آیات میں ہے اور جب وہ زندہ کئے گئے تو یروشلم (بیت المقدس) آباد ہو چکا تھا۔

حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن عباس ، حضرت عبد اللہ بن سلام (رضی اللہ عنہم) اور قتادہ، سلیمان، حسن (رحمہم اللہ) کا رجحان اسی جانب ہے کہ یہ واقعہ حضرت عزیر سے متعلق ہے۔
(تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۳۱۴ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۴۳)

اور وہب بن منبہ اور عبد اللہ بن عبید کا اور ایک روایت میں حضرت عبد اللہ بن سلام کا قول یہ ہے کہ یہ شخص حضرت ارمیاہ (یرمیاہ) نبی تھے۔ ابن جریر طبریؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور ہمارے نزدیک بھی یہی قول راجح ہے۔ (تفسیر، تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۴۴)

تاریخی بحث

اور یہ اسلئے کہ جبکہ قرآن عزیز نے اس ہستی کا نام ذکر نہیں کیا اور نبی معصوم سے بھی اس سلسلہ میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے اور صحابہ و تابعین سے جو آثار منقول ہیں ان کا ماخذ بھی وہ روایات و اقوال ہیں جو وہب بن منبہ کعب احبار اور حضرت عبد اللہ بن سلام تک پہنچتے ہیں اور انہوں نے جن بنی اسرائیل واقعات سے نقل کر کے بیان کیا ہے تو اب واقعہ سے متعلق شخصیت کی تحقیق کیلئے صرف ایک ہی راہ باقی رہ جاتی ہے کہ توراۃ اور تاریخی مصادر سے اس کو حل کیا جائے تو اس حقیقت کے پیش نظر جب ہم مجموعۂ تورات کے صحائف انبیاء (علیہم السلام) اور تاریخی بیانات پر غور کرتے ہیں تب یہ تفصیلات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۴۲-۴۶)

بنی اسرائیل کی سرکشی اور شرارت حد سے تجاوز کر چکی ہے اور ظلم و فساد کا بازار گرم ہے کہ خدا کی جانب سے اس زمانہ کے پیغمبر یرمیاہ پر وحی آتی ہے کہ بنی اسرائیل میں منادی کر دو کہ وہ ان حرکات بد سے باز آجائیں ورنہ گزشتہ قوموں کی طرح ان کو تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔ یرمیاہ نے خدا کا یہ پیغام جب بنی اسرائیل تک پہنچایا تو انہوں نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور ظلم و شرارت میں اور اضافہ اور یرمیاہ کے ساتھ مخول شروع کر دیا اور ان کو زندان میں ڈال دیا۔ اس حالت میں بھی یرمیاہ نے ان کو بتایا کہ وہ بابل کے بادشاہ کے ہاتھوں برباد ہوں گے اور وہ ان کو قید کر کے بابل لے جائے گا اور یروشلم کو مٹایا جائے گا۔ (یرمیاہ نبی کا صحیفہ)

تقریباً ساتویں صدی قبل مسیح کا وسط تھا کہ بابل میں بنوکد نصر (بخت نصر) کا ظہور ہوا اور اس نے اپنی

قاہرانہ اور جابرانہ طاقت سے قرب وجوار کی تمام حکومتوں کو مسخر اور زیر کر لیا اور تھوڑے عرصہ میں اس نے فلسطین پر پے بہ پے تین حملے کر کے بنی اسرائیل کو شکستِ فاش دے کر یروشلم اور فلسطین کے تمام علاقہ کو برباد کر ڈالا اور تمام بنی اسرائیل کو قید کر کے بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکاتا ہوا بابل لے گیا اور توارۃ کے تمام نسخوں کو خاکستر کر دیا اور ایک نسخہ بھی اسرائیلیوں کے ہاتھ میں محفوظ باقی نہ رہا۔ جب بخت نصر اسرائیلی گھرانوں کو قید کر کے غلام بنا رہا تھا تو کسی شخص نے اس سے یہ کہا کہ یہاں ایک شخص یرمیاہ زندان میں قید ہے۔ اس نے تیرے اس حملہ سے پہلے ان سب حالت کے متعلق پیشین گوئی کر کے بنی اسرائیل کو ڈرایا تھا۔ مگر اس کی قوم نے اس کی بات پر کان نہ دھرا اور اس کو زندان میں ڈال دیا۔ بخت نصر نے یہ سنا تو یرمیاہ کو قید خانہ سے باہر نکالا اور ان سے بات چیت کرتا رہا۔ یرمیاہ کی علم و دانش سے معمور گفتگو سن کر اس نے خواہش کی کہ وہ بھی اس کے ساتھ بابل چلیں وہ ان کو احترام سے رکھے گا۔ مگر حضرت یرمیاہ نے یہ کہہ کر اس کی خواہش کو رد کر دیا کہ جبکہ میری قوم اس ذلت کے ساتھ بابل جا رہی ہو۔ میں اس عزت کے مقابلہ میں اپنی موجودہ حالت کو ترجیح دیتا ہوں۔[1] چنانچہ انہوں نے یروشلم سے دور کسی جنگل میں بود و ماند اختیار کر لی اور یرمیاہ نبی کے صحیفہ میں ہے کہ انہوں نے وہیں بیٹھ کر بابل میں اسرائیلیوں کو یہ پیشین گوئی تحریر کے ذریعہ پہنچائی تھی کہ بنی اسرائیل ستر سال بابل میں اس ذلت و خواری کے ساتھ غلام رہیں گے اور اس کے بعد وہ پھر اپنے وطن میں آ کر بسیں گے۔ (صحیفہ یرمیاہ باب ۲۹ آیت ۱۰)

چنانچہ بخت نصر کی ہلاکت کے عرصۂ دراز کے بعد جب تقریباً ۵۳۹ ق م میں فارس کے بادشاہ سائرس (کیخسرو) نے بابل کے بادشاہ بیل شازار کو شکست دے کر فارس کو اس کے بے پناہ مظالم سے نجات دلائی تو اسی زمانہ میں اس نے بنی اسرائیل کو بھی آزاد کیا اور یروشلم اور ہیکل کی تعمیر کیلئے ان کو اجازت دی۔

شاہ خورس (کیخسرو) فتح بابل کے بعد تقریباً دس برس اور زندہ رہا اور اسی دوران میں بنی اسرائیل آزاد ہو کر بیت المقدس کی تعمیر میں مشغول ہوئے مگر جیسا کہ اعزار کے صحیفہ سے معلوم ہوتا ہے یہ تعمیر اس کی زندگی میں مکمل نہیں ہو سکی اور درمیان میں بعض افسروں نے ایسی دراندازیاں کیں کہ دو مرتبہ اسرائیلیوں کو اس کی تعمیر کچھ مدت کیلئے روک دینی پڑی اور کیخسرو کے بعد دارا اور دارا کے بعد اردشیر کے زمانہ میں جا کر وہ اس کو دوبارہ مکمل کر سکے۔[2] اور یروشلم (بیت المقدس) پھر ایک مرتبہ پہلے سے زیادہ بارونق شہر نظر آنے لگا۔

ان تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ بخت نصر کے یروشلم کو تباہ کرنے اور کیخسرو سے لے کر اردشیر کے زمانے تک دوبارہ اس کے مکمل آباد ہو جانے کے درمیان جو ایک طویل مدت ہے وہی وہ وقفہ ہے۔ جس پر یرمیاہ کو وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیات میں کیا گیا ہے۔

---

۱ البدایہ والنہایہ ص ۳۸۔۳۹ جلد ۲، تاریخ ابن خلدون وانسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔

۲ عزرا باب ۷ آیت ۱۱۔

قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جبکہ یرمیاہ نے بخت نصر کے ساتھ بابل جانے سے انکار کر دیا اور وہ بیت المقدس کی اس تباہ حالی سے گھبرا کر دور کسی جنگل میں گوشہ گیر ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بذریعہ وحی یہ حکم دیا ہوگا کہ وہ اس ویرانہ میں جا کر رہیں جو آج اگرچہ بنی اسرائیل کی تباہ کاریوں کی بدولت تباہ حال ہے مگر ہمیشہ سے نبیوں کی مقدس سرزمین رہا ہے اور یہ کہ ہم دوبارہ اس کو آباد کریں گے اور جب حضرت یرمیاہ خدا کے حکم سے وہاں پہنچے اور ان کی نگاہ میں اس کی بربادی کا پورا نقشہ پھر گیا تو انہوں نے حسرت و افسوس اور تعجب و حیرت کے ساتھ دل میں یا زبان سے کہا ہوگا کہ کون سے ایسے اسباب پیدا ہوں گے۔ جن کے ذریعہ خدائے تعالیٰ اس مردہ بستی کو دوبارہ زندگی بخشے گا اور پھر وہ سب کچھ پیش آیا جو زیر بحث آیات میں مذکور ہے اور اگر ہم اس پر یہ اور اضافہ کر دیں تو بے جا نہ ہوگا کہ خدا کی حکمت و مصلحت کا یہ تقاضا ہوا کہ جبکہ ابھی یروشلم کی دوبارہ زندگی اور آبادی میں طویل مدت باقی ہے اور یرمیاہ قوم سے الگ اس ویرانہ میں رہیں گے تو یہ ان کی زندگی کیلئے ناقابل برداشت سانحہ ہوگا۔ لہٰذا رحمتِ حق نے اس کے اس متعجبانہ سوال کو بہانہ بنا کر اس عرصہ کیلئے ان کو موت کی آغوش میں سلا دیا اور اس وقت بیدار کیا جب کہ یروشلم پہلے کی طرح خوب آباد اور بارونق ہو چکا تھا۔

واقعات و حادثات کی اس پوری مدت میں حضرت یرمیاہ کی عمر کا تخمینہ تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوتا ہے اور یہ مدت اس زمانہ کی عمر طبعی کے لحاظ سے کوئی تعجب خیز نہیں ہے۔

اس تحقیق کی تائید حضرت یسعیاہ کی اس پیشین گوئی سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے سائرس نجات دہندۂ بنی اسرائیل کے متعلق ڈیڑھ سو سال قبل کی تھی[1]۔ اس لئے کہ یسعیاہ نبی کا ظہور ہوا۔ لہٰذا نجات بنی اسرائیل کی درمیانی مدت کا معاملہ ان ہی کے ساتھ پیش آ سکتا ہے۔ اسکے برعکس حضرت عزیر کی حیات طیبہ کے متعلق جو تفصیلات توراۃ اور اسرائیلیات میں منقول ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابل کی اسارت کے زمانہ میں وہ صغیر سن تھے اور اسرائیلوں کے ساتھ بابل ہی میں رہے اور چالیس سال کی عمر میں "فقیہ" تسلیم کر لئے گئے اور وہیں منصب نبوت سے سرفراز ہوئے اور یروشلم کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالنے والوں کے خلاف دارا اور اردشیر کے درباروں میں جس وفد نے کوششیں کیں ان میں بھی یہی پیش پیش رہے ہیں اور توراۃ کے ناپید ہو جانے کے بعد یروشلم میں اس کی تجدید ان ہی کے فیضانِ نبوت کا اثر تھا۔

غرض بنی اسرائیل کی اسیری بابل سے لے کر رہائی اور تعمیر و آبادی بیت المقدس تک کی درمیانی مدت میں حضرت عزیر بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔

یہ ہیں وہ شواہد و قرائن جن کی وجہ سے ہم نے مفسرین کے راجح قول کو مرجوح اور مرجوح قول کو راجح کہنے کی جسارت کی ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

مسطورۂ بالا ہر دو اقوال کے علاوہ ان آیات کے مصداق متعین کرنے میں بعض اور بھی اقوال ہیں۔ مثلاً حزقیل یا بنی اسرائیل میں سے کوئی غیر معلوم شخص۔ (تفسیر ابن کثیر جلد اول ص ۳۱۴)

[1] باب ۴۴۔ آیت ۲۸۔

واقعہ کی غلط تفسیر

سورۂ کہف کے تفسیری فوائد سپردِ قلم کرتے ہوئے مولانا آزاد نے ایک جگہ سورۂ بقرہ کے اس واقعہ کو حضرت حذقیل کا مکاشفہ قرار دیا ہے جو صحیفہ حزقیل میں قریب قریب اس طرح مذکور ہے:
(تفسیر ترجمان القرآن جلد ۲)

ہم کو سخت تعجب ہے اور حیرت بھی کہ جب قرآن عزیز نے اس واقعہ کو صاف اور صریح طریقہ پر ایک شخص کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک معین مدت کیلئے موت کی آغوش میں سلادیا اور پھر زندہ کر کے اس سے موت کی مدت کے بارہ میں سوال کیا۔ جب وہ صحیح جواب نہ دے سکا تو خود اس کی تصحیح فرمائی اور اس سے متعلق شواہد کا مشاہدہ کرایا تو کس طرح مولانا آزاد نے حزقیل کے مکاشفہ کو اس واقعہ کی تفسیر یا تاویل قرار دیا۔

غور کیجئے کہ ایک برگزیدہ ہستی کا ایک ایسی کھنڈر اور ویران بستی پر گزر ہوا جو کبھی بہت ہی بارونق آباد بستی تھی اور جہاں لاکھوں انسان بس رہے تھے [illegible] "اس نے یہ دیکھا تو دل میں یہ سوچا یا زبان سے کہا کہ نہ معلوم کس طرح یہ مردہ بستی پھر زندہ ہوگی"۔ [illegible] تب اللہ تعالیٰ نے اسی جگہ اس کی روح قبض کر لی اور سو برس تک اسی حالت میں رکھ کر دوبارہ زندہ کر دیا [illegible] اور زندگی بخشنے کے بعد اس ہستی سے دریافت فرمایا: بتاؤ تم یہاں کتنی مدت پڑے رہے؟ برگزیدہ ہستی نے جواب دیا: ایک دن یا دن کا بعض حصہ [illegible] چونکہ جواب غلط تھا۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح اور حقیقت حال کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: نہیں بلکہ سو برس تک موت کی آغوش میں سوتے رہے ہو۔ [illegible] اور پھر اپنی قدرتِ کاملہ کے تصرفات کا مشاہدہ کرایا کہ ایک جانب اس طویل مدت کے باوجود کھانے پینے کی تمام چیزیں تروتازہ اور موسمی اثرات سے محفوظ تھیں اور دوسری جانب ان کی سواری کا گدھا گل سڑ کر بوسیدہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا [illegible] اور پھر فرمایا کہ ہم نے یہ سب کچھ اسلئے کیا کہ تم کو دوسروں کیلئے اپنی قدرت کاملہ کا ایک "نشان" بنادیں [illegible] پھر ان تمام باتوں کے بعد اس بزرگ ہستی کو مشاہدہ کرایا کہ کس طرح ہڈیوں نے آپس میں ترتیب پائی۔ پھر ان پر گوشت چڑھا اور پھر چمڑا اور ان کا گدھا زندہ کھڑا ہو گیا۔ [illegible] یہ سب کچھ دیکھ لینے اور مشاہدہ کر لینے کے بعد جب علم الیقین نے عین الیقین کا درجہ حاصل کر لیا تو فوراً اس برگزیدہ ہستی نے اعتراف کیا کہ بے شک خدا کی قدرتِ کاملہ کیلئے اسباب و وسائل کی حاجت نہیں۔ وہ جس طرح چاہے بے روک ٹوک تصرف کرے کوئی اس کیلئے مانع نہیں ہے [illegible]۔

اب ان صاف اور واضح آیات پر دوبارہ غور کیجئے اور سوچئے کہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو ایک "حقیقی واقعہ" کی حیثیت سے بیان کیا ہے یا مجاز کے طور پر ایک "مکاشفہ" کی شکل میں۔ نیز کیا حزقیل کے مکاشفہ اور ان

آیات میں ذکر کردہ واقعہ کے درمیان مشابہت کی وجہ سے دونوں کو ایک بتانا کسی طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ پس بلاشبہ مولانا آزاد کی یہ تاویل "تاویل باطل" ہے۔

البتہ یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے اگر حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو یہ واقعہ پیش آیا تو اس کے قریب قریب حضرت حزقیل علیہ السلام کا ایک مکاشفہ بھی ہے جو مجموعہ تورات کے صحیفہ حزقیل علیہ السلام میں مذکور ہے اس مکاشفہ میں انھوں نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہوئی ہڈیوں کو دوبارہ زندہ ہوتے ہوئے دیکھا اور خدائے تعالیٰ نے ان کو بتایا اس سے یہ مراد ہے کہ بنی اسرائیل اب ناامید ہو چکے ہیں کہ ہم اس بربادی کے بعد کبھی یروشلم میں دوبارہ آباد ہوں گے مگر تیرے ذریعے سے ان کو خبردار کرتے ہیں کہ خدا فیصلہ ہے ایسا ضرور ہوگا۔ (حزقیل باب ۳۷ آیات ۱۴-۱)

حضرت عزیر علیہ السلام اور عقیدہ ابنیت

گزشتہ سطور میں آچکا ہے جب بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کر ڈالا اور بنی اسرائیل کے مردوں، عورتوں، بچوں کو بھیڑوں کی طرح ہنکا کر لے چلا تو توراۃ کے تمام نسخوں کو بھی جلا کر خاک کر دیا تھا اور بنی اسرائیل کے پاس نہ توراۃ کا کوئی نسخہ باقی بچا تھا اور نہ کوئی حافظ تھا جس کو اول سے آخر توراۃ محفوظ ہو اسیری کے پورے دور میں وہ توراۃ سے قطعاً محروم ہو چکے تھے لیکن جب عرصہ دراز کے بعد ان کو بابل کی اسیری سے نجات ملی اور وہ بیت المقدس (یروشلم) میں دوبارہ آباد ہوئے تو اب ان کو یہ فکر ہوئی کہ خدا کی کتاب توراۃ کو کسی طرح حاصل کریں تب حضرت عزیز علیہ السلام (عزراہ) نبی نے سب اسرائیلیوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے توراۃ کو اول سے آخر تک پڑھا اور تحریر کرایا۔

بعض اسرائیلی روایات میں ہے کہ جس وقت انھوں نے بنی اسرائیل کو جمع کیا تو سب کی موجودگی میں آسمان سے چمکتے ہوئے دو (شہاب) اترے اور عزیز علیہ السلام کے سینے میں سماگئے تب حضرت عزیز علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو از سر نو توراۃ مرتب کر کے عطا فرمائی چنانچہ جب حضرت عزیز علیہ السلام جب اس اہم کام سے فارغ ہوئے تو بنی اسرائیل نے نہایت مسرت کا اظہار کیا اور ان کے قلوب میں حضرت عزیز علیہ السلام کی قدر و منزلت سوگناہ بڑھ گئی اور آہستہ آہستہ اس محبت نے گمراہی کی شکل اختیار کرلی انھوں نے عزیز علیہ السلام کو اسی طرح خدا کا بیٹا مان لیا جس طرح نصاری عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ تسلیم کرتے ہیں اور بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے اس عقیدے کے لئے یہ دلیل قائم کرلی کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے ہمیں توراۃ لا کر دی تھی تو الواح پر لکھی تھی مگر عزیز علیہ السلام نے تو کسی تو لوح یا قرطاس پر مکتوب لا کر دینے کی بجائے حرف بحرف اپنے سینے کی لوح سے اس کو ہمارے سامنے نقل کر دیا اور عزیز علیہ السلام میں یہ قدرت جب ہی ہوئی کہ وہ خدا کا بیٹا ہے[۲]۔ (العیاذ باللہ) سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ

۱: البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۴۲۔
۲: ایضاً ص ۴۶۔

قرآن عزیز کے اس اعلان پر کہ عزیز کو یہود خدا کا بیٹا کہتے ہیں آج کے بعض یہودی عالم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہم تو عزیز کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے اس لئے قرآن کا یہ دعویٰ غلط ہے مگر ان علماء یہود کا یہ اعتراض بھی اپنے پیشروؤں کی طرح تلبیس اور کتمان حق پر مبنی ہے ورنہ تو وہ جانتے ہیں اور ان کے علاوہ ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کی اور اس کو اقوام عالم کے مذاہب کی تحقیق سے دلچسپی رہی ہو کہ آج بھی نواح فلسطین میں یہود کا وہ فرقہ موجود ہے جو عزیر کو خدا کا بیٹا مانتا ہے اور رومن کیتھولک عیسائیوں کی طرح ان کا مجسمہ بنا کر ان کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو خدا کے ساتھ ہونا چاہیے۔

حضرت عزیر کی حیات طیبہ سے متعلق تفصیلی حالات کا کچھ زیادہ مواد کتب سیر و تاریخ میں نہیں پایا جاتا اور مجموعہ توراۃ کے صحیفہ عزرا میں بھی خود ان کی زندگی پاک پر مفصل روشنی نہیں پڑتی اور اس کا زیادہ حصہ بنی اسرائیل کی اسارت بابل اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے۔ البتہ تورات اور وہب بن منبہ اور کعب احبار سے منقول روایات سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ بخت نصر کے حملۂ بیت المقدس کے زمانہ میں صغیر سن تھے اور چالیس[۱] برس کی عمر میں بنی اسرائیل کے منصب "فقیہ" پر فائز ہوئے اور اس کے بعد ان کو منصب نبوت عطا ہوا اور وہ نحمیاہ نبی بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کا فرض انجام دیتے اور اراد شیر کے زمانہ میں وہ بنی اسرائیل کی مشکلات سے متعلق تعمیر بیت المقدس کو دور کرنے کے سلسلہ میں شاہی دربار میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے رہے۔ (صحیفہ عزرا)

اور مشہور قول کے مطابق جن بزرگوں نے سورۂ بقرہ کے واقعہ کا تعلق ان کے ساتھ بتایا ہے انھوں نے اس سلسلہ میں بعض مزید تفصیلات حضرت عبداللہ بن سلام اور کعب احبار وغیرہ سے نقل فرمائی ہیں جن کا ذکر ابن کثیر نے بھی اپنی تاریخ میں کیا ہے اور بعض مفسرین نے بھی آیات زیر بحث کی تفسیر کے ضمن میں ان کو نقل کیا ہے۔

حضرت سلیمان کے واقعات کے ضمن میں ایک صحیح روایت نقل کی گئی تھی کہ کسی "نبی" کے ایک چیونٹی نے کاٹ لیا۔ انہوں نے غصہ میں چیونٹی کے سوراخ میں آگ ڈال کر تمام چیونٹیوں کو جلوا دیا، تب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ان پر عتاب فرمایا کہ تم نے ایک چیونٹی کی خطا پر تمام چیونٹیوں کو جلا دینا کس طرح جائز رکھا؟ تو اس واقعہ کے متعلق ابن کثیر نے اسحق بن بشیر کی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ مجاہد ابن عباس اور حسن بصری وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ نبی "عزیر" تھے۔ (البدایہ والنہایہ، تاریخ طبری)

عزیر کے متعلق بعض اور بھی واقعات نقل کیے جاتے ہیں مگر روایت اور درایت دونوں اعتبار سے

۳: البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۴۲۔

ساقط الاعتبار ہیں بلکہ لغو اور لاطائل ہیں چنانچہ ابن کثیر وغیرہ نے بھی ان کو نقل کر کے رد کر دیا ہے۔
(البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۴۰)

حضرت عزیر اور منصب نبوت

مگر یہ واضح رہے کہ جن روایات میں حضرت عزیر کو آیات مسطورۂ بالا کا مصداق قرار دیا گیا ہے ان میں یہ بھی تصریح ہے کہ عزیر نبی نہیں تھے بلکہ مرد صالح تھے حالانکہ جمہور کا قول یہ ہے کہ حضرت عزیر نبی تھے اور قرآن عزیز نے بھی جس انداز اور اسلوب سے ان کا ذکر کیا ہے وہ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور گمراہ یہودیوں نے ان کو اسی طرح ابن اللہ بنا لیا جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کو نیز توراۃ بھی ان کے نبی ہونے کا اقرار کرتی ہے۔

علاوہ ازیں جو حضرات ایک طرف سورۂ بقرہ کی زیر بحث آیات کا مصداق عزیر کو بتاتے ہیں اور دوسری جانب ان کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے یہ بات قابل توجہ ہے کہ بقرہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بلا واسطہ خطاب فرمایا ہے اور ان سے ہم کلام ہوا ہے اور یہ ان کے نبی ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

بر حال عزیر کے نبی ہونے کے متعلق دو قول ہیں اور راجح قول یہی ہے کہ وہ بلا شبہ خدا کے پیغمبر ہیں۔

نسب

عزیر کے والد اور سلسلۂ نسب کے بعض دوسرے ناموں میں مؤرخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ حضرت ہارون بن عمران کی نسل سے ہیں۔

ابن عساکر ان کے والد کا نام جروہ بتاتے ہیں اور بعض سوریق اور بعض سروخایان کرتے ہیں اور صحیفۂ عزرا میں ہے کہ ان کا نام خلقیاہ تھا۔

وفات اور قبر مبارک

ابن کثیر نے وہب بن منبہ، کعب احبار اور عبداللہ بن سلام سے عزیر کے متعلق جو طویل روایت نقل کی ہے اس میں ہے کہ عزیر نے بنی اسرائیل کے لیے توراۃ کی تجدید عراق کے اندر دیر حزقیل میں کی تھی اور اسی نواح کے ایک قریہ سائر آباد میں ان کی وفات ہوئی۔[1] اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ بعض آثار میں موجود ہے کہ ان کی قبر دمشق میں ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۴۳)

بصائر

حضرت عزیر کے واقعات کو جو حضرات قصہ کہانی کی بجائے تاریخی حقائق سمجھتے ہیں وہ بلا شبہ

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۴۵

اس سے بہت اہم نتائج اخذ کر سکتے ہیں اور کیا عجب ہے کہ وہ حسب ذیل بصائر و عبر کو بھی اسی سلسلہ کی کڑی سمجھیں۔

۱) انسان کتنا ہی معراج ترقی اور بام رفعت پر پہنچ جائے اور خدائے تعالیٰ کے ساتھ اس کو زیادہ سے زیادہ بھی قرب حاصل ہو جائے تب بھی وہ خدا کا بندہ ہی رہتا ہے اور کسی بھی مقام بلند پر پہنچ کر وہ خدا یا خدا کا بیٹا نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس وحدہ لا شریک لہ اور باپ اور بیٹے کی نسبتوں سے پاک اور وراء الوراء ہے لہٰذا یہ انسان کی سب سے بڑی گمراہی ہے کہ وہ جب کسی برگزیدہ انسان سے ایسے امور صادر ہوتے دیکھتا ہے جو عام طور پر عقل کے نزدیک حیرت زا اور تعجب خیز ہوں تو وہ رعب یا انتہاء عقیدت کی وجہ سے پکار اٹھتا ہے کہ یہ ہستی تو خدا کا اوتار (خدا بشکل انسان) یا اس کا بیٹا ہے اور وہ یہ نہیں سوچتا کہ بلا شبہ ان واقعات کا صدور خدا کی طاقت کے ذریعہ بطور ''نشان'' اس کے ہاتھوں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ نہ خدا ہے اور نہ خدا کا بیٹا، بلکہ اس کا ایک مقرب بندہ ہے اور یہ امور خدا کے خاص قوانین کے ماتحت محض اس کی تائید اور اس کی صداقت کے لیے ظاہر ہوتے ہیں ورنہ تو یہ بھی خدا کے سامنے اسی طرح مجبور ہے جس طرح دوسری مخلوق چنانچہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ اس حقیقت کو واضح کر کے انسان کو اس گمراہ کن عقیدت سے سختی کے ساتھ باز رکھا ہے۔

۲) اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کے اس واقعہ کو ابراہیم ‏ کے اس واقعہ سے متصل بیان فرمایا ہے جس میں مذکور ہے کہ انھوں نے بھی ایک مرتبہ خدائے تعالیٰ سے یہ دریافت کیا تھا کہ مجھ کو یہ بتا کہ تو کس طرح مردہ میں جان ڈال دیتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ سوال کیا کہ ابراہیم! کیا تم اس مسئلہ پر ایمان نہیں رکھتے؟ تب ابراہیم ‏ نے جواب میں عرض کیا:

خدایا! میں بے شک اس پر ایمان رکھتا ہوں کہ تو مردہ کو زندہ کر دیتا ہے مگر میرے سوال کا مقصد قلبی اطمینان حاصل کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ نے پہلے واقعہ کو اس واقعہ کے ساتھ اس غرض سے بیان فرمایا ہے کہ تاکہ یہ مسئلہ واضح اور روشن ہو جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی جانب سے ان سوالات کا پیش آنا اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ احیاء موتیٰ کے بارے میں شک رکھتے اور اس کو دور کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان کے استفسار کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کو اس کے بارے میں جو علم الیقین حاصل ہے وہ عین الیقین اور حق الیقین کے درجہ تک پہنچ جائے یعنی وہ جس طرح دل سے اس پر یقین رکھتے ہیں اسی طرح وہ چاہتے ہیں کہ آنکھوں سے بھی مشاہدہ کر لیں کیونکہ وہ مخلوق خدا کی رشد و ہدایت پر مامور ہونے کی وجہ سے جن ذمہ داریوں کے حامل ہیں ان کی تبلیغ و دعوت کو باحسن وجوہ انجام دے سکیں اور یقین کا کوئی اعلیٰ درجہ ایسا باقی نہ رہے جو ان کو حاصل نہ ہو۔

۳) دنیا دار العمل ہے اور دار الجزاء ایک دوسرا عالم ہے جس کو دار آخرت کہا جاتا ہے لیکن عادت اللہ یہ جاری ہے کہ ظلم اور کبر دو ایسے عمل ہیں کہ ظالم اور متکبر کو اس دنیا میں بھی ضرور ذلت و رسوائی کا پھل چکھاتے ہیں خصوصاً جبکہ یہ دونوں اعمال بد افراد کی جگہ قوموں کا مزاج بن جائیں اور ان کی طبیعت کا جزو ہو جائیں

۱: اس کیلئے قصص القرآن جلد اول ملاحظہ فرمائیں۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ (سورۂ نمل ۲۷: ۶۹)

۲) لیکن یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ قوموں کی اجتماعی حیات کی بقاو فنا کی عمر انفرادی زندگی سے جدا ہوتی ہے اس لیے ان کے پاداش عمل کی تاخیر سے کبھی بھی باہمت اور صاحب استقلال انسان کو گھبرانا اور مایوس ہونا نہیں چاہیے اس لیے کہ خدا کا بنایا ہوا قانون "پاداش عمل" اپنے معین وقت سے ٹل نہیں سکتا۔

حضرت زکریا علیہ السلام

قرآن عزیز اور حضرت زکریا علیہ السلام ۞ نسب
۞ حالات زندگی ۞ چند تفسیری حقائق

قرآن عزیز اور حضرت زکریا علیہ السلام

قرآن عزیز میں حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر چار سورتوں آل عمران، انعام، مریم اور انبیاء کی حسب ذیل آیات میں آیا ہے:

شمار	سورۃ	آیت	عدد
۱	آل عمران	۳۷۔۴۱	۵
۲	انعام	۸۵	۱
۳	مریم	۲۔۱۱	۱۰
۴	انبیاء	۸۹۔۹۰	۲
			۱۸

ان میں سے سورۂ انعام میں تو صرف فہرست انبیاء میں نام ذکر کیا گیا ہے اور باقی تین سورتوں میں مختصر تذکرہ منقول ہے۔

نسب

قرآن عزیز جن زکریا علیہ السلام کا ذکر کر رہا ہے، یہ وہ نہیں ہیں جن کا ذکر مجموعۂ توراۃ کے صحیفۂ زکریا میں آیا ہے اس لیے کہ توراۃ میں جن زکریا کا تذکرہ ہے ان کا ظہور داریوس (دارا) کے زمانہ میں ہوا ہے چنانچہ زکریاہ نبی کی کتاب میں ہے:

"دارا کے دوسرے برس کے آٹھویں مہینے میں خداوند کا کلام زکریاہ بن برخیاہ بن عدو کو پہنچا"۔
(باب ۱۔ آیت ۱)

اور دارا بن گشتاسب کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے پانچ سو سال قبل ہے کیونکہ وہ کیقباد بن کیخسرو کے انتقال کے بعد ۵۲۱ ق م میں تخت نشین ہوا ہے اور قرآن عزیز نے جن زکریا علیہ السلام کا ذکر کیا ہے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے مربی اور حضرت مسیح علیہ السلام کے معاصر ہیں اور

ا کے اور یحییٰ بن زکریا اور مسیح کے درمیا کوئی نبی نہیں ہے اور یہ حضرت یحییٰ کے والد ماجد ہیں۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۴۶۵)

حضرت زکریا کے والد کا نام کیا تھا اس میں اصحاب سیر کے مختلف اقوال ہیں اور ا میں سے کوئی قول بھی باوثوق نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں ابن عساکر سے وہ سب اقوال نقل کر دیے ہیں یعنی زکریا بن اد (دا) یا بن شبوی یا ابن لد یا ابن برخیا بن مسلم بن صدوق بن جشا بن داؤد بن سلیما بن مسلم بن صدیقہ بن برخیا بن بلعاطہ بن ناحور بن شلوم بن بہفاشاط بن اینامن بن رجعام بن سلیما بن داؤد (علیہم السلام)

لیکن یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ حضرت سلیما بن داؤد علیہما السلام کی ذریت میں سے ہیں۔

(تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۴)

حالات زندگی

زکریا کی حیات طیبہ کے حالات تفصیل سے معلوم نہیں ہیں لیکن جس قدر بھی قرآ عزیز اور سیر و تاریخ کی قابل اعتماد روایات سے معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

گذشتہ مباحث میں گذر چکا ہے کہ بنی اسرائیل میں "کاہن" ایک معزز مذہبی عہدہ تھا اور اس کے ذمہ یہ خدمت تھی کہ وہ ہیکل (صخرۂ بیت المقدس) کی مقدس رسوم ادا کیا کرے اس کے لیے مختلف قبائل میں سے الگ کاہن منتخب ہوتے اور اپنی اپنی نوبت پر اس خدمت کو انجام دیا کرتے تھے۔

چنانچہ حضرت زکریا بنی اسرائیل میں معزز کاہن بھی تھے جلیل القدر پیغمبر بھی، چنانچہ قرآ عزیز نے ا کو انبیاء کی فہرست میں شمار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس یہ سب نکوکاروں میں سے ہیں۔

لوقا کی انجیل میں ا کو کاہن[۲] کہا گیا ہے:

یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں زکریاہ نام کا ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارو کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا اور وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور ورخداوند کے سارے حکموں اور قانو پر بے عیب چلنے والے تھے۔ (باب ۱۔ آیت ۵۔۶)

مگر انجیل برنابا میں بصراحت مذکور ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے چنانچہ حضرت مسیح یہود کو مخاطب کر کے ارشاد فرما رہے ہیں۔

۱: فتح الباری جلد ۶ و تاریخ ابن کثیر ۲ ص ۴۔

۲: اسلام کے دورِ اول میں عرب کے اندر جو کاہن (جوتشی) ہوتے اور مستقبل کے حالات بتایا کرتے تھے اور جن کی باتوں پر ایمان لانا اسلام کے ساتھ کفر کرنا بتایا گیا ہے وہ بنی اسرائیل کے اس منصب سے الگ شے ہے۔

وہ وقت قریب ہے جب تم پر ان انبیاء علیہم السلام کا وبال پڑنے والا ہے جن کو تم نے زکریا علیہ السلام کے زمانہ تک قتل کیا ہے اور جبکہ زکریا علیہ السلام کو ہیکل اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔[1]

زکریا علیہ السلام سُلالۃ داوٗد علیہ السلام سے تھے اور اُن کی زوجہ مطہرہ ایشاع یا الیشع حضرت ہارون علیہ السلام کی ذریت میں سے تھیں۔ (فتح الباری جلد ۶ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲)

گزشتہ مباحث میں یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام ''خواہ وہ بادشاہ اور صاحب حکومت ہی کیوں نہ ہوں'' اپنی روزی ہاتھ کی محنت سے پیدا کرتے اور کسی کے لیے بارِ دوش نہیں ہوتے تھے اسی لیے ہر نبی نے جب اپنی اُمت کو رُشد و ہدایت کی تبلیغ کی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا ہے وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں تم سے اس تبلیغ پر کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میرا اجر تو خدا کے سوا اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ چنانچہ زکریا علیہ السلام بھی اپنی روزی کے لیے نجاری کا پیشہ کرتے تھے جیسا کہ مسلم، ابنِ ماجہ اور مسند احمد میں بصراحت مذکور ہے۔

عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال كان زكريا نجارًا (الحديث) (کتاب الانبیاء)

حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: زکریا علیہ السلام نجّار (بڑھئی کا کام) کرتے تھے۔

اُن ہی کے خاندان یعنی سلیمان بن داوٗد علیہ السلام کی نسل میں سے عمران بن ماثان اور اس کی بیوی حنہ بنت فاقود نیک نفس[2] انسان تھے اور پارسائی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر لاولد تھے اور جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں تفصیل سے آئے گا، حنہ کی دُعا سے ان کے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام اُنھوں نے مریم رکھا اور حنہ نے اپنی منّت کے مطابق مریم علیہا السلام کو ''ہیکل'' کی نذر کر دیا۔ تو اب سوال پیدا ہوا کہ اس کی کفالت، پرورش اور نگاہداشت کس کے سپرد ہو، کاہنوں کے درمیان اس ''مقبول نذرِ خدا کے بارے میں اختلاف ہو کر جب بات قرعہ و فال پر آکر ٹھہری تو قرعہ زکریا علیہ السلام کے نام نکلا اور وہی مریم علیہا السلام کے کفیل قرار پائے۔

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا

اور زکریا علیہ السلام نے مریم کی کفالت کا بوجھ اپنے ذمہ رکھا

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُوْنَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ○ (٣:٤٤)

اور تم (اے محمد ﷺ) ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے اپنے قلم (قرعہ کے لیے) ڈال رہے تھے کہ ان

1: مشہور چار انجیلوں سے الگ یہ پانچویں انجیل ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری برنابا کی جانب منسوب ہے، یہ روما کے پوپ سکٹس کے کتب خانہ میں محفوظ تھی اور وہاں سے ایک اسقف نے کسی طرح حاصل کر کے اس کو شائع کر دیا اور وہ مسلمان ہو گیا، کیونکہ اس میں نبی اکرم ﷺ کے ظہور کی شہادتیں صاف اور واضح پائی جاتی ہیں۔

2: فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۴۔

میں سے کون شخص مریم کی کفالت کرے اور نہ تم ان کے پاس تھے جب وہ مریم کی کفالت کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے۔

علماء سیر و تاریخ کہتے ہیں کہ زکریا کی کفالت کے حقدار تھے اس لیے کہ بشیر بن اسحٰق نے "المبتداء" میں نقل کیا ہے کہ زکریا کی بیوی ایشاع (الیشع) اور حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ حنہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں[1] اور خالہ بمنزلہ اوالدہ کے ہوتی ہے جیسا کہ خود نبی اکرم نے عمارہ بنت حمزہ کے متعلق فرمایا تھا کہ ان کی پرورش حضرت جعفر کی بیوی کریں کیوں کہ وہ عمارہ کی خالہ ہیں "والخالة بمنزلة الام"[2]

جب مریم علیہا السلام سمجھ دار ہو گئیں تو زکریا نے ان کے لیے ہیکل کے قریب ایک حجرہ (خلوہ) مخصوص کر دیا جہاں وہ دن میں عبادت الٰہی میں مشغول رہتی اور رات اپنی خالہ کے پاس گزارتی تھیں۔

جب زکریا مریم علیہا السلام کے حجرہ محراب میں داخل ہوتے تو دیکھتے کہ ان کے پاس غیر موسمی پھل رکھے ہیں۔ ایک مرتبہ تعجب سے زکریا نے دریافت کیا مریم! تیرے پاس یہ کہاں سے آئے؟ مریم نے کہا: یہ خدا کی جانب سے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق عطا کر دیتا ہے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَامَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

جب زکریا مریم کے پاس محراب (خلوہ) میں داخل ہوتا تو اس کے پاس کھانے پینے کا سامان رکھا دیکھتا زکریا نے دریافت کیا۔ مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آتا ہے مریم نے کہا۔ یہ اللہ کے پاس سے ہے وہ بلاشبہ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق عطا کر دیتا ہے۔

مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ضحاک، قتادہ، ابراہیم نخعی (رحمہم اللہ) رزقا کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ زکریا مریم علیہا السلام کے پاس غیر موسمی پھل رکھے پاتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۶۰)

زکریا کے کوئی اولاد نہیں تھی اور وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اس بات کے علاوہ کہ میں اولاد کی دولت سے محروم ہوں زیادہ فکر اس امر کا ہے کہ میرے بھائی بند ہر گز اس کے اہل نہیں ہیں کہ میرے بعد بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کی خدمت انجام دے سکیں پس اگر اللہ تعالیٰ میرے کوئی نیک سرشت لڑکا پیدا کر دیتا تو مجھ کو یہ اطمینان ہو جاتا کہ بنی اسرائیل کی راہنمائی کا خدمت گزار میرے بعد موجود ہے۔

(فتح الباری جلد ۵ ص ۳۶۴)

مگر چونکہ ان کی عمر بقول ابن کثیر ستتر سال اور بقول ثعلبی نوے، بانوے یا ایک سو بیس سال ہو چکی تھی[3] اور ان کی بیوی بانجھ تھیں۔ اسلئے بہ اسباب ظاہر وہ مایوس تھے کہ اب اولاد ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

1: فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۴۔
2: بخاری باب الحضانۃ۔
3: البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۴۹۔

لیکن جب انہوں نے مریم (علیہا السلام) کے پاس بے موسم پھل دیکھے اور ان کو یہ معلوم ہوا کہ مریم پر خدا کا یہ فضل و انعام ہے تو ان کے دل میں فوراً جوش پیدا ہوا کہ جو ذاتِ اقدس اس طرح بے موسم مریم کو پھل بخشتی ہے کیا وہ ہم کو موجودہ ناامیدی کی حالت میں ثمرِ حیات (بیٹا) نہ بخشے گی۔ پس ہماری مایوسی سر تا سر غلط ہے۔ بلاشبہ جس ذاتِ پاک نے مریم پر اپنا انعام و اکرام کیا ہے۔ وہ ضرور ہم پر بھی فضل و کرم کرے گا۔ چنانچہ انہوں نے درگاہِ الٰہی میں دعا کی "خدایا میں تنہا ہوں اور وارث کا محتاج اور یوں تو حقیقی وارث صرف تیری ہی ذات ہے۔ خدایا مجھ کو پاک اولاد عطا فرما۔ مجھے یقین ہے کہ تو حاجتمند کی دعاء کو ضرور سنتا ہے۔" نبی کی دعاء اور دعاء بھی صرف ذات کیلئے نہیں بلکہ قوم کی رشد و ہدایت کی خاطر فوراً مستجاب ہوئی اور جب زکریا ہیکل میں مشغولِ عبادت تھے تو خدا کا فرشتہ ان پر ظاہر ہوا اور اس نے بشارت دی کہ تمہارا بیٹا پیدا ہوگا اور تم اس کا نام یحیٰ رکھنا۔ زکریا کو یہ سن کر بے حد مسرت ہوئی اور تعجب سے دریافت کرنے لگے یہ بشارت کس طرح پوری ہوگی؟ یعنی مجھ کو جوانی عطا ہوگی یا میری بیوی کا مرض (بانجھ پن) دور کر دیا جائے گا۔ فرشتہ نے جواب دیا: میں اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ حالات کچھ بھی ہوں تمہارے ضرور بیٹا ہوگا۔ کیونکہ خدا کا فیصلہ اٹل ہے اور تیرا خدا کہتا ہے کہ میرے لئے یہ بہت آسان ہے۔ یعنی جو طریقہ بھی اس کے لئے چاہوں اختیار کروں۔ کیا تجھ کو میں نے نیست سے ہست نہیں کیا۔

اب زکریا نے درگاہِ الٰہی میں عرض کیا: خدایا! ایسا کوئی نشان عطا کر۔ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ بشارت نے وجود کی شکل اختیار کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: علامت یہ ہے کہ جب تم تین روز تک بات نہ کر سکو اور صرف اشاروں ہی سے اپنا مطلب ادا کر سکو تو سمجھ لینا کہ بشارت نے وجود اختیار کر لیا لیکن ان دنوں میں تم خدا کی تسبیح و تہلیل میں زیادہ مشغول رہنا۔ چنانچہ جب وہ وقت آ پہنچا تو زکریا یادِ خدا میں اور زیادہ منہمک ہو گئے اور امت کو بھی اشاروں سے یہ حکم دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ خدا کی یاد میں مشغول رہیں اور یہ اسلئے کہ جس طرح یحیٰ کی ولادت کی بارت حضرت زکریا کیلئے باعثِ صد ہزار مسرت تھی۔ اسی طرح بنی اسرائیل کیلئے بھی کم خوشی کا باعث نہیں تھی کہ زکریا کا ایک صحیح جانشین اور علم و حکمت و نبوت کا سچا وارث عالم وجود میں آنے والا ہے۔

یہی واقعات ہیں جو قرآن عزیز اور صحیح احادیث کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں اور صرف ان ہی پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ یا اسرائیلی روایات ہیں جو اکثر و بیشتر تو اس مسئلہ میں قرآن و حدیث کے بیان کردہ واقعات کی مطابقت کرتی ہیں اور بعض ساقط الاعتبار ہیں اور یا بعض وہ آثار ہیں جو روایت و درایت کے اعتبار سے ناقابلِ حجت اور غیر مستند ہیں اور سورۂ مریم میں ہے:

كٓهٰيٰعٓصٓ ۝ ذِكْرُ رَحْمَةِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝ إِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝ وَإِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآئِيْ وَكَانَتِ امْرَأَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ

لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۝ (۱۹:۱-۱۱)

کاف، ہا، یا، عین، صاد (اے پیغمبر!) تیرے پروردگار نے اپنے بندے زکریا پر جو مہربانی کی تھی یہ اس کا بیان ہے، جب ایسا ہوا تھا کہ زکریا نے چپکے چپکے اپنے پروردگار کو پکارا، اس نے عرض کیا "پروردگار! میرا جسم کمزور پڑ گیا ہے میرے سر کے بال بڑھاپے سے سفید ہو گئے ہیں۔ خدایا! کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تیری جناب میں دعا کی ہو اور محروم رہا ہوں۔ مجھے اپنے مرنے کے بعد اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے (کہ نہ معلوم وہ کیا خرابی پھیلائیں) اور میری بیوی بانجھ ہے، پس تو اپنے خاص فضل سے مجھے ایک وارث بخش دے ایسا وارث جو میرا بھی وارث ہو اور خاندانِ یعقوب (کی برکتوں) کا بھی اور پروردگار! اسے ایسا کر دیجیو کہ (تیرے اور تیرے بندوں کی نظر میں) پسندیدہ ہو (اس پر حکم ہوا) اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی پیدائش کی خوشخبری دیتے ہیں۔ اس کا نام یحییٰ رکھا جائے اس سے پہلے ہم نے کسی کیلئے یہ نام نہیں ٹھہرایا ہے (زکریا نے متعجب ہو کر کہا) پروردگار! میرے یہاں لڑکا کہاں سے ہوگا، میری بیوی بانجھ ہو چکی اور میرا بڑھاپا دور تک پہنچ چکا۔ ارشاد ہوا! ایسا ہی ہوگا، تیرا پروردگار فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے مشکل نہیں۔ میں نے اس سے پہلے خود تجھے پیدا کیا۔ حالانکہ تیری ہستی کا نام و نشان نہ تھا۔ اس پر زکریا نے عرض کیا "خدایا! میرے لئے (اس بارے میں) ایک نشانی ٹھہرا دے" فرمایا "تیری نشانی یہ ہے کہ صحیح و تندرست ہونے کے باوجود تو تین رات لوگوں سے بات نہ کرے گا۔ پھر وہ حجرہ سے نکلا اور اپنے لوگوں میں آیا اور اس نے ان سے اشارہ سے کہا "صبح شام خدا کی پاکی و جلال کی صدائیں بلند کرتے رہو"۔

اور سورۂ انبیاء میں ارشاد ہے:

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَّكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝ (۲۱:۸۹-۹۰)

اور اسی طرح زکریا (کا معاملہ یاد کرو) جب اس نے اپنے رب کو پکارا تھا "خدایا مجھے (اس دنیا میں) اکیلا نہ چھوڑ (یعنی بغیر وارث کے نہ چھوڑ) اور (ویسے تو) تو ہی (ہم سب کا) بہتر وارث ہے، تو دیکھو ہم نے اس کی پکار

سن لی۔اسے (ایک فرزند) یحییٰ فرمایااور اس کی بیوی کو اس لئے تندرست کر دیا یہ تمام لوگ نیکی کی راہوں میں سرگرم تھے (اور ہمارے فضل سے) اُمید لگائے ہوئے اور (ہمارے جلال سے) ڈرتے ہوئے دعا میں مانگتے تھے اور ہمارے آگے عجز و نیاز سے جھکے ہوئے تھے۔اور سورۃ آل عمران میں ارشاد ہے:۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ○ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ○ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ○ (۳:۳۸-۴۱)

اسی وقت زکریا نے اپنے پروردگار سے دعا کی، کہا: اے میرے پروردگار مجھ کو اپنے فضل سے پاکیزہ اولاد کر بلا شبہ تو دعا کا سننے والا ہے۔ پھر جب زکریا حجرہ کے اندر نماز میں مشغول تھا تو فرشتوں نے اس کو آواز دی اللہ تجھ کو یحییٰ کی (ولادت کی) خوشخبری دیتا ہے جو شہادت دے گا اللہ کے ایک کلمہ (عیسیٰ علیہ السلام) کی، اور صاحب مرتبہ ہو گا اور عورت کے پاس تک نہ جائے گا (یا ہر قسم کی چھوٹی بڑی تلویث سے پاک ہو گا) اور نکوکاروں سے (ہونے ہوئے) نبی ہو گا (زکریا) نے کہا: پروردگار! میرے لڑکا کس طرح ہو گا جب کہ میں بہت بوڑھا ہو گیا اور میری بیوی بانجھ ہے، فرمایا: اللہ جو چاہے اسی طرح کرتا ہے زکریا نے کہا پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر کیجیے۔ فرمایا: یہ نشانی ہے کہ تو تین دن لوگوں سے اشارہ کے سوا (زبان سے) بات نہ کرے گا، اور اپنے رب کی یاد میں (اظہار شکر کے لیے) بہت زیادہ رہ اور صبح و شام تسبیح کر۔

چند تفسیری حقائق

سورۂ آل عمران اور مریم میں ہے کہ جب زکریا علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دی گئی تو وہ تعجب کا اظہار کرنے لگے کہ میں ضعیف العمر اور بیوی بانجھ، پھر یہ بشارت کس طرح عالم وجود میں آئے گی۔ شاہ عبد القادر (نور اللہ مرقدہ) اس کے متعلق ایک لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں:۔

"انوکھی چیز مانگتے تعجب نہیں آیا۔ جب سنا کہ ہو گا تب تعجب کیا"۔ (موضح القرآن۔ سورۂ مریم)

گزشتہ مباحث میں یہ کئی جگہ ذکر ہو چکا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جانب سے اس قسم کے سوالات کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ خدا کی قدرت کاملہ کے بارے میں شک کرتے ہیں بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کو یہ بتا دیا جائے تو بہتر ہے کہ قدرت الٰہی کا یہ کرشمہ کس نوعیت کے ساتھ وجود پذیر ہونے والا ہے، مگر چونکہ سوال کی ظاہر سطح ایسی ہوتی ہے کہ گویا وہ اس کے وقوع کے بارہ میں متردد ہیں اس لیے سنت اللہ یہ جاری ہے کہ اول ان کو اسی انداز میں جواب دیا جاتا ہے تاکہ ان کو متنبہ کر دیا جائے کہ اگرچہ یہ تقاضائے بشریت ان کا یہ سوال

قابل گرفت نہیں ہے تاہم ان کی شان رفیع سے یہ بہت نازل اور کمتر بات ہے کہ وہ مقرب بارگاہ ہوتے ہوئے اس قسم کے معاملہ میں اظہار تعجب کریں۔ چنانچہ شاہ عبد القادر صاحب نے اپنے مختصر سے دو جملوں میں اسی جانب اشارہ کیا ہے لیکن ساتھ ہی سوال کی جو حقیقی روح ہے اس کے پیش نظر اصل جواب بھی ضرور دیا جاتا ہے تاکہ ان کا قلب مطمئن ہو جائے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر اس مقام پر بھی اول زکریا کے تعجب کے مطابق جواب دیا اور اپنی قدرت کاملہ کے بے روک ٹوک تصرفات کا اظہار فرمایا اور پھر زکریا کے سوال کی حقیقی روح کے مطابق یہ جواب دیا ہم نے اس کی بیوی کے مرض کو دور کر کے صحیح و تندرست کر دیا۔

۲) سورۂ مریم میں ہے کہ حضرت زکریا نے اولاد کی دعا مانگتے ہوئے درگاہ الٰہی میں یہ کہا تھا: تو یہاں وراثت سے علم و حکمت اور نبوت کی میراث مراد ہے جیسا کہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعات میں گذر چکا اور اس مقام پر تو یہ معنی اس لیے بھی زیادہ واضح ہیں کہ زکریا مال و دولت سے خالی تھے اور نجاری کے ذریعہ روزانہ کی قوت لایموت حاصل کر لیا کرتے تھے۔ ان کے پاس وہ دولت ہی کہاں تھی جس کی وراثت کی ان کو تمنا ہوتی۔ نیز اس لیے بھی وراثت مالی مراد نہیں ہو سکتی کہ اگر یہ مقصد ہوتا تو زکریا کو فقط یہ کہنا چاہیے تھا کہ يَرِثُنِي وہ میرا وارث بنے گا يَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ کہنے کے کیا معنی؟ یحییٰ تنہا تمام خاندان یعقوب کے کس طرح مالی وارث ہو سکتے تھے۔

۳) سورۂ آل عمران اور مریم میں ہے ہم نے اس کی تفسیر جمہور کے مطابق کی ہے، چنانچہ عبد اللہ بن عباس، مجاہد، عکرمہ، قتادہ اور دوسرے علماء اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

> اعتقل لسانه من غير مرض ولا علة و قال زيد بن اسلم من غير خرس ولا يستطيع ان يكلم قومه الا اشارة ۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۱۱۲)
>
> ان کی زبان تین دن کے لیے بغیر کسی مرض اور خرابی کے بندھ گئی تھی اور زید بن اسلم کہتے ہیں کہ ان کی زبان گنگ کے مرض سے پاک رہتے ہوئے تین دن کے لیے بند ہو گئی تھی اور ان میں یہ قدرت نہیں رہی تھی کہ قوم سے اشارہ کے سوا بول سکیں۔

البتہ آیت کے اس جملہ میں سویا کے معنی میں دو قول ہیں ایک سوی بمعنی صحیح و تندرست اور دوسرے بمعنی متتابعات (یعنی مسلسل تین روز) قول اول جمہور کا قول ہے اور عوفی نے ابن عباس سے ایک روایت دوسرے قول کے مطابق نقل کی ہے حافظ عماد الدین جمہور کے قول کو ترجیح دیتے ہیں لوقا کی انجیل میں بھی زکریا کے اس واقعہ کا اسی طرح ذکر ہے جس طرح اس آیت کی تفسیر میں جمہور علماء کا مسلک ہے۔

تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۱۱۲۔

"زکریا نے فرشتے سے کہا: میں یہ بات کس طرح جانو کیونکہ میں بوڑھا ہو اور میری بیوی بانجھ ہے فرشتے نے جواب میں اس سے کہا: میں جبرئیل ہو جو خدا کے حضور کھڑا رہتا ہو اور اس لیے بھیجا گیا ہو کہ تجھ سے کلام کرو اور تجھے ان باتو کی خوش خبری دو ،اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا۔" (لوقا باب ۱، آیت ۱۸، ۲۰)

لیکن لانا آزاد ترجمان القرآن میں جمہور کی تفسیر سے جدا یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ زکریا سے کہا گیا کہ تم بنی اسرائیل کے روزو کی طرح تین دن کھانے پینے وغیرہ سے باز رہنے کے ساتھ ساتھ خا شی بھی اختیار کیے رہو تو عودہ بشارت کا وقت شروع ہو جائے گا۔

چنانچہ لوقا کی انجیل کا مسطورۂ بالا حوالہ نقل کر کے فرماتے ہیں:

قرآن نے یہ نہیں کہا ہے کہ حضرت زکریا گونگے ہو گئے۔ یہ یقیناً بعد کی تعبیرات ہیں جو حسب معمول پیدا ہو گئیں صاف بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت زکریا کو روزہ رکھنے اور مشغول عبادت رہنے کا حکم ہوا اور یہودیو کے یہا روزہ کے اعمال میں ایک عمل خا شی بھی تھی۔

کی یہ تفسیر اگرچہ عربیت کے قواعد کے بموجب بن سکتی ہے لیکن سلف صالحین سے چونکہ باتفاق اس کے خلاف مذکور ہے اس لیے ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں رہا گونگا ہو جانا تو اس کے متعلق گذشتہ سطور میں نقل ہو چکا کہ یہ مسلک کسی کا بھی نہیں کہ وہ ایسے مرض میں گرفتار کر دیئے گئے تھے جس کو خرس (گونگا ہونا) کہتے ہیں، بلکہ زبان میں قوت گویائی کے صحیح و سالم رہنے کے باوجود علامت کے طور پر تین دن کے لیے منجانب اللہ زبان میں (حصر) رکاوٹ واقع ہو گئی تھی۔

۴) سورۂ آل عمران میں کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ یہا رزق سے مراد علم و حکمت کے صحیفے ہیں مگر ہم نے اس قول کو اختیار نہیں کیا اس لیے کہ صاف اور متبادر معنی وہی ہیں جو جمہور سے منقول ہیں۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام

قرآن عزیز اور حضرت یحییٰ علیہ السلام

حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں ان ہی سورتوں میں آیا ہے جن میں زکریا علیہ السلام کا ذکر ہے یعنی آل عمران، انعام، مریم، انبیاء۔

نام و نسب

یہ زکریا علیہ السلام کے بیٹے اور ان کی پیغمبرانہ دعاؤں کا حاصل تھے ان کا نام بھی اللہ تعالیٰ کا فرمودہ ہے اور ایسا نام ہے کہ اس سے قبل ان کے خاندان میں کسی کا یہ نام نہیں رکھا گیا۔

يَا زَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامِ ۣاسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا۔ (سورہ مریم)

اے زکریا! ہم بے شک تم کو بشارت دیتے ہیں ایک فرزند کی، اس کا نام یحییٰ ہوگا کہ اس سے قبل ہم نے کسی کے لیے یہ نام نہیں ٹھہرایا ہے۔

حالات زندگی

مالک بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن زکریا اور عیسیٰ بن مریم کا رحم مادر میں استقرار ایک ہی زمانہ میں ہوا اور ثعلبی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ ماہ قبل ہوا ہے[۱] اور لوقا کی انجیل میں ہے کہ جب زکریا علیہ السلام کی بیوی الیشع کو حاملہ ہوئے چھ ماہ گذر گئے تب جبرئیل علیہ السلام فرشتہ مریم (علیہا السلام) پر ظاہر ہوا اور اس نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کو بشارت دی:

اور دیکھ تیری رشتہ دار الیشع کے بھی بڑھاپے میں بیٹا ہونے والا ہے اور اب اس کو جو بانجھ کہلاتی تھی چھٹا مہینہ ہے۔ (باب ۴، آیت ۲۶)

۱: فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۴۔

ان نقول کا حاصل یہ ہے کہ حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ سے چھ ماہ بڑے تھے۔

یحییٰ کے لیے جب زکریا نے دعا کی تھی تو اس میں یہ کہا تھا کہ وہ "ذریت طیبہ" ہو، چنانچہ قرآن عزیز نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء منظور فرمالی، چنانچہ یحییٰ نیکوں کے سردار اور زہد وورع میں بے مثال تھے نہ انھوں نے شادی کی اور ان کے قلب میں کبھی گناہ کا خطرہ پیدا ہوا اور اپنے والد ماجد کی طرح وہ بھی خدا کے برگزیدہ نبی تھے اور اللہ نے ان کو بچپن ہی میں علم و حکمت سے معمور کر دیا تھا اور ان کی آمد سے قبل رشد وہدایت کے لیے زمین ہموار کرتے تھے، چنانچہ ارشاد مبارک ہے:

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًاۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۔

پس زکریا جس وقت حجرہ میں نماز ادا کر رہا تھا تو فرشتے نے اس کو پکارا اے زکریا! اللہ تعالیٰ تجھ کو (ایک فرزند) یحییٰ کی بشارت دیتا ہے جو اللہ کے کلمہ (عیسیٰ کی بشارت دے گا اور وہ (اللہ کے اور اس کے بندوں کی نظر میں برگزیدہ اور گناہوں سے بے لوث ہوگا اور نکوکاروں میں نبی ہوگا۔)

کتب سیر میں اس م پر "سید" کے مختلف معنی منقول ہیں مثلاً حلیم، عالم، فقیہ، دین ودنیا کا سردار، شریف و پرہیزگار، اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور برگزیدہ لیکن آخری معنی چونکہ مسطورۂ بالا تمام معانی کو حاوی ہیں اس لیے ترجمہ میں ان ہی کو اختیار کیا گیا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۶۱)

اسی طرح "حصور" کے بھی مختلف معنی مذکور ہیں "وہ شخص جو عورت کے قریب تک نہ گیا ہو" "جو ہر قسم کی معصیت سے محفوظ ہو اور اس کے قلب میں معصیت کا خطرہ بھی نہ گذرتا ہو" "جو شخص اپنے نفس پر پوری طرح قا رکھتا اور خواہشات نفس کو رو ہو۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۶۱)

ہمارے خیال میں یہ سب معانی ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں اس لیے کہ لغت میں "حصر" کے معنی "رکاوٹ" کے آتے ہیں اور "حصور" اسم فاعل مبالغہ کا صیغہ ہے لہٰذا اس جگہ یہ مطلب ہے کہ خدا کے نزدیک جن امور سے رکنا ضروری ہے ان سے رکنے والا "حصور" ہے اور اس لحاظ سے چونکہ یحییٰ موصوف بہمہ صفت ہیں اس لیے مسطورۂ بالا تمام معانی بیک وقت ان پر صادق آتے ہیں۔

ان معانی سے جدا بعض کے نزدیک "حصور" کے معنی قوت مردمی سے محروم کے ہیں مگر یہ معنی اس جگہ قطعاً باطل ہیں اس لیے کہ یہ معنی مرد کے لیے مدح کے نہیں ہیں بلکہ نقص اور عیب ہیں چنانچہ اس بناء پر محققین نے اپنی تفاسیر میں اس کو مردود قرار دیا ہے اور قاضی عیاضؒ نے شفاء میں اور خفاجیؒ نے اس کی شرح نسیم الریاض میں اس پر سخت نکتہ چینی کر کے جمہور کے نزدیک اس قول کو باطل ٹھہرایا ہے۔

البتہ بقاء قوت کے باوجود اس پر قا پانے کے لیے خدا کے برگزیدہ انسانوں کے ہمیشہ سے دو طریقے رہے ہیں ایک یہ کہ تجرد و تبطل کی زندگی اختیار کر کے مجاہدات و ریاضات اور نفس کشی کے ذریعہ ہمیشہ کے لیے اس کو دبادیا جائے گویا اس کو فنا کر دیا گیا عیسیٰ کی زندگی مبارک میں یہی پہلو زیادہ نمایاں ہے اور یحییٰ میں

خدائے تعالیٰ نے یہ وصف بغیر مجاہدہ و ریاضت ہی کے بدء فطرت میں ودیعت کر دیا تھا۔

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اس درجہ قابو میں رکھا جائے اور اس پر اس حد تک ضبط قائم کیا جائے کہ وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی بے محل حرکت میں نہ آئے پائے بلکہ بے محل حرکت میں آنے کا خطرہ تک باقی نہ رہے لیکن بقاء نسل انسانی کے لیے صحیح طریق کار کے ذریعہ تاہل (ازدواجی) زندگی اختیار کی جائے۔

پہلا طریقہ اگرچہ بعض حالات میں محمود ہوتا ہے مگر فطرت انسانی اور حیات اجتماعی کے لیے غیر مناسب ہے پس جن انبیاء علیہم السلام نے اس طریق کار کو اختیار فرمایا وہ وقت کی اہم ضرورت کے پیش نظر تھا خصوصاً جبکہ ان کی دعوت خاص خاص قوموں میں محدود تھی لیکن جماعتی حیات کے لیے فطرت کا حقیقی تقاضا صرف دوسرا طریق کار پورا کرتا ہے اور اسی لیے نبی اکرم ﷺ کی تعلیم اور آپ کا ذاتی عمل اسی طریق کار کی تائید کرتے ہیں اور جبکہ آپ کی بعثت کافتہ للناس تمام عالم کے لیے ہے تو ایسی صورت آپ کے لائے ہوئے دین فطرت میں اسی کو برتری حاصل ہونی چاہیے تھی، چنانچہ آپ نے متعدد شعبہ ہائے حیات میں اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے کہ دنیا کے معاملات سے جدا ہو کر پہاڑوں کے غاروں اور بیابانوں میں زندگی گزارنے والے شخص کے مقابلہ میں اس شخص کا مرتبہ خدا کے یہاں زیادہ بلند ہے جو دنیوی زندگی کے معاملات میں مقید رہ کر ایک لمحہ کے کیلئے بھی خدا کی نافرمانی نہ کرے اور قدم قدم پر اس کے احکام کو پیش نظر رکھے۔

اس کے بعد ارشاد مبارک ہے:

يَايَحْيٰى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ○ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكَاةً وَّكَانَ تَقِيًّا ○ وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ○ وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ○ (سورۂ مریم)

اے یحییٰ! (خدا کا حکم ہوا کیونکہ وہ خوشخبری کے مطابق پیدا ہوا اور بڑھا) کتاب الٰہی (توراۃ) پیچھے مضبوطی کے ساتھ لگ جا چنانچہ وہ ابھی لڑکا ہی تھا کہ ہم نے اسے علم و فضیلت بخش دی نیز اپنے خاص فضل سے دل کی نرمی اور نفس کی پاکی عطا فرمائی وہ پرہیزگار اور ماں باپ کا خدمت گزار تھا سخت گیر اور نافرمان نہ تھا اس پر سلام ہو (یعنی سلامتی ہو) جس دن پیدا ہوا اور جس دن مرا اور جس دن پھر زندہ کیا جائے گا۔

ولادت باسعادت کی بشارت کے بعد قرآن نے یحییٰ علیہ السلام کے بچپن کے ان واقعات کو نظر انداز کر کے جو اس کے مقصد سے غیر متعلق تھے یہ ذکر کیا ہے کہ خدا نے یحییٰ کو حکم دیا کہ وہ اس کے قانون توراۃ پر مضبوطی سے عمل کریں اور اسی کے مطابق لوگوں کو ہدایت دیں اسلئے کہ یحییٰ علیہ السلام نبی تھے رسول نہ تھے اور توراۃ ہی کی شریعت کے پابند تھے اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا کہ ہم نے عام بچوں کی زندگی سے جدا ان کو بچپن ہی میں علم و فضیلت بخش دیئے تھے تاکہ وہ جلد ہی نبوت کے منصب پر فائز ہو سکیں چنانچہ سیر کی کتابوں میں میں مذکور ہے کہ بچپن میں جب بچے ان کو کھیلنے پر اصرار کرتے تو وہ یہ جواب دیدیتے خدا نے مجھ کو لہو ولعب

کے لیے نہیں پیدا کیا[1] اور یہ بھی مذکور ہے کہ وہ تیس سال سے قبل ہی نبی بنا دیئے گئے تھے۔
(قصص الانبیاء للنجار ص ۴۳۰)

آیات زیر بحث میں وَ اٰتَیۡنٰهُ الۡحُكۡمَ صَبِیًّا کے یہی معنی ہیں جیسا کہ عبداللہ بن مبارک نے معمرؒ سے نقل کیا ہے[2] اور جس شخص نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ ''یحییٰ علیہ السلام بچپن ہی میں نبی بنا دیے گئے تھے صحیح نہیں ہے اسلئے کہ منصب نبوت جیسا اعلیٰ واہم منصب کسی کو بھی صغیر سنی میں عطا ہونا نہ عقل کے نزدیک درست ہے اور نہ نقل سے ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ان آیات میں جو سلامتی کی دعاء دی گئی وہ تین اوقات کی تخصیص کے ساتھ ہے حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے یہی تین اوقات سب سے زیادہ نازک اور اہم ہیں۔ وقت ولادت جس میں رحم مادر سے جدا ہو کر عالم دنیا میں آتا ہے'' اور وقت موت کہ ''جس میں عالم دنیا سے وداع ہو کر عالم برزخ میں پہنچتا ہے'' اور وقت حشر نشر کہ ''جس میں عالم قبر (برزخ) سے عالم آخرت میں اعمال کی جزاء و سزا کے لیے پیش ہونا ہے۔ لہٰذا جس شخص کو خدا کی جانب سے ان تین اوقات کے لیے سلامتی کی بشارت مل گئی اس کو سعادت دارین کا کل ذخیرہ مل گیا فطوبیٰ لہ و حسن ماٰب

اور سورۂ انبیاء میں ارشاد ہے۔

وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَأَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ إِنَّهُمْ كَانُوْا يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَكَانُوْا لَنَا خَاشِعِيْنَ ۝ (سورۃ انبیاء)

اور اسی طرح (زکریا کا معاملہ یاد کرو) جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا خدا مجھے (اس دنیا میں) اکیلا نہ چھوڑ (یعنی بغیر وارث کے نہ چھوڑ) اور (ویسے تو) تو ہی (ہم سب کا) بہتر وارث ہے، تو (دیکھو) ہم نے اس کی پکار سن لی اسے (ایک فرزند) یحییٰ عطا فرمایا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے تندرست کر دیا۔ یہ تمام لوگ نیکی کی راہوں میں سرگرم تھے (ہمارے فضل سے) امید لگائے ہوئے) ہمارے جلال سے) ڈرتے ہوئے دعائیں مانگتے تھے اور ہمارے آگے عجز و نیاز کے ساتھ جھکتے تھے۔

دعوت تبلیغ

مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ (وغیرہ) میں حارث اشعری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو پانچ باتوں کی خصوصیت کے ساتھ حکم فرمایا کہ وہ خود بھی ان پر عامل ہوں اور بنی اسرائیل کو بھی ان کی تلقین فرمائیں۔ مگر یحییٰ علیہ السلام کو ان امور خمسہ کی تلقین میں کچھ تاخیر ہو گئی تب عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میرے بھائی! اگر تم مناسب سمجھو تو میں بنی اسرائیل کو ان کلمات کی تلقین کر

1: البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۵۰
2: تاریخ ابن کثیر جلد ۲۔

دوں جن کے لیے تم کسی وجہ سے تاخیر کر رہے ہو۔ یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا: بھائی! میں اگر تم کو اجازت دے دوں اور خود تعمیل حکم نہ کروں تو مجھے خوف ہے کہ کہیں مجھ پر کوئی عذاب نہ آجائے یا میں زمین میں دھنسا نہ دیا جاؤں اس لیے میں ہی پیش قدمی کرتا ہوں چنانچہ انھوں نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں جمع کیا اور جب مسجد بھر گئی تو وعظ بیان کیا اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو پانچ باتوں کا حکم کیا ہے کہ میں خود بھی ان پر عمل کروں اور تم کو بھی عمل کی تلقین کروں اور وہ پانچ احکام یہ ہیں۔

۱) پہلا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو اور نہ کسی کو اس کا شریک و سہیم ٹھہراؤ، کیونکہ مشرک کی مثال اس غلام کی سی ہے جس کو اس کے مالک نے اپنے روپیہ سے خریدا مگر غلام نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ جو کچھ کماتا ہے وہ مالک کے سوا ایک دوسرے شخص کو دے دیتا ہے تو اب بتاؤ کہ تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کرے گا کہ اس کا غلام ایسا ہو؟ لہٰذا سمجھ لو کہ جب خدا ہی نے تم کو پیدا کیا اور وہی تم کو رزق دیتا ہے تو تم بھی صرف اسی کی پرستش کرو اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

۲) دوسرا حکم یہ ہے کہ تم خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرو، کیونکہ جب تک تم نماز میں کسی دوسری جانب متوجہ نہ ہو گے خدائے تعالیٰ برابر تمہاری جانب رضا و رحمت کے ساتھ متوجہ رہے گا۔

۳) تیسرا حکم یہ ہے کہ روزہ رکھو اس لیے کہ روزہ دار کے منہ کی بو کا خیال نہ کرو، اس لیے کہ اللہ کے نزدیک روزہ دار کے منہ کو (جو خالی معدے سے اٹھتی ہے) مشک کی خوشبو سے زیادہ پاک ہے۔

۴) چوتھا حکم یہ ہے کہ مال میں صدقہ نکالا کرو کیونکہ صدقہ کرنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جس کو اس کے دشمنوں نے اچانک آپکڑا ہو اور اس کے ہاتھوں کو گردن سے باندھ کر مقتل کی جانب لے چلے ہوں اور اس ناامیدی کی حالت میں ہو یہ کہے: کیا یہ ممکن ہے کہ میں مال دے کر اپنی جان چھڑالوں؟ اور اثبات میں جواب پا کر اپنی جان کے بدلے سب دھن دولت قربان کر دے۔

۵) اور پانچواں حکم یہ ہے کہ دن رات میں کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے رہا کرو کیوں کہ ایسے شخص کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دشمن سے بھاگ رہا ہو اور دشمن تیزی کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہا ہو اور بھاگ کر وہ کسی مضبوط قلعہ میں پناہ گزین ہو کر دشمن سے محفوظ ہو جائے بلا شبہ انسان کے دشمن "شیطان" کے مقابلہ میں ذکر اللہ کے اندر مشغول ہو جانا محکم قلعہ میں محفوظ ہو جانا ہے۔

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی جانب متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا۔ میں بھی تم کو ایسی پانچ باتوں کا حکم کرتا ہوں جن کا خدا نے مجھ کو حکم کیا ہے۔ یعنی "لزوم جماعت" "سمع" اور "طاعت" "ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ"۔ پس جو شخص "جماعت" سے ایک بالشت باہر نکل گیا اس نے بلا شبہ اپنی گردن سے اسلام کی رسی کو نکال دیا مگر یہ کہ جماعت کا لزوم اختیار کرے اور جس شخص نے جاہلیت کے دور کی باتوں کی طرف دعوت دی تو اس نے جہنم کو ٹھکانا بنایا، حارث اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہنے والے نے کہا! یارسول اللہ اگرچہ وہ شخص نماز اور روزہ کا پابند ہی ہو، تب بھی جہنم کا سزاوار ہے؟ فرمایا: ہاں، اگرچہ وہ نماز اور روزہ کا پابند بھی ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں تب بھی سزاوار جہنم ہے۔ (البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۵۴)

علماء سیر نے اسرائیلیات سے نقل کیا ہے کہ یحییٰ کی زندگی کا بہت بڑا حصہ صحرا میں بسر ہوا وہ جنگلوں میں خلوت نشین رہتے اور درختوں کے پتے اور ٹڈیاں ان کی خوراک تھیں اور وہیں ان پر اللہ کا کلام نازل ہوا تب انھوں نے دریائے یردن کے نواح میں دین الٰہی کی منادی شروع کر دی اور عیسیٰ کے ظہور کی بشارت دینے لگے لوقا کی انجیل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

> اس وقت خدا کا کلام بیابان میں زکریا کے بیٹے یوحنا (یحییٰ) پر اترا اور وہ یردن کے سارے گرد و نواح میں جا کر گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کے بپتسمہ (اصطباغ) کی منادی کرنے لگا۔ (باب ا، آیت ا)

ابن عساکر نے وہب بن منبہ سے چند روایات نقل کی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ یحییٰ پر خدا کی خشیت اس درجہ تھی کہ وہ اکثر روتے رہتے تھے حتی کہ ان کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان پڑ گئے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان کے والد زکریا نے جب ان کو جنگل میں تلاش کر کے پالیا تو ان سے فرمایا "بیٹا ہم تو تیری یاد میں مضطرب تجھ کو تلاش کر رہے ہیں اور تو یہاں آہ و گریہ میں مشغول ہے؟ تو یحییٰ نے جواب دیا:

> اے باپ! تم نے مجھ کو بتایا ہے کہ جنت اور جہنم کے درمیان ایک ایسا لق و دق میدان ہے جو خدا کی خشیت میں آنسو بہائے بغیر طے نہیں ہوتا اور جنت تک رسائی نہیں ہوتی یہ سن کر زکریا بھی رونے لگے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۵۳)

واقعہ شہادت

یحییٰ نے جب خدا کے دین کی منادی شروع کر دی اور لوگوں کو یہ بتانے لگے کہ مجھ سے بڑھ کر ایک اور خدا کا پیغمبر آنے والا ہے تو یہود کو ان کے ساتھ دشمنی اور عداوت پیدا ہو گئی اور ان کی برگزیدگی و مقبولیت اور منادی کو برداشت نہ کر سکے اور ایک دن ان کے پاس جمع ہو کر آئے اور دریافت کیا: کیا تو مسیح ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ تب انھوں نے کہا: کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ کیا تو ایلیا نبی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ تب ان سب نے کہا کہ پھر تو کون ہے جو اس طرح منادی کرتا اور ہم کو دعوت دیتا ہے؟ یحییٰ نے جواب دیا: میں جنگل میں پکارنے والے کی ایک آواز ہوں جو حق کے لیے بلند کی گئی ہے۔[1] یہ سن کر یہودی بھڑک اٹھے اور آخر کار ان کو شہید کر ڈالا۔

اور ابن عساکر نے "المستقصی فی فضائل الاقصیٰ" میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مولیٰ قاسم سے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں یحییٰ کی شہادت کا واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ دمشق کے بادشاہ ہداد بن حدار نے بیوی کو تین طلاق دیدی تھیں، اور پھر چاہتا تھا کہ اس کو واپس کر کے بیوی بنالے۔ یحییٰ سے فتویٰ طلب کیا۔ انھوں نے فرمایا "کہ اب یہ تجھ پر حرام ہے" ملکہ کو یہ بات سخت ناگوار گذری اور یحییٰ کے قتل کے درپے ہو گئی اور بادشاہ کو مجبور کر کے قتل کی اجازت حاصل کر لی اور جبکہ وہ مسجد حبرون میں نماز میں مشغول تھے ان کو قتل کرا دیا اور چینی کے طشت میں ان کا سر مبارک سامنے منگوایا۔ مگر سر اس حالت میں

---

[1] انجیل یوحنا باب ا۔ آیات ۱۹۔ ۲۸۔

بھی یہی کہتا رہا کہ تو بادشاہ کے لیے حلال نہیں تاوقتیکہ دوسرے سے شادی نہ کر لے اور اسی حالت میں خدا کا عذاب آیا اور اس عورت کو مع سر مبارک زمین دھنسا دیا۔

اس روایت میں ایک واقعہ ایسا مذکور ہے جس کی وجہ سے تمام روایت ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے وہ یہ کہ یحییٰ علیہ السلام کا خون فوارہ کی طرح جسم مبارک سے برابر نکلتا رہا تا آں کہ بخت نصر نے دمشق کو فتح کر کے اس پر ستر ہزار اسرائیلیوں کا خون نہ بہادیا۔ تب ارمیاہ علیہ السلام نے آکر خون کو مخاطب کر کے کہا: اے خون! کیا اب بھی تو ساکن نہ ہوگا؟ کتنی مخلوق خدا فنا ہو چکی اب ساکن ہو جا۔ چنانچہ اس وقت وہ خون بند ہو گیا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۵۵)

اور حافظ ابن حجر نے اس قصہ کو نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اس قصہ کی اصل حاکم کی وہ روایت ہے جو انھوں نے مستدرک میں نقل کی ہے۔

روایت کے اس حصہ کو اگر تاریخ کا مبتدی طالب علم بھی سنے گا تو وہ بلا تردد باطل قرار دے گا۔ اس لیے کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بخت نصر کا زمانہ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے صدیوں پہلے ہے پھر یحییٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بخت نصر کے حملہ دمشق کا جوڑ لگانا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ اس لیے سخت تعجب ہے کہ حافظ ابن عساکر اور حافظ عماد الدین بن کثیر جیسے صاحب نقد بزرگوں نے اس طرح روایت کو نقل کر کے سکوت اختیار فرمایا۔ علاوہ ازیں اس روایت میں جس قسم کے عجائب و غرائب بیان کیے گئے ہیں وہ اس وقت تک ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتے جب تک ان کا ثبوت نص صریح سے حاصل نہ ہو جائے اور حاکم کی روایت بلحاظ سند بھی محل نظر ہے اور بلحاظ درایت بھی۔

مقتل

علماء سیر و تاریخ کا اس میں اختلاف ہے کہ یحییٰ علیہ السلام کا واقعۂ شہادت کس جگہ پیش آیا، ایک قول یہ ہے کہ بیت المقدس میں ہیکل اور قربان گاہ کے درمیان ہوا اور اس جگہ ستر انبیاء شہید کیے گئے سفیان ثوری نے شمر بن عطیہ سے یہی قول نقل کیا ہے۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۵۵)

اور ابو عبیدہ قاسم بن سلام نے حضرت سعید بن مسیبؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ دمشق میں قتل ہوئے اور اسی میں بخت نصر کا واقعہ بھی ذکر کیا ہے اور ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ جب صحیح ہو سکتا ہے کہ عطاء اور حسن کے اس قول کو تسلیم کر لیا جائے کہ بخت نصر عیسیٰ علیہ السلام کا معاصر تھا۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۵۵)

اور ہم ثابت کر چکے ہیں کہ مستند اور صحیح تاریخی شہادتوں سے یہ قول باطل ہے اس لیے کہ بخت نصر، مسیح علیہ السلام سے صدیوں قبل ہو گزرا ہے جیسا کہ خود ابن کثیر نے بیت المقدس کی تباہی اور عزیر علیہ السلام کے واقعات میں اس کو تسلیم کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس غلط بات کو تسلیم کر لینے کے بعد پھر یہ قول بھی قبول کر لینا ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام انبیاء بنی اسرائیل کے آخری نبی نہیں ہیں اور نبی اکرم ﷺ اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان "فترۃ" کا زمانہ بھی نہیں ہے بلکہ ارمیاہ، حزقیل، عزیر اور دانیال علیہم السلام وغیرہ انبیاء بنی اسرائیل جو مسلمہ طور پر بخت نصر اور اس کے بعد کے زمانہ تک بابل میں قید رہے ان سب کا ظہور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا حالانکہ یہ تمام باتیں باتفاق توراۃ تاریخی شہادت اور اسلامی روایات قطعاً غلط اور باطل ہیں۔

البتہ یہ بات کہ یحییٰ علیہ السلام کا مقتل بیت المقدس نہیں بلکہ دمشق تھا تو حافظ ابن عساکر کی اس روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو انھوں نے ولید بن مسلم کی سند سے نقل کی ہے کہ زید بن واقد کہتے ہیں کہ دمشق میں جب عمود سکاسکہ کے نیچے ایک مسجد کو دوبارہ تعمیر کیا جارہا تھا تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ شرقی جانب محراب کے قریب ایک ستون کی کھدائی میں یحییٰ علیہ السلام کا سر برآمد ہوا اور چہرۂ مبارک حتیٰ کہ بالوں تک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور خون آلود ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابھی کاٹا گیا ہے۔[1] لیکن یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ یحییٰ علیہ السلام ہی کا سر مبارک ہے کسی اور نبی یا مرد صالح کا نہیں ہے۔

الحاصل اس بارہ میں کوئی فیصلہ کن شہادت مہیا نہیں ہے کہ یحییٰ علیہ السلام کا مقتل کونسا مقام ہے لیکن یہ مسلمات میں سے ہے کہ یہود نے ان کو شہید کردیا اور جب عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی شہادت کا حال معلوم ہوا تو پھر انھوں نے علی الاعلان اپنی دعوت حق شروع کردی۔

قرآن عزیز نے متعدد جگہ یہود کی فتنہ پردازیوں اور باطل کوشیوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ انھوں نے اپنے نبیوں اور پیغمبروں کو بھی قتل کیے بغیر نہیں چھوڑا چنانچہ آل عمران میں ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيِّيْنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَأْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ ○

جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کے حکموں کا اور ناحق پیغمبروں کو قتل کرتے ہیں اور (نبیوں کے سوا) جو لوگ ان کو انصاف کرنے کا حکم کرتے ہیں ان کو (بھی) قتل کرتے ہیں تو ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنادو۔

اور ابن ابی حاتمؒ نے بسلسلۂ سند حضرت ابو عبیدۃ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل نے ایک دن میں تینتالیس نبیوں اور ایک سو ستر صلحاء کو قتل کردیا تھا جو ان کو امر بالمعروف کرتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۲۵۵)

زکریا علیہ السلام کی وفات

یحییٰ علیہ السلام کے واقعۂ شہادت کے ضمن میں علماء سیر و تاریخ کے درمیان یہ مسئلہ اختلافی رہا ہے کہ زکریا علیہ السلام کی وفات طبعی موت سے واقع ہوئی یا وہ شہید کیے گئے اور لطف یہ ہے کہ دونوں کی سند وہب بن منبہ ہی پر جاکر پہنچتی ہے چنانچہ وہب کی ایک روایت میں ہے کہ یہود نے جب یحییٰ علیہ السلام کو شہید کردیا تو پھر زکریا علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے کہ ان کو بھی قتل کریں، زکریا علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ وہ بھاگے تاکہ ان کے ہاتھ نہ لگ سکیں۔ سامنے ایک درخت آگیا اور وہ اس کے شگاف میں گھس گئے یہودی تعاقب کررہے تھے تو انھوں نے جب یہ دیکھا تو ان کو نکلنے پر مجبور کرنے کی بجائے درخت پر آرہ چلادیا جب آرہ زکریا علیہ السلام پر پہنچا تو خدا کی وحی آئی اور زکریا علیہ السلام سے کہا گیا کہ اگر تم نے کچھ بھی آہ وزاری کی تو ہم یہ سب زمین تہ و بالا کردیں گے اور اگر تم

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۵۵۔

نے صبر سے کام لیا تو ہم بھی ان یہود پر فوراً اپنا غضب نازل نہیں کریں گے۔ چنانچہ زکریا ؑ نے صبر سے کام لیا اور اف تک نہیں کی اور یہود نے درخت کے ساتھ ان کے بھی دو ٹکڑے کر دیے اور ان ہی وہب سے دوسری روایت یہ ہے کہ درخت پر آرہ کشی کا جو معاملہ پیش آیا وہ شعیا ؑ سے متعلق ہے اور زکریا ؑ شہید نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے طبعی موت سے وفات پائی۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۵۲)

بہر حال مشہور قول یہی ہے کہ ان کو بھی یہود نے شہید کر دیا تھا رہا یہ معاملہ کہ کس طرح اور کس مقام پر شہید کیا تو اس کے متعلق صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ "واللہ اعلم بحقیقۃ الحال"

شب معراج اور یحییٰ ؑ

بخاریؒ نے یحییٰ ؑ کے ذکر میں صرف اسراء کی حدیث کے اس ٹکڑے کو بیان کیا ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا دوسرے آسمان پر ان کے ساتھ ملاقات کرنا مذکور ہے روایت میں ہے:۔

فلما خصلت فاذا یحي و عیسٰی و ھما ابنا خالۃ قال ھذا یحيٰ و عیسٰی فسلم علیھما فسلمت فردا ثم قالا مرحبا بالاخ الصالح و النبي الصالح۔ (کتاب الانبیاء)

پس جب میں (دوسرے آسمان پر) پہنچا تو دیکھا کہ یحییٰ اور عیسیٰ موجود ہیں اور یہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں جبرئیل نے کہا یہ یحییٰ اور عیسیٰ ہیں ان کو سلام کیجیے میں نے ان کو سلام کیا تو ان دونوں نے سلام کا جواب دیا اور پھر دونوں نے کہا آپ کا آنا مبارک ہو اے ہمارے نیک بھائی اور نیک پیغمبر!

زکریا ؑ کے واقعات میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ یحییٰ ؑ کی والدہ ایشاء (الیشبع) اور مریم ؑ کی والدہ حنہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں، اس لیے حدیث معراج میں نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمانا کہ یحییٰ اور عیسیٰ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں مجاز متعارف کے اصول پر ہے یعنی رشتوں میں اس قسم کا مجاز مشہور اور رائج ہے کہ والدہ کی خالہ کو اولاد بھی خالہ کہا کرتی ہے۔

یحییٰ ؑ اور اہل کتاب

اس سے قبل لوقا کی انجیل سے ہم یحییٰ ؑ کے متعلق بعض حوالجات نقل کر چکے ہیں اصل واقعہ یہ ہے کہ یہود تو اپنی سرشت کے مطابق یحییٰ ؑ کے منکر ہیں مگر نصاریٰ ان کو یسوع مسیح کا منادی تسلیم کرتے ہیں اور ان کے والد زکریا ؑ کو صرف کاہن مانتے ہیں اور اہل کتاب ان کا نام یوحنا بیان کرتے ہیں ہو سکتا ہے کہ عبری میں یوحنا کے وہی معنی ہوں جو یحییٰ کے ہیں اور ممکن ہے کہ عبری کے یوحنا نے عربی میں یحییٰ کا تلفظ اختیار کر لیا ہو۔

انجیل لوقا میں بھی قرآن عزیز کے ارشاد کے مطابق یہ تصریح کی ہے کہ یہ نام ان کے خاندان میں کسی شخص کا ان سے پہلے نہیں تھا۔ اس لیے خاندان والوں نے جب سنا تو تعجب کا اظہار کیا۔

اور آٹھویں دن ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کا ختنہ کرنے آئے اور اس کا نام اس کے باپ کے نام زکریا رکھنے

۱: تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۵۲۔

لگے۔ مگر اس کی ماں نے کہا: نہیں بلکہ اس کا نام یوحنا رکھا جائے، انھوں نے اس سے کہا کہ تیرے کنبے میں کسی کا یہ نام نہیں اور انھوں نے اس کے باپ کو اشارہ کیا کہ تو اس کا نام کیا رکھنا چاہتا ہے؟ اس نے تختی منگا کر کے یہ لکھا کہ اس کا نام یوحنا ہے اور سب نے تعجب کیا اسی دم اس کا منہ اور زبان کھل گئی اور وہ بولنے اور خدا کی حمد کرنے لگا۔ (لوقا باب ۱ آیات ۵۹۔۶۵)

اور ان کی عام رہائش اور زندگی کے متعلق متی کی انجیل میں ہے:

یوحنا اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا پٹکا اپنی کمر سے باندھے رہتا تھا اور اس کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا۔ (باب ۳ آیت ۴۔۵)

اور یوحنا کی انجیل میں ان کی دعوت و تبلیغ کے متعلق یہ لکھا ہے:۔

"اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے "کاہن" اور "لاوی" یہ پوچھنے کو بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیا ہے۔ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ یعنی نبی منتظر اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انھوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا۔ میں جیسا یسعیاہ نبی نے کہا ہے "بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو"۔ (باب ۱ آیات ۱۹۔۲۳)

اور لوقا کی انجیل میں اس طرح مذکور ہے۔

اس وقت خدا کا کلام بیابان میں زکریاہ کے بیٹے یوحنا پر اترا اور وہ یردن کے سارے گردونواح میں جا کر گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کے بپتسمہ کی منادی کرنے لگا جیسا کہ یسعیاہ نبی کے کلام کی کتاب میں لکھا ہے کہ:

"بیابان میں پکارنے والے کی آواز آتی ہے کہ خداوند کی راہ تیار کرو، اس کے راستے سیدھے بناؤ"۔

(لوقا باب ۳ آیات ۵۔۲)

اور اسی انجیل میں ان کی گرفتاری کے متعلق یہ الفاظ مذکور ہیں۔

پس وہ (یوحنا) اور بہت سی نصیحتیں دے دے کر لوگوں کو خوش خبری سناتا رہا۔ لیکن چوتھائی ملک کے حاکم ہیرودیس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرودیاس کے سبب اور ان ساری برائیوں کے باعث جو ہیرودیس نے کی تھیں یوحنا سے ملامت اٹھا کر، ان سب سے بڑھ کر یہ بھی کیا کہ اس کو قید میں ڈالا۔ (باب ۳ آیت ۱۸۔۱۹)

اور آگے چل کر اسی انجیل میں ان کی شہادت کے متعلق یہ ذکر ہے:

اور چوتھائی ملک کے حاکم ہیرودیس سب احوال سن کر گھبرا گیا اس لیے کہ بعض کہتے تھے کہ

یوحنا مردوں میں سے جی اٹھا ہے اور بعض یہ کہ ایلیاہ ظاہر ہوا ہے اور بعض یہ کہ قدیم نبیوں میں سے کوئی جی اٹھا ہے۔ مگر ہیرودیس نے کہا کہ یوحنا کا تو میں نے سر کٹوا دیا اب یہ (مسیح) کون ہے جس کی بابت ایسی باتیں سنتا ہوں؟ (باب ۹ آیت ۷۔۹)

بصائر

حضرت زکریا اور یحییٰ کے واقعات و حالات سے اگرچہ حقیقت میں نگاہیں خود ہی نتائج و بصائر اخذ کر سکتی ہیں تاہم یہ چند باتیں خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں:

۱) دنیا میں اس شخص سے زیادہ شقی اور بد بخت دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا جو ایسی مقدس ہستی کو قتل کر دے جو نہ اسکو ستاتی ہے اور نہ اسکے مال و دولت پر ہاتھ ڈالتی ہے بلکہ اس کے برعکس بغیر کسی اجرت و عوض اسکی زندگی کی اصلاح کیلئے ہر قسم کی خدمت انجام دیتی اور اخلاق، اعمال اور عقائد کی ایسی تعلیم بخشتی ہے جو اس شخص کی دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح و سعادت کی کفیل ہو۔ چنانچہ نبی اکرم نے اسی بناء پر حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کے اس سوال پر کہ قیامت میں سب سے زیادہ مستحق عذاب کون شخص ہوگا؟ یہ ارشاد فرمایا:۔

قال: رجل قتل نبیا او من امر بالمعروف و نھی عن المنکر۔

(تفسیر ابن کثیر عن ابی حاتم جلد ۱ ص ۳۵)

وہ شخص جو نبی کو یا ایسے شخص کو قتل کرے جو اس کو بھلائی کا حکم کرتا اور برائی سے باز رکھتا ہے۔

اقوام عالم میں یہود کو اس شقاوت میں ید طولیٰ حاصل رہا ہے اور انھوں نے اپنے پیغمبروں اور نبیوں کے ساتھ جس قسم کے توہین آمیز سلوک حتیٰ کہ قتل تک کو روا رکھا اس کی نظیر دنیا کی دوسری قوموں میں مفقود ہے۔

۲) بنی اسرائیل چونکہ مختلف اسباط (قبائل) میں تقسیم تھے اور اس وجہ سے ان کی آبادیاں چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے مراکز جدا جدا تھے اس لیے ان کے درمیان ایک ہی وقت میں متعدد نبی اور پیغمبر مبعوث ہوتے رہے مگر تورات ان سب کی تعلیم کے لیے اساس اور بنیاد رہی ہے اور موسیٰ کے حق میں ان انبیاء کی حیثیت اس درجہ کی تھی جو اس امت میں نبی اکرم کے صحیح اور حقیقی جانشین علماء حق کو حاصل ہے اور اگرچہ حدیث علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل الفاظ کے لحاظ سے محل نظر ہو لیکن مراد اور مفہوم کے اعتبار سے قطعاً صحیح اور درست ہے اس لیے کہ خاتم الانبیاء کے بعد اب جبکہ سلسلۂ نبوت اپنے عروج کمال پر پہنچ کر ختم ہو گیا تو امت مرحومہ کی تا قیام قیامت اصلاح و رشد کے لیے علماء حق کے سوا دوسری کوئی جماعت نہیں ہو سکتی اور منصب نبوت کے خصوصی شرف کے علاوہ ان کی حیثیت بلاشبہ وہی ہے جو موسیٰ کی تعلیم کے نشر و ابلاغ کے لیے انبیاء بنی اسرائیل کی تھی۔

ہم نے "عالم" کے ساتھ حق کی شرط لگائی ہے اس لیے کہ نبی اکرم نے علماء سوء کو شرار الخلق بدترین

مخلوق فرمایا ہے، لیکن یہ واضح رہے کہ جس طرح "علماء سوء" کی پیروی امت کی گمراہی کا باعث ہوتی ہے اس سے زیادہ دین کی بربادی کا سامان اس طرح مہیا ہوتا ہے کہ علماء سوء کی آڑ لے کر علماء حق کے خلاف امت میں بدگمانی پھیلائی جائے ان کا استہزاء و تمسخر کر کے دین قیم کو تباہ کرنے کی سعی نامشکور کی جائے اور حق اور سوء کے امتیاز کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو حکم بنانے کی جگہ اپنی آراء اور خواہشات کی موافقت و مخالفت کو معیار قرار دے لیا جائے۔

نیز مخصوص اشخاص و افراد کی مخالفت کے جذبہ میں عام طریقہ پر علماء دین کو ہدف ملامت بنانا اور ان کی توہین تذلیل کرنا دراصل دین حق کی تعلیم کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا ہے اور اس آیت و حدیث کا مصداق بننا ہے جو گذشتہ صفحات میں یہود کے سلسلہ میں بیان ہو چکی ہیں۔

۳) انسان کو خدا کے فضل و کرم سے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیے اور اگر بعض حالات میں خلوص کے ساتھ دعائیں کرنے کے باوجود بھی مقصد حاصل نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس شخص سے خدا کی نگاہ مہر نے رخ پھیر لیا ہے نہیں بلکہ "حکیم مطلق" کی حکمت عام اور مصلحت تام کی نظر میں کبھی انسان کی طلب کردہ شئے مآل اور انجام کے لحاظ سے اس کے لیے مفید ہونے کی جگہ مضر ہوتی ہے جس کا خود اس کو اس لیے علم نہیں ہوتا کہ اس کا علم محدود ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ مطلوب مصالح شخصیہ سے بالاتر مصالح اجتماعیہ کی فلاح و نجاح کی خاطر تاخیر چاہتا ہے یا اس سے بہتر مقصد کے لیے اس کو قربان کر دیا جاتا ہے

بہرحال "قنوط" اور "مایوسی" درگاہ رب العزت میں غیر محمود اور ناپسندیدہ بات ہے:

لَا تَيْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ ○

خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو اس لیے کہ خدا کی رحمت سے صرف وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو منکر ہیں۔

بحمد اللہ تم